10-1-1991

وزیرِ اعلیٰ شری شرد پوار کی ۵۰ ویں سالگرہ کے موقع پر ناگپور کے سرکاری رہائش گاہ زام گیری پر ۱۲ دسمبر ۱۹۹۰ء
کو مہاراشٹر دودھان سبھا کے چیرمین شری مدھوکر راؤ چودھری شری شرد پوار کو مبارکباد دے رہے ہیں۔

اسی طرح وزیر برائے شہری ترقیات شری سوشیل کمار شندے اور حزبِ مخالف پارٹی کے لیڈر شری منوہر جوشی،
وزیر اعلیٰ کو سالگرہ کی مبارکباد دے رہے ہیں

قومی راج

۱۰ر جنوری ۱۹۹۱ء

ہندی اور مراٹھی میں ہر ماہ کی یکم اور پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے
انگریزی، گجراتی، سندھی اور اردو زبان میں ہر ماہ کی ۱۰ر تاریخ کو شائع ہوتا ہے

زرِ سالانہ ۲۵ روپے — قیمت فی شمارہ ۳ روپے

جلد ۱۶ — شمارہ ۱۰

چیف ایڈیٹر ——— شری ارون پاٹنکر

مینیجنگ ایڈیٹر ——— آر. جی. مائیڈیو

ایڈیٹر ——— فیروزہ فیاض خان

ترسیلِ زر کا پتہ:-

اسسٹنٹ ڈائریکٹر (ایڈمنسٹریشن)
ڈائرکٹوریٹ جنرل آف انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز،
گورنمنٹ آف مہاراشٹر، بیرک نمبر ۱۹
مقابل سروچی بلڈنگ، نزد منترالیہ، بمبئی ۴۰۰۰۲۱
Tel. 2021530

مراسلت کا پتہ:-

ایڈیٹر قومی راج
ڈائرکٹوریٹ جنرل آف انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز،
گورنمنٹ آف مہاراشٹر
۱۵واں منزل، نیو ایڈمنسٹریٹیو بلڈنگ
مقابل منترالیہ بمبئی ۴۰۰۰۳۲
Tel. Nos. 2020651, 2023957

اس شمارے میں

صفحہ نمبر

سیتو مادھوراؤ پاگڑی

مہاتما جیوتی باپھلے خراجِ عقیدت

انیسویں صدی مہاراشٹر کیلئے بہت سے معنوں میں اہمیت رکھتی ہے اس صدی کے دوران نہ صرف سیاسی دانشوروں کی ریل پیل رہی بلکہ سماج سدھار کا کام کرنے والے کئی رہنما پیدا ہوئے۔ انگریزوں کے راج میں نئی نسل کے سامنے نئے برطانوی نظام کو سمجھنے اپنانے اس کی موافقت یا مخالفت میں چلنے سے متعلق کئی مسائل پیدا ہوئے پرانی قدریں ختم ہونے لگیں نئی قدریں جنم لینے لگیں۔

نیا برطانوی نظام چونکہ بمبئی میں شروع سے ہی رائج تھا لہٰذا یہاں اب زندگی کے وہ آداب و قوانین نہیں رہ گئے تھے جو پہلے تھے ان میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں جبکہ مہاراشٹر کے دیگر حصوں میں اب بھی پرانے نظام کا ہی سکہ چل رہا تھا ۱۸۱۸ء میں برطانوی راج کے آغاز سے چند سالوں تک تو یا دماغی عذاب بن کر لوگوں کے دلوں پر چھایا رہا مگر آہستہ آہستہ سچائی کو ماننا

ہی پڑا اور ماضی کے فسانے قصۂ پارینہ بنتے چلے گئے۔ سالہا سال
کے بعد انتظامیہ میں باقاعدگی اور ضبط پیدا ہوا اور عوام کی
بہبود کی جانب توجہ دی گئی۔ لوگ ملک کے ایک سرے سے دوسرے
سرے تک آنے جانے لگے اور نئے خیالات نے جنم لئے تعلیم کے
لئے مدرسے کھولے گئے اور اس سمت قدم آگے بڑھتے گئے۔ اور پہلی
دفعہ عوام نے اس بات کو محسوس کیا کہ تعلیم سے وہ لوگ مستفید ہو
سکتے ہیں۔

اس عہد میں سب سے اہم سماجی مصلح مہاتما جیوتی با پھلے تھے
ان کا جنم ۱۸۲۷ء میں ہوا ابتدائی تعلیم کے بعد روایت کے
مطابق ان کے والدین چاہتے تھے کہ وہ آبائی پیشہ اپنائیں
مگر انھوں نے ۱۸۴۲ء میں انگریزی کی تعلیم حاصل کرنا شروع
کی یہ سلسلہ چند سالوں تک ہی چلا مگر اس عرصے میں انھوں
نے کئی لوگوں سے رابطہ پیدا کر لیا۔

اور نظام پارینہ کی انھوں نے مخالفت کی کہ ان کے
مطابق خوش حالی اور استحکام کیلئے نیا نظام زیادہ مفید تھا۔
جیوتی با پھلے کے مطابق جہالت اور ناخواندگی ہی
سماجی مسائل کی اصل جڑ ہے۔ ذہنی غلامی اور پرانے
نظام کو سینے سے لگانے کی اصل وجہ بھی ناخواندگی ہے
تعلیم اور صرف تعلیم انھیں اس اندھیرے سے نجات دلا سکتی
ہے۔

جیوتی با پھلے نے سب سے پہلے پونے میں ایک اسکول قائم کیا
اس زمانے میں ذات پات جیسے مسائل سر ابھارے ہوئے
تھے خواتین کو سماج میں کوئی اہمیت نہ تھی ان کی تعلیم کو
معیوب سمجھا جاتا تھا۔ بیواؤں کی حالت ناگفتہ بہ تھی چنانچہ
انھوں نے ۱۸۵۱ء ہی میں لڑکیوں کیلئے اسکول کھولا چھوت
چھات کو وہ نہیں مانتے تھے اس لئے یہ اسکول سبھی کے لئے
عام تھا آج جب کہ خواتین میں تعلیم عام ہے اس بات کی اہمیت کا
اندازہ نہیں ہوتا ہے کہ جیوتی با پھلے کا یہ قدم اس ضمن میں کتنا
اہم ترین تھا۔

جیوتی با پھلے ایک اعلیٰ دانشور، سماجی مفکر تھے انھوں نے
سماجی نامساوات اور جہالت کی وجوہات کو جاننے کی کوشش
کی اور وہ اس نتیجہ پر پہونچے کہ ملک اور رسم ورواج
کی باگ ڈور برہمن سنبھالے ہوئے ہیں جو ترقی کی راہ میں
روڑا بنے ہوئے ہیں اس کا یہ مطلب نہیں کہ جیوتی برہمنوں
کے خلاف تھے بلکہ ان کے اور برہمن دانش وروں ومفکروں
کے گہرے مراسم تھے اور بہت سے براہمنوں کا انہیں تعاون
حاصل تھا ان کی اسکول کے قیام کے لئے جو زمین انھیں
ملی تھی وہ ایک برہمن نے ہی عطا کی تھی۔

ان کے اسکول کے انتظامیہ کے ممبران میں کئی برہمن
افراد موجود تھے، جسٹس راناڈے ان کے ثنا خواہوں میں
سے تھے۔ اور اس بات کو ان کے کٹر مخالفین نے بھی مانا ہے
کہ سماجی نامساوات کو دور کرنے کا واحد ذریعہ ذہنی بیداری
ہے جو تعلیم کے ذریعہ ممکن ہے۔ وشنو شاستری
چپلونکر جو ہمیشہ ان کی مخالفت کرتے رہے اس بات کو وہ
بھی ماننے پر مجبور تھے۔

" جو کچھ برائیاں تھیں بہر حال ان کا سماج میں تدارک
ضروری تھا۔ "

جیوتی با کے کئی برہمن دوست ضرور تھے مگر وہ
برہمنوں کو عوام کی ترقی میں بادھا ڈالنے کیلئے سخت
سے سخت تنقید کرتے تھے اور اس سلسلے میں عیسائیت
اور اسلام کے اصولوں کی تعریف کرتے تھے جس میں
برہمنوں نے جس طرح لوگوں کو استحصال کیا ہے اس
کی گنجائش نہیں تھا۔

ان تمام باتوں کے باوجود جیوتی کسی دوسرے
مذہب کی جانب راغب کیوں نہیں ہوئے یا اس کی وجہ
یہ ہے کہ وہ اپنے وقت سے بہت آگے تھے وہ برہمنی استحصال
کے مخالف ضرور تھے مگر صحیح معنوں میں وہ ہر رجعت پسندی کے
مخالف تھے وہ ایک روشن خیال انسان تھے اور وہ حب الوطن

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

اپنی خزاں کو اس طرح رَدِ کشِ لالہ زار کر
خانۂ بے ثبات ہیں نقشِ بقا ابھارتے

اپنے سفر کی راہ کو آپ ہی خار زار کر
کون سا کام کرلیا نقشِ فنا ابھار کر

دل میں لگا کے آگ سی مجھ سے یہ کہہ گیا کوئی
میری خطائے دل دراصل میری خطائے دل نہیں

میں خود اسے بجھاؤں گا اب مرا انتظار کر
تو مرا جائزہ نہ لے خود کو نہ شرمسار کر

میری سکندری میں ہے شانِ قلندری نہاں
کود تھا وہ بشر ہوں میں سنگ تھا وہ شرر ہوں میں

میرا لباسِ ظاہری اِس کا نہ اعتبار کر!
مجھ پہ کبھی اک نگاہ ڈال اور پھر انتظار کر

اور تمام کاروبار، محض خسارۂ حیات
چاہیئے نفعِ دل اگر شوق کا کاروبار کر!

خالقِ آدمی ذرا مجھ سے سن آدمی کا ذکر
آپ ہی شرمسار ہو، مجھ کو نہ شرمسار کر!

قطعہ

زندگی یوں تو ہوا بن کے اڑی جاتی ہے
اور ایسے کہ کوئی لمحہ ٹھہرتا ہی نہیں

انہیں لمحات میں لمحہ کوئی آزادؔ مگر
کبھی رکتا ہے تو پھر یوں کہ گزرتا ہی نہیں

کو بھی ایک حد تک ہی قبول کرتے تھے جنگ و جدل اور اشتعال انگیزی سے وہ مخالف تھے۔

وہ یکجائی کے پجاری تھے انھوں نے ستیہ شودھک سماج کی سنہ ۱۸۳۰ء میں بنیاد ڈالی جس کا خاص مقصد خدا کی وحدانیت کو ماننا تھا خدا کی نظر میں تمام انسان برابر ہیں اور جس کی پرستش کا ہر انسان کو حق ہے۔ کوئی بھی شخص محض پیدائش یا ذات کی بنا پر بڑا یا چھوٹا نہیں ہے بلکہ وہ اپنے اصلی اعمال سے ممتاز ہوتا ہے کوئی مذہبی کتاب مکمل الہامی نہیں دوسرا جنم، فضول مذہبی رسم و رواج اور پرستش جہالت پر مبنی ہیں۔

جیوتی با پھلے کا انتقال سن ۱۹۹۰ء میں ہوا جیوتی با جو کہ خدا کا سب سے بڑا تحفہ انسان کیلئے باشعور ہونے اور فکری قوت رکھنے کو سمجھتے تھے اپنے سیدھے سادے طریقۂ کار کی بنا پر انیسویں صدی میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں آج اگر ہم ان کو سمجھنے سے قاصر ہیں تو یہ ہمارا قصور ہے اس مہاراشٹر کے سپوت کو ہمارا خراجِ عقیدت قبول ہو۔

(تلخیص، فیروزہ نیاز خان)

بھارت رتن ڈاکٹر امبیڈکر

۱۴ر اپریل کو ڈاکٹر باباصاحب امبیڈکر کی ۹۹ سالگرہ کے موقع پر صدر ہند نے انہیں بھارت رتن (بعد از مرگ) ملک کا سب سے ممتاز شہری اعزاز عطا فرمایا۔

ڈاکٹر بھیم راؤ رام جی عرف باباصاحب امبیڈکر مدھیہ پردیش کے مہو مقام میں ۱۴ر اپریل ۱۸۹۱ء میں ایک ہریجن خاندان میں پیدا ہوئے ان کے والد رام جی صوبیدار فوج میں ملازم تھے۔ ان کی والدہ بھیما بائی ایک سیدھی سادی اور نیک خاتون تھیں

رام جی نے بڑی محنت سے ترقی کر کے صوبیدار کا عہدہ سنبھالا تھا اور وہ وقت کی قدر و منزلت سے واقف تھے وہ چاہتے تھے کہ ان کی سب سے ذہین اولاد بھیم راؤ اعلیٰ تعلیم حاصل کرے۔ زمانۂ طالبعلمی سے ہی نوعمر بھیم راؤ کو اہانت آمیز سلوک سے واسطہ پڑا تھا جو اونچی ذات والے ہندوؤں کا اچھوتوں سے تھا۔ اس کے باوجود بھیم راؤ نے ۱۹۱۲ء میں انگریزی اور فارسی میں بی۔ اے کیا اور مہاراجہ بڑودہ کی اسکالرشپ پر وہ کولمبیا یونیورسٹی نیویارک گئے وہاں انہوں نے معاشیات اور سیاست میں ایم۔ ایس سی تھیس تیار کی مگر اسے مکمل نہ کر سکے۔ بڑودہ واپس آکر انہیں نہایت دردناک تجربات سے جوجھنا پڑا ایک درخت کے نیچے اپنے سامان کے ساتھ بسیرا کرنا پڑا یہاں تک کہ تانگہ والے نے نیچی ذات کا ہونے کی وجہ سے انہیں تانگہ سے اتار دیا آخرکار وہ بمبئی لوٹ آئے اور اچھوتوں کیلئے لڑنے کا تہیہ کر لیا ۱۹۲۴ء سے انہوں نے ہائی کورٹ میں پریکٹس شروع
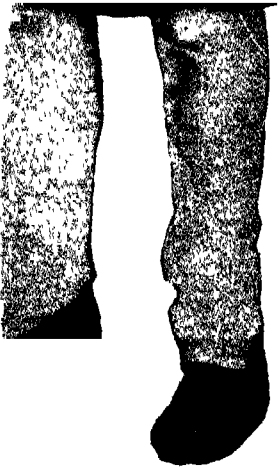
لی اور عوامی زندگی کا آغاز یہیں سے ہوا اس سال انہوں نے بھشکرت ہتکرنی سبھا قائم کی تاکہ "اچھوتوں" کو اٹھایا جاسکے اس کے بعد ان کی سرگرمیاں عروج پر پہنچ گئیں اس میدان انہوں نے موک نایک ہفتہ وار اخبار اچھوتوں کے مسائل کو لے کر نکالا۔

۱۹۲۷ء میں انہوں نے قلابہ ضلع میں پبلک ٹینک سے مہاروں کو پانی لینے کیلئے ستیہ گرہ کیا اونچی ذات کے ہندوؤں کو یہ بات بہت بری لگی اور دس سال تک کیس چلا کہ ٹینک کا پانی مہاروں کی وجہ سے خراب ہوگیا۔ اونچی ذات کے ہندو اسے پرائیوٹ پراپرٹی بتاتے تھے بعد میں اسے گائے کے پیشاب اور گوبر ڈال کر صاف کیا گیا بالآخر فتح مہاروں کی ہوئی اور وہ کیس جیت گئے اس سال انہوں نے مہاڈ میں منوسمرتی جلائی جس میں اچھوتوں کے خلاف لکھی گئی باتیں درج ہیں۔ اور اس واقعہ کی وجہ سے امبیڈکر ہندوستان کے کونے کونے میں مشہور ہوگئے

۱۹۳۰ء میں انہوں نے اچھوتوں کے کالا رام مندر میں داخل ہونے کیلئے ناسک میں ستیہ گرہ کی۔

۱۹۳۲ء میں پونہ پیکٹ کی وجہ سے اچھوتوں کو عام حلقہ انتخابات میں محفوظ نشستیں عطا کی گئیں۔

ڈاکٹر باباصاحب امبیڈکر ذات پات کے نظام کے ہی کٹر مخالف ہونے کی وجہ سے ہی مشہور نہیں ہیں بلکہ وہ ایک عظیم سیاست داں بڑے قومی رہنما بھی تھے۔ انہوں نے دستور ہند کی شکل میں گرانقدر تحفہ ہندوستان کو دیا ہے جو آنے والی نسلیں سدا عزیز رکھیں گی۔

۱۹۵۲ میں

ڈاکٹر باباصاحب امبیڈکر ۵۶-۱۹۶۳ء تک راجیہ سبھا کے ممبر رہے ۱۹۵۶ء میں تین لاکھ لوگوں کے ہمراہ بدھ مت قبول کیا بدھ مت میں پراچنا، کرونا اور سماتا کی تعلیم دی گئی ہے اور اچھی خوشحال انسانی زندگی بسر کرنے کیلئے تمام باتیں ضروری ہیں اس وجہ سے انہوں نے دوسرے مذاہب پر بدھ مت کو فوقیت دی۔

مہاراشٹر جو کہ سنتوں دانشوروں فلسفوں اور سماجی مفکرین کی سرزمین ہے جنہوں نے یہاں کی زندگی کے ہر پہلو کو سنوارا ہے ہم اس سرزمین کے عظیم سپوت کی صد سالہ جشن ولادت پر انہیں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں کہ وہ ایک عظیم اسکالر سیاسی و سماجی

وزیر اعلیٰ شری شرد پوار ڈاکٹر باباصاحب امبیڈکر کی برسی کے موقع پر ودھان بھون میں ڈاکٹر امبیڈکر کی تصویر پر گلپوشی کرکے خراجِ عقیدت پیش کر رہے ہیں۔

مفکر ایک اعلیٰ دانشور اور ظلم کے خلاف جہاد کرتے والوں میں سے ایک تھے۔

(تلخیص :- فیروزہ فیاض خان)

یوسف ناظم

مزاح نگار کرشن چندر

اردو کے مزاح نگاروں کی عام اور روزمرّہ استعمال کی فہرست میں کرشن چندر کا نام شامل نہیں ہے۔ یہ بجائے خود ایک مزاحیہ نہ سہی۔ نیم مزاحیہ بات یقیناً ہے اور اس کی ذمہ داری زیادہ تر بہ نفس نفیس خود کرشن چندر پہ ہے کیونکہ انہوں نے افسانہ نگار بننے کو ترجیح دی۔ ممکن ہے ان کی پسند کی وجہ یہ رہی کہ حال حال تک مزاح کو ادب میں کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔

کرشن چندر کا حساب کتاب اُن بلند قامت اور باوقار ظرافت نگاروں کا سا ہے جن کی بنیادی حیثیت اور شہرت، سنجیدہ شاعر، تنقید نگار، مکتوب نگار، صحافی، افسانہ نگار اور سیاست داں کی رہی ہے۔ اس فہرست میں غالب بھی ہے اور شبلی بھی، نیاز فتح پوری بھی ہے اور قاضی عبدالغفار بھی۔ یہی نہیں عبدالماجد دریاآبادی بھی ہیں۔ اور ابوالکلام آزاد بھی۔ کرشن جی بھی اسی قبیل کے مزاح نگار ہیں۔ اگر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو شاید یہ بات بھی ثابت ہو جائے کہ طنز و مزاح کی مشق میں کرشن چندر نے پطرس سے زیادہ ہی لکھا ہے۔ رشید احمد صدیقی سے بھی زیادہ لکھا ہے۔ لیکن ان کے ساتھ مشکل یہ ہوئی کہ ظرافت کے علاوہ انھوں نے اتنا کچھ لکھا کہ ان کی ظرافت نگاری لجائی شرمائی دور ایک گوشے میں بیٹھی رہی ہاتھوں میں مہندی لگائے ان کی مثال یا بعینہٖ مثال اکبرالہ آبادی کی بھی ہے۔ اکبرالہ آبادی ظریفانہ شاعری میں اتنے بلند و بالا ہے کہ ان کی سنجیدہ شاعری جو چار ضخیم جلدوں میں ہے اب تک صرف انہی جلدوں میں بند ہے۔ ذرا سے جلدی بیماری بھی کہا جا سکتا ہے، حالانکہ انکے جاننے اور ماننے والے مانتے ہیں کہ اکبر الہ آبادی غزل گوئی میں کسی استاد شاعر سے پیچھے نہیں ہیں ایک ثقہ مثل اور شریف النفس شخص ظریف شاعر کی حیثیت سے مشہور ہوا اور ایک ظریف النفس ادیب نے صرف افسانہ نگار کی حیثیت سے شہرت پائی، دنیا میں یہی ہوتا آیا ہے۔

میرے، کرشن جی کو بنیادی طور پر مزاح نگار ماننے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان کی ادبی زندگی کا آغاز ہی طنز و مزاح سے ہوتا ہے۔ جو خود ایک فالِ نیک ہے ان کا پہلا مضمون "ضرب و کرب کی پیداوار ہے۔ ضرب ان کے بدن پر پڑی اور اس کے نتیجے میں وہ کرب کی کیفیت سے گزرے — ظرافت نگاری کیلئے یہ کیفیت ضروری ہوتی ہے۔ لیکن یہ کوئی کلیہ نہیں وہ غالباً آٹھویں یا نویں جماعت کے طالب علم تھے۔

جب فارسی کی کلاس میں ان کے ٹیچر نے ان کی خبر لی لیکن ٹھہریئے یہ قصّہ تو خود ان کی ہی زبانی سننا چاہئے لکھتے ہیں — " میں کشمیر کے ایک ہائی اسکول میں پڑھتا

تھا آٹھویں یا نویں جماعت میں ٹھیک سے یاد نہیں میرے فارسی کے ٹیچر شری گلزاری لال نندا سابق ہوم منسٹر کے پتا جی لالہ بلاقی رام تھے۔ دور پار سے ہماری اور ان کی رشتہ داری بھی تھی وہ اکثر ہمارے گھر پتا جی سے ملنے آیا کرتے تھے ہم بھی ان کے گھر جایا کرتے تھے۔ لیکن ایکدن فارسی کی کلاس میں پڑھاتے ہوئے انھوں نے مجھے کسی شرارت کے کارن دھر پیٹا تو میں ساری رشتہ داری بھول گیا۔ استاد اور طالب علم کا رشتہ بھی بھول گیا اور غصہ میں آکر اپنی مار کو یاد کرتے ہوئے میں نے ایک طنزیہ "پروفیسر ملیکی" کے نام سے اپنے استاد کے خلاف لکھ مارا ـــــــــــ یہیں پر اکتفا نہیں کی بلکہ اسے چھپنے کیلئے دیوان سنگھ مفتوں کے ہفتہ روزہ ریاست میں بھیج دیا جہاں وہ اگلے ہفتے چھپ بھی گیا۔ اس کی اشاعت سے سب سے زیادہ حیرت مجھے خود ہوئی تھی۔ میرا وہ طنزیہ خاکہ سارے شہر میں آگ کی طرح پھیلا اور پڑھا گیا، اور اس مضمون کی اشاعت پر مجھے دوبارہ پیٹا گیا۔ اس لئے میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میری ادبی زندگی پٹائی اور گالی سے شروع ہوئی اور گالیوں کا یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

یہ اقتباس کرشن جی کے مضمون "بندگی کی منزل" کا ہے جو اپریل ۱۹۶۰ء کے عصری ادب میں شائع ہوا تھا فرمائش اور اصرار کے باوجود ان کا لکھا ہوا یہ خاکہ ان سے حاصل نہیں کیا جا سکا، عمارتوں کے بن جانے کے بعد سنگ بنیاد نظر سے پوشیدہ ہو جاتے ہیں" پروفیسر ملیکی" کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ آٹھویں یا نویں جماعت کے طالب علم کے تحت الشعور میں جو حس مزاح پرورش پا رہی تھی کچھ عرصے بعد نشر زندگی اور گل آخر بینی کے فن کی صورت میں نمودار ہو کر رہی، نثر میں شعلہ و شبنم اور زخم مرہم کا خوب صورت امتزاج بہت کم تحریروں میں نظر آتا ہے۔ کرشن چندر اس معاملے میں خوش نصیب تھے۔

مزاح نگاری کرشن چندر کو اناطول فرانس، سوئفٹ یا ایڈیسن کے حوالوں کے اور مثالوں کے ساتھ پیش کرنا اور ان کا ان سے یا اُن کا اِن سے موازنہ کرنا اس لئے ضروری نہیں ہے کہ میں اس بات کا قائل ہوں کہ اردو ظرافت مغربی ظرافت سے ذرا آگے ہے۔ اور اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہم ہندوستانی مقابلتاً اور نسبتاً زیادہ ذہین ہیں۔ بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہمارے ہاں کے مسائل، سیاسی معاشی اور معاشرتی حالات، ذہنی اور ذہنی اختلافات، روزمرہ، زندگی کے واقعات اور عجائبات ظرافت نگاری کے بہترا اور سامنے کے موضوعات ہیں اور ان موضوعات پر جو ادیب بھی کامیابی کے ساتھ قلم اٹھا سکتا ہے۔ بلاتخصیص زمین و زبان یقیناً بہتر ظرافت نگار بن سکتا ہے، شرط کامیاب اور موثر خامہ فرسائی کی ہے اور چونکہ کرشن جی فطرتاً شگفتہ مزاج اور عادتاً انشا پرداز تھے۔ ان سارے موضوعات کو یوں نبھا گئے جیسے یہ انھی کیلئے تراشے گئے ہوں حکیم الدین احمد نے اپنی پوری تنقید میں ایک بات پتہ کی کہی ہے کہ مزاح نگار کا انشاء پرداز ہونا ضروری ہے اس سے ماننا پڑتا ہے۔ جز بیان مزاج کا دشمن اور ظرافت کا قاتل ہے رشید احمد صدیقی اسی لئے مزاح نگاروں میں ممتاز ہیں کہ وہ بلند پایا انشاء پرداز تھے۔ اور قاری کو اپنی تحریر کے ساتھ بہالے جاتے تھے۔ فرحت اللہ بیگ اس معاملے میں ان کے ہم جلیس تھے۔ اور یہی کمال کرشن چندر کو بھی حاصل تھا۔ خوبصورت اور دل آویز نثر کا جہاں تک تعلق ہے نثر نگار ہی نہیں شاعر بھی کرشن چندر پر رشک کرتے ہیں۔ اور خواجہ احمد عباس نے تو اپنے ایک مضمون میں یہ تک لکھا ہے کہ وہ اسی وجہ سے ان سے جلتے ہیں۔ میرے حساب سے کرشن چندر کی زبان افسانہ نگاری سے زیادہ انشائیہ نگاری کی زبان ہے، طنز و رنج کی خوبیوں سے مالا مال اور شوخی اور شگفتگی کے ستاروں سے سجے ہوئے اسکے مزاحیہ اردو ظرافت میں افسانے کی حیثیت رکھتے ہیں ظرافت نگاری کے مقابلے میں کرشن چندر کو رشید احمد

صدیقی، فرحت اللہ بیگ اور مشتاق احمد یوسفی کی صف میں رکھنا، اس صنف کی قدر و منزلت بڑھانا ہے۔

دلچسپ بات تو یہ ہیکہ خود کرشن جی نے سنجیدگی سے کبھی یہ نہیں سوچا کہ وہ مزاح نگار ہیں۔ اور کسی وقت سوچا بھی ہوگا تو وہ اسے بھول چکے تھے۔ حیدرآباد میں سنہ ۱۹۶۶ء میں ظرافت نگاروں کی پہلی کانفرنس منعقد ہوئی تو وہ حیدر آبادی جن پر علاقائی تعصب کا الزام لگایا جاتا ہے دوڑے دوڑے کرشن جی کی خدمت میں پہنچے کہ اس کانفرنس کی صدارت آپ کریں گے۔ اور انھیں یقین دلایا کہ اصل مزاح نگار تو آپ ہیں یہ اور بات ہے کہ کانفرنس کوئی اور لوگ کر رہے ہیں۔ کرشن جی کو ان کے مزاحیہ افسانے یاد دلانے پڑے تب کہیں جاکر وہ صدارت کیلئے آمادہ ہوئے اور ان کی رگِ ظرافت عود کر آئی۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ کرشن چندر بجز اپنے دوسرے مزاح نگاروں کے ـــــ تعلق سے دریادل واقع ہوتے ہیں۔ شوکت تھانوی کے بارے میں انھوں نے اپنے ایک خط میں صہبا لکھنوی مدیر افکار کراچی کو لکھا تھا "شوکت تھانوی کی موت سے دلی رنج ہوا! باغ و بہار آدمی تھا، آج مزاح نگاری میں آخر وقت تک اسے اس کا مناسب مقام نہیں دیا گیا۔ بلاشبہ اس نے بہت لکھا ہے اس میں بڑی آسانی سے قدرِ اوّل کی اتنی چیزیں دستیاب ہوسکتی ہے کہ چار پانچ اچھے مجموعے مرتب ہوسکیں۔ اتنی دولت کسی دوسرے مزاح نگار کے ہاں آپ کو ملے گی مگر وہ سب بڑے مزاح نگار ہیں اور شوکت کچھ بھی نہیں۔ کیونکہ وہ زیادہ لکھتا تھا۔ لکھنے کو تو چیخوف نے بھی گیارہ سو افسانے لکھے تھے مگر وہ سب کے سب تو لازوال نہیں ہوسکے۔ بڑی مشکل سے پچاس افسانے زندہ رہے تو اتنے عمدہ مزاحیہ مضامین تو شوکت کے ہاں بھی مل جائیں گے۔ پھر انھیں قدرِ اوّل کا مزاح نگار کیوں نہ مانا جائے"

اب میں سوچتا ہوں کہ کیا یہی رائے خود اس رائے کے خالق پر صادق نہیں آتی ـــ آتی ہے۔ حالانکہ مزاح کو ہوا کا جھونکا کہا ہے۔ اور ہوا کے وہ لطیف جھونکے جو اہتزار و انبساط کی کیفیت اور شگفتگی گل کی فضا پیدا کریں کرشن چندر کے ہاں اس افراط سے ملتے ہیں کہ یادنوشی میں بھی ہم جیسوں کو بادہ کوشی کا لطف آتا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"کانتا، چمپا اور میناکشی بڑی خوبصورت لڑکیاں ہیں۔ یہ کیا کرتی ہیں؟

" خوبصورت لڑکیاں خود کچھ نہیں کرتیں لوگ ا سے کرتے ہیں۔ پریم، عشق اور محبت وغیرہ ـــ ا محبت کے بارے میں فرماتے ہیں ـــ "یہ محبت ہوئی سمنٹ کی بوری ہوئی تائی مدن کی ساڑی ہوئی اونچی ایڑی کا سینڈل ہوئی۔ مگر شاید کچھ لوگ محبت کو اس طرح کرتے ہیں جس طرح پاؤں کا جوتا خریدتے

مجھے حیرت اس وقت ہوئی ڈاکٹر سلام سندیلوی کا مضمون نظر سے گزرا! جس میں وہ لکھتے ہیں "کرشن چ کے ہاں ان کے مزاج کے کچھ اور پر تو نظر آتے ہیں۔ م وہ اپنے افسانوں میں کہیں کہیں مزاح سے بھی کام لی ہیں، مگر مزاح ان کے افسانوں کا کوئی اہم عنصر نہیں ہے اور نہ وہ مزاح نگار ہیں۔ اس کے باوجود ان کا مزاح لطیف اور دلچسپ ہوتا ہے"

میں اسی لئے زیادہ پڑھنے سے گھبراتا ہوں کہ اس قسم کی تنقید یہاں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ اختصار اور رمز مزا کا حسن ہی نہیں لوازمات ہیں کرشن چندر ایک جملے میں دا بیان کرنے کا فن جانتے تھے لکھتے ہیں ـــ

" چند لمحوں بعد شری بھیکم داس داخل ہوتا ہے چہرے بشرے سے ملنے جلنے کے انداز سے صاف معلو ہوتا ہے کہ لڑکی والا ہے" ایک جگہ اور لکھتے ہیں ان دنوں گیہوں روپیہ کا ۲۰ سیر ملتا تھا ـــ لوگ محبت

سے عشق کرتے تھے راشن کارڈ سے نہیں ،، کرشن جی ہم سے جلد رخصت ہو گئے ۔ گیہوں تو چند دنوں میں ۲۰ روپئے سیر بکنے والا ہے ۔ سوشلزم کی آمد و رفت کے دن ہیں —

آمد کم رفت زیادہ — سوشلزم کے بارے میں بھی کرشن جی کے خیالات سن لیجئے ،، آپ ہیں مضامین کا ایک سلسلہ لکھ دیجئے ۔ پبلک سیکٹر، پرائیویٹ سیکٹر کا استعمال گر مضامین میں سوشلزم ذرا کم ہو پرائیویٹ سیکٹر زیادہ ہو ،،
،، میں سمجھ گیا ،، شری گوکل آنکھ مار کر بولے ۔ مگر کتنا ہو سوشلزم ان میں ، ساٹھ فیصدی ! —
۵۰ فیصدی چلے گا ،، گوکل نے پوچھا ، وہ بھی بہت ہو جائے گا ۔ اتنا سوشلزم ہمارے سیٹھ ہضم نہیں کر پائیں گے ان کے معدے کا بھی خیال رکھئے ۔

کرشن جی کا قلم شاخِ گل تو تھا ہی لیکن اسی سے انھوں نے تلوار کا بھی کام لیا ہے ۔ سیف قلم کی ترکیب انھیں یاد تھی ۔

طنز کے وہ مہاراجہ تھے ۔ ایسی کاٹ کے تسمہ لگا نہ رہنا ان کی تحریر کا خاصہ تھا ، کہتے ہیں ،، ہم کوئی شریف آدمی ہے جو ایسی بے ایمانی کرے گا ، ہم ڈاکٹر نہیں ، ہوٹل کا مالک نہیں ، دکاندار نہیں ، کارخانے دار نہیں ، دفتر کا صاحب نہیں جو ایسی بے ایمانی کرے گا ، ہم تو ماحول چور ہے ، گنڈا ہے ، جیب کترا ہے ۔ ہم لوگ وعدہ کرکے پھر گیا تو دنیا کا دھندہ کیسے چلے گا ،،

کرشن جی بذلہ سنجی میں کس طرح اساتذہ سے کم نہیں تھے ۔ مظہر امام کے نام ایک خط میں انھوں نے البتہ اچھی بات نہیں لکھی لیکن یہ خط ۱۹۵۸ء کا خط ہے لکھتے ہیں ،، آپ نے شادی کر ڈالی ۔ خدا آپ کو خوش رکھے اور شادی کی ہر آفت سے محفوظ رکھے ، عورتوں کے متعلق میرا اب یہ عقیدہ ہے کہ وہ دور سے بہت اچھی معلوم ہوتی ہیں ، میں پھر یاد دلا دوں کہ یہ خط ۱۹۵۸ء کا ہے ۔

پرکاش پنڈت کو ایک خط میں ،، پیارے پرکاش پنڈت فی الحال بمبئی آنے کا خیال گول کرو ۔ یہاں پانی کی اس قدر قلت ہے کہ لوگ بمبئی سے باہر جانے کا ارادہ کر رہے ہیں ۔ گو تم پانی پیتے ہی نہیں مگر پھر بھی منہ کا مزہ بدلنے کیلئے کبھی کبھی تو پی لیتے ہوگے ۔ (ویسے وسکی میں خود بہت پانی ہوتا ہے)

جی چاہتا ہے کہ ان کا ایک بھرپور اقتباس آپ کو ضرور سناؤں ان کا یہ مضمون آل انڈیا بکری بندھ کوئی بیس سال پہلے کا لکھا ہوا ہوگا ۔ لیکن آج بھی ادب میں ایک چیز خاص طور پر تلاش کی جاتی ہے جس کا نام ہے عصری حسیت دیکھے اس اقتباس میں ہے یا نہیں ۔

،، پندرہ دن بعد دہلی میں آل انڈیا بکری بندھ نہایت شاندار طریقے سے منایا گیا ۔ سنا ہے گورکھشا بندھ میں صرف ایکبار گولی چلی ہمارے بندھ میں پولس نے کم از کم تین بار گولی چلائی ۔ گورکھشا بندھ میں صرف سات آدمی مرے تھے ۔ اور ہمارے بندھ میں کم از کم [illegible] آدمی ہلاک ہوئے ، اور دو سو سے اوپر زخمی ہوئے گورکھشا بندھ صرف آٹھ موٹریں جلائی گئیں ، بکری بندھ میں جلائی جانے والی موٹروں کی تعداد بھی ۲۵ سے اوپر تھی ۔ اس کے علاوہ ہم نے پارلیمنٹ سے واپس آتے ہوئے ایک پورا بازار جلا دیا جس زاویہ سے بھی دیکھئے ۔ ہمارا بکری بندھ گورکھشا بندھ سے بڑا اور شاندار تھا ۔

حکومت کو بکری کی حفاظت کرنی ہی پڑی اس بندھ پر میں نے صرف چالیس لاکھ روپئے خرچ کئے ۔ دس لاکھ روپئے صاف بچا لیئے ۔ کیونکہ ایک تو بچت کرنا ہمارے قومی اصول میں داخل ہو چکا ہے دوسرے میں چینی داس کی بھی مدد کرنا چاہتا تھا ۔ چنانچہ میں نے ان دس لاکھ میں سے دس ہزار چینی داس کو بھی دے

دے۔ اپنے ماتحتوں کو خوش رکھنا میری زندگی کا پہلا اصول ہے،،

اس طنز و مزاح سے لبریز مضمون کا ہیرو بکری بندھے کے بعد آل انڈیا بھینس بندھ اور بھیڑ بندھ کے پروجیکٹ بناتا، اور بہ کثرت دولت کماتا ہے لیکن جب یہی ہیرو آدمی رکھشا بندھ بناتا ہے تو اس کا دیوالیہ پٹ جاتا ہے، اور وہ مجبوراً وکالت کے پیشے کی طرف لوٹ جاتا ہے۔

،، جامن کا پیڑ، کرشن جی کا بہت مشہور اور مقبول طنزیہ ہے کیا سرکاری دفتروں میں مروجہ عصری حسیت اس میں موجود نہیں ہے۔

مزاح، طنز اور ظرافت ان سب پر کرشن جی کو قدرت حاصل تھی۔ مزاح کیلئے ان کی شگفتہ مزاجی ظرافت کیلئے ان ذہانت اور مطالعہ اور طنز کے لئے ان کا بے پناہ مشاہدہ یہ ان کے اسلحہ تھے۔ شائستہ اور مہذب مزاح کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں مخلّد او۔ الطبع مزاح کے نمونے بھی ان کے ہاں ملتے ہیں ملنے ہی چاہئیں، کیونکہ وہ بھی پکے از زندہ دلانِ پنجاب تھے چلتے چلتے ان کے ایک دو جملے اور سن لیجیے۔ ۵۲ ہاتھی میں لکھتے ہیں ؛؛ وہ ہندوستان کے رہنماؤں کی طرح ہاتھی کا جسم بڑا اور دماغ چھوٹا ہوتا ہے،،

اور غلیات میں فرماتے ہیں ،، میں اس زمان کار کا انتظار کر رہا ہوں جو لوگ ہاتھوں کی انگلیاں پانی میں تیر کر لیا کریں گے اور فخریہ لہجے میں احباب سے ذکر کریں گے۔ لو بھئی آج ہم نہائے،،

ایک زمانہ تھا جب ہمارے یہاں لوگ گنگا نہالیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی کو اگر کرشن جی مزاح نگار نہیں لگے تو میں سمجھتا ہوں اس میں قصور میرا ہے مجھے پہلے ہی انھیں مطلع کر دینا چاہئے تھا کہ کرشن چندر نہ صرف مزاح نگار ہیں۔ بلکہ ان کے مزاج کا کینواس طول و عرض میں بہت بڑا ہے۔ اور ہوائی قلعے کی ایک جلد بھی انھیں نذر کر دینی چاہئے تھی۔ تاہم میں مانتا ہوں کہ کرشن چندر کو مزاح نگار تسلیم کرنے میں تنقید نگاروں اور قاریوں کی ہچکچاہٹ واجبی ہے اور اس کا جواز صرف یہ ہے کہ کرشن چندر کی شہرت اور مقبولیت ناول نگار اور کہانی کار کی ہے مزاح نگار کی نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کرشن چندر نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان کے پہلوان بننے کے مواقع زیادہ تھے۔ لکھتے ہیں۔

،، کبھی کبھی اس بات کا اندازہ کہ کوئی کیا بن گیا اس بات سے ہوتا ہے کہ وہ کیا نہ بن سکا۔ بچپن میں مجھے پہلوانی کا شوق تھا۔ میرا بچپن کشمیر کے دیہات میں گذرا تنو میں سے نوّے میرے دوست مسلمان لڑکے تھے۔ ان سب کو میری طرح پہلوانی کا شوق تھا۔

اس زمانے میں مسلمان پہلوان اپنے ماتھے پر چاند تارہ گدواتے تھے ،، آگے لکھتے ہیں۔

ہم لوگ اسکول سے بھاگ کر گودنے والے کے پاس پہنچے ہم بہت سے لڑکے تھے۔ اکثر بچوں نے اپنے نام کے دو دو حرف اپنی باہنوں پر گدوا لئے، کچھ نے ماتھے پر چاند تارہ۔

ہم دونوں بھائی امیر گھر سے آئے تھے۔ ہم نے پورا نام گدوایا۔ کرشن چندر — مہندر ناتھ — پورا نام مگر جب پورے نام گد چکے تو معلوم ہوا پیسے بھی ختم ہو چکے ہیں۔ ماتھے پر چاند تارہ گدوانے کے لئے پیسے نہیں ہیں اس روز کس قدر رونا آیا ہے میں آپ کو بتا نہیں سکتا لیکن اتنا ضرور بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس دن ماتھے پر چاند تارہ گدوا لیتا تو عین ممکن ہے میں آج ایک پہلوان ہوتا۔ کہانی کار نہیں ہوتا،،

اب میں کیا عرض کروں مانا کہ کرشن جی رستم ہند دارا سنگھ نہیں بن سکے لیکن ادب کے رستم تو بن ہی گئے اور وہ اپنے ماتھے پر چاند تارہ نہیں گدوا سکے تو کیا ہوا وہ خود ادب کی پیشانی پہ چاند بن کر چمکے۔

ان کی تحریر کی چاندنی کا جس نے بھی لطف اٹھایا اس نے یہی کہا ہوگا — نظم حسرت میں بھی مزا نہ رہا۔

وینکٹیش ماڈگلکر

ترجمہ: سلام بن رزاق
۹/۱۱، ایل۔ آئی۔ جی کالونی، کرلا (ویسٹ)، بمبئی ۷۰

دوپہر ہوئی۔ مدرسے کے سامنے ٹنگے پیتل کے گھنٹے پر ایک لڑکے نے چوبی ہتوڑے سے ضرب لگائی۔ ٹن۔ ٹن۔ ٹن کی گونج گاؤں میں دور تک پھیلتی چلی گئی۔

ننھا ونود کتے کے پلّے سے کھیلنے میں ایسا مگن تھا کہ اس نے گھنٹی کی آواز نہیں سنی۔ وہ لیٹے لیٹے چلائی۔ ونود گھنٹی ہوگئی دیکھو، مدرسہ نہیں جائے گا؟" پہلے تو ونود نے اس کی آواز سنی ان سنی کر دیا۔ مگر جب اس نے متواتر تین چار دفعہ ہانک لگائی تو وہ بڑی بے دلی سے اٹھا۔ پیر پٹکتا اور ہاتھ نچاتا ماں کے سامنے آکر چلایا، "میرا بستہ کہاں ہے؟ تختی، کتاب، پنسل کہاں ہے؟"

ماں اٹھی، ونود ابھی بچہ ہے ضدی اور شریر، دن بھر ناک میں دم کئے رہتا ہے پڑھ لکھ کر ایک دن بڑا آدمی بنے گا اور اس کے سارے کشٹ دور ہو جائیں گے۔ بیچاری اسی توقع پر اس کی ذرا ذرا سی بات کا خیال رکھتی ہے۔

تختی کھونٹی سے ٹنگی تھی۔ کتاب کے اوراق الگ ہوتے کو تھے ایک کونے میں پڑی تھی۔ وہیں پنسل بھی تھی اس نے تینوں چیزیں بستے میں ٹھونسیں اور بستہ ونود کی طرف بڑھا دیا۔ تبھی اس کی نظر کیچڑ سنے اس کے ہاتھوں پر پڑی، تیوروں بل ڈال کر بولی "ونود تیرے ہاتھ کتنے گندے ہیں، چل پہلے ہاتھ دھو کر آ، گندہ کہیں کا۔"

"اونہہ۔" ونود اور بھی چڑ گیا۔ پسینے سے گیلے ہو جائیں گے تو ذرا سا مسل دوں گا سارا میل نکل جائے گا یہ ماں تو بس ــــ وہ زور زور سے پاؤں پٹکتا آنگن میں گیا۔ صاف پانی کے بھرے ہوئے ٹب میں اس نے دونوں ہاتھ ڈبو دیے۔ پھر انھیں نیکر سے پونچھتا دوبارہ ماں کے سامنے آکر چلایا۔ "اور میری ٹوپی ــ"

پھر ڈھونڈا ڈھونڈ شروع ہوگئی کمرے کے چاروں کونے، رسوئی، آنگن، کھونٹیوں کے علاوہ تمام کونے کھدرے کھنگال ڈالے مگر بے سود۔ آخر کافی پریشانی کے بعد ٹوپی سونے کے کمرے میں بورے کے نیچے پڑی مل گئی۔ ونود ٹوپی کو جھٹک کر سر پر جماتا اور تختی گھماتا پٹکتا ہوا باہر نکلا باہر دھوپ پھیل چکی تھی۔ مکان کے سائے سمٹنے لگے تھے ونود دھوپ سے بچتا دیواروں کے سائے سائے چلنے لگا۔ اچانک اسے سامنے سے حمزہ اور اس کا چھوٹا بھائی عباس آتے دکھائی دیے۔ لال گوندڑے کی ٹوپی پہنے، دونوں ہاتھوں سے سر پر رکھی تختی کتابیں تھامے

ہ لنگڑ کھیلتا چل رہا تھا، اس کے پیچھے دیوار سے
نکاسی کی تنگ نالی کے دونوں کناروں پر اپنے پیر
ئے عباس پھدک پھدک کر چلنے کی کوشش کر رہا تھا
ں ہاتھ کی دو نوں انگلیاں ہونٹوں میں دبا کر دنود
زور سے سیٹی بجائی، حمزہ، عباس چونک کر مڑے۔
ساتھی کو متوجہ کرنے کا یہ طریقہ مدرسے کے بچوں
عام تھا۔ حمزہ رک گیا۔ عباس بھی رک گیا۔ دنود ان
قریب پہونچ چکا تھا۔
"حمزہ آج گرو جی نے حساب کرنے کو کہا تھا۔ تو نے
ہ!"
حمزہ نے نفی میں گردن ہلائی۔ پھر تنک کر بولا۔
"اگر گرو جی نے مجھے مارا تو میں ابا سے جا کر کہہ دونگا
وں نے ہی میرے کو بھینس چرانے کو بھیجا تھا"
"میں نے بھی نہیں کئے۔ میرے کو پھوکٹ میں چھڑی
انی پڑے گی"، دنود نے منہ لٹکا کر کہا۔
"ننھا عباس تختی بجاتا ہوا بیچ میں بول پڑا۔
"اپنے کو تو حساب نہیں ہے۔"
دنود نے اسے چپ کرایا۔ "تو ابھی چھوٹا ہے تیرے
کیا معلوم حساب کیا ہوتا ہے"
تھوڑی دیر تک تینوں کچھ سوچتے رہے۔ عباس
یض کے کنارے کو منہ میں ڈالے چوسنے لگا، حمزہ
تھیلی کی پشت سے اپنی چپٹی ناک کو بار بار مسلنے لگا دنود
فن کرتے کرتے اچانک بول پڑا۔
"اپن آج اسکول نہیں جائینگے۔"
یہ تجویز سب کو پسند آئی — "الف ب کی تختی" استاد جی
کی آئی کمبختی"
حمزہ نے عباس سے تاکید کی کہ وہ گھر پر چغلی نہیں
ے گا۔ پھر تینوں کھیتوں میں سے مٹکتے دبکتے گاؤں
کے باہر نالے پر پہنچ گئے۔ جامن، بیر، املی اور کروندے
کے درختوں کے گھنے جھنڈ کے درمیان صاف اور سفید
ل بہہ رہا تھا تینوں تھوڑی دیر تک اس کی کل کل
سنتے رہے، کائی، کرنجی اور املی کی خوشبو سونگھتے
ہوئے بچھڑوں کی طرح ریت میں لوٹیں لگانے
لگے۔ حمزہ بولا۔
"اپنی تختیاں بالو میں چھپا دو۔ گھر جاتے وقت
لے لیں گے۔"
دنود نے جھٹ دونوں ہاتھوں سے بالو کھینچ
کر ایک چھوٹا سا گڈھا بنایا اس میں سب کی تختی کتاب
دبا دینے کے بعد بالو سے گڈھے کو بھر دیا۔ بطور نشانی
ایک پتھر اس پر رکھ کر تینوں ہاتھ جھاڑتے ہوئے
اطمینان سے اٹھ کھڑے ہوئے۔
دوپہر کی دھوپ نالے کے شفاف پانی پر شیشے کے
ٹکڑوں کی طرح بکھری ہوئی تھی۔ پانی میں ننھی ننھی مچھلیاں
تیر رہی تھیں۔ جو کبھی تیر کی طرح سوں سے آگے نکل جاتیں تو
کبھی اپنی نازک دمیں لٹ لٹ ہلاتی ایک ہی جگہ معلق سی ہو
کر تیرنے لگتیں۔
حمزہ جھٹ پجامہ کمر میں کھوستا اور آستین اوپر چڑھاتا
ہوا بولا۔
"میں تو مچھلیاں پکڑوں گا۔"
دنود اور عباس نالے کے کنارے کھڑے تماشا دیکھنے
لگے ایک چھوٹی سی مچھلی سامنے گھٹنوں گھٹنوں پانی میں خراماں
خراماں تیر رہی تھی۔ اس کا رنگ نالے کی تہہ میں بچھی بالو کی طرح
ہلکا، زرد اور صاف تھا۔ حمزہ بے چاپ ایک ایک قدم
اٹھاتا ہوا اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مچھلی کے قریب پہنچ
کر وہ آہستہ سے نیچے جھکا ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے
میں پھنسا کر ہاتھ آہستہ سے پانی کی سطح پر ٹیک دیئے۔ دنود
اور عباس سانس روکے آنکھیں پھاڑے دیکھ رہے
تھے۔ مچھلی اب بھی اسی جگہ ٹھہری ہوئی اپنی نازک سی دم
ہلا رہی تھی۔ اچانک حمزہ پھرتی سے مچھلی پر جھپٹا۔ دنود
کے پیٹ میں خلا سا پیدا ہو گیا۔ عباس کے حلق میں کوئی چیز
اٹک گئی۔ حمزہ دونوں مٹھیوں میں بالو سمیٹتا نالے کے باہر
آیا۔ اور کنارے پر مٹھیاں کھول دیں۔
"دھت — کچھ تو نہیں تھا۔"
نالے کی طرف انگلی اٹھا کر دنود چلایا "ارے اوہ

دیکھو اس پتھر کے پاس۔"
مچھلی ایک بڑے سے پتھر کی آڑ میں چھپ گئی تھی۔
حمزہ لپکا۔ عباس اور ونود بھی نالے کے کنارے
اس کے پیچھے بھاگے۔ حمزہ بولا "مچھلیاں اس نیلی کائی
کے نیچے چھپی رہتی ہیں۔ اوپر سے اچانک کائی مٹھیوں
میں بھر کر باہر سوکھی بالو پر ڈال دو تو اس میں دو چار
مچھلیاں ضرور مل جاتی ہیں۔ تڑپتی، پھڑکتی ہوئیں۔" پھر
اس نے کچھ اس طرح لپک لپک کر مچھلیوں کے تڑپنے
پھڑکنے کی اداکاری کی کہ ننھا عباس کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ حمزہ
نے گھور کر دیکھنے لگا۔ اس نے فوراً منہ پر ہاتھ رکھ کر
ہنسی کی آواز دبائی کہ کہیں اس کی آواز سن کر مچھلیاں
چوکس نہ ہو جائیں۔

ونود بولا۔" تو پھر چلو اوپر کی طرف چلیں۔ ادھر
کائی ہوگی۔"

تینوں نالے کے چڑھاؤ کی سمت چل پڑے۔ پیروں
سے پانی میں چھپاکے پیدا کرتے، پانی میں ڈوبی چٹانوں
کے سوراخوں میں جھانکتے اور پانی میں آبی جھاڑیاں
سرکاتے وہ لوگ اوپر کی طرف چلتے رہے۔ آخر حمزہ آٹھ
دس چھوٹی چھوٹی مچھلیاں پکڑنے میں کامیاب ہو گیا۔
جوں ہی ایک آدھ مچھلی اس کی گرفت میں آتی اسے خشک
بالو پر زور زور سے پٹکتا۔ جب مچھلی ٹھنڈی ہو
جاتی تو اسے اپنے کرتے کی نئی جھولی میں ڈال لیتا۔ جو
اس نے اس مقصد کے تحت کرتے کے اگلے حصے میں گانٹھ
مار کر بنائی تھی۔

اپنے سرخ ننھے ننھے منہ بند کئے وہ ساری مچھلیاں
اس جھولی میں بے حس پڑی تھیں۔ حمزہ ونود کو بتانے
لگا۔" دیکھو! یہ کالی پیٹھ والی ڈوکرا ہے اور یہ مونچھوں
والا جھینگا ہے۔"

ونود انھیں چھوتا پھر منہ بنا کر کہتا "پتہ نہیں تم
لوگ انھیں کیسے کھاتے ہو!"
ارے تیرے کو کیا معلوم ان کا مزہ۔ میں اب ان
کے پیٹ پھاڑ کر ان کو صاف کروں گا۔ ان کے پنکھ
گلپھڑے اور دم کاٹ کر پھینک دوں گا۔ پھر توے پر
بھون کر چٹنی اور نمک سے کھاؤں گا۔"
ونود کے منہ میں پانی بھر آیا۔ عباس دوبارہ
قمیض کے کنارے کو منہ میں دبائے چوسنے لگا۔ جلد
ہی تینوں بچے مچھلیوں کے شکار سے اکتا گئے۔ حمزہ نے
ونود کی گاندھی ٹوپی میں ساری مچھلیاں انڈیل دیں۔
اور اپنے ازار بند سے باندھ کر لے نیفے میں اڑستا ہوا
"چلو جنگل میں جائیں۔ ادھر فاختہ کے انڈے بہت ملتے
ہیں۔"

نالے کے ایک طرف خاردار جنگل بہت دور تک پھیلا
ہوا تھا۔ کیکر، بیرن، جامن، کروندے، آم اور دوسرے
قسم قسم کے درختوں سے جنگل بھرا ہوا تھا، گاؤں
کی عورتیں ایندھن جمع کرنے کی غرض سے وہاں آتی
تھیں۔ بارا موشی اور مانگ لوگ شہد کے چھتوں
کی تلاش میں وہاں اکثر آتے رہتے تھے۔ دھنگر اور
مویشی چرانے والے گڈریوں کے چھوکرے، جامنوں
کے موسم میں جنگل میں گھس جاتے اور دن بھر جامنیں
کھاتے اپنے مویشی چراتے پھرتے۔ تینوں بچے کانٹے
دار جھاڑیوں سے بچتے، خشک پتوں کو روندتے۔
جنگل میں داخل ہوئے۔
کیکر کے درخت پر پر پھیلائے بیٹھا بھار ڈا شور
مچانے لگا۔
بیٹ کے نیچے انڈے لئے بیٹھی فاختہ اپنی چھوٹی
گول آنکھیں جلدی جلدی جھپکنے لگی۔
قرب و جوار کے پرندے گردن گھما گھما کر آہٹ
لینے لگے۔
ایک بیر کے درخت کی اونچی، شاخ پر بیٹھی پکے
بیر کھانے والی ایک چیل دم ہلاتی ہوئی اڑی اور اوپر
آسمان میں الٹی ہو کر چھپانے لگی۔ گھونسلے میں بیٹھے
اس کے تینوں بچے ایک دم سہم گئے۔
ایک درخت کی طرف ہاتھ اٹھا کر ونود چیخا۔

"ارے وہ رہا فاختہ کا گھونسلا"

حمزہ نے ادھر دیکھا۔ "ابے چل! وہ گھونسلا فاختہ کا نہیں۔ جنگلی چڑیا کا ہے۔"

"جنگلی چڑیا؟"

"ہاں جنگلی چڑیا۔ اس کی پیٹھ تانبے کے رنگ کی ہوتی ہے۔ اور اس کے گلے کے نیچے ہوتا ہے نیلے رنگ کا چھوٹا سا دھبہ۔"

"تو کیا پہچان لیتا ہے رے یہ سب؟"

"دھت تیری کی، اس میں کون سی بڑی بات ہے فاختہ کا گھونسلا لمبی لمبی تیلیوں سے بنا ہوتا ہے۔ اور یہ گھونسلا نرم نرم گھاس کے تنکوں سے بنا ہوتا ہے"

حمزہ بلی کی طرح دبکتا ہوا درخت کے اوپر پہنچا اور گھونسلے میں ہاتھ ڈالنا ہی چاہتا تھا کہ اس میں سے ایک ننھی سی چڑیا پھڑ پھڑا کر اڑی اور درخت کی ایک اونچی شاخ پر بیٹھ کر اپنی نازک دم ہلاتی چوں چوں کرنے لگی۔ اس کا رنگ واقعی تانبے جیسا سرخی مائل تھا۔

"حمزہ کتنے انڈے ہیں؟" عباس نے بے چینی سے پوچھا تھا۔

"ایک بھی نہیں ہے۔ ابھی تو اس نے گھونسلا بنانا شروع کیا ہے۔ جب پورا گھونسلا بن جائے گا۔ تب وہ انڈے دیگی"

عباس انڈے دیکھنے کیلئے بہت بیتاب تھا۔ آخر ایک درخت پر فاختہ کا گھونسلا دکھائی دیا۔ بیری کے سوکھے سے درخت پر دو شاخوں کے بیچ میں بنے اس گھونسلے کے پہلو میں پھیکے جامنی رنگ کی فاختہ بیٹھی تھی۔

"عباس!" حمزہ چیخا!

"دیکھ یہ پنجابی فاختہ ہے" اپنی دیسی فاختہ سے بڑی ہوتی ہے"

ونود، عباس حمزہ کی معلومات سے کافی متاثر تھے۔ حمزہ ونود سے بولا۔

"چل اس کے انڈے کو اتار!"

ونود منمنایا۔" میں.... مجھے ٹھیک سے جھاڑ پر چڑھنا نہیں آتا۔"

"چل آجائے گا!" حمزہ اس کی بانہہ پکڑ کر کھینچتا ہوا بولا، ونود نے ایک پتھر اٹھایا اور گھونسلے کی طرف اچھالا، فاختہ پھر سے اڑ گئی۔ ونود بڑی مشکل سے درخت پر چڑھ پایا، بیری کے کانٹوں نے اس کی ہتھیلیوں، کہنیوں اور رانوں کو چھیل دیا مگر اوپر پہنچ کر اس نے دیکھا کہ تیلیوں سے بنے اس کے گھونسلے میں دو انڈے تھے۔ مٹی سے سفید دودھ جیسے۔ ونود نے بے حد آہستگی سے انھیں اتار لیا۔ اور نیچے اترنے لگا۔ انڈوں کو سنبھالتے ہوئے اترنا بڑا مشکل کام تھا۔ اس کا کرتا کھونچ لگ کر پھٹ گیا۔ بائیں ہاتھ کی کہنی بری طرح چھیل گئی۔ مگر وہ انڈے کو صحیح سلامت لئے نیچے اتر آیا۔ عباس نے دونوں انڈے اپنی قمیض کے جیب میں بڑی احتیاط سے رکھ لئے۔

اسی طرح کبھی فاختہ کے گھونسلے، جھانکتے، کبھی چیلوں کے پیچھے چلاتے بھاگتے اور کبھی ببول کے درخت سے سفید پیدا گوند جمع کرنے تینوں جنگل میں بڑی دیر تک گھومتے بھٹکتے رہے۔ حمزہ عباس سے کہہ رہا ہے۔

"عباس! گوند سنبھال کر رکھنا، بنیے کو دیں گے تو دس بیس پیسے ملیں گے۔"

ننھا عباس بائیں آستین سے اپنی بہتی ناک پونچھتا ہوا چہک کر بولا،

"ہاں، ہاں عرس کے دن اپن ایک ایک سیٹی لیں گے نہیں تو تل گڑ کی ریوڑیاں کھائیں گے۔"

عرس کی گہما گہمی یاد کر کے ونود بار بار آنکھیں جھپکانے لگا عباس ریوڑیوں کے تصور میں اپنے سیدھے ہاتھ کا انگوٹھا چوس رہا تھا۔

درختوں کے سائے سے گھرے، طرح طرح کے پھولوں اور پھلوں کی خوشبو سے بھرے اس جنگل میں تینوں خوب بھٹکتے رہے۔

درمیان میں رک رک کر ونود اور عباس حمزہ سے طرح طرح کے سوالات پوچھتے۔ ننھا عباس کسی درخت کی طرف انگلی اٹھا کر پوچھتا۔

"حمزہ! یہ کون سا جھاڑ ہے؟"

"دیو ببول" حمزہ بزرگانہ متانت سے جواب دیتا

ٹھنگنا اور پھیلا ہوا۔ اس کے کانٹے نکیلے اور لمبے ہوتے ہیں۔"

کبھی ونود پوچھتا: "حمزہ! حمزہ رام کاٹھی کا پیڑ کونسا ہے؟" اس نے یہ نام ریوڑ چرانے والے گڈریے چھوکروں سے اکثر سنا تھا۔

"وہ بھی ببول کا پیڑ ہوتا ہے۔ مگر اس میں کانٹے نہیں ہوتے۔ کھجور کی طرح سیدھا ہوتا ہے۔ مویشی اس کے پتے بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔

ونود نے پہلی دفعہ اس جنگل میں عجیب و غریب چیزیں دیکھیں۔ خوبصورت پرندے، سفید چوہے، ہرے چمکیلے پروں کے پھدکنے والے ٹڈے، جنھیں پکڑ کر ماچس میں قید کیا جا سکتا تھا اور جو ببول کے پتے کھاتے تھے۔ تھوڑے دنوں میں وہ انڈے بھی دینے لگتے۔ سرخ رنگ کے پھل، کوئل اور فاختہ کے گھونسلے، شہد کے چھتے، ایسی کتنی ہی عجیب و غریب چیزیں، عجیب اور دلچسپ، چلتے چلتے عباس کے تلوے میں کھچ سے ایک کانٹا گھس گیا۔ عباس ایک ہاتھ سے پاؤں پکڑے رونے لگا۔ حمزہ نے اسے ایک بڑے پتھر پر بٹھا دیا۔ پھر ببول کا ایک لمبا سا کانٹا لیا اور اس سے اس کے تلوے میں گڑے کانٹے کو کریدنے لگا۔ کانٹا کافی گہرا دھنس کر اندر ہی ٹوٹ گیا تھا۔ حمزہ نے روئی کی جھاڑی، ڈھونڈ نکالی اور جلدی جلدی دو چار پتے توڑے۔ ڈنٹھلوں سے گاڑھا، گاڑھا سفید دودھ نکل آیا۔ انگلی سے اس نے عباس کے زخم پر دودھ لگا دیا۔ عباس اب بھی ہچکیاں لے رہا تھا حمزہ اسے تسلی دینے لگا "کل صبح تک ٹوٹا ہوا کانٹا خود ہی اوپر آجائے گا۔ رومت، چپ ہو جا۔"

سورج مغرب کی طرف جھک رہا تھا ہوا چلنے لگی، پکی فصل اور کالی مٹی کی مست کر دینے والی خوشبو نتھنوں سے ٹکرائی۔ پرندے اپنے گھونسلوں کو لوٹ رہے تھے۔ اور دھیرے دھیرے ان کے شور سے جنگل گونجنے لگا تھا۔ اچانک حمزہ بولا،

"چلو شام ہونے والی ہے۔ گھر چلیں"

تینوں گاؤں کی طرف مڑے اور نالے کے کنارے چلنے لگے۔ عباس کی جیب میں رکھے ہوئے انڈے کب کے ٹوٹ چکے تھے۔ کرتے پر سفید زرد دھبے خشک ہو کر سخت ہو گئے تھے۔ نالے کے کنارے بیٹھ کر عباس کا کرتا دھویا گیا۔ بھوک لگ رہی تھی۔ حمزہ نے خشک گوند کا ایک ٹکڑا دونوں کو دیا اور ایک ٹکڑا خود بھی منہ میں ڈال لیا گوند مزے دار تھا۔ مگر اسے چبانا آسان نہیں تھا ان کی داڑھیں اوپر تک چپکنے لگیں۔

جب وہ گاؤں میں داخل ہوئے آسمان پر شفق انار کی طرح کھل گئی تھی۔ بکریوں اور بھیڑوں کے ریوڑ منمناتے ہوئے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ ان کے کھروں سے اڑنے والی دھول نے گاؤں کی فضا کو گرد آلود کر دیا تھا۔ سب سے پہلے اپنے بستے کو کھود نکالے جو نالے کے کنارے ریت میں۔ دبا کر رکھے تھے پھر تینوں چھپتے چھپاتے اپنے گھروں کی طرف روانہ ہو گئے۔

ونود کی ماں دروازے پر بیٹھی قندیل کی چمنی پونچھ رہی تھی ونود پر نظر پڑتے ہی بولی۔

"اتنی دیر کیوں لگا دی رے۔ منہ دیکھ کیسا بھبوکا ہو رہا ہے۔ دھوپ میں بھٹک رہا تھا نا؟"

ونود چپ رہا۔ وہ تصور میں اب بھی جنگل ہی میں بھٹک رہا تھا۔ چھپاک چھپاک پانی میں پاؤں مار رہا تھا مچھلیاں پکڑ رہا تھا۔ پرندوں کے انڈے جمع کر رہا تھا گوند نکال رہا تھا۔

ماں بے چاری سمجھی شاید گروجی نے آج بچوں کو خوب کھیل کھلائے ہیں۔ تبھی تو ونود ایسے لوٹتا ہے اور تھکا تھکا سا دکھائی دے رہا ہے۔ اور پھر اس خیال سے کہ اس کا کمسن بچہ بلا ناغہ مدرسہ جاتا ہے اس کا دل خوشی اور اطمینان سے لبریز ہو گیا۔

• مشتاق مومن

زبان شاعر کے لئے بند ڈبے کا گوشت نہیں بلکہ خون میں نہایا ہوا شکار ہے۔ جسے دیکھ کر، چھو کر، چکھ کر، سونگھ کر شاعر کے پانچوں حواس جاگ اٹھتے ہیں۔ زبان ایک نٹ کھٹ اور ضدی میڈیم ہے۔ اسے رام کرنے میں شاعر کا سحر اس کی وحشت کھونے میں اس کا اعجاز رہا ہے۔ اسی لئے زبان کے رخسار سیمیں پر شاعر کے بوسوں کے نشانات ہی نہیں بلکہ ناخنوں کی خراشیں بھی ہوتی ہیں۔

جب بھی ندا فاضلی سے رسالوں اور کتابوں کے صفحات پر ملاقات ہو وارث علوی کے محولہ بالا جملے ضرور یاد آتے ہیں۔ اور ایسا گمان ہوتا ہے کہ ناقد نے شاعر کا سحر، اعجاز زبان کے رخسار سیمیں پر شاعر کے بوسوں کے نشانات اور ناخنوں کی خراشیں جیسی تراکیب ندا فاضلی کی شاعری کیلئے ہی کہی ہیں۔

ندا فاضلی کا پہلا شعری مجموعہ، لفظوں کا پل، بیورائٹرس پبلی کیشنز نے ۱۹۶۹ء میں شائع کیا تھا۔ کتاب کے اولین صفحات پر ندا فاضلی نے لکھا تھا "۶۵ء کی بات ہے۔ میں بھوپال سے گوالیار واپس آیا تھا، رات کا وقت تھا۔ میں حسب معمول اپنی اٹیچی ہاتھ میں لئے اس برسوں کی جانی پہچانی گلی میں مڑ گیا۔ جہاں املی کی گھنی چھاؤں تلے میرا گھر تھا۔ میں نے گلی میں گھستے ہوئے تو اپنے آپ کو دیکھا تھا۔ دروازہ کھٹکھٹانے تک بھی میں اپنے آپ کو دیکھ رہا تھا۔ لیکن اس کے بعد نہ جانے کیا ہوا۔ اٹیچی ہاتھ میں لئے سر جھکائے واپس آیا تھا۔ وہ میں نہیں تھا۔ کوئی اور تھا۔ مجھ جیسا ہی۔۔۔ وہ بالکل اکیلا تھا۔ اس کا نہ کوئی گھر تھا۔ نہ شہر تھا۔ اور نہ رشتہ دار تھے۔ کاغذ پر نہ جانے لکیریں کب بدلی تھیں۔ لیکن بٹی ہوئی سرحدیں اس پوری رات بجلی کے ایک کھمبے سے دوسرے کھمبے تک شہر کے ہر گھر کو آگ لگاتی پھر رہی تھیں۔۔ وہ اکیلا آدمی آج بھی اسی طرح اکیلا۔ اکیلا بھٹک رہا ہے۔ رات کے بھیانک اندھیروں میں جس گھر کو اس سے چھین لیا گیا تھا۔ اسے وہ آج تک ڈھونڈ رہا ہے یہ بے منزل کی تلاش ہی۔ اس کی منزل ہے۔"

ندا فاضلی کے یہ الفاظ معمولی بھی نہیں۔ اور سرکش بھی نہیں

سرسری تم جہان سے گذرے
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

مگر ان میں انسان کا دل دھڑکتا ہے۔ جو اپنے ماحول، تہذیب گھر، رشتہ دار، اور قصبہ کی باتیں کر رہا ہے۔ یاد کر رہا ہے۔ ان بیتے دنوں کو جو بیت گئے۔ جو دن بیت گئے کتنے اچھے تھے۔ ۱۹۶۹ء لفظوں کا پل سے ۱۹۸۶ء تک مورناچ اور آنکھ اور

خواب کے درمیان شاعر کی زندگی، جدوجہد، ٹوٹنا اور ٹوٹ
کر پھر جڑنا، لمحہ لمحہ زندگی، پل دو پل کی موت، ماہ و سال کی
بھٹی میں سلگتا ہوا بے چین دل، چھمبور سے کلا نگر باندرہ، نور
محمدی ہوٹل کے تیز لال مرچ کا سالن اور ڈان پاڑہ میں سجی
سجائی دکان یا خوبصورت فلیٹ اور اس فلیٹ میں۔

میری عزت کو شرافت کا ابھی نام نہ دے
وقت بدلا تو تری رائے بدل جائے گی!

ندا نے اب تک کی زندگی میں کیا کھویا، کیا پایا۔ اس کا عکس میں
ان کے تینوں شعری مجموعے میں مکمل طور پر کرتا دکھائی دیتا ہے
ہماری تشنگی بھی ہو جاتی ہے کہ اپنے خیالات، جذبات، تاثرات
اور تعصبات، اور اپنے آدرشوں کے اظہار کے لئے اس نے
شاعری کو میڈیم کیوں بنایا۔ شاعروں کی بھیڑ میں اس نے
اپنی الگ مضارع کیوں بنائی۔ اس کی کوئی شناخت ہے
بھی یا نہیں۔

کیا ندا فاضلی کو چھنیا ہوا گھر، چھینی ہوئی تاریخ، اور
تہذیب دوست و احباب اور رشتہ دار ماں۔ باپ، بھائی
بہن، مل گئے۔؟ اس کا پورا جواب ہمیں ان کی شاعری میں
شاید ہی مل سکے کیونکہ ان کی شاعری تاثرات و تعصبات کا
زیر عکس ہیں۔ اور یہ مکمل نہیں۔ جو کچھ وہ کہنا چاہتے ہیں اس کے
اظہار کے لئے کیا انہیں الفاظ مل گئے۔؟ جو کچھ ان کے دل و
دماغ میں تھا۔ کیا سب صفحۂ قرطاس پر منتقل ہو سکا؟

شاید ہاں
شاید نہیں

بہت پہلے میر انیس نے اپنی قادر الکلامی کا دعویٰ یوں کیا تھا۔
ندا بنجارہ زندگی جینے کا مدعی ضرور رہا ہے۔

جیو جینا سہل نہ جانو بہت بڑی فنکاری ہے

تو چلئے ندا فاضلی سے ملاقات کرتے سب سے پہلے ان کے گھر
جاتے ہیں۔

جب بھی گھر سے باہر جاؤ
تو کوشش کرو۔ جلدی لوٹ آؤ
جو کئی دن سے غائب رہ کر
واپس آتا ہے

وہ زندگی بھر پچھتاتا ہے
گھر اپنی جگہ چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔

(موذناچ کی پہلی نظم)

تم جہاں بھی رہو
اسے گھر کی طرح سجاتے رہو۔
گلدان میں پھول لگاتے رہو۔
دیواروں پر رنگ چڑھاتے رہو۔
سجے بنے گھر میں ہاتھ پاؤں اگ آتے ہیں

پھر تم کہیں بھی جاؤ۔
بھلے ہی اپنے آپ کو بھول جاؤ
تمہارا گھر
تمہیں ڈھونڈ کر واپس لے آئے گا۔

(لگاؤ)

دور کا ستارہ

بیس برسوں بعد
اپنے گھر کو تلاش کرتا ہوں
اپنے گھر پہنچا۔
لیکن میرے گھر میں
اب میرا گھر نہیں تھا
مجھے کافی دیر ہو گئی تھی۔
دیر ہو جانے پر
ہر کھویا ہوا گھر
آسمان کا ستارہ بن جاتا ہے
جو دور سے بلاتا ہے۔
لیکن پاس نہیں آتا ہے
نہ جانے کون سے لمحے کی بددعا ہے یہ
قریب گھر کے رہوں اور گھر نہ جاؤں میں

ڈی ونچی نے یہ بات کس قدر پتے کی کہی ہے کہ ہمارے تجربات نہیں
ہمارے فیصلے جھوٹے ہوا کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ فیصلہ اسی
وقت جھوٹا ہوگا جب کہ ہم محسوسات کو شریک عقل نہ کریں ڈی
ونچی کی یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہئے کہ آرٹ کی بنیاد تجربات و محسوسات

پر ہے۔ نہ کہ منقولات اور معقولات پر۔ ندا کے یہاں خیال۔ اور سوچ کا کوئی ایک لہر نہیں ہے۔ جس پر انگلی رکھ کر کہہ سکیں۔ یہی خالص اور ذہن پسند رنگ ہے۔ ان کا کسی خیال اور احساس کو وہ بیان کرتے ہیں۔ اور پھر اس کو رد کرنے میں کوئی رعایت بھی نہیں کرتے۔ اور پھر اپنا تجربہ کرتے ہیں۔

میں نہیں سمجھ پایا آج تک اس الجھن کو
جسم کی حرارت تھی یا تیری محبت تھی
کیسے ہو کہ لیلیٰ ہو، بہر ہو کر اکٹھا ہو
بات صرف اتنی ہے آدمی کو فرصت تھی
(لفظوں کا پل سے)

.... کچھ دن خطوں میں آنسو بہے شور و غل ہوا۔
تم زیر لب کے سو میں
میں الجھن سے کٹ گیا۔
پھر یوں ہوا کہ دھوپ کھیلی ابر چھٹ گیا۔
میں نے وطن سے کوسوں پرے گھر بسا لیا
تم نے پڑوس میں نیا بھائی بنا لیا

ایک خط

تمہارے نام کی خوشبو سے جب موسم سنورتے ہیں
فرشتے جب تمہارے رات دن لے کر اترتے ہیں
تمہیں پانے کی حسرت تھی
مجھے تم سے محبت تھی
تمہارے خواب جب آکاش کے تاروں میں روشن تھے
کھلی انگڑائیوں میں دھوپ تھی آنچل میں ساون تھے
بہت سوں سے رقابت
مجھے تم سے محبت تھی
تمہارا خط ملا۔
میں یاد ہوں تم کو عنایت ہے
بدلتے وقت کا لیکن ہر اک دل پہ حکومت ہے۔
وہ پہلے کی حقیقت تھی
مجھے تم سے محبت تھی۔

وہ لڑکی

وہ لڑکی یاد آتی ہے
جو ہونٹوں سے نہیں پورے بدن سے بات کرتی تھی
سمٹتے وقت بھی چاروں دشاؤں میں بکھرتی تھی
وہ لڑکی یاد آتی ہے
وہ لڑکی اب نہ جانے کس کے بستر کی کرن ہوگی۔
سورج کو جو چھینے بیں لئے مرغا کھڑا ہوگا
کھڑکی کے پردے کھینچ دے رات ہو گئی

نظم ایک لڑکی ان مصرعوں پر ختم ہوتی ہے

یہ ساری چیزیں یا کہ جیسے مجھ میں شامل ہیں
مرے غموں میں مری ہر خوشی میں شامل ہیں

ابھی تک پھول کی مانند ہوگی یا چمن ہوگی

میں چاہتا ہوں کہ وہ بھی یوں ہی گذرتی رہے
اور وناز سے لڑکے کو پیار کرتی رہے

مذہبی اور نسلی نفرت کا لاوا ریلوے انجن کے بوائلر کی طرح اندر ہی اندر کھولتا رہتا ہے۔ جو موقع پاتے ہی پھٹ پڑتا ہے۔ اور اپنے ساتھ سب کچھ بہا کرلے جاتا ہے۔ علاقائی تعصب، اور فرقہ وارانہ فسادآج طرزِ زندگی بن گئے ہیں۔ آج فسادات اور جنگ پر جو نظمیں کہی جا رہی ہیں۔ ان میں ندا کی نظمیں ایک الگ انداز رکھتی ہیں۔ اور کئی لحاظ سے وہ ان نظموں اور افسانوں سے الگ ہیں جو تقسیم وطن کے بعد لکھی گئی تھیں ندا کا موضوع چاہے فساد ہو یا جنگ یا دو ملکوں کے لیں دین ہر ان کا ایک الگ انداز اور الگ treatment ہے۔ یہ نظمیں آج کے دور کے مزاج کا آئینہ دار ہیں۔ اپنے پیش رو کی طرح انہوں نے سرحد کو مان کر قبول کرکے شاعری نہیں کی۔ بلکہ انہوں نے سرے سے اس سرحد کو ہی نہیں مانا ہے جو جسموں پہ سے گذار دی گئی ہے اس سرحد پر ندا۔ آدھے ادھر ہیں۔ آدھے ادھر تھا۔

پاسپورٹ آفیسر کے نام

کراچی ایک ماں ہے
بمبئی بچھڑا ہوا بیٹا
یہ رشتہ پیار کا پاکیزہ رشتہ ہے جسے ایک
نہ کوئی توڑ سکتا ہے۔ نہ کوئی توڑ پایا ہے۔
غلط ہے ریڈیو۔ جھوٹی ہیں سب اخبار کی خبریں
نہ میری ماں کبھی تلوار تلنے ان میں آئی ہے۔
نہ میں نے اپنی ماں کے سامنے بندوق اٹھائی ہے
یہ کیسا شور و ہنگامہ ہے
یہ کیسی لڑائی ہے

جنگ

ہر گلی کوچوں میں گھس کر
بند دروازے کی سانکل کھولتی ہے
مدتوں تک
جنگ
گھر گھر بولتی ہے
سرحدوں پر فتح کا اعلان ہو جانے کے بعد

جنگ پر لکھی گئی نظموں میں انہوں نے یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ دو ملکوں میں جب جنگ ہوتی ہے تو سپاہی مرتا ہے۔ اور شہید کہلاتا ہے یہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دو ملکوں کے درمیان جب جنگ ہوتی ہے تو دونوں کے سپاہی یہ سوچتے ہیں کہ وہ حق پر ہیں۔

تم فوج میں بھرتی ہونا چاہتے ہو
ضرور ہو
لیکن یاد رہے
جنگ کے دوران تمہارا ملک جو کہے گا وہ سچ ہوگا
اور سچ کے لئے
تمہیں اپنی جان سے کھیلنا ہوگا۔
تمہارے دوستوں اور دشمنوں کی
فہرست سیاستوں کی طرح بدلتی رہے گی
جنگ ختم ہونے کے بعد
تم ان شہید بھی ہو سکتے ہو۔
اور بے وقوف بھی
بہت مشکل ہے بنجارہ مزاجی

سلیقہ چاہئے آوارگی میں

لفظ سفر،
ندا کی شاعری کا ایک اور کلیدی لفظ ہے۔ اور ان کی شاعری کا نمایاں رنگ بھی۔ مور ناچ۔ جو دسمبر ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں ندا نے لکھا تھا لفظوں کا پل کی بیشتر نظمیں اور گیت اپنے لسانی دائرے سے نکل کر ملکی زبانوں میں بھی مقبول ہو چکے ہیں لفظوں کا پل سے مور ناچ تک ندا کا شعری سفر قصباتی زمینوں کے ساتھ شہری صلابت سے ٹکراتا ہوا گذرتا ہے۔ اس میں سوانحی انداز میں موجود عہد کے اتار چڑھاؤ کو منعکس کیا گیا ہے۔ لیکن لب و لہجہ کی دردمندی اس شاعری کو شخصی مسائل اظہار ہوتے ہوئے بھی ہم سب کے دکھ سکھ کی کہانی بنا دیتا ہے۔

اس نظم سے وہ شخص زیادہ باتیں کر سکتا ہے جس نے اپنی ماں کو جھری دار چہرے اور ہاتھ پر ابھری لکیروں کے ساتھ گوبر اور مٹی سے کچی دیواروں کے زخموں کو بھرتے دیکھا ہو۔۔ میری ماں ہر دن اپنے بوڑھے ہاتھوں سے ادھر ادھر سے مٹی لا کر گھر کی کچی دیواروں کے زخموں کو بھرتی رہتی ہے۔

تیز ہواؤں کے جھونکے سے
بیچاری کتنا ڈرتی ہے
میری ماں کتنی بھولی ہے۔

میں ندا کی یہ نظم جب بھی اپنے ذہن میں دہراتا ہوں بے ساختہ مجھے میری ماں یاد آ جاتی ہے اور وہ منظر میری آنکھوں میں زندہ ہو جاتا ہے جب کرفیو کے سناٹے میں گھر کی کچی دیواروں میں مٹی بھرا کرتی تھی تاکہ کرفیو گھر کے اندر نہ گھس جائے۔

ندا کا ایک مخصوص میدان دوشیزۂ فطرت کی نقاب کشائی ہے۔ گاؤں میں اور شہر میں بھی، بھور، سردی، پہلا پانی، سہرا دوپہر شام اور صبح، ایک دن ان کی ایسی ہی نظمیں ہیں جن میں گاؤں اور شہر دونوں زندہ ہیں۔

سورج!
ایک نٹ کھٹ سا
دن بھر
شور مچائے۔
ادھر ادھر چڑیوں کو بکھیرے
کرنوں کو چھترائے

قلم، دواتیں، برش، ہتھوڑا
جگہ جگہ پھیلائے
شام
تھکی ہاری ماں جیسی
ایک دیا ملکائے
دھیمے دھیمے
ساری بکھری چیزیں چنتی جائے

یہ نظمیں نہیں پینٹنگز ہیں جن میں شاعر نے فطرت کو فریم کر دیا ہے۔ بڑے شہروں کا جو احوال ہے اور مشینی زندگی، بے حسی، بے چہرگی، نے فطرت، موسم اور انسان کا جو حلیہ بنا رکھا ہے اس کا بڑی شدت سے بیان ہوا ہے۔ شہری مزاج کا یہ بھی ایک پہلو ہے کہ یہاں سورج پہلے نہیں نکلتا بسیں اور ٹرینیں پہلے نکلتی ہیں

یہ کیسی بستی ہے
میں کس طرف چلا آیا
فضا میں گونج رہی ہیں ہزاروں آوازیں
سلگ رہی ہیں ہواؤں میں ان گنت سانسیں
جدھر بھی دیکھو
کھوے، کولہے، پنڈلیاں، ٹانگیں

مگر کہیں؟
کوئی چہرہ نظر نہیں آتا۔ (بمبئی)

اس مضمون میں، میں نے شاعر کے گیتوں اور دوہوں کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اس صنف سخن میں ان کی اپنی الگ ایک دنیا ہے انہوں نے دوہوں اور گیتوں میں عوامی زبان اور اسلوب منہ کا کو شیر و شکر کر دیا ہے۔ اور زبان و اسلوب کے نئے پیرایہ بیان دریافت کئے ہیں نئے محاورے کی دریافت کے ساتھ ان گیتوں میں الھڑپن اور جذب و مستی کی جو کیفیت شامل ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

ساحر لدھیانوی کو یہ ناز تھا کہ ان کی شاعری ہر دور میں زندہ رہے گی اور پڑھی جاتی رہے گی۔ کیونکہ ہر دور میں لوگ جوان ہوتے رہیں گے اور محبت کرتے رہیں گے۔ ندا فاضلی سے میری ملاقات اسماعیل یوسف کالج میں ہوئی تھی۔ جہاں وہ اور ڈیوڈ میتھوز مدعو تھے ان کے ملنے سے پہلے میں ان کی رومانی نظموں کا اسیر ہو چکا تھا۔

نیم تلے دو جسم اجانے، چم چم بہتا ندیا جل
اڑی اڑی چہرے کی رنگت، کھلے کھلے زلفوں کے بل
دبی دبی کچھ گیلی سانسیں، جھکے جھکے سے نین کنول
نام اس کا؟ دو نیلی آنکھیں
ذات اس کی رستے کی رات
مذہب اس کا بھیگا موسم
پتا بہاروں کی برسات

ساحر لدھیانوی کا بیان ندا فاضلی پر بھی صادق آتا ہے، ندا فاضلی کی نظمیں کالج کے طلبہ اور طالبات کے کاپیوں پر لکھی ملتی ہیں اور غزلوں کے حوالے سے میر، غالب، مومن، اور خواجہ میر درد کی بات چلے اور ندا فاضلی کا ذکر آئے تو طلبہ و طالبات اشتیاق میں ہو جاتے ہیں۔ اور ندا کی نظمیں اور اشعار کاپیوں پر نوٹ کرنے لگتے ہیں۔

ندا پر یہ مضمون مکمل نہیں ہے۔ ناتمام کا لفظ میں نے سوچ سمجھ کر استعمال کیا ہے۔ سر دست ندا فاضلی کی اب تک کی شاعری کا ایک تاثراتی جائزہ لینا مقصد تھا۔ اور ویسے بھی۔

کچھ باتیں ان کہی رہنے دو
کچھ باتیں ان سنی رہنے دو
اک اوجھل بے کلی رہنے دو
اک رنگین ان بنی دنیا پر
اک کھڑکی ان کھلی رہنے دو

سب باتیں دل کی کہہ دی اگر
پھر باقی کیا رہ جائے گا
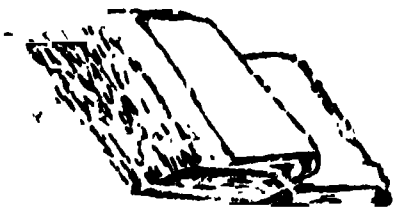
فکرِ احمر

"روسی نظمیں"

سعادت حسن منٹو

"برف کا گالا"

کس قدر شفاف! ـــــ کس قدر حسین ہو
برف کے ننھے اولے۔
اگر تجھے غور سے دیکھا جائے،
تو برف کی دھاریاں پگھلتی دکھائی دیں گی
اسی طرح ہمارے آخری آنسو،
کسی گذرے ہوئے غم کے لئے بہتے ہیں،
جبکہ آنے والی خوشی کا پہلا خواب طلوع ہوتا ہے۔

"خزاں کا گیت"

موسم گرما نے آخری سانس لیا ـــــ دم پڑ گیا!
متوردن پرواز کر گئے!
برکھا سے لدی ہوئی دھند دلدلوں سے پیدا ہوئی
رات نے اپنا خواب آگیں نقاب الٹ دیا۔
پکے ہوئے کھیت ننگے پڑے ہیں۔
ندیوں کا رقصاں کھیل سرد ہے۔
جنگلوں کے بال سپید ہو رہے ہیں۔
ایوانِ قدرت رنگ بدل رہا ہے۔
جلد ـــــ بہت جلد، سرما کی سردی
مرغزاروں اور کھیتوں کو اپنا سلام پیش کرے گی۔
بہت جلد جھونپڑوں اور مکانوں میں،
آگ اپنی دلکش گرمی بخشے گی!

"ہنگامہ"

ایک لہر دوسری لہر پر لپکتی ہے
اور شور کرتی ہوئی گذر جاتی ہے
اسی طرح انسان پر انسان لڑھکتے ہوئے ڈھیروں کی طرح گذر جاتا ہے،

—— کم مایہ انبوہ!!
لہریں مستعار حرارت پر اپنی سردی کو ترجیح دیتی ہیں۔
انسان گرمیٔ قلب کا خواہاں ہے، لیکن ——
وہ سمندر کی لہروں سے بھی زیادہ سرد ہے!!

"خنجر"

مجھے تجھ سے محبت ہے —— اے، میرے آہنی خنجر
اے میرے رفیق! —— سردا، رچکیلے!!
غمناک جدائی کے موقعے پر،
جب دستِ نازک نے تجھے بطورِ تحفہ پیش کیا
صرف اسی وقت خون کی سُرخ بوندوں کی بجائے،
تیری دھار پر چمکتا ہوا آنسو —— اُلفت کا بے بہا موتی نظر آیا!!
مجھ پر جمی ہوئی سُرمگیں آنکھیں،
ایک نہاں غم میں ڈوبی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں،
جیسے تیرا اصل شعلوں کی سُرخ زبانوں سے کھیل رہا ہے ——
وہ شعلے جو کبھی مغموم تاریکی سے نکل کر پھر بھڑک اٹھتے ہوں
محبت کے پیانِ خاموش! ——
غم آفریں زندگی کو خوشتر بنانے والے!!
ایک جہاں گرد کے لئے مشعلِ راہ!!
روحانی قوت! میں تجھے ہرگز ہوکا نہ دونگا۔
بلکہ تیری طرح زندگی بسر کرونگا —— اے میرے خنجر!

"...... کے نام"

ہم جُدا ہیں —— لیکن
تیری خیالی تصویر میں اپنے مغموم دل سے لگائے ہوئے ہوں،
دھندلا نقشہ! —— مسرت بھرے ایام کی ہلکی سی جھلک!!

تیرا یہی تحفہ میرے لئے باعثِ راحت ہے
اگرچہ جذبات کی دنیا مجھے مسخر کر چکی ہے،
تاہم وہ چہرہ جس سے میں ایک دفعہ محبت کر چکا ہوں،
محو نہیں ہو سکتا
فراموش شدہ مندر میں اب بھی پجاری باقی ہے،
اگرچہ بت اوندھے پڑے ہیں، لیکن خدا موجود ہے۔

"تبسم اور آنسو"

تبسم اور آنسو —— سورج اور بارش ہے
اک چمکتا ہے، دوسرا بہتا ہے —— دلفریبی سے،
مجھے تیری روح، غم واندوہ کے تفکرات میں گُھلی ہوئی،
سورج کی منور روشنی کی طرح اس چمکتے ہوئے آنسو میں،
جھلکتی دکھائی دے رہی ہے!

"جامِ حیات"

ہم جامِ حیات نوش کرتے ہیں ——
کہ ہماری آنکھوں پر مضبوطی سے پٹی بندھی ہوئی ہے،
اس کا سنہرا کنارہ ہمارے آنسوؤں سے تر ہے
ان شبنمی قطروں سے چمک رہا ہے۔
موت کی آمد ہماری آنکھوں سے وہ پٹی اٹھا دیتی ہے!
دنیا کا شیریں سحر غائب ہو جاتا ہے، جو ہمیں مسحور کئے ہوئے تھا۔
تب ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ سنہرا پیالہ خالی تھا، —— ہمیشہ سے خالی!!
تصور کی وہ شرابِ رنگین جو ساغرِ حیات کو پُر کئے ہوئے تھی، ہمیں
ہمیں ایک پل بھر تک نصیب ہوا!!
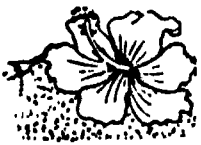
ڈاکٹر حقیر آستانی
۲۰۷، گولڈز اون۔ جے پی روڈ
اندھیری (ویسٹ) بمبئی ۴۰۰۰۶۱

کہاں ہے؟

(فرقہ وارانہ فسادات سے متاثر ہو کر)

کیا میں زندہ ہوں! مرا مدفن کہاں ہے! مرے احساسات کا آنگن کہاں ہے!

میرے بوسیدہ کفن پر ہنسنے والو آپ کا آراستہ دامن کہاں ہے!

خارزاروں پر بہار آنے لگی ہے کھلکھلاتا مہکتا مدھوبن کہاں ہے!

پیار کا، صدیوں پرانی دوستی کا گڑگڑاتا، جھومتا ساون کہاں ہے!

وہ ادا، وہ بات، وہ بے لاگ رغبت جس پہ ہو قربان یہ تن من دھن کہاں ہے!

مل ملا کر روئیں گے ہمسائیگی کو آپ کا خنجر مری گردن کہاں ہے!

دوستی کی آڑ میں ہے دشمنی بھی ہے اگر یہ دوست تو دشمن کہاں ہے!

اب کہاں وہ بے دھڑک ملنا ملانا! ایسی جذبات کا بندھن کہاں ہے!

مبتلا ہیں سب اپنے غم میں سارے ان کے ہو جانے کا باقی فن کہاں ہے!

اپنے پن کی بات کیا کرتے ہو یارو! اپنا پن کس میں ہے! اپنا پن کہاں ہے!

کچھ نہیں باقی حقیر آستانی
دو دلوں کی باہمی دھڑکن کہاں ہے؟

★

بشر نواز
محلہ گھاٹی۔ اورنگ آباد (مہاراشٹر)

نظم

مجھے اس کا غم نہیں ہے
مرے دل کی دھڑکنوں کا
کوئی راز داں نہ نکلا

مجھے اس کا غم نہیں ہے
کہ سخن تھے لاکھ۔۔ لیکن
کوئی ہم زباں نہ نکلا

مجھے غم جو ہے تو یہ ہے
مری زندگی کے موسم
کسی درد کی زمیں پر
کبھی ابر بن نہ پائے
نہ بھگو یا کوئی آنگن
نہ کہیں چمن کھلائے

مجھے غم جو ہے تو یہ ہے
کہ سکونِ دل کی خاطر
جو دیئے فریب خود کو
وہ عجب سراب نکلے

مجھے غم جو ہے تو یہ ہے
کہ جو خواب میں نہ دیکھے
وہ مرا عذاب نکلے

★

• ڈاکٹر نایاب لکھنوی
۲۸/۴۲۳۰۴۹، ساتویں لین، مالیگاؤں

گھر سے جب نکلوں گا تو زادِ سفر رکھ دے گا وہ
میرے ہاتھوں پر دعاؤں کے گہر رکھ دے گا وہ

دھوپ پھر قبضہ کرے گی فاتحانہ شان سے
کاٹ کر بستی کے جب سارے شجر رکھ دے گا وہ

آئینوں سے عکس لے جائیگی اک آندھی بلا
چہرہ چہرہ جب غلافوں کا بزر رکھ دے گا وہ

اپنی بستی کو مٹا کر آنے والوں کے لئے
رات کے کالے جزیرے میں سحر رکھ دے گا وہ

رات دن مانگیں دعائیں جس سپاہی کے لئے
کس کو تھا معلوم کہ تیغ و سپر رکھ دے گا وہ

پھر حقیقت اس کو دکھلائے گی عکسِ تار تار
پھر یہ رسمِ رونمائی اپنے گھر رکھ دے گا وہ

اس گھڑی جوشِ ہجومِ سنگ فطرت دیکھنا
جس گھڑی نایاب شاخوں پہ ثمر رکھ دے گا وہ

• ڈاکٹر مبارک انصاری
محلہ بترا پور شہر گورکھپور ۲۷۳۰۰۱

دو غزلیں

ایسا ماحول بہر حال تباہی دے گا
اک نہ اک دن اسے پتھر کا نباہی دے گا

لطف جب کہ خزاں رت میں بھی کلیاں کھلتیں
سبز موسم ہے تو گلدان سجا ہی دے گا

ہاتھ میں اپنے وہ جادو کی چھڑی رکھتا ہے
جب بھی چاہے گا کرشمہ وہ دکھا ہی دے گا

دستِ قاتل پہ ہو یا فرشِ زمیں پر لوگو
خونِ مظلوم ہے تو رنگ دکھا ہی دے گا

بس یہی سوچ کے خوابوں کے نگر کر آباد
کچھ نہیں تجھے رنگین قضا ہی دے گا

وقت آرام سے رہنے کہاں دے گا تجھکو
ایک چکر ترے پاؤں میں پنہا ہی دے گا

وقت کا دھارا غلط سمت کہاں جاتا ہے
اسے مبارک اسے رستے پہ لگا ہی دے گا

میزان میں وہ کب ہمیں کم تولتے نہ تھے
یہ ظرف تھا ہمارا کہ ہم بولتے نہ تھے

آج ان کے پاؤں میں بھی ہیں چکر بندھے ہوئے
جو لوگ ایک پل بھی کہیں ڈولتے نہ تھے

اندیشہ تھا کہ خواب ہمارے بکھر نہ جائیں
اس ڈر سے خط ہم اس کا کبھی کھولتے نہ تھے

موسم بدل گیا ہے تو وہ بھی بدل گئے
کب کس وہ اپنے پیار کا یاں گھولتے نہ تھے

بیٹھے ہیں اب پرند سرِ شاخ آرزو
پہلے اڑان بھرنے کو پر تولتے نہ تھے

راتوں کو تابناک مبارک بنا نا تھا
خوابوں کے موتیوں کو یونہی رولتے نہ تھے

شفیع اللہ خان راز اٹاوی ایس۔این۔کالج کٹرہ پہلوان خان، اٹاوہ یو۔پی ۲۰۶۰۰۱

فریاد

میرا فسانۂ غم،
آنسوؤں میں ڈوبا ہے۔
بدن میں / تیر ہیں پیوست۔
روح / زخمی ہے۔
رگوں کو،
آتش بیداد ڈستی رہتی ہے
حسین آنکھیں مری
خون روتی رہتی ہے
لبوں پہ
مہر خموشی کی زنگ چسپاں ہے
زباں پہ،
حرفِ شکایت بھی لا نہیں سکتی۔
کسی کو
اپنی کہانی سنا نہیں سکتی
مرے عروج سے
نفرت ہے / تنگ ذہنوں کو۔
یہ چاہتے ہیں۔
تعصب کو پوجنے والے
مرے وجود کو اندھے کنویں میں دفنا دیں
وطن میں اہلِ وطن
اجنبی سمجھتے ہیں
وجود رکھتے ہوئے
بے نشان ہوں لوگو
وہ
بد نصیب
میں
اُردو زبان ہوں لوگو

غزلیں

پانیوں کا کرم ادھورا ہے
جسم سیراب روح تشنہ ہے

سر زمین پر وہ حشر برپا ہے
آسمان خوف سے لرزتا ہے

وقت نے کانچ کی کسوٹی پر
پتھروں کا مزاج پرکھا ہے

اسکی جھولی میں چاند تارے ہیں
روشنی کو مگر ترستا ہے

شور ہے تیرگی پرستوں میں
روشنی کا سفیر اندھا ہے

شہر میں قاتلوں کے ڈیرے ہیں
رات دن قتل عام ہوتا ہے

خوں میں ڈوبی ہوئی فضائیں ہیں
ہر نگر، قتل گاہ لگتا ہے

آدمی آدمی کے کام آئے
زندگی کا یہی تقاضہ ہے

آئینے راز سر بسجدہ ہیں
جب سے پتھر کے بت کو دیکھا ہے

گلی کوچوں میں چرچے کانچ کے ہیں
یہ آخر کیسے ٹکڑے کانچ کے ہیں

تمہارا دل تو ہے پتھر کا لیکن
حسین آنکھوں میں سپنے کانچ کے ہیں

چٹانیں ساحلوں پر منتظر ہیں
سمندر میں سفینے کانچ کے ہیں

سنبھل کر سنگ ریزے چن رہا ہے
بہت ہوشیار ٹیلے کانچ کے ہیں

نہ جانے کب سے پتھر ڈھو رہے ہیں
بہت مضبوط ٹیلے کانچ کے ہیں

فضا میں سنگ لہرانے لگے ہیں
اڑانوں میں پرندے کانچ کے ہیں

زمانہ پتھروں کو پوجتا ہے
مگر آنکھوں میں جلوے کانچ کے ہیں

اِدھر لوگوں کے ہاتھوں میں ہے پتھر
ادھر نازک کھلونے کانچ کے ہیں

ابھی تک راز میں سمجھا نہیں ہوں
مکان بستی میں کتنے کانچ کے ہیں

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکاڈمی نے "اردو کے چالیس سال" عنوان سے ایک سیمنار کا انعقاد کیا تھا جس کا افتتاح مہاراشٹر کے وزیر برائے شہری ترقیات شری سوشیل کمار شندے نے نہرو سینٹر ورلی میں ۲۸ دسمبر ۱۹۹۰ء کو کیا زیر نظر تصویر میں شری جاوید خان وزیر برائے ہاؤسنگ، شری عابد علی خان شری علی سردار جعفری، پروفیسر منشی اور شری ہارون رشید دیکھے جا سکتے ہیں

شری سوشیل کمار شندے کے ہاتھوں ریاست مہاراشٹر اردو اکادمی کے جلسہ کا افتتاح
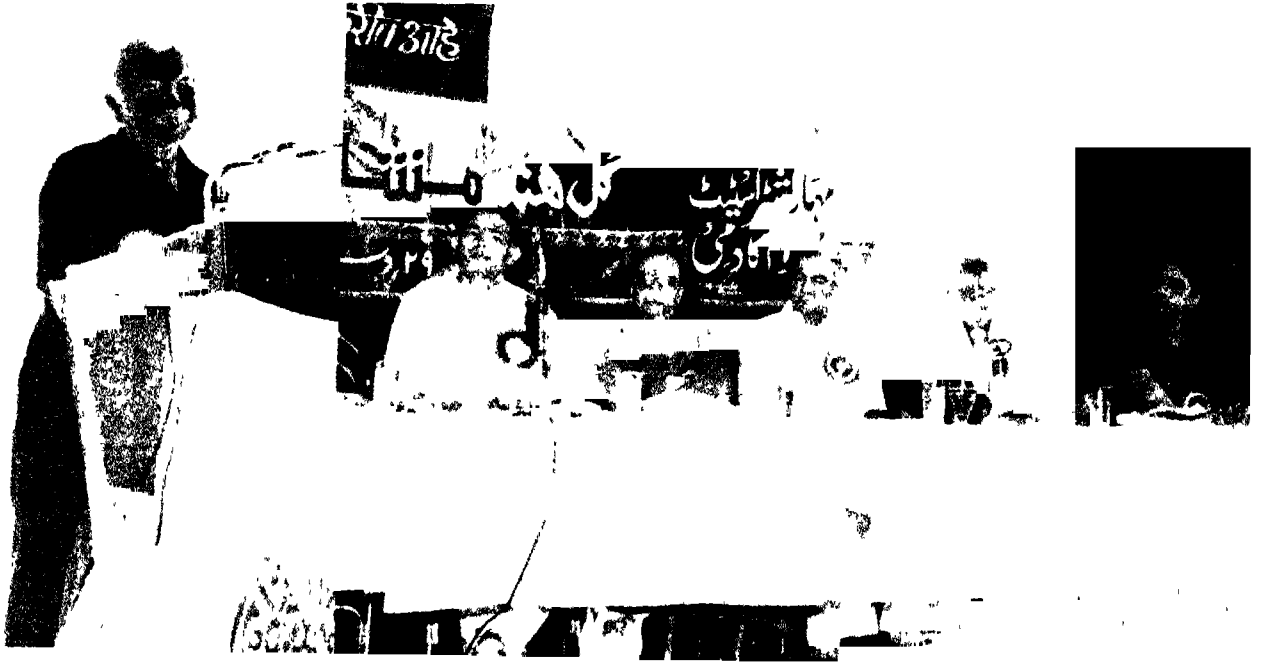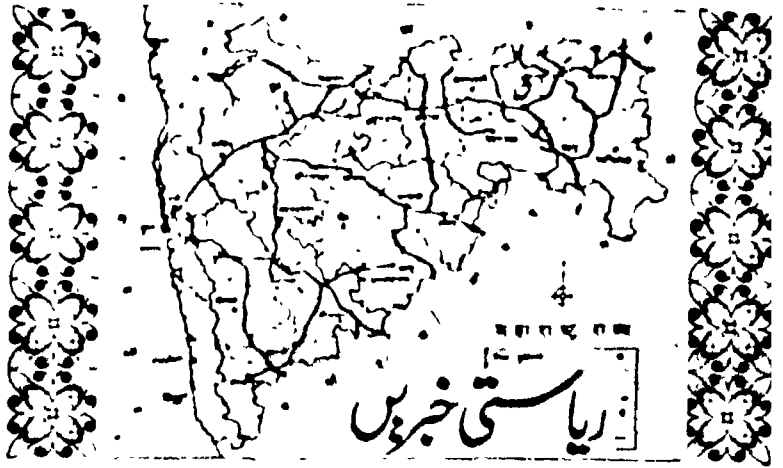
کسی بھی زبان کا ادب، ذات پات، علاقہ، یہاں تک کہ ریاست کی حدود کی بندشوں سے آزاد ہوتا ہے ادب سے ہر کوئی استفادہ حاصل کر سکتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار شری سوشیل کمار شندے وزیر شہری ترقیات نے ۲۸، دسمبر کو نہرو سینٹر ورلی میں کیا۔

شری شندے مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کی جانب سے اردو ادب کے ۴۰ سالہ پر منعقدہ قومی سمینار میں بحیثیت مہمان خصوصی تقریر فرما رہے تھے۔

وزیر موصوف نے ریاست کے مختلف حصوں میں رہائش پذیر مستحق شاعروں اور ادیبوں کو ضروری امداد فراہم کرنے کی اہمیت

پر زور دیا تاکہ وہ اپنی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کر سکیں۔

پروفیسر جاوید خان وزیر ہاؤسنگ اور چیرمین مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی نے اپنے صدارتی خطبے میں فرمایا کہ اکادمی۔ ریاست کے دیہی علاقوں میں اردو کے فروغ میں دلچسپی رکھتی ہے نیز آپ نے مہمانوں کا خیر مقدم بھی کیا۔

ڈائرکٹر اکادمی شری سردار جعفری، شری عابد علی خان شریمتی قرۃ العین حیدر، شری اختر الایمان، شری سریندر پرکاش، نے بھی اس موقعہ پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

ابتدا میں شری یوسف ناظم ممبر سکریٹری نے اپنی تعارفی تقریر میں جلسہ کے اغراض و مقاصد بیان کئے شری ہارون رشید ممبر سکریٹری نے شکریہ ادا کیا۔

آڈیٹ رپورٹ گورنر کو پیش کی گئی

۳۱ مارچ ۱۹۸۹ء تک کے اخیر سال تک حکومت مہاراشٹر کو موصول ہونے محصول کی آڈیٹ رپورٹ ریاستی حکومت کے ذریعہ یکم نومبر ۱۹۹۰ء کو کنٹرولر اینڈ آڈیٹر جنرل آف انڈیا نے گورنر مہاراشٹر کو پیش کر دی ہے۔

سنت گیانیشور کی جانب سے لکھی گئی گیانیشوری کے ۷۰۰ سال مکمل ہونے کے موقعہ پر محکمہ پوسٹل کے ۲ روپے کے ایک یادگار اسپیشل اسٹامپ کا ۳۱ دسمبر ۱۹۹۰ء کو منترالیہ میں منعقدہ تقریب میں وزیر تعلیم شری ویلاس راؤ دیشمکھ نے افتتاح کیا۔

مشہور اسکالر بابا مہاراج ساتر کر مہمان خصوصی کی حیثیت سے موجود تھے۔

اس موقعہ پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے وزیر تعلیم نے محکمہ پوسٹل کا گیانیشور پر پوسٹل اسٹامپ جاری کرنے پر شکریہ ادا کیا۔ شری دیشمکھ نے فرمایا کہ حکومت مراٹھواڑہ میں پیٹھن میں سنت پیٹھ قائم کرنے کیلئے مقررہ کمیٹی کی سفارشات پر ایک مہینے میں غور کرے گی۔ آپ نے فرمایا کہ عوام کیلئے گیانیشوری اور سنت تکارام کے شمارے کم قیمت پر نکالے جائینگے۔

بابا مہاراج ساتر کرنے اپنی تقریر میں مہاراشٹر کو سنتوں کی جائے پیدائش قرار دیا۔ انھوں نے فرمایا کہ منڈل کمیشن کی سفارشات سے ملک کے مختلف حصوں میں ہونے والے ردعمل سے مہاراشٹر محفوظ رہا ہے جس کا سارا کریڈیٹ یہاں کے سنتوں کی اعلیٰ تعلیمات کو جاتا ہے

ابتدا میں سکریٹری جنرل ایڈ منسٹریشن کلچرل افیرس انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز شری دینکٹ جاری اور شری سکل کالے چیف پوسٹ ماسٹر جنرل مہاراشٹر سرکل نے اپنی تقریروں میں اس تقریب منعقد کرنے کے اغراض و مقاصد بیان کئے۔

اس موقعہ پر کلاکاروں نے گیانیشور کے پسائیدان اور گیت گا کر سنائے شری پردیپ بھیڑے نے پروگرام کمپیر کیا۔

مہاراشٹر اسٹیٹ پلاننگ بورڈ کی از سر نو تشکیل

حکومت مہاراشٹر نے اسٹیٹ پلاننگ بورڈ کی از سر نو تشکیل کی ہے شری اناصاحب شندے، کو اس کا نائب چیرمین مقرر کیا گیا ہے وزیر اعلیٰ اس بورڈ کے چیرمین ہیں علاوہ ازیں اس بورڈ میں مختلف میدانوں کے ماہرین کو حیثیت ممبر نامزد کیا گیا ہے۔ وہ اس طرح ہیں

شری وی۔ جی راجیہ ادھکشا، ڈاکٹر (شریمتی) چترا نائیک۔ شری اے۔ کے محمدار، پروفیسر پی۔ بی۔ پاٹل، شری ایم۔ ایس۔ پٹوردھن، شری جی۔ بی۔ نیوالکر، ڈاکٹر مدھو سدن ساٹھے، شری پی۔ آر۔ لاتے، شری ڈی۔ ایم سکتھنکر، شری بھوجگراؤ کلکرنی، ڈاکٹر (شریمتی) کمال زند یوے اور شری ڈی۔ وائی۔ گوھوکر۔

غیر معیاری ادویات

گورنمنٹ اینالٹ ڈرگس کنٹرول لیباریٹری مہاراشٹر اسٹیٹ نے مندرجہ ذیل چھ ادویات کو غیر معیاری قرار دے دیا ہے۔ غیر معیاری ادویات کی ڈرگس اینڈ کاسمیٹکس قانون ۱۹۴۰ء کے سکیشن (اے) (ا) کے تحت فروخت اور تقسیم کاری کی اجازت نہیں دی گئی ہے۔

وہ اسطرح ہیں۔ نوٹوں کے نام بیچ نمبر اور تیار کرنے وا

مشہور سائنٹسٹ ڈاکٹر ہومی۔ این۔ سیٹھنا کو گورنر مہاراشٹر شری دی سبرامنیم نے بمبئی کے ۵۰۰ ادیں میئر کے طور پر راج بھون میں ۲۰ر دسمبر ۱۹۹۰ء کو حلف دلائی۔ زیرِ نظر تصویر میں وزیر اعلیٰ مہاراشٹر شری شرد پوار بھی نظر آرہے ہیں۔

ے نام درج ذیل ہیں۔ ایمپسلین کیپسول آئی پی کیمپیلین ۵۰۰۔ ۱۲۹۹ ایمپسلین کیپسول آئی۔ پی کیمپیلین ۲۵۰۔ ۵۰۴، ایمپسلین کیپسول آئی پی کیمپیلین ۵۰۰۔ ۲۹۹، اور ٹریمو تھو پریم اور سلپھا میتھوز از دلے ٹیلیٹ (ڈی۔ ایس) آئی۔ پی کیمیٹرون ڈی۔ ایس ۲۰۹، میسرز سنتو کیم فارما سیٹو کلز نا یاد ــــ ۵۸۵۴۰، (کرناٹک) پائیرازن فاسفوٹے ٹیلیٹ آئی۔ پی ایل۔ ایل ۱۰۱، میسرز بروگس ویلکم (آئی) لیمیٹڈ بمبئی اور سلک اسیڈ، آئی پی۔ ۹، میسرز دانٹر دیل لیباریٹریز ادجین

ریاست مہاراشٹر میں واقع مذکورہ ادویات کے تیار کرنے والوں کو مذکورہ بیچ نمبر والی ادویات کی فروخت کو روک دینے اور فروخت شدہ کو واپس منگوانے اور ایسی ادویات کے تیار کرنے کو روک دینے کے احکامات دے دیے گئے ہیں۔

دیگر ریاستوں کے ڈرگس کنٹرولر کو اسی طرح کے اقدامات کرنے کی بابت مطلع کر دیا گیا ہے۔

ایسی ادویات کی فروخت یا تقسیم کی بابت اطلاع کمشنر فوڈ اینڈ ڈرگس ایڈمنسٹریشن مہاراشٹرا اسٹیٹ گرہا نرمان بھون کو مناسب کاروائی کرنے کی غرض سے مطلع کیا جا سکتا ہے۔

جرمن کے سفیر کی گورنر سے ملاقات

۔ بھارت میں فیڈرل ریپبلک آف جرمنی کے سفیر ڈاکٹر ہانس جارج ونیک نے ایف۔ آر۔ جی کے قونصل جنرل مسٹر ولف گینگ۔ ایس، کے ہمراہ ۲۷ر دسمبر کو راج بھون میں گورنر مہاراشٹر شری۔ سبرامنیم سے ایک رسمی ملاقات کی ۔

ضلع پریشد قوانین

حکومت مہاراشٹر نے مہاراشٹر ضلع پریشد ڈسٹرکٹ سروسیز (بھرتی) (آٹھویں ترمیم) قوانین بابت ۱۹۹۰ء کو غیر معمولی گزٹ کے حصہ 13۔ IV مورخہ ۲۲ر نومبر ۱۹۹۰ء میں شائع کر دیا ہے۔

گورنر مہاراشٹر شری وی۔ سی۔ براہیم، بھارتیہ ودیا بھون میں منعقدہ تقریب میں اپنے خیالات کا اظہار فرما رہے ہیں۔ دوسری تصویر میں "میرا بھارت مہان" گیت گاتے ہوئے بچے ــــ

خبریں۔ تصویروں میں

ناگپور نگر پالیکا میں منعقدہ ایک تقریب میں شری شرد پوار کو استقبالیہ دیا گیا۔ زیر نظر تصویر میں ناگپور کے میئر سپاسنامہ پیش کر رہے ہیں۔ اسٹیج پر شریمتی پرتیبھا تائی پاٹل اور کشمیر کے سابق وزیر اعلیٰ شری فاروق عبداللہ بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

وزیر اعلیٰ شری شرد پوار، سورگباشی
ا پاٹل کی برسی کے موقع پر شائع کردہ یادگار
ے کا افتتاح کرتے ہوئے

وزیر مملکت برائے اطلاعات و رابطہ عامہ شری ارون گجراتی "بھرد گو سندیش" نامی رسالہ کی تیسویں سالگرہ کے موقع پر اسکا افتتاح کر رہے ہیں۔

وزیر ہاؤسنگ پروفیسر جاوید خان، ۵ دسمبر ۱۹۹۰ء کو ناگپور میں، مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کی طرف سے مشہور شاعر مرحوم سکندر علی وجد پر منعقدہ سیمینار میں اپنے خیالات کا اظہار فرما رہے ہیں۔

قارئین کی رائے

* عبدالقوی دسنوی
سیفیہ اسٹاف کوارٹرز
سیفیہ سائنس کالج۔ بھوپال ۴۶۲۰۰۱

۱۰ اگست ۱۹۹۰ء کا قومی راج ملا، خوشی ہوئی کہ اس شمارے میں قرۃ العین حیدر سے متعلق کئی مضامین شائع ہوئے ہیں۔ یہ آپ نے نہایت اچھا قدم اٹھایا۔ بلاشبہ قرۃ العین حیدر نے اردو کا سر بلند کیا ہے۔ گیان پیٹھ ایوارڈ کی وہ ہر طرح مستحق ہیں۔ انھوں نے اپنے ناولوں اور افسانوں کے ذریعہ اردو کی جس قدر خدمت کی ہے اس کا اعتراف ہر زمانے میں کیا جائے گا۔

ان سے متعلق تمام تحریریں اچھی ہیں، جو قرۃ العین حیدر کی شخصیت اور فن کو سمجھنے میں مدد کرتی ہیں۔ البتہ تصویر سرورق پر شائع ہوتی تو مناسب تھا اور کوئی اچھی تصویر ہوتی تو اور اچھی بات ہوتی۔ بہرحال اس اچھے شمارے کیلئے دلی مبارکباد قبول کیجئے۔ اس طرح کے اردو کے فنکاروں کے گوشے جاری رکھیے تو یہ بھی اردو کی بڑی خدمت ہوگی ۔

* قیصر الجعفری
رشید کمپاؤنڈ، کوسہ، براہ ممبرا
(ضلع تھانہ) بمبئی

مہاراشٹر کے رہنے والوں کے لئے بالخصوص اردو ادیبوں اور شاعروں کے لئے "قومی راج" کا مطالعہ میرے نزدیک بہت ضروری ہے، شعر، تبصرہ، افسانہ سب میں انتخاب کی شعوری کوشش کے ساتھ ساتھ حکومت کی روز بروز کارکردگی اور اعلانات وغیرہ کی معلومات کی فراہمی دوسرا کوئی پرچہ پیش نہیں کرتا۔ اور یہ قابل قدر بات ہے اور وقت کی ضرورت بھی۔

"قومی راج" سرکاری رسالہ ہے اس لئے اس کی قیمت تین روپے کسی بھی صورت میں مناسب نہیں ہے۔ اسٹال پر عدم دستیابی بھی محل نظر ہے۔ سرورق پر ادب کی نمائندگی جس انداز سے بھی ہو، ہونی ضروری ہے۔ تاکہ بہ یک نظر ادبی رسائل کا ایک حصہ نظر آئے ۔

* تسنیم فاروقی
لکھنؤ ۲۰

۱۰ اگست ۱۹۹۰ء کا شمارہ اردو ادب کے اس عہد کی تاریخ ہے لائبریری میں ایک معتبر دستاویز کی مثال رکھتا ہے قرۃ العین حیدر کے ادب کی مختلف سمتوں پر مضامین اور مقالات اپنی ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں یہ اور بات ہے کہ دو ایک تحریریں اپنی ثانوی اشاعت کے باعث کم اثر گیر رہیں۔

نہایت اہم اور مفصل گفتگو جو شہریار اور ابوالکلام قاسمی سے انجام پائی، لائق مطالعہ بھی ہے اور ادب خانے کے لئے حوالہ بھی، اپنی تمامی دلچسپیوں اور ادیبانہ سوالات وجوابات کے پیرائے میں خاصے کی چیز ہے۔ پروین شاکر کی نظم "قرۃ العین حیدر" لب ولہجہ کے اعتبار سے ایک تبدیلی موسم کی شاہد ہے۔ نظم میں ان کو وہ ستائش شاید کبھی نہ حاصل ہو سکے۔ جس کا حق انھیں غزل کے میدان میں ان کے پاکستانی حامیوں نے دے رکھا ہے بہرکیف ایک نظم ہے اور محمود سعیدی، نظام الدین نظام ظاہر ہے کہ اچھے شعراء ہیں ان کی تخلیق زینت اوراق ہیں۔ آپ کا ادارتی مضمون گیشوراؤ بھونسلے اور مراٹھی اسٹیج، خود اردو ڈرامے لکھنے والوں کے لئے معلوماتی ہے پرچے کی صحافتی اور ادبی مہارت پر مبارکباد و تحسین قبول فرمائیں

* ایم۔ وائی رحمان
شندے نگر۔ یوتمحل (مہاراشٹر) ۴۴۵۰۰۱

ستمبر ۱۹۹۰ء کے شمارے میں ادبی مضامین کی تعداد کچھ زیادہ نظر آتی۔ آپ سے درخواست ہے کہ تعلیمی وتکنیکی مضامین پر زیادہ توجہ دیجئے۔ مراٹھی زبان سے ترجمہ کروائیے اردو رسالوں میں، "جنگ آزادی میں اردو کا کردار" جیسے مضامین لکھنے کا سلسلہ اب بند ہونا چاہیئے۔ بہتر ہوگا کہ اس قسم کے مضامین دوسری زبانوں کے رسائل کے لئے لکھے جائیں۔

"گیان پیٹھ ایوارڈ یافتہ ڈاکٹر سی نارائن ریڈی پر ڈاکٹر کے۔ بھگنہ وسل راؤ کا مضمون شائع کرنے پر مبارکباد قبول کیجئے۔ "مراٹھواڑہ میں عصری ادب" پسند آیا۔ حمید سہروردی صاحب کی خدمت میں مبارکباد پیش کریں۔

قومی راج

جلد ۲۸ شمارہ ۱۷
۱۰ فروری ۱۹۹۱ء

ہندی، مراٹھی میں ہر ماہ کی یکم اور پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے
انگریزی، گجراتی، سندھی اور اردو زبان میں
ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

زر سالانہ ۲۵ روپے — قیمت فی شمارہ ۲ روپے

چیف ایڈیٹر — شری ارن پاٹنکر
منیجنگ ایڈیٹر — آر. جی. مایڑو
ایڈیٹر — نیلوفر فیاض خان

ترسیل زر کا پتہ:

اسسٹنٹ ڈائریکٹر (ایڈمنسٹریشن)
ڈائریکٹوریٹ جنرل آف انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز
گورنمنٹ آف مہاراشٹر، بیرک نمبر ۱۹
مقابل سروجی بلڈنگ، نزد منترالیہ، بمبئی ۴۰۰۰۲۱
Tel 2021530

مراسلت کا پتہ:

ایڈیٹر قومی راج
ڈائریکٹوریٹ جنرل آف انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز
گورنمنٹ آف مہاراشٹر
۱۷واں منزلہ، ایرانڈ منسٹریٹو بلڈنگ،
مقابل منترالیہ، بمبئی ۴۰۰۰۳۲
Tel. Nos. { 20239 / 20280

اس شمارے میں

صفحہ نمبر

قاسم قریشی
اندھیری، ممبئی

اِک حسیں رہ گذر کا تو آغاز ہے
یومِ جمہور تجھ پر بڑا ناز ہے

شادیانے مسرت کے بجنے لگے
پھول گلشن میں ہر سمت کھلنے لگے
راستے منزلوں سے بھی ملنے لگے
کوہ ساروں سے جھرنے برسنے لگے

ہر طرف آرزوؤں کی پرواز ہے
یومِ جمہور تجھ پر بڑا ناز ہے

بعد مدت کے ہمکو یہ دولت ملی
مسکراتی ہوئی آدمیت ملی
غم کے سیلاب سے دل کو فرصت ملی
ہر قدم پر ہمیں تیری چاہت ملی

سب کی آواز ہی تیری آواز ہے
یومِ جمہور تجھ پر بڑا ناز ہے

تیرگی مٹ گئی روشنی آ گئی!
گنگناتی ہوئی چاندنی آ گئی
غم کے بادل چھٹے اور خوشی آ گئی
حوصلوں میں نئی زندگی آ گئی

گیت گاتا ہوا دل کا ہر ساز ہے
یومِ جمہور تجھ پر بڑا ناز ہے

ہر نظر کو نظارہ میسر ہوا!
کشتیوں کو کنارہ میسر ہوا
بے کسوں کو سہارا میسر ہوا
کوئی اپنا ہمارا میسر ہوا

کتنا خوش رنگ تیرا یہ انداز ہے
یومِ جمہور تجھ پر بڑا ناز ہے

آج انسان کی فطرت بدل کیوں گئی
یہ ہوا اب تعصب کی چل کیوں گئی
آگ نفرت کی ہر سمت جل کیوں گئی
اب محبت بھی نفرت میں ڈھل کیوں گئی

سہمی سہمی سی کیوں اپنی آواز ہے
یومِ جمہور تجھ پر بڑا ناز ہے

میرے ماضی کے چہرے نہ بے نور تھے
راستے منزلوں سے کہاں دور تھے
راہ رو آبلوں سے کہاں چور تھے
آج سے پہلے اتنے نہ مجبور تھے

یہ بتائے کوئی ہم کو کیا راز ہے
جشنِ جمہور تجھ پر بڑا ناز ہے

ساجز
س. مولانا شوکت علی روڈ، بمبئی ۳

۲۶ جنوری

شب کے تاروں سے کہدو کہ ہٹ جائیں وہ
بادلوں کو خبردو کہ چھٹ جائیں وہ
جشنِ جمہوریت کو منانا ہے اب
کہدو اہلِ وطن سے کہ ڈٹ جائیں وہ

شان سے اب کے فصلِ بہار آگئی!
گلستاں پر نئی تازگی چھا گئی!!
دِل میں رُوحِ مسرت سی دَوڑ گئی!
ہر کلی ناز سے آج لہرا گئی!

مسکراتے ہیں گل خندہ زن ہے کلی
یہ فضا آج دیکھو تو دلھن بنی!!
دیدنی ہے ستاروں کی یہ روشنی!
جس طرف دیکھئے ہے عجب دلکشی

آج جنتا کے ہاتھوں میں خود راج ہے
آج جنتا کے قبضے میں ہی تاج ہے
ایک مدت سے تھے جس کے ہم منتظر
وہ مسرت کی تقریب بھی آج ہے

آؤ عاجز زمانے پہ چھا جائیں ہم
غیر کو بھی محبت سے اپنائیں ہم
اب ہے عاجز تقاضہ یہی وقت کا
پرچم امن ہر سمت لہرائیں ہم

★ جے. کے. جادھو
جوائنٹ ڈائرکٹر آف انڈسٹریز اور کنوینر اُدیوگ متر
مہاراشٹر اسٹیٹ۔

مہاراشٹر

ایک مثالی صنعتی ریاست

مہاراشٹر ملک کی ترقی پذیر صنعتی ریاستوں میں سر فہرست ہے، اور یہ مقام مہاراشٹر نے میڈک ایم ایس ایف سی، ایم ایس ای بی، ایم ایس ایس آئی ڈی سی، سیکوم ملٹرون، ایم آئی ڈی سی اور این، ادیوگ متر وغیرہ جیسے مختلف عوامی اداروں کی جد وجہد سے حاصل ہوا ہے علاوہ ازیں بجلی کی بڑی مقدار میں فراہمی صنعتی ڈیولپمنٹ زمین مواصلات کی کارکردگی اور نقل وحمل کی سہولتوں، اچھی بندرگاہوں اور عالمی ہوائی اڈے وغیرہ نے ریاستی صنعت کو مہاراشٹر میں جلا بخشی ہے۔

صنعتی ڈیولپمنٹ اور ترقی یافتہ معاشی اور سماجی ڈھانچے کی بدولت مہاراشٹر کو صنعت اور بزنس میں ایک مثالی مقام حاصل ہوا ہے۔ وہ اب ملک کی ایک مثالی صنعتی ریاست ہے۔ جس کی حدود سہیادری پہاڑیوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ اور بحر عرب کا ۷۲۰ کلومیٹر وسیع ساحل اس کی خوبصورتی میں اضافہ کا باعث بنا ہوا ہے۔

ریاست بمبئی، ریاست حیدرآباد کے حصے اور بیدار کے مرکزی صوبوں کو شامل کرکے مہاراشٹر کی موجودہ ریاست کی تشکیل یکم مئی سنہ ۱۹۶۰ء کو کی گئی۔ ریاست میں ۳۱ اضلاع بناکر اسے چار ریجن میں تقسیم کیا گیا ہے۔ وہ اس طرح ہیں: کوکن ویسٹرن مہاراشٹر ودربھ اور مراٹھواڑہ۔

۶،۲۸ کروڑ نفوس والی یہ ریاست (۱۹۸۱) کی مردم شماری کے مطابق) ۳،۰۸ لاکھ اسکوائر کلومیٹر رقبہ پر پھیلی ہوئی ہے۔ مہاراشٹر کو تیسری بڑی ریاست اور ملک کی دوسری سب سے بڑی خواندہ ریاست ہونے کا شرف حاصل ہے۔

اشٹر باکمال صنعتی ریاست :۔

حکومت ہند کے انڈسٹریز (اے ایس آئی) سال ۸۶-۱۹۸۵ء
الانہ سروے کے مطابق مہاراشٹر ملک کے نقشہ پر سرفہرست
نہ والی ریاست کے روپ میں ظاہر ہوئی ہے ۔

تی اور سماجی ہم آہنگی :۔

ریاست میں صنعتوں خاص طور سے بمبئی اور پونے کے اطراف
ا قا اور ریاست کے دیگر صنعتوں کے زیر ترقی علاقوں میں
ترقی ریاستی حکومت کی پالیسی کا خاص مقصد ہے اور اس مقصد
ت اس نے نئے ڈیولپمنٹ ادارے قائم کئے ہیں جن کی شاندار
ری کے نتائج آج ہم دیکھ رہے ہیں ۔

نی :۔

مہاراشٹر انڈسٹریل ڈیولپمنٹ کارپوریشن (میڈک) کو ۱۹۶۲ء
ئم کیا گیا تھا جس کا خاص مقصد صنعتی علاقوں کی ترقی کی دیکھ بھال
ہے ۔ ۲۵۰۰۰ ہیکٹر اراضی اس ادارے کے سپرد کی گئی یہ ادارہ
نٹ پلاٹ فیکٹری شیڈ روڈ اسٹریٹ لائٹ واٹر سپلائی نکاسی
ر عام سہولیات کی فراہمی جیسے کاموں میں مشغول رہتا ہے ۔

) :۔

میڈک نے ریاست میں بڑی تعداد میں واٹر ورکس قائم
ہیں ۔ میڈک کی واٹر سپلائی اسکیم کی گنجائش ۱۵۶۲ ایم ایل ڈی
بشمول ۱۰۱،۱ کلو میٹر تک کی ہے ۔

لی :۔

مہاراشٹر نے بجلی کی ترقی میں حیرت انگیز پیش رفت کی ہے
اور اس کے تمام ۳۹۴۱۳ دیہات کو برقیا یا گیا ہے ۔ مہاراشٹر اسٹیٹ
الیکٹرک سٹی بورڈ گذشتہ ۲۵ سالوں میں بجلی کی تقسیم کاری کے کاموں
میں مصروف ہے ۔ مہاراشٹر واحد ریاست ہے جہاں زرعی اور صنعتی
کاموں کے لیے بجلی بلا کسی رکاوٹ کے فراہم کی جاتی ہے ۔ ریاستی
حکومت نے ریاست میں صنعتی تعلقات میں ہم آہنگی برتنے کی ہمیشہ
کوشش کی ہے ۔ جس کی بدولت یہاں کے مزدوروں کی حالت میں
دن بدن سدھار ہو رہا ہے ۔

ٹرانسپورٹ کے کام :

مہاراشٹر میں سڑکوں اور ریلوے کے کاموں میں تیزی لائی
گئی ہے ۔ یہاں تک کہ مہاراشٹر کے ساحلوں کو بھارت کے تمام
بڑے شہروں سے جوڑ دیا گیا ہے جس کی بدولت افراد اور اشیا کی
بڑی تیزی کے ساتھ نقل و حمل کی جا سکتی ہے ۔
بمبئی جو کہ ایک عالمی ہوائی اڈہ بھی ہے جس کا تعلق دنیا کے
تمام بڑے ممالک سے ہے ۔ اندرون ملک اڑان کے ذریعہ مہاراشٹر
کے تمام بڑے شہروں کو بمبئی سے جوڑ دیا گیا ہے ۔

زراعت :۔

مہاراشٹر گنے ، کپاس ، دالیں ، چاول ، تلہن وغیرہ جیسی
اہم صنعتی زرعی پیداوار کرتا ہے ۔

بڑے صنعت کار :

مہاراشٹر میں ٹاٹا ، کرلوسکر ، لارسن اینڈ ٹوبرو ، ریلائنس ،
مہندرا اینڈ مہندرا ، ہندوستان لیور ، والچند گروپ ، بجاج جیسے
طاقتور صنعتی ادارے اور سنڈوز ، گلیکسو ، فائزر ، ہوچیسٹ جیسے
بیرونی اشتراکی ادارے ہیں ان تمام اداروں کی موجودگی سے ریاست
میں صنعتی ثقافتی عروج کا پتہ چلتا ہے ۔

مارکیٹ:

مہاراشٹر کو ملک کی بڑی صنعتی مارکیٹ ہونے کا بھی فخر حاصل ہے۔ بمبئی کے اطراف کی صنعتوں میں خام اشیاء کی بڑی مارکیٹ واقع ہیں۔ یہاں کپڑوں کی بھی بڑی مارکیٹ واقع ہے دیگر غذائی اشیاء بھی انڈسٹریل سیکٹر میں تیار کی جاتی ہیں۔ مہاراشٹر کو بھارت میں ایکسپورٹ کرنے کے بھی اس کے جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے بڑی مواقع میسر ہیں۔ یہاں ملک کا تقریباً ۲۵ فیصد مال ایکسپورٹ کیا جاتا ہے۔ اس شہر کا دنیا کے تمام بڑے ملکوں سے ہوائی رابطہ قائم کیا گیا ہے۔

ٹیلی کمیونیکیشن:

مہاراشٹر میں ایک مواصلاتی نظام کام کر رہا ہے جس کا بمبئی سے بھارت کے ۸۰۰ شہروں سے ایس ٹی ڈی پر رابطہ قائم کیا گیا ہے۔ بمبئی کے علاوہ مہاراشٹر کے ۱۷ شہروں کا ملک کے ۱۷۰ شہروں سے آئی ایس ڈی سے رابطہ جوڑا گیا ہے۔ خاص طور سے بڑے شہروں میں ٹیلکس کی سہولتیں فراہم کی گئی ہیں۔ اور دیہاتی سطح پر پوسٹ اور ٹیلی گراف کے آفس جاری کر کے مہاراشٹر میں کمیونیکیشن کی سہولت فراہم کی گئی ہے۔

بنیادی ضروریات:

انگلش میڈیم اسکول، کالج، یونیورسٹی جیسے سماجی ضروریات جدید آلات سے لیس اسپتال، پرائیویٹ کلنک اور نرسنگ ہوم، ڈسپنسری، پرائمری ہیلتھ سینٹر، سینما ہال، منفرد کلب، ڈپارٹمنٹل اسپورٹس، لائبریری، پارک، ہوٹل اور ریسٹورنٹ مہاراشٹر میں صنعتی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے موجود ہیں۔

قدرتی وسائل:

ریاست میں لوہا، میگنیز، کوئلہ، ریت وغیرہ جیسی اہم معدنی کانیں پائی جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں کروڈ آئیل اور نیچرل گیس بمبئی ہائی سے آئیل فلڈ بمبئی میں واقع ہیں جو کہ بھارت کا ۶۰ سے ۷۰ فیصد تیل اور گیس پروڈکشن کی ضروریات کو پورا کرتی ہیں۔

جنگلاتی وسائل:

ریاست میں جنگلات کا کل رقبہ ۶۴,۲۰۰,۹۹۲ اسکوائر کلومیٹر ہے یہاں سے ٹیک، شیشم، صندل لکڑی، بامبو، فائبرس وغیرہ حاصل کئے جاتے ہیں۔

ترغیبی اسکیمات:

ریاست میں متوازن ترقی کے لیے ریاستی حکومت نے ۱۹۶۴ء سے مختلف ترغیبی اسکیمات وضع کی ہیں۔

ترغیب کی پیکیج اسکیم ۱۹۸۸ء:

ریاست میں ابتداء سے ہی مستحق انڈسٹریل یونٹ پر سیلز ٹیکس کے سلسلے میں چھوٹ دی گئی ہے۔ جیسے پیکیج اسکیم ۱۹۸۸ء کے نام سے جانا جاتا ہے جو کہ ۳۰ ستمبر ۱۹۹۳ء تک پانچ سال کی مدت تک کے لیے نافذ کی گئی ہے۔

الیکٹرونکس انڈسٹری کے لیے ترغیبی اسکیم ۱۹۸۷ء

الیکٹرونکس صنعت کے فروغ کے لیے ایک خصوصی اسکیم مہاراشٹر ترغیبی اسکیم فار الیکٹرونکس انڈسٹری ۱۹۸۷ء کو عمل میں لایا گیا ہے جسے ریاستی حکومت نے اس اسکیم کے تحت مہاراشٹر میں نئی الیکٹرونکس صنعتیں قائم کی ہیں انہیں مہاراشٹر کے کسی بھی علاقہ بشمول بمبئی میٹرو

یجن (سوائے زون I اور II) اور تمام پونے ریجن کے
ں خریداری ٹیکس اور سینٹرل سیلز ٹیکس میں ۷ سال تک چھوٹ
ہے۔ مہاراشٹر میں صنعتوں کے فروغ کے لیے ایک مضبوط
ی ضروریات سے لیس ادارے قائم کیے ہیں جس میں سے بعض
ادارے اور ان کے فرائض درج ذیل ہیں۔

ٹرانڈسٹریل ڈیولپمنٹ کارپوریشن (میڈک)

یکم اگست ۱۹۶۲ء سے قائم بھارت میں اپنی نوعیت کا پہلا
یشن قائم کیا گیا جو کہ ڈیولپ لینڈ پانی، سڑک، اسٹریٹ لائٹ
نالے، ہاؤسنگ اور پوسٹل سروس، اسپتال، کینٹین، بینک،
یلیشن وغیرہ جیسی عام ضروریات مہیا کرتا ہے۔ اپنے قیام سے
نے ۱۶۶ انڈسٹریل علاقے ریاست میں قائم کیے۔ میڈک
ت کے تمام اضلاع میں صنعتی علاقوں کی ترقی کے کاموں میں
تا ہے۔ اور اب اس نے ریاست کے تعلقوں میں اسٹریل علاقہ
رنا شروع کر دیے ہیں تاکہ مہاراشٹر میں صنعتی اداروں کا ایک
سا بچھا دیا جائے۔

میڈک نے اب تک مختلف صنعتی علاقوں میں ۲۲۱۵۰ پلاٹ
کئے ہیں اس نے ۲۲۵۶ اداروں کے لیے ورک شیڈ تعمیر کئے
۱۲۰۰۰ یونٹ میں پروڈکشن شروع ہو چکا ہے جس میں ۵۰۰۴ لاکھ
روزگار فراہم کیا گیا ہے۔ ان اداروں میں ۴۰۰۰ کروڑ روپئے کی
کاری کی گئی ہے۔

پریٹیو انڈسٹریل اسٹیٹ:

مہاراشٹر میں ۱۱۹ کوآپریٹیو انڈسٹریل اسٹیٹ اب تک قائم
گئے ہیں۔ تقریباً ۴۵۰۰ یونٹوں میں فیکٹری شیڈ تعمیر کر کے انمیں
شن شروع کر دیا گیا ہے۔

مہاراشٹر اسٹیٹ فائنینشیل کارپوریشن (ایم ایس ایف سی)

ایم ایس ایف سی کو ۱۹۶۲ء میں قائم کیا گیا جو کہ چھوٹے درمیانی
درجے کی صنعتوں کو زمین بلڈنگ مشینری اور آلات کے لیے قرضے دیتی
ہیں۔ یہ قرضے نئی انڈسٹریل اداروں کو قائم کرنے کے ساتھ ان کی توسیع
انھیں جدید بنانے کے کاموں کے سلسلے میں بھی دیئے جاتے ہیں۔
یہ کارپوریشن میڈیکل پریکٹیشنروں، سابق فوجیوں، خواتین
صنعت کاروں وغیرہ کی بھی مالی امداد مہیا کرتی ہے۔
اپنے قیام سے اس ادارے نے ۳۲ ہزار قرضے جن کی
مالیت ۸۱۶ کروڑ روپئے تھی منظور کئے۔ ان اداروں میں ۱۶۷۰
کروڑ روپئے کی سرمایہ کاری کی گئی جس سے ۹ لاکھ افراد کو روزگار فراہم
کیا گیا۔

اسٹیٹ انڈسٹریل اینڈ انویسمنٹ کارپوریشن آف مہاراشٹر (سیکوم)

سیکوم کو حکومتِ مہاراشٹر نے ۳۱ مارچ ۱۹۶۶ء میں قائم کیا۔
ادارے درمیانی اور بڑے پیمانے کی صنعتوں کو ۵۰۰ لاکھ روپے
تک کی مالیت والے پروجیکٹ پر مدد کرتا ہے۔
سیکوم بحیثیت ایک ترقی پذیر ڈیولپمنٹ بینک ایک صنعت
کار کی مالیاتی ضروریات کو پوری کرنے اور اس کی رہنمائی کرنے کے لئے
ہمیشہ تیار رہتا ہے۔

دیگر کارپوریشن:

علاوہ ازیں بے شمار دیگر کارپوریشن صنعت کاروں کی مدد کرنے
کے لیے قائم کی گئی ہیں۔ مہاراشٹر سمال اسکیل ڈیولپمنٹ کارپوریشن (ایم
ایس ایس آئی ڈی سی) چھوٹی صنعتوں کو کمیاب خام اشیاء اور مارکٹنگ
کی سہولیات فراہم کرتی ہے۔ مہاراشٹر الیکٹرونکس ڈیولپمنٹ کارپوریشن
(ملٹرون) کو ٹیکنیکل اور مارکٹنگ میں الیکٹرونکس صنعتوں کی مدد کرنے کے
لیے قائم کیا گیا ہے۔ ایم آئی ڈی سی اوراین کو کنسلٹنسی سروس فراہم کرنے

اور مہاراشٹر سینٹر فار انٹرپرینر شپ ڈیولپمنٹ (ایم سی ای ڈی) بے روزگار نوجوانوں کو خود روزگار کے پروگرام میں شامل کرنے میں مدد کرنے میں تیار رہتا ہے۔

اُدیوگ متر:

اُدیوگ متر دہ ایک ایسا معتبر نام ہے جو صنعت کاروں کے ایک سچے دوست کا کام انجام دیتا ہے۔ اسے حکومتِ مہاراشٹر نے ۱۹۷۹ء میں صنعتوں کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے قائم کیا تھا۔ یہ صنعت کاروں کو صنعتیں قائم کرنے میں قانونی امور پر ان کی رہنمائی کرتا ہے۔

اُدیوگ متر کمیٹی:

اُدیوگ متر کمیٹی ڈیولپمنٹ کمشنر (انڈسٹریز) کی چیرمین شپ میں قائم کی گئی ہے۔ جیف ایگزیکیٹو آف انڈسٹریل ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے ممبران اس میں شامل ہیں۔ یہ کمیٹی ہر ماہ کے تیسرے منگل کو بمبئی میں ایک مرتبہ اپنی بیٹھک منعقد کرتی ہے جس میں انفرادی یونٹ اور عام امور کے مسائل پر بات چیت کی جاتی ہے یہ انڈسٹریز ایسوسی ایشن کے ممبران سے اٹھائے گئے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

یہ کمیٹی ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹرس کا دورہ کر کے علاقائی صنعتوں کے حالات کا جائزہ لیتی ہے اور ان کے مسائل کو حل کرنے کی پیشکش بھی کرتی ہے۔ اور اگر ممکن ہوا تو ان مسائل کو اسی جگہ حل کرنے کی کوشش بھی کرتی ہے۔

اُدیوگ متر میں سیکوم ایم ایس ایف سی ڈائرکٹوریٹ آف انڈسٹریز میڈک ایم ایس ای بی اور دیگر اداروں کے نمائندے شامل کیے جاتے ہیں۔

ضلع اُدیوگ متر:

ریاستی سطح کے اُدیوگ متر کمیٹی کی حکومت نے مئی ۱۹۸۴ء میں تشکیل کی ہے۔ ضلع ادیوگ متر (زیڈ یو ایم) کو ہر ضلع میں قائم کیا گیا ہے جس کا خاص مقصد ضلع میں چھوٹی صنعتوں کو در پیش دشواریوں کو دور کرنے میں رابطہ کا کام انجام دینا ہے۔

اس کمیٹی میں ضلع کے کلکٹر کو چیرمین اور ضلع پریشد ممتاز بینک اسٹیٹ لیول کارپوریشن اسٹیٹ الیکٹرک سٹی بورڈ اور ڈسٹرکٹ انڈسٹریز سینٹر کے عہدیداران شامل کئے جاتے ہیں۔

زیڈ یو ایم کے خاص فرائض این اے کی اجازت، بجلی کی منظوری یا زمین کا الاٹمنٹ لوکل / میونسپل / ٹاؤن پلاننگ اتھارٹیز کی طرف سے این او سی فیکٹری ایکٹ، بوائلر ایکٹ کے تحت رجسٹریشن وغیرہ کے کاموں میں مدد کرنا ہے۔

اُدیوگ متر نے اپنی ۱۰ سالہ کارکردگی کے دوران بے شمار اداروں کو مذکورہ امور کے سلسلے میں مدد فراہم کی ہے۔ اسی وجہ سے اُدیوگ متر کا نام لوگوں میں مقبول ہوتا جا رہا ہے۔

تمام یہ ادارے انجمنیں اور کارپوریشن مہاراشٹر میں صنعتی ترقی کے لیے ایک مثالی اور خوشگوار ماحول سازی میں مصروف ہیں۔

پروفیسر آئی۔یو۔خان
صدر شعبۂ جغرافیہ
برہانی کالج، بمبئی ۱۰۔۔۔۴

۴۱ ویں یوم جمہوریہ کے موقعہ پر ایک خاص مضمون

خدارا انھیں تم بھلا نہ دینا!

اس سال ہم جمہوریہ ہند کی ۴۱ ویں سال گرہ منا رہے ہیں
ن کے حصول کے آغاز ہی سے محنت و مشقتوں کے تجربات کے،
ی کی خاطر کی گئی کوششوں کے، ترقیات کے اور صناعتی،
، سائنسی اور فنی میدانوں میں عروج کے کئی سال بیت چکے ہیں!
اب تک ہم نے ہمارے ملک کو درپیش کئی ہمالیائی مسائل کو حل
ی کوشش کی ہے۔ اس دوران کئی بار ہم لڑکھڑائے بھی،
ی، کبھی غلطی بھی کی، بھٹک بھی گئے اور دوبارہ اپنا راستہ
ن کر لیا۔

حالانکہ بظاہر تو ایسا محسوس ہو رہا ہے ہم اپنی جمہوری اقدار
رہتے جا رہے ہیں لیکن ہندوستان کا جمہوریت پر یقین کبھی
نہیں۔ مجموعی طور سے ہماری عوام ایک متحد جمہوری نظام کے
ی خاطر مسلسل جدوجہد کر رہی ہے جہاں غریبی، جہالت،
رقات اور مذہبی غیر روا داری کا خاتمہ ہو۔

آج کے اس موقعہ پر ہمارے سر اُن لوگوں کے احترام میں عزت سے جھک جاتے ہیں جنھوں نے مادر وطن کی آزادی کے خاطر اُن کی جانیں نثار کیں۔ ایک مشہور شاعر " ایمرسن " (EMERSON) نے کیا خوب کہا ہے؛

" کسی ملک کو اگر طاقت یا عظمت کوئی بخشتا ہے تو وہ اس کے لوگ ہیں نہ کہ سونا "

آج تاتیا ٹوپے، ویلو تھمپی، پالیا تھابن، کٹا بومن اور ٹیپو سلطان جیسی سرخرو شخصیات کا ذکر کر کے ہمارا سینہ فخر سے پھول جاتا ہے جنکی بہادری اور شجاعت لاثانی اور بے نظیر ہے۔ علاوہ ازیں وہ انقلابی شخصیات بھی جیسے بھگت سنگھ، اشفاق اللہ خاں، ڈنگرا، چندر شیکھر آزاد، راجگرو، سکھدیو، بسمل، اور دیگر جنھوں نے عظیم برطانوی سامراج کے سامنے بے خوف ہو کر ان کی

مولانا محمد علی جوہر

سبھاش چندر بوس

شہید اعظم سردار بھگت سنگھ

جماعت کا لوہا منوایا۔ آج ہم انھیں نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

آزادی کی اس تحریک کو جن لوگوں کی لیڈر شپ یا رہبری حاصل ہو سکی انھیں سریندر ناتھ بنرجی، بدرالدین، طیب جی، گوکھلے، تلک، لالہ لجپت رائے، علی برادران، پٹیل برادران، مولانا آزاد، پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو، نیتاجی بوس، حکیم اجمل خان، حسرت موہانی، ستیہ مورتی، راجندر پرساد، راجاجی، رفیع احمد قدوائی، جی، بی، پنت، ڈاکٹر امبیڈکر، بابو جی، شیخ عبداللہ، چرن سنگھ، وائی، بی، چوہان، لال بہادر شاستری، کملاپتی ترپاٹھی، وسنت دادا پاٹل، خان عبدالغفار خان اور گاندھی جی جیسے نام سرفہرست ہیں۔ ہم ان کا قرض کبھی چکا نہیں سکتے۔

آزادی کی اس تحریک میں عورتیں بھی مردوں سے پیچھے نہیں تھیں۔ آزادی کے حصول کے خاطر انھوں نے بھی اپنی جانوں کی بازی لگا دی تھی۔ آج ہمارا حافظہ اس عورت کو یاد کرتا ہے جس کو لوگ جھانسی کی رانی کے نام سے یاد کرتے ہیں جس نے انگریزوں کے خلاف لڑتے ہوئے میدانِ جنگ میں جان دے دی ان عورتوں میں پنڈت تارا مابائی، ودیا گوری نیل کنٹھ، مسز رے، کملا دیوی چٹوپادھیا، صفیہ سومجی، سدھرا کاری چوہان، رکمنی، وجے لکشمی پنڈت، نیلی سین گپتا، اینی بیسنٹ، کملا نہرو، کستوربا گاندھی، سچیتا کرپلانی، اور اندرا گاندھی جیسے نام قابلِ ذکر ہیں!

بلبل ہند سروجنی نائیڈو کا شاعرانہ ترنم، تو رودت کے دل کو چھو لینے والی تشبیہات، ٹیگور کے اشعار سے تخلیق ہوئی آزادی کی صدائے بازگشت اور سبرامنیا بھارتی کے من موہک گیت، ان سب چیزوں نے تحریک آزادی کو جلا بخشی۔ اس کے علاوہ اس ضمن میں بہادر شاہ ظفر کی غزلیں، شنکار اکروپ کا کلام اور بنگالی نظموں کا جادوگر یہ داس، بھی تحریک آزادی میں نمایاں مقام رکھتے ہیں ان تمام نظموں اور شاعرانہ کلام نے ہمارے دماغوں میں بلند پایہ خیالات کی تخلیق کی اور ہمیں ہمارے وطن کی عظمت کا احساس دلایا ان اشعار نے ہمیں کاہلی کی تنگ و تاریک وادیوں سے نکالا اور ایک نئے سرے سے متحدہ ہندوستان کے تعمیر کی ترغیب دی۔

آج ہم ان اساتذہ کو بھی نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہیں جنھوں نے ہمیں شمع علم سے جلا بخشی۔ چاہے یہ اساتذہ پرائمری مدارس سے تعلق رکھتے ہوں یا اعلیٰ تعلیمی مدارس سے، یہ ہمارے احترام کے مستحق ہیں اس لئے کہ یہ ہمارے مستقبل کے امین ہیں۔ سابق صدر ڈاکٹر سروپلی رادھا کرشنن ایک مشہور فلسفی اور استاد تھے۔ سابق صدر ڈاکٹر ذاکر حسین، جناب مدن موہن مالویا، سرسید احمد خان، یہ حضرات ہماری قومی یونیورسٹیوں، جیسے جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، بنارس ہندو یونیورسٹی، بنارس اور علیگڑھ مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ کے معمار ہیں۔ یہ حضرات بھی ہمارے عزت و احترام کے مستحق ہیں۔

ا ویڈ واسودیو بلونت پھڈکے

ویر ساورکر

راجگرو

، ہم ہمارے ان نوجوانوں کو بھی سلام کرتے ہیں جو ہماری
یل طویل سرحد کی نگہبانی میں جٹے ہوتے ہیں ۔ نہ انھیں
م کی پرواہ ہے اور نہ ہی سنگدل زمین کی ۔ وہ ہمیشہ
بستہ ہیں ۔ وہ ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں پر، کچھ کی دلدلی
ور راجستھان کے ریگزاروں میں اپنے فرائض کی ادائیگی
ں تاکہ اگر دشمن نے ہمارے ملک میں جھانکنے کی بھی کوشش
ے منہ توڑ جواب دے سکیں علاوہ ازیں نہ صرف
وان جنگی میدان میں آگے رہے ہیں بلکہ امن و آشتی
بی ان کے تجربات اور کوششیں بھی لائق تحسین ہیں
ر کوریا کی مثال آئندہ نسلوں کے لئے مشعل راہ ہوگی۔

ی جوانوں میں میجر سومناتھ شرما ۔ سیکنڈ لیفٹننٹ رملنے ۔ پیرو سنگھ
ا نیک کرن سنگھ ، کیپٹن گرچرن سنگھ ۔ میجر دھن سنگھ تھاپا
جوگیندر سنگھ ، میجر شیطان سنگھ ۔ حوالدار عبدالحمید ۔ بریگیڈیر
ر لیفٹننٹ کرنل تاراپور کا نام قابل ذکر ہے جو دشمن سے
سپر ہوگئے اور اپنے ساتھیوں کیلئے بہادری اور شجاعت کا
ر گئے یہ ہمیں عزیز ہیں اس لئے کہ یہ ہماری آزادی کے
ت ہیں۔
سائنس اور ٹکنالوجی میں بھی ہمارے جن مادر وطن کے سپوتوں
ر فہرست ہے ان میں جگدیش چندر بوس ، راما نوجن ، بھابھا ،

کرشنن ، بھٹناگر ، نارلیکر ، وکرم سارا بائی ، الیس ، زیڈ قاسم ،
عبدالکلام وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں ۔
ادبی دنیا میں آر ، کے ، نارائن ، ملک راج آنند ، سنتھارا ما
راؤ ، ابرے مینن ، راجا راؤ چٹرجی ، امیتا پریتم ، پریم چند ، تاراشنکر
بینرجی ، بنکم چندر ، فراق گورکھپوری ، مرزا غالب ، ساحر لدھیانوی
شکیل بدایونی ، سردار جعفری ، خشونت سنگھ ، ایم جے اکبر وغیرہ
کے نام قابل ذکر ہیں ۔ انگریزی اور علاقائی زبانوں میں انکی تخلیقات
ادبیت کو جلا بخشتی رہیں گی ۔
سبھ لکشمی ، روی شنکر ، استاد بسم اللہ خان ، استاد امجد علی
خان وغیرہ یہ موسیقی اور فنون لطیفہ کے درخشاں ستارے ہیں ۔
پرتھوی راج کپور ، راج کپور ، وی شانتارام ، بی آر چوپڑہ ،
راما نند ساگر ، محبوب خان ، نرگس ، مینا کماری ، خواجہ احمد عباس ،
ستیہ جیت رے ، شیام بینگل ، سنیل دت ، نوشاد ، دلیپ کمار
سنجے خان ، امیتابھ بچن اور بہت سے دوسرے لیلے ہیں جنھوں نے
فلمی دنیا کو منور کیا ہے اور عوام کو تفریح کا سامان مہیا کیا ہے ۔
لتا منگیشکر اور محمد رفیع کا نام آواز کی دنیا میں زندہ جاوید رہیگا ۔
آج اس موقع پر ہم ان تمام حضرات کو بھی ہدیہ تہنیت پیش
کرتے ہیں جنھوں نے زراعی اور انجینرنگ کے میدانوں میں نمایاں
کامیابی حاصل کی ہے ۔ بند اور نہروں کی تعمیر کرکے انھوں نے زرعی
میدان میں ہندوستان کا چہرہ ہی تبدیل کر دیا ہے ۔ بجلی گھروں

لوک مانیہ تلک — گوپالکرشن گوکھلے — دامودر چافیکر

کی تعمیر کی۔ موٹر کاروں کی فیکٹریاں۔ ریلوے انجنوں کے مراکز، کپڑوں کی ملیں وغیرہ نے ہندوستان کو ایک عظیم صنعتی مرکز میں تبدیل کر دیا ہے۔ ہندوستان میں صنعتی ترقی کا سہرا جمشید جی ٹاٹا کے سر جاتا ہے انھیں یاد کرنا بھی ہمارا فرض ہے۔

نامناسب ہوگا اگر ہم اس موقع پر ہم ہمارے کسانوں اور مزدوروں کو نہ یاد کریں جو موسم کی پرواہ نہ کرتے ہوئے دن رات اور ہمہ وقت اپنے وطن کی ترقی کیلئے کوشاں رہتے ہیں۔

ہمارے یہ جذبات جو عقیدت سے بھرپور ہیں، آج ہم ان تمام ہندوستانیوں تک پہنچانا چاہتے ہیں چاہے وہ سماج کے کسی بھی طبقے سے تعلق رکھتے ہوں۔ ادنیٰ یا اعلیٰ۔ جو کسی بھی وقت اپنے اغراض و مقاصد کی تکمیل سے غافل نہیں ہوتے ہیں اور جن میں ایمانداری، اخلاص، جوش و خروش، شجاعت، ہمت، ارادے کی پختگی، قربانی، خدمت اور عمل کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے اور جو ہمارے وطن عزیز کو قوت اور طاقت عطا کرتے ہیں!

ہمارا یہ وطن اعلیٰ اخلاقی اقدار کا وطن ہے یہاں مختلف مذاہب کے فلسفے پائے جاتے ہیں۔ یہاں شنکرا، ویویکانند، راماکرشنا، نانک، بدھ، مہاویر، اجمیر کے خواجہ غریب نواز، حضرت نظام الدین، امیر خسرو، عبدالرحیم خان خاناں جیسے انسانیت کے علم بردار پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے محبت و پریم کا درس دیا۔ یہ وہ سرزمین ہے جس پر اشوک، اکبر، چندرگپتا، شیواجی، رنجیت سنگھ، حیدرعلی جیسے سورماؤں نے حکومت کی آیئے آج ہم عہد کریں کہ اپنی آخری سانس تک اس مادرِ وطن کی حفاظت کریں گے، اس کی آزادی کو محفوظ رکھیں گے اور اسے ایک ایسا مثالی ملک بنا دیں گے۔ جہاں آزادی، مساوات اور بھائی چارگی کا حقیقت میں دور دورہ ہو۔

رقمِ خریداری

بذریعہ منی آرڈر بھجوائیں۔ وی۔ پی۔ پی نہیں بھجوائی جاتی ہے۔ منی آرڈر کوپن پر اپنا نام و پتہ صاف صاف اردو کے ساتھ ہندی یا مراٹھی میں بھی لکھ دیں۔ اس طرح رسالہ فوراً ہی جاری ہو سکے گا۔

(ادارہ)

کوثر آفتاب
راجیہ بھاشا دبھاگ - منیا ٹانڈ بلاک (بہار)

جنگِ آزادی کا "گاری بالڈی"

"GARI BALDI"

سبھاش چندر بوس

سبھاش چندر بوس، جنھیں "نیتاجی" کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ جنگِ آزادیٔ ہند کے انقلابی مجاہدوں میں منفرد حیثیت کے حامل تھے۔ انگریزی سامراج کے سامنے آزادی کی بھیک مانگنا نہیں گوارہ نہیں تھا۔ وہ تلوار کے زور پر ہندوستان کو فرنگیوں سے نجات دلانے کے حق میں تھے۔

نیتاجی دو مرتبہ ۱۹۳۸ء اور ۱۹۳۹ء میں کانگریس کے صدر منتخب ہوئے لیکن اعلیٰ کمان سے اختلاف کی وجہ سے انھوں نے کانگریس سے استعفیٰ دے دیا۔ اختلاف کی وجہ "جنگ آزادی" ہی تھی۔ کانگریس کے اہم اراکین پنڈت جواہر لال نہرو اور دیگر افراد کا جھکاؤ روس کی جانب تھا وہ اس ضمن میں روس کی ہمنوائی اور اس سے اشتراک کے حامی تھے جبکہ نیتاجی ہٹلر سے اشتراک کے حامی تھے۔ لحاظہ انھوں نے کانگریس چھوڑنے کے بعد فارورڈ بلاک کو تشکیل دیا اور "آزاد ہند فوج" تیار کی۔

۲۶ جنوری ۱۹۴۱ء کو نیتاجی اپنے گھر (کلکتہ) سے خفیہ طور پر غائب ہو گئے۔ ہندوستان سے وہ جرمنی پہنچے اور پھر جاپان جا پہنچے۔ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ نیتاجی نے جاپان سے اشتراک کیا اور انگریزوں

کو ہندوستان سے نکالنے کا پکا ارادہ کیا۔ ۱۸ مارچ ۱۹۴۳ء کو آزاد ہند فوج نے انگریزوں پر پہلا حملہ کیا۔ اس وقت نیتاجی سبھاش چندر بوس نے اپنے ساتھیوں کو کہا تھا "ہمارے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ ہم یا تو دلی میں داخل ہو کر فتحیاب ہونگے یا ہماری لاشیں مادرِ ہند کی دھول چومیں گی۔ ہماری فوج ہندوستان کی غلامی کی زنجیر توڑے گی۔ ہم نہیں جانتے کہ ہم میں سے کتنے لوگ اس فتح و کامرانی کو دیکھ سکیں گے۔ لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ فتح ہماری ہوگی۔ آج میں آپکو بھوک پیاس، درد و تکلیف نیز بے بسی کے سوا کچھ بھی نہیں دے سکتا، لیکن ان سب سے بڑا اور گرانقدر تحفہ "ہندوستان کی آزادی" ہوگی!

دہلی کے لال قلعہ میں "آزاد ہند فوج" کے کئی افران پر غداری کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا ان میں کرنل شاہ نواز، کیپٹن سہگل اور ڈھلن کا نام اہم ہے۔ کانگریس لیڈر بھولا بھائی ڈیسائی نے ان افران کے مقدمہ کی پیروی کی اور رہائی دلوائی۔

نیتاجی سبھاش چندر بوس کو شاید یہ قبل از وقت ہی احساس ہو گیا تھا کہ وہ اب اپنے وطن کو نہیں لوٹ سکیں گے۔ انھوں نے دنیا میں جرمنی چھوڑنے سے قبل ہی اپنے بڑے بھائی شرت چندر بوس کے نام ایک خط لکھ کر اپنی شریک حیات کو سونپ دیا اور یہ تاکید کر دی کہ جب بھی شرت بھائی یہاں آویں تو اس خط کو انہیں دے دینا۔ اپنے بڑے بھائی کو نیتاجی نے لکھا تھا۔

" پرستش مآب دادا،

ایک بار پھر آج پر خطر سفر پر چل پڑا ہوں۔ اس سفر کا رخ مادرِ وطن ہے۔ ممکن ہے اس سفر کا انجام میں نہ دیکھ سکوں۔ کہیں درمیان سفر ہی میری زندگی نے ساتھ چھوڑ دیا تو پھر آپ کو خط بھی نہ لکھ پاؤں گا۔ اس لئے یہ خط سفر سے پہلے ہی چھوڑے جا رہا ہوں، جو آپ کو قبل از وقت مل جائے گا۔ میں نے یہاں پر شادی رچالی ہے میری ایک بیٹی بھی ہے۔ میرے نہیں رہنے پر میری بیوی اور بچی کو آپ سے اسی شفقت کی توقع رکھتا ہوں جو آپنے پوری زندگی مجھ پر نچھاور کیا۔ بھگوان سے میری پرارتھنا ہے کہ وہ میری بیوی اور بیٹی کو میرے ادھورے چھوڑے فرض کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کامیابی عطا کرے۔

میرا اسلام عقیدت قبول فرمائیں۔ ماں جی اور ریج بوندی، دیگر سب ہی بڑوں کو سلام عقیدت!

آپ کا پیارا بھائی،
سبھاش
برلن ۸ فروری ۱۹۴۳ء "

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ نیتاجی کے بغیر ہندوستان کو غلامی کی زنجیر سے آزاد کرانے میں اور بھی زیادہ تاخیر ہو سکتی تھی اس امر کی تصدیق اس بات سے ہوتی ہے کہ ۱۹۵۶ء میں کلکتہ کے عارضی گورنر جناب یعنی بھوشن چکرورتی نے انگلینڈ کے سابق وزیر اعظم لارڈ اٹلی کے ہندوستان تشریف لانے پر دریافت کیا 'تھا' اچھا سر! آپ لوگ اتنی جلدی بھارت چھوڑ کر کیوں چلے گئے، جواہر لال نہرو کے خوف سے یا پھر کانگریس کی وجہ سے!

اٹلی کا جواب تھا "نہیں، نہیں! ان میں سے کسی کے خوف سے ہم نہیں گئے۔ ہمیں جانا پڑا اپنی فوج کی وجہ سے ہماری فوج ہی ہمارے خلاف ہو گئی، اس کا ایک ہی سبب تھا سبھاش چندر بوس! انھوں نے ہماری فوج کو ہم سے ورغلا دیا تھا۔ جب ہماری فوج ہی ہمارے خلاف ہو گئی تو بھلا ہم کس کے بل بوتے پر حکومت کرتے، صرف آرمی (Army) نے ہی نہیں بلکہ نیوی (Navy) کے لوگوں

نے بھی دو دو بار بغاوت کر دی تھی "

کہا جاتا ہے کہ ۱۸ اگست ۱۹۴۵ء کو ایک ہوائی حادثہ میں نیتاجی سبھاش چندر بوس کی وفات ہوگئی۔ لیکن دی ٹرانسفر آف پاور The Tranfer of Power کے دفعہ ۱۶ الف کے صفحہ ۱۰۰ پر یہ تحریر ہے "۲۳ اگست ۱۹۴۵ء کو خط کے ذریعہ لارڈ باویل نے لارڈ پیتھک لارینس سے دریافت کیا تھا کہ "سبھاش چندر بوس کو اب کہاں رکھا جائے" اس کے علاوہ اب تک کئی بار سبھاش چندر بوس (نیتاجی) کے زندہ رہنے اور نظر بند و مقید رہنے کا ذکر ہوتا رہا ہے۔ لیکن وہ کہاں ہیں اور کس حالت میں ہیں اس کی کوئی سند آج تک نہیں مل سکی۔ اور نہ آزادی کے بعد حکومت ہند نے اس ضمن میں کوئی مثبت اقدام ہی کیا ہے۔

غرض کہ نیتاجی سبھاش چندر بوس کے ذریعہ ہندوستان کی آزادی کی خاطر کئے گئے اقدامات ' خدمات و کارنامے کو ہندوستان سدا یاد رکھے گا۔ اور ان کو ہندوستان کی جنگ آزادی کا گاری بالڈی "GARI BALDI" کے نام سے جانا جاتا رہے گا۔

اردو کی ممتاز ادیبہ قرۃ العین حیدر کو پچھلے دنوں وزیر اعظم چندر شیکھر نے گیان پیٹھ ایوارڈ پیش کیا۔ فراق گورکھپوری کے بعد اردو کی وہ دوسری اہل قلم اور دنیائے ادب کی چوتھی خاتون ہیں جنھیں ہندوستان کے اس اہم ادبی ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔

صفحہ ۲۴ سے آگے

ڈاکٹر مختار احمد انصاری

اور شہرت رکھتے تھے، سیتر گرمی بن گئے۔ انہوں نے دلی پردیش کانگریس کی بنیاد ڈالی۔ کانگریس کے اندرونی حلقوں میں ان کے مشوروں کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ وہ انڈین نیشنل کانگریس کے صدر بنائے گئے اور اس طرح نو آبادیاتی نظام کے دوران قوم نے ان کو وہ اعلیٰ ترین اعزاز بخشا جو اس کے بس میں تھا۔

ان کی شخصیت بے داغ تھی، اپنی زندگی میں وہ ہندو، مسلمان، روایت اور جدت، قدیم اور جدید کے درمیان ایک پل کا کام دیتے تھے۔۔۔ ڈاکٹر انصاری ہر طرح کی تنگ نظری سے پاک تھے اور ان کی مہمان نوازی ضرب المثل بن گئی تھی، وہ بڑوں اور چھوٹوں کو یکساں عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ہر سچا قومی کارکن ان کا عزیز مہمان تھا۔ آج ہمیں پھر ڈاکٹر انصاری کی خدا ترسی اور انسانیت، قومی خدمت کیلئے خود کو وقف کر دینے کا جذبہ۔ مذہبی جنون سے پاک و صاف ہونا نیز دیگر مذاہب اور پیشوں کے لوگوں کے لئے احترام اور نیک دلی کی ضرورت ہے، جن کے وہ مظہر تھے۔

برجا پریمی
ریڈر شعبہ اردو
کشمیر یونیورسٹی۔ حضرت بل
سرینگر ۱۹۰۰۰۶ (کشمیر)

مولانا ابوالکلام آزاد

بحیثیت انشاپرداز

جواہر لال نہرو نے ابوالکلام آزاد کے انتقال پر کہا تھا

"میں نہیں کہتا کہ مولانا آزاد کے بعد ہندوستان میں عظیم انسان پیدا ہی نہیں ہوں گے۔ یقیناً پیدا ہوں گے۔ لیکن جو تہذیب و تعزیب اور مخصوص عظمت مولانا آزاد کو حاصل تھی۔ وہ اب نہ تو ہندوستان میں کسی کو نصیب ہوگی۔ نہ ہندوستان کے باہر۔ کسی کے حصہ میں آئے گی"

پنڈت نہرو کے اس بیان میں شاید زیادہ مبالغہ نہیں۔ اس لئے کہ مولانا کی شخصیت بیک وقت کئی خانوں میں بٹی ہوئی تھی۔ وہ ایک مدبر، ایک سیاست داں، ایک خطیب، ایک اعلیٰ پایہ کے صحافی، اور سب سے بڑھ کر ایک ادیب انشاپرداز تھے۔ ہندوستان کی تحریک آزادی کے ایک جانباز سپاہی سے قطع نظر، بنیادی طور پر وہ ایک ادیب تھے۔ لیکن سیاست کے خارزاروں میں پڑ کر انہیں اتنی فرصت نہیں ملی تھی کہ وہ ادبی میدان میں اپنے قلم کی بھرپور جولانیاں دکھا سکے کہ جو ان کا پہلا عشق تھا۔ انہیں قید و بند سے اتنی فرصت کہاں ملتی تھی۔ لیکن اس کے باوصف انہوں نے اتنا سرمایہ چھوڑا ہے کہ اس بات کا یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ ایک ادیب کی حیثیت سے زیادہ نمایاں تھے یا ایک سیاست داں کی حیثیت سے۔ ابھی انہوں نے جوانی کی سرحد میں قدم رکھا ہی تھا کہ اپنے الہلال اور البلاغ کے مضامین سے آگ لگا دی۔ اردو ادب میں ان مضامین کا ایک منفرد مقام ہے۔ طنز، مزاح، فصاحت، اور خطابت کی آمیزش سے استوار ایسا اسٹائل پورے اردو ادب میں کہیں نظر نہیں آتا، انہوں نے اپنی سیاسی سرگرمیوں کو اپنی نگارشات کے نزدیک پھر حاوی ہونے نہیں دیا۔

مولانا کے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز شعر و شاعری سے ہوا تھا۔ لیکن یہ میدان ان کو راس نہ آیا۔ اس لئے نثر کو اپنی جولان گاہ بنایا اور ایسی نثر جس کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عبداللہ نے کہا کہ ابوالکلام کا امتیاز ان کی بارعب نثر ہے۔ مولانا نے نثر ہی کے مختلف شعبوں میں قلم چلا کر بڑا مقام پیدا کیا۔ نکتہ سنجی انشاپردازی، علم و فضل کی شان، ان کی نثری خصوصیات میں، جو اردو میں بہت کم لوگوں کے حصے میں آیا ہے۔

مولانا کی مضمون نویسی سے دلچسپی کا سب سے بڑا، اور واضح ثبوت الہلال اور البلاغ کے صفحات ہیں۔ الہلال میں انکے

مضامین کی اٹھان ہی ان کے اسلوب کے جاہ و جلال کو واضح کرتی ہے

عبدالرزاق قریشی نے الہلال کے تناظر میں بڑے پتے کی بات کہی تھی۔

"الہلال کی آواز اونچے پہاڑ سے گرتے ہوئے آبشار کے مانند تھی، آبشار خوبصورت بھی ہوتا ہے، اور پر جلال بھی۔"

الہلال کے مضامین کے ساتھ ہی مولانا کے نثری اسلوب کا جاہ و جلال سامنے آگیا۔ اگرچہ یہ مضامین صحافتی نثر میں لکھے گئے تھے۔ لیکن۔ ان میں واضح طور پر ادبیانہ رنگ ملتا ہے۔ مولانا کے اس خوبصورت اسلوب کو دیکھ کر اس وقت کے ایک اور بڑے صحافی۔ اور شاعر حسرت موہانی نے کہا تھا۔

جب سے دیکھی ابو الکلام کی نثر
نظم حسرت میں وہ مزا نہ رہا

ذکر ہو چکا ہے کہ ابو الکلام نے ابتداء میں اظہار خیال شعر کی وساطت سے کیا تھا۔ لیکن جب یہ میدان راس نہ آیا تو نثر کو جولان گاہ بنایا۔ چنانچہ سب سے پہلے انہوں نے ہفت روزہ "الصباح" نکالا۔ پھر "احسن الاخبار" کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔ اس کے بعد انہوں نے کئی اخبار جاری کئے۔ لسان الصدق، الہلال، البلاغ ان میں قابل ذکر ہیں۔ ان ہی اخبارات کے ذریعہ مولانا نے اپنی قوم کو بیدار کرنے کے لئے شعلہ زنی کی تھی۔ ان کا مشہور مضمون "میں وہ صور کہاں سے لاؤں" الہلال ہی میں شائع ہوا تھا جس نے ایک آگ لگا دی تھی۔

مولانا اپنے قلم سے محض سچے محب وطن اور ایک بیدار نظر سیاست داں کا کردار ادا نہیں کرتے۔ بلکہ وہ نثر کے نئے انداز سے گل بوٹے سجاتے ہیں۔ مولانا لفظ و معنی کے رشتے کو سمجھتے تھے۔ اسلئے وہ نثر کا ایسا اسلوب ایجاد کر سکے جس میں تخلیقی حسن کی پوری توانائی تھی۔ انہوں نے صرف صحافتی ذمہ داریاں نہیں نبھائیں بلکہ متنوع موضوعات پر قلم اٹھایا۔ لیکن

بیان کے جاندار اور زندہ اسلوب کا اعجاز ہے کہ علمی مباحث میں بھی ان کے یہاں سپاٹ پن نہیں پایا جاتا۔

مولانا نے اپنی گوناگوں قومی اور سیاسی ذمہ داریوں کے باوصف کئی بڑے کارنامے انجام دئے۔ مقالات آزاد، تبرکات آزاد، مضامین آزاد، ترجمان القرآن، غبار خاطر اور دوسرے مکاتیب ایک سے بڑھکر ایک کارنامہ ہے۔ جن میں مختلف علمی، ادبی، سیاسی، سماجی، دینی، فلسفیانہ موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اور ہر جگہ آپ اپنے موضوع کے ساتھ مطابقت رکھتے ہوئے الفاظ کے موتی پروتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ غبار خاطر کے دیباچے میں محمد اجمل خان نے اس بات کی طرف واضح اشارہ کیا ہے۔

"حضرت مولانا کی زندگی مختلف اور متضاد حیثیتوں میں بٹی ہوئی ہے۔ وہ ایک ہی زندگی اور ایک ہی وقت میں مصنف بھی ہیں، مقرر بھی، مفکر بھی، ادیب بھی، مدبر بھی، فلسفی بھی اور ساتھ ہی ساتھ سیاسی جدوجہد کے میدان کے سپہ سالار بھی۔ علمی اور فکری زندگی کا میدان عملی سیاست کی جدوجہد سے اتنا دور واقع ہوا ہے کہ ایک قدم دونوں میدانوں میں بہت کم اٹھ سکتا ہے۔ مگر مولانا آزاد کی زندگی ان تمام مختلف اور متضاد حیثیتوں کی جامع ہے گویا ان کی ایک زندگی میں بہت سی زندگیاں جمع ہو گئی ہیں۔"

یہی سبب ہے کہ ان کا طرز تخاطب، ہمیشہ مختلف رہا ہے۔ اور انہوں نے الگ الگ موضوعات کے لئے الگ الگ اسالیب وضع کئے ہیں ان کی تخلیقی شخصیت مختلف حصوں میں بٹی ہوئی نظر آتی ہے بعض اوقات اس بات پر یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ مختلف تحریریں ایک ہی شخص کے قلم سے نکلی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا نثری اسلوب تاثراتی بھی ہے۔ مکاتیبی بھی، انانیتی بھی، اور

خطیبانہ بھی، ان کے یہاں رنگ برنگے پھول ہیں۔ جن کی مہک مختلف ہے۔ ہر خوشبو اپنی جگہ معطر کرنے والی، ہر رنگ من موہ لینے والا، مگر ایک دوسرے سے الگ، سردار جعفری نے بڑے ہی دلنشیں الفاظ میں ان رنگوں کو سمیٹ لیا ہے۔

"مولانا آزاد کا اسلوب نگارش وہ ہے جس میں تشبیہوں اور استعاروں، سے پھول کھلتے ہیں اور حسن معنی کے چہرے سے نقاب اٹھنے کے بجائے اس پر پردہ ڈالنے کے لئے، اور عشق و قلب کی آگ تیز کرنے اور ذوق نگاہ کو بے تاب کرنے کے لئے استعمال کئے گئے ہیں

اور یہ ایک بڑی بات ہے۔"

مولانا ایک صاحب طرز انشاپرداز ہیں۔ علمی، ادبی، سیاسی، اور فلسفیانہ سطح پر وہ مخصوص تصورات اور خیالات رکھتے ہیں، لیکن بڑی بات یہ ہے کہ وہ ان تصورات کو متناسب اور متوازن ڈھنگ سے الفاظ میں ڈھال سکنے پر قادر ہیں۔ یہی، خصوصیت ان کو ایک بڑا انشاپرداز بناتی ہے۔ وہ اپنے قاری کو اپنے ساتھ بہا لے جا سکتے ہیں۔ اس لئے انہیں ایک منفرد انشاپرداز کہنا بے جا نہیں۔ اسالیب کے تنوع کے باوصف ان کے یہاں خطیبانہ اسلوب کی زیادہ چھاپ نظر آتی ہے۔ لیکن یہ اسلوب شعلہ بیان مقرر کا نہیں بلکہ یہ معنوی اور صوری دونوں اعتبار سے ایک خوبصورت تاثر پیدا کرتا ہے۔

مولانا کے نثری اسلوب کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ الفاظ کے بلیغ استعمال سے جگاتے ہیں۔ اور بلاغت کا پورا حق ادا کرتے ہیں۔ ان کا مطمح نظر محض ایک نقطے کی وضاحت کرنا نہیں ہے بلکہ یہ ہوتا ہے کہ اس مخصوص کیفیت کو قاری تک پہنچا دیں، اور اسے اس کا احساس کرا دیں۔ ان کا مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ معنی کی ان مختلف سطحوں کو بھی قاری پر واضح کر دیں، جن کو انہوں نے لفظوں میں اتار دیا ہو۔ یہ صحیح ہے کہ سیاسی، فلسفیانہ، یا دینی مباحث کو سمجھانا ایک جان لیوا کام بھی ہے۔ اور خشک اور بے حد دقیق کام ہے۔ لیکن مولانا کا انداز نگارش ان مباحث کے بیان میں حسن و تاثیر کے عناصر آمیز کرتا ہے

ذکر ہو چکا ہے کہ مولانا عام دینی اور علمی موضوعات کے لئے ایک اسلوب برتتے ہیں۔ صحافت کے لئے ان کا اسلوب دوسرا ہے۔ اور خالص انشاپردازی کے لئے ان کا اسلوب بالکل علیحدہ ہے۔ لیکن ان کا حاوی اسلوب شاعرانہ ہے۔ جسے شعر منثور کہا گیا ہے۔ یعنی وہ نثر میں شاعری کرتے ہیں۔ طرہ یہ ہے کہ حالانکہ شعر کسی اور کا ہوتا ہے۔ لیکن وہ اپنی عبارت میں اس کو اس طرح جوڑتے ہیں کہ وہ عبارت کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ اور قاری کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ شعر اسی موقعہ کے لئے کہا گیا ہو۔ مولانا کا حافظہ غضب کا ہے۔ ان کے حافظے میں اردو، فارسی، اور عربی اشعار کا ایک نہ ختم ہونے والا ذخیرہ موجود ہے۔ جس کا استعمال وہ وقت ضرورت محل اور موقعہ کے مطابق کرتے ہیں۔ ان اشعار کا ایک فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ مولانا کے مفاہیم واضح ہو جاتے ہیں یہاں ایک بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ مولانا دینی مباحث کے لئے اشعار کا استعمال کبھی نہیں کرتے۔

ذکر ہو چکا ہے کہ مولانا مختلف اسالیب پر قادر ہیں۔ مگر ان کی انشاپردازی کا اصلی رنگ ان کی انانیتی اور تاثراتی تحریروں میں نکھرا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ان کا خاص امتیاز ان کی نادر تشبیہات اور استعارے ہیں۔ ان کے ادبی مقالات میں ان کا تاثراتی انداز اور بھی خوبصورت اور زود اثر محسوس ہوتا ہے کہیں۔ کہیں انہوں نے علامتوں کا استعمال بھی کیا ہے۔ یہ ایسے مقامات ہیں جہاں وہ داخلی کیفیات کا اظہار کرنا چاہتے ہیں۔ علامتوں کے برتاؤ سے ان کی تحریروں میں تہہ داری پیدا ہوتی ہے۔ مولانا نے کہیں۔ کہیں طنز و مزاح کو بھی بروئے کار لایا ہے لیکن اس میں ایک خاص سلیقہ اور شائستگی ملتی ہے۔ وہ زیر لب تبسم کے قائل ہیں۔ اور ایسا کرنے کے لئے ان کا مزاح ایک خاص رنگ کا حامل ہوتا ہے۔ اس طرح کے مزاح میں جو طنز چھپی ہوئی ہوتی ہے اس کا اثر گہرا اور تیکھا ہوتا ہے۔ یہ مولانا کا خاص رنگ ہے۔

مولانا کی انشاپردازی غبارِ خاطر اور کاروانِ خیال کی ۔ تحریروں میں خاص طور پر نظر آتی ہے ۔یہاں ان کی تحریروں کی سلاست، احساس جمال، جذبے ، تخیل اور احساس کا پورا حسن دو بہ خود واہو جاتا ہے ۔ اور ان کی انشاپردازی کا ایک ایسا نقش مرتسم ہوتا ہے جس کی مثال شاید ہی اردو ادب میں کہیں اور نظر آئے ۔مولانا کی انشاپردازی کا ایک ہلکا سا اندازہ ان تحریروں میں بغیر کسی شعوری کوششوں کے از خود غیر محسوس طریقے سے ہوتا ہے ۔ میں صرف چند مثالوں پر اکتفا کروں گا ۔

"میں آپ کو بتلاؤں اس راہ میں میری کامرانیوں کا راز کیا ہے ۔ میں اپنے دل کو مرنے نہیں دیتا کوئی حالت ، کوئی جگہ ہو ، اس کی تڑپ کبھی دھیمی نہیں پڑے گی ۔ میں جانتا ہوں کہ جہاں زندگی کی ساری رونقیں اس میکدۂ خلوت کے دم سے ہیں یہ اجڑا اور ساری دنیا اجڑ گئی "۔

(غبارِ خاطر)

"آہ ! میں کیا کروں اور کہاں جاؤں اور کس طرح تمہارے دلوں کے اندر اتر جاؤں ۔ کس طرح ہو کہ تمہاری روحیں پلٹ جائیں ۔ اور تمہاری غفلت خاطر یہ کیا ہو گیا ہے کہ پاگلوں سے بھی بد تر ہو گئے ہو ۔ کیوں تمہاری عقلوں پر ایسا طاعون چھا گیا ہے کہ سب کچھ کہتے اور سمجھتے ہو پر نہ راست بازی کی راہ تمہارے آگے کھلتی ہے ۔ اور نہ گمراہوں کے نقش چھوڑتے ہو ۔"

(تحریکِ آزادی)

"میں وہ صور کہاں سے لاؤں جن کی آواز چالیس کروڑ دلوں کو خواب غفلت سے بیدار کر دے میں اپنے ہاتھوں میں وہ قوت کیسے پیدا کروں جس کی سینہ کوبی کے شور سے سرگشتگانِ خواب موت اور ہشیار ہو جائیں .... کہاں ہیں وہ جگر جو آتش عزت و حمیت کی سوزش کے لذت آشنا ہیں پھر آہ ! کہاں ہیں اس برہم شدہ انجمن کے ماتم گسار ، اس برباد شدہ قافلہ کے نالہ ساز ، اس صفِ ماتم کے فغاں سنج اور اس کشتیٔ طوفان کے مایوس مسافر جن کی موت و حیات کے آخری لمحے جلد جلد گذر رہے ہیں ۔

(الہلال)

مولانا کی تحریریں اس طرح کے لعل و گہر سے بھری ہوئی ہیں ۔جن کے مطالعہ سے قاری پر وجد طاری ہوتا ہے ۔ اور اسے ایک زندہ ، ایک شگفتہ ، ایک شاعرانہ ، اور ایک بہت ہی خوب صورت انداز اور اسلوب تحریر کا احساس ہوتا ہے ۔جس کی پورے اردو کے نثری ادب میں کوئی دوسری مثال نہیں ملتی ۔ یہی خصوصیت ان کو اردو کا ایک بہت بڑا صاحب طرز انشا پرواز بناتی ہے ۔

مضمون نگار حضرات سے گذارش

• فل اسکیپ کاغذ کے صفحہ ایک طرف صاف اور خوش خط تحریر فرمائیے ۔

• کاربن کاپی یا زیروکس کاپی کے بجائے اصل مسودہ روانہ فرمائیے ۔ اور آخر میں اپنا نام اور پتہ ضرور لکھ دیجیے ۔

• صرف غیر مطبوعہ تخلیقات روانہ فرمائیے ۔ مضامین کی نقل اپنے پاس محفوظ رکھیے ۔

• غیر طلب یدہ تخلیقات کا معاوضہ دینے یا نہ دینے کا فیصلہ ادارہ کرتا ہے

اس سلسلہ میں توجہ یا کسی بھی یاددہانی کی ضرورت نہیں ہے ۔

(ادارہ)

مردِ آہن پنڈت جواہر لال نہرو

سمیع الدین اطہر
ضلع پریشد مڈل اسکول
چھاونی اورنگ آباد (مہاراشٹر)

۱۴ نومبر ۱۸۸۹ء کی اولین ساعتوں میں الٰہ آباد میں واقع آنند بھون محل میں ایک نومولود کی پیدائش پر مسرتوں کے چراغ جل اٹھے جس کا نام جواہر لال نہرو رکھا گیا، موتی لال نہرو ان معنوں میں بہت ہی خوش نصیب انسان تھے کہ انھیں دنیا کی ہر آسائش کے ساتھ ساتھ ان کے مقدر کا ستارہ انتہائی عروج پر جگمگا رہا تھا ایسے میں یہ بلند اقبال صاحبزادے ان کے گھر جنم لیا کہا جاتا ہے کہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، پیدائش کے فوری بعد اس لڑکے کی عمر جیسے جیسے بڑھتی گئی بلند اقبالی کے جوہر نظر آنے لگے، تعلیم میں ہوشیار کھیل میں طاق بذلہ سنجی میں یکتائے روزگار ظرف نگاہی میں مشہور غرض یہ ہے کہ جب ان کی عمر صرف پندرہ برس تھی انھیں انگلستان کے مشہور پبلک اسکول میں داخلہ مل گیا، ۱۸ سال کی عمر میں انھیں ٹرینیٹی کالج کیمبرج میں داخلہ مل گیا ۱۹۱۲ء میں انھوں نے بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے ہندوستان واپس ہوئے انھیں بچپن ہی سے میدانِ سیاست سے دلچسپی تھی چنانچہ انگلستان کے قیام کے دوران انھوں نے کالج میں کئی مواقع پر سوسائیٹیاں بنائیں اور تقاریری مقابلوں میں ہمیشہ امتیازی مقام پایا، انھیں بچپن ہی سے انگریزوں کے ظلم و ستم اور ان کی بربریت کے مشاہدات کا موقع ملا تھا چنانچہ انگلستان سے واپسی کے وقت ان کے ذہن میں ہندوستان کی آزادی کا ایک تخیلی خاکہ تیار ہو چکا تھا وطن واپس آنے کے بعد گاندھی جی سے ملاقاتیں ہوتی رہیں اور

،وستان کے دیگر لیڈروں مثلاً ، بال گنگا دھر تلک، مدن موہن
یہ، سبھاش چندربوس، سپرو، آزاد، سرینواس شاستری جی جیسے
نیتاؤں کی مسلسل صحبت نے ان کے اس جذبۂ حریت آزادی
یمز کر دیا اور اسی طرح پنڈت جی رفتہ رفتہ سیاست میں
ی طور پر داخل ہوگئے ان تمام بیرونی مجلسی صحبتوں سے
لاوہ خود ان کے گھر میں آنجہانی موتی لال نہرو جو ابتدا میں
رٹش حکومت کے ہی بہی خواہوں میں شامل تھے لیکن رفتہ رفتہ
ن کا ذہن حکومت کے خلاف اقدامات پر آمادہ ہوگیا اور اسی طرح
ہند کا یہ مایۂ ناز سپوت (پنڈت جواہرلال نہرو) اندرونی و بیرونی
حول سے متاثر ہوتا گیا اور بالآخر اس نے عملی قربانیوں کی
زرگاہوں سے گذرتے ہوئے ہندوستان کی آسمان سیاست
ایک درخشندہ آفتاب بن کر چمکنے لگا۔ ان کی زندگی کے
اقعات اور مہاتی تفاصیل کا اگر تفصیلی جائزہ لیا جائے تو
درخ کو ان سارے واقعات کی تفصیل لکھنے اور اس پر تبصرہ
رنے عمر خضر درکار ہے۔

عبارت مختصر آج جبکہ ہم سارے ملک میں ان کی زندگی کی
پہلی صد سالہ برسی منانے جا رہے ہیں تو ایسے میں ضروری
ہوتا ہے کہ اس اہم تقریب پر ہم مختصراً سہی ان کی زندگی پر روشنی
ڈالیں جن عوام نے انھیں جواہرلال نہرو سے ہندوستان کے
وزیر اعظم کے عہدۂ جلیلہ پر پہنچا دیا تھا۔

سیاست کے میدان میں آنے کے بعد جو صعوبتیں اور
قربانیاں انھوں نے عوام کی تقدیر بدلنے کیلئے پیش کی ہیں انکی
تفصیلات بھی بڑی طویل ہیں تلک کی ستیہ گرہ میں شمولیت مختلف
اوقات میں جیل یاترا، اپنی شریک حیات کی بیماری میں ان سے
دوری، دنیوی حیثیت سے حشمت و جاہ رکھتے ہوئے عوام کے
شانہ بہ شانہ جیلوں کی مشقت پیسہ دولت پاس ہوتے ہوئے
غرباء کے ہمراہ فقر و فاقہ یہ سارے واقعات بجائے خود ایک
بڑے مطالبہ کیلئے مقابلے پر ڈٹ جانے کا زندہ شاہکار ہے
اور اس طرح اپنی ان تھک محنتوں اور صعبتوں کے بعد ۱۵ اگست
۱۹۴۷ء کو اپنے مشن میں کامیاب ہوکر آزادئ ہند کا اعلان
کرتے ہوئے لال قلعہ پر ترنگا پرچم لہرا دیا اور تاریخ کے باب
میں ایک آزاد ملک کے قیام کا ثبوت پیش کر دیا۔

نہرو جی نے سوشلزم کی تعلیم دی تھی انھوں نے فرقہ

پرستی کے خلاف اجتہاد کیا تھا، آزادیٔ وطن کے بعد ملک کیلئے دستور ہند کی تدوین کروائی اور ۲۶ر جنوری ۱۹۵۰ء سے سارے ملک میں اس کو لاگو کروا دیا خارجہ پالیسی میں اپنا منفرد انداز اپنایا جنگ کے مہیب آثار کو دیکھ کر نا وابستگی کی پالیسی اپنائی اور اقوام عالم کی صفوں میں ہندوستان کی شمولیت سے ملک کا وقار بلند کیا۔

سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں اس قدر عجلت سے ترقی حاصل کی کہ چند ہی سالوں میں غذائی اجناس میں خود مکتفی ہو گیا اور جسے سبز انقلاب کا نام دیا گیا۔

تعلیمی ترقی کے میدان میں ہندوستان کے چپہ چپہ میں اور ملک کے چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں پاٹ شالوں کا قیام عمل میں آگیا۔ بہر حال یہ پنڈت جی کا بلند نظری اور بالغ فکری ہی تھی جنکی قیادت میں ہندوستان نے اس قدر تیزی سے ہر میدان میں ترقی کی ہے کہ سارا عالم انگشت بہ دنداں ہو گیا جس ملک میں سینے پرونے کی سوئی تک ہمیں برٹش راج کے دور میں باہر سے منگوانی پڑتی تھی آج ہم ان ہی کے طفیل میں بڑے بڑے کارخانے، اوزار، ہتھیار، پراجکٹ ہمارے ملک میں نظر آ رہے ہیں، غرض یہ ہے کہ ان مختصر واقعات سے بعد انھیں زیادہ موقعہ نہیں ملا کہ وہ ملک کو جس انداز سے مزید ترقی کی راہوں پر لانا چاہتے تھے موت کے بے رحم ہاتھوں نے ان کو ہم سے ۲۷ر مئی ۱۹۶۴ء کو چھین لیا اور سارا ملک ان کی بے وقت جدائی پر سوگوار ہو گیا۔ سلام اس مرد مجاہد کو جس نے اپنی ساری صلاحتیں ملک کی آزادی دلوانے کے بعد ہمیں ایک روشن مستقبل کے دہانے پر لا کر چل بسا۔

"ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا"

لیکن پنڈت جی کی موت نے ہمیں مایوس نہیں کیا ہے بلکہ انکی یاد کو ہم نے صرف گلے لگا کر رکھ لینے یا یوم وصال اور صد سالہ

برسی منا کر انھیں کوئی خراج عقیدت پیش کر دینے سے کام نہیں بنیگا، بلکہ اگر ہم صحیح معنوں میں اس مرد آہن کو خراج عظمت پیش کرنا مقصود ہو تو ہمیں چاہئے کہ ان کے جاری کردہ مشن کو ہم جاری و ساری رکھیں ان کے بتلائے ہوئے خطوط پر ہم چلتے رہیں۔ ان کی پالیسیوں پر عملی طور پر گامزن ہو جائیں تو یہی حقیقی معنوں میں ان کی روح کو شانتی ملے گی۔ دیش ترقی کی راہوں پر گامزن رہے گا عظمت ہند کا جو سکہ اقوام عالم کے دلوں پر ثبت ہو چکا تھا وہ قائم و دائم رہے گا اور آج ہم اس موقعہ پر ان کا وہ قول دھرلتے ہیں کہ ہر ہندوستانی "آرام حرام ہے" والی بات کو اپنی گرہ میں باندھ لے اور دیش کی ترقی کیلئے ولے درمے سخنے اور قدمے آگے بڑھتے رہے آگے بڑھتے رہے کیونکہ "ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں"

تصحیح گذشتہ شمارہ ۱۰ر جنوری ۱۹۹۱ء میں صفحہ ۱۲ کے دوسرے کالم کی سطر ۱۲ میں ۱۹۹۰ء تک بجائے ۱۸۹۰ء اور صفحہ ۵ کے پہلے کالم کی دسویں سطر میں ۱۹۸۹ء کے بجائے ۱۸۸۹ء نوٹ فرمائیں عجلت میں نظر ثانی نہ ہو سکی ادارہ معذرت خواہ ہے۔ (ادارہ)

عادل صدیقی

ڈاکٹر مختار احمد انصاری

ایک حقیقی رہنما کی صورت میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی
رگرمیاں صرف سیاست تک ہی محدود نہیں تھیں، وہ سیاست
ں اخلاق اور سماجی اور اصلاحی کاموں اور عام انسانوں کی فلاح
ہود کے امور کو ضروری سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سماجی زندگی
کوئی پہلو ان کی توجہ سے محروم نہیں رہا۔ چھوت چھات کے مسائل
ں، موپلوں کے مصائب ہوں، مزدوروں کی پست حالی ہو،
سانوں کی پسماندگی ہو، نیم متوسط اور متوسط طبقہ کی خستہ حالی ہو،
بقۂ نسواں کے ساتھ ناانصافی ہو، بچوں کی شرح اموات میں اضافے
سوال ہو، سبھی پر ان کی نظر یکساں تھی۔ ڈاکٹر انصاری تعلیم کی کمی
ان تمام بیماریوں اور مسائل کی جڑ سمجھتے تھے۔ وہ تعلیم کو انسانی
خصیت اور صلاحیت کے اظہار کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ بیسویں صدی
ے آغاز میں جن رہنماؤں نے اہلِ وطن کو بیدار کرنے اور ان کے
کری سانچوں کو استوار کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، ان
یں ڈاکٹر انصاری پیش پیش تھے۔

ڈاکٹر انصاری اگرچہ مسلمانوں کی مختلف جماعتوں مسلم لیگ سے
لافت کمیٹی نیشنلسٹ احرار، خدائی خدمتگار اور جمیعۃ العلماء سے کسی
صورت میں وابستہ رہے لیکن سیاست میں ان کا اندازِ فکر ہمیشہ ہی
سیکولر اور قوم پرستانہ رہا۔ سنہ ۱۹۲۰ء سنہ ۱۹۲۲ء سنہ ۱۹۲۶ء سنہ ۱۹۳۲ء
یں وہ کانگریس کے جنرل سکریٹری رہے۔ اس سے جدوجہد آزادی
ور کانگریس میں ان کے اعلیٰ مقام کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

ملک کی عوامی زندگی میں ڈاکٹر انصار کا نام سب سے پہلے ۱۹ ار
نومبر سنہ ۱۹۱۲ء کو کامریڈ کے صفحات پر نمودار ہوا۔ کامریڈ میں ایک
ایک خبر شائع ہوئی جس میں کہا گیا کہ دلی کے ڈاکٹر مختار احمد انصاری
ہندوستانی ہلال احمر کا ایک میڈیکل مشن لے کر ترکی جانے والے ہیں۔
اس سے ڈاکٹر انصاری کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔ یہ مشن ہندوستان
کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا پہلا قدم تھا جس نے مغربی ایشیا کے ملکوں
کے ساتھ قریبی روابط پیدا کرنے کی اس پالیسی کی داغ بیل ڈالی
جسے انڈین نیشنل کانگریس نے جدوجہدِ آزادی کے زمانے میں آگے
بڑھایا اور حصولِ آزادی کے بعد حکومت نے اس اصول کو مضبوطی
سے اپنایا۔

اس دور کی ایک اہم بات یہ ہے کہ جنگ بلقان کے سلسلے میں
ہندو رہنماؤں اور ہندو اخبارات نے مسلمانوں کے جذبات کا ساتھ
دیا۔ کلکتہ کے ایک جلسۂ عام میں مشہور بنگالی لیڈر بپن چندر
پال نے اعلان کیا کہ ہماری ہمدردی ترکوں کے ساتھ ہے۔ تقریباً
چھ ماہ قیام کرنے کے بعد ۱۴ جولائی سنہ ۱۹۱۳ء کو یہ مشن بمبئی واپس
آیا۔ اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے مولانا شبلی نے ۲۷ اشعار پر مشتمل
ایک نظم کہی، چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

کسی کو خواب میں بھی یہ سعادت مل نہیں سکتی
مریضوں کیلئے وہ آپ کی شب ہائے بیداری

ادا کرتے ہیں ہم شکرِ جنابِ حضرتِ باری
کہ آئے خیریت سے ممبرانِ وفدِ انصاری

فراق ملک و ترک خانماں و دوری منزل
خدا کے فضل سے تم جانتے یہ گھڑیاں جھیل لیں ساری

تحریک خلافت ہندوستان میں اس مقصد سے شروع کی گئی تھی کہ ترکی کی تقسیم کو روکنے اور جزیرۃ العرب کی آزادی برقرار رکھنے کیلئے برطانوی حکومت پر دباؤ ڈالا جا سکے۔ گاندھی جی نے اعلان کیا تھا کہ اگر ترکی کا معاہدۂ امن ہندوستانی مسلمانوں کو مطمئن نہ کر سکا تو وہ تحریک عدم تعاون چلائیں گے۔ چنانچہ ۲ جون ۱۹۲۰ء کو مہاتما گاندھی کی تجویز پر الہ آباد میں آل پارٹیز کانفرنس منعقد کی گئی اور عدم تعاون کی پالیسی اپنائی گئی — مہاتما گاندھی نے خطابات واپس کرکے تحریک شروع کردی اور وائسرائے کو لکھا "یہ اعزازات میرے لئے چاہے جتنے قیمتی رہے ہوں، میں انہیں اس وقت تک خوشدلی کے ساتھ استعمال نہیں کر سکتا جب تک میں مسلمان ہم وطن اپنے مذہبی جذبات کے ساتھ کی گئی ناانصافی سے کڑھ رہے ہیں" —

ڈاکٹر انصاری ہندوؤں کو ساتھ لے کر چلنا چاہتے تھے۔ ان کا پختہ یقین تھا کہ تحریک خلافت ہندو۔مسلم اتحاد میں مددگار ثابت ہوگی۔ انہوں نے دلی صوبائی کانگریس کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے برطانوی راج کے خلاف متحدہ ہندو۔ مسلم محاذ قائم کرنے کی اپیل کی۔ ہندو۔مسلم اتحاد کے موضوع پر انہوں نے ۱۹۲۷ء میں کانگریس کے صدر کی حیثیت سے جو فرمایا تھا، وہ آج بھی ہمارے لئے مشعلِ راہ ہے۔ آپ نے کہا تھا۔

" ہندو۔مسلم مسئلہ کا سب سے اچھا حل یہ ہے کہ ہر ایک کلچر کے زندہ رہنے کا حق تسلیم کر لیا جائے۔ باہمی روا داری اور ایک دوسرے کے احترام کا جذبہ پیدا کیا جائے اور کلچرل میل جول کی حوصلہ افزائی اور ترقی کے لئے ایسے قومی ادارے قائم کئے جائیں جہاں دونوں فرقوں کے نوجوان ایک دوسرے سے ربط وضبط قائم کریں اور ان کو دونوں تہذیبوں کے بنیادی اصول اور نصب العین کا مطالعہ کرنے اور سمجھنے کا موقع ملے۔ "

ڈاکٹر انصاری ۲۵ دسمبر ۱۸۸۰ء کو پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد عبدالرحمن ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور میں ضلع بلیا میں صدر امین تھے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں دوسرے سرکاری ملازمین کی طرح انہوں نے بھی انگریزوں کا ساتھ دیا لیکن ان کے بیٹوں نے، جو دیوبند کے انگریز دشمن مذہبی و سیاسی مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتے تھے آزادیٔ وطن کی تحریک میں دل کھول کر حصہ لیا۔ حکیم عبدالوہاب انصاری اور حکیم عبدالرزاق انصاری نے، جو کہ ڈاکٹر انصاری کے بڑے بھائی تھے۔ دیوبند میں ہی تعلیم حاصل کی تھی۔ ڈاکٹر انصاری نے مغربی طرز کی تعلیم حاصل کی وہ محنتی طالب علم تھے اور انہوں نے ہر کلاس میں وظیفہ لیا۔ ریاست حیدرآباد کی طرف سے انہیں انگلستان ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنے کیلئے بھیجا گیا۔ ڈاکٹر انصاری نے ایڈنبرا یونیورسٹی کے میڈیکل کالج سے ماسٹر آف میڈیسن (ایم۔ڈی) اور ماسٹر آف سرجری (ایم۔ایس) کی ڈگریاں حاصل کیں۔ اپنی اعلیٰ صلاحیتوں اور کامیابیوں کے باعث وہ لندن کے لاک ہسپتال میں رجسٹرار ہو گئے — انہیں چیرنگ کراس ہاسپٹل میں ہاؤس سرجن مقرر کیا گیا۔ یہ اعزاز پانے والے وہ پہلے ہندوستانی تھے۔ ہندوستان واپس آکر انہوں نے پریکٹس شروع کی۔ آپ کی وفات ۱۰ مئی ۱۹۳۶ء کی شام کو ہوئی۔ جامعہ ملیہ نئی دلی کے قبرستان میں آپ کی تدفین عمل میں آئی۔

ان کی شخصیت رنگا رنگ تھی مگر وہ ایثار و قربانی کا مجسمہ تھے۔ انہوں نے بحیثیت ایک کامیاب ترین ڈاکٹر بے اندازہ دولت کمائی مگر اپنی تمام کمائی قوم کے لئے وقف کر دی۔ انہوں نے خدمتِ خلق کو اپنی زندگی کا نصب العین بنایا۔ وہ وسیع النظری اور روشن خیالی کا ایک حسین پیکر تھے۔

شریمتی اندرا گاندھی نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ایک تقریب میں ۲۶ مارچ ۱۹۸۰ء کو اپنی ایک تقریب میں کہا تھا کہ ڈاکٹر انصاری صف اوّل کے رہنماؤں میں تھے۔ اپنی جوانی میں ہی انہوں نے طبی پیشے میں انتہائی ممتاز مقام حاصل کر لیا تھا۔ گاندھی جی کی تحریک کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے باکمال لوگوں نے اس میں کشش محسوس کی۔ میرے دادا اور شری سی۔آر۔داس نے مہاتما گاندھی کے ساتھ کام کرنے کیلئے اپنی اپنی وکالت چھوڑی۔ ڈاکٹر انصاری جو اپنے پیشے میں غیر معمولی مہارت

(باقی صفحہ ۱۵ پر)

سرور بن اشہر
فلیٹ ۳/۲، میونسپل اسٹاف کالونی
نمبر ٹی فیز II (اشوک وہار فیز II) دہلی ۱۱۰۰۵۲

علّامہ سیمابؔ اکبرآبادی

(۳۱ جنوری کو جنکی ۴۰ ویں برسی ہے)

غزل ہماری شاعری کی جان اور آبرو ہے۔ اس میں بے پناہ وسعت و پنہائی اور دلکشی و رعنائی ہے۔ اُردو شاعری میں یہ خوبی اور صلاحیت بھی ہے کہ یہ وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے کر ہر دور کے انسانوں کے ساتھ رشتہ استوار رکھ سکتی ہے۔ اُردو غزل کی اِس رنگارنگی اور تنوع کے سبب ہر بلند پایہ اور باصلاحیت شاعر نے اس کے وسیلے سے قوم کو پیغام دیئے ہیں لیکن پھر ایک دور ایسا بھی آیا کہ غزل کی ہیئت ہی بدل گئی۔ حتیٰ کہ حضرت جگر مرادآبادی بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ ؎

"فکرِ جمیل خوابِ پریشاں ہے آج کل !!!
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل۔

علامہ سیمابؔ نے غزل کے تیور اور رنگ و آہنگ کو وقت کے تقاضوں کے خلاف محسوس کرتے ہوئے فرمایا ؎

سیمابؔ غزل گوئی اب اِس کے سوا کیا ہے
بے فصل کا اِک نغمہ، بے وقت کی شہنائی

اور علامہ اقبالؔ بھی غزل میں رکیک اور فرسودہ آلائم و مصائب کی بھرمار دیکھ کر یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ ؎

شاعر کی نوا ہو کہ مغنّی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

غزل میں حُزنیہ اور اَلمیہ انداز، محرومی و مایوسی سے معمور مضامین اور سُوقیانہ پن و ابتذال دیکھ کر علامہ سیمابؔ نے غزل کو آخرِ شب کی فغاں کہتے ہوئے زندگی کے ہر پہلو سے روشناس کرانے اور اُن کے تصورات و خیالات کو بدلنے کے لیے مُشاعروں میں خطبۂ صدارت پڑھنے کی بنیاد ڈالی۔ غزل کے رنگ و آہنگ کو بدلنے کے لیے اپنے ایک خطبہ میں شعراء کو یہ پیغام دیتے ہیں،

"میں غزل میں پاکیزہ تغزل کا مخالف نہیں لیکن شاعری کو محض تغزل تک ہی محدود رکھنا بھی نہیں چاہتا اور شاعری میں صنفِ غزل

اس وقت تک ایک مدفون حسینہ کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ اندیشہ یہ ہے کہ اگر اُسے صحیح اور ترقی پذیر صورت میں رکھنے کی کوشش نہ کی گئی تو وہ ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائے گی۔"

اُردو شاعری کو ملک و قوم کے لیے موثر اور مُفید بنانے کی خاطر وہ شعراء کے اذہان و افکار اور مشاعروں کی روش اور گھٹی گھٹی فضا میں نیا پن اور خوشگوار انقلاب کے خواہاں رہے۔ لہٰذا اِس سلسلے میں اپنے ایک اور خطبہ میں یُوں اظہارِ خیال فرماتے ہیں:

"میرا جذبۂ اصلاح یہاں تک حوصلہ مند اور گستاخ ہے کہ اگر اس سلسلے میں دار و رسن کا فتویٰ بھی کسی طرف سے ملے تو میں بخوشی لبیک کہنے کو تیار ہوں۔ لیکن اپنی سالہا سال کی ادبی و شعری خدمات کا حاصل یہ ضرور دیکھنا چاہتا ہوں کہ موجودہ شاعری اور مشاعروں کو مُلک اور قوم کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید اور کارآمد بنائے۔"

علامہ سیماب نے اردو غزل کو زبان و بیان کی سنجیدگی و متانت، فلسفہ و تصوف کی گیرائی و گہرائی، مضمون کی سادگی و صفائی، الفاظ کی برجستگی و روانی اور جذبات کی شائستگی و شگفتگی سے مالا مال کر کے اہلِ سخن پر واضح کر دیا کہ مشاہدۂ حق کی گفتگو بغیر جام و مینا کے بھی ہو سکتی ہے بادہ و ساغر، ساقی و شراب کے بغیر بھی یہ بات نہ صرف بن سکتی ہے بلکہ پُر اثر و دل نشین بھی ہو سکتی ہے اور اِس حقیقت و اجتہاد کے سبھی معترف ہیں کہ علامہ سیماب نے ایسا کر کے دکھا دیا۔ ان کی غزلوں اور نظموں میں عزم و حوصلے اور تعمیر و تنظیم کے علاوہ جوش و ولولے کا درس ملتا ہے۔ اُنھوں نے اپنے نغموں اور ترانوں کے ذریعہ وطنیت و انسانیت کو ایک رشتۂ وحدت میں پرو دیا ہے۔ ان کی سیکڑوں نظمیں الفاظ و معنی کی ندرتِ خیالات کے تنوع اور فکری و تعمیری جذبوں سے معمور ہیں۔ علامہ سیماب کی نظموں کے مجموعوں "کارِ امروز"، "شعرِ انقلاب" اور "ساز و آہنگ" میں متعدد ایسی نظمیں بھی ملتی ہیں جو ہیئتی تجربوں کے اعتبار سے جدیدیت کا بے مثل بلکہ بے نظیر نمونہ کہی جا سکتی ہیں۔

غزل کے سلسلے میں بھی علامہ سیماب کے کارہائے نمایاں سب پر روشن ہیں۔ وہ زبان و بیان کے معاملہ میں مخصوص بلکہ اچھوتے نظریات رکھتے ہیں۔ شراب و شباب کے مضامین کے بجائے فکر و فلسفہ، ملی جذبات و خیالات پسند کرتے تھے۔ غزل کو داستانِ گل و بلبل اور صدائے چنگ و رُباب سے نکال کر اس میں شمشیر و سناں، طبل و علم اور عزم و عمل کے مضامین نظم کیے جانا پسند کرتے تھے۔ مبتذل اور سوقیانہ الفاظ سے پرہیز کرتے تھے۔ علامہ کے اس اجتہاد سے متاثر ہو کر اُردو ادب کے سب سے بڑے نقاد پروفیسر کلیم الدین احمد کو بھی کہنا پڑا کہ

"اُردو ادب میں سیماب اکبرآبادی کی اہمیت تاریخی ہے۔ سیماب ان شعرا میں سے ہیں جو صرف غزل ہی نہیں کہتے بلکہ اپنے فن اور اس کے مختلف پہلوؤں پر غور و فکر بھی کرتے ہیں انھوں نے محسوس کیا کہ موجودہ زمانہ میں غزل پستی کے غار میں گر گئی ہے۔ فرسودہ خیالات کی بے لطف تکرار شاعری سمجھی جانے لگی ہے۔ اس لیے انھوں نے غزل میں انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی مضامین کی دُنیا محدُود تھی۔ اُسے وسیع طرزِ ادا میں ابتذال اور فرسودگی سے بچ کر متانت، سنجیدگی اور ادبی شان و شوکت پیدا کی۔ موجودہ تغزل کا مورخ جدید رنگِ تغزل کی داغ بیل ڈالنے والوں میں سیماب کو یقیناً سرِ فہرست رکھے گا۔"

علامہ سیماب کا جدید رنگِ تغزل ان کے پہلے دو دواوین "کلیم عجم" اور "سدرۃ المنتہیٰ" میں بدرجۂ اتم نمایاں ہے۔ انھوں نے اپنے تفکر و تغزل سے غزل کو جو غیر معمولی وسعت اور جامعیت

عطا فرمائی اس کا ہلکا سا عکس اُن کے اِن اشعار میں ملاحظہ فرمایئے۔

یہ فرض کیوں نہ قدم پر ترے ادا کرتے
نمازِ عشق تھی، سجدے زمیں پہ کیا کرتے

دل کی بساط کیا تھی نگاہِ جمال میں!
اِک آئینہ تھا ٹوٹ گیا دیکھ بھال میں

محبت میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر
ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگِ جاں پر

کوئی یہ شکوہ سرایانِ جور سے پوچھے
وفا بھی حسن ہی کرتا تو آپ کیا کرتے

مجھے کیوں سونپتا ہے انتظامِ محفلِ عالم
بنا رکھی تھی میں نے محفلِ عالم کہ یا تو نے

ہے غارتِ چمن میں یقیناً کسی کا ہاتھ
شاخوں پہ انگلیوں کے نشاں دیکھتا ہوں میں

میں اے دُنیا تری شاہنشہی و قیصری سمجھا
یہ رشوت اس کو دے جو زندگی کو زندگی سمجھے

سیماب مولانائے روم اور مرزا غالب سے حد درجہ متاثر ہیں۔ اُن کے کلام میں جا بجا فلسفہ و تصوف اور عرفان و معرفت کے اشعار خاصی تعداد میں نظر آتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں،

ہستی و نیستی کی حدیں دُور رہ گئیں
یہ آ گیا کہاں؟ میں تجھے ڈھونڈھتا ہوا

وہ دنیا تھی جہاں تم بند کرتے تھے زباں میری
یہ محشر ہے یہاں سُننی پڑے گی داستاں میری

قطرہ دریا ہے اگر شاملِ دریا ہو جائے
ذرّہ اس بھید کو پا جائے تو صحرا ہو جائے

ہے محوِ آرائشِ مسلسل تو اپنے جلووں کی روشنی میں
اک آئینہ ماہتاب تیرا، اِک آئینہ آفتاب تیرا

خلوصِ دل سے جو سجدہ ہو اُس سجدے کا کیا کہنا
وہیں کعبہ سرک آیا جہاں ہم نے جبیں رکھ دی

ترے جلال و جمال ہی سے، ہے اعتدالِ مزاجِ عالم
کہیں غضب بے پناہ تیرا، کہیں کرم بے حساب تیرا

وہ سجدہ کیا، رہے احساس جس میں سر اٹھانے کا
عبادت اور بقیدِ ہوش، توہینِ عبادت ہے

خراب فرطِ عمل ہو نہ جائے اے سیماب
اِسے جنابِ رسالت مآب ﷺ دیکھیں گے

علامہ سیماب کے یہاں صبر و استغنا، خودی و خودداری اور عزتِ نفس کے بھی بے شمار مضامین ملتے ہیں۔ وہ غم و مصائب میں بھی مسکرانے اور زندگی کو خوشگوار بنانے کا حوصلہ یوں پیدا کرتے ہیں،

ناحق شکایتِ غمِ دُنیا کرے کوئی
غم ہے بڑی خوشی جو گوارا کرے کوئی

اگر تو چاہتا ہے آرزو، تیری کرے دنیا
تو دل پر جبر کرکے بے نیازِ آرزو ہو جا

ہر شخص ہے خوابِ تمنا، بقدرِ ذوق
سیماب کس سے عرضِ تمنا کرے کوئی

زندگی دو دن کی ہے، لمبی سہی میعادِ قید
آج آیا ہے قفس میں کل رِہا ہو جائے گا

کس سے سیماب پریشانی دل کہتے ہم
ہم نے اپنی ہی طرح سب کو پریشاں پایا

علامہ سیماب نے قضا و قدر کا بڑا گہرا مطالعہ و مشاہدہ کیا تھا۔ فلسفۂ حیات و ممات کے سلسلے میں فرماتے ہیں ؂

جو یہ سمجھ لے تو مرنے سے پھر کوئی نہ ڈرے
کہ موت ایک حقیقت ہے زندگی کی طرح

کسی صورت سے کوئی کر دے گویا مرنے والوں کو
یہ راز اب تک ہے سربستہ کہ مرجانے پہ کیا گزری
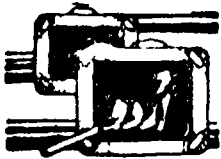
معمورۂ فنا کی کوتاہیاں تو دیکھو
اک موت کا بھی دن ہے دو دن کی زندگی میں

عمل بقا ہے، فنا ہے سزائے بے عملی
حیات و موت سب انساں کے اختیار میں ہے

حقیقت ہے تو اتنی ہے فریبِ خوابِ ہستی کی
کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہو جائے

غرض یہ کہ علامہ سیماب نے دبستانِ داغ کے ایک نمائندہ شاعر ہونے کی حیثیت سے نہ صرف اُردو غزل کو جلا، بخشی اور فصاحت و بلاغت سے مالا مال کیا بلکہ نظم میں بھی اپنی جدت اور جودتِ طبع کے خوب خوب جوہر دکھائے اور جدید قدروں سے روشناس کراتے ہوئے حقائقِ حیات پیش کرنے میں بڑا اجتہاد کرتے ہوئے اہل الرائے معاصرین سے "آگرہ اسکول" تسلیم کرالیا۔ اور جب تک زندہ رہے عہد ساز اور جلیل القدر شخصیتوں کی صف میں نمایاں نظر آتے رہے۔

ایشور راج ماتھر
ایم اے (عثمانیہ) بی. ایس. جے (امریکہ)
سابق صدر ناظم اطلاعات و تعلقات عامہ، حکومت مہاراشٹر
۳۸۸ - ایم، روڈ نمبر ۲۲ - جبلی ہلس - حیدرآباد ۳۳

شخصیت کا ارتقاء و بالیدگی

شخصیت، دبدبہ، رعب، وقار، اور وجاہت لیسے جامع الفاظ ہیں کہ ان کو صرف گوری چمڑی اور خوبصورت اور دلکش چہرہ ہی سے منسوب کرنا صحیح نہیں ہے. شخصیت صرف خوبصورتی اور چہرہ کی دلکشی ہی سے نہیں بنتی بلکہ اسمیں لباس، بول چال، انداز گفتگو، خود اعتمادی، حکمت عملی اور کردار جیسے عناصر کا بڑا دخل ہوتا ہے. اس کے علاوہ، دوسروں کو اپنے نقطۂ نظر کے موافق بنانے اور ان میں یہ احساس پیدا کرنا کہ ہر شخص بھروسہ کے قابل ہے اور کوئی بھی کام ذمہ داری کے ساتھ انجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہے وغیرہ شخص قابلیت اور صلاحیت بھی شامل ہیں اس کا مطلب یہ ہوا کہ شخصیت کو بنانے میں چہرہ ایک جزوی حیثیت رکھتا ہے. اسمیں کوئی شک نہیں کہ خوبصورت چہرہ ہر انسان کا ذاتی اثاثہ ہوتا ہے اس کا اثر ہر شعبۂ زندگی پر پڑتا ہے. خواہ وہ شادی بیاہ کا معاملہ ہو، سماجی تعلقات کا مسئلہ ہو یا کسی کمپنی یا حکومت کی نمائندگی و نیابت کا سوال ہو، شخصیت، وجاہت، رعب و دبدبہ لازمی طور پر اثر انداز ہوتے ہیں.

سماج میں عام طور پر ایک بڑی غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ صرف چند خوش قسمت لوگوں کو ہی اچھی، باوقار اور پراثر شخصیت نصیب ہوتی ہے اور دوسرے لوگ کسی شخصیت یا وجاہت کے حامل نہیں ہوتے. یہ ایک امر واقعہ ہے کہ ہر شخص کی اپنی اپنی شخصیت ہوتی ہے. کسی کی پرزور اور مقناطیسی اور کسی کی کمزور اور منفی رجحانات کی آئینہ داری کرتی ہے. بعض لوگ اپنی شخصیت کا پورا پورا فایدہ اٹھاتے ہیں اور بعض اپنی کمزوریوں اور خامیوں کی وجہ سے ایسا کرنے سے قاصر رہتے ہیں.

سائنس اور ٹکنالوجی کے اس دور میں، کمزور شخصیت والوں کو ناامید اور ہراساں ہونے کی کوئی ضرورت نہیں. نفسیات اور (PSYCHIODRY) کے ذریعہ شخصیت کو ابھارا جا سکتا ہے، اس کو نکھارا جا سکتا ہے اور ایک معمولی آدمی کو بھی بااثر شخصیت کا مالک بنایا جا سکتا ہے.

شخصیت کو ابھارنے کیلئے ماہرین نفسیات سب سے پہلے

یہ قدم اٹھاتے ہیں کہ کمزور شخصیت والے فرد کو شدت کے ساتھ یہ احساس دلاتے ہیں کہ وہ ایک خاص انسان ہے اس میں چند ایسے پوشیدہ اوصاف اور گن ہیں جن کے بارے میں وہ خود واقف نہیں ہے اور نہ ان کے موجود ہونے کا احساس

اس فرد میں موجود ہے۔ خاص تکنک کے ذریعہ ان پوشیدہ صلاحیتوں کو ابھارا جاتا ہے۔ اس میں خود اعتمادی پیدا کی جاتی ہے اسکو حکمت عملی سے کام لینے کے اصول سکھلائے جاتے ہیں۔ اور دوسروں کو اثر انداز کرنے کے گر عملی طور پر سکھائے جاتے ہیں۔ لباس، بول چال اور اندازِ گفتگو میں تبدیلی پیدا کرکے اور اسکو ستھرا بنا کر اس کی شخصیت کو دوبالا کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں یہاں یہ ذکر کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ شہرہ آفاق ڈرامہ نویس جارج برنارڈ شاہ نے PICCADALI کی غیر مہذب، گنوار معمولی سی پھول بیچنے والی لڑکی کو خاص تربیت دے کر عمدہ لباس پہنا کر اور اس کے انداز گفتگو کو نکھا کر اس کی اس شخصیت کو اس قدر اوپر اٹھایا کہ وہ اپنی نئی حاصل کردہ شخصیت کے ذریعہ اعلیٰ سماجی حلقوں میں ایک شہزادی سمجھی جانے لگی۔ اس طریقہ کار کو

SELF IMAGE IMPROVEMENT

یعنی بذاتِ خود اپنے آپ کو بہتر بنانے کی تکنک کہا جاتا ہے۔

یہ امر باعث دلچسپی

ہے کہ انگریزی لفظ PERSONALITY لاطینی لفظ

MASK: یعنی نقاب سے نکلا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہماری ظاہری شخصیت اس نقاب کے مماثل ہے جس کو ایکٹر لوگ ڈرامے کو پیش کرتے وقت اسٹیج پر پہنا کرتے ہیں۔ حقیقت میں اس نقاب کو اصلی انسانی شخصیت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا شخصیت دراصل جملہ انسانی صلاحیتوں، کردار انداز گفتگو اور لوگوں کو ہم خیال بنانے کے فن کا مجموعہ ہے ان تمام عناصر کی اجتماعی کیفیت لوگوں پر اثر کرتی ہے ردعمل پیدا کرتی ہے انسان کی جسمانی، ذہنی مجموعی صلاحیتوں، کارکردگی اور کردار کا خوش آئند مرقع ہی

شخصیت کہلاتا ہے۔

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا انسان اپنی شخصیت کو ابھار سکتا ہے، کیا اس کو ذاتی محنت سے بہتر بنایا جاسکتا ہے، کیا اس کو نکھارا جاسکتا ہے اور اگر ایسا ہوسکتا ہے تو کیوں کر۔ یہ ممکن ہے بشرطیکہ انسان اپنے آپ کو جاننے کی کوشش کرے اپنی اصلی شخصیت کو پہچانے صلاحیتوں اور کمزوریوں کا محاسبہ کرے اور اپنے آپ کو سدھارنے اور بہتر بنانے کا عزم مصمم کرے۔ بہتر بننے کے لئے اپنی کمزوریوں کا احساس لازمی ہے جب کمزوریوں اور خامیوں کا احساس پیدا ہوگا تو ان کو دور کرنے کی طرف بھی خاص توجہ مرکوز کی جائیگی۔ شاید اسی کیفیت کو پیش نظر رکھ کر بہادر شاہ ظفر نے یوں فرمایا تھا۔

جب پڑی اپنی برائیوں پہ نظر
تو اپنے سے برا کوئی نہ رہا

فطرتاً انسان میں

خودستائی EGOISM، خود پسندی کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے اسی وجہ سے وہ اپنی کمزوریوں اور خامیوں کو نہ صرف دوسروں سے بلکہ خود اپنے آپ سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ جبکہ خودستائی اور خودپسندی کا پردہ پڑا رہتا ہے تب تک نہ وہ اپنی برائیاں کمزوریوں اور خامیوں سکو جان سکتا ہے اور نہ اس پر قابو پانے کی کوشش کرسکتا ہے۔ جب دل کو ٹٹولا جاتا ہے تو خامیاں اور کمزوریاں صاف نظر آتی ہیں اور اس کے بعد ہی ایک ذہنی کشمکش شروع ہو جاتی ہے اور ان پر قابو پانے اور ان سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کا آغاز ہوتا ہے۔ ابرٹ برنس نے اس سلسلہ میں اپنے آپ سے تین سوال کرنے کی ہدایت کی ہے۔

جب انسان اپنے آپ کا باریک بینی سے جایزہ لیتا ہے تو

ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا دماغ زیادہ روشن ہے یہ
بات اس کے جو ابتک اپنے آپ کے متعلق سوچا کرتا تھا.
بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی بھی کام کو بحسن وخوبی انجام دینے
صلاحیت اس میں موجود ہے۔ یہ بھی آہستہ آہستہ روشن
ہوتا جاتا ہے کہ اس میں اثر انداز طریقہ پر بات چیت کرنے
اہلیت ہے۔ اس سلسلہ میں ہنری فورڈ کی مثال خالی
دلچسپی نہ ہوگی۔

ہنری فورڈ اپنے ابتدائی دور میں (۱۵۰) ڈیڑھ سو
الرماہوار پر ایک Power House میں کام کیا کرتا تھا۔
اوقات فرصت میں وہ دوسرے مزدوروں کی طرح اپنا
وقت شراب نوشی اور گپ شپ میں ضائع نہیں کرتا تھا بلکہ
نئی Motor پہ تجربہ کرنے میں مصروف رہتا۔

جب وہ اپنی موٹر کے
انجن بنانے کے تجربہ میں کامیاب ہو گیا تو وہ دولت اور
شہرت سے مالا مال ہو گیا۔ اور دنیا کے مقبول ترین شخصیتوں
میں اس کا شمار ہونے لگا۔

موجودہ دور میں شخصیت کے ارتقار کی بہترین
مثال JOHN F. KENNEDY کی ملتی ہے۔ طالب علم کی حیثیت سے
وہ انتہائی خاموش اور کم سخن ہوا کرتا تھا۔ وہ ایک
ذہنی قسم کا انسان تھا جسکی زندگی کی تمنا یہ تھی کہ وہ
ٹیچر بنے یا لیکچرر۔ وہ سوچ بچار کرنے والوں میں تھا
لیکن عملی طور پر کوئی کام کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی برخلاف
اس کے۔ اس کا بڑا بھائی JOE KENNEDY باوقار شخصیت
کا مالک تھا۔ یہی وجہ تھی کہ خاندان کے سارے لوگ اپنی سماجی
اور سیاسی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کیلئے اس کی طرف
دیکھتے تھے کیونکہ JOHN F. KENNEDY سے ان کو مستقبل کی
کوئی امید ہی نہیں تھی۔

بد قسمتی سے JOE KENNEDY دوسری جنگ عظیم
میں مارا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارے کنبہ کی سماجی اور
سیاسی ذمہ داریاں JOHN F. KENNEDY کے ناتواں کندھوں
پر آن پڑیں۔ اس ناگہانی اور ڈرامائی انداز میں اس کے
بڑے بھائی کے انتقال کر جانے سے جان کینیڈی کی شخصیت،
اس کے سوچنے سمجھنے کے طریقوں پر بہت گہرا اثر پڑا۔ وہ
خیال پلاؤ پکانے والی شخصیت" سے باہر نکل کر ایک با عمل،
ذی اثر اور حرکیاتی DYNAMIC شخصیت بن گیا۔ اس کو
صرف ایک ہی دھن تھی اور وہ یہ کہ ہر حالت میں اس کو اپنا
نصب العین حاصل کرنا ہی ہوگا۔

اس مصمم ارادہ کے ساتھ ہی اس نے
ابتدا میں تذبذب اور سامعین کے خوف پر قابو پانے میں
کامیابی حاصل کی عام جلسوں کو مخاطب کرنا شروع کر دیا
بجائے لوگوں سے کترانے کے، ان سے انتہائی گرم جوشی کے
ساتھ ملنے لگا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اس نے یہ محسوس
کیا کہ اسکی پرانی شخصیت کی بہ نسبت یہ سیاسی شخصیت اس
کے مزاج کی زیادہ موافق ہے۔

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ زندگی میں
اعلیٰ ترین چیزوں کو حاصل کرنے کے لئے خاص محنت
و جانفشانی کرنی پڑتی ہے۔ اسی محنت، جان توڑ کوشش
اور شخصیت کے ارتقار کی وجہ سے JOHN.F.KENNEDY
دنیا کی سب سے طاقتور جمہوریت کا صدر بن سکا۔

بنت مسعود
وسندادن ای/۳۱۹، راجان ٹاون شپ،
ملاڈ (ایسٹ)، بمبئی ۹۷

سلمیٰ نے آج پھر وہی خواب دیکھا کہ وہ انجان رستوں سے گذر رہی ہے پر پیچ و پر خم گلیاں ہیں ہر گلی میں کئی موڑ ہیں اور ہر موڑ پر بیسیوں راستے پھوٹتے چلے جاتے ہیں۔ اپنی منزل کی تلاش میں وہ بڑھتی چلی جاتی ہے نڈھال ہوتے ہوئے بھی نہ تو جھکتی ہے اور نہ ستاتی ہے پھر جیسے لئے جس کی جستجو تھی وہ شبیہ سامنے آجاتی ہے دھندلی دھندلی لہر میں لپٹی ہوئی تمہارے لئے میں نے کتنا لمبا سفر طے کیا اور تم نے اپنا چہرہ چھپا رکھا ہے۔ آخر تم کون ہو؟ اور میرے خوابوں سے کیوں اس طرح گذر جاتے ہو وہ سایہ کی جانب لپکتی ہے کہ اس کی نیند ٹوٹ جاتی ہے۔

کمرے کی کھڑکیاں اور دروازہ بند تھے ہیٹر چالو ہوتے ہوئے بھی کپکپا دینے والی سردی میں ندیم بیحد گرم کمبل سر سے پیر تک اوڑھے سکڑا ہوا مست خواب تھا Otrivan چشمے کے پانی کی بوتل سے ایک گھونٹ پینے کے بعد سلمیٰ کو ٹھنڈ کچھ اور لگنے لگی شال کو چاروں طرف لپیٹ کر وہ کھڑکی سے لگ کر شیشوں سے باہر دیکھنے لگی باہر ہلکی ہلکی برف پڑ رہی تھی لیڈو شو ختم ہو چکا تھا۔ شانزے لیزے پر اتنی ہی چہل پہل تھی جتنی دن میں ہو سکتی ہے Tourist اپنی اپنی گاڑیوں میں بسوں میں اور گروپ میں اِدھر اُدھر آجا رہے تھے۔ باتیں قہقہے بے انتہا روشنی روشنیوں کے اس شہر میں رات کہاں؟ ہر وقت جاگتا ہوا یہ شہر اب ظاہر یہ لوگ ایفل ٹاور کے پاس میکڈونلڈ سے ہیم برگر کھائیں گے، کوکا کولا پئیں گے شور مچائیں گے کچھ نوجوان پیگال کا رخ کریں گے، فرانسیسی، اطالوی، نیگرو، جرمنی و مصری عورتیں اور نسخہ پیگال یورپ میں جسم فروشی کی سب سے بڑی منڈی اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود ہم جنسی وہ بھی کھلے عام سلمیٰ دل بجز درہ جاتی یورپ میں آبادی گھٹتی جا رہی ہے شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو ورنہ ہمارے یہاں تو شادی ہوئی نہیں اور سال بھر میں بچہ گود میں ہے سالوں میاں بیوی کے Scandals بنتے رہتے ہیں۔

سلمیٰ کو بھیمڑی والی خالہ جان یاد آگئیں وہی جن کے چودہ بچے حیات ہیں اور شاید چھ سات نہیں رہے جب ہوسلے پربلاؤ ان کا دوبارہ نکاح پڑھوایا گیا اور آج تک خالہ جان خالو جان کے اس طرح Scandals بنتے ہیں کہ ہیر رانجھا، لیلیٰ مجنوں، سسی پنوں کس شمار میں ہیں۔

سلمیٰ!!! ندیم کی آواز نے اسے چونکا دیا... ارے آپ

ے کھڑکی سے لگی کیا کھڑی ہو آؤ چمٹ کر سو جائیں سردی لگ رہی ہے — یہ ہیٹر کیا کمرہ ٹھیک گرم رہا ہے! آؤ جانی ہیٹر کے فرائض بھی تم ہی انجام دو"

سلمیٰ نے سوچا اگر ندیم نے اپنے گھر میں یعنی ہندوستان بات کہی ہوتی تو صبح کے اخبار سے قبل یہ خبر گھر میں اسطرح جاتی کہ زبردست Scandal بنتا اور کئی دنوں تک رہتا، کتنا حوصلہ ہے ہم لوگوں کو پھر وہ جاکر ندیم کے ا لپٹ گئی۔ سلمیٰ کی شادی کو محض تین ماہ ہی ے تھے پیرس آئے ہوئے دو ماہ سے زیادہ کا وقفہ یا تھا۔ بڑے دنوں کی چھٹیاں تھیں ندیم نے وراں بند کر کے Lyon کے فارم ہاؤس میں سالِ نو ارٹی دینے کا فیصلہ کیا تھا دنیا کی سب سے زیادہ رفتار ٹرین T.J.V میں وہ لوگ Lyon جا رہے تھے الس کا بہت ہی خوبصورت سا شہر ہے ٹرین سے سلمیٰ کے لئے کیا گیا تھا تاکہ وہ یہاں ریل کے سفر بھی لطف اندوز ہوئے اسٹاف گاڑیاں لے کر آرہا تھا — ہائے چاہ برباد کرے گی ہمیں معلوم تا۔

ندیم ہر گانے سے قبل ہائے ضرور لگایا کرتے ۔" سچویشن کے حساب سے یہ گانا بے ربط ہے" سلمیٰ کہا۔ "جانی کسان کا بیٹا ہوں۔ کھیتی باڑی چھوڑی لیکن یہاں نہ بیل گاڑی ہے نہ رہٹ نہ آم کا ی ہے نہ کوئل کی کوک اگر کچھ ہے تو بس گوریاں وریاں، سانولے رنگ کو آنکھیں ترس گئی تھیں ے شیام ہمارے چور"

اور سلمیٰ مسکراتی رہی اور ندیم گاتا رہا "ہائے لے سلونے آئے دن بہار کے" سلمیٰ اور ندیم کی دی بھی کتنی مشکلوں سے ہو پائی تھی، دس سال ساری ہی میں گزر گئے تھے کمال بوا نے تو فتویٰ دے دیا تھا "ارے شیعے لڑکی لیتے تھوڑا ہی ہیں

یہ تو اپنی لڑکی دے دیتے ہیں تاکہ دوسروں کا پورا خاندان شیعہ ہو جائے۔

شبو نے بھی حسب معمول ہاں میں ہاں ملائی۔

"بوا شیعہ لڑکیاں ہوتی چالاک ہیں کم از کم میاں کو تو پورا شیعہ بنا لیتی ہیں"

"بس بوا تمہیں تو شیعوں میں عیب ہی عیب نظر آتے ہیں" سلمیٰ بولی۔

ارے تو شادی کیوں نہیں کرتا۔ بیٹھا کر رکھا ہے جب جھونڈا سفید ہو جائے گا تب آئے گا بیاہ کرنے اور اللہ اللہ کر کے ندیم پیرس سے اسے بیاہنے آگیا ندیم نے ہندوستانی ریستوران کا فرانس میں جال سا پھیلا لیا تھا وہ اس وقت اتنا مصروف تھا کہ واقعی شادی کرنے وہ کسطرح آیا اس کا اندازہ سلمیٰ کو یہاں آکر ہوا کبھی کبھی تو ندیم اور سلمیٰ تین، تین روز، چار چار روز تک مل نہیں پاتے تھے سلمیٰ کیلئے ہی ندیم نے خاص طور سے اپنے آپ کو Free رکھا تھا کہ کہیں وہ روٹھ نہ جائے۔

ایک روز ندیم نے بمبئی میں اس سے کہا تھا "سلو، جانی! دیکھو تمہیں کیسے ڈھونڈ ھ نکالا"۔ "ڈھونڈھ کیا نکالا بس ہم لوگ ایک دوسرے سے مل گئے"، وہ کہتی۔ "نہیں۔ زندگی کے قیمتی چوبیس سال آپ کی جستجو و تلاش میں صرف ہوئے ہیں"، وہ جواب دیتا "آپ کو کیسے پتہ چلا کہ میں وہی ہوں جسکی آپ کو تلاش ہے" کل راستے بدل گئے تو" سلمیٰ پوچھتی۔

"ہو ہی نہیں سکتا جانی! ایکسپریس ٹاور اور ایفل ٹاور میں کوئی فرق ہے یا نہیں" ندیم نے کہا۔ اور شادی کے بعد اس نے اطمینان کا سانس لیا آخر دم تک وہ "ایفل ٹاور" بنی رہے گی۔ خدا کا شکر ہے ایکسپریس ٹاور بننے کی نوبت نہیں آئی وہ "ایفل ٹاور" دنیا کا عجوبہ دریائے سین کے قریب کھڑا۔ یہ ملک بوس مینار۔ چیزیں کیسے ایک دوسرے سے نسبت پاتی ہیں۔ جانی! تم ہماری "ایفل ٹاور" ہو۔ ندیم اس سے چمٹ جاتا۔

T.J.V سے واقعی وہ لوگ ڈیڑھ گھنٹے میں Lyon پہنچ گئے باقی

پارٹی شام تک آجائیگی ندیم نے بڑی پر تکلف تقریب رکھی تھی ، آپاری روی۔ دو۔ ریوالی ، فرانسیسی گانوں کی آوازیں ، وائن کی بوتلیں ، شمپین کے کارک کھلنے کی آوازیں رقص کرتے ہوئے مرد ، عورت ، وہسکی ، ووڈکا بیئر کا دور اور ہندوستانی کھانے۔

ہائے ہائے میری ہم رقص مجھ کو تھام لے ندیم نے سلمی کو بھینچ لیا ، ڈارلنگ یہ ہندوستان نہیں جو تم شرماتی پھرو بلکہ اوروں کے ساتھ بھی رقص کرو ،، لیکن مجھے ناچنا آتا ہی کہاں ہے ،، سلمی بولی بس ادھر ادھر مٹکو پھر ایک آدھ بار ناگ کی طرح ہتھیلی سے پھن بنا کر دکھلاؤ جسم کو اس طرح ہلاؤ جیسے کھجلی ہو رہی ہو ،

آپ کو تو ہر وقت مذاق سوجھتا ہے سلمی مسکرائی آج وہ خوش تھی۔ بنجور موسیو ، بنجور مدام ، ندیم کے فرانسیسی دوست جوق در جوق چلے آرہے تھے۔ پارٹی عروج پر تھی یکایک سلمی ٹھٹھک سی گئی سگریٹ کے دھوؤں کے مرغولوں میں اسے اپنا خواب کیوں یاد آگیا ؟ یہ چہرہ بار بار اسے اپنی جانب کیوں کھینچ رہا تھا ؛ وہ گم صم سی ہوگئی جیسے پردے ایک کے بعد ایک اٹھتے چلے گئے ہوں اور وہ شبیہ واضح ہو کر حقیقت بن کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی ہے۔ شور و غل میں بھی اسے اپنے دل کی دھڑکنیں سنائی دینے لگیں۔ وہ اسے ایک ٹک دیکھتی رہی۔ اپنے مالک کی بیوی کو اپنی جانب اس طرح گھورتے دیکھ کر مارکو کو کچھ عجیب سا لگا لیکن جب اس کی نظریں سلمی سے چار ہوئیں تو مارکو کو احساس ہوا کہ ان تمام ہنگاموں میں اگر کچھ Depth ہے تو شاید اسی شخصیت کی بنا پر ہے اس کے احساس میں گہرائی کا جو عنصر پیدا ہوا تھا یقیناً اس کی محرک سلمی تھی سلمی کو پتہ چلا کہ مارکو ان کے پیرس والے ریستوران کا بار مین ہے۔ اس کے خوابوں سے اس شخص کا تعلق کیسے ہو سکتا تھا محض دماغ کا خلل ہے وہ ان خیالات کو جھٹکنے کی کوشش کرتی۔

ایک روز ندیم نے مارکو سے سلمی کو ملایا یہ سلمی یہ مارکو ہے یہاں فرانسیسی میں ماسٹر کی ڈگری لے رہا ہے۔ اسٹوڈنٹ ہے۔ پارٹ ٹائم کام کرتا ہے۔ ہمارے یہاں آجاتا ہے تم اس سے فرنچ سیکھو ، جلد سیکھ جاؤگی۔،،

ندیم مارکو کو پسند کرتا تھا۔ اسی لئے ہر طرح اس کی مدد کر دیتا تھا۔ مارکو تنزانیہ کا رہنے والا تھا جو فرنچ کالونی تھی ریستوران میں کام کرنے کے دو فائدے تھے ایک تو یہ کہ رات کا کھانا مفت مل جایا کرتا تھا ، اور تنخواہ کے علاوہ ٹپ مل جایا کرتی تھی جو کبھی کبھار تنخواہ سے بھی زیادہ ہوتی کیونکہ ندیم کے ہندوستانی Cusine یا نعمت خانہ کا پیرس میں اتنا چرچا تھا کہ ہندوستان کے V.I.P. جب پیرس آتے یا گلف اور عرب ممالک کے شیخ وغیرہ آتے تو یہاں ضرور کھانا کھاتے ، کیونکہ کھانا بہت لذیذ بنتا تھا یہاں کا شیف واقعی بہت اچھا کھانا پکاتا تھا اور یہاں کام کرنے والوں کو خوب ٹپ ملتی۔

ندیم اپنے کاموں میں بے حد مصروف تھا اس نے مارکو کو ایک طرح سے سلمی کا Escort مقرر کر دیا تھا مارکو کی عمر بھی کچھ ۲۳ یا ۲۴ سال ہوگی یعنی وہ سلمی سے کم از کم چار پانچ سال چھوٹا ہی تھا قربتوں اور صحبتوں نے مارکو اور سلمی کو ذہنی طور پر ایک دوسرے کے قریب کر دیا تھا فرانس میں ژاں پال سارتر کی تقلید میں بہت سے لوگوں نے شادی کے بندھنوں کو خیرباد کر دیا تھا بس Fiance اور Fiancee بن کر رہ گئے تھے منگیتر ہو کر جہاں تک نباہ ہوتا رہے ، پھر الوداع ، اب مارکو نے بھی اپنی منگیتر ۔۔ فرانسوا سے ملنا جلنا کم کر دیا تھا۔ ہفتہ کے اختتام پر جب وہ اسے لینے آتی تو وہ اکثر ٹال جاتا فرانسوا کسی سوپر مارکیٹ میں سوپروائزر تھی اکثر پورے ہفتے کی ضروریات کی اشیاء ایک بیگ میں بھر کر مارکو کے لئے لے آتی تھی مگر آج کل وہ انھیں لینے سے بھی انکار کر دیتا اس بات کا خود مارکو کے پاس کوئی جواز نہیں تھا۔ بہر حال ان تمام باتوں سے اور مارکو کی سرد مہری سے تنگ آکر فرانسوا نے بھی کوئی اور فیانس ڈھونڈ لیا تھا اس طرح مارکو کو زیادہ سے زیادہ سلمی کے ساتھ وقت گزارنے کا موقع ہاتھ آگیا۔

ایک روز سلمی کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا اور اپنے اور اس کے رشتے کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کے قدم خود بخود ریستوران کی طرف مڑ گئے دوپہر کا وقت تھا

ہلکی ہلکی بارش کی وجہ سے سردی بڑھ رہی تھی مارکو کو اس وقت ریستوران میں دیکھ کر شیف (سب سے بڑا باورچی) بہت خوش ہوا کیونکہ سلمے مارشے (بازار) جانا تھا اور ریستوران میں اس وقت کوئی اور موجود نہ تھا کہ وہ اسے بٹھا کر چلا گیا اور مارکو کامیو Cumus کی کسی کتاب کا مطالعہ کرنے لگا یکایک ریستوران کا صدر دروازہ کھلا اور سلمٰی شاید شاپنگ سے آرہی تھی اس کے دونوں ہاتھوں میں پیکٹس تھے سلمٰی کو دیکھ کر مارکو نے اس کی مدد کی اور کہا مادام! موسیو ندیم شاید آج درسیلز سے آجائیں گے۔

یکایک یہ کیا ہوگیا' چند لمحوں میں جیسے سالوں کی دوریاں ایکدم ختم ہوگئیں کلیاں کیلئے شاخ گلاب خود جھک گئی مرد اور عورت باہنوں کے دائرے، ہونٹوں کے لمس، جسم کی خوشبو یہی وہی ازل سے کبھی نہ ختم ہونے والا کھیل آف خدا۔

ندیم کی آواز سے سلمٰی کا سحر ٹوٹا یہ سب کیسے ہوا! ایک لمحہ کیلئے جیسے بلیک آؤٹ سا ہوگیا مگر دوسرے ہی لمحے اندر سے اس نے اپنے آپ کو اتنا مطمئن پایا کہ خود ایسے حالات میں ایسی کیفیت پر اسے تعجب سا ہوا، ندیم مارکو کو نمک حرام کہہ رہا تھا اور جب اس نے مارکو کے ایک چانٹا رسید کیا تو سلمٰی کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے اس کے پورے جسم میں سوئیاں چبھو دی ہیں۔

اسے سکتے کی حالت میں دیکھ کر ندیم نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا اور کہا سلمٰی تم فکر نہ کرو اس کم بخت کو میں سبق سکھا کر دم لوں گا۔ اس کی اتنی ہمت کیسے ہوئی کہ تمہارے ساتھ اتنی Liberty لے۔ زندگی بھر جیل میں سڑنے کے لئے نہیں بھجوا دیا تو میرا نام ندیم شیرازی نہیں۔"

دوسرے روز تمام اخبارات میں خبر چھپی تھی کہ ایک فرانسیسی طالب علم موسیو مارکو عمر ۲۳ سال نے اپنے ہندوستانی مالک کی بیوی مادام سلمٰی عمر ۲۹ سال کا Rape کیا ملزم جیل میں بند ہے عدالت کل فیصلہ کرے گی!

ندیم سلمٰی کی دلجوئی کرتا رہتا تھا وہ گم صم سی بیٹھی رہتی ندیم اسے بتاتا کہ فرانس کا قانون زنا بالجبر کے معاملے میں بہت سخت ہے اگر صحیح ثابت ہوگیا تو وہ کم از کم ۱۰ ار ۱۲ سال جیل کی سزا کاٹے گا میں نے بہت اچھا وکیل کر لیا ہے بس تمہیں عدالت میں اتنا ہی کہنا ہے کہ اس نے تمہیں Rape کیا ہے کل کورٹ جانا ہے۔

اور سلمٰی سوچ رہی تھی کہ کیا یہ سچ ہے! کیا ان تمام باتوں میں اس کی مرضی شامل نہ تھی کیا وہ اس موقع کا فائدہ اٹھا کر ایک بے گناہ کو پھنسوا دے گی؟ تو کیا مارکو واقعی بے گناہ ہے! کیا وہ مارکو سے کبھی نہیں مل سکے گی؟ اور عمر بھر وہ بنا کسی جرم کے مجرم بنا رہے گا، سزا بھگتے گا آخر کیوں!

نہیں ہرگز نہیں۔ سلمٰی نے مصمم ارادہ کر لیا وہ کل ایسا نہیں ہونے دے گی وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ ایسا کرنے سے اسے کچھ نہیں ملے گا اور سب کچھ کھو دینا پڑے گا لیکن اسے جو کچھ حاصل ہوگا اس کا کبھی کسی کو اندازہ نہیں ہوسکے گا اور ندیم کے ری ایکشن کا ورہ کا کیا ہوگا؟ اسے اس کی ایسے مطلق پرواہ نہ تھی۔

مضمون نگار حضرات سے گذارش

- ★ فل اسکیپ کاغذ کے صرف ایک طرف صاف اور خوشخط تحریر فرمایئے۔
- ★ کاربن کاپی یا زیروکس کاپی کی بجائے اصل مسودہ روانہ فرمایئے، اور آخر میں اپنا نام اور پتہ ضرور لکھ دیجئے۔
- ★ صرف غیر مطبوعہ تخلیقات روانہ فرمایئے۔ مضامین کی نقل اپنے پاس محفوظ رکھیئے۔ غیر طلبیدہ تخلیقات کا معاوضہ دینے یا نہ دینے کا فیصلہ ادارہ کرتا ہے۔ اس سلسلے میں توجہ یا کسی یاد دہانی کی ضرورت نہیں ہے۔

(ادارہ)

ماضی کے آئینے سے "۱۹۴۸ء کی بہترین نظمیں" نامی مجموعہ کلام میں جو نیا ادارہ لاہور نے شائع کیا تھا میرا جی کی مندرجہ ذیل نظم پیش کی تھی۔

سہارا

میرا جی

اوس کی بوندوں میں نمکینی نہیں،
پھول گر چاہے کہ اپنی رات کے انجام کو
ایک ہی لمحے میں یکسر جان لے
اس کو لازم ہے ہوا کے سرد جھونکے سے کہے
جاؤ اس کے آنسوؤں کو چوم لو!

آنسوؤں کو چوم کر محسوس یہ ہونے لگا
ایک آنسو، ایک بوند
ایک پل میں ایک بحرِ نیلگوں
بن کے چھا جاتا ہے تنہا ناؤ پر

کیا ہوا گر اوس کی بوندوں میں نمکینی نہیں،
اوس کی بوندوں میں نمکینی اگر ہوتی تو کیا
پھول اس میں تیرتے ہی تیرتے
اپنی منزل تک پہنچ سکتا نہ تھا، اک ناؤ بن سکتا نہ تھا؟
پھول کیا ہے، تو کہ میں،
پھول میں ہوں تو نہیں،
تو تو بحرِ نیلگوں میں ایک تنہا ناؤ ہے
بہتی جاتی ہے، ذرا رکتی نہیں،
جھنجھلا کر علم کب ہے اوس کی بوندوں میں نمکینی نہیں
تو فقط باتوں کے بل پر اپنی باتوں کی رسیلی چھاؤں میں
یہ سمجھتی ہے کہ ہر لمحہ اچانک پھیل کر
ششش جہت پر دل دھڑکتے ہی میں یوں چھانے لگا

جیسے اک ٹھہراؤ فرقت کی اندھیری رات میں
درد کے ہمدوش لذت کو بھی اکساتا رہے،

لے، پیالہ تھام لے،
اس میں باقی ہے ابھی کچھ زہرِ غم
جس کو پی کر میں بھی اپنی زندگی سے بھاگتا پھرتا رہا،

گفتگو سے فائدہ کچھ بھی نہیں، لیکن مجھے
ہر اشارا دام ہے الفاظ کا
جس میں طائر پھڑپھڑاتے چیختے؛
چیختے ہی چیختے خاموش ہو جاتے ہوئے
جان لیتے ہیں کہ اب وہ رات ہی دامن بنے گی درد کے انبار کا
جس کے بکھرے دامنِ صد چاک میں
پھول کی بھیگی ہوئی پتی پہ بوندیں اوس کی
ساتھ لاتی ہیں گدازِ روح کی ہلکی ملاحت کو، جسے
چکھ کے کہتی ہے زباں کیوں، اب کہو،
اوس کی بوندوں میں نمکینی نہیں؟

دیکھ، دور ——
ایک تنہا ناؤ بحرِ نیلگوں پہ رفتہ رفتہ بڑھتے بڑھتے آ رہی ہے پاس دیکھ
دور کی چیزیں بھی یوں
باتوں باتوں میں قریب آ جائیں گی کیا تھی خبر!
دیکھ تو ——
رشتۂ عہدِ تخیل بند تھا
کھلنے لگا۔
رفتہ رفتہ اک نئی صورت نظر آنے لگی۔
اک نئی صورت مگر کچھ نقش تو مانوس ہیں۔

اور ہر لمحے سے ہر آنسو سے قصرِ نیلگوں استادہ ہے
دور اس کی چھت میں دو فانوس ہیں۔

میرا جی

شبیر احمد خاں انور
مکان نمبر ۔ ۶ ۔ ۳ محلہ بڈ
عادل آباد (اے۔ پی)

قوم ہے گلشن ہیں جسمیں گل ہزاروں رنگ کے
جن کی خوبی دیکھ کر جلتے ہیں سپنے سنگ کے

مختلف فرقے ہیں قوم ہند میں شامل یہاں
ہے جگر کوئی، کوئی سر اور کوئی دل یہاں

اتحادِ باہمی ہے قوم یکجہتی کا ..... نام
یہ نہ ہو تو قوم بن جاتی ہے غیروں کی غلام

قوم یکجہتی میں مضمر قوم کی معراج ہے
یہ نہ ہو تو قوم کی قسمت ہی پھر تاراج ہے

دوستو اس بات کی تاریخ عالم ہے گواہ
بٹ گئیں ٹکڑوں میں جب تو ہوگئیں قومیں تباہ

چھوڑ دی جس قوم نے دنیا میں یکجہتی کی راہ
قعرِ پستی میں گری وہ ہوکے برباد و تباہ

ایکتا جس میں نہیں قوم ہے وہ ناتواں
پھر زمیں اسکی مخالف اس کا دشمن آسماں

متحد آپس میں ہوں گر قوم کے افراد سب
ہوتے ہیں سر سبز اور شاداب اور آباد سب

دوستو جس قوم کے افراد میں ہو دشمنی
موت کے سائے تلے اس قوم کی ہے زندگی

ایک ہوکر قوم کے افراد جب آگے بڑھے
جیت کر دنیا کو پھر زینے ترقی کے چڑھے

قومی یکجہتی سے ہے خوش حال قومی زندگی
شادماں، مضبوط اور لایزال قومی زندگی

گو ہمہ جہتی ترقی ہے بہارِ زندگی
قومی یکجہتی بھی انور ہے وقارِ زندگی

رئیس الدین رئیس
۱۰/۱۷/۲۵ دہلی گیٹ، علیگڑھ یوپی

نیا عہد

ہم نئے سال کا اس طرح سے آغاز کریں
ہم نئے سال میں آؤ یہ نیا عہد کریں

ملک اک باغ ہے اس ملک کے مالی بنجائیں
بدنظر کے لیے اک تحفش سی گالی بن جائیں
چاند تاروں سے چلو آؤ سجائیں بھارت
آسماں سے بھی حسیں آؤ بنائیں بھارت
ہم نئے سال میں ہم آؤ یہ نیا عہد کریں
ہند و مسلم ہیں نہ ہم سکھ نہ ہم عیسائی
مادرِ ہند کے ہم پوت ہیں بھائی بھائی!
رہ زنی ہو نہ فسادات، کوئی قتل نہ ہو
خون دھرتی نہ پیئے لاشوں کی اب فصل نہ ہو
ہم نئے سال میں آؤ یہ نیا عہد کریں

اب نہ دلہن کو کسی گھر میں جلایا جائے
اب ہوس کو نہ جہیزوں کی بڑھایا جائے
بن کے جائیگی بہو کل کو تمہاری دختر
دیکھ پاؤ گے بھلا کیسے وہ جھلسا منظر
ہم نئے سال میں آؤ یہ نیا عہد کریں
کوئی گردوارہ ہو نہ مندر نہ مساجد مسمار
عمر بھر کے لیے بن جائیں چلو ہم معمار
کوئی مسجد ہو کہ مندر ہو کہ گردوارہ ہو
ہم کو ہر لمحہ دل و جان سے بھی پیارا ہو
ہم نئے سال میں آؤ یہ نیا عہد کریں

آ نئے سال کا اس طرح سے آغاز کریں
دل سے دل ہاتھ سے ہم ہاتھ ملائے رکھیں
اپنی محنت کے پسینے سے یہ دھرتی سینچیں
ہر طرف پھول محبت کے کھلائے رکھیں

ہم نئے سال میں آؤ یہ نیا عہد کریں
ہم نئے سال کا اس طرح سے آغاز کریں۔
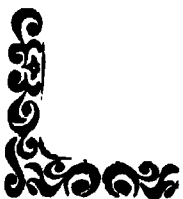
غزلیں

...قشبندی
...سو پلی
...زل، بیکانیر (راجستھان)

...ھیں گے اس کو اہلِ فن کہتے رہو
...یں کو چاند تاروں کا گگن کہتے رہو

...صحراؤں کو صحن چمن کہتے رہو
...سے یہاں گنگ و جمن کہتے رہو

...ج کی کون اب تحقیق کرتا ہے یہاں
...ینے کا بھی اک ہوتا ہے فن کہتے رہو

...ساتے رہو اس کو صلائے عام ہے
... پھلتا رہے اپنا چمن کہتے رہو

...یں رہنے والے جی لیں اس امید پر
...ر گھر میں سورج کی کرن کہتے رہو

...ہذیب و تمدن کی یہ کیسی شان ہے
...ترقی پر ہے انساں کا چلن کہتے رہو

... دنیا پر عیاں ہے روزِ روشن کی طرح
...مارق امن کی ہے انجمن کہتے رہو

ایوب اثر
محلہ دلازاک چوکی جنگی شاہجہانپور
(۲۴۲۰۰۱ یوپی)

محبت کیا، وفا کیسی، کہاں کا پیار ہوتا ہے
یہ دنیا ہے یہاں ہر چیز کا بیوپار ہوتا ہے

بلاتا ہے کوئی اپنا مجھے جب اجنبی کہہ کر
وہ لمحہ تو مرے احساس پر تلوار ہوتا ہے

ابھی کچھ دیر مت جاؤ کہ دونوں وقت ملتے ہیں
یہی ہے وہ سماں فطرت کا جو شہکار ہوتا ہے

بہت دشوار ہوتا ہے سفر راہِ محبت کا
کہ لٹنے کے لئے بھی حوصلہ درکار ہوتا ہے

سمجھ کر بھی مزاج یار کو جو چوٹ کھا جائے
مری نظروں میں وہ نادان بھی ہشیار ہوتا ہے

بڑھے جب کوئی خالی ہاتھ میری جیب کی جانب
تو اپنی لاج رکھنا بھی بڑا دشوار ہوتا ہے

اثر مقسوم ہے سقراط کا زہر الم پینا
اگرچہ زندگی سے اپنی سب کو پیار ہوتا ہے

فصیح اکمل
۱۱۸، سلمیٰ منزل، کوملی واڑہ، دمنی (ضلع تھانے) مہاراشٹر

غزلیں

میرے لب پر اپنے لب رکھ کر نہ بول
خواہشوں کے اور دروازے نہ کھول

صرف اک خواہش پہ یوں کچھ بکھر نہ جا
خواب کی تالوں پہ بھی کچھ دیر ڈول

نرم بستر سلوٹوں کا ریگ زار
گرم سانسوں کا ابھی ریشم نہ کھول

پہلے اندازوں کا جادو چل تو جائے
پھر تو میرے جسم میں یہ زہر نہ گھول

آہٹیں دھوکا بھی دے جاتی ہیں اب
صبح کے احساس سے آنکھیں نہ کھول

سایہ سایہ چلتی شام
کیا کیا رنگ بدلتی شام

رنگ برنگ کھلونوں سی
چہرہ چہرہ ادھلتی شام

سب سے بڑی عمارت سے
جھانکے شوخ چھلتی شام

کسی کے اندر کھیلتی صبح
کسی کے اندر جلتی شام

کالی سڑک پر پھولوں سی
پھیل گئی ہے چلتی شام

جلی ہوئی اک بستی میں
منظر منظر جلتی شام

قلم کی لرزش

ید مشتاق حسین جوش ادیب بارسی ٹاکلی کی تخلیق
ش' فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی اُتر پردیش کے مالی
شائع ہوئی ہے۔
خ طباعت ستمبر ۱۹۸۹ء ہے۔ شارق جمال ناگپوری نے
ت کہا ہے۔

ں یہ چھپ گئی ہے ہلا، پسند اہل ادب کریں گے
درت' قلم کی لرزش ہلا کہ اس کی تعریف سب کریں گے

منشاء الرحمن خان منشا نے پیش لفظ لکھا ہے۔
ں کی یہ تضمینات ان کے قدرت اور مذاقِ شعری کی
پتہ دیتی ہیں ڈاکٹر افتخار احمد فخر کا بیان ہے۔
ن کا فن بڑا مشکل فن ہے جوش ادیب اس مرحلے سے
ساتھ گزرے ہیں" آتش بہادلپوری کی رائے ہے۔
ں کی کاوش و کاہش لائق تحسین ہے:
ں ادیب کا کام کئی سطحوں پر ملتا ہے۔ جوش کی نظموں پر مشتمل
ابیں فکرِ جوش اور سویرا شائع ہو چکی ہیں۔ "قلم کی لرزش"
اہتمام کیا گیا ہے ناسخ، میر اور سودا سے لے کر شکیل بدایونی
دی اور سیفی پریمی تک ملک کے تقریباً ستر (۷۰) نامور
کے کلام پر تضمین شامل ہے۔

آج تمام اہل قلم اپنے مضامین میں کسی مخصوص شاعر کی برتری
ابت کرنے کو ناسخ، میر، سودا، غالب، وغیرہ کے مقطعوں کو
یش کرتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ وہ صرف مقطع نہیں بلکہ ایک
دقیع صنفِ سخن ہے۔ اس کا نام 'تضمین چسپاں' ہے۔

عام طور پر فارسی شاعر مرزا محمد علی قرشی سلیم کو اس
کا موجد قرار دیا گیا ہے۔ لیکن صاحب بحر الفصاحت نے اس
سے پہلے کمال خجند کی نشان دہی کی ہے جس نے خسرو دہلوی
کے چند مصرعوں کو تضمین کیا ہے۔ مثلاً
بُردلی دلِ عشاق کمال از سخن خوب ہلا خوباں عمل فتنہ زدیوان تو یا بند
ہلالی ۹۲۶ ہجری میں مارا گیا تھا۔ اس نے حافظ شیرازی کے
مصرعے کو تضمین کیا ہے۔

ہلالی چوں حریف بزم رنداں شد بخواں مُطرب
الا یا ایہا الساقی ادر کاسا و ناولہا،

سلیم نے بھی اس مصرعے کو تضمین کیا ہے۔

سلیم امشب بہ یاد تربت حافظ قدح نوشم
الا یا ایہا الساقی ادر کاسا و ناولہا،

فارسی تضمین 'چسپاں' کی روایت اُردو شاعری میں داخل ہوئی۔
چند مثالیں۔

شیخی مذاق کس کی رہی اب بقول میر ہلا اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

جگر پہ نقش ہے مصرعے یہ مصحفی کا۔ رند ہلا لٹکتے ہیں تری ہیکل سے تا کہ تعویذ

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ ہلا آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

تاریخی اعتبار سے تضمین جیسا ایک اساسی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا رنگ بدلتا گیا۔ یہاں تک کہ تصرّف کو بھی جائز سمجھا گیا۔

وزیر لکھنوی کا شعر ہے۔

جانور جو ترے صدقے میں رہا ہوتا ہے
اے شہِ حُسن وہ چھٹتے ہی ہُما ہوتا ہے

ذوق دہلوی نے تصرّف کر کے یوں لکھا۔

زاغ بھی گر ترے صدقے میں رہا ہوتا ہے
اے شہِ حُسن وہ چھٹتے ہی ہُما ہوتا ہے

یہ محض الفاظ کی بازی گری نہیں بلکہ اس میں ایک قدیم مذہبی رسم کا اظہار ہے۔ اس کا نام "طائرِ صدقہ" ہے۔

اس صنفِ سخن میں وسعت ہوتی رہی۔ کسی شاعر کے ایک شعر اور پھر اشعارِ غزل کو تضمین میں ڈھالا گیا۔
"بحر الفصاحت" میں تضمین کی تعریف یوں کی گئی ہے۔
"ایک شاعر دوسرے شاعر کا پورا شعر یا مصرعہ کا ٹکڑا اپنے کلام میں باندھے۔ پورے شعر اور اس کے زائد کی تضمین کو "استعانت" کہتے ہیں۔ مصرع اور مصرعے سے کم کی تضمین کو "ایداع" اور "رفو" کہا جاتا ہے۔

تضمین نہایت پاکیزہ اور عظمت کی چیز ہے۔ اس میں حدیث اور آیت کو بھی پیش کیا جاتا ہے۔ اس صورت میں اس کو "اقتباس" کہتے ہیں۔
اس میں قول، مثل اور حکمت کے مضمون کو بھی باندھا جاتا ہے۔
اس مقام پر اس کو "عقد" کہا جاتا ہے۔

پسودا، کہاں کتنی ہی دشوار ہیں گو راہیں،
حائل نہیں ہو سکتے حالات اگر چاہیں
منزل ہے کھڑی آگے پھیلائے ہوئے باہیں
اے دوست ترے در تک پہلی ہی کہیں گاہیں
دل ایک مسافر ہے گرتا ہے سنبھلتا ہے
دل بھول گیا جیسے جینے کی ادائیں بھی
ہر پل وہ تڑپتا ہے اللہ رے بیتابی
اب کس کو بتائیں ہم کیا حال ہے اپنا بھی
ہم ہجر میں جب جاگے تھی رات بہت سیلی
دیدار کا ہر موسم لمحات میں ڈھلتا ہے

اب تضمین کا رواج برائے نام ہے۔ جوش ادیب کا یہ کارنامہ کہ اُنھوں نے اس صنفِ سخن میں "قلم کی لرزش" ایک کتاب مکمل کر دی، قابلِ ستائش ہے۔ اُنھوں نے تضمین کی از سرِ نو جلوہ دہی کر کے اردو شاعری میں ایک وقیع اضافہ کیا ہے۔ اور اس کی بدولت اپنی فن کارانہ شناخت بھی قائم کر لی ہے۔

۱۹۵ صفحات کی یہ کتاب صرف دس روپے میں دستیاب ہو سکتی ہے۔

ملنے کا پتہ :- جوش ادیب پارسی ٹاکی، ضلع اکولہ (مہاراشٹر)

❋

ضروری گذارش!

* دفتر سے خط و کتابت کرتے وقت حوالہ نمبر ضرور تحریر فرمائیں، جو ہمارے خط یا آپ کے رسالے کے اوپری حصہ پر درج رہتا ہے۔
* جواب طلب اُمور کے لیے جوابی خط، لفافہ یا ڈاک ٹکٹ روانہ فرمانے کی زحمت نہ فرمائیں، ادارہ کی طرف سے تمام خطوط کے جواب دیے جاتے ہیں۔
* منی آرڈر کوپن پر (فارم کے نچلے حصہ میں) ہمیشہ اپنا نام، پتہ اور تجدیدِ خریداری کے لئے سابقہ نمبر حوالہ صاف صاف ضرور تحریر فرمائیں۔

اسی طرح خط لکھتے وقت یا مضمون روانہ فرماتے وقت بھی اپنا پورا نام و پتہ ضرور تحریر فرمائیں۔

(ادارہ)

وزیر اعلیٰ نے مردم شماری کی بابت تفصیلات فراہم کیں

وزیر اعلیٰ شری شرد پوار نے یکم فروری ۱۹۹۱ء کی صبح اپنی سرکاری رہائش گاہ "ورشا" میں مردم شماری کرنے والے شری ناگیش دھاواڈے، کو اپنے اور اپنے خاندان کے اراکین کے بارے میں جانکاری دی۔

شری کے۔ پدمنابھیا، کمشنر بمبئی میونسپل کارپوریشن نے بھی مردم شماری کے مقصد کے تحت اپنی رہائش گاہ پر اپنے اور اپنے خاندان کے اراکین کے بارے میں مردم شماری کرنے والوں کو جانکاری دی۔

اس موقع پر شری جے۔ کے۔ بھنتیا مردم شماری ڈائرکٹر آف آپریشن مہاراشٹر شری اے۔ بی۔ مادھوسکر ڈپٹی کمشنر بی ایم سی، شری وسنت دیشپانڈے اسسٹنٹ مردم شماری آفیسر بی ایم سی اور ڈاکٹر رنے۔ این یم گاوکر، ڈاکٹر بھینت چکاور شریمتی دنو دینی دیسائی اور دیگر موجود تھے۔

ظ۔ انصاری کی رحلت پر۔۔۔۔۔!
پروفیسر جاوید خان کا اظہار غم

اردو کے مشہور و معروف ادیب و نقاد صحافی اور مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکیڈمی کے سابق وائس چیرمین ڈاکٹر ظ۔ انصاری (ظل حسنین) کی رحلت پر حکومت مہاراشٹر کے وزیر ہاؤسنگ اور چیرمین مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکیڈمی پروفیسر جاوید خان نے اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار فرمایا ہے۔

ڈاکٹر ظ۔ انصاری کا ۳۱ جنوری کی شب بمبئی کے سیفی اسپتال میں انتقال ہو گیا۔

پروفیسر جاوید خان نے اپنے تعزیتی پیغام میں مرحوم کی ادبی سماجی اور صحافتی خدمات کی سراہنا کرتے ہوئے فرمایا کہ ڈاکٹر ظ۔ انصاری کی رحلت سے اردو ادب ایک بلند پائے کے ادیب سے محروم ہو گیا۔ میری خداوند کریم سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

قومی ذہانت کی کھوج کے امتحانات
نتائج کا اعلان

قومی ذہانت کی کھوج (ریاستی سطح) کے امتحانات جو ۲۵ نومبر ۱۹۹۰ء کو کمشنر آف بیوریو آف گورنمنٹ ایگزامیشن پونہ کی طرف سے منعقد کئے گئے تھے اس کے نتائج ظاہر کر دیئے گئے ہیں این ٹی ایس سی کے فائنل امتحان کے منتخبہ امیدواروں کو بذریعہ پوسٹ مطلع کر دیا گیا ہے این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی نئی دہلی ۱۶ سے اس ضمن میں مزید خط و کتابت کی جا سکتی ہے۔

ظ انصاری کی رحلت پر
ریاستی وزیر سید احمد کا تعزیتی پیغام

حکومت مہاراشٹر کے ریاستی وزیر ماحولیات ٹیکسٹائلز اوقاف اور نشہ بندی شری سید احمد، نے اردو کے ممتاز ادیب و نقاد ڈاکٹر ظ انصاری کی رحلت پر اپنے شدید رنج و غم کا اظہار فرمایا ہے۔

اس موقعہ پر جاری اپنے تعزیتی پیغام میں شری سید احمد نے فرمایا کہ ڈاکٹر ظ انصاری نے اپنی ساری زندگی اردو ادب کیلئے وقف کر دی تھی۔ بحیثیت سابق وائس چیرمین مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکیڈمی موصوف نے مہاراشٹر میں اردو کے فروغ کیلئے گرانقدر خدمات انجام دیں۔

میری خداوند کریم سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے!

شری سیّد احمد نے
جوگیشوری کے فسادزدہ علاقوں کا دورہ کیا

حکومت مہاراشٹر کے وزیر مملکت برائے ماحولیات و توانائی شری سید احمد نے ۸، فروری کو صبح جوگیشوری کے میگھ واڑی جنکشن، جھولا میدان، باندرہ پلاٹ، پریم نگر مہاراشٹر چوک، سیکٹر کالونی، گاندھی نگر، شنکر واڑی، ہری نگر فسادزدہ علاقوں کا قومی یکجہتی کے جذبے کو فروغ دینے کی غرض سے دورہ کیا اور مقامی افراد کی مشترکہ امن کمیٹی بنا کر سب کیلئے کام کرنے پر زور دیا۔

اس موقعہ پر وزیر موصوف کے ہمراہ ایڈیشنل کمشنر آف پولس شری آفتاب احمد خان، ڈی سی پی ڈگرسکر اور مقامی سماجی خدمت گار بھی تھے۔

اس موقعہ پر شری سید احمد نے ان فسادزدہ علاقوں میں جا بجا عوامی اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے ان سے ان کے دلوں سے خوف و ہراس نکال کر آپس میں بھائی چارے کے جذبے کے ساتھ رہنے کی اپیل کی ساتھ ہی شرپسندوں کے ساتھ پولس کو سختی کے ساتھ نپٹنے کی تاکید بھی کی۔

وزیر موصوف نے علاقہ میں پولس بندوبست کا بھی معائنہ کیا اور متعلقہ حکام کو علاقہ میں مکمل امن و امان کی فضاء برقرار رکھنے کی تاکید کی۔

شری سید احمد نے فساد میں ہلاک ہونے والے افراد کے گھر جا کر ان کے لواحقین کو پرسہ بھی دیا اور بعد ازاں وزیر موصوف فساد میں زخمی ہونے والوں کی عیادت کرنے کوپر اسپتال بھی تشریف لے گئے اور وہاں ڈاکٹروں کو زخمیوں کی اچھی طرح سے دیکھ بھال کرنے کے احکامات دیئے۔

نیز وزیر موصوف نے علاقہ کے سوشیل ورکروں سے وہاں امن و امان قائم رکھنے کیلئے امن کمیٹی بنانے پر زور دیا اور مشکل کے وقت اپنی خدمات کی پیشکش بھی کی!

پانچ اضلاع کیلئے صارفین کی تکالیف کم کرنیوالے فورم کی تشکیل

حکومت مہاراشٹر نے مرکزی حکومت کی منظوری سے صارفین کا تحفظ قانون ۱۹۸۶ء کے تحت چندرپور، سندھو درگ، دھولے، رتناگیری اور تھانے اضلاع میں صارفین کی تکالیف کم کرنے والے فورم کی تشکیل کی ہے۔

اضلاع کے فورم اور اس کے صدر اور دیگر دو ممبران کے نام درج ذیل ہیں۔

چندرپور ضلع فورم: شری سی۔ ایم۔ دھوپارے، ڈسٹرکٹ جج، چندرپور صدر، شری عبدالہاشمی شیخ اور

□

وزیراعلیٰ شری شرد پوار، اڑسے گاؤں میں اروندیہ آبپاشی پروجیکٹ کا افتتاح فرما رہے ہیں۔ یہ اسی موقع کی تصویر ہے۔

□

تی و یل وسنت راؤ شندے۔ بحیثیت ممبران۔
سندھودرگ ضلع فورم، شری پندھری ناتھ جگناتھ ڈے جج (ریٹائرڈ) بمبئی سٹی سول کورٹ، کانکاولی سندھودرگ صدر شری دیپک وسنت ڈیکرکر اور شریمتی مرنال نارائن کاشلیکر ساونت وادی بحیثیت ممبران دھولے، ڈسٹرکٹ فورم۔ شری وی اے گے، ڈسٹرکٹ جج دھولے صدر، شری سوالال کن لال بافنا اور شریمتی شالینی دتاترے سیوڈے بحیثیت ممبران۔

رتناگیری ڈسٹرکٹ فورم شری وی۔ ایل۔ ردھیکر سٹرکٹ جج رتناگیری صدر شری بھالچندر نارا سوپچھے اور شریمتی شالینی مین رتناگیری، بحیثیت ممبران۔

تھانے ڈسٹرکٹ فورم شری اے ایس میڈھیکر جج (ریٹائرڈ)، بمبئی سٹی سول کورٹ صدر، شری سریندر این باجپائی ڈمبولی (ایسٹ) اور ایڈوکیٹ شریمتی نند اکشور مل یا ٹھک تھانے بحیثیت ممبران۔

رسمی ملاقات

بھارت میں نیدرلینڈ کے سفیر مسٹر ہرمن جے دیو مارچی سرواس نے ۴، فروری ۱۹۹۱ء کو راج بھون میں مہاراشٹر کے گورنر شری سی۔ سبرامنیم سے ملاقات کی بعد ازاں سفیر محترم نے منترالیہ میں وزیراعلیٰ شری شرد پوار سے بھی ملاقات کی،

بھارت میں نیدرلینڈ کے قونصل جنرل شری جے۔ جے کوسٹر بھی اس موقعہ پر موجود تھے۔

کپاس کی حصولی

کپاس کی حصولی اسکیم کے تحت ریاست کے اندر ۲۵، جنوری ۱۹۹۱ء تک ۹۰،۶۷،۱۷،۵۹ کوئنٹل کپاس حاصل کی گئی اور ۱۱۱،۷۵،۴۶ گانٹھیں کی دھنائی کی گئی۔

گورنر مہاراشٹر شری سی۔ سبرامنیم، بھارتیہ ودیا بھون، ناگپور کیندر تشریف لے گئے۔ اس موقع پر منعقدہ جلسہ میں بائیں جانب سے شری جال۔ پی۔ گیمی، شری آر۔ کے پاٹل، ڈاکٹر اروِنا رام کرشنن، شری مینن اور دیگر حضرات دیکھے جا سکتے ہیں۔

خبریں۔ تصویروں میں

ریاستی پلاننگ کمیشن کی بیٹھک، وزیر اعلیٰ شری شرد پوار کی صدارت میں، منترالیہ میں ۴ فروری ۱۹۹۱ء کو منعقد کی گئی۔ کمیشن کے نائب صدر شری انا صاحب شندے، وزیر مالیات شری رام راؤ آدک اور وزیر آبپاشی شری پدم سنہہ پاٹل اور چیف سکریٹری شری کے۔ بی سرینواسن اور ریاستی پلاننگ کمیشن کے اراکین تصویر میں دیکھے جا سکتے ہیں!

نیوک نگر میں مہاتما جیوتی باپھلے گارڈن کی رسمِ بھومی پوجن کی تقریب کے موقع پر وزیرِ اعلیٰ شری شرد پوار تقریر کرتے ہوئے دیکھے جا سکتے ہیں۔

شری رام راؤ آڈک، وزیرِ مالیات ایمرجنسی کی ریاستی کانفرنس سے خطاب فرماتے ہوئے۔

پروفیسر جاوید خاں، وزیرِ ہاؤسنگ نے ۵ فروری ۱۹۹۱ء کو پریل کے ایم ڈی کالج کے ہال میں منعقدہ جلسۂ تقسیمِ انعامات میں بطورِ مہمانِ خصوصی شرکت کی زیرِ نظر تصویر میں موصوف شری سید جنید مصطفےٰ نامی طالب علم کو مہارشی شری کپ پیش کر رہے ہیں۔ تصویر میں داہنی طرف ایم۔ ڈی کالج کے پرنسپل شری جی۔ پی سریواستو بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

● ڈاکٹر م، ق، خان
حکیم عنایت کالونی، گیا (بہار) ۸۲۳۰۰۱

قومی راج کا شمارہ اگست ۲۰۰۰ء نہایت وقیع اور شاندار ہے۔ آپ نے قرۃ العین حیدر کے بارے میں ایک ساتھ کئی مضامین شائع کر کے اُن کی ہمہ گیر ادبی عظمت کو نہایت خوش اسلوبی سے اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور سب سے بڑا کام یہ ہوا ہے کہ آپ نے محترمہ سے ایک غیر رسمی گفتگو پیش کر کے محترمہ کے فن کو سمجھنے کے بہترین ذرائع ، ناولوں میں کردار اور وضع کردار کے لوازمات" اچھے مقالے ہیں اس بار شعری حصّہ بھی نہایت اہم ہے۔ ریاستی خبریں بھی دلچسپ ہیں آپ نے اس بار جریدے کے چاروں سرِ ورق کا بہترین استعمال کیا ہے یہ شمارہ کسی بھی سرکاری جریدے سے کم نہیں اور یہ شمارہ تو دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔

● وزیر جاوید
پین گنگا نگر۔

قومی راج اپنی ادبی خدمات کے لحاظ سے بے مثال ہے ماہ اگست کے شمارے میں ایک عظیم ادیبہ محترمہ قرۃ العین حیدر کی زندگی اور ادبی خدمات کا تعارف اردو دوستوں کیلئے مشعلِ راہ ہے ماہ ستمبر کے شمارے میں "مراٹھواڑہ میں عصری ادب" "قومی یکجہتی کے علمبردار مولانا ابو الکلام آزاد" اور "آزادی کے نقیب حسرت موہانی" وغیرہ جیسے مضامین طلبا اور طالبات کیلئے ایک مفید موادِ تعلیم ہے۔ میری ناقص رائے میں اگر اسی طرح قدیم و جدید شعراء اور ادباء کی سوانح حیات اور خدمات سے متعلق مضامین مسلسل قومی راج میں شائع ہوتے رہے ہیں تو یہ رسالہ کالج کے طلباء کے لئے بہترین رہبر بھی ثابت ہو سکتا ہے امید ہے کہ اس ناقص مشورہ کو شرفِ قبولیت بخشا جائے گا۔

● شبیر احمد خاں انور
مکان نمبر ۱، ۶، ۲، ۳ محلہ بڑھ ضلع عادل آباد،
(اے پی) ۵۰۴۰۰۱

قومی راج ہر ماہ پابندی سے مل رہا ہے اور نمایاں ترقی کر رہا ہے، ادب اور صحافت کی دنیا میں ایک الگ ہی مقام بنا رہا ہے، اس کے صفحات میں سائنس، ٹیکنالوجی، سیاسیات، ادب سب ہی کچھ ہے اس اعتبار سے ہر قسم کے مزاج کیلئے مناسب ہے۔ تازہ شمارہ میں قیصر رام نگری کی نظم "پریم سندیش"، بدر تبلیری کی غزل نما نظم اور بیکل اتساہی کی نظم "جواب تو دے" بہت پسند آئیں۔ غزل میں عزیز بھارتی، کامل حیدر آبادی اور صبیحہ موہانی کی غزلیں خوب ہیں، مضامین میں "مراٹھواڑہ میں عصری ادب" "جنگ آزادی میں اردو کا کردار" "قومی یکجہتی کے علمبردار مولانا ابو الکلام آزاد" "آزادی کے نقیب حسرت موہانی" اور "نمائش کے ... گل داؤدی کی چہیا اقسام" اس اعتبار اور حیثیت سے پسند آئے کہ یہ سب کے سب معلومات افروز مضامین ہیں اور قارئین کی عام معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔

● قمر النساء سرور بنت محی الدین فاروقی
۵۔۲۷، باغبانپورہ، ناسک سٹی (مہاراشٹر) ۴۲۲۰۰۱

اگست ۲۰۰۰ء شمارہ نظر نواز ہوا، دل خوشی سے جھوم اٹھا

محترمہ قرۃ العین حیدر صاحبہ کی گفتگو بہت ہی پسند آئی اور میں نے یہ شمارہ خاص طور سے اپنے کالج میں کئی لڑکیوں کو دکھایا جسے سب نے بہت پسند کیا۔

مراسلت کا پتہ:-

ایڈیٹر قومی راج

ڈائرکٹوریٹ جنرل آف انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز

گورنمنٹ آف مہاراشٹر،

۱۷ واں منزلہ نیو ایڈمنسٹریٹو بلڈنگ

مقابل منترالیہ بمبئی نمبر ۴۰۰۰۳۲

قومی راج

مہاتما جیوتی راؤ پھلے خصوصی نمبر

جلد ۱۸ شمارہ ۳

۱۰ مارچ ۱۹۹۱ء

زرِ سالانہ :- ۲۵ روپے

قیمت فی شمارہ :- ۳ روپے

چیف ایڈیٹر :- شری اردن پاٹنکر

مینجنگ ایڈیٹر :- آر جی بماٹیدیو

ایڈیٹر :- فیروزہ فیاض خان

ہندی اور مراٹھی زبان میں ہر ماہ کی یکم اور ۱۵ تاریخ کو اور انگریزی، گجراتی، سندھی اور اردو زبان میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔
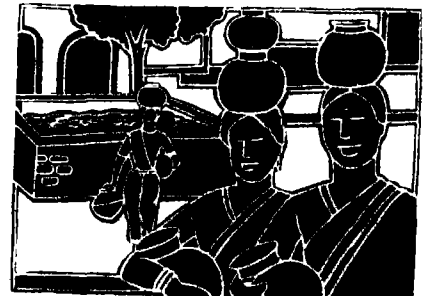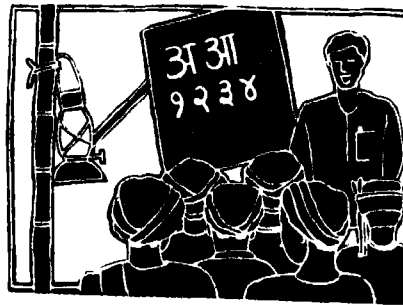
توسیل زر کا پتہ:-

اسسٹنٹ ڈائرکٹر (ایڈمنسٹریشن)

ڈائرکٹوریٹ جنرل آف انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز،

گورنمنٹ آف مہاراشٹر۔ بیرک نمبر ۱۹

مقابل سرچ بلڈنگ، نزد منترالیہ، بمبئی ۴۰۰۰۲۱

پیغام وزیرِ اعلیٰ

انیسویں صدی میں، مہاراشٹر ریاست میں کئی عظیم شخصیتیں ہو گزری ہیں کچھ خاص اور اہم مقاصد کے لئے ان شخصیتوں نے اپنی عمریں صرف کر دیں ان رہنماؤں کو خراج عقیدت پیش کرتے وقت ان کی زندگی اور کارنامے ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔

مہاتما جیوتی با پھلے نے تعلیم نسواں، بیواؤں کی شادی، ذات پات جیسی برائیوں کو سماج سے دور کرنے کیلئے اپنی ساری زندگی وقف کر دی تھی، انھوں نے مشنری اسکول میں نوکری کی مگر خود کے جاری کردہ اسکول سے کسی قسم کی مالی امداد حاصل نہ کی۔ جن جن برائیوں کے خلاف انھوں نے آواز اٹھائی یا انھیں دور کرنے کی کوشش کی ان کی زوردار مخالفت ہوئی ان پر حملے ہوئے، مگر جیوتی با اپنے فیصلوں پر اٹل رہے۔

آج دنیا بہت آگے نکل گئی ہے لڑکیوں کے لئے تکنیکی اور تعلیمی ادارے بھی کھولے جا رہے ہیں، اس تبدیلی یا انقلاب کے تئیں ہمارا بھی فرض بنتا ہے کہ ہم بھی خواتین کے تئیں اپنا زاویہ نگاہ بدلیں یہ وقت کی ضرورت ہے۔ خواتین کو سماج میں برابری کا درجہ ملنے پر وہ خود اعتمادی کے ساتھ ملک کی ترقی کے دھارے میں شامل ہو سکیں گی، مہاتما جیوتی با پھلے کی یاد میں منائی جانے والی صدی میں ہمیں اپنا روحانی جائزہ لینے کا موقع ملا ہے۔

حکومت مہاراشٹر کی جانب سے اس موقع پر "قومی راج" کا خصوصی شمارہ شائع کیا جا رہا ہے۔ یہ بڑی خوش آئند بات ہے، معلومات سے پُر خاص نمبروں کی روایت قومی راج نے اپنے قارئین کے لئے قائم کی ہے اور اپنی ایک نمایاں شناخت بنائی ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس پیش کردہ نمبر کا بھی اسی تپاک سے خیر مقدم کیا جائے گا۔

پُرخلوص تمناؤں کے ساتھ

(شرد پوار)

پیغام وزیر محکمہ تعلیم و تکنیکی تعلیم
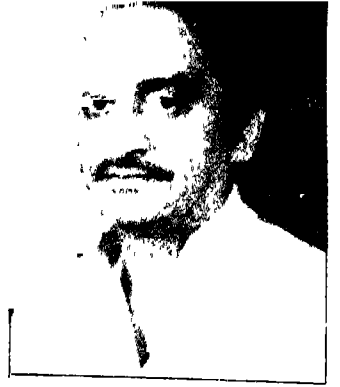
یہ ایک قابلِ ستائش بات ہے کہ مہاتما جیوتی باپھلے کے جشنِ صد سالہ کے موقعہ پر ادارۂ "قومی راج" اپنا خاص شمارہ شائع کر رہا ہے۔

بیسوی صدی کے دوران اس مُلک میں اور بالخصوص مہاراشٹر میں کئی ایسی ہستیاں پیدا ہوئیں جنھوں نے زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا اور انھوں نے سیاسی، سماجی، اقتصادی، مالی، مذہبی، تعلیمی اور ادبی شعبوں کو نئے خیالات سے نوازا اور نئے زاویوں سے پیش کیا۔ انھیں ہستیوں میں سب سے پیش پیش مہاتما جیوتی باپھلے تھے۔

مہاتما پھلے نے جو کارنامے سماجی یکجہتی، مذہبی یکسانیت، عورتوں اور پسماندہ طبقوں کی تعلیم اور تعلیم کی مدد سے سماج میں تبدیلی اور اسی طرح ذاتی بھید بھاؤ کو مٹانے کے لیے انجام دیئے وہ نہ صرف تاریخی اور انقلابی مقام رکھتے ہیں بلکہ اک نئے سماج کو پیدا کرنے والے بھی۔

جبکہ ہم مہاتما پھلے کا "سال جشنِ صد سالہ" منا رہے ہیں تو آج ضرورت اس بات کی ہے کہ اِس "سماج سُدھارک" کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو نئی پیڑھی کے سامنے رکھیں تاکہ جو کام ادھورا رہ گیا ہے وہ پورا ہو سکے۔

"قومی راج" کے خاص شماروں کی اپنی ایک مخصوص روایت ہے۔ فکر کی گہرائی اور مواد کی فراہمی یہی خصوصی شماروں کی خاصیت ہے۔ اُمید ہے کہ یہ خصوصی شمارہ اپنی روایات کی کسوٹی پر کھرا اُترے گا۔

مہاتما پھلے کے خصوصی شمارے کیلئے میری دلی مُبارکباد۔

بھارت بوندرے
وزیر محکمہ تعلیم و تکنیکی تعلیم
مہاراشٹر سرکار منترالیہ بمبئی ۳۲
مورخہ ۲۰ فروری سنہ ۱۹۹۱ء

پیغام وزیر برائے جنرل ایڈمنسٹریشن ڈپارٹمنٹ

مہاتما جیوتی با پھلے مہاراشٹر کے ایک بلند پایہ سماجی مفکر تھے. آپ نے کاشتکار مزدور پیشہ، پچھڑے ہوئے اور دلت خواتین پر ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف آواز بلند کی۔ پرانے خیالات پر تنقید کی. الگ الگ فرقہ اور گروہ کے لوگوں میں بھائی چارگی پیدا کی. انکا خیال تھا کہ تعلیم ہی ہمہ طرفہ ترقی کا دروازہ ہے اور یہ دروازہ انھوں نے شُدر اور اس سے بھی ہلکی برادری کی عورتوں کے لیے کھلوادیا. دلت اور مظلوم طبقہ کے بنیادی حقوق کے لیے آپ تمام عمر لڑے۔ جیوتی با صحیح معنوں میں سربراہِ انقلاب تھے. انسانیت کے پجاری تھے جیوتی با اور ان کی بیوی ساوتری بائی کے کارناموں پر ہم ہندوستانیوں کو فخر ہے. نئے مہاراشٹر کے بنانے میں مہاتما پھلے اور ان کی اہلیہ کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ مہاراشٹر کی تاریخ میں آپ ایک سربراہِ انقلاب اور متحد کار کے نام سے جانے جائینگے۔

مہاتما جیوتی با پھلے کے " جشنِ صد سالہ " کے موقعہ پر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ کی وساطت سے شائع ہونے والے جریدہ "قومی راج" کا خاص شمارہ مہاتما پھلے پر شائع ہو رہا ہے. یہ کام قابلِ ستائش ہے. اس خاص شمارہ کے ذریعہ جیوتی با کے خیالات اور کارنامے نئی پیڑھی تک پہونچیں گے اور نئے سماج کی تشکیل کے عوام کے خوابوں کو پورا کرنے میں مددگار ثابت ہوں گے ایسی مجھے امید ہے۔

ارُن گجراتی
وزیر برائے جنرل ایڈمنسٹریشن ڈپارٹمنٹ
مہاراشٹر سرکار، منترالیہ، بمبئی ۳۲

مہاتما پھلے سمارک سمیتی کا مقصد تھا کہ مہاتما پھلے کا قدِ آدم مجسمہ بمبئی میں مہاراشٹر ادھان بھون کے سامنے نصب کیا جائے وہ مقصد اب پورا ہوگیا ہے۔ اور مجسمہ کی تنصیب کی جارہی ہے۔ اس واقعہ سے جنھیں سماجی تبدیلی کا شدت سے احساس ہے بڑی مسرت ہوگی۔

لیکن اب تک اس میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی ہے۔ کارخانے بڑھتے گئے لیکن کسان جس طرح پس رہے ہیں یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔ ایسے وقت میں مہاتما پھلے کے درشن ہماری قسمتوں کے مالک ممبرانِ اسمبلی کو ہوتے رہیں یہ انتہائی ضروری ہے۔

۱۹۲۵ء کے جولائی مہینے میں مرحوم کیشوراؤ جیدھے نے

★ ایس۔ ایم جوشی
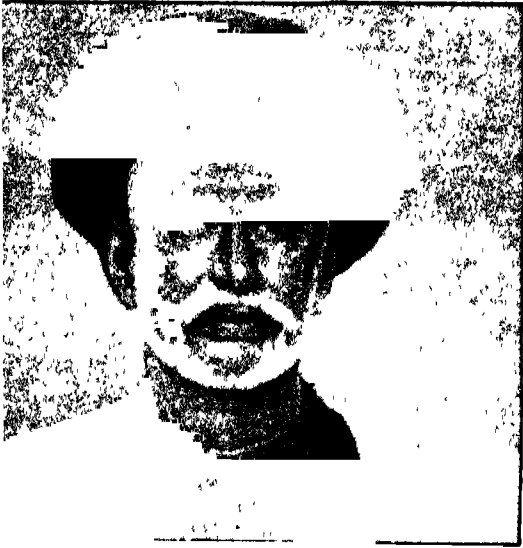
مکمل انقلاب کا راہبر مہاتما پھلے

۱۸۸۸ء میں ڈیوک آف کناٹ پونے آئے تھے جیوتی راؤ کے دوست راؤجی چپلون کرنے شہزادے کو مدعو کیا اور جیوتی راؤ کو بھی شرکت کی دعوت دی۔ جیوتی راؤ حاضر ہوئے لیکن ایک غریبی میں دن گزارنے والے کسان کے لباس میں۔ اس موقعہ پر انھوں نے انگریزی میں تقریر کی اور اپنی اس تقریر کے ذریعہ کسانوں کی روزمرہ کی تکالیف کی جانکاری شہزادے کو دی۔

اب بھارت آزاد ہے پھر بھی کسانوں کی تکالیف دُور نہیں ہوئیں۔ انھیں مصائبات سے آزاد کرانے کی کوششیں جاری ہیں

پونے کی نگر پالیکا میں مہاتما پھلے کا مجسمہ نصب کرنے کی تجویز پیش کی۔ اس سے قبل نگر پالیکا میں وشنو شاستری چپلون کر اور لوکمانیہ تلک کے مجسمے تنصیب کیے جاچکے تھے۔ لیکن برہمن ممبران کو مہاتما پھلے کے مجسمے کی تنصیب پسند نہ تھی۔ برہمن ممبران کی تعداد کم ہوتے ہوئے بھی انھوں نے اپنے ہم خیال ممبران کی مدد سے یہ تجویز نامنظور کردی۔

اس سال مہاتما پھلے کا مجسمہ ودھان بھون کے سامنے متفقہ رائے سے تنصیب کیا جارہا ہے۔ لوگوں کے ذہنوں میں جو تبدیلی

رونما ہوئی ہے اس سے یہ واضح اور بھی بامعنی ہو جاتا ہے۔ سماج بدل رہا ہے لیکن تبدیلی کی رفتار سست ہے۔ اس کی تیز رفتاری ملک کے مستقبل کے نقطۂ نظر سے مفید ہوگی۔

۱۸۱۸ء میں پیشوائی کے اختتام کے بعد تبدیلی کا رد عمل شروع ہوا۔ غیروں کی غلامی میں جکڑا ہوا سماج آہستہ

آہستہ جاگنے لگا۔ سماج کے مختلف طبقوں کے لیڈران نے اپنے اپنے طور پر سوچنا شروع کیا۔ ذاتی تجزیہ شروع ہوا۔ اور اسی میں سے پھلے جیسا "یگ پرش" نمودار ہوا۔ جیوتی راؤ خاص طور پر سماجی برائیوں کے ناقابلِ برداشت بوجھ تلے دبے ہوئے لوگوں کے دکھوں سے بے چین ہو اٹھے۔ وہ جان گئے کہ یہ ساری دکھوں کی دین کے مالک خاص اختیار کر پیدا ہونے والے اونچی ذات کے لوگ ہیں۔ ہندو سماج میں مختلف ذاتوں کے وجود کے خلاف انھوں نے احتجاج کا پرچم بلند کیا۔ راجہ رام موہن رائے کی مانند مہاتما پھلے بھی بھارت میں سماجی برائیوں کو دور کرنے میں

پہل کرنے والوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔

مہاتما پھلے نے صرف اپنے خیالات ہی پیش نہیں کیے بلکہ وہ اسے عمل میں بھی لائے۔ ستیہ شودھک سماج کی بنیاد ڈال کر انھوں نے اسے سماجی رد و بدل کا ہتھیار بھی بنالیا جو مصیبت زدہ سماج میں جا کر عمل کے ذریعہ پھیلا کر ہوئی ایک تحریک بھی تھی۔ ان کی یہ چھیڑی ہوئی تحریک اب بھی وہ اپنی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچی ہے۔ سماجی برائی جب تک ختم نہیں ہوتی تب تک اپنے آپ کو آزاد سمجھنا محض ایک وہم ہے۔ برائیوں میں گھیرے ہوئے سماج میں جمہوریت کب تک جکڑی رہے گی۔؟

ہر جاندار کو پیٹ کی بھوک رہتی ہے لیکن صرف پیٹ کی بھوک مٹانا انسان کا مقصد نہیں۔ وہ اس پر مطمئن نہیں ہوتا۔ اس کے دل میں سماجی برابری اور آزادی کی بھوک ہوتی ہے اور یہ بھوک اسے آرام سے بیٹھنے نہیں دیتی، بے چین رکھتی ہے۔ اس بھوک کو مٹانے کے لیے وہ جد و جہد کرتا ہے۔ اگر یہ نہیں مٹتی تو

چھٹپٹانے لگتا ہے ۔ کئی مرتبہ مایوسی ہاتھ آتی ہے ۔ ہماری سماجی بناوٹ میں اونچے طبقے کے لوگوں نے ساری برائیاں شودر لوگوں کے سر تھوپ دی ہیں۔ اسی وجہ سے سماج میں تناؤ پیدا ہوتا رہا ہے ۔ اور اب یہ تناؤ اپنے عروج پر پہنچ چکا ہے ۔ اگر وقت پر بیدار نہ ہوئے تو یہ سارا نظام درہم برہم ہو جائیگا شودروں کو برابری کا نہ سمجھنے کی وجہ سے وہ ہندو سماج سے دوسرے سماج کی طرف چلے گئے اور یہ سلسلہ صدیوں سے جاری ہے لیکن اب وقت آگیا ہے کہ اگر اونچے درجے کے لوگوں نے اپنا رویہ بدلا نہیں اور انھیں برابری کا سمجھا نہیں تو یہ لوگ منظم ہوتے ہوئے بھی سماج سے راہِ فرار اختیار کرنے میں پس و پیش نہیں کریں گے ۔ جیوتی راؤ کے شروع کئے ہوئے سماج سدھارنیکے کام کی اگر اونچے درجے کے لوگوں نے مخالفت نہ کی ہوتی رکاوٹیں نہ لائی ہوتیں تو حالت آج کی طرح نہ ہوتے ۔ اگر ان کا یہ کام ہم نے پورا نہ کیا تو یہ مصیبت ٹلنے والی نہیں ۔ اسکے علاوہ کوئی دوسرا علاج نہیں ۔

میناکشی پورم میں پچھڑے طبقہ کے اور دلت سماج کے لوگوں نے مذہبِ اسلام قبول کیا جس کی وجہ سے غم و غصہ کی ایک لہر دوڑی ہوئی ہے ۔ کیا اس واقعہ سے ہندو سماج اور اونچے طبقہ کے لوگ کوئی سبق سیکھ سکیں گے ؟ کیا سماج سے برائیوں کو دور کرنے کے وہ آگے آئیں گے ؟ کچھ عرصہ کے لیے تقریر بازی کرنے پھر آرام سے بیٹھ جانے کی کوئی گارنٹی نہیں دے سکتا ۔ اس واقعہ کی وجہ سے برابری اور سماجی برائیوں کو دور کرنے کی طاقت کو اور مضبوط اور تیز تر رفتار کرنا ہوگا ۔ لیکن امکان کچھ ایسا بھی ہے کہ کٹر وادی کہیں اور کٹر نہ ہو جائیں جو مظلوم ہیں وہ بھی پہلے کی بکھرے ہوئے نہ رہیں اور رہیں بھی کیوں ؟ اور وہ بھی منظم ہوں گے اور ظالم سماج کے خلاف مختلف طریقوں سے نبرد آزما ہوں گے ۔ موجودہ حالات میں سماج سدھارنیوالوں کی کوششیں زیادہ سے زیادہ اثر انگیز بنانے کے لئے اپنی پوری طاقت کو مرکوز کرنی ہوگی ۔ مہاتما پھلے کی شروع کی ہوئی تحریک جو کہ برابری پر مشتمل نئے سماج کی تشکیل ہے ۔ آخری خواہش ہونی چاہیئے (حرفِ آخر ہونا چاہیئے)

جیوتی راؤ کی زندگی کا دم و سخن ایک جملے میں مل جائے گا جس کے لیے انھوں نے اونچی ذات کے لوگوں کا مضحکہ سہا ۔ اپنے وقت میں دلتوں کے لیے اپنا حوض کھول دیا ۔ لیکن ان کے انتقال کے بعد کئی سالوں تک یہ تحریک یتیم ہوگئی ، دبی رہی ۔ ۱۹۲۰ء کے شروع میں کیشوراؤ جیدھے اور ان کے ساتھیوں نے ستیہ شودھک تحریک میں دوبارہ روح پھونکی اور اسے تیز رفتار بنایا ۔ ۱۹۲۵ء میں پونے نگر پالیکا کے ممبر منتخب ہونے کے بعد اپنی کارگزاری کے دوران وہ برہمن سربراہی کے خلاف کھڑے ہو گئے ۔ انھوں نے نگر پالیکا کے خرچہ سے چلنے والے پانی کے نل اور حوض چھوا چھوت کا فرق نہ کرتے ہوئے سب کے لیے کھول دینے کی تجویز پیش کی اس وقت برہمن ممبران اور ان کے ہمخیال ممبران نے مورچہ بندی کر کے اس تجویز کو نامنظور کروایا ۔ کولہاپور کے شاہو مہاراج نے بھی اس تحریک کو اپنایا ۔ لیکن ان کی بے وقت موت اور آزادی کی سیاسی تحریک کی وجہ سے یہ تحریک منتشر ہوگئی ۔ اس تحریک میں شامل کچھ لیڈران حکومت کے آگے جھک گئے ۔ کیشوراؤ جیدھے نے وقت اور لوگوں کی نفسیاتی نبض کو پہچان لیا ۔ اور برہمن لیڈران کو چھوڑ کر گاندھی جی کی شروع کی ہوئی ستیہ گرہ کی تحریک میں کود پڑے ۔ ان کے ساتھ ہی ڈاکٹر باباصاحب امبیڈکر کے زیرِ قیادت سماجی یکسانیت کی تحریک سے اپنی قربت قائم رکھی

۱۸۱۸ء میں برٹشوں کا راج آیا ۔ وہاں یورپ میں پروٹسٹنٹ مشنریوں نے شخصی آزادی کا جھنڈا پوپ کی کل مختاری کے خلاف بلند کیا ہوا تھا ۔ اس کے تاثرات غیر ملکی حکومت کے ساتھ بھارت تک پہونچ گئے ۔ لوتھر کالون جیسے لوگوں کے خیالات لے کر کرسچن مشنری کے لوگ ہم تک آئے ۔ ہندو سماج کے کمزور پہلوؤں

پرانگلی رکھتے ہوئے عیسائی مذہب کی تبلیغ شروع کی۔ انھوں
نے زور دیا پیدائشی اونچ، نیچ، چھوا چھوت، بیوہ عورتوں کے
بال کاٹنا اور بیواؤں کے دوبارہ شادی نہ کرنے پر دیا۔ یہ ساری
برائیاں مذہب کے نام پر چل رہی ہیں اس پر بھی زور دیا۔ فطری
طور پر جیوتی راؤ مشنری کے لوگوں کی طرف راغب ہوئے کیوں کہ
ان کی بھی مندرجہ بالا برائیوں سے مخالفت تھی۔ یہ کوشش بھی
کی گئی کہ وہ ہندو دھرم چھوڑ کر عیسائی مذہب اپنالیں لیکن جیوتی
راؤ اس جال میں نہ آئے کیوں کہ ہندو سماج کے نظم وضبط کی
برائیوں کے خلاف خیالات ان کے اپنے تھے نہ کہ عیسائی مشنریوں
سے لئے ہوئے "وجرسوچی" جیسی سنسکرت گرنتھ اور کبیر کے
بیج گرنتھ اور اکا کے "وپرمتی" یہ حصے وہ جانتے تھے۔ اور اسی
لیے ان کی معنویت کو ستیہ شودھک تحریک میں شامل کیا۔ ایسا
کہنا بجا ہوگا۔ ۱۸۶۰ء میں تکارام تاتیا پڈول کی "جاتی بھید
وویک سار" نام کی کتاب شائع ہوئی اسی طرح سنت بہینا بائی
نے "وجرسوچی" نام کی سنسکرت کتاب کا مراٹھی زبان میں ترجمہ
کیا تھا۔ اس کے علاوہ مشنری کے سچائی کے شیدائی عظیم لوگوں نے
یہاں آنے سے پہلے مذہبی اختلافات کے خلاف صف آرائی کر
رکھی تھی۔ عیسائی مشنری کے ہندوستان آنے سے قبل صدیوں
تک لنگایت سماج کے گورو بسویشور اور "مہانو بھاؤ پنتھ" کے بانی
چکر دھر نے سماجی تقسیم کے خلاف لڑائی کی تھی۔

اپنے ہی مذہب میں رہتے ہوئے تبدیلی کا کام کرتے رہنے
کا جیوتی راؤ کا ارادہ تھا۔ وہ مذہب کے مخالف نہیں تھے۔ کائنات
کے خالق نے ہم سب کی تخلیق کی ہے۔ اور اسی لیے ہم سب بھائی
بھائی ہیں یہی ان کا یقین تھا۔ اسی انسانی بھائی چارگی سے ہی ستیہ
شودھک سماج کا وجود ہوا ہوگا۔ ان کا عقیدہ ایشور کے وجود
پر تھا۔ انھوں نے ایشور کو خالق سے منسوب کیا ہے۔ وہ ہر
ایک کے ساتھ انصاف کرتا ہے۔ یہ ان کا یقین تھا۔ خالق سب
کے ساتھ برابر کا انصاف کرتا ہے اسے ثابت کرنے کے لیے انھوں
نے جو اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے ضروری نہیں کہ وہ سائنس کی
کسوٹی پر کھرے اتریں۔ دھرم سنستھا کی ضرورت کو وہ محسوس
کرتے تھے۔ مذہب کے تخیل کی بنیاد پر ہی انھوں نے خالق
کے تخیل کو ذہن میں لایا ہوگا۔ آج اکثریت میں لوگوں کو مذہب کی
ضرورت کا احساس ہوتا ہے۔ اور اسی کی جڑ سے نکلا ہوا ایشور
کا تخیل ہے۔ ایشور کے وجود سے انکار کر کے انسانیت سے لگاؤ
ہو اگر ایسا کہا جائے تو ایشور کے وجود کے ماننے والے کو ایک
انسان سے دوسرے انسان کے پیار کرنے کا احساس ہوتا ہے۔ انھیں
روحانی تسکین کا مزہ ملتا ہے۔ اس کی جڑ کہاں ہے یہ کہو تو جانیں۔

آج بھی پسے ہوئے دلت لوگوں کو ایسا لگتا ہے کہ مذہب
اسلام قبول کرلیں۔ یہ کس بات کی نشانی ہے؟ مہاتما پھلے کی تعلیم
اگر لوگوں تک پہنچائی جاتی تو ایسے حالات سامنے نہ آئے ہوتے
لیکن ایسا نہ ہونا تھا۔ عورتوں کو مردوں کی طرح تعلیم حاصل کرنے
کا اختیار ہے۔ یہ مہاتما پھلے، بھانڈارکر، آگرکر، بہارشی کروے جیسے
لوگوں کا اصرار اب قابل قبول ہوگیا ہے۔ لیکن یہ بھی نہ ہو سکا
بھارت میں عورتوں کی آزادی کی تحریک کی بانی ساوتری بائی پھلے
کو بے پناہ تکلیفیں، تضحیک اور ذہنی اذیت سے دوچار ہونا پڑا
ہم عورتوں کی طرف سے منہ پھیر لیں نامناسب ہے۔

ساوتری بائی نے ۱۸۴۸ء میں پونے شہر میں لڑکیوں کا پہلا
اسکول کھولا۔ اسی سال یورپ میں کارل مارکس نے کمیونسٹ مینی
فیسٹو پیش کیا۔ اور مزدوروں کے حقوق مارنے والے سرمایہ داروں کے
خلاف آواز اٹھائی۔ اسی سال ساوتری بائی نے عورتوں کی غلامی
کے خلاف آواز اٹھائی۔ واقعی یہ ایک قابل ذکر اتفاق ہے۔ ساوتری
بائی بھارت کی سب سے پہلی خاتون ٹیچر تھیں۔ انھوں نے مرد
جیوتی راؤ کی بیوی کی حیثیت سے نہیں بلکہ ذاتی خیالات سے متا
ہوکر کیا۔

جیوتی راؤ کی ساوتری بائی کے ساتھ شادی ایک حُسنِ اتفاق تھا۔ اگر ساوتری بائی کا ساتھ نہ ہوتا تو جیوتی راؤ کو عیسائی تعلیم کے کام کی شروعات کرنا مشکل ہوتا۔ انتہائی تضحیک و پریشانی اٹھانے کے باوجود ساوتری بائی نے پسپا ہونا قبول نہیں کیا۔ بجائے اس کے وہ جیوتی راؤ کی مدد کرتی رہیں اور حوصلہ بڑھاتی رہیں۔

عورتوں، دلتوں اور پس ماندہ طبقوں پر ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف تحریک شروع کرنے کے بعد وہ آرام سے نہیں بیٹھیں انھوں نے ۱۸۹۲ء میں "شیت کریانچا اسوڈ" نامی ایک کتاب شائع کی۔ اناج پیدا کر کے سماج کو پالنے والے کاشتکاری تکالیف کو دور کرنے کی کوشش کی۔ کاشتکار طبقہ پر ہونے والے مظالم کے خلاف خم ٹھونک کر اترنے والے نہ صرف مہاراشٹرا بلکہ بھارت کے پہلے سماج کے بارے میں مفکر مہاتما پھلے ہی تھے۔ چاروں طرف سے کاشتکاروں کی کس طرح پریشانی ہوتی ہے یہ جوتی راؤ نے "اسوڈ" میں کھل کر ظاہر کی ہے۔ ہندو سماج کے نظام میں کاشتکاروں کو شدر کا درجہ دیا ہوا ہے۔ اونچے طبقہ کے لوگ اناج پیدا کرنے والے کاشتکاروں کو شدر سماج میں شامل کرتے ہیں۔ ان کی بے عزتی کی جاتی ہے نہ صرف یہ بلکہ ان کی مالی حالت بھی خراب کی جاتی ہے تاکہ انھیں ظلم کا شکار کیا جا سکے انھیں غریب اور لاچار کیا جا سکے اور ان کی بنیاد پر سماجی نظام ٹکا رہ سکے یہ اونچے طبقے کے لوگ جان گئے تھے۔ یہ ساری باتیں جیوتی راؤ نے اپنی تحریر اور کتابوں کی مدد سے آشکار کیں۔

مہاتما پھلے نے بھالیکر، آیاوارو، لوکھنڈے، سوامی رتیا، دھونڈی رام نامدیو، کمبھار وغیرہ ساتھیوں کے ذریعہ ستیہ شودھک تحریک شروع کر کے مکمل سماجی انقلاب کے دور کی شروعات کی۔ ان کے انتقال کے بعد بھی یہ تحریک آگے نہ بڑھ سکی۔ چہار پہلو انقلاب کے بجائے ملک کے سیاسی آزادی کے سوال کو زیادہ فوقیت دی گئی۔ ایسا ہونا آبادی والے ملک کے لیے فطری تھا۔

بیسویں صدی کے شروعات میں کیشوراؤ جیدھے، جول کر، کولھاپور کے شاہو مہاراج، بھاسکر راؤ جادھو وغیرہ لیڈروں نے دوبارہ ستیہ شودھک سماج کی تحریک کو متاثر بنانے کی کوشش کی لیکن اس تحریک کو برہمن مخالف کی شکل دے کر اسے محدود کر دیا۔ برہمنوں کے علاوہ دوسرے اونچے طبقے کے لوگ دلتوں پر اور پسماندہ طبقوں پر جو ظلم کر رہے تھے اسے نوٹ کیا گیا اور ناراضگی ظاہر کی گئی۔ سماجی برائیوں کی مخالفت کی جانی چاہیئے۔ یہ مخالفت برہمنوں کی نہیں یہ خیال دور ہوتا گیا۔ اس کے علاوہ ملک کی آزادی کی تحریک پر لوگوں کی گرفت بڑھنے کی وجہ سے اس کا زور کم ہوتا گیا۔ قومی تحریک کا اثر نہ بڑھے اس لیے غیر ملکی حاکموں نے بھی ستیہ شودھک تحریک کے کچھ لیڈروں کو اپنی طرف ملا لیا۔ برٹشوں کے حامی اور غیر ملکی حکومت کی سخت مخالفت کرنی چاہیئے ایسا کہنے والے ڈھیلے پڑ گئے ایسے حالات میں کیشوراؤ جیدھے نے حالات کا باریکی سے جائزہ لیکر مہاتما گاندھی کے زیر قیادت جاری ستیہ گرہ تحریک میں کود پڑے اس کی وجہ سے مہاراشٹر میں کانگریس کی تحریک اور تنظیم کا پایہ اور مضبوط ہو گیا۔ بہوجن سماج کا ایک بہت بڑا حصہ قومی تحریک میں شامل ہو گیا۔

ہمارے ملک کو آزاد ہوئے چوتنیس سال ہو گئے ہیں، لیکن کاشتکاروں کے حقوق نظر انداز ہی رہے۔ کاشتکاروں کی اپنی تحریک وجود میں نہیں آئی۔ آزادی کے بعد کے زمانے میں اقتصادی منصوبوں کی شروعات ہوئی لیکن اب تک بڑے صنعت کاروں کو ہی بڑھاوا ملا۔ کاشتکاری کے کام کو اگرچہ برباد نہیں کیا انھیں لوٹا گیا۔ کارخانہ داروں کی ترقی کے لیے کاشت کاری سے ہی مالی امداد دی جانی چاہیئے۔ ایسے خیالات رکھنے والے مالیاتی منصوبہ کار اور سیاست آگے آئے۔ پچھلے کئی برسوں سے کاشتکاری کی طرف سے ان کی اپنی آواز بلند کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ در حقیقت آزادی کی لڑائی کے دوران ہی ایسا ہو

جانا چاہیئے تھا۔ کئی ایک کوششیں خود ساختہ انقلاب پسند سماج وادی لوگوں نے کیں لیکن یہ زور نہ پکڑ سکیں۔ تحریک سے متاثر کئی لیڈروں نے کانگریس سے باہر آکر "شتیکری کامگار پکش" کی بنیاد ڈالی۔ سماج واد کو نعرہ بنایا۔ لیکن ۱۹۳۴ء سے لے کر "لوک شاہی سماج واد پکش" اور "شتیکری کامگار پکش" یہ دونوں ایک جان نہ ہو سکے۔ فطری طور پر حکومت کرنے والی کانگریس کے سماجی، اقتصادی منصوبوں کا ان پر اثر نہ ہو سکا۔

تحریک آزادی کے دوران اس میں حصہ لینے والے اور خود کو انقلابی کہلانے والے سماج وادی پکش نے سماجی۔ اور اقتصادی بنیاد پر کھڑی ہوئی سماجی تنظیم کو ختم کر کے اس کی جگہ یکسانیت پر مبنی نئے سماج کی تشکیل کرنے کا قصد کیا لیکن صرف مالیاتی سوالات تک ہی اپنا مقصد محدود رکھا۔ آزادی حاصل ہونے کے باوجود بھی سماجی سدھار کے سوال کی طرف زیادہ دھیان نہیں دیا۔ کارل مارکس کے خیالات کی طرح ہی انھیں مہاتما پھلے اور مہاتما گاندھی کی تعلیم بھی ورثہ میں ملی تھیں لیکن انھوں نے اس کا جتنا چاہتے تھے اتنا فائدہ نہیں اٹھایا۔ سماج وادی تحریک کی باگ ڈور بہت سے اعلیٰ طبقے کے لوگوں کے ہاتھ رہی یہ اس کی مجبوری رہی ہو۔ لیکن نئے راہبر مہاتما پھلے اور مہاتما گاندھی کی تعلیمات کو اپنانا کوئی مشکل کام نہیں۔ اپنے ملک میں جمہوری سماج واد کو لانا ہے تو مارکس وادی خیالات کے ساتھ گاندھی جی کی ستیہ گرہ اور مہاتما پھلے کے عام ستیہ دھرم کی پناہ لینی ہی پڑے گی۔

سत्यमेव जयते.

सार्वजनीक सत्य धर्मपुस्तक.

हें

जोतीराव गोविंदराव फुले

यांनीं

एकंदर मानव स्त्रीपुरुषाच्या हितार्थ केलें

तें

यशवंत जोतीराव फुले

यांनीं

मुंबई येथें

(सुबोधप्रकाश छापखान्यांत छापवून प्रसिद्ध केलें.)

आवृत्ति पहिली.

(या ग्रंथासंबंधी सर्व हक्क प्रसिद्ध कर्त्यानें आपणाकडे ठेविले आहेत.)

पुणे. इसवी सन १८९१.

किंमत १२ आणे.

آج ہر طرف جمہوریت اور سماج برابری کی زبان بولی جا رہی ہے

خاص طور پر اونچے طبقے کے لوگ اپنی ذہنیت بدلیں

گے نہیں تو صرف قانون بنانے سے یہ کام ممکن نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ جے پرکاش نرائن جی نے مکمل انقلاب کا نعرہ بلند کیا تھا۔ سماجی برائیاں دُور کرنے کے لیے جو اقدامات ضروری ہیں ان کے بغیر مقصد حاصل کرنا مشکل ہے۔ مہاتما پھُلے، مہاتما گاندھی اور لوک نایک جے پرکاش جی کی منزل ابھی دُور ہے۔ ہندو سماج میں ہمیں انصاف نہ ملنے کے برابر ہے۔ انسانوں کی طرح برتاؤ نہیں

میں ایک قسم کی نئی بیداری جاگی ہے۔ وہ باقاعدہ منظم اور طاقت ور بن گئے ہیں۔ جگہ جگہ مظلوم اور بچھڑے ہوئے مزدُور، کسان اور کاشتکاروں کے بیچ جاکر کام کرنے والے نوجوانوں کی ٹولیاں سامنے آرہی ہیں۔ یہ طاقت یکجا ہونی چاہیئے۔ اس کے لیے سب سے پہلے ان میں رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ سب کو اوپر لانے والی

ہوتا، تو سینکڑوں دلتوں نے مذہبِ اسلام قبول کیا نہ ہوتا۔؟

بدلہ نہ لینے والے کاشتکاروں میں سے مصیبت زدہ کاشت کاروں کی تحریک سو سال پہلے مذہبی ٹھیکیداروں نے شروع کی اس کے بعد آزادی آئی۔ کاشتکاروں کے نام پر الگ الگ لوگوں نے حکومت ہڑپ کی لیکن وہ کارخانہ داروں کو کاشتکاروں کو لوٹنے سے روک نہ سکے۔ پچھلے ایک دو برسوں سے وہ ذرا ہوشیار ہوگئے ہیں۔ سارے ملک میں کاشتکاروں

جوانوں کی ٹولی، سماج وادی طبقے، دلت پنتھر یہ سب ایک ہی سماج مقصد کے پُجاری ہیں۔ مہاتما پھُلے کا ودھان بھون کے سامنے تنصیب کیا ہوا مجسمہ ہم سب کو للکارتا ہے۔ ہم سب ذاتی مفادات کو بالائے طاق رکھ کر آگے بڑھیں تبھی یہ خواب پورا ہوسکے گا۔

(مہاتما پھُلے گورو گرنتھ ۱۹۹۲ء سے ماخوذ)

فیروزہ فیاض خان

جیوتی باپھلے

ہندوستان میں خواتین کی تعلیم کے علمبردار

ڈاکٹر امبیڈکر جنہوں نے بھارت کے دستور کو تیار کرنے میں سب سے اہم رول ادا کیا ہے۔ جیوتی با پھلے کی سوانح لکھنا چاہتے تھے انہوں نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ میں جیوتی با پھلے کو مہاتما بدھا اور کبیر کی طرح تعظیم و تکریم کے لائق سمجھتا ہوں۔

جیوتی با پھلے وہ پہلے ہندوستانی ہیں جنہوں نے مہاراشٹر میں خواتین کے لیے پہلے اسکول کی بنیاد ڈالی۔ وہ چاہتے تھے کہ خواتین کے ساتھ جو غیر امتیازی سلوک ہوتا ہے اُسے دُور کریں اور انہیں اُن کی پس ماندگی سے اٹھا کر مساوی درجہ دلائیں۔

جیوتی با ۱۸۲۷ء میں ایک کسان باغبان کے گھر پیدا ہوئے ان کی ماں مالی ایک مذہبی اور پاکباز خاتون تھیں جن کا بہت جلد انتقال ہو گیا۔ جس دایہ نے انہیں پال پوس کر بڑا کیا اس نے جیوتی با کی اچھی تربیت کی تھی اور ۵ سال کی عمر میں اپنی تعلیم کے لیے اسکول بھیج دیا گیا۔ تعلیم کے دوران انہوں نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ ایک ذہین طالب علم ہیں لیکن دوسروں کی باتوں میں آ کر ان کی تعلیم کا سلسلہ ان کے پتا نے بند کروا دیا۔ اور انہیں آبائی کام پر لگا دیا گیا۔

اس دوران ان کے دو پڑوسی جناب غفار بیگ اور مسٹر لیگی ان کے لئے نعمت ثابت ہوئے۔ دونوں بہت تعلیم یافتہ افراد تھے۔ جیوتی با نے ان کی سنگت میں دوبارہ پڑھنے لکھنے کا سلسلہ جاری کیا۔ اور ۱۸۴۱ء میں وہ باقاعدہ مشن اسکول میں داخل ہو گئے جہاں ان کی ملاقات ایک برہمن لڑکے سداشیو گووندے سے ہوئی۔ اور یہ دوستی تا عمر قائم رہی۔ دونوں دوستوں نے ایک بات کا عہد کیا کہ وہ ملک کے پچھڑے اور جہالت میں گھرے لوگوں کو تعلیم کی روشنی سے روشناس کریں گے۔

اپنے اسی برہمن دوست کی شادی میں شرکت پر چند برہمنوں نے انہیں بہت زیادہ ذلیل و خوار کیا اور انہیں اپنے نیچی ذات کے ہونے

بھی انہیں دیئے جاتے۔ بعد میں یہ تعداد بڑھتی چلی گئی اور حکومت نے ۷۵ روپئے ماہوار کی امداد سرکاری دکشنا پرائز کمیٹی کی جانب سے جاری کی۔

جیوتی با پھلے اپنے وقت سے بہت آگے تھے۔ آج جب خواتین نے ہر شعبے میں ترقی کر لی ہے یہ بات اس وقت قرین قیاس بھی نہ تھی کہ خواتین کو اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم کے لیے بھیجا جا سکتا

کا شدت سے احساس ہوا۔ اسی رات انھوں نے اس بات کا فیصلہ کر لیا کہ وہ اس ناانصافی کے خلاف لڑیں گے اور اس کے لیے ان کے پاس ایک ہی ہتھیار تھا۔ خواندگی۔ وہ چاہتے تھے کہ شودر اور نیچی ذات کے افراد اور خواتین جو کہ استحصال اور زیادتیوں کا شکار ہیں، تعلیم حاصل کر کے اپنے آپ کو ناانصافیوں سے بچائیں۔

انہوں نے مہار، مانگ، چمار اور دیگر نیچی ذات کی لڑکیوں کے لیے ایک اسکول کھولا۔ ان کے برہمن دوست سداشیو گوندے نے اس سلسلے میں ان کی حتی الامکان مدد کی۔ وہ زمین بھی انہیں کی دی ہوئی تھی جہاں یہ اسکول شروع کیا گیا۔

اس سلسلے میں انھوں نے اپنی بیوی کو تعلیم دلائی تاکہ وہ اسکول میں پڑھا سکے اور خود اس نیک کام میں دن رات جٹ گئے۔ اگرچہ مہاتما گاندھی کو جب بروداجیل میں ۱۹۳۲ء میں بند کیا گیا تھا تو انھوں نے جیوتی با پھلے کے لیے کہا کہ وہ صحیح معنوں میں مہاتما ہیں۔ جو کام انہوں نے ہریجنوں اور نیچی ذات کے ہندوؤں کے لیے کیا ہے وہ ایک مہاتما ہی کر سکتے ہیں۔

مہاتما پھلے کا اسکول محض ۸، لڑکیوں سے شروع ہوا۔ اور ساوتری بائی پھلے ہیڈ مسٹریس بنائی گئیں۔ اس وقت لڑکیوں کو گھر سے خود لایا جاتا انہیں تعلیم دینے کے بعد گھر واپس چھوڑا جاتا اس کے علاوہ ترغیب کے طور پر انہیں کھیلنے کو دنے دیا جاتا اور دیگر تحائف

ہے اور مہاراشٹر میں خواتین کی تعلیمی ترقی کا پورا کریڈٹ مہاتما جیوتی با پھلے کو جاتا ہے جن کی انتھک کوششوں سے ہندوستانی خواتین میں تعلیم کا رواج عام ہوا۔

مہاتما جیوتی راؤ گوبند راؤ پھلے (۱۸۹۰-۱۸۲۷)
جدید ہندوستان تاریخ کے سب سے اہم سماجی مصلح ہیں جیوتی راؤ کا خاندان پھول مالاؤں کے بنانے میں ماہر ہونے کی وجہ سے پیشواؤں سے خاصا قریب تھا اور اسی باعث سماج میں اس خاندان کو عزت کی نگاہ

نے متاثر کیا وہیں دوسری طرف ہندو مذہب کی تعلیمات مساوات کی فرسودہ رسومات، توہم پرستی ایک انسان کا دوسرے انسان کے تیں غیر مساویانہ سلوک چھوت چھات نے انھیں اپنے مذہب سے نفرتوں کی حد تک بدظن کر دیا۔
اسی کے ساتھ ساتھ سداشیو بلارڈ، مورو وٹھل والویکر، سکھارام یشونت پرانجپے جیسے رفقار کی صحبت نے انھیں بائبل سے لے کر تھامس پین کی انقلاب و شہرہ آفاق

آنجہانی گ۔ت۔ماڑکھولکر

سماجی مساوات کے نقیب مہاتما جیوتی باراؤ پھلے

سے دیکھا جاتا تھا جیوتی راؤ کا جنم پونا سے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں میں ہوا ۱۸۲۷ء سے ۱۸۴۷ء تک ان کا سارا وقت تعلیم کی حصول یابی میں صرف ہوا تعلیم کے دوران ان کے ذہن و دل پر جو مذہبی سماجی و سیاسی اثرات مرتسم ہوئے ان کے نقش عمر بھر نہیں مٹے اور زندگی کی آخری سانس تک ان کے افکار و نظریات کو متاثر کرتے رہے عیسائی اور مسلم گھرانوں سے ان کی واقفیت اسی دوران ہوئی جب انھیں اپنے پڑوسی لیجیٹ صاحب اور غفار بیگ منشی جیسے افراد کے خاندان سے قریب ہونے کا موقع ملا' ان دونوں خاندان کی بھی قربت نے انھیں جہاں ایکطرف عیسائی اور مسلم مذاہب کی تعلیمات مساوات اور اخوت

تصنیف رائٹس آف مین سے مستفید ہونے کا موقع فراہم کیا اور اسی نے دماغ کو کشادہ اور نظر کو وسعت عطا کی ہندو مذہب پر مسلط پنڈتوں اور برہمنوں کی اجارہ داری مذہب کے نام پر ہریجنوں اور نچلی ذات کے لوگوں پر مظالم عیسائی اور اسلامی مذاہب کی مساویانہ تعلیم' بائبل سمیت کر مختلف انگریزی مصنفوں کی تصانیف کا غائر مطالعہ' یہی وہ عوامل تھے جس نے جیوتی راؤ اور ان کے رفیق کار ولا کا اعتماد ہندو مذہب سے اٹھا دیا۔
والویکر نے اپنی سوانح حیات میں صاف اور واضح الفاظ میں تحریر کیا ہے کہ ہندو مذہب پر سے ہمارا عقیدہ طالب علمی کے زمانے ہی میں اٹھ گیا تھا اور ہماری توجہ

عیسائی مذہب کی جانب مڑ گئی تھی لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ اور ہمارا شعور پختہ ہوتا گیا تو ہمیں احساس ہوا کہ ہندو مذہب ترک کرکے عیسائی مذہب کو قبول کرنا ہمارا محض ایک جذباتی فیصلہ تھا کیونکہ ہر مذہب کی بنیاد محض عقیدے پر قائم ہوتی ہے اور دنیا کے تمام مذاہب میں ایسے اصول ہی بنیادی بلکہ کلیدی حیثیت رکھتے ہیں جن پر عمل محض عقیدے کی سطح پر کیا جاسکتا ہے چنانچہ کسی بھی مذہب کو قبول یا رد کرنے سے قبل عقیدے کی صداقت کو پرکھنا ضروری ہے۔

دنیا کے وہ تمام مذاہب جو یکسانیت، اخوت کی تلقین کرتے ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ انھیں اپنایا جائے اور اس کے لئے کسی ایک مذہب کو قبول کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے اسی وجہ سے آگے چل کر جیوتی راؤ نے اور ان کے دوستوں نے عیسائی مذہب بھی ترک کردیا۔ الغرض وقت کے ساتھ ساتھ ان کے افکار و نظریات میں تبدیلی آتی رہی لیکن جس چیز کا اثر آخری وقت تک ان کے ذہن سے محو نہیں ہوا وہ تھامس پین کی سماجی مساوات نامی کتاب تھی اس کے علاوہ فرانس انقلاب کے پیچھے بھائی چارگی اور مساوات، اخوت کا جو جذبہ تھا اس نے بھی ان کے ذہن پر خاصے گہرے اثرات مرتب کئے اور کئی سالوں بعد جیوتی راؤ نے ستیہ شودھک سماج کی بنیاد ڈالی تو ان کے پیش نظر انسانی اقدار کے یہی اصول تھے۔

ایک بار جیوتی راؤ کو اس وقت جب وہ ایک برات میں شریک تھے تو انھیں برہمن مخالف کہہ کر بے عزت کیا گیا جس سے انھیں بے پناہ روحانی تکلیف پہونچی اور وہ ایک لمبے عرصے تک دل گرفتہ رہے۔ برہمنوں کے اس غیر اخلاقی و غیر انسانی رویے نے ان کے دل میں برہمنوں کے تئیں پننے والی نفرت کو مزید تیز کردیا اور انھوں نے ہندو مذہب کے ان ٹھیکداروں کے خلاف پرچم بغاوت بلند کردیا۔

اپنی اس بغاوت کو عملی جامہ پہنانے کیلئے انھوں نے ایک کے بعد ایک کئی انجمنیں قائم کیں جن کا مقصد مذہب پر مسلط پنڈتوں اور بھٹوں کی اجارہ داری کو ختم کرنا تھا انجمنیں بنانے کے علاوہ اپنے اس مقصد کو پائے تکمیل تک پہونچانے کیلئے انھوں نے ڈھیر سارے مضامین تحریر کئے جیوتی راؤ کے قلم سے نکلے ہوئے یہ الفاظ اصل میں بارود کا ڈھیر تھے اور اس کے منظر عام پر آتے ہی وہ دھماکے ہوئے جس نے اونچی ذات کے ہندوؤں اور پڑھے لکھے طبقے کو دہلا کر رکھدیا۔ ان مضامین کی اشاعت کے بعد مختلف اخباروں میں دشنام طرازی کا جو سلسلہ شروع ہوا اسے پڑھ کر۔ ہمیں اونچی ذات کے ہندوؤں کی بوکھلاہٹ کا اندازہ ہوتا ہے لیکن اس جارحانہ ردِ عمل اور مخالفانہ ماحول سے جیوتی راؤ ذرا بھی متاثر نہیں ہوئے اور انھوں نے اپنی روش نہیں بدلی بلکہ اس مخالفت نے ان کے ارادوں اور حوصلوں کو مزید مستحکم کردیا اور برہمن و دلت جاتیوں کے لئے ان کے پاس جو اسکیمیں تھیں اس پر اور تیزی سے عمل آوری شروع کردی۔

جیوتی راؤ کا خیال تھا کہ ہندوستانی معاشرے میں پنپنے والی تمام تر سماجی برائیوں اور لعنتوں کی ماں جہالت ہے چنانچہ نچلے اور پسماندہ طبقے میں تعلیم کو عام کرنے کی اشد ضرورت ہے جس کے بغیر تمام فلاحی کام بے معنی ہیں چنانچہ ۱۸۴۸ء میں انھوں نے کم سن بچیوں کیلئے ایک اسکول کھولا یہ اسکول پونہ میں ہندوستان کی جانب سے قائم کردہ لڑکیوں کا پہلا اسکول تھا اس کے سال بھر بعد انھوں نے (مہار مانگا) دلت اور پسماندہ طبقے کے بچوں کیلئے اسکول قائم کیا ان دونوں اسکولوں میں جیوتی راؤ اور ان کی بیوی ساوتری بائی کام کرتے تھے ان دونوں کے علاوہ ان کے کئی برہمن رفقا بھی اس کام میں ان کے شریک کار تھے علاوہ ازیں جیوتی راؤ کو مزدوروں کی خواندگی کا بھی پورا احساس تھا لہٰذا اس کے لئے انھوں نے ایک علیحدہ نائٹ اسکول قائم کیا — جیوتی راؤ کے ان فلاحی کاموں سے ان کے گھر والے خصوصًا ان کے والد خفا تھے لیکن انھوں نے سماج کے دیو قامت مسائل جو ان کے سامنے منہ پھاڑے کھڑے تھے ان کے سامنے اپنے والد کی ناراضگی کو اہمیت نہیں دی چنانچہ ایکدن جیوتی راؤ کو گھر سے نکال دیا — گھر سے نکلنے کے بعد سے لے کر ان پر کئے گئے قاتلانہ حملے تک جیوتی راؤ

کو مختلف النوع مشکلات و پریشانی کا سامنا کرنا پڑا لیکن کبھی بھی ان کے قدم نہیں ڈگمگائے بلکہ زندگی کے ہر محاذ پر وہ جس ثابت قدمی، لگن اور صبر کے ساتھ پسماندہ طبقات کی فلاح میں لگے رہے وہ بجائے خود ان کا غیر معمولی کارنامہ ہے۔

اس عہد میں اونچی ذات کے ہندؤں میں ایک نہایت ہی وحشیانہ رسم مروج جس کے تحت کم عمر بیواؤں کے ساتھ غیر انسانی سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ جیوتی راؤ نے اس بہیمانہ و غیر انسانی رسم کے خلاف سینہ سپر ہو گئے۔ اور (انسداد قتل اطفال تنظیم) کی داغ بیل ڈالی۔ اس کے خلاف برہمنوں اور اونچی ذات کے ہندو نے احتجاج کیا یہی نہیں اس آشرم کی بنیاد ڈالنے کے تیرہ سال بعد انھوں نے برہمن و دھوا کے نو عمر بیٹے کو گود لیا' اور اس کا نام یشونت رکھا اس بچے نے آگے چل کر جیوتی راؤ کی تعلیمات کو جس طرح پھیلایا وہ تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں۔

۱۹۶۸ء میں مہاتما جیوتی راؤ نے اپنے گھر کا حوض اچھوتوں کیلئے کھول دیا اور اس طرح صدیوں سے چلی آرہی چھوت چھات جیسی لعنت کا نہایت موثر حل ڈھونڈ نکالا جیوتی راؤ کا خیال تھا جب تک عملی سطح پر کچھ نہ کیا جائے تب تک پسماندہ اقوام کی ترقی کے لئے لکھی گئی تمام کتابیں و تقاریر بے معنی ہے ہندو مذہب کے مطابق عورت اور شودر کو وید پڑھنے کا حق حاصل نہیں تھا جیوتی راؤ نے اس ناانصافی کے خلاف بھی صدائے احتجاج بلند کی۔

جیوتی راؤ کی شخصیت علم اور عمل کا مثالی مجموعہ ہے ہندو سماج اور مذہب کے ٹھیکیداروں کی جانب سے صدیوں سے کی جانے والی ناانصافیوں اور استحصال نے جیوتی راؤ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا اب انھیں سماجی معاشی انصاف دلوانا ہی ان کی زندگی کا واحد مقصد تھا اور اس مقصد کو پائے تکمیل تک پہونچانے کیلئے جہاں انھوں نے عملی اقدامات اٹھائے وہیں بہت سے مضامین اور کتابیں بھی تحریر کی تھیں۔

۱۸۶۹ء سے ۱۸۹۰ء تک چھترپتی شیواجی مہاراج کے "پواڑہ" (مراٹھی میں رزمیہ نظمیں) سے لے کر شیتکر انچا اسوڑ "کسانوں کا استقام" نامی کتاب تک انھوں نے جو تحریری سرمایہ چھوڑا ہے اس سے ہم ان کے افکار اور شخصیت کو زیادہ بہتر طریقہ سے سمجھ سکتے ہیں ان دونوں کتابوں میں ان کے ادبی و تخلیقی جوہر پوری آب و تاب کے ساتھ نمایاں ہے خاص طور پر "شیتکر انچا اسوڑ" میں جیوتی راؤ نے پسماندہ کسانوں پر سرکاری افسران کے مظالم کو جس موثر اور دل پذیر انداز میں بیان کیا ہے اس سے انگریزی حکومت کے تیئں ان کی نفرت کا احساس ہوتا ہے

ان تمام خوبیوں کے باوجود جیوتی راؤ کی تحریر ادبی و تاریخی نقطۂ نظر سے دیکھنا' پڑھنا یا پرکھنا درست نہیں ہوگا کیونکہ ان کی تحریروں میں معروضی انداز نظر کی بے انتہا کمی ہے۔ اور یہ اس لئے بھی فطری ہے کہ ان کی تحریر کا بنیادی مقصد اپنے نظریات کا پرچار اور پروپگنڈہ کرنا تھا۔

جیوتی راؤ نے جو تحریری سرمایہ اپنے پیچھے چھوڑا ہے اس کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں اس کے محرک کو سمجھنا بھی ضروری ہے جس نے ان سے یہ سب لکھوایا قدیم پرانوں ملفوظات و مخطوطات' روایات سے متعلق' اس کے علاوہ آریاؤں کی آمد' مہاراشٹر کی تاریخ' افضل خاں کا قتل' شیواجی مہاراج کی تاجپوشی' پانی پت کی لڑائی' ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی' نانا صاحب پیشوا' تانتیا ٹوپے بلونت پھڑکے' پرارتھنا سماج' آریہ سماج وغیرہ سے متعلق اپنے جو نظریات انھوں نے پیش کئے آج جب ہم انھیں تاریخ کے وسیع تر پس منظر میں دیکھتے ہیں تو ان کی اہمیت کسی حد تک کم ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وقت نے ان کے بہت سے افکار و نظریات کی تردید کر دی ہے لیکن اس کے باوجود انھیں یک قلم مسترد نہیں کیا جا سکتا

جیوتی راؤ کے مضامین کا مطالعہ کرتے وقت جو بات سب سے زیادہ ہمیں کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ

انھوں نے اپنے تمام مضامین میں "آریہ" لفظ پر غیر معمولی بلکہ غیر ضروری زور صرف کیا ہے۔ بلکہ اپنے کئی مضامین "آریہ" لفظ کو بنیاد بنا کر لکھے ہیں، اور چونکہ آریاوں" سے متعلق انھوں نے جو نظریہ اختیار کیا تھا آج کئی جدید مورخوں نے اس کی تردید کردی ہے چنانچہ ان کے تمام مضامین تاریخ کے طالب علم کو گمراہ کر سکتے ہیں۔

چھوت چھات کی لعنت آریاؤں سے قبل ہی ہندوستان میں مروج تھی آریہ وسط ایشیا سے جنوبی ہند میں آئے اور ہندوستانی تاریخ اور تہذیب کا ایک اٹوٹ حصہ بن گئے۔ یہ وہ تاریخی حقائق ہیں جن پر بیشتر محققین متفق ہیں لہذا آریہ سماج پر لگائے گئے جیوتی راؤ کے الزامات کی تردید ہو جاتی ہے چونکہ جیوتی راؤ نے اس عہد کا تجزیہ و مطالعہ محض مذہبی سماجی اور اقتصادی نقطۂ نگاہ سے کیا تھا اور ان میں تاریخی شعور اس قدر قوی نہ تھا کہ وہ ان تمام حالات کا مطالعہ وسیع تر پس منظر میں کر پاتے لہذا جیوتی راؤ کی تحریروں کو پڑھتے ہوئے ہمیں ان کے نقطۂ نظر اور ان کی limitation کو سمجھنا ضروری ہے۔

[illegible] ہندوستان کا سماج اسو دیو بلونت پھڑکے جیسے افراد کا [illegible] قومی لیڈر اور دانشوروں نے سر عام اڑایا [illegible] کے چند ایک خیال سے کسی کو اختلاف ہوتا ہے تو یہ کوئی تعجب خیز امر نہیں ہے۔

اگر جیوتی راؤ کو بین الاقوامی واقعات اور عالمی سیاست کا [illegible] ہوتا تو وہ اپنی کتاب کبھی امریکی قوم کے نام منسوب کرتے [illegible] تمام امریکہ [illegible] کو جانے والا وحشیانہ حملہ اگر چند لمحوں کے لئے فراموش کر بھی دیا جائے تو اسپین، پرتگال، [illegible]، فرانس اور انگلینڈ و دیگر ممالک سے آئی ہوئی [illegible] کا ریڈ انڈین پر کیا جانے والا ظلم و استبداد کیونکر بھلایا جا سکتا ہے اگر ان حقائق کی [illegible] تھوڑی بہت بھی جانکاری ہوتی تو وہ اپنی کتاب [illegible] اقوام کے نام منسوب کرنے کی غلطی ہرگز نہ کرتے۔

آج ہندوستان کو آزادی حاصل کئے ہوئے کچھ بہت زیادہ عرصہ نہیں ہوا ہے لیکن اس کے باوجود پچھڑی ہوئی ذات کو سماجی انصاف دلانے کی ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے گو کہ یہ دعویٰ سراسر غلط ہوگا کہ ہندوستان کی سرزمین پر پسماندہ دلت اور ہریجن جاتیوں کو سماجی انصاف دلایا جا چکا ہے لیکن پھر بھی یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ مرکزی و ریاستی حکومت میں پسماندہ طبقات کیلئے گنجائش پیدا کی گئی ہے نیز عدالت کے بلند ترین عہدے پر بھی پچھلے اور پسماندہ طبقات کے افراد براجمان ہو چکے ہیں بلکہ براجمان ہیں۔ اس کے برخلاف امریکہ میں صورتحال ایسی نہیں ہے۔ وہاں کے نیگرو اقوام کے افراد کو ریاست اور عدالت کے بلند تر عہدے سے محروم رکھا گیا ہے۔ یہی نہیں انھیں پارلیمان کی جانب سے عنایت کردہ شہری حقوق تک حاصل نہیں۔ گورے لوگوں کے اسکولوں، عبادت گاہوں کلبوں۔ یہاں تک کہ قبرستان میں بھی نیگرو کے داخلے کی ممانعت ہے۔ جنوبی افریقہ کے روڈیشیا میں مٹھی بھر انگریزوں نے محض اپنا اقتدار قائم کرنے اور اسے بنائے رکھنے کے لئے جو ظلم و ستم کی داستانیں تحریر کی ہیں وہ آج بھی تاریخ کے صفحات پر تازہ خون کے قطروں کی مانند کانپ رہی ہیں۔ اگر جیوتی راؤ کی نظروں سے یہ تمام تاریخی حقائق گذرے ہوتے تو انگریزی تہذیب و اخلاقیات کے جو گن انھوں نے گائے تھے اس کا دکھ ان کو ضرور ہوتا۔

چنانچہ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ جیوتی راؤ کی تحریروں کا مطالعہ کرنے سے پہلے ہمیں ان کے نقطۂ نظر کی مجبوری اور محدود وسائل کی کمزوری کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے عالمی سیاست پر جو انھوں نے رائے زنی کی ہے اس سے قطع نظر مہاراشٹر کے پسماندہ طبقات کے مسائل اور پچھڑی ہوئی دلت جاتیوں کو سماجی انصاف دلانے اور ناانصافی کے خلاف کھڑے رہنے کا جو حوصلہ انھوں نے اپنے قلم کے زور سے دیا ہے وہ ہی ان کے مضامین کا سب سے جاندار اور پائیدار حصہ ہے جیوتی

راؤ کے قلمی خدمات کا صحیح اندازہ ہم اسی تناظر میں کر سکتے ہیں۔

جیوتی راؤ کے اپنے مختلف مضامین انگریزی حکومت کے اوصاف سے بھرے پڑے ہیں۔ اس کی وجہ محض یہ ہے کہ انگریز اپنے ساتھ کچھ اچھی چیزیں بھی لائے تھے جس کا احساس جیوتی راؤ کو تھا۔ انگریز فرسودہ رسومات میں جکڑے ہوئے ہندوستان میں زندگی کا ایک نیا سائنسی اور حقیقی اسلوب لے کر آئے تھے انگریزوں کی آمد سے قبل ہندوستان کو فرسودہ رسومات اور سڑی گلی روایات نے آکٹوپس کی طرح جکڑ رکھا تھا اور ظاہر ہے اس کا نشانہ نچلے اور پسماندہ طبقے کے افراد ہی زیادہ بنتے تھے۔ لیکن انگریزوں کی آمد نے اس گرفت کی گرہ کو کس حد تک ڈھیلا کر دیا تھا —— یہ ایک تاریخی سچ ہے جسے کسی بھی طرح جھٹلایا نہیں جا سکتا —— لہٰذا جیوتی راؤ کے قلم سے انگریزی حکومت کی آمد سے متعلق جو تعریفی اور توصیفی کلمات ادا ہوئے ہیں اس کے لئے انھیں مورد الزام ٹھہرانا قطعی نامناسب ہوگا۔

نچلی اور پچھڑی ہوئی مختلف اقوام کو سماجی و معاشی انصاف دلانا ہی جیوتی راؤ کی زندگی کا واحد مقصد بن گیا تھا اور اپنے تمام تر سماجی و انقلابی کاموں کو ایک نقطہ پر مرکوز کرنے کے لئے انھوں نے ۲۴ ستمبر ۱۸۷۳ء میں ستیہ شودھک سماج کی بنیاد ڈالی ۱۸۸۹ء میں ان پر لقوہ کا حملہ ہوا اس حملہ نے انھیں ایک طرح سے اپاہج کر دیا اور انھیں بستر سے اٹھنے تک کی مہلت نہیں ملی لیکن اس خطرناک حملے نے بھی ان کے آہنی عزم اور اپنے فرائض کے احساس سے منہ پھیرنے نہیں دیا۔ سیماب صفت جیوتی راؤ کی بستر پر خاموش پڑے رہنا کب منظور ہوتا، چنانچہ بستر پر پڑے پڑے سروا جنک ستیہ دھرم نامی کتاب لکھی۔ یہ کتاب اصل میں ستیہ شودھک سماج کے مقاصد اس کے اصول اور قاعدوں پر روشنی ڈالتی ہے۔

SLAVERY.

(IN THE CIVILISED BRITISH GOVERNMENT UNDER THE CLOAK OF BRAHMANISM)

EXPOSED BY

JOTIRAO GOVINDRAW FULE

(ब्राह्मणी धर्माच्या आडपडद्यांत)

गुलामगिरी.

(सुधारल्या इंग्रजी राज्यांत.)

हें लहानसें पुस्तक

जोतीराव गोविंदराव फुले

यांनी

लोक हितार्थ केलें

व

पुणें येथें "पुना सिटी प्रेस" छापखान्यांत छापलें.

किंमत १२ आणे

[illegible] शूद्रादिअतिशूद्रांस ६ आणे

(All Rights Reserved)

[१८७३ साली प्रकाशित झालेल्या प्रथमावृत्तीतील मुखपृष्ठाचे यथामूळ मुद्रण]

اس سے قبل ۱۸۴۹ء سے ۱۸۶۸ء تک پرم ہنس سبھا اور پرارتھنا سماج کی داغ بیل مہاراشٹر میں ڈالی جا چکی تھی جس کے پیش نظر پچھڑی ہوئی دلت اور ہریجن جاتی کو سماجی و معاشی انصاف دلانے کے بڑے مقاصد تھے۔ علاوہ ازیں ۱۸۷۵ء میں آریہ سماج کی بنیاد بمبئی میں پڑ چکی تھی ان تمام سماجوں کے قیام کے پیچھے سب سے بڑا مقصد سماجی زندگی میں اخوت مساوات، بھائی چارگی اور اعلیٰ انسانی اقدار کو رواج دینا اور پسماندہ پچھلے طبقے کو سماجی نابرابری، طبقاتی کشمکش اور بندھ و بندھنوں کے مظالم سے آزاد کرانا تھا۔

CULTIVATOR'S WHIP-CORD

by

JOTIRAO GOVINDRAO PHULEY

for the defence

of Shudra (Dasyu) Community

शेतकऱ्याचा असूड

हे [illegible] पुस्तक

जोतीराव गोविंदराव फुले

यांनी

[illegible] शेतकऱ्यांचे [illegible] केले आहे.

پراتھنا سماج نے اس سلسلے میں "باہمی طعام" سے لیکر اچھوتوں کی بازآبادکاری اور ان کے سماجی واقتصادی سدھار اور ریفارم کے لئے مختلف سطحوں پر اپنی سرگرمیاں بھی شروع کر دی تھیں ——————

یہاں ایک بنیادی سوال کا اٹھنا فطری امر ہے کہ جب مختلف سماج اپنے اپنے طور پر ریفارم میں مصروف عمل تھے تو جیوتی راؤ کے دل میں ایک الگ اور نیا سماج قائم کرنے کا خیال کیوں کر سمایا۔

پرم ہنس اور پراتھنا سماج میں رام بال کرشن جیکر، ڈاکٹر آتمارام پانڈورنگ بھیکوبا دادا چوان جیسے غیر برہمن اہم اور سرگرم کارکن تھے یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ ان تنظیموں میں اکثریت بھی غیر برہمنی افراد کی تھی جب جیوتی راؤ نے ستیہ شودھک سماج کو قائم کرنے کا اعلان کیا تو اس پر "برہمن" برادری نے بڑا واویلا مچایا، اور ان پر کافی لعن طعن کی اور انھیں مختلف طرح سے اپنی جارحانہ تنقید کا نشانہ بنایا۔

LIFE OF SHIVAJI,

IN POETICAL METRE.

BY

JOTIBA GOVINDRAO PHULE.

पवाडा

छत्रपति शिवाजी राजे भोसले

यांचा,

जोती गोविंदराव फुले यांनी

लोकहितार्थ केला;

तो

मुंबईत

"ओरिएन्टल" छापखान्यांत छापिला.

सन १८६९.

हें पुस्तक मुंबईत रा० वासुदेव बाबाजी नवरंगे, नंबर ३९, काळबादेवीचा रस्ता, यांच्या दुकानीं, व पुण्यांत वेताळ पेठेत पुस्तककर्त्याच्या दुकानीं मिळतें. किंमत साडे आणे.

[illegible]

اب ہمیں ان عناصر و عوامل کو سمجھنا ناگزیر ہو جاتا جو ستیہ شودھک سماج کے محرک تھے ۱۸۴۰ء سے لے کر ۱۸۹۰ء کے درمیان جا میکر سے لے کر آگرکر تک مہاراشٹر میں جتنے بھی سماجی مصلح اور ریفارمر ابھرے ان میں برہمن اور غیر برہمنی دونوں طبقات کے افراد شامل تھے اور ان میں اکثر سفید پوش یعنی خوش حال طبقے سے متعلق تھے —— گو کہ جیوتی راؤ کسی اونچی ذات یا طبقے سے نہیں تھے بلکہ ان کا تعلق بھی نچلی ذات ہی سے تھا۔

پھر بھی انھیں ان تکالیف اور مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا جو نچلی اور دلت جاتی کا مقدر بن چکی تھی ان کا تعلق تاجر خاندان سے تھا میونسپل ممبر

علاوہ ازیں ادیب ہونے کے باعث سماجی سطح پر انھیں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اکثر اونچے طبقے کے افراد بھی ان وجوہ کی بنا پر جیوتی راؤ کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے لیکن یہاں یہ کہنا کہ انھیں کبھی اپنے نچلی ذات کے ہونے کا احساس نہیں ہوا تو شاید غلط ہوگا۔ ان کی زندگی میں ایسے بہت سے مواقع آئے جب انھیں اپنی ذات کے پسماندہ سمجھے جانے کا شدید دکھ ہوا وہ جس عہد میں جی رہے تھے وہاں ہر طرف پسماندہ اور دلت جاتیوں کو جور و استبداد کا نشانہ بنایا جا رہا تھا مذہب کسی بے بس پرندے کی مانند پنڈتوں کی مٹھی میں پھڑ پھڑا رہا تھا۔ انھوں نے اسے اپنی ذاتی ملکیت سمجھ لیا تھا۔ یہ سب دیکھ کر جیوتی راؤ تلملا اٹھے اس وقت تمام مذہبی لیٹریچر سنسکرت زبان میں تھا اور اسے پڑھنے کا حق صرف پنڈتوں کو تھا شودرا اور ہریجن اس حق سے مستثنیٰ تھے۔ دلت اور ہریجن کی اس حق سے محروم رکھے جانے سے ان کا جو سماجی، تہذیبی اور ثقافتی خسارہ ہوا اس کا احساس اور دکھ بھی جیوتی راؤ کو تھا۔

اس کے علاوہ انگریزوں نے گاؤں اور دیہاتوں میں تمام طبقات کیلئے درس و تدریس کے در وا کر دیئے تھے اس میں ذات پات کی کوئی قید نہیں تھی۔ لیکن یہ بھی ایک تلخ سچائی ہے۔ کہ انگریزوں کی جانب سے دی گئی ان سہولیات سے محض چند اونچی ذات کے سفید پوش ہی فائدہ اٹھا رہے تھے اور اس طرح وہ سرکاری و غیر سرکاری اداروں میں بلند تر عہدے تک رسائی حاصل کر پا رہے تھے ان تمام چیزوں کو دیکھ کر جیوتی راؤ کو بڑا دکھ ہوا اور انھوں نے ہنٹر کمیشن کے روبرو ایک عرضداشت پیش کی اور اس طرح انگریز حکومت کی توجہ پسماندہ اور دلت جاتیوں کی جانب کھینچی۔

جیوتی راؤ نے جو عرضداشت ہنٹر کمیشن کو پیش کی اس میں پرائمری تعلیم، تعلیم نسواں اور تجارتی تعلیم اہم مدے تھے۔

اس عرضداشت میں جیوتی راؤ نے پسماندہ اقوام کو خواندگی سے آراستہ کروانے کیلئے حکومت سے پرزور اپیل کی تھی علاوہ ازیں مروجہ طریقہ تعلیم پر جس طرح سے تنقید کی تھی اس سے ان کی تعلیمی بصیرت کا کس قدر اندازہ ہوتا ہے انھوں نے جو عرضداشت میں بیان کی ہیں وہ اس سچائی کی غمازی کرتی ہیں کہ جیوتی راؤ محض ایک سماجی ریفارمر یا مصلح نہیں تھے

بلکہ وہ ایک انقلابی رہنما تھے جو پورے سماجی ڈھانچے کو بدل دینے کے خواہش مند تھے۔ ستیہ شودھک سماج کو قائم کرنے کے پیچھے ان کا یہی مقصد تھا لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ مہاتما جیوتی راؤ پھلے نے سماجی مساوات کے وصول کے لئے اپنی تمام زندگی لگا دی اور تاریخ میں سماجی مساوات کے نقیب کی حیثیت سے ان کے کارنامے کبھی فراموش نہیں کئے جا سکتے۔

تلخیص و ترجمہ

نجمہ شیخ ۱۶ / ۳ صنوبر منزل
ہالہ روڈ کرلا، بمبئی نمبر

مہاتما جیوتی راؤ پھلے عوامی حقوق کے علمبردار

شاہد ندیم

عظمت کسی کی جھولی میں قدرت یوں ہی تو نہیں ڈال دیتی، مقصد سے لگن، مسلسل جد و جہد اور ماحول مستقبل سے بے نیازی کا ثبت جب کسی آتما میں سماتا ہے تبھی وہ مہاتما کہلاتا ہے۔

مہاتما جیوتی راؤ گوندراؤ پونے میں ایسے ہی کسی نایاب شگون میں ہوا تھا، وہ ۱۸۲۷ء میں پیدا ہوئے ان کے والد گوندراؤ پونے میں بھاجی ترکاری کی دکانداری کرتے تھے،

جیوتی راؤ کا آبائی وطن ضلع ستارا کا ایک گاؤں کاٹگن تھا، وہاں ان کا خاندان گوریا کے نام سے جانا جاتا، انکے دادا شیٹی با گوریا پونے آکر بس گئے تھے، جیوتی راؤ کے والد اور چچا پیشواؤں کے ہاں باغبانی، مالی کے کام پر ملازم تھے۔ یہیں اور اسی وجہ سے ان کا نام پھلے، پڑ گیا وہ بمشکل ایک سال کے ہوں گے کہ ان کی والدہ چل بسیں، پرائمری تعلیم کے بعد انھیں اسکول چھوڑنا پڑا، تعلیم کے لئے ماں نہ تھا نہ ماحول، ان کے والد کی خواہش تھی کہ خاندانی کھیتی باڑی میں جیوتی راؤ ان کی مدد کریں، لیکن جیوتی راؤ کی لگن اور ذہانت سے متاثر ہو کر ان کے دو پڑوسیوں نے ایک مسلمان ٹیچر، دوسرا عیسائی نے گوندراؤ سے اصرار کیا کہ وہ جیوتی راؤ کا تعلیمی سلسلہ ختم کریں، انھیں پونے کے اسکاٹش مشن اسکول میں داخل کر دیا گیا۔

اسی اسکول میں ان کی دوستی ایک برہمن لڑکے سداشیو بلال گوونڈے سے ہوئی، جو عمر کے آخری دنوں تک بنی رہی، جیوتی راؤ اور گوونڈے تھامس پین کے خیالات سے بے حد متاثر تھے، دونوں مل کر پین کی کتاب ورائٹس آف مین، (انسانی کے حقوق) دلچسپی اور دلجمی سے پڑھتے ان کے دو اور برہمن دوست مورو وٹھل والو یکر اور سکھارام یشونت پرانجے، بعد کے برسوں میں ان کی سرگرمیوں میں برابر کے شریک رہے۔

۱۸۴۷ء میں سکنڈری تعلیم کی تکمیل کے بعد جیوتی راؤ نے سرکاری ملازمت نہ کرنے کا فیصلہ کیا، ۱۸۴۹ء کے ایک واقعہ نے ان کی زندگی کا ایک رخ، ایک راستہ متعین

کر دیا، وہ اپنے ایک برہمن دوست کی شادی میں مدعو تھے دلہا، اس کے خاندان کے افراد اور دوسرے احباب کے ساتھ وہ بارات میں شریک تھے کہ کچھ لوگوں کو پتا چلا کہ جیوتی راؤ، ذات کے مالی ہیں، دلہا کے خاندان کے لوگوں نے ان کی توہین کی اور مذاق اڑایا، جیوتی راؤ بارات چھوڑ کر گھر لوٹ آئے، آنکھ میں آنسو لیے انھوں نے سارا واقعہ اپنے والد سے کہہ سنایا۔

اس واقعہ کے بعد جیوتی راؤ نے ذات پات کے فرق کو مٹانے، اور دبی کچلی عورتوں کے حقوق کے لئے جد وجہد کرنے کا فیصلہ کیا۔

ان کے نزدیک پچھڑی ذاتوں کو سدھارنا اور عورتوں کو تعلیم دینا بنیادی اور اہم مسئلہ تھا، یہ عمل انھوں نے اپنے گھر سے ہی شروع کیا، اپنی بیوی ساوتری بائی کو خود پڑھایا اور اگست ۱۸۴۸ء میں ایک گرلس اسکول کی ابتدا کی، تنگ نظر اور پرانے خیالات کے لوگ اسے برداشت نہ کر سکے۔ ان کے خلاف باقاعدہ مہم چھیڑ دی مگر جیوتی راؤ ان پروپگنڈے سے نہ گھبرائے، نہ ڈرے، سینہ سپر ہو گئے اور ڈٹ کر مقابلہ کیا کسی میں ہمت نہ ہوتی کہ وہ یہاں اچھوت، طالبات کو پڑھاتا، جیوتی راؤ نے اپنی بیوی سے پڑھانے کی درخواست کی ان کی بیوی پر اسکول جاتے ہوئے گندگی اور گالیاں پھینکیں گئیں مخالفین نے جیوتی راؤ کے والد پر بھی دباؤ ڈالا کہ وہ اپنے وہ اپنے بیٹے کی سرگرمیوں سے کنارہ کش ہو جائیں یا پھر انھیں اپنے گھر سے بے دخل کر دیں دونوں نے اپنے مقصد کو نہیں چھوڑا۔ گھر چھوڑ دیا، مالی دشواریوں کی وجہ سے اسکول بند کر دیا گیا کچھ عرصہ بعد جیوتی راؤ پھلے نے اپنے دوستوں گووندے اور والوبکر کی مدد سے اسے دوبارہ شروع کیا۔

مرے ڈیل نے اپنی یادداشت میں جیوتی راؤ کے حوالے سے ایک واقعے کا ذکر کیا ہے،

"میرے ساتھی جیوتی راؤ گووند راؤ پھلے مشہور انسان ہیں، ہریجنوں کے لئے کافی کام کیا ہے، انھوں نے میرے پاس ایک ہریجن لڑکا کو بھیجا کہ اس کی دیسی تعلیم مکمل ہو چکی ہے، انگریزی کی ابتدائی جماعت میں داخل کر لیا جائے۔ داخلہ دے دیا گیا برہمن بچوں نے مجھ سے شکایت کی کہ اگر اسکول میں ہریجن بچوں کو لیا گیا تو ہم اسکول چھوڑ دیں گے، میں نے انھیں سمجھایا کہ صرف ایک ہی تو لڑکا ہے،

"ایک ہو یا دس" سب ایک ساتھ بولے

"تو کیا میں اسے خارج کر دوں؟"

"آپ جانیں، وہ رہا تو ہم نہیں رہیں گے،"

"تم اسے مت چھونا، ذہین بچے ہو تم اچھے نمبروں سے پاس ہو گے، اور پھر وہ تو الگ بینچ پر بیٹھتا ہے"

"مگر چٹائی تو زمین پر بچھی ہے، اسے تو چھوا ہے اب ہم گندے ہو گئے ہیں گھر جا کر کھانے سے پہلے نہانا ہوگا"

"بہر حال جو بھی ہو، اس لڑکے کو نہیں نکالا جا سکتا" سارے لڑکے غصّہ سے چلے گئے، اور وہ ہریجن لڑکا پھر کبھی اسکول نہیں آیا اس واقعہ نے مجھے جھنجھوڑ دیا۔

احمد نگر کے امریکن مشن اسکول میں لڑکیوں کی تعلیم و تربیت سے جیوتی راؤ بے حد متاثر اور مسرور ہوئے، ۳ر جولائی ۱۸۵۱ء کو انھوں نے ایک اور گرلس اسکول قائم کیا پہلے دن آٹھ لڑکیاں داخل ہوئیں، رفتہ رفتہ لڑکیوں کی تعداد بڑھنے اور مخالفین کا زور گھٹنے لگا، ساوتری بائی یہاں بھی لڑکیوں کو پڑھاتیں ۵۲ر ۱۸۵۱ء کے دوران انھوں نے مزید دو گرلس اسکول شروع کیے۔

۱۸۸۲ء میں تعلیمی کمیشن (جو بالعموم ہنٹر کمیشن کے نام سے جانا جاتا ہے۔) کے یادگاری خطبہ میں، جیوتی راؤ نے اپنی تعلیمی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا، "لڑکیوں کے اسکول کے قیام کے کوئی سال بھر بعد میں نے گرام مخلوط اسکول قائم کیا جس میں مہار

رمانگ خاص طور پر شامل کئے گئے ۔ آگے چل کر اسی طرز
دو اور اسکول شروع کئے گئے ۔ میں تقریباً نو دس سال
ان کے لئے کام کرتا رہا۔

جوتی راؤ اس سے بخوبی واقف تھے کہ بمبئی پریزیڈنسی
عوامی سطح پر ابتدائی تعلیم کو نسبتاً زیادہ نظر انداز کیا جاتا ہے
انھوں نے برطانوی حکومت پر الزام عاید کیا کہ وہ ریونیو کا
بیش تر حصہ اعلا طبقوں کی تعلیم پر صرف کرتی ہے جس کے نتیجے
میں سرکاری دفاتر میں برہمنوں کا اثر اور اقتدار بڑھتا
جا رہا ہے انھوں نے عوام سے برہمنوں کی جابریت کے
خلاف اٹھنے کی اپیل کی۔

جیوتی راؤ کے معترضین نے ان کی گرامر اور ان گھڑ
زبان کا مذاق اڑایا اور ہندستانی تاریخ سے ان کی عدم
واقفیت پر حرف گیری کی ہے اور کہا ہے کہ ان کی فکر
اور سوچ، عیسائی مشنریوں کے اعتراضات کی بازگشت
ہے جو انھوں نے ہندوستانی سماج اور برہمنوں پر عاید کئے
ہیں وقت کے اہم اور نام نہاد عالموں، دانشوروں نے
جوتی راؤ کی باتوں پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا انھوں نے
اس جذبے کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی وہ کس خلوص
اور لگن سے انسانی برابری اور مساوات کیلئے کام کر رہے
ہیں۔

جیوتی راؤ کی انسانی قدروں سے گہری وابستگی نے انکے
لئے دشواری پیدا کر دی تھی، وہ اس تعلق سے اتنے
جذباتی ہو جاتے کہ صبر و سکون سے مسئلہ کا تجزیہ کرتے،
اور معروضی طور پر غور و خوض کرنے سے چوک جاتے۔

بیواؤں کی دوسری شادی پر پابندی اور کم عمری
میں شادی بیاہ کی رسم، برہمنوں اور دوسری اعلیٰ
ذاتوں میں عام تھی، اکثر جوان بیوائیں ایسی پابند
اور دکھ بھری زندگی نہیں پسند کرتی تھیں، چند ایک
اسقاط حمل کے بوجھ سے بھی نجات پا لیتیں یا پھر اپنی ناجائز
اولادوں کو گلی کوچوں میں بھٹکنے کیلئے آزاد چھوڑ دیتیں
جوتی راؤ نے ایسے بچوں کے لئے یتیم خانہ قائم کیا یہ
غالباً کسی ہندو کا قائم کیا، اپنی طرز کا پہلا ادارہ تھا
انھوں نے حاملہ بیواؤں کو سہارا دیا اور انھیں یقین دلایا
کہ یتیم خانے میں ان کی اور ان کے بچوں کی مناسب دیکھ
بھال پرورش ہوگی اس یتیم خانے میں ایک برہمن بیوہ نے
۱۸۷۳ء میں لڑکے کو جنم دیا جیوتی راؤ نے اسے اپنا بالک بیٹا
بنا لیا۔

کچھ عرصہ کیلئے جیوتی راؤ نے حکومت کی ٹھیکیداری
بھی کی، پونے کے قریب کھڑک واسلا میں ایک عظیم الجثہ
ڈیم کی تعمیر کیلئے سامان مہیا کرتے، یہاں پر ان کا پبلک
ورکس محکمہ کے بعض بد نیت اور رشوت خور افسران سے
سابقہ پڑا، اعلیٰ برطانوی عہدیداروں کے علاوہ کلرک اور
دیگر افسران متعصب برہمن تھے جو ان پڑھ اور ناخواندہ
مزدوروں کا جی بھر کے استحصال کرتے، جیوتی راؤ نے
محسوس کیا کہ مزدوروں کو صورت حال سے آگاہ کرنا اور
برہمن افسران کے چنگل سے چھڑانے حد ضروری ہے ۔ ان کے
ترتیب دیئے ہوئے ایک بلار میں پبلک ورکس محکمہ کے
برہمن افسران کی دھوکہ بازی اور عیاری کا ذکر ملتا ہے،
۱۸۶۸ء میں جیوتی راؤ نے اچھوتوں اور نچلی ذات والوں
کیلئے اپنے گھر کے قریب تالاب بنوانے کا فیصلہ کیا، اپنی مشہور
اور متنازعہ کتاب سیلوری (غلامی) مطبوعہ جون ۱۸۷۳ء
میں انھوں نے ایک مینی فیسٹو شائع کیا انھوں نے کہا تھا کہ
وہ اپنی ذات، نسل، یا ملک پر کسی طرح کا فخر محسوس نہیں
کرتے، کئی اہم اور ممتاز اخباروں نے اسے شائع کرنے
سے انکار کر دیا، برہمنوں کے خلاف شدید پروپگنڈے کی
وجہ سے یہ کتاب تنقید کا نشانہ بنی اس کتاب کا انتساب اظہار
عقیدت کے طور پر امریکہ کی نیک اور خدا ترس عوام کے نام
کیا تھا جو غلام نیگروؤں کے لئے کام کر رہے تھے پوری
کتاب مکالمات کی شکل میں تحریر کی گئی ہے۔

۲۴ ستمبر ۱۸۷۳ء کو جیوتی راؤ نے اپنے مخلصین اور
معتقدین کی ایک خصوصی میٹنگ طلب کی، اسی جگہ ستیہ شودھک
سماج کے قیام کا فیصلہ کیا گیا، جیوتی راؤ اس کے پہلے صدر
اور خازن تھے، اس کے ممبران کو برطانوی سلطنت سے
وفاداری کا حلف اٹھانا پڑتا، تنظیم کا بنیادی مقصد

شودر اور اتی شودروں کو برہمنوں کے تسلط اور استحصال سے آزاد کرانا تھا اس کے ممبران تمام انسانی برادری کو خدا کی اولاد جانتے مانتے تھے تنظیم کے دروازے تمام ذات برادری کیلئے کھلے تھے، حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ چند یہودی بھی اس کے ممبر تھے، ۱۸۷۶ء میں ممبران کی تعداد ۳۱۶ تھے،

جیوتی راؤ بت پرستی، ویدوں کے تقدس اور پاکیزگی کے منکر تھے وہ چتروَرن (چار ذاتوں برہمن، کھتری ویش اور شودر) کے کٹر مخالف تھے ایک اور کتاب سارو جنک ستیہ دھرم پستک (مطبوعہ ۱۸۹۱ء) میں انھوں نے اپنے خیالات کو مکالمات کی شکل میں پیش کیا ہے۔ ان کی رائے تھی کہ مرد اور عورت کو برابری کا حق دیا جائے جنس کے اعتبار سے دونوں میں فرق کرنا گناہ ہے انھوں نے سماج کی فلاح کے لئے آزادی، اخوت اتحاد اور مساوات کو ضروری قرار دیا، وہ مذہب کے تعصب اور شدید وطن پرستی کے ردعمل سے سماج میں پیدا ہونے والی برائیوں اور بربادیوں سے واقف تھے،

۱۸۷۶ء میں انھیں پونہ میونسپلٹی کا ممبر نامزد کیا گیا ۱۸۷۷ء میں مہاراشٹر میں بھیانک قحط اور بھکمری پھیلی تھی، دیہی علاقے خاص طور پر متاثر ہوئے، دیہاتی گاؤں چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔

جیوتی راؤ نے ان لوگوں کی بہت خدمت کی، لوگوں نے اپنی اولادوں کو لاوارث چھوڑ دیا، ۱۷ مئی ۱۸۷۷ء کو شائع جیوتی راؤ کی ایک اپیل سے اندازہ ہوتا ہے کہ ستیہ شودھک سماج کے زیر اہتمام و کنڈیہ یتیم خانہ نے مظلوم اور غریب بچوں کی پرورش کا بار اپنے سر لیا تھا ۱۸۷۹ء میں جیوتی راؤ کے ساتھی، کرشن راؤ بھالے کرنے ہفتہ روزہ دین بندھو کی ادارت سنبھالی یہ رسالہ ستیہ شودھک سماج کا ترجمان تھا، اس میں کسانوں، مزدوروں کے مسائل اور مشکلات کو خاص طور پر شائع کئے جاتے،

تنگ نظر اور متعصب خیالات کے شعلہ بیان مقرر وشنو شاستری چپلونکر نے جیوتی راؤ پر زبردست حملہ کیا اور ان کی تحریروں پر نکتہ چینی کی ایسے حالات میں دین بندھو، جیوتی راؤ کی حمایت میں آگے آیا جوتی راؤ کے ایک اور ساتھی نارائن بندھو کی انتظامیہ ذمہ داریاں سنبھالیں، بمبئی میں لوکھنڈے کے ہمراہ جیوتی راؤ بھی مزدوروں سے خطاب کرتے یہاں یہ بات قابل ذکر ہے جب جیوتی راؤ، لوکھنڈے بھالے کر اور دوسرے احباب کسانوں مزدوروں کو متحد و منظم کر رہے تھے، کوئی دوسرا ادارہ یا فرد اس سمت میں آگے نہیں آیا تھا۔

جیوتی راؤ کو سارو جنک سبھا، انڈین نیشنل کانگریس، برہمو سماج اور پرارتھنا سماج کے رہنماؤں پر ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ یہ جماعتیں اپنے بنیادی مقصد اور لائحہ عمل کے لئے برعکس عوامی فلاح و بہبودی کے لئے نہیں کام کرتیں، یہ ادارے برہمنوں کے زیر اثر ہیں اور عوام کی نمائندہ نہیں ہیں۔

اپنے کتابچہ "ستسار" (سچائی کی خوشبو) مطبوعہ جون ۱۸۸۵ء میں برہمو سماج اور پرارتھنا سماج کے رویہ پر نکتہ چینی کرتے ہوئے انھوں نے ان اداروں کے رہنماؤں سے مخاطب ہو کر کہا تھا کہ "ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت نہیں ہے آپ ہماری فکر نہ کریں،

اپنی متنازعہ کتاب، سارو جنک ستیہ دھرم پستک، میں انھوں نے اپنا ایک تجربہ بیان کیا ہے! (عام طور پر) کسان مزدور اچھوت نچلی ذات کے لوگ سارو جنک سبھا اور انڈین نیشنل کانگریس کے ممبر نہیں بنتے اگر ان جماعتوں کا یہ دیرینہ مطالبہ تسلیم کرلیا جائے اور ایڈمنسٹریٹو سروس کو ہندوستانی ڈھنگ میں ڈھال دیا جائے تو یہ اس کا برہمن کرن ہوگا ان کی رائے میں یہاں قومیت کا وسیع تصور اس وقت تک نہیں قابل قبول ہوگا جب تک لوگ ایک ساتھ کھانے پینے اٹھنے بیٹھنے شادی بیاہ کیلئے آزاد نہ ہو تعلیم قومیت کے فروغ میں بہت معاون اور مفید ثابت ہوگی وہ صرف اصلاحی اداروں اور انجمنوں پر ہی تنقید نہیں کرتے حکومت بھی اس کا نشانہ بنتی کہ وہ عوامی فلاح کے لئے کام نہیں کرتے۔

حکومت نے جب شراب کی دکانوں کیلئے مزید لائسنس جاری

رنے کا فیصلہ کیا تو جیوتی راؤ نے اس کی شدید مخالفت کی ان کا خیال تھا کہ شراب کی لت غریب اور بد حال خاندانوں کو اور بھی تباہ و برباد کر دے گا۔

۳۰ نومبر ۱۸۹۰ء کو پونہ یونیورسٹی کے چیر مین تمام ممبران سے گزارش کی کہ گورنر جنرل لارڈ لینڈ ٹنگ کے استقبالیہ اخراجات کے لئے ایک ہزار کی رقم منظور کریں وہ اس موقع پر گورنر جنرل کو ایڈریس پیش کرنا چاہتے تھے لارڈ لیٹن نے ایک ایکٹ کے ذریعہ پریس کی آزادی پر پابندی لگائی تھی ستیہ شودھک سماج کے ترجمان دین بندھو نے اس کے خلاف آزادی صحافت کے لئے احتجاج کیا تھا۔ جوتی راؤ کو یہ رقم خرچ کرنے کی یہ تجویز غیر ضروری لگی انھوں نے سختی سے مخالفت کی اور تجویز رکھی یہ رقم پونہ کے غریب بچوں کی تعلیم پر صرف کی جا سکتی ہے ۳۱ نامزد ممبران میں وہ اکیلے ممبر تھے جنھوں نے اس کی مخالفت میں ووٹ دیا۔

ان کی جرأت اور دلیری کا ایک اور واقعہ جس سے غریبوں سے ان کی بے پناہ محبت کا اندازہ ہوتا ہے ۲ مارچ ۱۸۸۸ء کو جیوتی راؤ کے قریبی دوست ہری راؤ چپلونکر نے کراں ڈیوک اور ان کی بیگم کے اعزاز میں تقریب کا اہتمام کیا جوتی راؤ کسانوں کا دیہاتی لباس پہن کر شریک ہوئے اور تقریب کی مدعو امراء اور روساء پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ سونے چاندی اور جواہرات کے زیورات پہن کر یہ اپنی دولت کی نمائش کر رہے ہیں معزز مہمانوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ یہاں پر جمع ہونے والے افراد ہندوستان کے صحیح اور سچے نمائندہ نہیں ہیں کراں ڈیوک اگر ہر میجسٹی ملکہ " انگلستان کی رعیت کی حالت زار اور

افلاس کا صحیح اندازہ لگانا چاہتے ہیں تو وہ دیہاتوں اور شہر کی اچھوت بستیوں کا دورہ کریں " انھوں نے ڈیوک سے درخواست کی کہ وہ اپنی والدہ ملکہ وکٹوریہ تک یہ پیغام پہنچا دیں کہ وہ غریب اور نادار بچوں کی تعلیم کا بندوبست کر دیں۔

۲۸ نومبر ۱۸۹۰ء کو جدوجہد کی طویل کہانی جیوتی راؤ پھلے کی موت سے ساتھ ختم ہو گئی لوگ انھیں عقیدت اور احترام

سے مہاتما کہتے اور پکارتے وہ مختلف جہتوں اور سمتوں میں عوامی خدمت کرنے والے اولین خدمت گار تھے سماجی اور ناانصافی کے خلاف لڑنے والے مجاہد تھے۔

انھیں اور ان کی نیکیوں کو یاد کرنا آج کے حالات میں زیادہ ضروری ہے کیونکہ آج ایسے کردار ہمارے سماج میں کم رہ گئے ہیں جو بے لوث اور بے پناہ ہو کر عوامی خدمت انجام دے سکیں!

مہاتما پھلے کی تعلیمی خدمات

٭ دھننجے کیر

آج جس طرح کے تعلیمی ادارے ہوتے ہیں اس طرح کے تعلیمی ادارے مہاتما جیوتی با پھلے کے زمانے میں نہ تھے۔ اس وقت تو یوں ہوا کرتا تھا کہ جہاں جس شہر کے علاقے میں اونچی ذات یا طبقے کے لوگ ہوا کرتے تھے۔ وہاں بھی قسم کی کچھ درسگاہیں ہوا کرتی تھیں جن میں سنسکرت زبان وقواعد، قانون، طب، علم نجوم، مذہبی تعلیم جیسے مضامین پڑھائے جاتے تھے۔ مذہبی اور سماجی طور پر پسماندہ لوگوں کو حصولِ علم کا حق حاصل نہ تھا۔ بعض دیہاتوں میں ابتدائی تعلیم کے جو مدارس تھے وہاں بھی تاجروں اور امیروں کے بچے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ان کے لیئے بھی اس تعلیم کا مقصد صرف اور صرف گھریلو کاروبار سنبھالنا ہوا کرتا تھا۔ عام لوگوں کے لیئے یہ تعلیم موڑی لیپی میں اور برہمنوں کو بال بودھ لیپی میں دی جاتی تھی۔ تاریخ اور جغرافیہ جیسے مضامین سے کسی کو دلچسپی نہ تھی البتہ حساب پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ کتابیں آج کی سی نہ تھیں بلکہ ہاتھ سے لکھے مسودے ہوا کرتے تھے دیوی دیوتاؤں کے سنے سنائے قصے بڑی آسانی سے ملا کرتے تھے اور انھیں کو پڑھ کر لوگ لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔

درس وتدریس سے جڑے ہوئے طبقے کی حالت کچھ ایسی اچھی نہ تھی انہیں حسبِ ضرورت نذرانہ مل پانے کی وجہ سے وہ زائد روزگار یا آج کی زبان میں پارٹ ٹائم جاب کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے۔ مدرسش ہی گھر زیادہ تر اسکول یا مدرسہ لگتا۔ یا کوئی زمیندار اپنے بچوں کو پڑھانے کے لیئے کوئی جگہ وقف کرتا یا پھر کچھ علم دوست مل کر کسی مدرس کا تعین کرتے اور وہ کسی مندر ہی میں اسکول کھول کر بیٹھ جاتا۔ اس طرح کچھ غریب بچوں کو پڑھنے کا موقع مل جاتا۔

سنہ ۱۸۳۶ء میں سرکاری اخراجات پر پونہ ضلع کے کچھ دیہاتوں میں بطور تجربہ "پنچ گرام" اسکول کھولے گئے تھے۔ جہاں لکھائی پڑھائی اور معمولی حد تک حساب کتاب سکھایا جاتا تھا۔ جو آگے چل کر ۱۸۴۲ء میں کامیاب تسلیم کیا گیا اور اسے رائج کیا گیا۔

مہاتما پھلے سے قبل مہاراشٹر میں برہمن مذہبی اور سیاسی طور پر اپنا سکہ جمائے ہوئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مذہبی پرانوں کے

ورد یا مطالعے کا حق صرف انھیں کو حاصل تھا۔ نچلے طبقے کے جن افراد نے حکم عدولی کی انھیں سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔

انگریزوں کی حکومت قائم ہونے پر ایسٹ انڈیا کمپنی نے یہ طے کیا کہ ہندوستان سے وصولیافتہ ٹیکس بالگان سے ہر سال ایک لاکھ کی رقم عالموں اور پنڈتوں میں تقسیم کر کے انھیں امداد دی جائے۔" لہٰذا ۱۸۱۳ء سے صحیح معنوں میں عام ہندوستانیوں کے لئے تعلیم کے دروازے وا ہوئے۔

ہندستان میں جب پوری طرح سے انگریزوں کا راج قائم ہوا۔ سرکاری کاج اور سماجی سطح پر ان کے ذہنی اثرات غالب آنے لگے تب انگریزی زبان کے جاننے کی اہمیت محسوس کی گئی۔ دیسی اور بیرونی علم کو جاننے کی لوگوں میں غرض وغایت بڑھنے لگی۔

چیلن نامی انگریز نے ۱۸۲۱ء میں سنسکرت پاٹھ شالا اور پونہ کالج کی ابتدا کی تھی جہاں صرف برہمنوں کو داخلے کی اجازت تھی۔ دوسری ذات کے ہندوؤں کو حصول علم کے لیئے ان درسگاہوں میں داخلہ ممنوع تھا۔ کافی سوچ بچار کے بعد تمام ہندوؤں کے لیئے ان درسگاہوں کے دروازے کھول دیئے گئے۔ جسے برہمنوں نے ناپسند کیا اور اس فیصلے سے شہر کے برہمنوں میں بڑی بد امنی پھیل گئی۔ جسے "گیان دیو" نامی رسالہ یوں بیان کرتا ہے "علم کے دروازے سبھوں کے لیئے کھلے دیکھ کر برہمنوں میں ناراضگی پھیل گئی ہے۔ پونہ کے برہمن غصے سے بپھرے ہوئے ہیں۔ برہمن مدرسین نے غیر برہمن طالب علموں کو پڑھانے سے انکار کر دیا ہے۔ چونکہ ان کے مذہبی تعلیم کے مطابق غیر برہمنوں کو سنسکرت سیکھنے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔"

تنگ نظر ہندوؤں نے پونہ کالج کے پرنسپل کو دھمکی دی۔ لہٰذا پرنسپل میجر کینڈی اس معاملے پر برہمنوں کو غور و خوض کرنے کی مہلت دے دی۔ اور سونار، پربھو اور دیگر جاتیوں کے طالب علموں کو خود سنسکرت پڑھانے لگے۔ برہمن پنڈت صرف اور صرف برہمنوں ہی کو پڑھاتے تھے تمام برہمن پنڈتوں نے یک زبان ہو کر اپنا فیصلہ یہ کہہ کر سنا دیا کہ غیر برہمنوں کو سنسکرت پڑھانے سے بہتر ہے ہم مستعفی ہو جائیں۔

برہمنوں کے اس غیر منصفانہ فیصلے کو سنا کر "گیان دیو" میں یوں لکھا گیا کہ "اس معاملے میں بھارت کے کئی علاقوں میں کب کا فیصلہ کیا جا چکا ہے۔ کلکتہ یونیورسٹی میں تمام مذاہب کے طالب علموں کو داخلہ ملنا شروع ہو چکا ہے۔ برہمنوں کو چاہیئے کہ وہ وقت کے تقاضے کو سمجھیں اور اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں۔ عوامی رقم سے ان کے لیئے علیحدہ درسگاہوں کا انتظام ناممکن ہے۔ بھگوان کے لاڈلے ہم برہمن ہی نہیں اس طرح کا خیال وہ ذہن سے نکال دیں۔ ہاں اگر وہ خود کے پیسے سے ایسا کچھ کرنا چاہتے ہیں وہ آزاد ہیں مگر حکومت اپنے خزانے سے پیسہ دے کر ایسا کرے یہ مناسب نہیں ہے۔ حکومت کے تعلیمی ادارے تمام مذاہب کے طالب علموں کے لیئے کھلے ہونے چاہیئے۔"

ہفت روزہ "پربھاکر" یوں رقم طراز ہے کہ "پونہ کے برہمن پنڈتوں کا یہ برتاؤ نامناسب اور احمقانہ ہے۔ بمبئی میں سینکڑوں برہمن پنڈت سناروں، پربھو جاتیوں اور انگریزوں کے

گھروں میں سنسکرت پڑھا رہے ہیں لہٰذا وہ اپنے فیصلے پر غور کریں دگرنہ بمبئی کے پنڈت ان کی جگہ پر متعین کئے جائیں گے اور وہ کم تنخواہ میں کام کرنے پر رضامند بھی ہو جائیں گے ؟

گنگا دھر دکشت پھڑکے نامی ایک برہمن سن ۱۸۲۰ء تا ۱۸۲۵ء تک بمبئی کے یورپی لوگوں کو سنسکرت پڑھا کر گذر بسر کرتے رہے۔ ان کا اپنے شہر پونہ واپس لوٹ آنے پر پونہ کے برہمنوں نے یہ الزام لگا کر سماجی بائیکاٹ کر دیا کہ انھوں نے انگریزوں کی صحبت میں کھانا کھایا ہوگا۔ بیچارے گنگا دھر دکشت سنیاسی ہوگئے اور دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

نچلے طبقے کی ترقی ناممکن دکھائی دے رہی تھی۔ کیونکہ حصولِ علم کے خواہش مند طالب علموں کے ساتھ برہمنوں کے بے رحمانہ برتاؤ نے انھیں مایوس کر دیا تھا۔ ایونڈ مرے میچل اپنی یادداشتوں میں ایک مزے دار واقعہ کو یوں بیان کرتے ہیں کہ وہ پونہ سے قریب ایک سرکاری اسکول میں حاضر ہوئے۔ اس اسکول کے برہمن مدرس کے پاس ایک بیت کی چھڑی رکھی ہوئی تھی اور پاس ہی کچھ مٹی کے ڈھیلے بھی رکھے ہوئے تھے۔ جب ان سے ان ڈھیلوں کے تعلق سے دریافت کیا گیا تو وہ یوں جواب دہ ہوئے کہ ہریجن بچوں کو میں اس چھڑی سے نہیں مارتا کہ اس چھڑی کے ان کے جسم کو چھونے سے میرا جسم گندہ ہونے کا ڈر لگا رہتا ہے سو میں ان کی شرارت پر انھیں دور سے ایک ڈھیلا مار دیتا ہوں۔

مرے میچل نے اپنی یادداشت سے جیوتی با پھلے کے حوالے سے ایک واقعہ یوں بیان کیا ہے کہ "میرے ساتھی جیوتی راؤ گوند راؤ پھلے ایک نامور شخصیت ہو گذری ہے۔ جو ساری زندگی ہریجنوں کی ترقی کیلئے کوشاں رہے۔ جیوتی راؤ نے کسی ایک ہریجن لڑکے کو میرے پاس بھیجا۔ اس لڑکے کی اتنی تعلیم ہو چکی تھی کہ انگریزی کی ابتدائی جماعت میں اسے داخلہ دے دیا گیا۔ اس کے بعد برہمن بچوں کا ایک گروہ آکر مجھ سے شکایت کرنے لگا کہ اگر آپ کے اسکول میں کسی ہریجن بچے کو تعلیم دی جائے گی تو ہم اسکول چھوڑ دینگے۔ میں نے انھیں لاکھ سمجھانے کی کوشش کی کہ آخر وہ ایک ہی تو لڑکا ہے اس پر انہوں نے کہا کہ ایک کیا اور دس کیا ؟"

"تو کیا میں اسے نکال باہر کر دوں ؟"

"وہ آپ جانیں اگر وہ رہا تو ہم نہیں رہیں گے۔"

"تمہاری اگر خواہش نہ ہو تو تم اس سے دور رہو پھر تم تو ذہین لڑکے ہو تمہارا نمبر اوپر ہی رہے گا۔"

"اور پھر وہ علیحدہ جگہ پر بھی تو بیٹھتا ہے۔"

"مگر چٹائی جو زمین پر بچھی ہوئی ہے ؟ اسے تو اس نے چھو لیا۔ ہم اب گندے ہو گئے کھانا کھانے سے قبل ہمیں نہانا ہوگا۔"

"بہر کیف میں اس لڑکے کو اسکول سے باہر نہیں کر سکتا۔" واقعتاً مجھے اس بحث نے جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ سارے لڑکے خفا ہو کر چلے گئے اس روز کے بعد وہ ہریجن لڑکا مایوس ہو کر کبھی اسکول نہ آیا۔

مدراس کے تعلق سے ایک واقعہ یوں ہے کہ وہاں جب ہریجن بچوں کو اسکولوں میں داخلہ دیا جانے لگا کئی برہمن بچوں نے اسکولوں کو خیرباد کہا۔

ہریجنوں کی کسمپرسی کا علم جیوتی با پھلے کو ایک شادی میں ہوا جہاں ایک ہریجن کو کافی ذلیل کیا گیا وہ دن تھا کہ جیوتی با نے طے کر لیا کہ وہ اس اونچ نیچ کے بھید بھاؤ کو مٹانے کے لیے اپنی ساری زندگی وقف کر دینگے اور انھوں نے یہی کیا۔ وہ یہ بات اچھی طرح جان گئے تھے کہ سیاسی غلامی سے بدتر اگر کوئی چیز ہے تو وہ سماجی غلامی ہے۔ نچلے طبقے کے لوگ ذہنی طور پر کمزور علم سے نابلد اور غلامی کے عادی ہونے کی وجہ سے اونچی ذات کے خلاف آواز اٹھانے کی ہمت نہیں کرتے۔ یا ان میں یہ سمجھ بوجھ ہی نہیں ہے۔ لہٰذا

ان کے لیئے سب سے اہم ضرورت اگر کوئی ہے تو وہ علم کی روشنی ہے ۔ کہ جہالت بذات خود اندھیرا اور علم یقیناً روشنی ہے ۔ ذہنی انقلاب پیدا کرنے کے لیئے علم کا ہونا اشد ضروری ہے ۔ لہٰذا جیوتی با نے سماج کے نچلے طبقے کی جانب توجہ دی ۔ سن ۱۸۴۸ یوں بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے ۔ کارل مارکس کی کمیونسٹ تحریک اور امریکی خواتین کی تحریک آزادیٔ نسواں کے ۔ ہندوستانی عورت جو غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی ۔ ہندو مذہب جس نے اسے نہایت ہی کم تر درجہ دے رکھا تھا ۔ لہٰذا جیوتی با کی نظر سے یہ مسئلہ بھی نہ چوک سکا اور انھوں نے ہریجنوں اور ان کی لڑکیوں کی تعلیم پر بھرپور توجہ دی احمد نگر کے اور ہکن میشن اسکول میں جب انھوں نے عورتوں کو تعلیم حاصل کرتے دیکھا تو بڑے خوش ہوئے ۔ اس میدان میں اپنا ہاتھ بٹانے کے لیئے اپنی اہلیہ یا جیون ساتھی ساوتری بائی کو داخلہ دلوا دیا ۔ اور اس کے بعد ۱۸۴۸ میں نچلے طبقے کی لڑکیوں کے لیئے پونہ کے بدھوار پیٹھ میں لڑکیوں کے ایک مدرسے کی بنیاد ڈالی ۔ اس اسکول کا جاری ہونا تھا کہ تنگ نظر برہمنوں نے ہنگامہ کھڑا کر دیا ۔ جیوتی راؤ کے خلاف شکایتیں کرنی شروع کر دیں ۔ عورتوں کو یوں بھی تعلیم دلوانا ان تنگ نظروں کے نزدیک جرم تھا اور ادھر کم ذات کی لڑکیوں کی تعلیم گویا ان کے مذہب کے خلاف کوئی بہت بڑی سازش رچی جا رہی ہو ۔

ایک مرد عورتوں کو پڑھا رہا ہے ۔ ہندو شاستر کے مطابق عورت اور کم ذات کے لوگوں میں کوئی فرق نہ تھا ۔ عورت پھر دسے کے قابل نہیں ہوتی اس کے پاس ذہنی صلاحیتیں نہیں ہوتیں یہاں تک کہ عورتوں کا پاؤں میں چپل پہننا ناپاک جانا جاتا اسے برسات یا دھوپ سے بچنے کے لیئے چھاتے کے استعمال کی بھی اجازت نہیں تھی ۔ مردوں میں اپنے شوہر سے بات کرنے کو معیوب اور غیر مہذب جانا جاتا ۔ کسی بزرگ نے جب اپنی بہو کو اپنے شوہر سے بات کرتے دیکھا تو بطور سزا انھیں کوٹھری میں بند کر رکھا تھا ۔ عورت اپنے شوہر کے ساتھ کھانا تک نہیں کھا سکتی تھی ۔ ساس سسر کو چھوڑ کر اپنے پتی کے ساتھ جہاں اس کا روزگار جڑا ہو وہ نہیں رہ سکتی تھی ۔ بچپن ہی میں لڑکیوں کی شادی کر دی جاتی تھیں تاکہ وہ اپنی ساس اور سسر کی خدمت میں جٹ کر عادی ہو جائیں لہٰذا عورت کو کسی قسم کی کوئی آزادی حاصل نہ تھی مذہب اور سماج کے نام پر گھٹیا روایتوں میں اس کی زندگی جکڑی ہوتی تھی ۔

جیوتی راؤ کا اسکول ترقی کرتا رہا ۔ مگر ہریجنوں کے بچوں کو پڑھانے کے لیئے استاد آسانی سے میسر نہ تھے ۔ آخرکار جیوتی با نے اپنی بیوی کو یہ ذمہ داری سونپ دی ۔ لہٰذا سارے پونہ شہر میں کہرام مچ گیا ۔ ایک عورت معلم بنے یہ انہیں پسند نہ تھا ۔ انہیں پریشان کیا جانے لگا ۔ اسکول جاتے وقت ان پر کوڑا کرکٹ اچھال دیا جاتا ۔ آوازیں کسی جانے لگیں ۔ مگر وہ اپنے کام کو خاموشی سے انجام دیتی رہیں ۔ ایک روز انھوں نے پریشان کیئے جانے پر کہا کہ " اپنا فرض نبھا رہی ہوں ، خدا تمھیں معاف کرے ۔ تنگ نظر برہمنوں نے جب جیوتی با اور ان کی بیوی ساوتری بائی کو اپنے مشن پر اٹل دیکھا تو جیوتی با کے والد محترم گوند راؤ سے مل کر انھیں بھڑکایا ۔ " تمہارا بیٹا اور بہو مذہب اور سماج کے نام پر کالک پوتھ رہے ہیں ۔ ان کے اس غیر مذہبی عمل کی وجہ سے تم بھگوان کو اپنے آپ سے خفا کروا رہے ہو ، ہم چاہتے ہیں کہ تم اپنے بیٹے جیوتی سے کہہ کر اسے سمجھا دو یا پھر اسے گھر سے نکال باہر کر دو ۔ " آخرکار گوند راؤ یعنی جیوتی با کے والد محترم کو کہنا پڑا کہ یا تو اسکول چھوڑ دو یا گھر ۔

" چاہے مجھے موت ہی کیوں نہ آئے میں اپنا کام کبھی نہ چھوڑوں گا " لہٰذا جیوتی با کو اپنی بیوی کے ساتھ باپ کا گھر چھوڑ کر جانا پڑا ۔

کلکتہ میں لڑکیوں کے لیئے پہلا اسکول انیسویں صدی میں ۱۸۱۹ء میں امریکن مشنری کی جانب سے بھی کھولا گیا ۔ اسکول میں لڑکیاں اکھٹا کرنے کے لیئے مدرسین کو جانا پڑتا تھا ۔ استاد جتنی زیادہ لڑکیاں اکھٹا کرنے میں کامیاب ہوتے ان کی تنخواہ میں اضافہ کیا جاتا تھا ۔ امریکن مشنری نے سن ۱۸۴۰ء میں پونہ میں اسکول کھولے تھے عیسائی مشنری کی جانب سے چلائے جانے کی وجہ

سے یہ اسکول زیادہ دنوں نہ چل سکا کیوں کہ اس میں صرف دس طالبات زیرِ تعلیم تھیں۔ لہٰذا آزادانہ طور پر لڑکیوں کا پہلا اسکول کھولنے والے ہندوستانی جیوتی راؤ تھے۔ پانچ چھ ماہ ہی کے عرصے میں جیوتی راؤ کا بھی یہ اسکول بند ہو گیا تھا۔ دوبارہ جیوتی راؤ کی مالی حالت بحال ہوئی تو انھوں نے پھر چِپنا گنج پیٹھ نامی جگہ پر شیوا جی راؤ گونڈے کی جانب سے بطورِ عطیہ دی ہوئی جگہ پر اسکول جاری کیا۔ گونڈے صاحب کی جانب سے ہر ماہ ۲ روپئے کی امداد بھی دی جانے لگی۔ وشنو پنت نامی ایک برہمن درس و تدریس میں جیوتی با کی مدد کرنے لگے تھے مگر برہمنوں نے انھیں پریشان کرنا شروع کیا۔ مجبوراً انھیں کام بند کرنا پڑا۔ اسکول میں طالبات کی تعداد خاصی تعداد میں بڑھ جانے پہ جیوتی با دوسری جگہ کی تلاش میں لگ گئے کسی نے انھیں جگہ دینا گوارہ نہ کیا۔ لہٰذا شہر کے ایک مسلم کے گھر میں کرائیے پہ اسکول جاری کیا۔ ترقی کرتے کرتے دو سال میں بدھوار پیٹھ میں انا صاحب چپلونکر جیسے نامور برہمن کی جگہ میں اسکول کی ابتدا کی اب کام کا بار بہت بڑھ گیا تھا۔ اور کام بھی کافی پھیل گیا تھا۔ لہٰذا اس پر نظر رکھنے کے لیئے انھوں نے ایک کمیٹی کا انعقاد کیا۔ جس میں انا صاحب سہسر بدھئے پالوراؤ جے مانڈتے وشنو بھڑے، کرشنا چپلونکر جیسے نامور لوگ شامل تھے جیوتی با کی شریکِ حیات ساوتری بائی اس اسکول کی پرنسپل مقرر کی گئی تھیں۔ تنگ نظر برہمنوں نے اب بھی انھیں پریشان کرنا نہ چھوڑا تھا۔ لہٰذا ایک چپراسی خاص طور پر ان کے ساتھ رکھا جانا ضروری ہو گیا تھا۔ [illegible] کی جانب سے ۱۷ ستمبر ۱۸۵۱ء میں [illegible] دوسرے اسکول کی باقاعدہ ابتدا ہوئی تھی۔ ۱۵ مارچ ۱۸۵۲ء میں ستال پیٹھ میں لڑکیوں کے تیسرے اسکول کی ابتدا ہوئی۔

جیوتی راؤ صرف ہریجنوں اور آزادیٔ نسواں ہی کے حامی نہ تھے بلکہ انھوں نے گوپال راؤ دیشمکھ اور بھوالکر جیسے سماجی کارندوں کی بھی ہمیشہ حمایت کی اور انکو تعاون دیتے رہے۔ کچھ اور برہمن بھی اب جیوتی راؤ کے ساتھ ہو گئے تھے جنھیں ہریجنوں کے تئیں ہمدردی تھی۔ یہ بات جیوتی کو کبھی پسند نہ آئی وہ صحیح معنوں میں ہریجنوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کے خلاف لڑ رہے تھے۔ جیوتی راؤ چاہتے تھے۔ غریب کسان جو محنت کرتے ہیں انھیں ان کی محنت کا مکمل پھل ملنا چاہیئے۔ وہ انسانیت پسند اور انسانیت نواز تھے۔ ان کے مطابق جو شخص اپنی ذات کو دوسرے کی ذات سے اعلیٰ جانتا ہو وہ سماجی خادم کبھی نہیں ہو سکتا۔ ان کی دِلی خواہش تھی کہ جنھیں کم ذات یا نچلے طبقے کے لوگ جانا جاتا ہے وہ طبقہ آگے بڑھے علم کے میدان میں اتر کر ترقی کرے اور اپنی شخصی آزادی کو جان لے۔ جب وہ اسے جان لیں گے اپنی آزادی کیلئے خود لڑیں گے۔ بس جیوتی با انھیں یہی پڑھانا اور سمجھانا چاہتے تھے۔ اچھے اور برے میں تمیز کرنا سکھانا چاہتے تھے۔

۱۸۸۲ء میں ہندوستان میں تعلیمی نظام اور تعلیمی مسائل کے سلسلے میں معلومات حاصل کرنے کے لیئے ولیم ہنٹر نامی ایک شخص کا تقرر کیا گیا تھا۔ جو ہنٹر کمیشن کے نام سے جانا جاتا ہے یہ کمیشن سماج کے پڑھے لکھے اور مشہور لوگوں سے مل کر تعلیمی مسائل کے تعلق سے سوالات پوچھتے تھے۔ زیادہ تر لوگوں نے

اس ضمن میں یہ رائے دی کہ ہریجنوں اور ڈھیڑوں کو تعلیم سے دُور رکھا جائے ان کے ذہن میں حصولِ علم کا خیال ہماری ہی اونچی ذات کے کچھ لوگوں نے ان کے ذہنوں میں ڈالا ہے یہ لوگ جو سماج سدھار چاہتے ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ ان نچلی ذات کے لوگوں میں سمجھ بوجھ آگئی تو وہ ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کریں گے۔ لہٰذا حصولِ علم صرف اونچی ذات ہی تک کے لئے محدود کر دیا جائے۔

۱۹ اکتوبر ۱۸۸۲ء کو جیوتی راؤ نے اپنی رائے جو پیش کی تھی انھوں نے اپنے آپ کو ایک تاجر، کسان ظاہر کیا تھا۔ اپنے قائم کردہ اسکولوں کی معلومات فراہم کی تھی۔ آگے چل کر وہ یوں لکھتے ہیں کہ علم کے نام پر حکومت کا یہ خیال کہ اونچی ذات کے لوگ نچلے ذات کے لوگوں میں علم عام ہونے دینگے یہ غلط ہے۔ حکومت جو غریب عوام پر لگان یا محصول لگا رہی ہے وہ سارا پیسہ صرف اونچی ذات کی تعلیم پر صرف کیا جاتا ہے۔ حکومت کی درسگاہیں صرف امیروں کے بچوں کیلئے ہیں۔ آگے جیوتی راؤ نے حکومت کو ایک یہ سجھاؤ بھی دیا تھا کہ عوام کے لیئے عمر کی ایک میعاد تک حصولِ علم لازم قرار دیا جائے یہ عمر کم از کم بارہ سال کی جائے۔

پرائمری اسکولوں میں جو اساتذہ منتخب کئے جاتے ہیں وہ زیادہ تر برہمن ہوتے ہیں ان کی تنخواہیں بہت ہی کم ہوتی ہیں۔ لہٰذا وہ کام میں دلچسپی لیتے دکھائی نہیں دیتے شہر میں رہنے والے اساتذہ کی تنخواہ کم از کم پندرہ روپئے اور دیہات میں بسے ٹیچروں کی تنخواہ کم از کم بارہ روپئے ہو، جیوتی راؤ نے کہا کہ یہ ضروری ہے کہ یہ درس و تدریس کا امتحان پاس کئے ہوئے ہوں۔ ان کا تعلق زراعت یعنی کھیتی باڑی سے ہو کیونکہ غریب بچوں کی ضروریات اور ان کے جذبات کو وہ برہمنوں سے زیادہ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ گاؤں کے طلباء کے لئے جو نصاب ترتیب دیا جائے وہ آسان اور سیدھا ہو گاؤں کے مدارس کا معائنہ ان کے افسران سے سالانہ چار مرتبہ کیا جائے۔ انگریزی افسران اس معائنے میں ذاتی طور پر دلچسپی لیں۔

جیوتی راؤ کے مطابق "ہمارے اسکولوں کا کام محض اساتذہ اور کلرک پیدا کرنا نہیں ہونا چاہئے۔ اعلیٰ تعلیم کیلئے کچھ ایسا انتظام کیا جائے کہ ہر کوئی اسے بہ آسانی حاصل کرسکے۔ میٹرک

युनैटेड स्टेट्स मधील सदाचारी लोकांनी
गुलामांस दास्यत्वापासून मुक्त कर-
ण्याच्या कामात औदार्य,
निरपेक्षता, व परोपकार
बुद्धी दाखविली या-
स्तव त्यांच्या
सन्मानार्थ
हें लहानसें पुस्तक
त्यांस परम
प्रीतीनें नजर
करितो, आणि माझे देश
बांधव त्यांचा या शुभ कृत्याचा
कित्ता, आपले शूद्रबांधवांस ब्राह्मणलो-
कांच्या दास्यत्वापासून मुक्त करण्याच्या
कामांत घेतील अशी आशा बाळगतो.

ग्रंथकर्ता.

(प्रथमावृत्तीतील अर्पणपत्रिका)

९९

کے امتحان کے لیئے منتخبہ کتابیں جس طرح حکومت بنگال شائع کرتی ہے انہیں خطوط کو بمبئی سرکار بھی اپنائے۔"

راج شری شاہو چھتر پتی، کرم ویر بھاؤ راؤ، ڈاکٹر دیشمکھ اور باپوجی سالنکھے، جیسے عظیم علم دوست حضرات اگر مہاتما پھلے کی جلائی ہوئی علم کی جوت کو گاؤں گاؤں لے جا کر عام نہ کرتے تو آج مہاراشٹر کے دیہاتوں میں جو ترقی ہمیں نظر آتی ہے وہ شاید نظر نہ آتی۔

تلخیص و ترجمہ: (وقار قادری)
۵۵ جولائی بلڈنگ، تیسرا منزلہ، مدنی روڈ، ماہم، بمبئی ۱۶

ماضی کے آئینے سے

کرشن چندر

سُدھا خوب صورت تھی نہ بد صورت، بس معمولی سی لڑکی تھی سانولی رنگت، صاف ستھرے ہاتھ پاؤں، مزاج کی ٹھنڈی مگر گھر لو، کھانا پکانے میں ہوشیار، سینے پرونے میں طاق، پڑھنے لکھنے کی شوقین، مگر نہ خوب صورت تھی نہ امیر، نہ چنچل، دل کو لبھانے والی کوئی بات اس میں نہ تھی۔ بس وہ تو ایک بے حد شرمیلی سی اور خاموش طبیعت والی لڑکی تھی ——— بچپن ہی سے اکیلی کھیلا کرتی۔ مٹی کی گڑیاں بناتی اور ان سے باتیں کرتی انھیں تنکوں کی رسوئی میں بٹھا دتی۔ اور خود اپنے ہاتھ سے کھیلا کرتی۔ جب کوئی دوسری لڑکی اس کے قریب آتی تو گڑیوں سے باتیں کرتے کرتے چپ ہو جاتی۔ جب کوئی شریر بچہ اس کا گھروندا بگاڑ دیتا تو خاموشی سے رونے لگ جاتی۔ رو کر خود ہی چپ ہو جاتی اور تھوڑی دیر کے بعد دوسرا گھروندا بنانے لگتی۔

کالج میں بھی اس کی سہیلیاں اور دوست بہت کم تھے وہ شرمیلی طبیعت ابھی تک اس کے ساتھ چل رہی تھی۔ جیسے اس کے ماں باپ کی غریبی نے بڑھاوا دے دیا ہو۔ اس کا باپ جیون رام ناتھو مل واتی مرچنٹ کے یہاں چاندنی چوک کی دوکان پر تیس سال سے سیلز مین چلا آرہا تھا۔ اس کی حیثیت ایسی نہ تھی کہ وہ اپنی بیٹی کو کالج کی تعلیم دے سکے۔ اس پر بھی جو اس نے اپنی بیٹی کو کالج میں بھیجا تھا محض اس خیال سے کہ شاید اس طریقے سے اس کی لڑکی کو کوئی اچھا خاوند مل جائے گا۔ کبھی کبھی اس کے دل میں یہ خیال بھی آتا تھا ممکن ہے کالج کا کوئی اچھا لڑکا اس پر عاشق ہو جائے۔ مگر جب وہ سُدھا کی صورت دیکھتا جھکی ہوئی گردن، سکڑا ہوا سینہ، خاموش نگاہیں ——— اور اس کی کم گوئی کا اندازہ کرتا تو ایک آہ بھر کر چپ ہو جاتا اور اپنا حقہ گڑگڑانے لگتا۔

"سُدھا کے لیے تو کوئی بر گھیر گھار کر ہی لانا ہوگا۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ اس طرح کے بر بڑا جہیز مانگتے تھے، اور اس کی حیثیت ایسی نہ تھی کہ وہ بڑا تو کیا چھوٹا سا بھی جہیز دے سکے۔ ذہن کے بہاؤ میں بہتے بہتے اس نے یہ بھی سوچا کہ آج کل محبت کی شادی بڑی سستی رہتی ہے۔ اب مانک رام کی بیٹی گوپی ہی کو دیکھو باپ بیچارہ منسٹری میں تیسرے درجے کا کلرک ہے۔ مگر بیٹی نے ایک ٹکورپتی ٹھیکیدار سے شادی کر لی ہے۔ جو اس کے ساتھ کالج میں پڑھتا تھا۔ باپ کوارٹروں میں رہتا ہے۔ مگر لڑکی ایرکنڈیشنڈ موٹر کار پر بیٹھ کر اپنے میکے والوں سے ملنے آتی ہے۔ ہاں مگر گوپی تو بہت خوب صورت ہے اور ہماری سُدھا تو بس ایسی ہے جیسے اس کی ماں۔ . . . . .

"اس کے لیے تو کسی بر کو گھیرنا ہی پڑے گا۔ جس طرح سُدھا کی ماں کی ماں اور اس کے رشتے والوں نے مجھے گھیرا تھا۔"

دو تین جگہ سُدھا کی ماں نے بات چلائی تھی، مگر وہ بات آگے نہ بڑھ سکی مگر ایک بار تو اس نے بندا اتنا مضبوط باندھا کہ لڑکا خود گھر چل کر سُدھا کو دیکھنے آگیا مگر سُدھا اُسے پسند نہ آئی۔ لڑکا خود بھی کونسا اچھا تھا؟ مُوا چیچک مارا، ٹھنگنا سا، اس پر ہکلاتا تھا۔ جامن کا سا رنگ، مگر گوری لڑکی چاہتا تھا اور جہیز میں ایک اسکوٹر مانگتا تھا۔ یہاں سُدھا کا باپ ایک سائیکل تک نہ دے سکتا تھا۔ اس

یہ معاملہ آگے چلتا بھی تو کیسے چلتا؟

مگر سُدھا کے باپ کو معلوم نہ تھا کہ اس بدصورت ٹھگنے کے انکار پر خود سُدھا کتنی خوش ہوئی تھی؟ وہ اور اس کے بعد بھی دو برسوں میں جو دو لڑکے اُسے دیکھنے آئے وہ انکار کر کے چلے گئے۔ ان سب میں سُدھا کس قدر دل ہی دل میں شکر گزار تھی۔ وہ اوپر سے جتنی ٹھنڈی تھی، اندر سے اتنی ہی لاوا تھی۔ یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ سُدھا کے تخیل کی اڑان کتنی اونچی اور وسیع ہے۔ اپنی تنگ و تاریک سی دنیا سے باہر نکل کر اس کی کلپنا کیسی کیسی سُندر جگہوں پر اُسے لے جاتی تھی؟ اس بات کو نہ تو اس کا باپ جیون رام جانتا تھا نہ اس کی ماں منگی جانتی تھی کہ سُدھا کتنی عجیب لڑکی ہے۔ وہ باہر سے معمولی رنگ روپ کی لڑکی تھی، مگر اُس نے اپنے دل کے اندر ایک چمکتی ہوئی زندگی چھپا رکھی تھی، جس طرح لعل گُدڑی میں چھپا رہتا ہے۔ اور یہ تو ہماری روایت ہے کیوں کہ ایک میلے کچیلے بھکے کو دیکھ کر کبھی بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ اس آدمی کے پاس اتنا سونا ہوگا۔ اسی لیے تو وہ شرمیلی تھی۔ وہ اپنا بھید کسی کو کیوں بتلائے؟ شاید لوگ اس پر ہنسیں گے اور جو کچھ وہ سوچتی تھی وہ سب کتنا عجیب ہوتا تھا۔ یہ کالج کی سندر چنچل لڑکیاں اگر اس کے حسن کی موہنی دیکھ لیں تو دھک سے رہ جائیں۔ اور یہ لمبی لمبی کاروں والے دیوتاؤں کی طرح اٹھلاتے ہوئے نوجوان اگر اس کے دل کے راکٹ جہاز دیکھ لیں تو کیا حیرت میں نہ کھو جائیں؟ وہ میری طرف دیکھتے بھی نہیں۔ اور ٹھیک بھی ہے۔ گھر کی کڑھی ہوئی شلوار اور سلوٹوں والی سیلہ قمیض پہننے والی ایسی لڑکی کو وہ بھلا کیوں دیکھیں گے۔ تو میں بھی انھیں کیوں بتاؤں گی کہ میں کیا ہوں؟

"تو نے کیسی لڑکی جنی ہے؟" جیون رام کبھی کبھی منگی کو ستانے لگتا۔ "ہر وقت چُپ رہتی ہے۔ ہر وقت نگاہ نیچی رکھتی ہے۔ ہر وقت کام میں جٹی رہتی ہے۔ اس کے منہ پر کبھی ہنسی نہیں دیکھی۔ اب کپور صاحب کی لڑکیوں کو دیکھو، ہر وقت پھولوں کی طرح مہکتی رہتی ہیں۔ ہر وقت گھر کو گلزار بنائے رکھتی ہیں، اور ایک یہ سُدھا.......

جیون رام اخبار پٹک کے چُپ ہو جاتا۔

منگی بارہ آنے سیر والا بھات اور چنے کی پتلی دال اُس کے سامنے رکھتی ہوئی کہتی "ان چھپیوں کی بات مت کرو۔ اُن چھپیوں کا باپ سپرنٹنڈنٹ ہے۔ چار سو روپے گھر لاتا ہے۔ میری بچی کے پاس صرف دو قمیضیں ہیں اور کپور صاحب کی لڑکیاں دن میں دو سوٹ بدلتی ہیں۔ کبھی پچھی سیاہ ہے.........؟"

جیون رام مانتے میں کر چُپ ہو جاتا۔ اس کے دل میں بہت سے سوال ابھرتے۔ یہ چاول اتنے موٹے کیوں ہیں ——؟ یہ دال اتنی پتلی کیوں ہے ——؟ اس کی بیوی ہر وقت مسوڑی سی کیوں نظر آتی ہے ——؟ اس کی بچی ہر وقت چُپ کیوں رہتی ہے ——؟ لوگ جہیز میں اسکوٹر مانگتے ہیں ——! بہت سے سوال پتلی دال کے چنوں کی طرح اُس کے دماغ میں تیرنے لگتے...... مگر جب ان سوالوں کا کوئی جواب نہ ملے تو انھیں پتلی دال کی طرح پی جانا چاہیے۔

ایف۔ اے۔ پاس کر کے جیون رام نے سُدھا کو کالج سے اٹھا لیا۔ "میں افورڈ نہیں کر سکتا!" اُس نے اپنے ساتھی ملوطارام سے کہا، جو سیوال دول کلاتھ مرچنٹ کے یہاں نوکر تھا۔ وہ بڑی آسانی سے یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ کالج میں پڑھانے کی میری حیثیت نہیں۔ مگر حیثیت کا لفظ کتنا صاف اور کھلا ہوا ہے۔ جیسے کسی نے سر پر سات جوتے مار دیے ہوں اور "افورڈ" میں کتنی گنجائش ہے۔ ویسے اپنی زبان میں کبھی کبھی بدیسی اور اجنبی الفاظ بھی استعمال کر لینے سے کتنی پردہ پوشی ہو جاتی ہے۔ بالکل ایسے جیسے گھر میں کوئی اجنبی آ جائے تو گھر کے لڑائی جھگڑے پر اسی وقت پردہ پڑ جاتا ہے.........! "تمھاری بیلا تو ابھی کالج میں پڑھتی ہے نا؟"

اُس نے ملوطارام سے پوچھا۔

"ہاں" ملوطارام من کی خوشی سے چہکتے ہوئے بولا "اگلی سردیوں میں اس کی شادی ہونے والی ہے۔"

"لڑکا ڈھونڈ لیا؟" جیون رام نے مری ہوئی آواز میں پوچھا۔

"ہاں" ملوطارام کوئل کی طرح کوکتے ہوئے بولا۔ "اس نے خود ہی اپنا بر پسند کر لیا، کالج میں! لڑکا بڑا امیر ہے۔"

جب ملوطارام چلا گیا تو جیون رام نے بڑا سا منہ بنایا اور ملوطارام کی پتلی آواز کی نقل کرتے ہوئے بولا "اس نے خود ہی اپنا بر پسند کر لیا، ہے؟" پھر وہ زور سے فرش پر تھوکتے ہوئے بولا "حرام زادہ......"

(۲)

دو سال گزر گئے۔ سُدھا اب آصف علی روڈ کی ایک فرم میں ٹائپسٹ تھی۔ وہ پہلے سے زیادہ خاموش، باوقار اور محنتی ہو گئی تھی۔ گھر کی حالت بھی اچھی ہو گئی۔ کیوں کہ سُدھا گھر میں سو روپے لاتی تھی۔ دفتر کے کام سے فارغ ہو کر وہ اسٹینو کا کام سیکھنے جاتی تھی۔ بی۔ اے کرنے کا ارادہ بھی رکھتی تھی۔

گھر کی حالت ذرا بہتر ہونے پر جیون رام اور منگی نے سُدھا کے بر کے لیے زیادہ اعتماد سے کوشش شروع کر دی تھی۔ وہ سُدھا کی تنخواہ میں سے بہت کم خرچ کرتے تھے۔ اور اسکوٹر کے لیے پیسے جمع کر رہے تھے۔

بہت دنوں کے بعد جیون رام ایک لڑکے کے والدین کو اسکوٹر کا لالچ دے کر گھیرنے میں کامیاب ہوا۔ منگنی کی رقم، بیاہ کا جہیز، جہیز کی نقدی، جہیز کا سونا،

ساری ہی ضروری باتیں طے ہوگئیں تو موتی جو لڑکے کا نام تھا اور واقعی شکل و صورت میں موتی ہی کی طرح اجلا اور خوب صورت تھا۔ اپنی ہونے والی بیوی کو دیکھنے آیا۔

موتی نے گہرے براؤن رنگ کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ اس کی سنہری رنگت پر اس کے سیاہ گھنگھریالے بال بے حد خوب صورت معلوم ہوتے تھے۔ اس کی قمیض سے کف کے باہر اس کے ہاتھ بڑے متناسب اور خوب صورت لگتے تھے۔ اور جب وہ بھی سجاتا سُدھا کی طرف دیکھ کر مسکرایا تو اندر ہی اندر اس معصوم لڑکی کا دل کھل گیا۔ اور چائے کی پیالی اس کے ہاتھوں میں کپکپانے لگی، اور بڑی مشکل سے وہ چائے کی پیالی موتی کو پیش کر سکی۔

موتی چائے پی کر اور شکریہ ادا کر کے بڑی سعادت مندی سے رخصت ہو گیا۔ اپنی بہنوں کے ساتھ۔ دوسرے دن اس کی بہنوں نے کہلا بھیجا "لڑکی پسند نہیں"
اس رات سُدھا سو نہ سکی۔ رات بھر اس کی آنکھوں میں موتی کا خوب صورت چہرہ اور اس کا بادامی جسم ڈولتا رہا تھا۔ اور رات بھر موتی کے ہاتھوں کا خفیف سا لمس اس کی پوروں کو گدگداتا رہا۔

"لڑکی پسند نہیں۔ اونہہ" بھابی غصے سے ساگ کو کڑھائی میں بھونتے ہوئے بولی "اور خود تو بڑا یوسف ہے۔ اپنی رنگت پہ بڑا اتراتا ہے۔ مگر اپنی پکوڑا ایسی ناک نہیں دیکھتا؟ اور اپنے حبشیوں ایسے گھنگھریالے بال نہیں دیکھتا۔ اپنی بہنوں کو نہیں دیکھتا؟ ایک تو بھینگی تھی صفا بھینگی۔ دوسری پوڈر سرخی کی ماری، صورت کی چوہیا لگتی تھی۔ تیسری کے بال دیکھے تھے تم نے؟ جیسے بنیے کی بوری کے بھوسڑے۔ اونہہ لڑکی پسند نہیں"...... یہ کہہ کر اس نے اتنے زور سے کڑھائی میں کرچھی چلائی جیسے وہ ساگ کے بجائے اس لڑکے کو ٹھونس رہی ہو۔

سُدھا نے محسوس کیا کہ اس کے گھر والوں بلکہ گھر کے باہر محلے والوں اور شاید دفتر والوں کا بھی خیال یہ تھا کہ سُدھا کچھ محسوس نہیں کرتی۔ بلکہ دفتر کے کام کے لیے نہایت مناسب لڑکی ہے نہ کسی سے عشق کرے۔ نہ کسی کو عشق کی ترغیب دے۔

دن بہ دن اس کی آنکھیں پیلی، ہونٹ خشک ہوتے اور چہرہ دھواں دھواں ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی صورت ایسی ٹھنڈی اور بے حس نکل آئی تھی کہ اسے دیکھ کر کسی برف خانے کا احساس ہونے لگا تھا۔ کلرک آپس میں چہ میگوئیاں کرتے ہوئے کہتے "جو آدمی سُدھا سے شادی کرے گا اسے پہاڑ پر جانے کی ضرورت نہ ہوگی"۔

اس لیے موتی کے انکار کرنے پر سُدھا کے دل پر کیا بیتی یہ تو کسی کو معلوم نہ ہو سکا۔ پہلی بار اس نے زندگی میں کسی کو دل دیا تھا۔ اور یہ کسی کو معلوم نہ تھا۔ ہوتا بھی کیسے۔ جا کر کہتی بھی کیا کسی سے؟ کہ جسے میں نے چاہا وہ مجھے دیکھنے آیا تھا اور ناپسند کر کے چلا گیا۔ لوگ تو عشق میں روتے ہیں۔ وہ بے چاری کچھ کہہ بھی نہ سکتی تھی۔

اس دن اس نے دفتر میں اوور ٹائم کیا اور جب اندھیرا خاصا بڑھ گیا تو وہ دفتر سے باہر نکلی اور اپنا بھورے رنگ کا پرس جھلاتی ہوئی سامنے کے آصف علی پارک میں چلی گئی اور ایک بنچ پر تنہا بیٹھ گئی۔ یہ پارک دہلی گیٹ کے سامنے ایک چھوٹا سا خاموش گوشہ تھا۔ چند پیڑ تھے۔ چند بنچیں تھیں۔ چند ٹکڑے تھے گھاس کے ——— ان کے چاروں طرف ٹریفک کا شور تھا مگر آج یہاں نسبتاً خاموشی تھی۔ سُدھا ہر روز یہاں آتی تھی اور آدھ پون گھنٹہ اکیلے بیٹھ کر تازہ دم ہوتی تھی۔ تھوڑے عرصے کے لیے اپنے خیالوں کی لہروں پر دور تک تیرتی ہوئی نکل جاتی۔ . . . اسے تنہائی سے ڈر نہ لگتا تھا تنہائی اس کا واحد سہارا تھی۔ اندھیرے سے اسے ڈر نہ لگتا تھا۔ بلکہ اندھیرا اس کا دوست تھا۔ غنڈوں سے اسے ڈر نہ لگتا تھا۔ جانے اس کی شخصیت میں کچھ ایسی بات تھی کہ غنڈے بھی اسے دوری سے سونگھ کر چل دیتے تھے۔ کترا کر نکل جاتے تھے۔

آج اندھیرا گہرا تھا اور پیڑوں کے نیچے گہری خاموشی۔ پتھر کا بنچ بھی خوب ٹھنڈا تھا۔ چند منٹ تک سُدھا خاموشی سے اس بنچ پر بیٹھی رہی۔ مگر جب اس کی تکان نہ گئی تو وہ اٹھ کر پیڑ کے نیچے چلی گئی۔ اور تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اور آنکھیں بند کر لیں۔

یکایک کسی نے اس سے کہا: "تم یہاں کیوں بیٹھی ہو؟ اکیلی؟"

سُدھا نے آنکھیں کھولیں۔ سامنے موتی مسکرا رہا تھا۔ وہی خوب صورت براؤن سوٹ پہنے، وہی سپید دانتوں والی جگمگاتی ہوئی مسکراہٹ لیے..... اس کے ہاتھ تھے ہی خوب صورت تھے ...... سُدھا کے حلق میں کوئی چیز آ کے رکنے لگی۔ وہ بول نہ سکی۔

موتی اس کے قریب آ کے بیٹھ گیا۔ اتنا قریب کہ اس کی پتلون اس کی ساری سے مس ہو رہی تھی۔ اس نے آہستہ سے پوچھا۔

"تمہیں میرے انکار پر غصہ آ رہا ہے نا؟"

سُدھا نے آہستہ سے سر ہلایا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"بہت برا لگ رہا ہے نا؟"

سُدھا نے مجرموں کے انداز میں آہستہ سے سر ہلا دیا اور آنسو چھلک کر اس کے گالوں پر آ گئے۔ اور وہ رونے لگی........

موتی نے اپنے کوٹ کی جیب سے رومال نکالا اور اس کے آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔

"مگر اس میں رونے کی کیا بات ہے؟ ہر انسان کو اپنی پسند یا ناپسند کا حق ہے۔ بتاؤ حق ہے کہ نہیں؟"

"مگر تم نے کیا دیکھا تھا میرا؟ جو تم نے مجھے ناپسند کر دیا۔ کیا تم نے میرے ہاتھ کا پھلکا کھایا تھا؟ میرا اسٹریالا دیکھا تھا؟ کیا تم نے میرے دل کا درد دیکھا تھا؟ اور وہ بچہ جو تمہیں دیکھتے ہی میری کوکھ میں ہمک کر آیا تھا ——— ؟" تم نے میرے چہرے کا صرف سپاٹ پن دیکھا۔ میرے بچے کا حسن کیوں نہیں دیکھا ——— ؟ تم نے وہ ہاتھ کیوں نہیں دیکھے جو زندگی بھر تمہارے پاؤں دھوتے۔ اور وہ من جو میں تمہاری

قمیص پر کاڑھنے والی تھی۔ تم میرے جسم کی رنگت سے ڈر گئے۔ تم نے اُس سوئٹر کا اُجلا رنگ نہ دیکھا جو میں تمہارے لیے بُننا چاہتی تھی۔ موتی تم نے میری ہنسی نہیں سُنی۔ میرے آنسو نہیں دیکھے، میری انگلیوں کے لمس کو اپنے خوب صورت بالوں میں محسوس نہیں کیا۔ میرے کنوارے جسم کو اپنے ہاتھوں میں لرزتے ہوئے نہیں دیکھا۔ تو پھر تم نے کس طرح مجھے ناپسند کر دیا تھا؟"

ارے . . . اتنی لمبی تقریر وہ کیسے کر گئی؟ اتنا سب کچھ کیسے کہہ گئی؟ بس اُسے اتنا معلوم تھا کہ وہ رو رہی تھی، اور کہتی جا رہی تھی اور اس کا سر موتی کے کندھے پر تھا۔ اور موتی اپنی غلطی پر نادم اس کے شانوں کو ہولے ہولے تھپک رہا تھا۔

اُس دن وہ بہت دیر سے گھر پہنچی اور جب اُس کی ماں سگھی نے اُس سے پوچھا تو اُس نے کمال لاپروائی سے کہہ دیا۔ "دفتر میں دیر ہو گئی" پھر پرس کو زور سے جھلا کر پلنگ پر پھینک دیا اور اس اعتماد سے کنگھا کرنے لگی کہ اُس کی ماں چونک گئی۔ اُس کا باپ چونک گیا۔ آج سُدھا کی روتی ہوئی آنکھوں کی تہہ میں خوشی کی ایک ہلکی سی لکیر تھی جیسے گہرے بادلوں میں کبھی کبھی بجلی کوند جاتی ہے۔

سگھی نے اپنے ہونٹ چبا کر چالاک نگاہوں سے اپنے خاوند کی طرف اس طرح دیکھا جیسے اس نے اپنی بیٹی کا راز بھانپ لیا ہو۔ جیون رام نے بھی ایک پل کے لیے مسرور نگاہوں سے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا پھر اپنی تھالی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

ضرور کوئی بات ہے؟ اور سُدھا چونکہ عورت ہے اس لیے اس بات کی تہہ میں ضرور کوئی مرد ہے ایسا دونوں میاں بیوی نے اسی لمحہ سوچ لیا۔

آٹھ دس روز کے بعد اس شبہے کو اور تقویت پہنچی۔ جب ایک لڑکا اپنی ماں کے ساتھ سُدھا کو دیکھنے کے لیے آیا۔ اس لڑکے کی ماں سگھی کی بچپن کی سہیلی تھی۔ اور کیسے کیسے منت سے اور کس کس طرح کے واسطے دے کر سگھی نے اسے شیشے میں اُتارا تھا۔ یہ صرف سگھی ہی جانتی تھی۔ اس لیے جب اس موقع پر لڑکے کی بجائے سُدھا نے شادی سے انکار کر دیا تھا۔ تو پہلے تو سگھی اچنبھے میں رہ گئی۔ پھر اس کے دل میں وہ شبہ اور تقویت پکڑتا چلا گیا . . ضرور کوئی ہے . . . . !!

وہ چپکے چپکے اپنی بیٹی کے بیاہ کے جہیز کا سامان تیار کرنے لگی اور جیون رام حقہ پیتے پیتے اُس دن کا انتظار کرنے لگا جب سُدھا چپکے سے آکر سگھی سے سب بات کہہ دے گی۔ اور بڈھا جیون رام پہلے تو لال پیلی آنکھیں نکال کر سُدھا کو گھورے گا: "تیری یہ ہمت! کہ تو نے ہم سے بالا بالا ہی اپنے لیے بر پسند کر لیا؟ نکال دوں گا گھر سے۔ اور چٹیا کاٹ کر پھینک دوں گا۔ ہمارے خاندان کی ناک کٹانے والی . . . ." پھر وہ سگھی کے سمجھانے بجھانے پر خود ہی نرم پڑ جائے گا اور آخر غصہ تھوک کر ہنستے ہوئے پوچھے گا: "مگر کون ہے وہ ——— ؟"

اور اب کوئی بھی ہو وہ سُدھا کے بتاتے ہی جلد سے جلد اس کے ہاتھ پیلے کریں گے۔ پچیس برس کی جوان لڑکی کو گھر میں رکھنا ٹھیک نہیں۔

مگر دن گزر گئے۔ مہینے گزر گئے۔ سال گزر گئے۔ مگر سُدھا نے کچھ نہ بتایا۔ اُس کی ماں انتظار کرتی رہی، مگر وہ جنم جلی کبھی کچھ مُنہ سے نہ پھوٹی۔ تھک ہار کے اُس کے ماں باپ نے پھر دو تین بر ڈھونڈے۔ مگر سُدھا نے صاف انکار کر دیا۔ آخری بر جو اس کے باپ نے ڈھونڈا وہ ایک رنڈوے حلوائی کا تھا جس کی عمر چالیس سے تجاوز کر چکی تھی۔

اُس روز شفق کے ڈھلتے ہوئے سایوں میں گلابی انگلیوں والی مہکتی ہوئی شام میں سُدھا نے موتی کو بتایا: "وہ لوگ آج میرے لیے ایک بڈھا حلوائی ڈھونڈ کے لائے تھے۔"

"پھر؟" موتی نے ہنس کر پوچھا۔

"میں نے صاف انکار کر دیا۔"

"تو نے انکار کیوں کر دیا پگلی۔ شادی کر لیتی تو زندگی بھر آرام سے میٹھی مٹھائی کھاتی۔"

"اور تمہیں چھوڑ دیتی؟" سُدھا نے پیار بھرے غصے سے موتی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"میں نے بھی تو تم سے شادی نہیں کی؟" موتی نے اُس کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

"تو کیا ہوا؟" سُدھا اُس کے گال کو اپنے گال سے سہلاتی ہوئی بولی: "تم میرے پاس تو ہو، شادی سے بھی زیادہ میرے پاس . . . . ہر وقت میری مٹھی میں گویا . . . ."

موتی ہنس کر بولا: "ہاں یہ تو صحیح ہے۔ میں بالکل تمہاری مٹھی میں ہوں، جب چاہو بلا لو۔"

"شروع میں تو تم ایسے نہ تھے" سُدھا موتی کی طرف عجیب نگاہوں سے دیکھ کر بولی۔ "شروع میں تو تم بڑی مشکل سے میرے پاس آیا کرتے تھے . . . ."

"شروع میں ایسا پیار بھی تو نہ تھا۔ اور کسی کے دل کو سمجھتے ہوئے دیر بھی تو لگتی ہے . . . . . ." موتی نے سُدھا کے کانوں میں سرگوشی کی، اور سُدھا کی آنکھیں شدتِ احساس سے بند ہونے لگیں، اور تھوڑی دیر کے بعد اس نے موتی کی تیز تیز سانسوں کی آنچ اپنے چہرے پر محسوس کی، اور اپنی گردن اور رخسار پر اُس کے بوسے برستے ہوئے محسوس کیے . . . . !

"کل کہاں ملو گے؟"

"جہاں تم کہو . . . . . . لورز لین میں؟"

"اوں ہوں!"

"کرلے میں گھوڑوں کی نمائش ہو رہی ہے۔"

"میں کیا گھوڑے خرید کر پالوں گی؟" سُدھا ہنسی۔

"فلاں ہال میں ماڈیوں کی نمائش ہے۔"
"تا با با!" سُدھا نے کانوں پہ ہاتھ رکھے۔
موتی خاموش ہوگیا۔
پھر سُدھا خود ہی بولی: "کل پکچر دیکھیں گے۔ بسنت سنیما میں بہت اچھی پکچر لگی ہے۔ میں دو ٹکٹ خرید رکھوں گی۔ تم ٹھیک پونے چھ بجے وہاں پہنچ جانا۔"
"ٹکٹ میں خرید لوں گا؟"
"نہیں یہ پکچر تو میں دکھاؤں گی۔ تم کوئی دوسری دکھا دینا۔ میں کب منع کرتی ہوں...... مگر بھولنا نہیں۔ کل شام پونے چھ بجے، بسنت سنیما کے اندر!"

بسنت سنیما کے باہر بہت بھیڑ تھی۔ سُدھا نے دو ٹکٹ خرید لیے تھے اور اب وہ موتی کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے احتیاطاً آدھ پاؤ چلغوزے اور ایک چھٹانک کشمش بھی لے لی۔ سنیما دیکھتے دیکھتے کھانے کا اُسے ہوکا سا تھا۔

پونے چھ ہوگئے۔ چھ ہوگئے۔ پچھلے شو کے چھوٹنے کے بعد لوگ چلے گئے۔ نئے لوگ شو دیکھنے کے لیے آنے لگے، موتی نہیں آیا۔ چاروں طرف روشنیاں تھیں۔ لوگوں کی بھیڑ تھی۔ خوانچے والوں کی بلند آوازیں تھیں۔ تانگے، موٹروں اور رکشاؤں کا ہجوم تھا۔ اور موتی ہجوم کو پسند نہیں کرتا تھا۔ شور کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اب وہ اس کی طبیعت سمجھ گئی تھی۔ اُسے خاموشی پسند تھی۔ اندھیرا پسند تھا۔ تنہائی پسند تھی....

..... موتی بے حد حساس اور نفاست پسند تھا۔

سوا چھ کے قریب وہ سنیما ہال میں جا بیٹھی۔ اُس نے اپنے ساتھ والی سیٹ پہ اپنا رومال رکھ دیا۔ چلغوزوں اور کشمش کے لفافے بھی۔ پہلے پہلے ہال بھر گیا مگر موتی نہیں آیا۔ پھر جب ہال کی روشنیاں گل ہوگئیں اور پکچر شروع ہوگئی تو سُدھا نے موتی کا ہاتھ اپنے ہاتھ پر محسوس کیا۔ وہ اندھیرے میں چپکے سے آکر ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ سُدھا نے اُس کے ہاتھ کو دباتے ہوئے کہا۔

"بڑی راہ دکھاتے ہو۔"
"ساری!" موتی کے لہجے میں بے حد ملائمت تھی۔
"یہ تمہارے لیے چلغوزے اور کشمش لائی ہوں کھاؤ...."

موتی نے کشمش کے چند دانے اٹھا کر اپنے منہ میں ڈال لیے اور سُدھا مسرت کے احساس سے پکچر دیکھنے میں مصروف ہوگئی۔ اب باتیں کرنے کا لمحہ تھا۔ وہ محسوس کر سکتی تھی کہ موتی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں ہے۔ وہ اس کے ساتھ کرسی پر بیٹھا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنا سر اُس کے شانے پر رکھ دیتی۔ موتی سرگوشی میں کہتا۔

"میرے کندھے پر سر رکھ دینے سے تمہیں کیا نظر آتا ہے؟ تصویر تو نظر آتی نہ ہوگی؟"

"وہ تصویر نظر آتی ہے جو اس ہال میں بیٹھا ہوا کوئی آدمی نہیں دیکھ سکتا۔" سُدھا نے بڑی گہری مسرت سے کہا۔

آہستہ آہستہ ہر شخص نے تبدیلی محسوس کی۔ سُدھا کی میلی میلی آنکھیں اُجلی ہوتی گئیں۔ اور اس میں کاجل لگا کر اُس نے دُنبالہ کھینچا تو وہی اُجلی آنکھیں تلوار کی دھار کی طرح کٹیلی ہوگئیں۔ سینے کا اُبھار واضح ہونے لگا۔ کمر لچکنے لگی اور چال میں کولھوں کا مدوجزر شامل ہوتا گیا۔ وہ دن بدن حسین اور دلکش ہوتی گئی۔ اب اُس کے کپڑے انتہائی صاف ستھرے ہوتے تھے۔ ہوتے تھے کم قیمت کے، مگر بے حد عمدہ سلے ہوتے تھے۔ سُدھا کو یہ توفیق تو نہ تھی کہ وہ کسی اچھے درزی کے پاس جاسکے مگر خود ہی اُس نے درزی کا کام سیکھ لیا تھا اور بہت کم لڑکیاں کٹائی اور نئے لباس کی تراش اور ڈیزائن میں اس کا مقابلہ کر سکتی تھیں۔ مگر اس نے کبھی کسی کو نہیں بتایا کہ وہ یہ کپڑے خود اپنے ہاتھ سے کاٹ کر تیار کرتی ہے۔ اس کے دفتر کی جب کوئی دوسری لڑکی اُس کے لباس کی تعریف کرتی تو سُدھا جھٹ کسی مہنگے درزی کا نام بتا دیتی۔ جہاں صرف امیر ترین فیشن ایبل عورتوں کے کپڑے تیار ہوتے تھے اور اُس کے دفتر کی لڑکیاں جل کر خاک ہو جاتیں۔ اور سُدھا سے رشک اور حسد کے ملے جلے انداز میں پوچھتیں۔

"کیسا ہے وہ تیرا؟"
"گورا رنگ ہے۔ بال گھنگھریالے ہیں۔ ہنستا ہے تو موتی جھڑتے ہیں۔" سُدھا جواب دیتی۔
"کیا تنخواہ لیتا ہے؟"
"بارہ سو۔"
"بارہ سو؟" لڑکیاں چیخ کر پوچھتیں۔ "بارہ سو تو ہماری فرم کے منیجر کی تنخواہ ہے۔"
"وہ بھی ایک فرم میں منیجر ہے۔" سُدھا جواب دیتی۔
"اری ہمیں دکھائے گی نہیں؟ بس ایک بار دکھا دے...... ہم دیکھ تو لیں کیسا ہے تمہارا وہ!"
"دکھا بھی دوں گی، کہو تو دفتر میں بُلا کے دکھا دوں!"

یہ تو اُس نے یونہی کہہ دیا تھا۔ ورنہ سُدھا کہاں موتی کو دکھلانے والی تھی۔ وہ مر جاتی مگر اپنے موتی کو نہ دکھاتی۔ ان لونڈیوں کا کیا بھروسہ.....

...... مگر سُدھا نے دفتر میں بُلانے کی دھمکی ایسی کامل اعتماد سے دے دی تھی کہ اس سے آگے پوچھنے کی ہمت لڑکیوں کو نہ ہوئی۔ اور وہ جل کر خاموش رہ گئیں۔

سدھا کا بوڑھا باپ کڑھ کڑھ کر مر گیا۔ کیوں کہ سدھا شادی نہ کرتی تھی اور
ے طرح طرح کی چہ میگوئیاں کرتے تھے۔ اور سدھا کا باپ اپنی بیٹی کو کچھ نہ کہہ
نا۔ کیوں کہ سدھا جوان اور بالغ تھی اور خود مختار بھی تھی۔ اب وہ گھر میں
رو پے لاتی ــــــ سدھا کا باپ مر گیا اور اس کے مرنے کے بعد گئے
الوں میں سدھا کے بھائیوں کی شادیاں ہو گئیں اور وہ لوگ اپنی اپنی بیویاں
ی اپنی ملازمتوں کے ٹھکانوں پر چلے گئے۔ پھر اس کی چھوٹی بہن وجے کی بھی

ہو گئی۔ پھر اس کی ماں بھی اپنی بڑی بیٹی کے کنوارپنے کے غم میں سلگ سلگ کر
ور سدھا اس غم میں اکیلی رہ گئی۔ چند ماہ کے بعد اس نے وہ گھر بھی چھوڑ دیا
ل لائنز میں ایک عمدہ مکان کی دوسری منزل میں دو کمرے لے کر پے انگ
Paying Guest کے طور پر رہنے لگی۔ اس کے رہنے کے حصے کا دروازہ
سے باہر نکلتا تھا۔ اور اب وہ اپنی نقل و حرکت میں مکمل خود مختار تھی۔ اب وہ چھتیس
ی ہو چکی تھی مگر شکل سے تیس برس کی معلوم ہوتی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ہر
سکراہٹ کھیلتی رہتی۔ اور آنکھوں میں خوشیوں کے سائے ناچتے رہتے۔ وہ پہلے
یادہ سنجیدہ اور باوقار ہو گئی تھی۔ وہ اسٹینو بھی ہو گئی تھی۔ اس نے بی۔ اے۔ بھی
تھا۔ اس کی تنخواہ بھی بڑھ گئی تھی۔ اور کتابیں پڑھنے کا شوق بھی ......
...اب وہ خوش حال اور آرام دہ اور سکون آمیز زندگی بسر کر رہی تھی۔ کبھی
سے وہ اپنی مانگ میں سیندور بھر رہی تھی اور ماتھے پر سہاگ کی بندیا سجاتی تھی۔
وں کو یہ تو معلوم نہ تھا کہ اس کی شادی کہاں ہوئی ہے؟ اور کون اس کا خاوند
مگر لوگ اتنا جانتے تھے کہ کوئی اس کا ہے۔ جس کے ساتھ وہ اپنی شامیں گزارتی
بلکہ لوگ تو یہاں تک کہتے سنے گئے کہ جو کوئی بھی وہ ہے۔ اس کی اپنی کچھ وجوہ ہیں
وجہ سے ان دونوں کی شادی نہیں ہوئی مگر وہ دونوں ہر شام کی تنہائیوں میں
ہیں اور جب دنیا سو جاتی ہے اور جب کوئی کسی کو نہیں دیکھتا۔ جب چاروں
نیند غالب آجاتی ہے۔ اس غنودگی سے بھرپور لمحوں میں کوئی سدھا کے یہاں آ کے
لے سے دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اور خاموشی سے اندر آجاتا ہے ......لوگوں
سے دیکھا نہیں تھا۔ مگر لوگوں کا خیال یہی تھا۔ وہ سدھا سے کچھ کہتے نہیں تھے
کہ سدھا اب ایک سنجیدہ اور باوقار عورت بن چکی تھی۔ اور جس کے ماتھے پر سیندور
بڑا ٹیکا جگمگاتا ہو۔ اسے کوئی کیا کہہ سکتا ہے؟

وہ شام سدھا کی چالیسویں سال گرہ کی شام تھی۔ اور وہ شام کئی وجوہ
سدھا کو کبھی نہیں بھولتی۔ سدھا موتی کو متھرا روڈ کے جاپانی گارڈن میں لے گئی
۔ جس پر باغ کی بجائے کسی خوب صورت منظر کا شبہ ہوتا تھا شفق نے چوٹ
ی ہوئی عورت کی طرح اپنا منہ چھپا لیا تھا۔ اور رات کی سانولی زلفیں افق پر
رنے لگیں۔ بھولے بھولے تارے نمودار ہونے لگے۔ آج سدھا بہت خاموش تھی۔

موتی بھی چپ چاپ سا تھا۔ ......

وہ اب بھی اسی طرح خوب صورت تھا۔ جیسے جوانی میں تھا۔ اب بھی وہ ہر روز اسی براؤن سوٹ میں آ کر سدھا سے ملتا تھا کہ سدھا کا حکم یہی تھا۔ اسے دیکھ کر یہ گمان ہوتا تھا کہ موتی پر زندگی کے بہاؤنے اور وقت کے گھاؤنے زیادہ نشان نہیں چھوڑے۔ صرف کنپٹیوں پر سفید بال آ گئے ہیں۔ جو اس کی صورت کو اور بھی باوقار اور وجیہ بناتے تھے اور وہ ایک چھڑی لے کر چلتا تھا۔ جو اس کی پچاسویں سال گرہ پر خود سدھا نے اسے تحفے میں دی تھی ورنہ اس کے علاوہ اس کی صورت شکل میں، کردار اور گفتار میں کسی طرح کا فرق نہ آیا تھا۔ وہ پہلے ہی کی طرح اتنا حسین، دل کش اور دل نواز تھا کہ اسے دیکھتے ہی سدھا کے دل میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگتی تھیں اتنا وقت گزر جانے کے بعد آج بھی اسے دیکھ کر سدھا کا دل اتنے زور سے دھک دھک کرنے لگتا تھا جتنا کہ پہلے روز. . . .

موتی نے آہستہ سے پوچھا: "تم نے مجھ سے شادی کیوں نہیں کی؟"

"ایک دفعہ انکار کرنے کے بعد ــــــ" سدھا نے ہولے سے کہا: "تم سے شادی نہیں کی جاسکتی تھی صرف محبت کی جاسکتی تھی .... اب تم یہ کیسے جان سکو گے کہ جس دن تم نے انکار کیا تھا اسی دن سے ہم میرے ہو گئے تھے .... .. اپنا جاننے کے لیے عورت کا دل چاہیے۔

موتی خاموش رہا۔ بہت دیر کے بعد بولا: "آج تو تم چالیس سال کی ہو چکی ہو۔ کیا تمہیں افسوس نہیں ہوتا؟ کہ تم نے مجھ سے شادی نہیں کی ..... !"

یہ سن کر سدھا بھی خاموش ہو گئی۔ اتنی دیر خاموشی رہی کہ موتی کو گمان گزرا کہ کہیں سدھا اندر ہی اندر رو رہی ہے۔

"سدھا!" اس نے آہستہ سے اس کا شانہ ہلایا۔

"میں سوچ رہی تھی:" سدھا ہولے سے بولی۔ ....."تم سے شادی نہ کر کے میں نے کیا کھویا ہے۔ ..... کیا کوئی شام ایسی تھی؟ جو میں نے تمہارے ساتھ نہ گزاری ہو۔ سوچو تو کہاں کہاں ہم نہیں گئے؟ جہاں جہاں میں نے تمہیں بلایا کیا تم وہاں نہیں پہنچے؟ اور جس وقت بھی بلایا کیا اسی وقت سب کام چھوڑ کر تم نہیں آئے؟ اگر شادی کا نام رفاقت ہے تو وہ مجھے حاصل ہے۔ . . . . . . !!

"پھر یہ بھی سوچو کہ اس طویل رفاقت میں میرا تمہارا ایک بار بھی جھگڑا نہیں ہوا۔ میں نے تمہیں ہمیشہ مہربان اور مسکراتے ہوئے پایا۔ سالہا سال جب میرے ہاتھوں کو تمہارے ہاتھوں کی ضرورت ہوئی۔ ان کے لمس کی گرمی میں نے اپنے جسم کے روئیں روئیں میں محسوس کی۔ تمہارے پھول میری زلفوں میں رہے۔ تمہارے بوسے میرے ہونٹوں پر۔ تمہاری وفا میرے دل میں .... کیا کوئی عورت محبت میں اس سے زیادہ پا سکتی ہے؟"

سُدھا نے ایک گہری مسرت سے اپنے آپ کو موتی کے بازوؤں میں ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اور پھر اُسے ایسا محسوس ہوا کہ موتی کے دو بازو نہیں بلکہ چار بازو ہیں۔ بلکہ شاید چھے بازو ہیں۔ آٹھ بازو ہیں۔ اور وہ اپنے جسم و جاں کے رگ و ریشے میں اس کے بازوؤں کو محسوس کر رہی تھی۔ جو اُسے بھینچ کر اپنے سینے سے لگا رہے تھے۔ اور سُدھا نے اپنے آپ کو ان بازوؤں کے سپرد کر دیا اور اندر ہی اندر اس طرح کھلتی چلی گئی، جیسے چاندنی کے لمس سے کلی کھِل کر پھول بن جاتی ہے۔ مدماتے تاروں کے جھرمٹ میں، سبز جھالروں والے پیڑوں کی اوٹ سے چاند اُبھر آیا تھا۔ اور اب چاند اُس کے بالوں میں تھا۔ اُس کی آنکھوں میں تھا۔ اُس کے ہونٹوں میں تھا۔ اس کے دل میں تھا۔ اور لہر در لہر اس کی جوئے خوں میں رواں تھا۔ "ہائے میرے موتی چور ..... میرے موتی چور ..... میرے میٹھے لڈو ..... میں تو مر گئی تیرے لیے ......"

تھوڑی دیر کے بعد جب سُدھا نے آنکھیں کھولیں تو اس کا پُرمسرت خنودگی آمیز چہرہ بتا رہا تھا کہ اُس سے ابھی ابھی محبت کی گئی ہے ..... !

وہ شام، وہ رات سُدھا کبھی نہیں بھولے گی۔ کیوں کہ وہ رات مکمل تھی۔ اور ان دونوں کی زندگیاں مکمل تھیں جیسے وقت اور عمر، چاند اور آرزو سب ایک ساتھ ایک دائرے میں مکمل ہو جائیں اور جذبے کی ایک بوند بھی چھلک کر باہر جانے کی ضرورت محسوس نہ کرے۔ ایسے لمحے کب کسی کی زندگی میں آتے ہیں؟ اور جب آتے ہیں تو اس شدت سے اپنا تاثر چھوڑ جاتے ہیں کہ انسان محسوس کرتا ہے ...... کہ شاید میں اب تک جیا ہی اس لمحے کے لیے تھا۔ شاید کچھ اسی طرح ہی سُدھا نے اس لمحے میں محسوس کیا اور پھر کبھی اس طرح محسوس نہ کیا۔ کیوں کہ اس واقعہ کے چند دن بعد، اس کے دفتر کا منیجر تبدیل ہو گیا اور جو منیجر اس کی جگہ آیا۔ اُسے سُدھا سخت ناپسند کرنے لگی تھی۔ ایک تو وہ بڑا بدصورت تھا۔ کسی زمانے میں اس کا رنگ گورا ضرور رہا ہوگا۔ مگر اب تو پرانے تانبے کا سا تھا۔ اور موٹی ناک پر مسلسل شراب نوشی سے نیلی وریدوں کا جال سا پھیلا تھا۔ اور سُدھا کو لگنے لگا کہ منیجر کی ناک دیکھ کر ہمیشہ گماں ہوتا کہ یہ ناک نہیں ایک انجیر ہے جو ابھی باتیں کرتے کرتے اس کے سامنے پھٹ جائے گا۔ اس کے گال جبڑوں پر لٹک گئے تھے۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ گڑھے پڑ گئے تھے۔ سر کے بال اُڑ گئے تھے۔ اور جب وہ بات کرتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بڈھا مینڈک کسی کائی بھرے تالاب کے اندر سے بول رہا ہو۔ عجب سی گھِن آتی تھی سُدھا کو اس سے۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ اب دفتر میں اتنے سال سے کام کرتے کرتے وہ ہیڈ اسٹینو بن چکی تھی اور اُسے دن بھر منیجر کے کمرے میں رہنا پڑتا تھا۔ اور اس سے اُسے انتہائی کوفت ہوتی تھی۔ لیکن اس سے زیادہ کوفت اُسے یہ سوچ کر ہوتی تھی کہ اُس نے اس بدصورت انسان کو اس سے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ جیسے یہ صورت جانی پہچانی ہو۔ مگر کہاں؟ ذہن اور حافظے پر زور دینے سے بھی اس کی یاد نہ آتی تھی۔

"اونہہ دیکھا ہوگا، اس مرگھلے کو کہاں" ہلیس میں چکر کاٹتے ہوئے کہیں! سُدھا اپنے آپ کو سمجھاتے ہوئے کہتی۔ مگر پھر کبھی وہی منیجر کسی فائل کو خود اٹھا کر سُدھا کی میز پر رکھتے ہوئے اپنے ہاتھوں سے ایسی جنبش کرتا کہ سُدھا کا ذہن بے چین ہو جاتا۔ اور وہ سوچنے لگتی۔ کون تھا وہ؟ کس سے اس کی یہ حرکت ملتی ہے۔ کیا میرے مرحوم باپ سے؟ میرے کسی بھائی سے؟ جیسے یہ حرکت مجھے کچھ یاد دلاتی ہو ——— ؟ مگر کیا ——— ؟ غور کرنے پر بھی وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکتی۔ . . اور پھر اپنا کام کرنے لگتی۔ مگر دن بھر اس کے دل میں ایک خلش سی چبھتی رہتی ..... !

پہلی تاریخ کو جب تنخواہ بٹ چکی اور لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تو منیجر نے سُدھا کو اُس کام سے روک لیا اور اُسے اپنی میز کے سامنے کرسی پر بٹھا لیا۔ پھر اس نے ایک کیبنٹ کھول کر اس میں سے ایک گلاس نکالا اور وہسکی کی بوتل اور سوڈا .... اور پہلا پیگ وہ غٹاغٹ چڑھا گیا۔ سُدھا اُسے حیرت سے دیکھنے لگی۔ اور غصے سے اٹھ کر جانے لگی کہ منیجر نے نہایت نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے جانے سے باز رکھا اور بولا۔

"آج جب تمھاری ترقی کی فائل میرے سامنے آئی تو مجھے معلوم ہوا کہ اس دفتر میں سب سے پرانی ملازم تم ہو، یہ بڑی خوشی کی بات ہے۔"

سُدھا چپ رہی۔

"تمھارا نام سُدھا ہے نا ......؟" منیجر بڑی بے چینی سے بولا۔

سُدھا بڑی حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اتنے دن سے میرے ساتھ کام کر رہا ہے۔ کیا یہ میرا نام بھی نہیں جانتا؟ آخر اسے کیا ہوا ہے؟

"میرا مطلب ہے ......" منیجر دوسرے پیگ کا ایک بڑا گھونٹ پی کر بولا۔ "تم وہی سُدھا ہو نا جس کے باپ کا نام جیون رام ہے ——— ؟"

سُدھا بڑی ترش روئی سے بولی۔ "ہاں میرے باپ کا نام بھی فائل میں لکھا ہے، پھر مجھ سے پوچھنے کی ضرورت کیا ہے؟" وہ تقریباً اٹھتے اٹھتے بولی۔

"بیٹھو بیٹھو ......" منیجر نے پھر اس کی منت کرتے ہوئے کہا۔

"تم نے مجھے پہچانا نہیں؟" وہ اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"نہیں ——— !" وہ غصے سے بولی۔

"تم اپنے باپ کے ساتھ محلہ جنداں میں رہتی تھیں نا؟"

"ہاں!"

"میں ایک روز تمھارے گھر آیا تھا۔ تمھیں دیکھا بھی تھا۔ تم سے باتیں بھی کی تھیں۔" بڈھے منیجر نے سُدھا سے کہا۔ "اب تم ایک خوب صورت عورت بن چکی ہو، مگر جب تم ایسی نہ تھیں۔ جب تم ایک معمولی سی لڑکی تھیں، اور میں نے تمھیں دیکھا تھا۔ اور تم سے باتیں بھی کی تھیں۔"

ب . . . . . ؟ کب ——— ؟" سُدھا بے چینی سے بولی۔

ہا نیچے زیرِ لب سُدھا کو دیکھتا رہا۔ آخر آہستہ سے بولا۔

یں موتی ہوں . . . . "

سُدھا سنّاٹے میں آگئی۔

یں بڑا . . . . میں بڑا بدنصیب تھا جو تم سے شادی نہ کی . . . . . .
نہیں اچھی طرح سے دیکھ نہ سکا، سمجھ نہ سکا، ان چند لمحوں میں کوئی کیا
تا ہے کیوں کہ ایک صورت جلد کے اندر بھی تو پوشیدہ رہتی ہے . . . .
، نوجوان تھا۔ دولت اور گورے رنگ کا لالچی۔ جو بیوی مجھے ملی، وہ دولت
تھی اور سفید چمڑا بھی، اور اس کے ساتھ ایک مغرور، بدمزاج، ظالم اور
بیعت بھی لائی تھی۔ چند سالوں ہی میں میرے پانچ بچے ہو گئے۔ ان میں
میرے تھے؟ میں کہہ نہیں سکتا۔ مگر لوگ طرح طرح کی باتیں بناتے تھے
سنتا تھا۔ اور پیتا تھا۔ اور دوسری عورتوں کے پاس جاتا تھا . . . . . . پھر
بیماری کا، اور شراب کا، اور ناکامی کا اور بے مہری کا۔ میری رگ
پھیل گیا اور میں وقت سے پہلے بوڑھا ہو گیا اور بجھ گیا . . . . اب
ہے۔ اس لیے میں اُسے کچھ نہ کہوں گا۔ اور اسے کہوں بھی کیا ——— ؟
یرا ہے۔ میری ان آنکھوں کا جو تمھیں پہچان نہ سکیں . . . . میری آنکھوں
ہیرا دیکھا اور پتھر سمجھ کر پھینک دیا . . . . کیا تم مجھے کسی طرح معاف
سکتیں ——— ؟ کیا تم مجھ سے شادی نہیں کر سکتیں ——— ؟ میری
نہیں ہے۔ مجھے تو محبت بھی نہیں ملی . . . . جس کے لیے میں ساری
رہا۔"

وہ کہے جا رہا تھا اور وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ اور اس کا جی چاہتا
وہ اس سے کہے "اب تم آئے ہو؟ بوڑھے بدصورت اور گنجے ہو کر خوفناک
کا شکار ہو کر . . . . اب تم مجھ سے شادی کے لیے کہتے ہو؟ مگر میں
اپنی ساری زندگی تمھیں دے دی۔ اور تمھیں معلوم تک نہ ہوا کہ میں نے اپنی
جوانی تمھارے تصوّر میں کھو دی۔ اور زندگی کی ہر بہار تمھارے خیال میں گنوا دی
اب کی ہر مچلتی ہوئی آرزو تمھاری ایک نگاہ کے لیے شادی نہ زندگی بھر میں مرکوں
جلتی رہی، تمھارے سائے کے ساتھ۔ اندھیرے پارکوں میں بیٹھی رہی تمھارے
کے ساتھ میں نے خود اپنے ہاتھ سے خرچ کر کے تم سے ساڑھیوں کے تحفے لیے
اور پیا اپنی محنت کا خون کر کے۔ سینما دیکھا اپنے ساتھ کی سیٹ خالی رکھ کر۔
مر گیا۔ میری ماں مر گئی۔ اور میری کوکھ کے بچے مجھے دور ہی دور سے بلاتے
اور میں کسی کے پاس نہ گئی۔ تمھارے خیال کو جز و جاں بنائے ہوئے
ار سہنے کے چالیس سال آنکھیں، کان اور ہونٹ بند کر کے تمھاری آرزو

میں بتا دیئے تھے . . . . میں کتنی خوش تھی؟ کتنی مگن تھی؟ میں نے تو
تم سے کبھی کچھ نہ مانگا۔ نہ شادی کا پھیرا۔ نہ سہاگ کی رات، نہ بچے کا تبسم! بس
. . . . . . صرف ایک تصوّر، ایک جھلک، ایک عکسِ رُخِ یار ہی تم سے مستعار لیا
تھا۔ اور تم آج اُسے بھی جہنم کی چتا میں جلانے کے لیے میرے شہر میں چلے آئے
ہو . . . . . . !؟"

مگر سُدھا موتی سے کچھ نہ کہہ سکی۔ وہ میز پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
اور جب موتی نے اُس کا ہاتھ تھامنا چاہا تو وہ غصّے سے جھنجھلا گئی۔ اور اس کا ہاتھ
جھٹک کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ باہر نکل کر سیڑھیوں سے نیچے اُتر گئی۔ موتی اُسے
بلاتا ہی رہا۔ وہ بھاگ کر سڑک پر جا پہنچی۔ سڑک پر اندھیرا تھا۔ مگر پھر بھی بجلی کی
قمقموں کی اتنی روشنی تھی کہ لوگ اُس کے آنسو دیکھ لیتے۔ مگر اُس نے کسی کی پرواہ
نہ کی۔ اور وہ روتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ آصف علی پارک کے قریب پہنچ کر وہ ٹھٹکی۔
ایک لمحے کے لیے اُسے خیال آیا کہ وہ پارک کے اندر جا کر، کسی پیڑ کے تنے سے ٹیک
کر بیٹھ جائے۔ مگر پھر اُس نے سوچا بے سود ہے۔ سب بے سود ہے۔ میرے
خیالوں کا شہزادہ اب وہاں نہ آئے گا۔ اب وہ کبھی میرے پاس نہ آئے گا۔"

جب وہ یہ سب کچھ سوچ رہی تھی، تو اُس نے اپنی مانگ کا سیندور مٹا ڈالا
اور سہاگ بندیا کھرچ لی۔ اور پارک کی ریلنگ سے اپنی ساری چوڑیاں توڑ ڈالیں
اِس یقین کے ساتھ کہ اب وہ ساری عمر کے لیے بیوہ ہو چکی ہے۔

تجزیہ:۔ انور خان

ایک اداس روح کا نغمہ

کرشن چندر ان خوش قسمت افسانہ نگاروں میں سے تھے جنھیں ادیبوں، شاعروں اور نقادوں نے یکساں طور سے چاہا۔ ادیبوں نے ان کے اسلوب کی تقلید کی۔ شاعروں نے مقدمے لکھوائے اور نقادوں نے ان کے بے مثال اسلوب، انسان دوستی، دردمندی اور حسن کاری کی تعریف کے پل باندھے۔ ایسے ماحول میں کرشن چندر کے افسانوں کا معروضی مطالعہ ناممکن تھا اور شاید اس کا سب سے زیادہ نقصان خود انہیں ہی ہوا کہ انھیں صحیح تنقید نصیب نہ ہو سکی۔ ایسا نہ تھا کہ نقادوں کو ان کے فنی نقائص کا علم نہ ہو۔ انھیں اس بات کا احساس تھا کہ وہ بعض اوقات افسانہ نہیں مضمون لکھنے لگتے ہیں۔ انہیں کردار نگاری کا زیادہ سلیقہ نہیں۔ ان کی رومانیت حقیقت نگاری پر غالب رہتی ہے۔ وہ سیاست کی چھڑی کو ضرورت سے زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ ان[1] کا رویہ صحافیانہ ہے مگر کرشن کی آواز ان کے عہد کے روشن خیال، روحانیت پسند انسان کی آواز تھی۔ ان کی تحریروں میں ہر خاص و عام کو اپنے ہی تصورات کی بازگشت سنائی دیتی تھی آج جب ہمارے اور کرشن چندر کے درمیان وقت اور بدلتے رجحانات کا تھوڑا سا فاصلہ ہو گیا ہے ہم ان کی تخلیقات کا معروضی جائزہ لے سکتے ہیں جو پہلے ممکن نہ تھا

کرشن چندر کی افسانہ نگاری کا آغاز جہلم پر ناؤ میں، آنگی جیسے رومانی افسانوں سے ہوا شروع میں یہ رومانیت فطرت کی آغوش میں زندگی بسر کرنے، اُس کا حصہ بن جانے کی آرزو تک محدود تھا۔ ایک معصوم دنیاوی خرخشوں سے آزاد زندگی۔ یہ احساس کہ انسان اس کائنات کا ایک جز ہے۔ فطرت کے قوانین اس پر بھی اتنے ہی لاگو ہوتے ہیں جتنے اور اشیاء پر۔ وقت کے ساز پر انسان کی زندگی ایک نغمے کے مانند ہے جو تھوڑی دیر کے لئے فضاؤں میں گونجتا ہے، دلوں کو متاثر کرتا ہے اور پھر عدم کے سکوت میں کھو جاتا۔ یہ احساس کرشن چندر کی رومانیت کا بنیادی سر ہے "جو آنگی"، گرہن کی ایک شام، اور زندگی کے موڑ پر، سے لے کر دوسری برف باری تک کے افسانوں میں بطور BASE استعمال ہوا ہے۔ کرشن چندر کے افسانوں میں فنا کا یہ احساس مثبت ڈھنگ سے آیا ہے۔ ابیقورس کی طرح

---

[1] آل احمد سرور تنقیدی اشارے [2] ممتاز شریں۔ اردو افسانے پر مغربی افسانے کا اثر۔

ری سے، فطرت کے حسن سے جی بھر کر لطف اندوز ہوتے
ں ہیں۔ اشتراکیت کے تصور نے اُن کے بعد کے افسانوں میں
ذر کو وسعت دے کر اسے انسان دوستی، روشن مستقبل کی آرزو
و استحصال کے خلاف احتجاج کے عناصر سے لیس کر دیا۔ اس فہم اور
، بغیر دو فرلانگ لمبی سڑک، کالو بھنگی اور مہالکشمی کا پل جیسی
ن لکھی نہیں جا سکتی تھیں۔ مگر رفتہ رفتہ احتجاج اور نظریات
ن پر اتنا زیادہ ہو گیا کہ وہ افسانے کے فنی لوازم سے قدرے
ہو گئے اور بیشتر افسانوں میں یہ محسوس ہونے لگا کہ سردش
نگ ہو گیا ہے۔ زندگی کی پہلو دار عکاسی کے بجائے نظریاتی
حادی ہو گئے اس دور کے نسارے ہی افسانوں میں غریبی
ری کا فرق اور تصادم کا موضوع آ ہی جاتا ہے چاہئے اس کی
ن ہو یا نہ ہو۔ یہ اثر ۱۹۵۶ء کے بعد ٹوٹا جب کمیونسٹ پارٹی
زمانے کانگریس سے مفاہمت کی پالیسی اختیار کی تاکہ کانگریس
ل بائیں بازو کے رجحانات کو تقویت دی جائے۔ احتجاج کے
ہم ہوئی اور ایک بار پھر کرشن چندر کے اندر کے فن کار کو پنپنے کا
ا۔ اس دور میں انھوں نے شہزادہ، تائی ایسری، روشنی کے
، اور سینوں کا قیدی جیسے افسانے تخلیق کیئے۔ ان میں تائی ایسری
زادہ کا شمار کرشن چندر کے بہترین افسانوں میں ہوتا ہے۔
، افسانوں میں وہ کمرشیلزم کا شکار ہو گئے۔ اور ایسی کوئی
نہ دے سکے۔

افسانہ شہزادہ اپنی تعمیر میں ایک اُداس نغمے کی طرح ہے۔
یں امید و حسرت، تکمیل و حسرت، تکمیل، فراق و وصل اور
ے جذبات و احساسات مل جل کر ایک ایسی سمفنی تخلیق
تے ہیں جو قاری کو مبہوت کر دیتی ہے۔[1] کرشن چندر کی نثر میں ایک
قی کی سی کیفیت ہوتی ہے۔ ایک مبہم جھنجھناہٹ جو مدتوں ہمارے
ں میں گونجتی رہتی ہے۔ شہزادہ میں یہ کیفیت اپنے عروج پر ہے
ن چندر بہت مدھم سروں میں کہانی شروع کرتے ہیں کہ سدھا
وش طبیعت کی ایک شرمیلی لڑکی ہے۔ معمولی خدوخال، ٹھنڈا
ا۔ بچپن ہی سے اکیلے کھیلنے کی عادت ہے۔ مٹی کی گڑیا بنا تی
وران سے باتیں کرتی رہتی ہے۔ یہ عادت کالج میں نفسی

ے کارن راسخ ہو جاتی ہے۔ سدھا کا باپ جیون رام چاندنی چوک
کی ایک دکان میں سیلز مین ہے۔ اس کی حیثیت ایسی نہیں کہ لڑکی کو کالج
میں پڑھا سکے مگر یہ سوچ کر کہ ممکن ہے اس طرح اس کی بات جلد طے
ہو جائے۔ اسے کالج بھیج دیتا ہے۔ سدھا کے نقوش معمولی ہیں اور بظاہر
وہ بالکل سرد لڑکی ہے اس لئے اس بات کا امکان ہے کہ سدھا
کے لئے گھیر گھار کر ہی لڑکا لانا ہوگا۔ مگر اس کے لئے جہد کی ضرورت
ہے وہ کہاں سے لائے۔

اس طرح چند چھوٹے چھوٹے پیراگراف میں وہ کہانی کی بنیاد
ڈال دیتے ہیں۔ پھر کہانی کی رفتار ہولے ہولے کچھ اور تیز ہوتی ہے۔
سدھا کی ماں آخر گھیر گھار کر ایک لڑکے کو لے آتی ہے مگر وہ شادی
سے اس لے انکار کر دیتا ہے کہ اسے جہیز میں اسکوٹر چاہیئے۔ لڑکے
کے انکار پر سدھا کو دکھ نہیں ہوتا بلکہ خوشی ہوتی ہے کیونکہ لڑکا بد
صورت ہے اور پستہ قد۔ اس کے بعد کئی لڑکے آتے ہیں اور انکار
کر کے چلے جاتے ہیں۔ مگر سدھا پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان
میں سے کوئی لڑکا خود اسے پسند نہیں آیا۔ در اصل کسی کو اندازہ نہیں
کہ سدھا اب دوہری زندگی جی رہی ہے۔ باہر سے بالکل سرد، لاتعلق
سی خاموش اور معمولی شکل کی لڑکی مگر اندر سے وہ لاوا ہے۔ اس نے
اپنے اندر ایک تخیلی دنیا بسا لی ہے جس میں وہ بے انتہا خوبصورت
ہے اور خیالوں میں بڑی سندر جگہوں کی سیر کیا کرتی ہے۔

اس انکشاف کے ساتھ اب کہانی میں بے پناہ امکانات پیدا ہو
جاتے ہیں اور قاری کی دلچسپی کہانی میں بڑھ جاتی ہے۔ اسے پتہ ہے کہ
اب وہ کرشن چندر کی پسندیدہ زمین پر ہے یعنی رومان۔ اگرچہ
بقول ظ۔ انصاری کرشن کے افسانوں میں، ناکام افسانوں
تک میں لفظوں کا ایک قدرتی سوتا ہے جو کبھی سوکھتا نہیں، اس
افسانے میں کہیں بھی الفاظ کا بے جا صرف نظر نہیں آتا۔ ہاں کرشن
کا آرٹ تنے ہوئے رستے پر چلنا نہیں۔ ان کے ہاں بڑی گنجائش
اور کشادگی ہے۔ کہانی کو اس طرح اٹھانے کے بعد وہ مرکزی کردار

---

[1] محمد حسن عسکری۔

سے گریز کرے اس کے باپ جیون رام پر آتے ہیں ۔ جیون رام اپنی بیوی سے الجھتا ہے کہ تو نے یہ کیسی لڑکی جنی ہے ۔ جو ہر وقت چپ رہتی ہے نگاہ نیچی رکھتی ہے اور کام میں جٹی رہتی ہے ۔ کپور صاحب کی لڑکیوں کو دیکھو کیسے پھولوں کی طرح مہکتی ہیں ۔

سدھا کی ماں نکمی جیون رام کو جتاتی ہے کہ کپور صاحب سپرنٹنڈنٹ ہیں یعنی معاشی زینے پر قدرے اوپر ۔ ان کی لڑکیوں کو جو سہولتیں حاصل ہیں وہ سدھا کو میسر نہیں ۔ اس طرح کرشن چندر گھر کا تناؤ ، خاندان کی معاشی زندگی اور ماں باپ کی پریشانیوں کا نقشہ کھینچ کر کہانی کو ہر زاویے سے چوکس کر دیتے ہیں ۔

کہانی کا بہاؤ اب تیز ہوتا ہے جیون رام سدھا کو کالج سے اٹھا لیتا ہے اور وہ ٹائپسٹ ہو جاتی ہے ۔ گھر کی حالت کچھ بہتر ہوتی ہے انتہائی کفایت سے پیسے خرچ کرتے ہوئے سدھا کے والدین کچھ رقم پس انداز کرتے ہیں تاکہ اس کے جہیز میں اسکوٹر دیا جا سکے اور بالآخر اسکوٹر کی لالچ میں ایک لڑکا جس کا نام موتی ہے اپنی بہنوں کے ساتھ اسے دیکھنے آتا ہے ۔ سجی سجائی سدھا اسے چائے کی پیالی پیش کرتی ہے لڑکا بہت خوبصورت ہے ۔ وہ مسکرا کر اس کی طرف دیکھتا ہے تو سدھا کے ہاتھوں میں چائے کی پیالی لرزنے لگتی ہے ۔ زندگی میں پہلی بار وہ کسی کو اپنا دل دے بیٹھتی ہے ۔

یہ کہانی کا پہلا اہم واقعہ ہے جو سدھا کی زندگی کو بدل دیتا ہے ۔ اس کے خاموش جیون میں طوفان سا آجاتا ہے ۔ اگلے روز موتی کی بہنیں کہلا بھیجتی ہیں کہ لڑکی انھیں پسند نہیں ۔ ایک سیدھی سادھی لڑکی پر اس انکار کا کتنا گہرا اثر ہوتا ہے ۔ اس کا ذکر ، کرشن چندر فوراً نہیں کرتے ۔ وہ موتی کے انکار پر سدھا کی ماں کے ردِّ عمل کا ذکر کرتے ہیں اور پھر لوگوں کا یہ خیال کہ سدھا کچھ محسوس نہیں کرتی ۔ اس کے بعد وہ بالکل تضاد کے طور پر سدھا کا ردِّ عمل بیان کرتے ہیں مگر راست بیانیہ میں جس میں انشا پردازی بالکل بھی نہیں ۔ یہ بیانیہ براہِ راست قاری کو متاثر کرتا ہے ۔ موسیقی کے ڈوبتے ابھرتے سروں کی طرح ایک ایک لفظ قاری کے ذہن میں اترتا چلا جاتا ہے ۔

" اس دن اس نے دفتر میں اوور ٹائم کیا اور جب اندھیرا خاصا بڑھ گیا تو وہ دفتر سے باہر نکلی اور اپنا بھورے رنگ کا پرس جھلاتی ہوئی سامنے کے آصف علی پارک میں چلی گئی اور بنچ پر تنہا بیٹھ گئی ۔ یہ پارک دہلی گیٹ کے سامنے ایک چھوٹا سا خاموش گوشہ تھا چند پیڑ تھے چند بنچیں تھیں چند قطعے تھے گھاس کے ۔ ان کے چاروں طرف ٹریفک کا شور تھا مگر آج یہاں نسبتاً خاموشی تھی ۔ سدھا ہر روز یہاں آتی تھی اور آدھ پون گھنٹہ اکیلے بیٹھ کر تازہ دم ہوتی تھی ۔"

اس طرح سیدھے سیدھے بیان کرنے کے بعد جس میں ذرا بھی جذباتیت نہیں کرشن چندر سدھا کے دل کی کیفیت کو ماحول کے ذریعے بیان کرتے ہیں ۔

" آج اندھیرا گہرا تھا اور پیڑ کے نیچے گہری خاموشی ۔ پتھر کے بنچ بھی خوب ٹھنڈا تھا ۔ چند منٹ سدھا خاموشی سے اس بنچ پر بیٹھی رہی مگر جب اس کی تکان نہ گئی تو وہ اٹھ کر پیڑ کے نیچے چلی گئی اور تنے سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں ۔

" یکایک کسی نے اس سے کہا ، تم یہاں کیوں بیٹھی ہو ؟ اکیلی ۔ سدھا نے آنکھیں کھولیں ۔ سامنے موتی مسکرا رہا تھا ۔ وہی خوبصورت براؤن سوٹ پہنے ۔ وہی سپید دانتوں والی جگمگاتی ہوئی مسکراہٹ لے "

سدھا کو بچپن سے گڑیاں بنا کر ان سے باتیں کرنے کی عادت ہے اس لیے تصوّر میں موتی سے گفتگو بالکل فطری ہے ۔ تلخ حقایق سے بچنے اور خود کو ناگوار صورت حال سے بچانے کا ایک طریقہ ہے ۔ ذہن کے مضبوط اور ناقابلِ شکست قلعہ میں پناہ لینا اور سدھا وہی کرتی ہے موتی کو وہ دل دے چکی ہے ۔ باہری دنیا سے موتی کے اس تصور کو وہ اپنے تخیل کی مملکت میں لے آتی ہے جہاں اسے کوئی شکست نہیں دے سکتا جس کی وہ مختارِ کل ہے ۔ جہاں ہر چیز اس کی دسترس میں ہے موتی کا یہ تصوّراتی وجود کرشن چندر کے ذہن کی خلاقی اور انسانی نفسیات سے ان کی شناسائی ظاہر کرتا ہے ۔

یہ صورت حال سدھا کے لئے اطمینان بخش ہے ۔ اپنے ذہنی خول میں وہ اس طرح سمٹ جاتی ہے کہ اب اس کا باہر آنا ناممکن ہو جاتا ہے ۔

اس لئے بعد میں جب اس کی ماں کبھی کبھار کسی ایک لڑکے کو لاتی ہے تو وہ انکار کر دیتی ہے اسے اب خارجی سہاروں کی ضرورت نہیں رہی۔ باہر کی دنیا بڑی غیر یقینی ہے، خطرات سے پر۔ اپنے ذہن میں اسنے جس موتی کو بسا لیا ہے اس پر اب کسی کا بس نہیں چل سکتا۔ سینما ہال، پارک، نمائش ہر جگہ وہ اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس کا محبوب اب ہمیشہ اس کے پاس رہتا ہے۔ اس کے علاوہ اسے کیا چاہیے؟ اس تصور کے ساتھ جو وہ رومانی شامیں گزارتی ہے۔ اور تخیل میں جس پیار سے لطف اندوز ہوتی ہے اس کا اثر اس کے خد و خال پر بھی ہوتا ہے۔ اسکی میلی آنکھیں اجلی ہونے لگتی ہیں، سینہ واضح ہو جاتا ہے کمر لچکنے لگتی ہے اور چال میں مستی آجاتی ہے یعنی پیار انسان کو کس طرح کھلا دیتا ہے اس کا بیان کرشن چندر نے بڑے پُر اثر انداز میں کیا ہے۔ سدھا کی ان تبدیلیوں سے گھر والوں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ ضرور ان تبدیلیوں کی تہہ میں کوئی مرد ہے۔ ماں چپکے چپکے جہیز کا سامان تیار کرنے لگتی ہے۔ مگر دن مہینے سال گزر جاتے ہیں سدھا کا باپ کڑھ کڑھ کر مر جاتا ہے کیونکہ محلے والے چہ میگوئیاں کرتے ہیں۔ یہاں پہلی بار کرشن سدھا کے بھائی بہنوں کا ذکر کرتے ہیں کہ اس کی چھوٹی بہن کی شادی ہو جاتی ہے۔ بھائی شادیاں کر کے اپنی اپنی ملازمتوں کے ٹھکانے چلے جاتے ہیں — اس ذکر کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ اب تک کہانی میں ان کا کوئی ذکر ہی نہیں۔ قاری ان کی توقع ہی نہیں کرتا۔ نہ ہی کہانی میں ان کا کوئی کام ہے اس مرحلے پر بھائیوں کا ذکر کرنے سے الٹا قاری کے ذہن میں سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ سدھا کے سلسلے میں انہوں نے کیا کیا۔

بہر حال کہانی اپنے فطری بہاؤ کے ساتھ رفتہ رفتہ عروج پر آرہی ہے۔ کرشن چندر اب سدھا کی چالیسویں سالگرہ کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ کہانی کا سب سے خوبصورت حصہ ہے اور کرشن چندر کی نثر کا بہترین نمونہ۔ اس شام وہ موتی کے ساتھ متھرا روڈ سے جاپانی گارڈن میں ہے۔ آج بھی موتی اس کے تصور میں ایسا ہی ہے بس کنپٹیوں پر سفید بال آگئے ہیں جو اس کی صورت کو اور بھی باوقار بناتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اب وہ چھڑی لے کر چلتا ہے جو سدھا نے خود خرید کر دی ہے۔ اس شام سدھا بہت خاموش ہے اور موتی بھی چپ چپ سا ہے یعنی سدھا کے ذہن میں اب کئی سوالات گردش کر رہے ہیں۔ شاید وہ سوچ رہی ہے کہ اتنا وقت کیسے گزر گیا۔ مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کہیں؟ مگر نہیں انسان ہر حال میں اپنی زندگی کے رائیگاں ہونے کے احساس سے بچنا چاہتا ہے؟

موتی اس سے پوچھتا ہے

'تم نے مجھ سے شادی کیوں نہ کی؟'

انسانی ذہن خود کو کس طرح فریب دیتا ہے اس کی اس سے بہتر مثال کیا ہو سکتی ہے؟ سدھا جس نے ایک خیالی پیکر کے ساتھ زندگی کے اٹھارہ بیس سال گزار دیئے جیسے ایک لڑکا لا پرواہی سے ناپسند کر کے چلا گیا اس کے تصور کو ذہن میں پرورش کرتے کرتے صورتِ حال یہ ہو گئی ہے کہ اس نے پوری سچویشن ہی پلٹ دی۔ اب موتی سدھا سے پوچھ رہا ہے کہ اس نے موتی سے شادی کیوں نہ کی۔ اور سدھا جواب دیتی ہے۔

'ایک دفعہ انکار کرنے بعد —؟' سدھا نے ہولے سے کہا 'تم سے شادی نہیں کی جا سکتی تھی ..... اب تم یہ کیسے جان سکو گے کہ جس دن تم نے انکار کیا تھا اس دن تم میرے ہو گئے تھے ... اتنا جاننے کے لئے عورت کا دل چاہیئے۔"

سدھا کو زندگی نے کچھ بھی نہیں دیا۔ محبت، شادی، بچوں کا سکھ کچھ بھی تو نہیں ملا مگر نہیں وہ اس کا اعتراف نہیں کرنا چاہتی۔ اس کا ہر فریب تخیل یہاں اس کی مدد کرتا ہے۔ اگر یہ ذہنی سہارے نہ ہوں تو انسان کیسے جی سکتا ہے؟ اور کرشن چندر ایسے کرداروں کی تصویر کشی میں ماہر ہیں۔

"میں سوچ رہی تھی" سدھا ہولے سے بولی .... تم سے شادی نہ کر کے میں نے کیا کھویا ہے ..... کیا کوئی شام ایسی تھی جو میں نے تمہارے ساتھ نہ گزاری ہوں سوچو تو کہاں کہاں ہم نہیں گئے؟ جہاں جہاں میں نے تمہیں بلایا، کیا تم وہاں نہیں پہنچے؟ اور جس وقت بھی بلایا گیا اسی وقت سب کام چھوڑ کر تم نہیں آئے؟ اگر شادی کا نام

[illegible]ہے تو وہ مجھے حاصل ہے "۔

"پھر بھی سوچو کہ اس طویل رفاقت میں میرا تمہارا ایک بار بھی جھگڑا نہیں ہوا۔ میں نے تمہیں ہمیشہ مہربان اور مسکراتے ہوئے پایا۔ سالہاسال جب میرے ہاتھوں کو تمہارے ہاتھوں کی ضرورت ہوئی، ان کے لمس [illegible] میں نے اپنے جسم کے روئیں روئیں میں محسوس کی۔ تمہارے [illegible] کی زلفوں میں [illegible] تمہارے بوسے میرے ہونٹوں پر — [illegible] میرے دل میں . . . . کیا کوئی عورت محبت میں اس [illegible] سکتی ہے ؟"

سدھا یہ سب کچھ موتی سے نہیں کہہ رہی اپنے آپ کو سمجھا [illegible]۔ جیسے زندگی میں کچھ بھی نہ ملا ایک تصور کے سوا، اس نے اس تصور کو بھی حرز جاں بنا لیا ہے۔ زندگی کی چالیس بہاریں جس کی یوں ہی گزر گئیں۔ پھول کھلا بھی، مہکا بھی مگر جس کی زندگی میں کوئی گل چیں نہ آیا مگر نہیں یہ زندگی بھی بے تکا نہیں تھی۔ شاید یہ بہت سی زندگیوں سے بہتر تھی۔ شاید قدرت نے اسے بہت سے صدموں سے بچا لیا تھا جو اس سے کہیں سخت ہوتے۔ انسان کی زندگی بہرحال ذہنی ہی تو ہوتی ہے۔ چیزوں سے حقیقت میں وہ جتنا لطف اندوز ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ ان کا تخیل اسے مسرت بخشتا ہے۔ اسی لئے تو وہ فنونِ لطیفہ کا دیوانہ ہے۔ سدھا در حقیقت اب جو آنند لے رہی ہے وہ ممکن تھا کہ شادی ہو جانے پر بھی اسے نصیب نہ ہوتا کیونکہ وہ بچپن سے ہی تخیل میں رہنے کی عادی ہے۔ شاید تصورات کی دنیا اس کے لئے زیادہ حقیقی ہے۔ اس بات کا احساس یوں بھی ہوتا ہے کہ شروع میں چند لڑکے اسے ناپسند کر کے چلے جاتے ہیں تو اسے دکھ نہیں ہوتا۔ حالانکہ ناپسندیدگی کے باوجود کوئی لڑکی یہ نہیں چاہتی کہ خود اسے ناپسند کر دیا جائے۔ بہرحال یہ ذہن ہی کی تو کار فرمائی ہے کہ ایسی ناقابل برداشت سچویشن کو بھی اس طرح قابل قبول بنا دیتا ہے۔

وزیر آغا نے سچ ہی کہا ہے کہ کرشن چندر بنیادی طور پر تخیل پرست ہیں ورنہ شاید وہ سدھا کے باطن میں اس طرح جھانک نہ پاتے۔ پورے افسانے میں سدھا کی داخلی دنیا کو انھوں نے جس خوبی سے بیان کیا ہے وہ وزیر آغا کے قول کی تصدیق کرتا ہے۔ گڑیوں سے کھیلتے ہوئے خود سے باتیں کرنے والی بھی خاموش، کم آمیز بظاہر سرد لاتعلق سے معمول کم رو لڑکی اور وہ عورت جو بیس برس سے دفتر کے معمول میں بندھی ہے اور ذہن تخیلات کی ایک دنیا بسائے ہوئے ہے۔ اگر کسی خاتون افسانہ نگار نے یہ افسانہ لکھا ہوتا تو لوگ اس میں اس کی نجی زندگی کے نقوش تلاش کرنے لگتے۔

خود کو اس طرح سمجھانے کے بعد سدھا اطمینان سے اپنی ذہنی دنیا کو مراجعت کر سکتی ہے۔ جہاں بس وہ ہے اور موتی۔ اور بلغ کی خوبصورت فضا۔ یہ بسنت راگ ہے۔ ملن کا راگ۔ آج اس کا ذہن مطمئن ہے۔ اسے یقین ہو گیا ہے کہ اس کی زندگی رائیگاں نہیں گئی اس کا موتی اس کے پاس ہے جو شادی کر کے بھی ایسی رفاقت نہیں دے سکتا تھا۔

" سدھا نے ایک گہری مسرت سے اپنے آپ کو موتی کے بازوؤں میں ڈھیلا چھوڑ دیا اور پھر اسے ایسا محسوس ہوا کہ موتی کے دو بازو نہیں چار بازو ہیں بلکہ شاید چھ بازو ہیں، آٹھ بازو ہیں اور وہ اپنے جسم کے رگ و ریشے میں اس کے بازوؤں کو محسوس کر رہی تھی جو اسے بھینچ کر سینے سے لگا رہے تھے اور سدھا نے اپنے آپ کو ان بازوؤں کے سپرد کر دیا اور اندر ہی اندر اس طرح کھلتی چلی گئی جیسے چاندنی کے لمس سے کلی کھل کر پھول بن جاتی ہے۔ جھلملاتے تاروں کے جھرمٹ میں سبز جھالروں والے پیڑ کی اوٹ سے چاند ابھر آیا تھا اور اب چاند اس کے بالوں میں تھا۔ اس کی آنکھوں میں تھا۔ اس کے ہونٹوں میں تھا۔ اس کے دل میں تھا اور لہر در لہر اس کے جوشیلے خون میں رواں تھا ہائے میرے موتی چور . . . . میرے موتی چور . . . . میرے میٹھے لڈو . . . . میں تو مر گئی تیرے لئے "۔

وصل کا اتنا خوبصورت بیان اردو نثر میں شاید ہی ملے۔ جس طرح ایک ماہر ستار نواز کی انگلیوں سے سُروں کا جھرنا برستا ہے یہاں الفاظ قاری کے ذہن پر گرتے چلے جاتے ہیں۔ لفظوں کا، سُروں کا ان جھرنا جو بس ایسے لگتا ہے جیسے گرتا ہی رہے گا۔ ایسی نثر۔ اب اس جواب تک ہمیں بس کرشن چندر کے یہاں ہی ملتا ہے۔ جس کی تقلید تو بہتوں نے کی مگر ایسی Sensibility کہاں سے لاتے ؟

شاعروں نے بھی اس کا اعتراف یہ کہہ کر کیا کہ یہ غزل ہے[1]

یہ افسانے کا عروج ہے۔ اس شام کو سدھا تکمیل
۔ جذبے سے دوچار ہوئی ہے۔ ہر چیز مکمل ہے۔ کرشن چندر
الفاظ میں: ایسے لمحے کب کسی کی زندگی میں آتے ہیں۔ اور جب
ہیں تو اس شدت سے اپنا تاثر چھوڑ جاتے ہیں کہ انسان محسوس
تا ہے کہ شاید میں جیا ہی اس لمحے کیلئے تھا۔ شاید کچھ اس طرح
ھانے اس لمحے میں محسوس کیا اور پھر کبھی اس طرح محسوس نہیں کیا۔

اب اس درد انگیز نغمے کا آخری حصہ شروع ہوتا ہے۔
ن چندر اپنی کہانی کو اس قابو کے ساتھ اس کے فطری اختتام تک
اتے ہیں۔ زندگی میں کوئی چیز ایک سی نہیں رہتی۔ نہ خوشی نہ غم۔
الے نازو الے۔ اس واقعے کے چند دن بعد دفتر کا منیجر تبدیل
آتا ہے اور جو نیا شخص آتا ہے وہ سدھا کو پسند نہیں۔ ایک
بدصورت ہے اور پھر اسے دن بھر اس کے ساتھ کام کرنا پڑتا
۔ دوسرے اسے بار بار یہ خیال آتا ہے کہ یہ صورت جانی
پانی ہے۔ اور ایک شام وہی شخص اس پر یہ انکشاف کرتا ہے
دہ موتی ہے جسنے اسے ٹھکرا دیا تھا۔ زمانے کے ہاتھوں اس کا
ہ اس قدر مسخ ہو چکا ہے کہ سدھا اسے پہچان نہ پائی! اب
وہ خود اس کے سامنے شادی کی تجویز رکھتا ہے سدھا ششدر
ائی ہے۔ حقیقت اور تخیل میں اتنا تضاد! وہ اس موتی کو دیکھتی
جاتی ہے۔ جسنے اس کے تصور کو بھی اس سے چھین لیا ہے۔

وہ آصف علی پارک پہنچتی ہے۔ ایک شام یہ بھی ہے۔ ایک شام
بھی جب اسنے اس پارک میں موتی کے تصور کو پایا تھا۔ پھر وہ
ں جو اسنے موتی کے ساتھ گزاری اور وہ شام جب وہ تخیل
جذبے سے دوچار ہوئی۔ پورے افسانے میں شام کا ذکر کہانی
ہیں جھٹ پٹے کی کیفیت، کہیں اندھیرے اور کہیں بجلی کے
ں سے جھانکتے گہرے اندھیرے پیدا کرتا ہے کہیں ملن، کہیں
اور کہیں اداسی کا رنگ۔ یہ شام ویرانی کا رنگ لے کر آئی ہے

سردار جعفری

سدھا پارک کے اندر نہیں جاتی کہ اب اسے پتہ ہے اس کے خیالوں
کا شہزادہ اب کبھی نہیں آئے گا۔ وہ اپنی مانگ کا سیندور سا ڈالتی
اور سہاگ بندیا کھرچ کر پارک کی ریلنگ سے اپنی ساری
چوڑیاں توڑ ڈالتی ہے۔

کسی نے کہا ہے کہ ایک اچھی کہانی اپنے بہترین لمحات میں
لیرک (Lyric) کا لطف دیتی ہے۔ یہ افسانہ اس
خیال کی صداقت کو ظاہر کرتا ہے۔ اس افسانے میں کرشن کا فن
اپنے عروج پر ہے۔ وارث علوی کے الفاظ میں کرشن چندر کے
مضراب کا ہلکا سا لمس ایک لفظ سے ہزار سر پیدا کرتا ہے۔ اور وہ
آوازوں کو سمفنی میں بدل دیتے ہیں اس افسانے میں نہ صرف آوازیں
ہی سمفنی ہیں بلکہ کمپوزیشن بذات خود ایک سمفنی ہے اس میں رنگ
بھی ہیں موڈ۔ حقیقت اور تخیل، امید و حسرت، ملن اور جدائی۔
ایک ہی افسانے میں اتنے رنگ، اتنی کیفیتیں کم ہی دیکھنے میں آتی
ہیں۔ مگر افسوس کہ ایسے افسانے جن میں خامیاں نہیں کے برابر
ہوں کرشن کے پاس کم ہیں۔ اگر مقصدیت کی لے کئی افسانوں
کو متاثر نہ کرتی تو کرشن چندر کے پاس ایسے کتنے ہی افسانے ہوتے
مگر سوائے تائی ایسری کے کرشن چندر کی جھولی میں اس پلے کا
کوئی افسانہ نظر نہیں آتا۔

مضمون نگار حضرات سے گذارش

★ فل اسکیپ کاغذ کے صرف ایک طرف صاف اور خوشخط تحریر فرمائیے۔
★ کاربن کاپی یا زیروکس کاپی کی بجائے اصل مسودہ روانہ فرمائیے، اور آخر میں اپنا نام اور پتہ ضرور لکھ دیجئے۔
★ صرف غیر مطبوعہ تخلیقات روانہ فرمائیے۔ مضامین کی نقل اپنے پاس محفوظ رکھیئے۔
★ غیر مطبوعہ تخلیقات کا معاوضہ دینے یا نہ دینے کا فیصلہ ادارہ کرتا ہے۔ اس سلسلے میں توجہ یا کسی یاد دہانی کی ضرورت نہیں ہے۔

(ادارہ)

م۔ ناگ
۵/۷ مرحوم حمید خان
جیا ٹاکیز کمپاؤنڈ۔ بوریولی (ویسٹ) بمبئی ۴۰۰۰۹۲

باجی

ببلو کب بچپن سے لڑکپن کی طرف بڑھا اسکا احساس نہ باجی کو ہوا نہ ماں کو۔

۔ باجی دوستوں کے سامنے بھی تم مجھے ببلو کیوں کہتی ہو ؟

۔ اچھا۔ تو کیا ظفر احمد کہوں "

۔ ظفر کہو سیدھا "

سب بی اب ظفر بڑے ہو گئے ہیں۔ ان کو بھائی صاحب کہو ماں کہتی

۔ ہاں ہاں بہت بڑا ہو گیا۔ ابھی کچھ کہو تو بس امی کر کے سر نکالنے لگے گا "

۔ چل بھاگ "

— ببلو کسی کے کہنے سننے سے نہ رکا۔ وہ بڑا ہوتا گیا۔ دھیرے دھیرے سب کچھ اس کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ دوستوں کی بات چیت سے، چھپ چھپا کر کتابیں پڑھنے سے ایک نئی دنیا اس پر آشکار ہونے لگی تھی۔ اور وہ حواس باختہ رہ گیا تھا— کیا یہ سب سچ ہے، پھر کیا باجی کو بھی سب کچھ پتہ ہے ؟ وہ اب باجی پر نظر رکھنے لگا تھا۔ اس کے طور طریقے بدلنے لگے تھے۔ اب وہ بستر پر پڑا اینڈتا نہ رہتا۔ نہانے کے بعد سلیقے سے کپڑے پہنتا۔ جب باہر جانے لگتا تو آئینے کے سامنے کافی وقت گذار دیتا۔ اور کتنا سجیلا لگتا !

۔ باجی کل کریم کے ساتھ کیا باتیں چل رہی تھیں ؟ "

۔ کس کے ساتھ ؟ "

۔ کریم خاں کے ساتھ "

۔ کب ؟ "

۔ جیسے کچھ پتہ ہی نہیں ! کل پارک کے پاس "

۔ اوہ — کریم خان — وہ ہمارے میگزین کا ایڈیٹر ہے۔ میری نظم سے متعلق بات چیت کر رہا تھا۔ وہ خود نظمیں کتنی اچھی لکھتا ہے "

۔ گدھا کہیں کا ! "

۔ ظفر گالی کیوں دیتا ہے ؟ ممی سے کہوں گی میں "

۔ ضرور دوں گا گالی — بڑا آیا نظمیں لکھنے والا "

۔ ٹھیک ہے۔ تو باہر جا۔ مجھے کپڑے بدلنے دے "

۔ اپا — ببلو کے مونچھیں نکلیں "

۔ اش — کہاں۔ چل کچھ نہیں "

"ارے۔ یہ دیکھ"
"باجی چپ"
"ارے ظفر، ایک چپاتی کھالے۔ کیوں ہر وقت اس کے پیچھے لگی رہتی ہو۔ دیکھ چلا گیا نا؟"

"باجی اوشا کے ساتھ مت گھوما کرو"
"کیوں تیرا کیا جاتا ہے؟"
"بے کار لڑکی ہے اوشا۔ لوگ کیا کیا باتیں کرتے ہیں اس کے بارے میں"
"ظفر! آج کل تو بہت حکم چلانے لگا ہے"
"کچھ برا کہا کیا؟"
"مگر تجھے کیسے پتہ چلا کہ وہ خراب ہے؟"
"ماننا ہے تو مانو ورنہ چھوڑو۔ لیکن تم اسکے ساتھ مت گھوما کرو"

"آج کالج سے تم نالے کے راستے کیوں لوٹ رہی تھیں؟"
"کب"؟
"آج دوپہر کو"
"تو کیا ہوا"
"کچھ ہونا چاہیئے کیا؟ وہاں بنگلے میں بیٹھ کر لڑکے فقرے چست کرتے رہتے ہیں"
"کرنے دو ___ لڑکوں سے کون ڈرتا ہے"
"امی تم کہو نا اس سے"
"زمانہ خراب ہے بے بی۔ لوگوں کی نظریں گندی ہوتی ہیں۔ اوشا سے بھی کہو"
"مگر امی یہ کون ہوتا ہے میری نگرانی کرنے والا؟ ___ تو کیوں بنگلے میں گیا بول ___ اب بول؟"
"کیوں جھگڑتے ہو۔ اری تو بڑی ہے نا اس سے۔ ذرا سمجھ داری سے رہو۔ کب یہ سمجھنا جائے گا؟"

جملوں کے مطلب، اندرون مطلب، دو معنی والے لفظوں میں چھپے ہوئے مفہوم وہ سب کچھ جان رہا تھا۔ باجی کو بھی کوئی ایسی نظروں سے دیکھتا ہوگا جیسے دوسری لڑکیوں کو دیکھا جاتا ہے ___ اسی وسوسہ سے وہ پریشان ہو گیا۔ وہ باجی کی کتابیں، کاپیاں، بیگ میں جانے کیا ڈھونڈتا رہتا۔
"ظفر اوشا بھاگ گئی"
"کیا ___؟"
"ارے اوشا بھاگ گئی اور اس نے شادی کر لی"
"کس کے ساتھ"؟
"معلوم نہیں"
"اسی روی کے ساتھ کی ہوگی شادی"
"ہاں! آپا۔ تیرے کو کیسے معلوم؟"
"سب کو معلوم ہے۔ پاگل ہے اوشا"
"پاگل کیا؟ وہ پیار کرتی تھی روی سے اور چاچا چاچی ملنے نہ دیتے"
"پیار ___ یعنی کیا؟"
"تو نہیں سمجھے گا ابھی"
"میں سب سمجھتا ہوں"

ببلو سوچتا رہا کہ وہ کیوں کر باجی کو دنیا سے چھپا کر رکھے۔ رات اس نے خواب دیکھا کہ وہ بہت خوش ہے اس کے پاس ایک بہت بڑی ٹوکری ہے۔ بانس کی ایک بہت بڑی ٹوکری اور اس ٹوکری میں ببلو نے باجی کو بند کر دیا ہے۔

صبیحہ موہانی سحر
سی - ۱۷۱، کریلی - الہ آباد

منی افسانہ

وہ میرے پیچھے بہت تیزی سے بھاگا چلا آرہا تھا
میں نے اور تیزی سے بھاگنا شروع کر دیا
اُس کی رفتار اور تیز ہوگئی
میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا
وہ میرے بالکل قریب آچکا تھا۔
میں بہت تھک گئی تھی میری سانس پھول رہی تھی
میں سستانے کے لیے رک گئی وہ میرے قریب آکر رک گیا
میں نے جھنجھلا کر پوچھا تم میرا پیچھا کیوں کر رہے ہو ؟
وہ مسکرایا اُس کی مسکراہٹ میں تلخی چھپی ہوئی تھی
وہ میرے قریب آکر راز دارانہ انداز میں بولا
نادان ، تو مجھ سے بھاگ رہی ہے ۔ مجھ سے اپنا پیچھا چھڑانا چاہتی ہے۔
مگر یہ مت بھولنا کہ اگر میں چلا گیا تو تو بالکل اکیلی ہو جائے گی۔ تیرا
دامن خالی ہو جائے گا۔
میں نے قدرے تعجب سے پوچھا
مگر تم ہو کون اور اس طرح سے کیوں میرے پیچھے پڑے ہو ؟
وہ بولا ، میں غم ہوں غم سبھی مجھ سے اپنا پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں۔
سبھی اپنے دامن میں زمانے بھر کی خوشیاں سمیٹ لینا چاہتے ہیں۔
مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ اگر غم نہیں ہوگا تو خوشی کے وجود کو لوگ
کیسے محسوس کریں گے ۔ نادان تھوڑا سا غم لے لے ورنہ پچھتائے گی ۔

میں اس کی باتوں میں آگئی اور بڑھ کر میں نے اپنا دامن پھیلا
اُسنے ڈھیر سارے غم میرے دامن میں ڈال دیئے۔
میرا دامن غموں کے بوجھ تلے اتنا بھاری ہو گیا کہ ایک قدم بھی
آگے بڑھنا میرے لیے دوبھر ہوگیا۔
میں نے چاہا کہ تھوڑے سے غم اُسے واپس کر دوں
لیکن یہ کیا ؟
وہ بہت دور کھڑا مسکرا رہا تھا
میں اپنے دامن میں غموں کو سمیٹے دھیرے دھیرے آگے بڑھنے
لگی ۔ لیکن میں آج تک اپنی منزل پر نہیں پہنچ پائی ہوں کیوں کہ
غموں کے بوجھ تلے میں دبی جا رہی ہوں یہ میرا پیچھا بھی نہیں چھوڑ
رہے ہیں۔
اور وہ میرے دامن کو بھر کر ایسا غائب ہوا کہ آج تک نہیں ملا
اور میں ہر روز کچھ راستہ طے کرنے کے بعد سوچتی ہوں کہ کاش
ایک بار صرف ایک بار میری اُس سے ملاقات ہو جائے تو میں
اپنا تھوڑا بوجھ ہلکا کر لوں اور اُس سے پوچھوں کہ اتنی بڑی
کائنات میں کیا میرے علاوہ اُسے اور کوئی نہیں ملا ۔
کاش ! ایک بار صرف ایک ....

——— - ———

مظہر سلیم

روشن چراغ

اداکارہ نوتن کا شمار ہندی فلموں کے ان اداکاران میں ہوتا ہے جنھوں نے سینما شائقین اور فلم بینوں کیلئے اداکاری کے ٹرینڈ کی بازیافت کی ہے اور اپنی محنت، مشقت اور لگن سے ہندی فلموں میں اپنا منفرد مقام بنایا ہے اور اداکاری کی ایک ایسی روایت کو جنم دیا ہے جسے آج بھی نئی نسل کی اداکارائیں نقشِ پا تصور کرتی ہیں، شبانہ اعظمی، سمیتا پاٹل کی اداکاری کو دیکھ کر ہمیں فوراً نوتن یاد آتی ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے ان اداکاراؤں نے نوتن کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔

• اناڑی میں نوتن، راج کپور اور موتی لال

نوتن کا تعلق بھی ہندی کی انھیں چند مشہور و معروف اور اپنے وقت کی نہایت اہم، خوبصورت اور قابل قبول اداکاراؤں سے ہے مثلاً نرگس، مدھو بالا اور مینا کماری۔ ان اداکاراؤں کی فنکارانہ صلاحیتوں سے کیسے انکار ہوسکتا ہے اس طرح نوتن بھی ایک باصلاحیت اداکارہ تھی جو آج ان تمام اداکاراؤں کی طرح اس جہان فانی سے کوچ کر گئیں۔

اداکارہ نوتن ۴ر جون ۱۹۳۶ء کو مشہور مراٹھی اسٹیج اداکار کمار سین سمرتھ اور شوبھنا سمرتھ کے گھر پیدا ہوئی۔ نوتن کے والد و والدہ دونوں ہی اپنے زمانے کے اداکاروں میں شمار کئے جاتے ہیں جن کی شہرت اسٹیج سے لے کر پردۂ سیمیں تک نہیں تھی بلکہ یہ دونوں اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کی بدولت اپنے شائقین کے دلوں پر بھی راج کر رہے تھے اور اپنی اداکاری اور فنکاری کا لوہا بھی منوا رہے تھے۔

اس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ گھر کا ماحول ابتدا سے ہی فلمی رہا تھا۔ اسی لئے نوتن کو فطری طور پر بچپن سے اداکاری کا شوق بھی رہا ہے اور اسی شوق کو دیکھتے ہوئے

نوتن ششی کپور کیساتھ

ہیرو بلراج ساہنی تھے - اور اس میں بڑی خوبصورتی سے اہنسا اور ہنسا (تشدد اور عدم تشدد) میں زبردست جنگ دکھائی گئی تھی، سیما میں اداکاری کا بہترین ایوارڈ نوتن کو پہلی بار فلم فیئر ایوارڈ کی شکل میں دیا گیا ۱۹۵۹ء میں بسل رائے کی مشہور فلم "سجاتا" میں نوتن نے دوبارہ بہترین اداکاری کا اعزاز حاصل کیا۔ یہاں پر اس نے بس نہیں کیا بلکہ ۱۹۶۳ء میں بمل رائے ہی کی فلم "بندھنی" اور ۱۹۶۷ء میں پرساد پرودکشن کی فلم "ملن" اور ۱۹۷۸ء میں راج کھوسلہ کی فلم "میں تلسی تیرے آنگن کی" کیلئے نوتن نے اپنی لافانی اداکاری سے بہترین اداکارہ کا ایوارڈ حاصل کیا۔

یہ ایوارڈ نوتن کو ان کے بے لوث محنت اور مشقت کے نتیجے میں ملے، اس میں نوتن کی خوش اخلاقی اور خوش مزاجی شامل تھی۔

نوتن کی یہ ایک خصوصیت رہی ہے کہ وہ جو بھی کردار ادا کرتی تھی اسے بڑی ذمہ داری اور سنجیدگی کے ساتھ نبھاتی تھی اور اس کردار کی گہرائیوں میں اتر جاتی تھی ان کے کرداروں میں ایک ایسی فرحت بخش زندگی ہوتی ہے جو Living Force کو تروتازہ کرتا تھا لیکن ان سب سے اہم اور مخصوص کردار صرف جہد مسلسل اور کشمکش سے بھی ابھرتا ہے۔ شاہد لطیف کی فلم "سونے کی چڑیا" میں نوتن نے ایک ایسی اداکارہ کا کردار نبھایا تھا جسے اس کے رشتہ دار عیش و آرام کی زندگی کے لئے اس کا استعمال کرتے ہیں اس رول میں نوتن ایک مظلوم اور لٹی پٹی اور مکمل طور پر ایک پسی ہوئی عورت کے کردار میں ابھرتی ہے۔

نوتن نے فلموں میں ہلکے پھلکے اور معمولی کردار بھی ادا کئے ہیں۔ گلیمر رول بھی کئے ہیں اور اپنے مزاج سے ہٹ کر کردار بھی نبھائے ہیں۔ "دلی کا ٹھگ" میں نوتن نے ایک سنسنی خیز و عجیب رول کیا تھا کیوں کہ اس فلم میں نوتن نے سوئمنگ کسٹیوم

"Swimming Costume"

پہنا تھا جو نوتن کی دیگر فلموں اور کرداروں سے بالکل میل نہ کھاتا تھا اور ایک سنجیدہ اور جذباتی اداکارہ کے امیج کی کی غلط تصویر بھی پیش نہیں کرتا تھا کیونکہ اس سے تو یہ پتہ چلتا تھا کہ نوتن کسی بھی چیلنج کو قبول کر کے اپنے کردار کی خوبصورتی اور روح کی پاکیزگی کو ہمیشہ بچاتی رہے گی۔ اور پسند کی جاتی رہے گی۔

کیونکہ سوئمنگ ڈریس پہننے کا مطلب عریانیت کا مظاہرہ۔

نوتن، رشیش دیو، سرسوتی چندر کے ایک سین میں

تن کے والد کمار سین سمرتھ نے ۱۹۴۵ء میں بنی اپنی ذاتی
م "نل دمینتی" میں ایک چھوٹا سا کردار نبھانے کا موقعہ دیا اس
قت نوتن کی عمر تقریباً ۹ سال تھی اس فلم میں نوتن کی والدہ
ہیروئن کا کردار نبھایا تھا اور اس فلم کے ہیرو تھے پرتھوی
ج کپور۔ ۱۴ سال کی عمر میں نوتن مس انڈیا چنی گئیں۔ اور
ی عمر میں نوتن نے اپنی فلمی زندگی کا بلکہ یوں کہہ سکتے ہیں کہ
کارانہ زندگی کا آغاز ۱۹۵۰ء میں بنی فلم "ہماری بیٹی"
ے کیا اور اس کے بعد تو نوتن کو اسٹوڈیو کی دیو پیکر لائٹس
ور کیمرے سے پیار ہو گیا تھا۔

فلموں کا پورا ریکارڈ دیکھیں تو بخوبی اس بات کا پتہ
ل جائے گا کہ "ہماری بیٹی" یہ فلم باکس آفس پر کوئی خاطر
خواہ کامیابی حاصل نہیں کر سکی تھی۔ لیکن یہ ضرور ہوا کہ ہماری
ی اس فلم کے بعد نوتن کو دلشکھ پنچولی کی فلم نگینہ میں
ہیروئن کا رول مل گیا اس فلم میں ناصر خان دلیپ کمار کے
بھائی) نے ہیرو کا رول نبھایا تھا۔ نگینہ ADULT فلم تھی
یہ فلم باکس آفس پر کامیاب بھی رہی تھی مگر نوتن ایکٹریس کے
روپ میں پہلی بار فلم بینوں سے متعارف ہوئیں اس فلم

نوتن اور دیوآنند "پیئنگ گیسٹ" میں

میں بلراج ساہنی جیسے منجھے ہوئے اداکار کے مقابل نوتن کو
ہیروئن کا رول نبھانا تھا تب تک نوتن نے سوئزرلینڈ جا کر
اپنی تعلیم بھی مکمل کر لی تھی مگر سوئزرلینڈ سے اسے اس لئے واپس
آنا پڑا کہ نوتن کی گھریلو حالت خراب ہو چکی تھی۔

۱۹۵۱ء میں نوتن نے "ہنگامہ"، "آغوش"، "شبنم"، "ماکھن"
"پربت"، "لیلیٰ مجنوں" اور "شباب" کئی فلموں میں کام کیا لیکن
جس فلم سے نوتن کا نام مدھو بالا، نرگس اور مینا کماری کے
ساتھ لیا جانے لگا وہ فلم تھی "سیما" بالکل عام ڈگر سے
ہٹ کر فلم تھی، یہ فلم ۱۹۵۵ء میں منظر عام پر آئی۔ سیما میں نوتن
نے ایک بالکل مختلف اور ایک چونکا دینے والا رول کیا تھا
کیونکہ اسوقت عام طور پر ایک ہی رول اداکارائیں کرتی تھیں
مگر نوتن کے لئے یہ رول مختلف تو تھا ہی مگر ایک تجربہ بھی تھا
اور یہ تجربہ صرف نوتن ہی کیلئے نہیں بلکہ فلم بینوں کیلئے بھی
تھا۔ اس فلم میں نوتن کا ایک ملزمہ کے کردار میں جلوہ گر
ہوتی ہیں وہ ایک ایسی لڑکی تھی جو یتیم ہے اور چوری
کے جھوٹے الزام میں اسے جیل بھیجا جاتا ہے اس فلم کے

نہیں تھا بلکہ اس رول کا مطالبہ تھا۔ اس طرح نوتن کی بہترین اور یادگار فلموں میں "اناڑی" "چھلیا" "سورت اور سیرت" اور خاص طور پر دیو آنند کے ساتھ "پئینگ گیسٹ" "بارش" "منزل" "تیرے گھر کے سامنے" وغیرہ میں نوتن اپنے مخصوص کردار کی وجہ سے یادگار بن گئی ہے۔ دیو آنند نوتن کے فلموں کے کامیاب بیرو رہے ہیں۔ کیوں کہ ان فلموں میں نوتن اور دیوآنند پر جو گیت فلمائے گئے ہیں وہ بے حد ہٹ ہوئے ہیں۔ اور آج بھی بڑے ذوق وشوق سے سنے جاتے ہیں۔

۱۹۶۸ء کے بعد بمبئی کی فلمی دنیا میں کافی اتھل پتھل ہوئی تو نوتن نے جنوبی (دکھشن بھارت) کا رخ کیا۔ اور "خاندان" "بھائی بہن" "گوری" "ملن" "سبھی" کامیاب اور بہترین فلمیں شائقین کو دیں۔

جو بہترین ہی نہیں بلکہ یادگار فلمیں ہیں اور آج بھی پسند کی جاتی ہیں یہ دور ۱۹۷۴ء تک چلا اس کے بعد نوتن نے ایک سپر ہٹ فلم غیر متوقع طور پر دی جس کا نام "سرسوتی چندر" تھا۔ نوتن کا کردار اس فلم میں نہایت ہی خوبصورت اور اہم تھا ۱۹۷۳ء کے بعد نوتن ایک عرصہ تک فلموں سے غائب رہیں

اور دور دور تک دکھائی نہیں دی، لیکن نہ فلمیں ان سے زیادہ دور رہ سکتی تھی اور نہ وہ فلموں سے۔ محمود کی فلم "جنی اور جانی" سبھاش گھئی کی فلم "کرما" اور "میری جنگ" سے انھوں نے کریکٹر رول ادا کرنا شروع کر دیا تھا۔ "میری جنگ" کے لئے انھیں بہترین معاون اداکارہ کے ایوارڈ سے بھی نوازا گیا ان فلمی اعزازات کے علاوہ نوتن کو پدم شری کے قومی اعزاز سے بھی نوازا گیا۔

آخر میں نوتن کے بارے میں وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ مدھوبالا، مینا کماری اور نرگس کے بعد جو فلمی دنیا میں خلا پیدا ہوا ہے شاید ہی وہ کبھی پر ہو سکے کیوں کہ نوتن کی موت صرف ایک اداکارہ کی موت نہیں بلکہ ایک عہد کا خاتمہ ہے خوش مزاج اور خوش اخلاق کی ایک روایت کا خاتمہ ہوا ہے۔

★ مہدی پرتاپ گڑھی
معرفت ایکزیکیٹو انجینئر، اری گیشن ڈویژن
پرتاپ گڑھ (یوپی)

ہولی کی شام

کیسا زرتاب و زر افشاں ہے جہاں آج کی شام
لائق دید ہے ہستی کا سماں آج کی شام

شاہراہوں پہ وہ چھڑکاؤ ہے پچکاری سے
ہر طرف رنگ کا دریا ہے رواں آج کی شام

زلف مشکیں سے ٹپکتا ہے گلابی..... پانی
ہو گئے عارض و لب نور نشاں آج کی شام

رنگ میں ڈوب کے کچھ اور نکھر آیا ہے
کس قدر کیف میں ڈوبا ہے جہاں آج کی شام

اٹھی پچکاری، چلا رنگ، فضا جھوم اٹھی
بن گئی عین خموشی بھی زباں آج کی شام

نکہت و رنگ میں انسان کے غم ڈوب گئے
زیست ہے بے خبر سود و زیاں آج کی شام

تو کہاں ہے مرے خوابوں کی شہزادی۔
گم ہے کیوں میری محبت کا جہاں آج کی شام

دیکھ کر کیف میں ڈوبے ہوئے لمحوں کا خرام
جاگ اٹھا سینے میں اک درد نہاں آج کی شام

پھاگ کے نشے میں مخمور ہے عالم مہدی
کاش سو جائے مرا درد نہاں آج کی شام

ساحر کلیم
نیشنل اردو اسکول
پوسٹ: سلوڑ ضلع اورنگ آباد
(مہاراشٹر) ۴۳۱۱۱۲

غزل

گھر وہ شیشے کا بنانے نہیں دیتا مجھکو
پتھروں میں بھی سمانے نہیں دیتا مجھکو

گاؤں جلتے ہیں بجھانے نہیں دیتا مجھکو
آگ شہروں میں لگانے نہیں دیتا مجھکو

یوں تو بن جاتی ہے تصویر عالم ناسوت
خود کی تصویر بنانے نہیں دیتا مجھکو

دل بھی شہروں میں بہلنے نہیں دیتا میرا
ہائے جنگل میں بھی جانے نہیں دیتا مجھکو

چاند بدلی میں کھو جاتا ہے اکثر لیکن
آئینہ خود کو چھپانے نہیں دیتا مجھکو

خود وہ طوفان اٹھاتا ہے زمانے میں بہت
ایک طوفان اٹھانے نہیں دیتا مجھکو

ظلم ایسے بھی وہ کرتا ہے سدا ساحر پر
رو دیتا ہے تو منانے نہیں دیتا مجھکو

★

سید حباب ترمذی

قطعات

(۱)

کیوں نہ رہبر ہو آسماں مرا کیوں نہ بادل ہو سائبان مرا
میں کہ فرہاد کے قبیل سے ہوں تیشہ و سنگ ہے نشان مرا

(۲)

صرف کاغذ پہ پیار کرکے مجھے کیا ملا بے قرار کرکے مجھے
بندہ پرور! حسین لفظوں سے خوش نہ ہوں سنگسار کرکے مجھے

(۳)

لالہ زاروں سے تیری مانگ بھروں نو بہاروں سے تیری مانگ بھروں
تیرا ملنا محال ہے ورنہ چاند تاروں سے تری مانگ بھروں

(۴)

رازِ سربستہ کھولنے والے زہر امرت میں گھولنے والے
تو نے اپنا بھی دل ٹٹول لیا میرے دل کو ٹٹولنے والے

(۵)

زلفِ گیتی سنوارنا ہے محال کل سے نازک ہے آج صورت حال
دست بردارِ آدمیت ہے اور کیا ہوگا آدمی کا زوال

(۶)

عقل حیراں ہے سرنگوں ہے قیاس رنج و غم پر ہے زندگی کی اساس
اے مسرت سے کھیلنے والے چھین لے مجھ سے تو مرا احساس

(۷)

ذرّے سے آفتاب کرکے مجھے شاعرِ لاجواب کرکے مجھے
شیلف میں جیسے رکھ دیا تم نے بند مثلِ کتاب کرکے مجھے

(۸)

مہرباں و شفیق مل جائے خوش مزاج و خلیق مل جائے
زندگی اداس راہوں میں کاش کوئی رفیق مل جائے
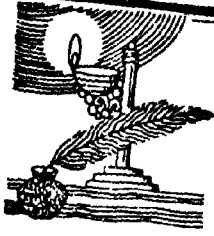
علی احمد جلیلی
جلیل منزل، جلیل روڈ، سلطانپورہ
حیدرآباد (آندھرا پردیش) ۵۰۰۰۲۴

دو غزلیں۔ دو رنگ

○

شمع محفل ہوں بجھاؤ گے تو پچھتاؤ گے
بجھ گیا میں تو اجالوں کو ترس جاؤ گے

ہاتھ گلشن کی سیاست سے بچائے رکھنا
ورنہ پھولوں کی لطافت سے بھی جل جاؤ گے

حدِ آداب سے ہم بڑھتے نہیں ہیں ورنہ
بڑھ گئے ہاتھ تو دامن نہ چھڑا پاؤ گے

تم تو عنوانِ سحر بن کے چلے تھے لیکن
کیا خبر تھی کہ چراغوں سے بہل جاؤ گے

بادلو آئے تھے تم پیاس بجھانے میری
میں نہ سمجھا تھا چٹانوں پہ برس جاؤ گے

وہ تو الفاظ کے پردے میں چھپا رہتا ہے
لاکھ ڈھونڈو علی اطہر کو نہیں پاؤ گے

○

اوروں کیلئے ساقی سب کچھ تو روا رکھنا
مرے لئے آنکھوں کے دو جام اٹھا رکھنا

جھونکے مری یادوں کے کیا جانے کب آجائیں
تم دل کے دریچوں کو راتوں میں کھلا رکھنا

سوتی ہیں یہاں کتنی ناکام تمنائیں
آہستہ قدم دل پر اے بادِ صبا رکھنا

میں جلد ہی آؤں گا ساون کی گھٹا بن کر
تم موسمِ گرما کی کچھ پیاس بچا رکھنا

کیا جانے کرم اس کا کب جوش میں آجائے
تم ہاتھ علی اپنے مصروفِ دعا رکھنا

م، ش، نجمی
۳/۱۳۱۔ خلیل چال۔ مقابل، ایل۔ آئی۔ جی کالونی
دی۔ جاودے نگر، پائپ روڈ، کرلا، بمبئی ۷۰

گھٹا ظلمت کی چھائی تھی اجالا دے دیا میں نے
اٹھا کر اپنے آنگن کا سویرا دے دیا میں نے

طلب سے تھا علاقہ، عالم تشنہ لبی تجھکو
تو قطرہ مانگنے آئی تھی دریا دے دیا میں نے

تو میری ذات کی معصوم خاموشی میں رہ زندہ
صدائے نفس جا تجھکو دھوکہ دے دیا میں نے

وصیت سر چھپانے کی بڑی آزردہ خاطر تھی!
ہوائے لامکانی کو گھروندے دے دیا میں نے

ہمارے خون کی سرخی سے سبزہ لہلہاتا ہے!
گریباں چاک دھرتی کو لبادہ دے دیا میں نے

خدایہ پوچھتا ہے اور بھی کچھ چاہیئے نجمی
تجھے جو چاہیئے تھا دیدیا، کیا دے دیا میں نے

مئو

ناصر شکیب
۳۰۔ یوسف مینجن ہاؤس، پہلا منزلہ
چودھری محلہ۔ کلیان ۔ ۴۲۱۳۰۱
ضلع تھانہ (مہاراشٹر)

کھانے تھے جتنے زخم وہ ماتھے پہ کھا چکا
پتھر کدھر سے آئے تھے سب کچھ بھلا چکا
میں کھو چکا ہوا میں تعقب نہ کر مرا!
تیری پہنچ سے دور بہت دور جا چکا
ہوگی نہ دل میں اب کبھی یادوں کی روشنی
جلتا ہوا چراغ میں خود ہی بجھا چکا
اُس نے بھی امتحان لیے میرے بارہا
اچھی طرح سے میں بھی اُسے آزما چکا
آنکھوں میں انتظار کے تو پھول مت کھلا
آنے کا تیرا وعدہ ہے لیکن تو آ چکا
اچھا ہوا کہ ختم ہوئی داستانِ عشق
کچھ میں بھلا چکا ہوں تو کچھ وہ بھلا چکا
رُودادِ عشق اتنی مجھے یاد رہ گئی!!!
کچھ پل سنہرے ہاتھ لگے تھے گنوا چکا
کیوں آزما رہا ہے مری تشنگی کو تو!!
میں تو سمندروں کو بدن میں سما چکا
ناصر چلو کہ اب نہیں آئے گا وہ کبھی
وعدوں کے اعتبار کا موسم بھی جا چکا

مئو

نام کتاب : موجِ صبا (شعری مجموعہ)
نام شاعر : صبا سیکری
پبلشر : بزمِ احباب، ۳۵ بیچ ریسٹورنٹ، حوہو، کولی واڑہ، سانتاکروز، بمبئی
صفحات : تین سو اڑسٹھ ۳۶۸
قیمت : اکیاون روپے ۵۱

صبا سیکری کا شمار بمبئی کے ان شاعروں میں ہوتا ہے جن کو اہلِ فن کے ایک مخصوص حلقہ میں خاصی پذیرائی اور مقبولیت حاصل ہے وہ نرم گفتار، شائستہ اور مخلص ہونے کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کے پارکھ اور عروضی نوک و پلک کے رمز آشنا ہیں۔

آرزو اسکول کا نمایاں وصف سادگی و پُرکاری اُن کے اشعار میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔

اپنے بارے میں تعارفی کلمات لکھتے وقت انھوں نے جس سادگی سے اپنی بات کہی ہے وہ انھیں کا شیوہ اور ان کے باطنی خلوص کا آئینہ ہے۔

"صحیح تعارف تو یہ ہے کہ آپ میں سے ایک ہوں اور اس طرح آپ کے لیے اجنبی نہیں، صرف شناخت کے لیے عرض ہے کہ سیکر (راجستھان) میرا وطن ہے۔ آبائی پیشہ 'بنائی' اور اسی مصروفیت نے بمبئی کو وطنِ ثانی بنا دیا۔ یہیں پروان چڑھا، یہیں انجمنِ اسلام ہائی اسکول سے میٹرک کیا۔ سنہ ۴۹ء میں لاہور یونیورسٹی سے ادیب فاضل کیا، اور پھر سلسلۂ تعلیم ختم کر کے عمارت سازی کے آبائی پیشے سے منسلک ہوگیا۔ شاید سنہ ۴۷ء میں شعر گوئی شروع کی"۔

اس طرح ان کی شاعری کا یہ مجموعہ ان کی چوالیس سالہ عمرِ شاعری کا لکھا جوکھا ہے۔ (غزلوں کی حد تک) ۔ صبا صاحب نے باقاعدہ جانشین آرزو لکھنوی علامہ پرتو لکھنوی سے کسبِ فیض کیا۔ اور اپنے اشعار میں شعوری طور پر یہ کوشش کی کہ محاورہ، روزمرہ، ندرتِ تراکیب، برمحل تشبیہات، اور مفید تلمیحات کو وہ پوری شائستگی سے نظم کر سکیں اور ان کا مجموعہ پڑھنے کے بعد یہ بات بجا طور پر کہی جا سکتی ہے کہ وہ اپنی اس کوشش میں پوری طرح کامیاب ہیں۔

مسرت کی بات یہ ہے کہ عمارت سازی کے مصروف ترین پیشہ کے علاوہ اولاد کی معقول تعلیم و تربیت کے ساتھ انھوں نے جس انہماک سے اپنے شعری سفر کی روایتوں کا احترام برقرار رکھا وہ معمولی بات نہیں ہے۔

صبا صاحب کی شخصیت سے جو لوگ پوری طرح واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ روایتوں کا احترام، پاسِ شرافت اور وضعداری اُن کے ایسے نمایاں اوصاف ہیں جن کے بغیر وہ سانس بھی نہیں لے سکتے۔ یہ بات میں نے محض تعریف میں نہیں کہی ہے۔ بلکہ یہ وہ اجزائے ترکیبی ہیں جن سے صبا صاحب کی شاعری کا خمیر اٹھا ہے۔

کچھ وضع کے پابند بھی ملتے ہیں جہاں میں
دیرینہ روایات کو معدوم نہ سمجھو

○

ترقی آدمی نے کی یقیناً
مگر اخلاق گرتا جا رہا ہے

ایسا انسان پرستش کے ہے لائق جس کے
دل میں اوروں کے لیے جذبۂ قربانی ہے

○

پریشانی سے میرے بعد والوں کو تو راحت ہو
ترے کوچے میں جتنی بلائیں میں لگا لایا!

○

جو نہ تھے اعتماد کے قابل
ہم نے اُن پر بھی اعتماد کیا
اس سے بڑھ کر نہیں کوئی نیکی
کسی ناشاد کو جو شاد کیا

○

محل کے مکینوں میں چھوٹا بڑا کیا
کنیزیں بھی شامل ہیں شہزادیوں میں

○

دیتا ہے کون ہاتھ اٹھا کر یہاں بھلا
جو چیز کھو گئی ہے وہی خیرات ہو گئی

ان چند اشعار کے آئینے میں صبا اکبرآبادی کی شرافتِ نفس اور طرفداریٔ حق کے کئی واضح عکس نمایاں ہیں۔

دولت کے تماشے دیکھ کر دولت کی اصل سمجھنا اور اپنے کردار کی محافظت کرنا کوئی صبا اکبرآبادی سے سیکھے۔ شاعری اُن کے لئے تنہا وسیلۂ اظہار ہے جس کے ذریعہ اُنھوں نے اپنے مزاج کی شرح بھی کی اور احترامِ انسانیت کے چراغ بھی روشن کئے۔

جو میرے نصیب میں ہے لکھا مرے کردگار ضرور دے
مگر اک دُعا بھی قبول کر مجھے اس عطا کا شعور دے

○

فرصتِ عیش مجھے گردشِ ایام نہ دے
فکرِ آرام کروں اتنا بھی آرام نہ دے

اِن اشعار کی روشنی میں فیصلہ کرنا دشوار نہیں ہے کہ جہدِ مسلسل کامرانی اور کامرانی کے بعد فراغت کی منزلوں سے ہمکنار ہوتے ہوئے صبا اکبرآبادی نے ہر قدم پر محتاط روی کا سفار کیا۔ اور اس ٹوٹتی بکھرتی قدروں کے عہد میں "بساطِ تہذیب" کو اپنے امکان بھر زوال آشنا ہونے سے بچائے رکھنے کی سعی کی۔

علامہ پرتو کا فیضان اُن کے اِن اشعار سے صاف جھلکتا ہے

تم کو چاہا تو کیا غلط چاہا
آئینہ تم سے پوچھتا ہو گا

○

کھیلنا ہر ایک کے جذبات سے
شغل اُن کا پسندیدہ رہا

○

جب جگہ مل نہ سکی دیر و حرم میں اے دوست
آ کے میخانے میں ہم بیٹھ گئے گھر کی طرح

○

اُن کی نگاہِ ناز کی شوخی
دل کی دُنیا درہم برہم

بقولِ صبا اکبرآبادی:

سلسلہ اہلِ زباں سے مجھے حاصل ہے صباؔ
میرے اشعار میں پرتوؔ کی سند ہوتی ہے

میں نے پرتوؔ کی سند کے طور پر جو اشعار "موجِ صبا" سے انتخاب کئے تھے اُن میں سے ایسے اسکول کی نمائندگی کے تمام اوصاف موجود ہیں جس کا نام زبان و بیان کی صفائی اور بندش کی چستی اور روزمرہ کے برمحل استعمال کے لیے ہمیشہ روشن و تابناک رہیگا۔

صبا اکبرآبادی کا یہ مجموعہ اگر ایک طرف کلاسیکی شاعری کی بازگشت ہے تو دوسری طرف قدروں کے احترام اور اُن کی اشاعت کی جانب ایک مستحسن اقدام جس کی پذیرائی خاص طور پر اس عہد میں نہ صرف ضروری ہے بلکہ فرض بھی ہے۔

ریاست کے حاجیوں کو ہر ممکن سہولیات فراہم کی جائیں گے !

چیرمین پروفیسر جاوید خان

مہاراشٹر اسٹیٹ حج کمیٹی کی ۱۴ر مارچ کو صبح منترالیہ میں وزیر ہاؤسنگ اور مہاراشٹر اسٹیٹ حج کمیٹی کے چیرمین پروفیسر جاوید خان، کی صدارت میں ایک میٹنگ منعقد کی گئی جس میں وزیر مملکت برائے توانائی اور ممبر حج کمیٹی شری سید احمد، اور حج کمیٹی کے ممبران نے شرکت کی۔

اس میٹنگ میں خادم الحاج کمیٹی کے اخراجات، حج کمیٹی کے عارضی عملہ کی مزید چھ مہینوں کی تقرری صابو صدیق کی جانب سے ریاستی حج کمیٹی کے دیئے گئے روم کے کرایئے، حج گائیڈ کی طباعت اور دیگر امور کے بارے میں فیصلے کئے گئے۔

میٹنگ میں پروفیسر جاوید خان نے امسال ریاست کے حاجیوں کو اسٹیٹ حج کمیٹی کی جانب سے زیادہ سہولتوں کے بارے میں تجاویز پیش کیں، اور اس کی صد ممکن عمل آوری کیلئے اور عہدیداران کو ہدایت دی۔

اس میٹنگ میں شری سید احمد، حاجی شبیر احمد ایل سی شری اقبال پٹیل، شری سید محمد ہادی (دونوں میونسپل کونسلر) شری قیوم نشتر، شری علی شمسی اور

شری ابراہیم گاندھی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار فرمایا اور اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔
اس موقعہ پر ریاستی حج کمیٹی کے سکریٹری، شری زیڈ معلم اور ایگزیکٹو افیسر شری سید مشتاق اور کمیٹی کے ممبران اور عہدیداران موجود تھے۔

ضلع پریشد اور پنچائت سمیتی انتخابات ۳۱ر مارچ ۱۹۹۲ء تک ملتوی

آرڈیننس جاری

حکومت مہاراشٹر نے اپنے ایک آرڈیننس کے ذریعہ مہاراشٹر ضلع پریشد اور پنچایت سمیتی قانون ۱۹۶۱ء میں ترمیم کی ہے اور عثمان آباد اور پربھنی ضلع پریشد کو تحلیل کرکے انتخابات کا عارضی التوا قانون ۱۹۸۰ء کے تحت ریاست میں واقع تمام ضلع پریشدوں کے عام انتخابات کو ۳۱ر مارچ ۱۹۹۲ء تک ملتوی کر دیا ہے موجودہ توسیع کی ان باڈیز کی میعاد ۲۱ر مارچ ۱۹۹۱ء کو ختم ہونے والی تھی۔

اس آرڈیننس کی مہاراشٹر ضلع پریشد اینڈ پنچایت سمیتی اور عثمان آباد اور پربھنی ضلع پریشد کو تحلیل اور انتخابات (ترمیم) آرڈیننس بابت ۱۹۹۱ء کے نام سے موسوم کیا گیا ہے جو کہ فوری طور پر نافذ العمل ہوگیا ہے اسے ریاستی حکومت کے گزٹ (غیر معمولی) مورخہ ۲۸ر فروری ۱۹۹۱ء میں شائع کر دیا گیا۔

سات میونسپل کارپوریشن کیلئے کونسلروں کی تعداد مقرر

حکومت مہاراشٹر نے ریاست کے سات میونسپل کارپوریشن کے وارڈ ایکشن کیلئے منتخب کونسلروں

کی تعداد کو اس ضمن میں جاری گزشتہ تمام اطلاع ناموں پر غور کرنے کے بعد مقرر کر لیا ہے۔

متعلقہ قانون کے تحت میونسپل کارپوریشن کے لئے مقرر ہونے والے کونسلروں کی تعداد اس طرح ہیں ۱) بمبئی منتخب ۲۲۱ بمبئی میونسپل کارپوریشن قانون ۱۸۸۸ء کے تحت اور (۲) ناگپور - ۹۸ سٹی آف ناگپور کارپوریشن قانون ۱۹۴۸ء کے تحت (۱) ناسک - ۸۵ (۲) پمپری چنچوڑ - ۷۸ (۳) پونے - ۱۱۱ (۴) امراؤتی اور (۵) تھانے - ۸۵ تمام بمبئی پروینشل میونسپل کارپوریشن قانون ۱۹۴۹ء کے تحت۔

سات میونسپل کارپوریشن کا احاطہ کرنے والا اطلاع نامہ ریاستی حکومت گزٹ غیر معمولی ۲۸ فروری ۱۹۸۱ء میں شائع کر دیا گیا ہے۔

تاراپور والا آکیوریم!
معذور افراد کیلئے مفت داخلہ

معذوروں کے سال کے موقعہ پر حکومت مہاراشٹر نے تاراپور والا آکیوریم میں معذور افراد کو مفت داخلہ دینے کا فیصلہ کیا ہے شری بی۔ پی۔ پانڈے ڈائرکٹر آف فشریز بمبئی نے یہ اطلاع کو دیتے ہوئے فرمایا کہ اس طرح سے معذور افراد کی آبی جانوروں کے بارے میں معلومات کے ساتھ ساتھ تفریح بھی ہو جائے گی۔

انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے اسپانسرڈ معذوروں کے گروپ اس رعایت کے مستحق ہیں انسٹی ٹیوٹ کو اس مقصد کے لئے منظوری درخواست پیش کرنی ہو گی۔

آکیوریم صبح ۱۰ بجے سے شام ۷ بجے تک اور عوامی تعطیلات کے دن رات ۸ بجے تک کھلا رہتا ہے یہ بروز پیر کو بند رہتا ہے۔

ڈسٹرکٹ فورم کیلئے پریسیڈنٹ کی تقرری

حکومت مہاراشٹر نے رائے گڑھ، وردھا، امراوتی آکولہ، بلڈانہ، ناسک، جلگاؤں، سولاپور، کولہاپور عثمان آباد، لاتور، بھنڈارا، سانگلی، احمد نگر، چندرپور دھولے، رتناگیری، اور بیڑ اضلاع کیلئے صارفین کے تحفظ قانون ۱۹۸۶ء کے مقصد کے تحت قائم متعلقہ ڈسٹرکٹ فورم کیلئے سٹنگ ڈسٹرکٹ اور سیشن جج نامزد کیا ہے۔

اس ضمن میں اطلاع نامہ ریاستی حکومت گزٹ غیر معمولی کے حصہ A - ۱۷ مورخہ ۲۵ فروری ۱۹۹۱ء میں شائع کر دیا گیا ہے۔

فراہمی آب اسکیم کی انتظامی منظوری

حکومت مہاراشٹر نے مہاراشٹر فراہمی آب اور نکاسی نالہ بورڈ کے تحت ضلع کولہاپور کے تعلقہ رادھانگری میں جھکر بیٹ، ورواڑی ملاقاتی دیہی فراہمی آب اسکیم کے کام کی انتظامی منظوری دے دی ہے جس پر لاگت کا تخمینہ ۴۲،۵۳،۰۰۰ روپیہ ہے۔

انتظامی منظوری

حکومت مہاراشٹر نے ضلع ناگپور میں سونیر میں کیلواد دیہی فراہمی آب اسکیم کی انتظامی منظوری دے دی ہے جس پر لاگت کا تخمینہ ۴۳،۳۱،۸۷۰ روپے ہے۔

انتظامی منظوری

حکومت مہاراشٹر نے ضلع بلڈانہ کے تعلقہ چیکلی میں امداد پور دیہی فراہمی آب اسکیم کی انتظامی منظوری دیدی ہے جس پر لاگت کا تخمینہ ۱۰،۳۸۸،۴۰ روپئے۔

جرمنی کے صدر ڈاکٹر رچرڈ وائی زیکر نے ۴ مارچ ۱۹۹۱ء کو اپنی مسز کے ہمراہ گھاراپوری کے غاروں کا دورہ کیا۔ یہ اسی موقع کی تصویر ہے۔

جرمنی کے صدر کی شہر میں آمد

نیڈرل ریپبلک آف جرمنی کے صدر ڈاکٹر رچرڈ وان ڈبلیو ۴ مارچ کو مدراس سے آئی اے ایف کے خصوصی طیارے کے ذریعہ بمبئی پہنچے آپ کے ہمراہ آپ کی اہلیہ مسز مرینے وان، ڈبلیو اور مرکزی وزیر مملکت برائے ماحولیات شریمتی مینکا گاندھی، ساتھ تھیں۔

صدر اور دیگر معززین کا سانتا کروز ہوائی اڈے پر گورنر مہاراشٹر شری سی سبرامنیم اور انکی اہلیہ شریمتی شکنتلا سبرامنیم، مہاراشٹر کے وزیر مالیات شری رام راؤ آدک، میئر شری چھگن بھجبل، گورنمنٹ مہاراشٹر کے چیف سکریٹری شری کے بی۔ سرینواسن، چیف پروٹوکول آفیسر شری وکیٹ چاری، اور بمبئی میں جرمنی کے قونصل جنرل مسٹر ڈبلیو سیمونسن اور دیگر نے خیر مقدم کیا۔

کپاس کی حصولی

کپاس کی حصولی اسکیم کے تحت ۱۰۶۰۱،۳۰،۶۳ر کوئنٹل کپاس خریدی گئی اور ۴۰،۱۳،۲۲،۹ر گانٹھیں ۲۵ر فروری ۱۹۹۱ء تک حاصل کی ریاست کے ۱۱ زونوں میں حاصل کی گئی۔ گذشتہ سال کے اعداد وشمار بالترتیب ۰۱۴،۳۰،۹۸ر اور ۷۶،۲۹،۱۱ر ہیں۔

اس مدت کے دوران زون کی ترتیب سے خریدی گئی کپاس کوئنٹل میں اور گانٹھیں درج ذیل ہے

ناگپور ۶۶۲،۳۴،۱۰ر (۲۴۲،۱۴۷)
ایوت محل ۸۲۹،۵۸،۱۰ر (۲۸،۱،۴۱ر)
آکولہ ۸۹۴۸۸۴ (۱۵۵۸۰۰) امراوتی ۲،۴،۹۳۵۴ (۳۵،۰۰۱)
کھامگاؤں ۴۴ ۳۲۵۱ (۸۲۲۰) اورنگ آباد ۱۵۱،۶۴۹
(۷۶،۶۹۵) پربھنی ۰۱۴،۲۷،۰ ۱ (۸۵،۲۷۱)
ناندیڑ ۳۲۶،۴۴۶ (۲۵ ۷۵ ۳) جلگاؤں ۵۱۳
۲۰۲ (۹،۲۰۴) دھولے ۴۸۵۵ اور بلڈانہ ۱۴۰۲۱
(۲۴۸۷)

'خموشی بول اٹھی ہے' کی اجرائی نشست

۹ فروری ۱۹۹۱ء کو انجمن اسلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی کے کانفرنس ہال میں اردو رائٹرز گلڈ، بمبئی کے زیر اہتمام نئی نسل کے اہم شاعر عبدالاحد ساز کے اولین شعری مجموعے "خموشی بول اٹھی ہے" کی اجرائی نشست جناب علی سردار جعفری کی صدارت میں منعقد ہوئی اس نشست میں بمبئی کے تقریباً سبھی مشاہیر ادبا و شعرا شریک ہوئے، جس کی وجہ سے یہ ایک بہت ہی موقر اور یادگار نشست ثابت ہوئی۔

جناب سردار جعفری نے اپنی صدارتی تقریر میں یہ تاریخی بیان دیا کہ "میں مسلسل ایک مہینے سے مقالہ لکھنے کی غرض سے فردوسی کا شاہنامہ پڑھ رہا تھا اور درمیان میں کبھی کبھی عبدالاحد ساز کی کتاب پڑھ لیتا تھا اس کے باوجود مجھے ساز کی شاعری ناگوار نہیں گزری یہ بات بجائے خود ان کی شاعری کے حق میں ایک بہت بڑی تحسین ہے مجروح سلطانپوری صاحب نے اس بات پر توجہ دلوائی کہ ساز کی شاعری میں روایت سے انحراف نہیں بلکہ اس کا احترام کرتے ہوئے روایت سے اختلاف ہے جناب عزیز قیسی نے فرمایا کہ ساز کو پیرایہ بیان پر تو خاصی قدرت ہے مگر خیال کے تعلق سے کہیں کنفیوژن ہے مجھے ان کی نظم "عوج بن عنق" خاص طور پر پسند آئی ہے، اور ان کا آئندہ شعری سفر اسی طرح کی نظموں سے عبارت ہونا چاہیے"۔ ندا فاضلی یوں گویا ہوئے کہ 'ساز کی بعض شعری ترجیحات میرے مطالبات پر پوری نہیں اترتیں، موت کی سوچ اور خوف ان کی شاعری میں نمایاں نظر آتا ہے۔

الیاس شوقی، جاوید ناصر اور مدیر شاعر افتخار امام صدیقی نے ساز کے تخلیقی رویے پر اظہار خیال کیا اور مضامین پڑھے۔

کتاب کا اجرا اردو کے ممتاز اور بزرگ معلم جناب مظاہری صاحب کے ہاتھوں ہوا اس باوقار نشست میں اردو کے ممتاز ادیب و شاعر شریک تھے۔

صنعتی تنازعہ

حکومت مہاراشٹر نے مہرز گرین راسس آئیل شیڈرز منیس ایسوسی ایشن بمبئی اور راسس کے ملازمین کے مابین صنعتی تنازعہ کو تصفیہ کی غرض سے شری این۔ ایچ۔ پھوپلے کی صنعتی عدالت کے سپرد کر دیا ہے۔

تجدیدِ خریداری کیلئے گذارش

اس شمارے سے اگر آپ کی مدتِ خریداری ختم ہو رہی ہے یا ختم ہو چکی ہے تو آج ہی آئندہ مدت کے لئے رقم خریداری بذریعہ منی آرڈر روانہ فرما دیجیے تاکہ رسالہ آپ کی خدمت میں مسلسل جاری رہے۔
بصورتِ دیگر مدتِ خریداری ختم ہو جانے کے بعد رسالہ کی ترسیل ممکن نہ ہو سکے گی۔ خریدار حضرات بطور خاص نوٹ فرمالیں۔ تجدید خریداری کی رقم روانہ فرماتے وقت منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر (جو آپ کے پتے کی سلپ کے اوپر درج ہوتا ہے) ضرور درج فرمائیں اور اپنا نام، پتہ پن کوڈ نمبر بھی صاف صاف تحریر فرمائیں۔ (ادارہ)

خبریں ۔ تصویروں میں

گورنر مہاراشٹر شری سی سبرامنیم، اسپیکر شری جینت راؤ ٹلک اور ڈپٹی اسپیکر شری اناجوشی ۷ مارچ ۱۹۹۱ء کو مہاراشٹر اسمبلی کے بجٹ سیشن کے افتتاحی اجلاس میں شرکت کیلئے تشریف لے جارہے ہیں۔
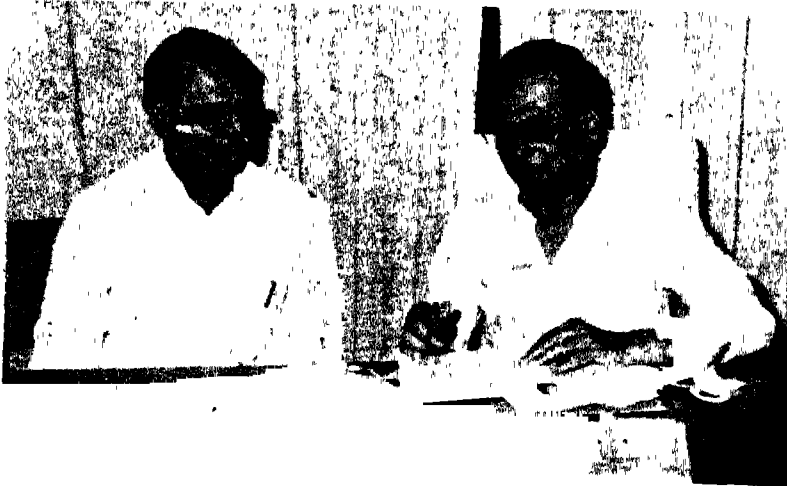
وزیر برائے مالیات شری رام راؤ اڈک اور وزیر مملکت برائے مالیات شری مدن بافنا ۹۲-۱۹۹۱ء کے مہاراشٹر بجٹ پر آخری نگاہ ڈالتے ہوئے۔

کمبھارواڑہ ویلفیر سینٹر کی جانب سے منعقدہ تہنیتی جلسہ جو شری سید احمد صاحب کے وزیر مملکت بنائے جانے کی خوشی میں رکھا گیا تھا۔ شری سید احمد وزیر مملکت برائے توانائی و ساحلیات تقریر کرتے ہوئے دائیں سے شری سلیم شیخ، شری ہارون رشید شری نعیم پٹھان، مہاراشٹر پردیش کانگریس (آئی) کے صدر شری شیواجی راؤ پاٹل نیلنگیکر، ڈاکٹر اسماعیل قریشی اور شری امین پٹیل بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

قارئین کی رائے

ڈاکٹر محبوب راہی
بارسی ٹاکلی، ضلع اکولہ (مہاراشٹر)

قومی راج کا شمارہ ۱۰ اگست ۱۹۹۰ء اس اعتبار سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے کہ اس کے بیشتر صفحات اقبال سمان ،، ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، اور گیان پیٹھ ایوارڈ یافتہ اردو کی شہرہ آفاق اور قدآور ادیبہ محترمہ قرۃ العین حیدر کو خراج تحسین پیش کرنے کیلئے مختص کر دیئے گئے ہیں - گویا ایک مخصوص گوشے کی شکل دے دی گئی ہے، جو موصوفہ کی وسیع اور وقیع تر ادبی خدمات کے پیش نظر ان کے شایان شان تو ہرگز نہیں (تقاضا تھا کہ ایک ضخیم خاص نمبر پیش کیا جاتا) بہر حال کچھ نہ ہونے سے کچھ نہ کچھ ہونا بہتر ہے میں آپا پر کئی رسائل حسب مقدور اپنے خاص نمبر گوشے شائع کر رہے ہیں اور کریں گے لیکن قومی راج نے جس طرح چند صفحات میں موصوفہ کی ناول نگاری، افسانہ نگاری اور ناولٹ نگاری کے علاوہ ان کی شخصیت پر پروفیسر شمیم احمد، پروفیسر وحید اختر، ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی، شہریار محمود ایوبی، پروین شاکر اور ڈاکٹر شمیم افروز زیدی جیسے آج کے مشاہیر قلم کاروں کی تخلیقات کے ذریعہ قرۃ العین حیدر کے فن اور شخصیت کے مختلف گوشے اجاگر کئے ہیں اسے محاورہ کی زبان میں کہتے ہیں " سمندر کو کوزہ میں سمو لینا " اس کے ساتھ موصوفہ کا افسانہ " پت جھڑ کی آواز " لطف کو دوچند کر دیتا ہے۔

علاوہ ازیں اس دور کے ایک اور بلند قامت افسانہ نگار " سریندر پرکاش " کو امسال ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملنے پر مظہر سلیم کا خراجِ تحسین اور اسی مناسبت سے ڈاکٹر مجید بیدار کا ناولوں میں کردار پر مقالہ موقع کی چیزیں ہیں۔ ان تمام کے ساتھ مخمور سعیدی اور نظام الدین کی غزلیں سونے پر سہاگہ کی مصداق ہیں۔ بر وقت اس بامعنی اور خوبصورت پیشکش کیلئے مبارکباد قبول کیجئے۔

اکبر عابد
معاون مدیر۔ سہ ماہی تکمیل
مالن بی چال، غیبی پیر روڈ، بھیونڈی (تھانے) مہاراشٹر

قومی راج کا شمارہ ۵ تا ۹ ملا۔ اوّل تا آخر پڑھا۔ بہت اچھا لگا۔ حمید سہروردی، انجم عباسی، ابوالفیض سید آبادی، ڈاکٹر شفیق اعظمی، علاء الدین جینا بڑے صاحبان کے مضامین معیاری تھے۔ خالد اگاسکر کی "کتھا" پر سلام بن رزاق صاحب کا بیباک تبصرہ بہت پسند آیا۔ بیکل اتساہی صاحب کی نظم "جواب تو دے" دل کو چھو لینے والی ہے۔ قاضی انصار اور کامل حیدرآبادی کی غزلیں بہت خوب ہیں۔ ان سے بڑھ کر اقبال مجید صاحب کا افسانہ "پوشاک" معیاری ہے۔ کالم "ہمارا سرورق" کا سلسلہ نیا نیا سا لگا مگر نشتر سا۔ آپ کی ادارت نے قومی راج کے معیار کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔

مناظر حسین شاہین
مڈل اسکول لکشمی پور۔ براہ چاکنڈ
ضلع گیا (بہار) ۸۰۴۴۰۴

قومی راج ۱۰ ستمبر ۱۹۹۰ء باصرہ نواز ہوا۔ یہ شمارہ بھی حسب روایت جاذب نظر اور معیاری صحافت کا دلکش نمونہ ہے حمید سہروردی، انجم عباس، ابوالفیض سید آبادی اور علاء الدین جینا بڑے خصوصیات کے مضامین پر از معلومات ہیں۔ جناب اقبال مجید کا افسانہ "پوشاک" اچھا لگا۔ جناب بیکل اتساہی، قمر رام نگری، بدر نظیری، کی نظمیں بامقصد اور پُر اثر ہیں۔ ڈاکٹر محبوب راہی، قاضی انصار، منزہ وصفی اور جمیمہ موہانی سحر کی غزلیں خوب ہیں۔

جلد ۱۸ — شمارہ ۷

۱۰ اپریل ۱۹۹۱ء

چندہ سالانہ ۵۰ روپے
قیمت فی شمارہ ۳ روپے

ہندی اور مراٹھی میں ہر ماہ کی یکم اور پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ انگریزی، گجراتی، سندھی اور اردو زبان میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

مراسلت کا پتہ
ایڈیٹر قومی راج
ڈائرکٹوریٹ آف انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز
گورنمنٹ آف مہاراشٹر
۱۱ واں منزل، نیو ایڈمنسٹریٹیو بلڈنگ
مقابل منترالیہ بمبئی ۴۰۰۰۳۲
Tel. Nos. { 2020491 2022957

چیف ایڈیٹر: شری ارون پاٹنکر

مینجنگ ایڈیٹر: آر۔ جی۔ ماتیدیو

ایڈیٹر: فیروزہ فیاض خان

اس شمارے میں

(قومی راج میں مطبوعہ کسی بھی تخلیق سے حکومت کا متفق الرائے ہونا ضروری نہیں ہے)

مہاراشٹر بجٹ میں ۲۷ کروڑ ۲۹ لاکھ روپے کا خسارہ

سونے چاندی کے زیورات پر سیلز ٹیکس میں اضافہ، تین کروڑ روپے کے نئے ٹیکس

مالیات اور منصوبہ بندی کے وزیر شری رام راؤ آڈک اور وزیر مملکت سر مدن بافنا مہاراشٹر کا ریاستی بجٹ پیش کرنے سے قبل نظرِ ثانی کرتے ہوئے۔

۷ مارچ کو خسارے کا بجٹ پیش کرتے ہوئے تین کروڑ روپے کی آمدنی کے لیے تازہ اقدامات کیے ہیں۔ شری آڈک نے بتایا کہ چونکہ نظرِ ثانی شدہ تخمینوں سے ۱۱۹ کروڑ ۲۸ لاکھ روپے کی بچت جو سال کے اخیر میں ترقیاتی اسکیموں کے نتیجے میں ہوئی ہے۔ سامنے آئی ہے اس طرح اب ۴۶ کروڑ ۷۰ لاکھ روپے کا مجموعی خسارہ ہوگیا ہے۔

علاقائی توازن کو قائم رکھنے کے لیے ۸۵ ۴ کروڑ روپے کی گنجائش رکھی گئی ہے جیسے بجلی کی فراہمی، تکنیکی تعلیم، صحتِ عامہ وغیرہ پر خرچ کیا جائے گا۔

خصوصی اقدام منصوبہ جات کے تحت ۱۲ ۱۱۸ کروڑ روپے منتخبہ قبائلی علاقوں کے لیے مختص کیے گئے ہیں شہری ترقیات کے لیے ۶۵ کروڑ روپے کی گنجائش مختلف ترقیاتی اسکیموں کے لیے رکھی گئی ہے۔

"جواہر روزگار یوجنا" کے تحت ۲ لاکھ خاندانوں کے لیے ۴۲، ۲۰۴ کروڑ روپے کی گنجائش رکھی گئی ہے۔

"نہرو روزگار یوجنا" کے تحت ۱۷، ۳ کروڑ روپے بطور ریاستی حصہ کے ذاتی روزگار، اجرت روزگار کے لیے مختص کی گئی ہے۔

پچھڑی جاتیوں، مندرج جاتیوں، مندرج قبیلوں سمیت جاتیوں اور نومیڈک قبیلوں کے لیے ۸۲، ۹۸ کروڑ روپے برائے سماجی، معاشی ترقیاتی کاموں کے لیے مختص کئے گئے ہیں۔ جس میں

آبپاشی کے کنوؤں کے لیے ۸۵، ۴ کروڑ روپے کی رقم مندرج جاتیوں اور مندرج قبیلوں کے کسانوں

اور غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گذارنے والوں کی اراضی پر تعمیر کرنے کے لیے مختص کی گئی ہے۔

بجٹ میں ہر قسم کی دیسی اور غیر دیسی شراب پر ۲ روپے فی لیٹر کے حساب سے مزید اکسائز ڈیوٹی نافذ کی گئی ہے۔ تاکہ ڈیوٹی کی وصولی کا طریقہ کار آسان ہو جائے۔

وزیر مالیات نے شراب کی برآمدی ڈیوٹی ۵ روپے سے کم کر کے ۲ روپے فی لیٹر کر دیئے جانے کا اعلان کیا۔

شری اڈک نے اعلان کیا کہ وہ ممبئی کے موٹر اسپرٹ کی فروخت سے متعلق ٹیکس کاری قانون کے تحت ٹیکس ادا نہ کرنے والے پٹرول پمپ مالکان کی آمدنی کے تخمینے کا اجتماعی نظام شروع کریں گے، اور ان کے لائسنس کی سالانہ تجدید کیے جانے کے بجائے صرف ایک مرتبہ ایک ہزار روپے کی لائسنس فیس کی وصولی کا طریقہ بنائیں گے

انھوں نے کہا کہ حکومت جلد ہی فوری طور پر جان بچانے والی ادویات کی جو سیل ٹیکس سے مستثنیٰ ہوں گی نظر ثانی شدہ فہرست کا اعلان کرے گی۔

وزیر مالیات نے کہا کہ وہ خشک میووں پر وصول کیے جانے والے ٹیکس کی شرح ۸ فیصد سے کم کر کے ۳ فیصد کیے جانے اور روئی کمبلوں پر لیے جانے والے ۲ فیصد سیل ٹیکس کو ختم کر دینے کی تجویز رکھتے ہیں تاکہ ریاست میں اون کی بنائی کرنے والے کارخانوں کو سہولت ملے۔

وزیر مالیات نے اسٹین لیس اسٹیل کے برتنوں پر ایک فیصد برتنوں نیز دیگر سامان پر ۴ فیصد ٹیکس لگانے کی تجویز رکھی ہے۔

انھوں نے ریڈی میڈ کپڑوں پر ٹیکس کی چھوٹ کی حد بڑھا کر ۷۵ روپے کر دی ہے تاکہ غریبوں اور اسکولی بچوں کے ایک بڑے طبقے کو سہولت مل سکے۔ انھوں نے پنسل کے نشانات مٹانے والی ربر کو جسے طلباء استعمال کرتے ہیں سیل ٹیکس سے مستثنیٰ کر دیا ہے۔

شری اڈک نے عورتوں کے بالوں میں لگائے جانے والے پنوں پر لیے جانے والے ٹیکس کی شرح ۱۵ فیصد سے کم کر کے ۴ فیصد کر دی ہے اور زنانہ ہینڈ بیگ کی بعض اقسام کو ٹیکس سے مستثنیٰ کر دیا ہے۔

شری اڈک نے سونے چاندی اور ان سے بنی ہوئی اشیاء کے ٹیکس میں دی ہوئی ایک فیصد کی رعایت کو ختم کر دیا ہے اور اس ٹیکس کی پرانی شرح ۲ فیصد کو بحال کر دیا ہے۔ انھوں نے مقامی استعمال کے لیے خریدے جانے والے ہیروں پر ٹیکس کی صرف ایک فیصد کی معمولی شرح کا نفاذ کیا ہے۔

انھوں نے کہا کہ حکومت ۲۷ کروڑ ۲۹ لاکھ روپے کے خسارے کو ٹیکس وصولی کے بہتر طریقے اختیار کر کے اور کفایت شعاری کے ذریعہ پورا کرنے کی کوشش کرے گی۔

****

مضمون نگار حضرات سے گذارش

- فل اسکیپ کاغذ کے صرف ایک طرف صاف اور خوشخط تحریر فرمایئے۔
- کاربن کاپی یا زیروکس کاپی کی بجائے اصل مسودہ روانہ فرمایئے، اور آخر میں اپنا نام اور پتہ ضرور لکھ دیجئے۔
- صرف غیر مطبوعہ تخلیقات روانہ فرمایئے۔ مضامین کی نقل اپنے پاس محفوظ رکھیئے۔
- غیر طلبیدہ تخلیقات کا معاوضہ دینے یا نہ دینے کا فیصلہ ادارہ کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں توجہ یا کسی یاد دہانی کی ضرورت نہیں ہے۔

(ادارہ)

ٹرانسپورٹ کے شیر کو کس طرح قابو میں رکھا جائے

شری یمان اے۔ پی سنہا جو ریاست مہاراشٹر کے ٹرانسپورٹ کمشنر ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمارے ٹرانسپورٹ مینجمنٹ میں دفتری سطح پر بہت ساری خامیاں ہیں۔ آج کل لوگوں کی نئی طرح کی ضروریات کو دیکھتے ہوئے دفتری کارکردگی نئے طریقے سے وضع کرنی چاہئیں۔ انھوں نے سفارش کی کہ ٹرانسپورٹ بورڈ کی تشکیل نو کی جائے اور اس میں ممبران کی تعداد بڑھائی جائے تاکہ اچھے سے اچھے طریقے پر ممبران اپنی خدمات انجام دے سکیں۔
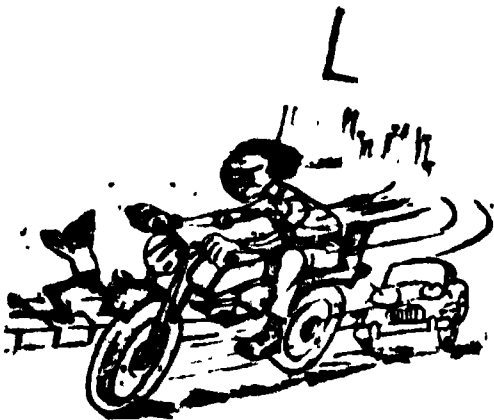
خصوصی طور پر جو موٹر گاڑیوں سے آلودگی کا مسئلہ ہے دھواں اور آواز کا مسئلہ ہے۔ اس کی تحقیق صحیح طریقے سے کی جائے۔ شری متی لینا میتھاز جو پریس رپورٹر ہیں۔ انہوں نے سنہا صاحب کا انٹرویو اس خصوص میں لیا ہے۔ یہاں چند اقتباسات دیئے جاتے ہیں۔

ٹرانسپورٹ کمشنر کے دفتر میں ۱۹۸۹ء میں موٹر گاڑی کے حادثات کا جو ریکارڈ آیا ہے اس میں ریاستِ مہاراشٹر بہ نسبت دوسری ریاستوں کے حادثات میں اوّل نمبر پہ ہے یعنی مہاراشٹر میں سب سے زیادہ ایکسیڈنٹ ہوئے۔ یہ خبر جب اخباروں میں چھپی تو عوام میں پریشانی اور ساتھ ہی

تیز رفتاری آپ کو کہیں لے جا سکتی ہے ۔ اسپتال یا پھر قبرستان۔

تعجب بھی دیکھا گیا۔ ہرکس وناکس نے اپنی رائے ظاہر کی
نسپورٹ کا محکمہ کی خامیاں کس طرح دُور کی جائیں۔ آمد
ت کو آسان کس طرح بنایا جائے کہ حادثات کم سے کم ہوں
یسا تجاویز ہوں۔؟

ٹرانسپورٹ محکمے کے ذمہ داران کا اس ضمن میں کیا کہنا
، اور وہ کس طرح سے سوچتے ہیں؟

ٹرانسپورٹ محکمے میں رشوت خوری عام ہے۔ اس
بارے میں وہ کیا کہتے ہیں۔؟

اے پی سنہا تاریخ اور سیاست میں دہلی یونیورسٹی سے
گریجویٹ ہیں۔ انھوں نے لندن یونیورسٹی سے سوشل پلاننگ
میں بھی ڈگری لی ہے۔

اے پی سنہا ۲ رمئی سنہ ۱۹۹۰ء سے ٹرانسپورٹ کمشنر
ہیں۔ اس سے پہلے وہ بہت سے اہم اور بڑے عہدوں پر
فائز رہے۔ قحط زدہ علاقوں کے احمد نگر میں ایگزیکٹیو ڈائرکٹر
رہے۔ ضلع تھانہ میں کلکٹر رہے، بمبئی کارپوریشن میں چیف
آفیسر کی حیثیت سے کام کیا۔ اور مہاراشٹر ہاؤسنگ بورڈ کے
چیف ایگزیکیٹو آفیسر رہ چکے ہیں۔

جس طرح ماضی میں گاڑیوں کی تعداد بڑھی ہے اسی
مناسبت سے ٹرانسپورٹ کے انتظامیہ کا اسٹاف نہیں بڑھا
سنہ ۱۹۹۰ء میں ریاست مہاراشٹر میں ایک لاکھ موٹر گاڑیاں
تھیں لیکن آج ۲۵ رلاکھ موٹر گاڑیاں ہیں۔ شری سنہا نے
یہ معلومات دیتے ہوئے کہا کہ میں اس خصوص میں انتظامیہ
کو بڑھانے، باقاعدگی سے چلانے کے لیے مناسب اقدام
کرونگا۔ شری سنہا نے کہا سنہ ۱۹۸۹ء میں ۵۹۴۷۷ گاڑیاں
حادثے کا شکار ہوئیں جس میں ۵،۲۷ اموات مہاراشٹر میں
ہوئیں۔ وجوہات پوچھنے پر شری سنہا نے بتایا کہ حادثات
کی وجوہات بہت سی ہیں۔ ان میں دو وجوہات بہت اہم
ہیں۔ اور وہ ہے ڈرائیونگ کی خامی اور میکانیکی خرابی ــــ
ایک تجربے کے مطابق اگر گاڑی کو صحیح طریقے سے رکھا
جائے۔ دیکھ بھال کی جائے تو پچیس فیصد حادثات کو
ٹالے جاسکتے ہیں۔ علاوہ اس کے راستوں کی صحیح جانکاری
اور راستے پر ڈرائیوروں کے لیے بنے ہوئے نشانات وغیرہ
کا دھیان رکھا جائے تو اس سے تینتیس فیصد حادثات کم
ہوسکتے ہیں۔

رشوت خوری کے متعلق انھوں نے بتایا کہ ٹیکسی ڈرائیور
اور رکشا ڈرائیور سے لے کر ذاتی گاڑیوں کے ڈرائیوروں نے
بھی رشوت سے بیزاری ظاہر کی ہے۔ اور محکمے کو اس ضمن
میں بہت سی شکایات موصول ہوئی ہیں۔

لوگوں نے بتایا کہ انہیں لائسنس لیتے وقت رشوت
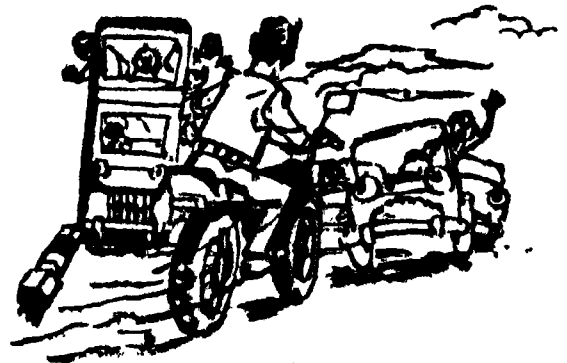
غلط لائن پر چلنے کا نتیجہ

دینی پڑتی ہے۔ اور اسی طرح "FITNESS CERTIFICATE" کے لیے بھی غیر ضروری خرچ کرنا پڑتا ہے۔

"اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ٹرانسپورٹ محکمے میں رشوت خوری عام ہے لیکن میں اس سے پوری طرح متفق نہیں ہوں" شری سنہا نے کہا۔ "لیکن میں اس تعلق سے تحقیقات کروں گا۔"

ریاست مہاراشٹر میں ٹرانسپورٹ محکمے کے کل ۳۵ دفاتر ہیں۔ ان میں لوگ لائسنس، پرمٹ رجسٹریشن ٹیکس کی ادائیگی کے لیے آتے ہیں۔ سب سے بڑا رشوت کا ذریعہ یہ ہے کہ جو درخواست دی جاتی ہے مندرجہ بالا ضرورتوں کے لیے۔ اسٹاف ان پر دھیان نہیں دیتا۔ کام میں تاخیر کرتا ہے اس وجہ سے لوگ دلالوں اور ایجنٹوں کے ذریعہ کام کرانا چاہتے ہیں۔ یہ دلال اور ایجنٹ ان دفاتر کے اطراف مل جاتے ہیں۔ انھیں زائد پیسہ دے کر یہ کام کرالیا جاتا ہے۔ اس سے زائد پیسے کو "SPEAD MONEY" بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے لیے ایک طریقہ رائج کرنا ہے کہ جس کے تحت یہ دیکھا جائے کہ مختلف درخواستیں کسی طرح جلد سے جلد نپٹائی جائیں اس طریقہ کار کو بہ حسن خوبی اور کامیاب بنانے کے لیے محکمے نے کسٹم اور اکسائز محکموں کی طرح ایماندار افسروں کی کارکردگی پر نقد انعامات یا اعزاز کا انتظام بھی کیا ہے۔ دوسرا اہم کام جو محکمہ کا ہے وہ ہے آلودگی کی تحقیق — آلودگی سے ماحولیات پر جو برا اثر پڑتا ہے۔

شری سنہا نے بتایا کہ دسمبر ۱۹۹۰ء کے آخر تک سولہ ہزار گاڑیوں کی آلودگی کی تحقیق کی گئی اور اسی سال کے آخر تک مزید پچیس ہزار گاڑیوں کو چیک کیا جائے گا۔

ٹرانسپورٹ سے پیدا شدہ آلودگی کے سلسلے میں انہوں نے بتایا — قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں پر مقدمہ دائر کیا گیا۔

اس خصوص میں قانون میں ترمیم کی ضرورت پر زور دیا دوسرے یہ کہ پرانی گاڑیاں — آج کے نئے اطوار کے حساب سے مناسب نہیں ہیں۔ اس لیے پرانی گاڑیوں کی جتنی بھی مرمت کی جائے اس کا نتیجہ صحیح نہیں نکلے گا۔ فی الحال آلودگی کی تحقیق کے لیے جو "آلات" استعمال کیے جا رہے ہیں بہت مختصر اور زیادہ تشفی بخش نہیں ہیں۔ اس لئے محکمہ تشفی اور اطمینان بخش آلات کے استعمال اور مناسب تحقیق پر زور دیگا۔ گاڑیوں کی آلودگی کی اہم وجہ یہ ہے کہ بڑھتی ہوئی آبادی کی وجہ سے آمد و رفت رُک رُک کر ہوتی ہے۔ دھواں زیادہ خارج ہوتا ہے۔ اس لیے کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ گاڑیوں کی تعداد کم کی جائے۔ اور ریل کے سفر کو بڑھاوا ملے لیکن شری سنہا کا کہنا ہے کہ یہ کوئی معقول حل نہیں ہے۔ اور یہ ممکن بھی نہیں ہے۔

ایک عام بس میں ۶۵ لوگ سفر کرتے ہیں اور ایک ڈبل ڈیکر بس میں تقریباً ۱۳۰ مسافر سماتے ہیں۔ اس مناسبت سے دیکھا جائے تو ذاتی موٹر گاڑیوں میں اوسط ۱.۶ لوگ ہی سفر کر پاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوا کہ موٹر کار کی بہ نسبت ڈبل ڈیکر بس چالیس گنا زیادہ کارآمد ہے۔

ان تمام مسئلوں کا حل یہ ہے کہ عام ٹرانسپورٹ کو خاص ٹرانسپورٹ کی بہ نسبت ترجیح دی جائے تاکہ کم گاڑیوں سے زیادہ لوگ سفر کر سکیں۔ اپنے انٹرویو میں رشوت خوری اور آلودگی پر انہوں نے خصوصی توجہ دی۔

نثار اختر انصاری
ایڈیٹر ہمہ گیر
مومن پورہ چوک ناگپور ۱۸

جدید نظم کے باکمال شعراء میں مرحوم سکندر علی وجد کا نام بھی شامل ہے اردو کے اس اعلیٰ شاعر کی پیدائش ۲۲ جنوری ۱۹۱۴ء کو ویجاپور ضلع اورنگ آباد (مہاراشٹر) میں ہوئی تھی۔ وجد نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن ہی میں حاصل کی اور ۱۹۲۹ء میں شاعری کی دنیا میں قدم رکھا۔ ۱۹۳۵ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ۱۹۳۷ء میں حیدرآباد سول سروس کا امتحان کامیاب کیا اور منصف کے عہدہ پر فائز ہوئے۔

۱۹۵۶ء میں وجد اورنگ آباد لوٹ آئے اور یہیں ۱۹۶۴ء میں ڈسٹرکٹ اینڈ سشن جج کے عہدہ پر فائز ہو کر قبل از وقت ملازمت سے سبکدوش ہو گئے! ان کی شاعری میں جہاں ایک طرف تغزل کا رنگ پنہاں ہے وہیں دوسری طرف بیداری اور حوصلہ کی باتیں بھی نمایاں ہیں۔

مٹ جائے گی وہ قوم جو بیدار نہ ہوگی
کٹ جائے گا جس ہاتھ میں تلوار نہ ہوگی

وقت کے ہر پل سے امرت رس نچوڑ
زندگی کا قبر تک دامن نہ چھوڑ
وجد آزادی کے پودے کے لئے
خون سے بڑھ کر پسینا چاہئے۔

۱۹۷۰ء میں حکومت ہند نے سکندر علی وجد کو پدم شری کے اعزاز سے نوازا ۱۹۷۲ء میں صدر جمہوریہ نے آپ کو ادبی و سماجی خدمات کے پیش نظر راجیہ سبھا کا رکن نامزد کیا ۱۹۷۵ء میں جب ریاست مہاراشٹر میں صوبائی سرکار نے اردو اکادمی قائم کی تو وجد صاحب کو اکادمی کا نائب صدر بنایا گیا۔ اردو اکادمی کی ترقی و توسیع میں مرحوم کا زبردست حصہ ہے!

وجد نے مولانا آزاد تعلیمی سوسائٹی اورنگ آباد کے نائب صدر، انجمن اسلام بمبئی کے ٹرسٹی، انجمن ترقی اردو ہند کے رکن، مراٹھواڑہ یونیورسٹی کے سینٹ رکن اور متعدد سرکاری کمیشنوں میں بحیثیت رکن اپنی اعلیٰ توانا

خدمات انجام دیں۔ حکومت ہند نے ۱۹۸۱ء میں انھیں ترقی اردو بورڈ کا نائب صدر مقرر کیا۔ وجد لگن اور کامیابی کے شاعر تھے۔ ناکامی اور محرومی سے انھیں سخت نفرت تھی۔ اپنی ایک نظم میں انھوں نے کہا تھا۔

مسکراؤ خوشی کی بات کرو
رونے والوں ہنسی کی بات کرو
یہ اندھیرے کے تذکرے کب تک
دوستوں روشنی کی بات کرو
بات جب ہے کہ دشمنوں سے بھی
جب کرو دوستی کی بات کرو
پھول مرجھائے تو کیا غم ہے
کھلنے والی کلی کی بات کرو

اس طرح نظم "نیا گیت" میں ان کی نصیحت ملاحظہ فرمائیں!

شہرت پر وشواس نہ رکھ
لوبھ کپٹ دکھ پاس نہ رکھ
مطلب کی بو باس نہ رکھ
دیکھ صلے کی آس نہ رکھ
نیکی کر دریا میں... ڈال
کل پر آج کا کام نہ... ٹال
میٹھے کا ہے جگ سسرال
کڑوے کے آگے ہر دو تال
ہمت ہر آفت کی ڈھال
اپنا نیتا آپ سنبھال

سکندر علی وجد کا پہلا شعری مجموعہ "لہو ترنگ" ۱۹۴۴ء میں اور دوسرا مجموعہ کلام "آفتاب تازہ" ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا تھا۔ ۱۹۶۲ء میں ان کی جدید نظموں اور غزلوں کا مجموعہ کلام "اوراق مصور" کا اجرار پنڈت جواہر لال نہرو کے ہاتھوں عمل میں آیا تھا۔ ۱۹۷۵ء میں ان کے چوتھے مجموعہ کلام "بیاض مریم" کا اجرار محترمہ اندرا گاندھی نے کیا تھا اس شعری کتاب کو یوپی اردو اکادمی اور غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی نے انعام سے نوازا تھا۔

۱۹۷۸ء میں وجد صاحب کی حیات میں ان کا آخری مجموعہ کلام "انتخاب" منظر عام پر آیا۔ حالانکہ ۱۹۸۰ء سے انھوں نے اپنی شاعری کو کلیات کی شکل میں مرتب کرنا شروع کیا تھا جس کا نام انھوں نے "جمال اجنتا جلال ہمالہ" تجویز فرمایا تھا۔

لیکن ۱۶ مئی ۱۹۸۳ء کو اورنگ آباد میں وجد وفات پا گئے۔ آگے چل کر "جمال اجنتا جلال ہمالہ" ۱۹۸۹ء میں جناب مقبول فدا حسین کے بنائے ہوئے دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ مہاراشٹر اردو اکادمی نے شائع کیا۔

محترمہ اندرا گاندھی سے وجد صاحب کو بڑی عقیدت تھی وہ انھیں غریبوں کا نجات دہندہ اور اقلیتوں اور اردو زبان کی محسن سمجھتے تھے اپنی ایک نظم میں اندرا جی کو مخاطب ہو کر فرماتے ہیں۔

دلوں پہ کیفیت خوشگوار چھائی ہے
ترے جنوں سے چمن میں بہار آئی ہے
مصیبتوں کے اندھیرے میں اب اجالا ہے
خوشی کی صبح کا سورج نکلنے والا ہے
ترے عمل سے ہے رنگین ہند کی تصویر
حسین خواب جواہر کی خوشنما تعبیر

جدید ہندوستان کے معمار پنڈت جواہر لال نہرو کے بارے میں وجد نے کہا تھا۔

چراغ محفل علم و عمل ہے نام ترا
بہار گلشن ہندوستاں پیام ترا

ا جلال نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں
کن میں امن کا ساماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

بد صاحب کی غزلوں میں بھی کچھ کم لطف نہیں
ر کی برجستگی اور رکھ رکھاؤ ان کے اشعار
ہیں۔ مثلاً

زندگی حزن میں نہائی ہے
وگ سمجھے بہار آئی ہے
چار دن چاندنی رہی آخر
شب ستاروں سے جگمگائی ہے

سکندر علی وجد سچ میں ایک لاجواب شاعر
وہ اردو زبان و ادب کے ایک صالح خادم
اردو کے ممتاز شعرا کا بیسویں صدی میں
جب ذکر ہوگا تب تب وجد کی یاد آئے گی
رہی گے۔

جن کی آنکھوں میں تھا سرورِ غزل
ان غزالوں کی یاد آتی ہے
جانے والے کبھی نہیں آتے
جانے والوں کی یاد آتی ہے

قومی راج میں شائع شدہ مضامین، حوالہ کے ساتھ یا بلا حوالہ نقل کئے جا سکتے ہیں، تاہم جس شمارے میں مضمون شامل ہو اس کی دو کاپیاں ڈائرکٹر جنرل آف انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز، حکومت مہاراشٹر، منترالیہ، بمبئی ۴۰۰۰۳۲ کے نام ضرور روانہ کی جائیں۔

(ادارہ)

ڈاکٹر جاوید وششٹ
نیچر بلبھ گڑھ فرید آباد (۱۲۱۰۰۴) ہریانہ

غزل

آدمی خاک ہے، وہ نوری نہیں
اک ادھوری بات ہے، پوری نہیں

فاصلے حائل ہیں، بھرپوری نہیں
عشق کا یہ ظرف، مجبوری نہیں

ہم سے پوچھو! اس دیارِ حسن کی
کون سی صورت ہے جو حوری نہیں

جب ملاقاتیں ہوں اپنے آپ سے
پاس منزل ہے، کوئی دوری نہیں

المیہ اس دور کا کہیے اسے
دل کلی اور نظر گوری نہیں

کون حق بولے گا، کالے دور میں
دار پر اب جذبِ منصوری نہیں

بوریا اپنا بھی ہے تختِ شہی
شان درویشی ہے، فغفوری نہیں

شیخ میرے جام میں تیرے لئے
بادۂ کوثر ہے، انگوری نہیں

شعر کا الہام سے ہے رابطہ
شاعری جاوید، مزدوری نہیں

رام پنڈت
۱۴/۱/۲۵۹ - نہرو نگر
کرلا (مشرق) بمبئی ۴۰۰۰۲۴

اُردُو ادب پر مہابھارت کا اثر

کہا گیا ہے کہ " بھارت پنچم وید" یعنی چار ویدوں کے برابر مہابھارت کو مانا گیا ہے۔ صرف ہندوستانی زبانوں ہی میں نہیں بلکہ عالمی زبانوں میں بھی اس کا مقام غیر معمولی ہے جس طرح مصر کے پُرانوں کا یورپ کی زبان وادب پر کئی صدیوں سے اثر رہا ہے۔ بالکل اسی طرح ہندوستانی زبانوں کے ادب پر بھی مہابھارت، رامائن اور پُرانوں کا اثر رہا۔ لیکن جب ہم اردو ادب پر مہابھارت کے اثر کا جائزہ لیتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اردو ادیب ہماری وراثت سے پوری طرح استفادہ نہیں کر پائے۔ مہابھارت سے متعلق کہا جاتا ہے यदिहास्ति तदन्यत्र यन्नेहास्ति न तत्क्वचित् یعنی جو باتیں اس میں ہیں وہ موجود دکھائی دیں گی۔ اور جو باتیں نہیں ہیں وہ کہیں نظر نہ آئیں گی۔ ہمارے اردو ادیبوں نے یہ بھی جاننے کی کوشش نہیں کی کہ کیا یہ منطق صحیح ہے۔ اس لیے اردو ادب پر مہابھارت کا اثر زیادہ نہیں ہے۔ یہ صاف ہے۔ لیکن چند گنے چُنے شاعروں اور افسانہ نگاروں نے اپنی تخلیقات میں مہابھارت کی کہانیوں کو علامتی طور پر برتا ہے جو قابلِ مطالعہ ہے

مہابھارت کا اردو ترجمہ منشی طوطا رام شایاں نے کیا ہے۔ بھشم پَرو میں شری مد بھگوت گیتا شامل ہے۔ گیتا کے فلسفے کا اثر تو غالبؔ سے لے کر علامہ اقبالؔ تک نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ کیفیؔ اعظمی، کرشن موہن، قاضی سلیم، اعجاز صدیقی جیسے مشہور شاعروں نے گیتا کے کرم واد، کی حمایت کی ہے۔ آج تک منشی لکشمن پرشاد، صنوبرؔ عظیم آبادی، منورؔ لکھنوی، صدرؔ لکھنوی، جعفر علی خان اثرؔ، دلو کی نندن مبتدی کے تراجم اردو میں مشہور ہیں۔

کروکشیتر کے میدان میں جب ارجن اپنے رشتے

داروں کو دیکھتے ہیں، تو ان کا جنگ کرنے کا حوصلہ کمزور پڑ جاتا ہے۔ شتریہ ہونے پر بھی ارجن بیراگ کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ تب کرشن انہیں گیتا کا اُپدیش دیتے ہیں دھرت راشٹر اندھے ہونے کی وجہ سے جنگ کا حال جاننا چاہتے ہیں۔ سنجے کو दिव्य दृष्टि حاصل ہے۔ وہ اس کے ذریعے تمام تفصیلات دھرت راشٹر کو سناتا ہے۔ اسی کو ایک نظم "پیوتسمہ یا" میں کیفی اعظمی نے باندھا ہے،

سنجے وہ پہلا انسان تھا
ہستناپور میں جس نے قبلِ مسیح
ٹیلی ویژن بنایا
اور گھر بیٹھے ایک راجہ کو
یدھ کا تماشہ دکھایا

— یہاں سنجے کو حاصل दिव्य दृष्टि کو ٹیلی ویژن سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ارجن صرف بہادر ہی نہیں بھگوان کرشن کا بھگت بھی ہے۔ نو دھانا بھکتی میں ارجن کی بھکتی "سکھیہ بھکتی" کہلاتی ہے۔ ارجن کے لیے کرشن کا ہر ہر جملہ ایک مثالی صورت ہے۔ اِس سیاق میں کرشن موہن کی نظم "کمل شبد" کو دیکھیے — کرشن اور ارجن میں گفتگو —

کرشن، وہ آسمان پر فاختہ اُڑ رہی ہے۔
ارجن، وہی ہے وہ ایک فاختہ
کرشن: نہیں یہ تو ایک کبوتر ہے
ارجن: کبوتر ہے، یہ واقعی آسمان پر
کرشن: نہیں یہ تو کوّا نظر آ رہا ہے،
ارجن: بے شک ہے کوّا، بجا کہہ رہے ہو
(سُن کے کرشن ہنسے:

ارجن: ہنسی مت اڑاؤ، میرے لیے تو پرندہ نہیں تھا، تمہارے لیے "کمل شبد" آکاش میں اُڑ رہے تھے!

یہی وہ کمل شبد ہیں جو گیتا کے نام سے پچھلی کئی صدیوں سے فلسفہ کی دنیا میں راج کر رہے ہیں۔ گیتا کا "کرم یوگ" دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ ہزاروں کتابیں اس پر دستیاب ہیں۔ کیفی اعظمی اپنی نظم "فرض" میں اس کرم یوگ کو بیان کرتے ہیں۔

فرض

اور کرشن نے ارجن سے کہا
نہ کوئی بھائی نہ بیٹا نہ بھتیجہ نہ گرو۔
ایک ہی شکل ابھرتی ہے ہر آئینہ میں
آتما مرتی نہیں، جسم بدل لیتی ہے۔
دھڑکن اس سینے کی جا چھپتی ہے اس سینے میں
جسم لیتے ہیں جنم جسم فنا ہوتے ہیں۔
اور جو اک روز فنا ہوگا وہ پیدا ہوگا۔
اک کڑی ٹوٹتی ہے، دوسری بن جاتی ہے۔
ختم یہ سلسلۂ زندگی پھر کیا ہوگا
رشتے سو، جذبے بھی سو، چہرے بھی سو ہوتے ہیں
فرض سو چہروں میں شکل اپنی ہی پہچانتے ہیں۔
وہی محبوب، وہی دوست، وہی ایک عزیز،
دل جسے عشق اور ادراک عمل مانتا ہے
زندگی صرف عمل صرف عمل صرف عمل
اور یہ بے درد عمل صلح بھی ہے جنگ بھی ہے،
امن کی موہنی تصویر میں ہیں جتنے رنگ،
انہی رنگوں میں چھپا خون کا ایک رنگ بھی ہے۔

خوف کے روپ کئی ہوتے ہیں، انداز کئی
پیار سمجھا ہے جسے خوف ہے وہ پیار نہیں،
انگلیاں اور گڑا اور جکڑ اور جکڑ
آج محبوب کا بازو ہے یہ تلوار نہیں ——
جنگ رحمت ہے کہ لعنت یہ سوال اب نہ اٹھا
جنگ جب آہی گئی سر پہ تو رحمت ہوگی
دور سے دیکھ نہ بھڑکے ہوئے شعلوں کا جلال
اسی دوزخ کے کسی کونے میں جنت ہوگی۔
زخم کھا، زخم لگا، زخم ہے کس گنتی میں
فرض زخموں کو بھی چن لیتا ہے پھولوں کی طرح،
نہ کوئی رنج نہ راحت نہ صلے کی پرواہ
پاک ہر گرد سے رکھ دل کو رسولوں کی طرح،
یہ پڑوسی جو محبت کا چلن بھول گئے
ان میں بھائی بھی ہیں، بیٹے بھی ہیں، احباب بھی ہیں۔
جانتے ہیں سبھی، کچھ نہیں ہتھیار مگر
ہم سے لڑنے کو تیار بھی بے تاب بھی ہیں۔
ہم نے چاہا تھا رہیں ساتھ دل و جاں کی طرح
وہ مگر اس کو سیاست ہی سیاست سمجھے
ہم نے چاہا تھا الگ ہو گئے بھی نزدیک رہیں
وہ مگر اس کو کوئی تازہ شرارت سمجھے ــ
ہم نے چاہا تھا لڑائی نہ چھڑے، جنگ نہ ہو
وہ سمجھ بیٹھے مفلوج ہیں بے کار ہیں ہم
کتنی تاریک سمجھ، کتنا گراں خواب ضمیر
کہ جگانا کوئی چاہے تو جگائے نہ بنے
ہم اہنسا کے پجاری سہی، دیوانے سہی
جنگ ہوتی ہے فقط جنگ کے اعلان کے بعد
ہاتھ بھی ان سے ملیں، دل بھی ملیں، نظریں بھی
اب یہ ارمان ہیں سب فتح کے ارمان کے بعد

ساتھیو، دوستو، ہم آج کے ارجن ہی تو ہیں۔
ہم سے بھی کرشن یہی کہتے ہیں ——

شری مد بھگوت گیتا کا کرشن سندیش ہم اعجاز صدیقی کی نظم "ناگزیر" میں پاتے ہیں۔

جنگ اک جبر ہے ہم امن پسندوں کے لیے
کاٹ موجود ہے دشمن کی کمندوں کے لیے

گیتا وہ نظم ہے بقول جگر مرادآبادی:

نغمہ وہی ہے نغمہ کہ جس کو
روح سنے اور روح سنائے

ارجن اور کرشن کے تعلقات اتنے گہرے تھے کہ ابن، سلام کے لفظوں میں:

دھیان تیرا تپسیا ہے میری
تیری پرچھائی کا پجاری ہوں

اسی لیے گیتا کا سامع ہونے کا موقع، پارتھ کو ہی حاصل ہوا تھا۔ افضل جعفری کا کہنا ہے کہ:

اب بھی گھنشیام ہے اس دشت کا بوٹا بوٹا
برگِ نو آج بھی انسان کے لیے گیتا ہے

گیتا سننے سے پہلے ارجن کی ہچکچاہٹ پر طنز کرتے ہوئے معین احسن جذبی لکھتے ہیں:

مثلِ ارجن معرکے میں ہچکچانا ننگ ہے
جنگ کا کو دیوتا ہے تیری فطرت جنگ ہے

یہاں پر جذبی صاحب آزادی کے سپاہی کو "دعوتِ جنگ" دے رہے ہیں۔ ارجن کا تیر رام چندر جی کا تیر اکلودیہ کا تیر، ہندو پرانوں میں مشہور ہے۔ ولی دکھنی نے معشوق کی نظر کو ارجن کے تیر سے تشبیہہ دی ہے۔ سراج لکھنوی اپنی نظم "یوم آزادی"

میں صبح کی ہوا سے متعلق کہتے ہیں ۔

نسیم صبح پھر ارجن کا بان بن کے چلی

قاضی سلیم "میرے آزاد وطن" میں اپنے ملک کے خطا کاروں سے کہتے ہیں:

اس خطا کار سے کہہ دو کہ اگر وقت پڑے

بانسری کرشن کی ارجن کا کڑا تیر بھی ہے

پانڈوں میں صرف بھیم ہی ایسا شخص ہے جو ناانصافی کے خلاف سینہ تان کر فوراً کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہ عقل سے کم اور طاقت سے زیادہ کام کرتا ہے۔ وہ اردو شاعری میں بہادری، انقلابی طاقت اور بغاوت کی علامت ہے۔

علی سردار جعفری "پروانہ" میں لکھتے ہیں:

ناز ہے تلوار کو جس پر وہ بازو ہو تم ہی

وہ بہادر بھیم ہو، وہ خود دار ٹیپو ہو تم ہی

اور دوسرے فقروں میں:

بغاوت سرسوتی سے، لکشمی سے، بھیم و ارجن سے

بغاوت دیویوں اور دیوتاؤں کے تمدن سے

مہابھارت کے کئی کہانیوں کے حوالے سے اردو شاعری میں اشعار کہے گئے ہیں۔ یہ علامتی انداز ہوتا ہے، وشوامتر، مینکا کا روپ دیکھ کر اپنی سادھنا کھو بیٹھے تھے۔ یہ اندر کی ایک چال تھی، اپنا تخت سنبھالے رکھنے کے لیے دیوتا ہمیشہ رشی منی کی سادھنا میں خلل ڈالتے ہیں۔ اس پر کرشن موہن کا شعر ہے:

دیکھ کر تیرا انوکھا روپ جوگی

بھول جائیں تپ اور تپ سادھنا کے

(سیاق: سمبھویدو)

آدی پرو میں شامل "ایک لویہ" کی کہانی مہابھارت کا ایک اہم حصہ ہے۔ آج ہمیں لگتا ہے، درون آچاریہ نے ایک لویہ کے ساتھ ناانصافی کی ہے۔ وہ براہمن اور کشتریہ نہ ہونے کی وجہ سے درون آچاریہ اسے تعلیم دینے سے انکار کرتے ہیں لیکن گرو دکشنا لیتے ہیں۔ کیا وہ اچھوت تھا؟ جیسے ابن انشاء نے کہا ہے:

لوگو! میلے تن من دھن کی ہم کو سخت منا ہی ہے

لوگو! ہم اس چھوت سے بھاگیں ہم تو کھرے برہمن ہیں!

یہی بات شاید کرن پر بھی لاگو ہو۔ اسی پس منظر میں ساحر لدھیانوی نے کہا ہے:

کچھ انسان برہمن کیوں ہیں

کچھ انسان ہریجن کیوں ہیں؟

ایک کی اتنی عزت کیوں ہے

ایک کی اتنی ذلت کیوں ہے؟

آگے چل کر وہ گیتا کا فلسفہ کہتے ہیں:

جنم سے کوئی نیچ نہیں جنم سے کوئی مہان نہیں

کرم سے ہٹ کر، کسی شخص کی کوئی بھی پہچان نہیں

منو کی ہدایات ہمیں مہابھارت کے مارکنڈے سمسیا پرو میں ملتا ہے۔ ہم عصر ادیب انور قمر نے منو پر "منو کی ارتھ ہین یاترا" کے عنوان سے کہانی لکھی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ منو اپنے گرو کا "انوشیلن" کرتے ہیں۔ اکیلا رہ جاتا ہے۔ کیا یہی منو کی سچائی تھی؟ جنہوں نے پرانوں کا مطالعہ کیا ہوگا وہ کم سے کم اس بات کے حق میں نہ ہوں گے۔ منو اور منو اسمرتی کا مطالعہ اسی زمانے کے حالات اور پس منظر میں کرنا مناسب ہوگا۔

انوشاسن پرو اور تیرتھ یاترا پرو میں ہم گنگا کے بارے

یں پڑھتے ہیں. آٹھ چیزوں کو گربھ میں رکھ کر گنگا نجات دلاتی ہے. گنگا ندی اور شانتنو کی بیوی گنگا دو روپ ہیں. ہم پہلے یہ دیکھیں کہ گنگا ندی کے بارے میں اُردو شاعر کیا کہتے ہیں:

ساحر نے کہا:

کتنے سورج اُبھرے ڈوبے گنگا تیرے دوارے
یگو یگو کی کتھا سنائیں تیرے بہتے دھارے
تجھ کو چھوڑ کے بھارت کا اتہاس لکھا نہ جائے

بھارت کا اتہاس یعنی بھارت دیش کا اتہاس | اور دوسرا مطلب ہے بھارت (مہابھارت) نامی اتہاس لکھنا ممکن نہیں ہے.
پنڈت آنند نرائن ملا "زمینِ وطن" میں کہتے ہیں

اُٹھی دودھ کے کنڈ سے لکشمی
قدم شیو کے شانوں پر دھرتی ہوئی

فراق ایک نظم میں کہتے ہیں:
نہلاتی کھنا کو آئی رس کی پُتلی
جیسے شیو کی جٹا سے گنگا اُترے

گنگا کو مہادیو کی جٹا سے زمیں پر لانے کا سہرا بھگیرتھ کے سر ہے. اس سیاق میں مندرجہ بالا سطریں لکھی گئی ہیں. گنگا کے جلالی روپ کو لے کر علامتی انداز میں جمیل مظہری کہتے ہیں:

ے اے مادرِ گنگا تیرا ہر بُلبلہ طوفاں لیے

فراق تو اس سے بھی آگے کی بات کہتے ہیں:

اے گنگو جمن کی مسکراتی لہرو
دیتی ہے سنائی تم میں ویدوں کی رچائیں

بھیشم مہابھارت کا ایک ایسا کردار ہے جو اپنے ورت سے بندھے ہونے کی وجہ سے بظاہر کوروُں کی طرف مگر بہ باطن پانڈوں کے ساتھ ہے. جمیل مظہری "اے مادرِ ہندوستان" میں ہندوستان کے دل کی حالتِ زار یوں بیان کرتے ہیں.

ے ذرّے ذرّے میں ترے آج بھی بے چین ہے بھیشم کا دل

فراق اسی سیاق میں شکنتلا کی مثال یوں دیتے ہیں:

مٹی تیری اے ہند ہے نرالی ہوئی ؛ سیتا اور شکنتلا کے اشکِ غم سے

ڈاکٹر راہی معصوم رضا ذات پات، دنگے فساد کے پس منظر میں کہتے ہیں، (نظم گنگا اور مہادیو)

میرا نام مسلمانوں جیسا ہے
مجھے قتل کرو اور میرے گھر کو آگ لگا دو
لیکن میری رگ رگ میں گنگا کا پانی دوڑ رہا ہے.
میرے لہو سے چلو بھر کر مہادیو کے منہ پر پھینکو
اور اس جوگی سے یہ کہدو:

مہادیو!
اب اس گنگا کو واپس لے لو
یہ ذلیل ترکوں کے بدن سے بن گاڑھا گرم لہو بن کر
دوڑ رہی ہے.!

بھگیرتھ کے ذریعے لائی ہوئی گنگا کو واپس بھیجنا چاہتے ہیں. فرقہ واریت پر یہ ایک تیکھا طنز ہے.

اردو شاعری میں منشی بنواری لال شعلہ، حسرت موہانی، سیماب اکبرآبادی، نہال سیوہاروی، نذیر بنارسی، منور لکھنوی، نذیر اکبرآبادی، افسر میرٹھی، سردار جعفری، آنند نرائن ملا، ثاقب لکھنوی، اور پرویز شاہدی نے نظمیں لکھی ہیں. ان سبھی نظموں میں گنگا کی عظمت کا بیان کیا ہے.
سمبھو پروگی ذیل میں پانڈوں کے آبا و اجداد دُشینت

اور شکنتلا کی پریم کہانی مہابھارت کا ایسا منظر نامہ ہے جس نے کالی داس جیسے عظیم شاعر کو "شاکنتل" جیسا ناٹک لکھنے کی تحریک دی۔ اقبال ورما سحر نے دشینت اور شکنتلا، پریم پال اور منور لکھنوی نے شکنتلا کا ترجمہ کیا۔ منور لکھنوی کے ترجمے کے بارے میں ڈاکٹر ذاکر حسین نے کہا تھا ۔ "کہیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ ایک باکمال اردو شاعر کا کلام نہیں ہے۔"

نل اور دمینتی کی کہانی بھی مہابھارت کا ایک حصہ ہے ۔ "نل دمن" نامی کئی کتابیں اردو میں شائع ہو چکی ہیں ان میں کالی پرساد، احمد علی احمد اور راحت کے "نل دمن" شہرت حاصل کر چکی ہیں۔ وَن پَرو میں یہ کہانی آتی ہے ۔

سلام بن رزاق ہم عصر افسانے کا اہم نام ہے۔ آپ نے ہندومت کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اور پرانوں کی کہانیوں کو آج کے سیاق و سباق اور پس منظر میں لکھا ہے۔ رامائن کی شرون کمار کی کہانی ہو یا مہابھارت کے ایک لویہ کی کہانی وہ ان کہانیوں کو آج کے مخالف حالات میں بیان کرتے ہیں سلام کی کہانی "ایک لویہ کا پُنر جنم" ہمیں اس تلخ صداقت کے روبرو کرتی ہے کہ زمانہ بدلنے کے بعد بھی اونچ نیچ اور بھید بھاؤ کی دیواریں مضبوطی سے کھڑی ہیں ۔ کہانی کی شروعات میں پرانے زمانے کے ایک لویہ کی کہانی کا اختصار دیا گیا ہے ۔ ایک لویہ کا باپ اسے راج گرو درون آچاریہ کے یہاں دھنُروِدّیا سکھانے لے جاتا ہے لیکن آچاریہ درون ایک لویہ ذات کا بھیل ہونے کی وجہ سے اسے اپنا شاگرد نہیں بناتے وہ کہتے ہیں میں صرف برہمن اور شتریوں کو ہی تعلیم دے سکتا ہوں۔ مایوس ہو کر دونوں باپ اور بیٹے لوٹ آتے ہیں ۔ کہانی کے نصف آخر میں ساڑھے تین ہزار سال بعد ایک لویہ اپنے باپ کے ساتھ مزدور گھرانے میں پیدا ہوتا ہے وہ محنت اور لگن سے ہمیشہ پہلا ڈویژن لاتا ہے۔ جب وہ میڈیکل کالج میں داخلے کے لیے پہونچتا ہے تو اتفاق سے اس کالج کے پرنسپل درون آچاریہ ہیں۔ اس بار بھی وہ ایک لویہ کو داخلہ نہیں دیتے۔ کیوں کہ آج وہ ہریجن نہیں ہے ۔

کنور سین اور کمار پاشی نے بھی ہندو مت پر تخلیقی کام کیا ہے۔ دونوں کی زبان پر بھی ہندی کا گہرا اثر ہے۔ کنور سین کی کہانی "دھرت راشٹر کے بعد" ایک علامتی کہانی ہے۔ راجہ دھرت راشٹر کے اندھے ہونے کا یہاں مناسب استعمال کیا گیا ہے۔ کہانی کا آخری حصہ مثال کے طور پر دے رہا ہوں،

"
عجیب تماشہ تھا
راجہ نے جوں ہی سنیاسن چھوڑا
اس کے آنکھوں کی روشنی لوٹ آئی۔
گھوری سنہاسن پر بیٹھتے ہی آنکھیں کھو بیٹھا
اس کے من کا چتر پٹ اندھکار میں ڈوب گیا
دوسرے ہی پل اس نے ادھیکاری کو
اندھوں پر لاٹھی چلانے کی اگیا دے دی۔ "

یہاں شاعرانہ زبان اور داستانی انداز کی وجہ سے منظر نامہ واضح نہیں ہو پاتا۔ لیکن یہی اردو کی علامتی کہانی کی خصوصیت مانی جاتی ہے۔

یگ وِدھ پرو میں بکا سُور کی کہانی آتی ہے۔ اس کہانی کو نئے پس منظر میں پیش کیا ہے۔ جدید افسانہ نگار سریندر پرکاش نے اور شرون کمار ورما نے ۔

سریندر کی کہانی کا عنوان "گاڑی بھر رسد" ہے۔ یہاں سریندر نے کہانی کو بکا سور ودھ تک نہیں پہونچایا ہے۔ بچپن کو یاد کرتے ہوئے کہانی میں آتا ہے کہ دور پہاڑ پر گاڑی بھر رسد پہونچائی جاتی تھی اور ساتھ میں ایک لڑکا بھی رسد کے

طور پر بھیجا جاتا ہے۔ راوی کے والدین اس گاؤں کو چھوڑ کر دوسرے گاؤں چلے جاتے ہیں، وہاں کچھ دنوں تک تو ٹھیک رہتا ہے مگر پھر اس گاؤں سے بھی رسد جانے لگتی ہے اور ایک دن راوی کو رسد کے ساتھ بھیجنے کی تجویز رکھی جاتی ہے اور اسے سجایا سنوارا جاتا ہے ــــ سریندر نے ناانصافی ظلم اور تشدد کے خلاف یہ کہانی علامتی انداز میں لکھی ہے جو ان کا اپنا حصہ ہے۔ بکاسورا بد بھیم کا تو یہاں ذکر بھی نہیں ہے۔ پھر بھی قاری بنیادی کہانی سے جڑ جاتا ہے۔

دوسری کہانی اسی موضوع پر شرون کمار ورما نے لکھی ہے. عنوان ہے: "کچھ نہیں ہوگا"

پانچ چھ ہزار سال بعد شہر کے چوراہے پر پڑی لاش جسے بھیم نے وہاں چھوڑ دیا تھا۔ اس میں حرکت ہونے لگتی ہے یہ خبر دھیرے دھیرے سارے شہر میں پھیلتی ہے اور سارا ماحول خوف اور تناؤ سے بھر جاتا ہے۔ ماحول کی زندہ عکاسی کی گئی ہے لوگ حکام سے اپنی حفاظت کی درخواست کرتے ہیں۔ حکام ان کی حفاظت کا وعدہ کرتے ہیں۔ کچھ دنوں بعد وہ متحرک لاش وہاں سے غائب ہو جاتی ہے... مگر ایک دن کوئی بتاتا ہے کہ اس نے بکاسور کو دیکھا ہے۔ دوسرا کہتا ہے ابھی ابھی اس نے آفس میں بکاسور کو کرسی پر بیٹھے دیکھا۔ رات دن لوگ چوراہے پر کھڑے ہیں کہ کب مہابھارت کا زمانہ آئے اور وایو پتر بھیم پیدا ہو۔ شاید وہ پاگل ہو چکے ہیں۔ پھر شاچار پر لکھی گئی اس کہانی میں منوں خوراک کھانے والا بکاسور ہے۔ رشوت خور سرکاری ملازم جن کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا۔

ستیہ وان ساوتری کی کہانی مہابھارت کے تیج درتا مہاتمیہ (وراٹ پرو) میں شامل ہے۔ اس پر جگر بریلوی کی مثنوی "پیام ساوتری" داستانوی ڈھنگ سے بیان کی گئی ہے۔

راجندر سنگھ بیدی کی کہانی "اپنے دکھ مجھے دیدو" میں مدن کی بیوی اِندو جب حاملہ ہوتی ہے تب مدن اس کی موت کے اندیشے سے ڈر کر اس سے کہتا ہے ــ "تجھے کچھ نہ ہوگا اِندو ــ تجھے میں موت کے منہ سے چھین کر لے آؤں گا۔ اب ساوتری کی نہیں ستیاوان کی باری ہے۔"

دروپدی مہابھارت کے رونما ہونے کی وجہ ہے! اس کہانی میں راجندر سنگھ بیدی لکھتے ہیں:

مدن کی نگاہیں اور اس کے ہاتھوں کے دشاسن صدیوں سے اس دروپدی کا چیر ہرن کرتے تھے جو عام طور پر بیوی کہلاتی ہے۔ لیکن ہمیشہ اسے آسمان سے تھان کے تھان کپڑوں کے گز کپڑا ننگاپن ڈھکنے کے لیے ملتا آیا ہے۔ دشاسن تھک ہار کر یہاں وہاں گر پڑے تھے۔ لیکن دروپدی وہیں کھڑی تھی۔ تقدس کی سفید ساری میں دیوی لگ رہی تھی!

یہاں پر مدن شخص اور دروپدی عورت کی نمائندہ ہے۔ شخص جُوا ہارنے والی پانڈو ہے۔ چیر ہرن کرنے والا دشاسن ہے اور حیا ڈھانکنے والے کرشن بھی ہیں۔ شخص کے اندر سبھی چھپے ہیں۔ بُرے لوگ اور عظیم لوگ جو ظالم بھی ہیں اور مظلوم بھی، رحم دل بھی ہیں۔ اور مکار بھی۔ عورت جو پیدائش سے بھولی ہے کئی بھیم اور کئی کرشن مدد کے لئے کھڑے ہیں!

"دروپدی سنئے ٹیک کی" اس نظم پر کرشن موہن نے ایک نئے پہلو پر نظر ڈالی ہے۔

اور اس نے اپنے وکش ایک تنگی چادر سے ڈھکے
انساد کا جھگڑا اور بھرم ٹوٹا
مٹائے بدھی کے جھگڑے

مچلتی محفلِ شب میں
وہ دھیرے دھیرے برہنہ ہو رہی تھی مسکراتے
اور لہراتے
ادا چھیڑتی تھی محفل میں بیٹھے ہر دلکش پر
نئے یُگ کے چھبیلے، چنچل دریودھن
تماشہ دیکھتے تھے اور بہلتے تھے مچلتے تھے۔
مگر کوئی زبردستی نہ کرتا تھا۔
کہ خود برہنہ ہو کر وہ ناچ اور پرستا میں مگن تھی
اس کو نہ تھی
کرشن کی رکشا کی ضرورت ایسے میں۔

یہاں کرشن موہن کی نئی یگ کی دروپدی ۔کیبرے ڈانسر ہے۔ یہ موازنہ کس حد تک مناسب ہے یا نہیں، متنازعہ فیہ ہوگا۔ دروپدی کے ایک سے زائد شوہروں کا ہونا اس کی وجہ ہو سکتی ہے۔ اسی موضوع پر مشہور افسانہ نگار جوگیندر پال کی کہانی ''مہابھارت کی دوسری جنگ'' ہے۔

ایک شخص کی دروپدی نامی طوائف سے ملاقات ہوتی ہے اور وہ یہ کہانی سنا رہی ہے ـــ وہ طوائف ہے مگر بھگوان کرشن کی بھگت ہے۔ ہمیشہ پوجا پاٹھ اور آرتی میں مصروف رہتی ہے۔ اور مہابھارت کے خاص واقعات کے حوالے دیتی رہتی ہے۔ وہ چُھپ کر رویا کرتی ہے اور پوچھنے پر کہتی ہے ''کہیں اس کے گاہک باپ یا بھائی نہ نکلیں''۔

وہ جسم بیچتی ہے اور خدا سے دعا کرتی ہے ـــ کہ اے خدا جس طرح تو نے ماں دروپدی کی لاج رکھی میری بھی رکھ ـــ پھر وہ یہ بھی کہتی ہے ''پردے میں میرا پردہ چلتا رہے اور آبرو کے ساتھ روزی روٹی چلتی رہے ـــ'' زندگی کے بارے میں وہ کہتی ہے ''جیون ایک یُدھ ہے پہلے لوگ تلوار سے لڑتے تھے اور اب سب سے بڑا ہتھیار ہے ـ ہنسی اور مزاح!''

پوری کہانی دروپدی سنا رہی ہے۔ مہابھارت کے واقعات کے حوالوں سے اور پھر یہ دروپدی سوال کرتی ہے: ''میں اکیلی اپنی آبرو کے ساتھ یہ مہابھارت کا یُدھ کیسے لڑوں؟''

افسانہ نگار کی رائے میں آج کے زمانے میں دُشاسن اور دریودھن کورو بہت ہیں مگر کرشن کہیں بھی نظر نہیں آتا۔''

مندرجہ بالا تفصیلات اور مثالوں سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اردو ادب پر مہابھارت کا اثر محدود ہے۔ ویسے تخلیق کاروں کی تعداد بھی محدود ہی ہے۔ کیوں کہ کچھ ہی نظموں شعروں اور کہانیوں میں مہابھارت مذکور ہے۔ پاکستان میں ہندو متھ پر اچھی شاعری لکھی جا رہی ہے۔ جمیل الدین عالی، صہبا اختر، ساقی فاروقی اور انتظار حسین کے فن پاروں سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ بھی یاد رہنا چاہیئے کہ کلچرل لین دین کے امکانات تبھی ممکن ہیں جب ہم سبھی مذاہب کی کتابوں کو اپنی ثقافتی وراثت تسلیم کریں۔ ان کے خیالات کو جذب کریں، دیو مالا کریں۔ اور ان سب سے مل کر نئی تخلیق ہو!

مہابھارت کا سب سے اہم کردار شری کرشن پر زیادہ تفصیل سے میں نے اس لیے نہیں لکھا کیوں کہ اردو ادب میں کرشن چھیل چھبیلا، گوکل کا گوالا، گوپیوں کا کنہیا، یشودا کا راج دلارا، نند کی آنکھوں کا تارا ہے۔ جمنا کے کنارے بنسری کی دھن پر سارے عالم کو ساکت کرنے والے اس کردار کا رشتہ شری مد بھاگوت سے ہے نہ کہ مہابھارت سے ـــ مہابھارت کے کرشن پر اردو ادب میں زیادہ نہیں لکھا گیا۔

علاوہ ازیں مسلمانوں میں رس خان، رحیم شاہ برکت اللہ شاعرہ تاج اور شیخ رنگ رنجبو وغیرہ نے پچھلی صدی میں کرشن پر شعری تخلیقات لکھیں۔ اور اس صدی میں قادر بخش مبارک علی بلگرامی، وحید نظیر اکبرآبادی، مولانا ظفر علی خان، مرتضیٰ احمد خان، سید عبدالجلیل بلگرامی، حفیظ جالندھری نے کرشن کی خوبصورت عکاسی کی ہے۔ آج اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے۔ یہ اگر یہ زبان ہے۔ بھارت کی تہذیب ہے۔ اس میں پریم چند، کرشن چندر، بیدی، رام لال، جوگیندر پال، سریندر پرکاش، طبراج مین را، گوپی چند نارنگ، گیان چند جیسے سو سے زائد ہندو فنکار ادب لکھ رہے ہیں۔ جب دونوں فرقوں کے مسائل ایک سے ہیں۔ جیون مارگ ایک سا ہے تو دونوں کا ادب میں عکس و خیال یکساں ہونا فطری ہوجاتا ہے۔ اپنے مسائل نئی تکنیک سے پیش کرنے کے لیے قدیم کتابوں پرانوں وغیرہ کے متھ اور علامتوں سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔ کمی ہے صرف ان کتابوں کے ٹھیک اور سنجیدہ مطالعہ کی۔ سریندر پرکاش، سلام بن رزاق، کنول سین، کمار پاشی جیسے ادیبوں کی تخلیقات پڑھ کر ایسی امید کی جا سکتی ہے کہ اس ضمن میں مستقبل روشن ہے۔

* اسحاق ملک
حیدرآباد اے پی ۲۴

عید

جلوہ گر جب نہیں وہ یارِ عید
کیف پرور نہیں بہارِ عید
ہم وہ محرومِ دید ہیں جنکو
عید پر بھی ہے انتظارِ عید
چاند اُدھر اور تم اِدھر نکلے
آگیا ہم کو اعتبارِ عید
آؤ للہ پھر گلے ملنے!
آگئی صبح زرنگارِ عید!
کر ادا رسم شانِ محبوبی
دے کوئی تحفہ یادگارِ عید
عید کے ساتھ تم جو آجاؤ
اور پُرکیف ہو بہارِ عید
غم کے ماروں کی عید کب ہوگی
مدتوں سے ہے انتظارِ عید
اے ملک ہم کو مل نہیں سکتی
جس خوشی پر ہے انحصارِ عید

امان اللہ خان شیروانی

(پرنسپل اسلامیہ کالج
اٹاوہ ۔ یو۔پی)
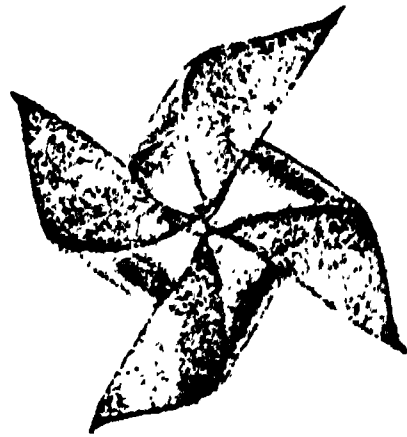
تعلیم کا نیا روپ اور نیا سروپ

تعلیم اور سماج کے باہمی تعلق اور رشتہ کے متعلق ماضی میں بڑا اختلاف رائے رہا ہے۔ کچھ علماء اور اکابرین کا خیال تھا کہ "تعلیم برائے تعلیم" ہونا چاہیئے یعنی 'تعلیم' کا مقصد صرف علم حاصل کرنا یا معلومات میں اضافہ ہے جبکہ دوسرے اہلِ دانش کے خیال میں "تعلیم" سماج میں تبدیلی لانے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ ایک اور طرزِ فکر یہ بھی تھا کہ 'تعلیم' مکمل طور پر اپنے ماحول اور حالات کے تابع ہوتی ہے اور سماجی سیاسی اور اقتصادی حالات کی تبدیلی کے ساتھ 'تعلیم' کے مقاصد اور نظام تعلیم بدلتے رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ 'تعلیم' کے متعلق یہ سب نظریات صرف تصویر کا ایک رخ دیکھتے ہیں۔ 'تعلیم' کے مقاصد اور انکی وضاحت کیلئے اُسے ہر رُخ سے دیکھنا اور سمجھنا چاہیئے۔ تعلیم اپنے حالات سے متاثر ضرور ہوتی ہے لیکن ان پر اثر انداز بھی ہو سکتی ہے اسی لیئے سماجی انقلاب اور تہذیبی، تمدنی ارتقاء اور ترقی کے لئے تعلیم ہی بہترین وسیلہ ہے اور اسی کے ساتھ قومی مقاصد پورے کرنے کا ایک ذریعہ بھی ہے۔ تعلیم کا مقصد نوجوانوں کو حالات سے باخبر کرنا اور ان کی معلومات میں اضافہ کرنا ضرور ہے لیکن اسی کے ساتھ انہیں اپنے پیروں پر کھڑے ہونے اور سماج کا ایک مفید رکن بننے میں مدد کرنا بھی ہے۔

تعلیم ہی کے ذریعہ انسان خود کو اس قابل بناتا ہے جس سے وہ طبعی اور قدرتی وسائل کا بھرپور استعمال کرکے اپنی اور سماج کی زندگی کو آرام دہ اور خوبصورت بنا سکے اور حال اور مستقبل کی دشواریوں کا مقابلہ کر سکے۔ 'تعلیم' اقتصادی اور معاشی ترقی میں معاون ہوتی ہے اور تعلیم ہی سماج کی آزادی اور بقا کی ضامن بھی ہوتی ہے۔ اسی لئے تعلیم کا انسان کی نشو و نما اور ترقی سے بڑا گہرا رشتہ ہے۔ اگر ایک طرف یہ سماج کو ترقی کی طرف لے جاتی ہے تو دوسری طرف اسے بھی سماج کی بدلتی قدروں اور تیز رو تبدیلیوں کا ساتھ دینا چاہیئے۔ اسی طرح سماج اور تعلیم میں دوطرفہ رشتہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

عالمی بینک نے اپنی ایک دستاویز میں لکھا ہے کہ "زراعت صنعت و حرفت اور تجارت کی طرح تعلیم کو قومی نشو و نما اور ترقی کا صرف ایک حصہ سمجھنا مناسب نہیں کیونکہ تعلیم قومی ترقی کے ہر ادارے میں سرایت کر کے خود اسکا ایک اثر دار اور اہم جزو بن گئی ہے اور ہر طرح ترقی میں حصہ دار ہو گئی ہے۔"

جب تعلیم کو قومی ترقی کا ایک اہم اور تکمیلی جزو تسلیم کر لیا گیا تو تعلیم کو قومی ترقی کے سب ہی عناصر سے باہمی ربط اور رشتہ قائم کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ ایک تعلیمی درسگاہ کیلئے لازمی ہے مگر

اسکا رشتہ اپنے علاقہ کے اسپتال، کارخانوں، تجارتی اداروں، پیشہ ورانہ تربیت دینے والے اداروں اور لوکل انتظامیہ سے قائم ہو تاکہ درسگاہ کے پروگراموں اور اس کی ترقی میں مدد ملتی رہے اور اس کے ساتھ تعلیمی درسگاہ بھی اپنے علاقہ کے سماجی اداروں کو ہر طرح کی امداد پہنچاتی رہے اس قسم کے روابط کیلئے دائرہ بڑا وسیع ہے اور یہ دو طرفہ روابط اور تعلقات دونوں کے لئے سود مند ثابت ہو سکتے ہیں۔

ایک ماہرِ تعلیم کا قول ہے کہ "تعلیم خود ایک عالم بھی ہے اور پورے عالم کا عکس بھی"۔ حقیقت یہ ہے کہ 'تعلیم' ایک طرف سماج کی تابع ہے تو دوسری طرف یہ سماج کے مقاصد کو پورا کرنے کا ذریعہ بھی ہے۔ سماج کے یہ مقاصد صرف تمدنی اور تہذیبی ہی نہیں ہوتے بلکہ اقتصادی اور معاشی بھی ہوتے ہیں مثلاً غریبی دور کرنے، دولت پیدا کرنے، معیارِ زندگی بلند کرنے اور امیری و غریبی کا فرق مٹانے کے لئے بھی 'تعلیم' ایک ذریعہ بن سکتی ہے۔ اس طرح تعلیم سے ہماری تہذیبی، اخلاقی اور روحانی ترقی ہی نہیں ہوتی یہ مادی ترقی کا بھی وسیلہ ہے۔ لیکن ان سب ذرائع اور طاقتوں کے ساتھ تعلیم اپنے چاروں طرف کے طبعی حالات اور سماجی روایات کا بھی اثر قبول کرتی ہے۔ اپنے چاروں طرف سے آنکھیں بند کرکے نہ تو تعلیمی کام کرنے والے صحیح طور پر کام کر سکتے ہیں اور نہ تعلیمی عمل ہی جاری رہ سکتا ہے۔ ایسی تعلیم جس کا کوئی تعلق اور رشتہ اپنے ماحول سے نہیں ہوگا وہ تعلیم ناقص اور نامکمل ہوگی اسلئے اب تعلیمی اداروں کو دوسرے تعلیمی اداروں سے یا تعلیمی فلسفہ میں کام کرنے والے عناصر سے ہی ربط و تعلق نہیں رکھنا چاہیئے بلکہ غیر تعلیمی اداروں اور غیر تعلیمی عناصر سے بھی پورا رشتہ قائم کرنا چاہیئے کیونکہ ان عناصر سے بھی تعلیمی عمل میں بڑی مدد حاصل ہوتی ہے اور دوسری طرف خود تعلیم کو ان غیر تعلیمی عناصر پر اثر انداز ہوکر سماج کے لوگوں کی خدمت کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اسی لئے اسکولوں میں "کمیونٹی سروس" کا نظریہ سامنے آیا ہے۔ اب اسکولوں کو صرف بچوں کے لکھانے پڑھانے کا کام ہی نہیں کرنا چاہیئے بلکہ بچوں کے والدین اور اپنے علاقہ میں رہنے والے سب ہی لوگوں کی ناخواندگی دور کرنے اور انہیں روشن خیال بنانے میں بھی مدد کرنا چاہیئے انکی سماجی و ثقافتی خدمت بھی انجام دینا چاہیئے اور ان کی معاشی ترقی میں بھی معاون بننا چاہیئے۔

تعلیم کا مقصد صرف فرد کی معلومات میں اضافہ کرنا یا اسکے ذہنی فوائد کے لئے کسی ہنر یا حرفت میں تربیت دینا ہی نہیں ہے اسکا مقصد قومی اور سماجی ترقی بھی ہے۔ اب تعلیم حاصل کرنا صرف دولت مندوں اور چنیدہ لوگوں کا ہی حق نہیں رہ گیا ہے بلکہ اب یہ تمام انسانوں کا حق بن گیا ہے۔ اب انسان چاہے کسی طبقہ یا نسل سے تعلق رکھتا ہو کسی مذہب یا قوم کا فرد ہو یا کسی بھی علاقہ کا رہنے والا ہو تعلیم حاصل کرنا اسکا پیدائشی حق ہے۔ اسی طرح تعلیم کا عمل بھی صرف چیدہ جگہوں پر ہی نہیں ہوتا اس کی پہونچ ملک کے ہر گوشہ اور طبقہ تک ہوگئی ہے۔ اب یہ سب کا حق ہے کہ سب ہی لوگ فرسودہ رسم و رواج اور غیر صحت مند اور منفی روایات کو چھوڑ کر جدید سائینٹیفک اور تکنیکی کھوج سے فائدہ اٹھائیں اور اپنا معیارِ زندگی بلند کرنے کی جدوجہد میں شامل ہوں۔ اسی لئے ۶۶-۱۹۶۴ کے تعلیمی کمیشن نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا "تعلیم کو زندگی کی ضرورتوں اور لوگوں کی آشاؤں سے ربط رکھنا چاہیئے اور اسے سماجی، اقتصادی، اور تہذیبی تبدیلیوں کا ایک طاقتور ذریعہ بننا چاہیئے۔"

حکومتِ ہند نے اپنی قومی پالیسی برائے تعلیم، ۱۹۶۸ میں بھی تعلیم اور سماج میں ایک قریبی ربط قائم کرکے تعلیم کو سماجی تبدیلیوں کا ایک اہم ذریعہ بنانے پر زور دیا تھا۔ اسی پالیسی اعلان میں کہا گیا تھا کہ "نظامِ تعلیم اس قسم کا ہونا چاہیئے جس سے تعلیم کی پہونچ عوام تک اور ہر فرد کی پہونچ تعلیم تک باآسانی ہو سکے۔" اب چونکہ تعلیم کو قومی مقاصد پورے کرنے قوم و سماج کی تعمیرِ نو میں پورا حصہ لینا ہے اسلئے اب تعلیم مندرجہ ذیل کاموں میں بڑا اہم اور کلیدی رول ادا کر سکتی ہے۔

(۱) ایسے سماج کی تشکیل جس میں برابری اور مساوات ہو۔

(۲) ایسی فضا تیار کرنا جس سے قوم سماج کی تعمیرِ نو میں پوری مدد ملے۔

(۳) قوم میں سائینٹیفک مزاج پیدا کرنا۔

(۴) نیشنلزم اور سیکولرازم کے نظریات کو فروغ دینا۔

(۵) ملک کے لوگوں کو بڑھتی ہوئی آبادی کی خرابیوں کی طرف توجہ دلانا۔

(۶) غریبی کو دور کرنا۔

(۷) سماج میں ناخواندگی کو دور کرنا

(۸) فرسودہ اور تباہ کن سماجی روایات اور سماجی برائیوں کو دور کرنا۔ جیسے ستی کی رسم، جہیز کی رسم، کالا بازاری اور ذخیرہ اندوزی وغیرہ۔

بھارتی دستورِ اساسی، ساوات، انصاف، آزادی اور بھائی چارہ کی ضمانت دیتا ہے۔ اسی دستور میں چھوت چھات کے خلاف قوانین بھی ہیں لیکن پھر بھی ملک میں ناانصافی، چھوت چھات اور فرقہ پرستی قائم ہے۔ مرد اور عورتوں کے درمیان، دیہاتی اور شہری آبادی کے درمیان مختلف مذاہب اور فرقوں کے درمیاں عدم مساوات اور ناانصافی بڑھتی جارہی ہے اور آج بھی ملک کی ایک بڑی آبادی فرسودہ اور دقیانوسی روایات اور توہم پرستی کا شکار ہے۔ حالانکہ ملک میں خواندگی میں کافی اضافہ ہوا ہے مگر ابھی تک ½ آبادی ناخواندہ ہے۔ اسلئے اب سوال یہ ہے کہ کیا موجودہ نظام تعلیم ان سب برائیوں کو دور کرنے کا اہل ہے؟ اور کیا وہ ہندوستانی سماج کو اندھیرے سے اُجالے میں لانے کی طاقت رکھتا ہے؟ اگر جواب نفی میں ہے تو پھر تعلیم کو اسکا اہل اور طاقتور بنانا ہوگا۔ اب تعلیم کا سب سے اہم مقصد یہی ہے کہ اس کے ذریعہ سماج میں تبدیلی لائی جائے اور اس دور کی تاریکیوں کو دور کیا جائے۔

موجودہ تعلیم کے بارے میں چند مزید اہم سوالات سامنے آتے ہیں۔ کیا ہمارا تعلیمی نظام قومی ترقی کے دائرہ سے الگ ہے؟ کیا یہ طلبا ر اور سماج میں کسی قسم کی بیداری پیدا کرنے کا وسیلہ نہیں بن سکتے؟۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے اسکول اور کالج اپنی مقررکردہ حدود سے باہر نکلنے اور درس و تدریس کے راستہ سے کچھ ہٹ کر آگے بڑھنے کی بات ہی نہیں سوچتے انکا بس ایک ہی کام ہے طلباء کی معلومات میں اضافہ کرنا اور انہیں امتحان پاس کرانا۔ اب تو صرف امتحان پاس کرانا ہی ہماری تعلیمی درسگاہوں کا نصب العین بن گیا ہے۔ ہمارے تقریباً سب ہی اسکول و کالج اب صرف امتحان پاس کرانے والے مقصد کو سامنے رکھ کر ہی کام کرتے ہیں۔

بقول ڈاکٹر زیدی

"تعلیم تو انسانی ترقی کے لئے ایک قسم کی سرمایہ کاری ہے اور اس لئے معاشی اور اقتصادی ترقی کا اصل محرک اور موجد تعلیم ہی ہو سکتی ہے۔ تعلیم سماجی تبدیلیوں کے لئے سب سے اہم ذریعہ ہے اس لئے ملک و قوم کی فلاح و بہبودی اور اقتصادی اور سماجی ترقی کا دار و مدار تعلیم پر ہی ہے۔ تعلیم کو اب اجتماعیت اور سماجیت میں رنگ جانا چاہیئے اور درسگاہوں کو طلباء کی تعلیم کے ساتھ عوام کی تعلیم کا بھی انتظام کرنا چاہیئے۔

تعلیم کے اس نئے روپ میں اسکولوں اور کالجوں کا رول:

اب تک اسکول اور کالج ایسے محل سمجھے جاتے تھے جن کو زمانہ کی ہوا تک نہیں لگنے دی جاتی تھی۔ انہیں سماج کے بُرے اثرات سے بچایا

جاتا تھا۔ ان درسگاہوں کے منتظمین اور اساتذہ جیسا چاہتے تھے۔ ان کو "علم کے پاک مندر" کہا جاتا تھا اور عوام کو بہت کم معلوم ہوتا تھا کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ لیکن آج کے جمہوری اور عوامی دور میں یہ محل سب کے لئے کھول دیئے گئے ہیں۔ اب تعلیمی درسگاہوں اور باہر کی دنیا کے تعلقات دن بدن بڑھتے جا رہے ہیں۔ اس دور میں اسکولوں اور کالجوں کو صرف نئی نسل اور بچوں کی تعلیم و تربیت کے مراکز کا کام ہی انجام نہیں دینا بلکہ انہیں سماج کے لئے تمدنی اور تہذیبی رہنمائی کا کام بھی دینا ہے۔ انہیں اپنے حلقہ اور سماج میں تعلیم اور روشن خیالی کو بھی فروغ دینا ہے۔ پرانی، دقیانوسی اور نقصان دہ رسم و رواج کے خلاف آواز اٹھانا ہے اور سماجی زندگی کے مراکز بن کر اس کی ترقی اور فلاح بہبود کے کاموں میں آگے بڑھ کر حصہ لینا ہے۔

تعلیم حاصل کرنے والے نوجوانوں اور سماج کے دوسرے لوگوں کے لئے ضروری ہے کہ ان دونوں کے درمیان قریبی تعلق ہو۔ اسی میں دونوں کا مفاد ہے۔ سماج کو اسکولوں اور کالجوں سے اپنے سماجی اور ثقافتی کاموں میں رہنمائی ملتی ہے تو دوسری طرف اسکولوں اور کالجوں کو تعلیمی عمل کے لئے ہر قسم کی مدد حاصل ہوتی ہے۔ کمیونٹی کے بزرگ اور تجربہ کار طبقہ سے تعلیم کے عمل میں پورا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ حقیقت میں نئی نسل کو سماج کے تجربہ کار بزرگ طبقہ سے علیحدہ کر دینے سے اس کو زندگی کے مسائل سمجھنے میں بڑی دشواری آتی ہے اور اس کی تعلیم صرف "کتابی تعلیم" ہو کر رہ جاتی ہے۔ جو کچھ بچے کتابوں اور اساتذہ سے سیکھتے ہیں اس کا عملی تجربہ حاصل کرنے کیلئے انہیں اپنے شہر، قصبہ، گاؤں اور محلوں کی زندگیوں کے عمیق اور گہرے مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

حصول علم کے لئے کتابوں اور اساتذہ کے ساتھ عوام بھی ایک وسیلہ ہیں۔ عوام علاقائی، سماجی اور معاشی اعتبار سے مختلف گروہوں میں بٹے ہوتے ہیں اس لئے تعلیمی عمل کو لوکل علاقائی اور سماجی حالات سے ہی تجربہ حاصل کرنا لازمی ہے۔ اس طرح علاقہ کے عوام کو اسکول سے بہت کچھ سیکھنا بھی تعلیمی عمل کا ایک حصہ ہے۔ اس کے لئے اسکولوں اور کالجوں میں "کمیونٹی سروس" کے مراکز بڑی اہمیت کے حامل ہیں یوں بھی اسکولوں کالجوں میں درس و تدریس کے کام صرف چند گھنٹوں کے لئے ہی ہوتے ہیں اور کافی وقت اسکول کی عمارتیں فرنیچر اور عملہ خالی رہتا ہے۔ اس لئے شام اور رات کے اوقات میں یہاں تعلیم بالغان، آئندہ تعلیم (Further Education) اور پیشہ ورانہ تعلیم کے مراکز بنائے جا سکتے ہیں۔ اسکولوں کی لائبریریوں کو عوام کے لئے کھولا جا سکتا ہے۔ جدید نظریہ تعلیم میں اسکولوں اور کالجوں کے ان کاموں کو بھی بڑی اہمیت دی جا رہی ہے۔ ہندوستان جیسے غریب اور ترقی پذیر ملک کے لئے عملی درسگاہوں میں سماجی کاموں اور سماجی فلاح و بہبود کے مراکز قائم کرنا نہ صرف فائدہ

مند ہے بلکہ کفایتی بھی ہے۔ اس ملک میں نئی نسل کو تعلیم یافتہ بنانے کے ساتھ عوام میں بیداری پیدا کرنا بھی ضروری ہو گیا ہے قومی یکجہتی قائم کرنے معاشی نابرابری کو دور کرنے، تندرستی اور صفائی کے متعلق عوام کو آگاہ کرتے بڑھتی ہوئی آبادی کی خرابیوں کو سمجھانے وغیرہ اور بہت سے فلاح و بہبود کے کام ان کمیونٹی مراکز سے انجام پا سکتے ہیں اور ان کاموں میں اساتذہ کی بھی مدد لی جا سکتی ہے۔

ڈاکٹر سید حامد حسین
ای ۷/۱۸۳، پروفیسرز کالونی
بھوپال (ایم پی) ۴۶۲۰۰۲

کھیلوں کے لفظ، لفظوں کا کھیل

انسان نے اپنی تفریحِ طبع کے لیے طرح طرح کے کھیل ایجاد کیے ہیں۔ اور ان کھیلوں کو قسم قسم کے نام دیئے ہیں۔ یہ نام اور کھیلوں کی دنیا سے تعلق رکھنے والے دوسرے الفاظ کس طرح شروع ہوئے اور ہم تک کس طرح پہونچے یہ بذاتِ خود ایک دلچسپ مشغلہ ہے اور کسی کھیل سے کم نہیں۔

مثلاً مختلف ٹیموں یا کھلاڑیوں کے درمیان مقابلے کا ایک طریقہ راؤنڈ رابن کہلاتا ہے۔ اس طریقے کے تحت ہر ٹیم یا کھلاڑی کو مقابلے میں شامل ساری ٹیموں یا کھلاڑیوں کے ساتھ ایک ایک بار کھیلنا ضروری ہوتا ہے۔ راؤنڈ رابن دراصل ایک فرانسیسی فقرے کی بدلی ہوئی شکل ہے جس میں "رابن" کو ایک ایسے لفظ کی جگہ دیا گیا ہے جس کا مطلب فیتہ یا ربن ہوتا ہے۔ ابتدا میں اس کا کھیل سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

سترہویں اور اٹھارویں صدی میں جب فرانس میں جابر بادشاہوں کی حکومت تھی، بادشاہ کسی شکایت کو سننے کے لیے تیار نہیں تھے اور اگر کچھ لوگ اپنے دستخطوں سے بادشاہ کو شکایتاً عرضی دیتے تو جس شخص کے دستخط سب سے اوپر ہوتے اُسے سازش کا سرغنہ قرار دے کر سزائے موت دے دی جاتی اس سے بچنے کے لیے لوگوں نے یہ طریقہ نکالا کہ وہ کاغذ کی ایک ایسی پٹی پر دستخط کرتے جس کے سرے چپکا کر ایک حلقہ بنالیا جاتا۔ اس طرح یہ معلوم کرنے کا کوئی طریقہ نہیں رہتا کہ سب سے پہلے کس نے دستخط کیے ہیں۔ کاغذ کی اسی گول پٹی کو راؤنڈ رابن کہا جاتا تھا۔ اسی طرح انگریزوں کی بحری فوج میں کسی ایک شخص پر ضد کی قیادت کے الزام سے بچنے کے لیے لوگ پہیے کی تیلیوں جیسی ترتیب میں ایک حلقے میں دستخط کیا کرتے

تھے ۔ اسے بھی راؤنڈ رابن کا نام دیا جاتا تھا۔ چنانچہ کسی بھی ایسے طریقے کو جس میں کسی خاص فرد کو اولیت حاصل نہ ہو اور سب کا برابر حصہ رہے راؤنڈ رابن کہا گیا۔ اور اسی مناسبت سے کھیلوں میں سب ہی ٹیموں یا کھلاڑیوں کو باری باری ساری دوسری ٹیموں یا کھلاڑیوں سے کھیل کھلوا کر کسی ایک ٹیم یا کھلاڑی کو فوقیت نہ دینے کے اس طریقے کے لیے بھی راؤنڈ رابن کا نام اختیار کیا گیا۔

کھیلوں کے مقابلے کے لیے ٹورنامنٹ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لفظ کی تاریخ قرونِ وسطیٰ تک پہونچتی ہے اُس زمانے میں ٹورنامنٹ کی شکل خود ایک کھیل کی تھی۔ جس میں سورما زرہ بکتر پہن کر اور گھوڑوں پر سوار ہو کر کُند ہتھیاروں، تلواروں، لکڑی کے بھالوں یا بانسوں وغیرہ سے ایک دوسرے کو شکست دینے کے لیے مقابلہ کرتے اور کسی انعام یا کسی حسینہ کی نظرِ عنایت جیتنے کی تمنا کرتے۔ اس قسم کے مقابلے فرانس میں شروع ہوئے۔ اور بارہویں سے چودھویں صدی کے دوران پورے یورپ میں پھیل گئے لیکن ۱۶۰۰ء تک یہ تقریباً متروک ہو گئے۔ ٹورنامنٹ کا لفظ ایک لاطینی لفظ سے بنا ہے جس کے معنی "گھمانا" ہیں یعنی گھوڑے کو اس طرح چکر دینا کہ حریف کا وار بچایا جا سکے۔ "ٹور" کا لفظ آج بھی دفتر کے لوگ "دورہ" کیلئے استعمال کرتے ہیں۔

کھیلوں کا مقابلہ جیتنے والوں کو اکثر ٹرافیاں دیجاتی ہیں لیکن قدیم زمانے سے آج تک ٹرافی نے طرح طرح کی شکلیں بدلی ہیں۔ ٹرافی جس یونانی لفظ سے نکلا ہے اُس کا مطلب دشمن کو بھگانا اور شکست دینا ہوتا ہے اور شروع میں ٹرافی کا لفظ جنگ میں فتح کے لیے بنائی گئی یادگار کے واسطے آتا تھا۔ اس کی شکل یہ ہوتی تھی کہ دشمن سے جو ساز و سامان اور ہتھیار ہاتھ لگتے تھے انھیں ایک جگہ ڈ[...] کر دیا جاتا تھا اور ارد گرد کے درختوں پر جھنڈے لگا کر انھیں دیوتاؤں کو چڑھاوے کی حیثیت دی جاتی تھی [...] اس قسم کی مستقل یادگاریں بنانے کا رواج ہوا تو انھیں بھ[ی] ٹرافی کہا جانے لگا۔ بعد میں ان یادگاروں میں شامل ہتھیاروں وغیرہ کی تصاویر کا عمارتوں میں اندرونی آرائش کے لیے استع[مال] ہونے لگا۔ شکاری اپنے شکار کیے ہوئے جانوروں کے سینگوں اور سروں وغیرہ کو یادگار اور آرائش کی طور پر لگا[نے] لگے۔ انھیں بھی ٹرافی کہا جاتا تھا۔ کھیلوں وغیرہ کے مقابلو[ں] میں جیت کی یادگار کے طور پر جو چیز دی گئی اور اُسے فخر[یہ] طور پر لوگوں نے اپنے دیوان خانوں میں رکھنا شروع کیا اُسے بھی اسی مناسبت سے ٹرافی کہنے لگے۔

کھیلوں میں ایک خاص مقابلہ آج کل جمناسٹکس کا ہوتا ہے۔ یہ اُن کھیلوں سے تعلق رکھتا ہے۔ جو جسمانی ورزش کے مختلف طریقوں سے نکلے ہیں۔ جہاں تک لفظ جمناسٹک کا تعلق ہے وہ ایک ایسے یونانی لفظ سے نکلا ہے جس کا مطلب "ننگا" یا "عُریاں" ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ قدیم یونان میں لوگ جسمانی ورزش بغیر کپڑوں کے کرتے تھے کیوں کہ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ ننگے بدن ورزش صحت کے لیے بہت مفید ہوتی ہے۔ لہٰذا دوڑوں کے مقابلے میں بھی کھلاڑی بلا لباس کے شریک ہوتے تھے اور ان کھیلوں میں تماش بین کے لحاظ سے بھی عورتوں کی موجودگی ممنوع تھی۔ شروع میں یہ ورزشیں اور کھیل کھلے میدان میں ہوتے تھے بعد میں ان کے لیے خاص قسم کا سامان استعمال ہونے لگا اور وہ جگہ جہاں اس قسم کی تربیت کا انتظام ہوتا تھا اُسے جمنازیم کا نام دیا گیا۔

ہندوستان میں انگریزوں نے کئی مقامات پر جم

خانوں کی سرپرستی کی۔ حالانکہ جم خانہ کا لفظ جمنازیم کا ترجمہ ہے۔ ان عمارتوں میں جمناسٹکس وغیرہ کی سہولتیں کم ہی ہوتی تھیں۔ زیادہ تر کمرے کے اندر یا کورٹ پر کھیلے جانے والے کھیلوں کا انتظام ہوتا تھا۔ جم خانہ سب سے پہلے غالباً ممبئی میں قائم کیے گئے اور ریکیٹ کورٹ کے لیے استعمال ہونے والے لفظ "گیند خانہ" کے مثل "جم خانہ" نام رکھا گیا۔ قدیم ترین ریکارڈ سنہ ۱۸۶۱ء میں رُڑکی کے جم خانہ کا ملتا ہے۔

آج کل کھیل کے میدانوں کے ساتھ جو عمارتیں بنائی جاتی ہیں ان کے ایک خاص حصّے کو پویلین کہا جاتا ہے لیکن شاید آپ کو یقین نہ آئے کہ جس لفظ سے "پویلین" نکلا ہے اُس کے معنی تتلی کے ہوتے ہیں۔ شروع میں یہ لفظ شامیانے کے لیے استعمال ہوا کیوں کہ ہوا کے زور سے جھولتا ہوا شامیانہ تتلی کی طرح لگتا تھا۔ پھر یہ لفظ کسی بھی ایسی چیز کے لیے استعمال ہونے لگا جس میں شامیانے جیسی چھت ہو۔ جیسے بڑا خیمہ یا باغ میں بنائی گئی سایہ دار جگہ۔ بعد میں اصل مکان سے علیحدہ کسی مختصر تعمیر کو پویلین کہا جانے لگا۔ اور اسی اعتبار سے اسٹیڈیم کے ایک حصے کو پویلین کا نام دیا جانے لگا۔

خود کھیلوں کے بھی عجیب رنگ ڈھنگ ہیں مثلاً آپ بیڈمنٹن کے پتے پر خط لکھ سکتے ہیں کیوں کہ اس سے پہلے سے کہ بیڈمنٹن نام کے کھیل کو شہرت حاصل ہو، بیڈمنٹن انگلستان کے علاقے گلوسسٹر شائر کا ایک مقام ہے جو کہ بوفرٹ کے ڈیوک کے دیہی صدر مقام کی حیثیت سے مشہور ہے جیسا کہ ہماری زندگی میں ہوتا ہے کہ بچے کو گود لینے والے کو خود بچے کے باپ کے مقابلے میں لوگ زیادہ جاننے لگتے ہیں۔ انگلستان کے اس شہر کا نام تو اس کھیل سے دلچسپی رکھنے والوں کی زبان پر چڑھ گیا لیکن مہاراشٹر کے شہر پونہ کا نام اس تعلق سے ذہن میں کبھی نہیں آتا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ سنہ ۱۸۷۵ء کے آس پاس پونے میں مقیم انگریز فوجی افسروں نے پہلے پہل اس کھیل کے اصول طے کر کے اُسے کھیلنا شروع کیا۔ انگلستان لوٹنے پر ان میں سے بعض افسر مقام بیڈمنٹن کے قرب و جوار میں جا بسے اور انھوں نے اس کھیل کو فروغ دیا جو کہ دھیرے دھیرے انگلستان کے دوسرے ساحلی علاقوں میں بھی کھیلا جانے لگا اور اس کے ساتھ بیڈمنٹن کا نام منسلک ہو گیا۔

بیڈمنٹن فوجیوں کے کھیل کی حیثیت سے اُبھرا تو کرکٹ دراصل گڈریوں کا کھیل تھا۔ خود اسکا نام گڈریوں کی لاٹھی کی یاد دلاتا ہے۔ کرک گڈریوں کی اس لاٹھی کو کہتے تھے جو ایک سرے پر مڑی ہوتی تھی اور بھیڑوں کو ہانکنے کے کام آتی تھی اس قسم کی چھوٹی لاٹھی کو کرکٹ کہتے تھے۔ گڈریوں نے اپنا وقت گذارنے کے لیے اپنی اسی لاٹھی سے یہ کھیل کھیلنے کا طریقہ شروع کیا۔ اور سنہ ۱۷۷۰ء کے قریب تک کرکٹ کے بلّے بجائے سیدھے ہونے کے آگے سے مُڑے ہوتے تھے۔ کرکٹ کا کھلاڑی اپنے بلّے سے وکٹ کو بچاتا ہے۔ دراصل وکٹ اُس چھوٹے پھاٹک کو کہتے ہیں جو باڑوں میں بڑے پھاٹک کے برابر لگا دیا جاتا ہے۔ شروع میں گڈریے یہ کھیل باڑے کے چھوٹے پھاٹک کے سامنے کھڑے ہو کر کھیلتے تھے۔ اور اسی بنا پر آج بھی کرکٹ کا کھلاڑی جن لکڑیوں کو گیند سے بچانے کی کوشش کرتا ہے انھیں وکٹ ہی کہا جاتا ہے۔ شروع میں اس کھیل کے لیے کپڑے یا اُون کی گیند استعمال ہوتی تھی جسے زمین پر لڑھکایا جاتا تھا۔ اب یہ گیند

باقاعدہ پھینکی جاتی ہے اور جو گیند باز تین مسلسل گیندوں میں کسی کھلاڑی کو آؤٹ کر دیتا ہے اس کے لیے یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے ہیٹ ٹرک کی ہے۔ یہ اصطلاح ابھی تک ایک معمہ بنی ہوئی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے یہ اصطلاح جادو کے اس کھیل سے نکلی جس میں جادوگر اپنے ہیٹ میں ہاتھ ڈال کر طرح طرح کی چیزیں برآمد کر کے لوگوں کو حیرانی میں ڈالتا ہے۔ اسی طرح کھلاڑی کی لگاتار تین بار کامیابی حیرت میں ڈالتی ہے۔ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ کہ اس قسم کے کامیاب گیند باز کو کرکٹ کلب کی جانب ایک ہیٹ بطور تحفہ دیا جاتا تھا اور اس طرح یہ اصطلاح چل نکلی۔

اب تو ہیٹ ٹرک کی اصطلاح کرکٹ کے علاوہ فٹ بال اور ہاکی وغیرہ کھیلوں میں استعمال ہونے لگی ہے جہاں کسی کھلاڑی کے لگاتار تین گول کرنے کو بھی ہیٹ ٹرک کہا جاتا ہے۔ لفظ "گول" کے بنیادی معنی تو غرض، مقصد یا منزل مقصود ہیں۔ لیکن کھیلوں میں اس لفظ کو سب سے پہلے گھڑ دوڑ میں استعمال کیا گیا۔ گول کا اس حد کو نام دیا گیا جہاں سب سے پہنچنے پر کوئی گھوڑا دوڑ کو جیت لیتا تھا۔ اس مقصد سے کہ یہ مقام دور سے دیکھا جا سکے اس جگہ پر ایک بانس لگا دیا جاتا تھا جس پر جھنڈی ہوتی تھی۔ بعد میں فٹ بال وغیرہ کھیلوں میں گیند کو پھینکنے کے لیے مقرر کی گئی جگہ کو بتانے کے لیے بانس گاڑ کر اس قسم کا نشان قائم کیا جانے لگا اور اسے بھی گول کا نام دیا گیا۔ پھر اوپر بھی ایک بانس رکھ کر گول کی اونچائی مقرر کر دی گئی اور ۱۸۹۲ء سے گول میں جالی لگانے کا بھی رواج ہو گیا۔

جہاں تک دوڑوں کے مقابلوں کا سوال ہے سب سے لمبی دوری کی دوڑ میراتھن دوڑ کہلاتی ہے جس میں کھلاڑیوں کو ۲۶ میل ۳۸۵ گز کی دوری طے کرنا ہوتی ہے۔ دراصل میراتھن ملک یونان میں واقع ایک مقام کا نام ہے جو کہ ایتھنز کے شمال مشرق میں ۲۲ میل کی دوری پر ہے۔ ۴۹۰ قبل مسیح میں میراتھن میں یونانیوں اور ایرانیوں کے درمیان ایک زبردست جنگ ہوئی جس میں خلاف توقع یونانیوں کو فتح حاصل ہوئی۔ یہ خبر دینے کے لئے ڈی یڈیز نام کا ایک ہرکارہ دوڑ پڑا اور بلا کہیں رکے ایتھنز پہنچ کر وہ چلایا "خوشیاں مناؤ ہم جیت گئے" اس کے ساتھ ہی وہ گر پڑا اور اسکی جان نکل گئی۔ میراتھن دوڑ اسی ہرکارے کی یاد تازہ کرنے کے لیے دوڑی جاتی ہے۔ ۱۸۹۶ء میں اولمپک کھیلوں کے دوبارہ شروع کئے جانے پر میراتھن دوڑ کو بھی بین الاقوامی مقابلوں میں شامل کیا گیا۔ لیکن اس وقت اس کی دوری طے نہیں تھی۔ ۱۹۰۸ء میں اولمپک کھیل لندن میں ہوئے اور میراتھن دوڑ ونڈسر قلعے سے وائٹ سٹی اسٹیڈیم تک رکھی گئی جو ۲۶ میل سے تھوڑی زیادہ ہوتی تھی۔ اس میں ۳۸۵ گز کا اضافہ اس وجہ سے کیا گیا کہ دوڑ اسٹیڈیم میں برطانوی شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم کی سیٹ کے ٹھیک سامنے ختم ہو۔ بعد میں ۲۶ میل ۳۸۵ گز کی یہی دوری میراتھن کی باضابطہ دوری قرار دے دی گئی۔

پچھلے دنوں میں جوڈو اور کراٹے نے کافی مقبولیت حاصل کی ہے۔ "کراٹے" دراصل جاپانی زبان کے دو الفاظ "کرا" اور "تے" سے مل کر بنا ہے جس کا مطلب خالی ہاتھ ہوتا ہے۔ یہاں "خالی" سے مراد "بغیر کسی ہتھیار کے" ہے دراصل اس فن کو ان بدھ بھکشوؤں نے ایجاد کیا تھا جو دور دراز علاقوں میں اپنی خانقاہوں میں رہا کرتے تھے۔ لیکن بعض اوقات انہیں حملہ آور ڈاکوؤں سے مقابلہ کرنا پڑتا تھا بدھ بھکشو کیونکہ اہنسا کے پابند تھے اس لیے کسی قسم

۔۔یار رکھنا یا اس کا استعمال کرنا اُن کے لیے ممنوع تھا
۔۔ذا انھوں نے اپنے بچاؤ کے لیے اس قسم کے طریقے
۔۔یار کیے جس میں صرف خالی ہاتھ یا پیروں، جسم کی
۔۔قت اور حملے کی شدّت سے ہی مخالف کو زیر کیا جاسکے۔

جوڈو بھی ایک جاپانی لفظ ہے جس کے معنی "نرم طریقہ"
۔۔تے ہیں۔ یہ دراصل جاپان کے قومی کھیل "جوجت سو"
۔۔ی ایک شکل ہے۔ "جوجت سو" کشتی کا ایک ترقی یافتہ
۔۔ہے۔ جس کے بڑے آداب ہوتے ہیں۔ انیسویں صدی
۔۔ ڈاکٹر کانو نے اس کشتی کا ایک نیا طریقہ نکالا جو کہ
۔۔جت سو" سے کم خطرناک اور پیچیدہ لیکن زیادہ موثر
۔ اس میں زیادہ پھرتی کے ساتھ مقابل کو زیر کرنے کے لیے
۔۔ده بھرپور داؤ کی گنجائش تھی۔ اسی بنا پر اس کو "نرم طریقہ"
۔۔سا کیا۔

سانپ سیڑھی کا کھیل موجودہ شکل میں ہمارے
۔۔ں انگلستان سے آیا ہے جہاں اس کا قدیم ترین ذکر
۱۸۹۔۔ء میں ملتا ہے۔ گویا اس کھیل کی ایجاد کو ابھی سو سال
۔۔ زیادہ نہیں ہوئے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ کھیل
۔۔یوں پُرانا ہے۔ اور اس کی ایجاد ہندوستان میں ہوئی
۔۔ا۔ فرق یہ ہے کہ اب اس کھیل کے لیے خانوں میں ایک
۔۔ سو تک کے عدد لکھے ہوتے ہیں۔ لیکن قدیم ہندوستانی
۔۔انقاہوں میں جب یہ کھیل رائج کیا گیا تھا اُس وقت ان
۔۔لوں میں مختلف قسم کی نیکیوں اور گناہوں کے نام درج ہوتے
۔۔ے اور سیڑھیوں اور سانپوں کی لمبائی، چھوٹی بڑی نیکیوں اور
۔۔ھوٹے بڑے گناہوں کی مناسبت سے مقرر کی گئی اور
۔۔ طرح یہ کھیل بھی اخلاقی تعلیم کا ایک ذریعہ تھا۔

تاش کا کھیل بھی صدیوں پرانا ہے اور اس کی ابتدا
بھی غالباً ہندوستان یا چین میں ہوئی تھی۔ لیکن اسوقت
جس قسم کے تاش کے پتے رائج ہیں وہ یورپ میں رائج
تاشوں کے مطابق ہیں۔ یورپ میں چھاپے کی ایجاد کے
بعد پندرہویں صدی کے آخر تک تاشوں پر دکھائی جانے
والی شکلوں میں بڑی حد تک یکسانیت پیدا ہوئی ہندوستان
میں ان چار شکلوں کو اینٹ، پان، حکم اور چڑی نام دیا گیا۔
اینٹ اور پان تو شکلوں کے مطابق ہیں لیکن حکم اور چڑی
غور طلب ہیں۔ دراصل حکم کا نام ہندوستان میں رائج
گنجفے کے کھیل سے لیا گیا ہے جس میں سب سے پہلے پھینکے
جانے والے پتے کو حکم کہا جاتا تھا۔ چڑی کے بارے میں
ایک رائے یہ ظاہر کی جاتی ہے کہ یہ ڈچ زبان میں اس پتے
کے لیے رائج لفظ "چڑتن" سے ماخوذ ہے۔ لیکن ہندوستانی
زبانوں پر ڈچ زبان کے براہ راست اثر کے کوئی شواہد نہیں
ملتے۔ اس لیے یہ ممکن ہے کہ یہ نام ترجمے کے ذریعے پہنچا ہو
اس قسم کے پتے کے لیے پرتگالی، اسپینی اور اطالوی زبانوں میں
جو لفظ استعمال ہوتا ہے اس کے معنی "چھڑی" ہوتے ہیں
(خود انگریزی لفظ "کلب" بھی اس سے قریب ہے) لہٰذا
ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پرتگالیوں کے لفظ کا ترجمہ چھڑی
اختیار کیا گیا جس نے بعد میں چڑی کی شکل لے لی۔ تاش
کے کھیل میں ترُپ کا بھی ذکر ہوتا ہے۔ یوں تو یہ لفظ انگریزی
لفظ "ٹرایمف" کی بگڑی ہوئی شکل ہے جس کا مطلب
"فتح" ہوتا ہے۔ لیکن دراصل یہ ایک پرانے لاطینی لفظ سے
ربط رکھتا ہے جو رومن کمانڈروں کے فاتحانہ جلوس کو بتانے
کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ رومن کمانڈر جنگ میں کامیابی
حاصل کرنے کے بعد دارالسلطنت میں بڑی شان و شوکت
سے داخل ہوتے تھے۔ ان کے ساتھ پوری فوج زرق برق
لباس میں ہوتی اور ان کے پیچھے پیچھے مال غنیمت اور جنگی

قیدی ہونے۔ ٹرپ کا پتا بھی اسی دبدبے کے ساتھ دوسرے پتوں کو قیدی بنا کر لے جاتا ہے۔

آخر میں "ہیپ ہیپ ہُرے" کے اس نعرے کا ذکر کریں جو فتحمند کھلاڑی اپنی فتح کی خوشی میں لگاتے ہیں۔ ہمارے یہاں یہ نعرہ انگریزوں کے ساتھ پہونچا اور انگریزی زبان میں مروّج امثال اور فقروں کی بریور کی ڈکشنری یہ بتاتی ہے کہ یہ نعرہ جرمنی سے آیا ہے اور اُس زمانے کی یاد دلاتا ہے جب یورپ میں اور خاص طور پر جرمنی میں یہودیوں کو ستانا اور ایذا پہنچانا ثواب سمجھا جاتا تھا "ہیپ" تین جرمن لفظوں کے ابتدائی حروف سے بنایا گیا تھا جن کا مطلب تھا "یروشلم باقی نہ رہا" اور "ہُرّا" کا مطلب تھا "جنت" کو۔ قرونِ وسطیٰ کے جرمن سورما جب یہ نعرہ لگاتے ہوئے یہودیوں کا پیچھا کرتے تھے تو اُن کا مطلب ہوتا تھا "کافروں کے ہاتھ میں یروشلم نہیں رہا۔ اور ہم جنت کے راستے پر ہیں" اس طرح دراصل یہ نعرہ ایک نسلی نفرت کا اظہار تھا۔

کھیلوں سے متعلق کئی اصطلاحات اور الفاظ اسطرح اپنے پیچھے انوکھی اور دلچسپ کہانیاں رکھتے ہیں اور اُن کا مطالعہ بجائے خود نئی دلچسپی کا باعث ہے۔

رقم خریداری

بذریعہ منی آرڈر بھجوائیں۔ وی۔پی۔ پی نہیں بھجوائی جاتی ہے۔ منی آرڈر کوپن پر اپنا نام و پتہ صاف صاف اردو کے ساتھ ہندی یا مراٹھی میں بھی لکھ دیں۔ اس طرح رسالہ فوراً ہی جاری ہو سکے گا۔

(ادارہ)

قاضی انصار
قاضی پورہ، کھنڈوہ (ایم پی) ۱-۴۵۰/۰۰۱

غزلیں

اے دل ترے زخموں کو ہرا کون کرے گا
اس دشت میں تسکین انا کون کرے گا

اس فعل کو لے میرے خدا کون کرے گا
انسان نہیں ہو تو خطا کون کرے گا

جب کوئی بدلتا ہی نہیں اپنی روش کو
مجھ سے مرا احساس جدا کون کرے گا

میں برسرِ پیکار ہوں باطل سے اکیلا
یہ قرض میرے سوا ادا کون کرے گا

میں اپنے ہی ہاتھوں پہ نظر ڈال رہا ہوں
انصار مرے حق میں دعا کون کرے گا

⁂

زمانہ آج بیکل ہو گیا ہے
جنوں میرا مکمل ہو گیا ہے
کوئی بن کر بگولا اٹھ رہا ہے
کوئی آوارہ بادل ہو گیا ہے
کبھی ماحول میں رنگینیاں ہیں
کبھی ماحول بوجھل ہو گیا ہے
میری امید قسمت کا ستارہ
نظر سے دور اوجھل ہو گیا ہے
کوئی انصار کو کہتا ہے دانا
کوئی کہتا ہے پاگل ہو گیا ہے

م۔ ق۔ خاں
حکیم عنایت کالونی گیا۔ (بہار)

جوان اور قابل رشک صحت، خوش حال اور ایک بے لوث
ٹ کر پیار کرنے والا شوہر ہو تو زندگی میں اور کیا چاہئے!
مجھے یہ ساری چیزیں میسر ہیں لیکن پھر بھی خوشی، دل
ت کا میرے اندر فقدان ہے، مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے
منے غم کا اتھاہ، بیکراں سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے اور
ں میں ڈوبنا ہی میرا مقدر ہے، میں ایک بے وقار، کم مایہ
ا ہوں جسے حالات کی آندھی اپنے ساتھ اڑائے لئے جا رہی
ہ. منزل کہاں ہے! مجھے اس کا کوئی پتہ نہیں۔
میرے دیوتا، میرے مجازی خدا! دنیا والوں کے
منے میں تمہیں مورد الزام نہیں ٹھہرا سکی۔ لیکن — کیا
، چاہوں بھی تو تمہیں بری الذمہ کر سکتی ہوں؟ تمہارا
م یہ ہے کہ تم نے مجھ جیسی بدنام، پستی میں گری عورت
ے شادی کر لی۔ تم شاید اس بات کا اعتراف نہیں کروگے
ونکہ اخلاقیات کی کسی کتاب میں تمہارا یہ عمل قابل گرفت
ہیں ہے. لیکن میرے غم، میرے ذاتی کرب کی وجہ تم
ر صرف تم ہو. یہ بالکل ٹھیک ہے کہ دنیا کا شاید کوئی

بھی منصف مزاج شخص تمہیں قصوروار ٹھہرانے کی تہمت
نہیں کرے گا، تم ایک اعلیٰ ترین انسان ہو بلکہ یوں کہو کہ تم
انسانیت کی اعلیٰ قدروں کے سنگ میل ہو۔ ہمارے سماج
کے سامنے انسان کامل کا جو تصور ہو سکتا ہے اس کی جیتی
جاگتی مثال تم ہو۔ اور یہی تمہارا قصور ہے، جرم ہے
اور مجھے تم سے یہی شکوہ ہے، یہی شکایت ہے!
کیا میں اپنی ماں کو بھول سکتی ہوں؟ ماں کی تصویر،
میرے تخیل کے پردے پر اپنی مانگ میں سیندور، پیشانی پر
لال بندیا سجائے، دلوں کو تسخیر کرتی ہوئی مسکراہٹ
بھرا چہرہ لئے آج بھی آویزاں ہے ماں کی پیشانی پر وہ
سرخ بندیا، مجھے آسمان میں تنہا درخشندہ ستارہ کی
طرح لگتی ہے جس سے میری پیشانی محروم ہے ماں کی رسیلی
میٹھی آواز، کانوں میں شہد ٹپکاتی آواز، جب وہ رامائن
کا پاٹھ کیا کرتی تھیں آج بھی گونجتی ہے. بازگشت
کرتی ہے. موسم باراں کی شام کے وقت جب گھنگھور
گھٹا، مست خرام ہاتھی کی طرح گھومتی، پہاڑیوں سے

ہمکنار ہوتی، دامن کہسار میں لہراتی، در و بام سے
ٹکراتی، ہمارے پاس سے گزرتی تو ہر طرف پراسرار
اندھیرا چھا جاتا تھا اور ایسے میں میری ماں کھڑکی کے

پاس کھڑی ہوکر کالیداس کے میگھ دوت سے مجھے کچھ
حصہ سناتی تھیں، ان اشعار کے معنی تشریح کرتی تھیں تو
ہم تھوڑی دیر کیلئے اس دنیا سے پرے کالیداس کی
خیالی دنیا میں کھوسے جاتے تھے۔ جب وہ پوجا گھر
میں خوشبو جلاتی تو سارا گھر سارا ماحول خوشبو سے معطر
ہوجایا کرتا تھا، میں دروازے کے اس پار کھڑی ماں
کو دیکھتی تھی۔ دیوی دیوتاؤں کو جھک کر، دونوں
ہاتھ جوڑ کر پرنام کرتی تھی اور نہ جانے انجانے میں
ان سے کیا کیا منت مانگتی تھی۔ لیکن اب میں ان کے
اس پوجا گھر میں کبھی داخل نہیں ہوسکتی۔ میری شفیق ماں،
معصوم ماں، بھگوان سے ڈرنے والی ماں — کبھی میری
دہلیز کے اندر قدم رکھنے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتی کیونکہ
اس کے اپنے عقیدے، اسکی اپنی سمجھ، جو اسے ورثہ میں ملی
ہے کے مطابق ایسا کرنے سے اس کی پاکیزگی، اس کی پوترتا
اسکے دھرم کو داغ لگ جائے گا۔

میں خوب اچھی طرح جانتی ہوں کہ وہ ایسا اس لئے
سوچتی ہے کہ وہ فرسودہ رسومات اور روایات سے
اس طرح جڑی ہے کہ اس سے الگ ہوکر ایک قدم آگے
بڑھنا بھی اس کے خیال میں پاپ ہے، گھور پاپ ہے
جس کا وہ اس جیون میں پرائشچت نہیں کرسکتی۔ پھر
بھی مجھے میری ماں پیاری ہے، مجھے اس کی یاد ستاتی
ہے، میں لاکھ کوشش کرتی ہوں کہ بھول جاؤں، کاش
کہ بھول جاؤں، لیکن میں ان یادوں کو حرف غلط کی
طرح لوح ذہن سے کھرچ کر نہیں مٹا سکتی ہوں — اور
اتفاق کچھ حالات کچھ ایسا اور میری ماں مجھ سے چھن
گئی، میں نے اس موہنی صورت اور آدرش والی ماں
کو کھو دیا۔

ماں! مجھے کیا یہ نہیں بتاؤ گی کہ ایک عزیز اولاد کے
کھونے، اسے الگ کرنے پر کیسا محسوس ہوتا ہے؟ لیکن
تم کچھ نہیں کہو گی کیونکہ تم نے غم سہنا ہی اپنی زندگی
مقصد بنالیا ہے۔ دنیا کا کوئی بڑا سے بڑا غم بھی
تمہیں اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتا۔ تم اٹل ہو۔ تم چٹان
کی طرح دائم و قائم ہو۔ تم اپنے غم کا اظہار کرنا چاہتی
ہی نہیں ہو! تم سب کچھ اپنے آپ میں سہہ لیتی ہو۔ زہر
گھونٹ بھی ہو تو اسے امرت کا پیالا سمجھ کر پی لیتی ہو۔ تم
روایت سے بغاوت نہیں کرسکتی۔ اپنی شفقت اور ممتا
قربان کرسکتی ہو، زندہ دفن کرسکتی ہو لیکن اُف
نہیں کرسکتی ہو۔

ماں! میں نے بھی اپنا غم اپنے سینے کے اندر
محفوظ کر رکھا ہے۔ میں نے اس غم کو ساری دنیا سے
رو پوش کر رکھا ہے۔ میرے قریب سے قریب رہنے
والے کو بھی اس غم کے وجود کا پتہ نہیں۔ میں اسی غم کے
سلگنے میں پل رہی ہوں۔ یہ غم میرے وجود کا ایک
جزو لاینفک بن گیا ہے۔ ماں! اپنے دیرینہ تجربات زندگی
کے باوجود شاید تم میرے غم کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکتی
ہو۔ ماں! یہ ایک ذاتی غم ہے۔ کتابوں، قصے کہانیوں اور
داستانوں میں ایسے غم کا کہیں ذکر نہیں۔ یہ بالکل انوکھا
ہے اپنی نوعیت کا آپ ہے۔

کل! میں تم سے پیار کرتی ہوں۔ مجھے کبھی کبھی
اوپر غصہ بھی آتا ہے اور رحم بھی کیونکہ میں اپنے
سے محبت کرنے پر مجبور پاتی ہوں۔ میرے سامنے کوئی
نہیں، میرے اس مرض کا کوئی علاج نہیں۔ یہ ایک لا
عارضہ ہے جو شاید میری آخری سانس تک میرے دا
سے لپٹا رہے گا۔ جو کچھ تم نے کیا وہ اپنی جگہ غلط
یا صحیح یہ تو وقت قائمی فیصلہ کرے گا لیکن تم میرے
اندر کی عورت کا قتل نہ کرسکے۔ تم کیا کوئی اس عورت
کو قتل نہیں کرسکتا۔ تم اس بازی میں ہار گئے ہو۔ اپنی
ہار، اپنی شکست کا اعتراف کرو، اسے قبول کرو نہ کرو
یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ میں تمہارا انتظار کرتی،

جب تک تم لوٹ آنے کا وعدہ کرتے رہے اور آج بھی تمہارا انتظار ہے۔ جب تم نے اپنے جانتے سارے رشتے یکسر منقطع کر لئے ہیں۔ میں اس دقیانوسی کہاوت کا سہارا نہیں لینا چاہتی کہ ایک ہندو لڑکی اپنی زندگی میں صرف ایک مرد سے اور صرف ایک بار محبت کرتی ہے تم تو جانتے ہو کہ اب میں ہندو نہیں ہوں ـــ لیکن اب میں کچھ نہیں ہوں، ایک دھڑکتا، زندہ مجسّم کرب ہوں، غم ہوں!

جو تم نے میرے اندر بویا تھا وہ دھیرے دھیرے میرے اندر جڑ پکڑتا گیا۔ میں اتنی ہمت نہیں کر سکی کہ اس تخم کو اکھاڑ پھینکوں۔ اس نے اپنے ننھے ننھے معصوم ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ میں اس کی مسکراہٹ اس کے قہقہے اپنی رگوں میں دوڑتے ہوئے خون میں محسوس کرتی ہوں ایسا لگتا ہے میرے خوابوں میں وہ اپنے لڑکھڑاتے قدموں سے چل رہا ہے۔ میں چاہتی تو تمہاری اس ذلیل حرکت کو شکست فاش دے سکتی تھی لیکن کاش میں تمہاری یادوں کو بھلا سکتی!

تم دونوں نے میرے جسم کا استعمال کیا ـــ تم نے بھی اور خورشید انور نے بھی۔ ایک طرف محبت اور دوسری طرف نفرت کے جذبات سے مغلوب ہو کر میں نے خود کو سپرد کر دیا۔ خورشید انور ـــ تم نے میرے غموں کا مداوا کرنے کی کوشش کی جو کمل کا مرہون منت تھا تم نے انسانیت اور شرافت کا ایک اعلیٰ آدرش پیش کیا ہے۔ میں تم سے کیسے نفرت کروں! تم نے میرے ساتھ ایک وحشی جیسا سلوک کیوں نہیں کیا؟ شاید تم نہیں جانتے کہ اب شرافت اور انسانیت پر میرا یقین متزلزل ہو چکا ہے۔ شادی کے پہلے اسقاط حمل کیلئے تم نے مجھے کیوں نہیں مجبور کیا؟ تم نے کیوں کہا تھا، میرا، میں تم سے پیار کرتا ہوں 'تمہارا بچہ ہمارا بچہ ہوگا، کیوں کہ وہ تمہارا ہی ایک حصہ ہے"

خورشید انور! تم احمق ہو، کیا تم یہ بات نہیں جانتے ہو کہ عورت اپنا غم تقسیم نہیں کر سکتی، وہ کسی کو اپنا شریک غم نہیں بناتی۔ عورت اپنا جسم سپرد کر دیتی ہے

اپنی روح نہیں، وہ زندگی جو میرے اندر پروان چڑھ رہی ہے وہ میری ہے پوری طور سے میری ہے وہ آدمی بھلا میرا غم کیا سمجھے گا۔ جس نے میری طرح غم نہیں جھیلا ہے!

یقین کرو، مجھے تم پر ترس آتی ہے، اس سے بھی زیادہ جتنی ترس تم کو مجھ پر آتی ہوگی افسوس تم کتنے بیوقوف ہو! تمہارے حصے میں تو کچھ بھی نہیں ہے نہ پیار، نہ غم! میں اکثر تمہارے چہرے پر غم کے آثار، تردد فکر کے گہرے نقوش دیکھتی ہوں وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ تم میری آنکھوں میں بے خوابی کی وجہ سے سرخی دیکھتے ہو۔ جب تم نے مجھے شادی کے لئے کہا تھا تو تم نے میری حفاظت کو پیش نظر رکھا تھا مجھے اس بات کا پورا احساس ہے۔ شاید تم بھی اتنا سمجھتے ہوئے کہ اگر تم اس لمحہ جانکاہ میں فراخدلی، ساری باتوں کو پس پشت ڈال کر مجھے اپنانے، مجھ سے بلاشرط شادی کرنے کو تیار نہیں ہوتے تو میں کہاں ہوتی! میرا اس دنیا اور اس دنیا کے بے رحم سماج میں کیا حالت ہوتی؛ آج تک میں نے تم جیسا رحم سماج میں کیا حالت ہوتی! آج تک میں نے تم جیسا رحمدل سماج میں کیا حالت ہوتی؛ آج تک میں نے تم جیسا رحمدل، نیک انسان نہیں دیکھا لیکن تم نے میری مجبوری کو اپنا احسان جتانے کا ذریعہ کیوں بنایا؟

اور آج میں نے ماضی کے سارے رشتوں کو منقطع کر کے اپنے کو تمہارے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا اور میرا اپنا وجود بے معنی ہو کر رہ گیا ہے۔ آدمی کب تک خلا میں زندہ رہ سکتا ہے ـــ اور کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا ہے کہ خورشید انور، تمہاری مجھے بالکل ضرورت نہیں۔

اور کل تمہاری زندگی جو میرے اندر دھڑک رہی تھی آخرکار ختم ہو گئی ـــ میرا ایک حصہ ٹوٹ گیا! اور تمہارا وجود!

خورشید انور! تمہیں ضرور خوش ہونا چاہئے تھا لیکن تم خوش اسی حالت میں ہو سکتے تھے جب تم بھی کسی کی طرح عیار اور خود غرض ہوتے کیونکہ مرد فطرتاً خود غرض اور دغا باز ہوتا ہے اور تب میں تمہیں پیار کے لائق سمجھتی میں ایک بار

نئے سرے سے تمہارے ساتھ ساتھ اپنی زندگی کا آغاز کرتی۔ تمہارا غم میں اپنے سینے میں محفوظ کر لیتی، اسے پروان چڑھنے کا موقع فراہم کرتی۔ تم میرے آنسوؤں سے بھرے چہرے کو اپنے سینے سے لگاتے ہو میرے بالوں میں انگلیاں پیوست کرکے اس سے دیر تک کھیلتے رہتے ہو، مجھے ہر طرح سے تسلی اور تشفی دیتے ہو، مجھے بہلاتے ہو، میرا غم غلط کرنا چاہتے ہو اور تم بار بار مجھے یقین دلانا چاہتے ہو کہ تم میرا غم سمجھتے ہو۔ تو مجھے تم سے نفرت ہونے لگی ہے۔

خورشید انور! تم مجھے تنہا چھوڑ دو — میں نے اپنا پتوار پھینک دیا ہے۔ اب میری زندگی کی کشتی کو نہ طوفان کا خوف ہے نہ تخریبی لہروں کا۔ نہ اسے سمندر کی اتھاہ گہرائیوں کا ڈر ہے۔ وہ غم۔ وہ جس نے مجھے زندہ رہنے پر مجبور کیا تھا جس کی وجہ سے تمہاری ضرورت تھی وہ مجھ سے روٹھ گیا اور اب جو غم یا خوف ہے وہ مختلف قسم کا ہے۔ یہ بیکار ہے مردہ ہے — مجھے اب تمہاری بالکل ضرورت نہیں رہی ہے تم شاید نہیں جانتے کہ تمہاری عظمت اور اعلیٰ ظرفی۔ تمہارے احسانات کے نیچے دبی چلی جا رہی ہوں۔ میں تمہارے اخلاق، خلوص، ایثار و قربانی کے جذبات پر شک نہیں کرتی، کاش یہ ساری باتیں میں صاف صاف تمہیں کہہ سکتی — میرے اندر اتنی جرأت ہوتی کہ میں جو کچھ محسوس کرتی ہوں، جھیلتی ہوں، وہ سب تمہیں کہہ سکتی! لیکن میری زبان تمہارے بار احسان کے نیچے گنگ ہو جاتی ہے۔ اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں! میں ایک عام انسان، سراسر گناہ کا پتلا

اور تم فرشتہ کی طرح معصوم، فیاض، فراخدل! میرے سارے گناہوں کو ذراسی پیشانی پر بل لائے درگزر کرنے والے انسان — ایسے دو متضاد اوصاف کے لوگوں کے ساتھ کیسے نبھیگی؟ میں اپنی نظر میں ہی ذلیل و خوار ہوتی جاتی ہوں۔ تم مجھے ذرا سوگوار دیکھتے ہو اور مجھے سینے سے لگا لیتے ہو میرے آنسو کا ایک قطرہ بھی تمہیں ایسا پریشان کر دیتا ہے جیسے وہ قطرہ برچھی کی انی ہو اور تمہارے جسم کے سب سے نازک حصے میں چبھتی جا رہی ہے۔ اب ہماری ازدواجی زندگی رحم اور احسان کی صلیب پر کب تک مصلوب ہوتی رہے گی! میں تم سے دور دور رہتی ہوں تو بھی تم مجھ پر ہزار سے فریفتہ رہتے ہو میں جان بوجھ کر کچھ ایسی حرکت کرتی ہوں کہ تم مجھ پر غصہ کرو۔ میرے ماضی کی زندگی کا طعنہ دو۔ لیکن تم اسے بھی برداشت کر لیتے ہو۔ مسکراتے رہتے ہو۔ تمہاری عظمت ہی میرا سب سے بڑا غم ہے سب سے بڑا کرب! زندگی لین دین کا نام اور میں تمہیں کچھ نہیں دے پائی اور تم سب کچھ نثار کرنے پر تلے بیٹھے ہو!

***

ضروری گزارش!

- دفتر سے خط و کتابت کرتے وقت حوالہ نمبر ضرور تحریر فرمائیں، جو ہمارے خط یا آپ کے رسالے کے اوپری حصہ پر درج رہتا ہے۔
- جواب طلب امور کے لئے جوابی خط / لفافہ یا ڈاک ٹکٹ روانہ فرمانے کی زحمت نہ فرمائیں، ادارہ کی طرف سے تمام خطوط کے جواب دیئے جاتے ہیں۔
- منی آرڈر کوپن پر (فارم کے نچلے حصہ میں) ہمیشہ اپنا نام، پتہ اور تجدید خریداری کے لئے سابقہ نمبر حوالہ صاف صاف ضرور تحریر فرمائیں —

اسی طرح خط لکھتے وقت یا مضمون روانہ فرماتے وقت بھی اپنا پورا نام و پتہ ضرور تحریر فرمائیں۔

(ادارہ)

ٹوٹے تارے

قرۃ العین حیدر

یہ کہانی "شمع" [illegible] میں شائع ہوئی تھی

انجیر اور زیتون کے درختوں اور ستارہ سحری کے پھولوں سے گھری ہوئی کسی جھیل کے خاموش اور پرسکون پانیوں میں دور سے ایک پتھر پھینکنے سے لہروں کا لہجہ بہ لہجہ پھیلتا ہوا دائرہ سا بنجاتا ہے نا۔ یا جب کوئی تھکا ہوا مطرب رات کے پچھلے پہر اپنے رباب پر ایک آخر مضراب لگا کر ساز کو ایکطرف رکھ دیتا ہے اور اس کے نقرئی تاروں میں سے جو لرزتا ہوا دم توڑتا ہوا آخری نغمہ بلند ہوتا ہے یا پھر جیسے سفید یاسمین کی معصوم کلیوں کی مہک کا تیز لپٹوں میں ملفوف ہوا کا ایک جھونکا صبح ہوتے دریچے سے اندر داخل ہو کر شمع کو بجھا جائے اور پھر اس بجھی ہوئی شمع میں سے جو ہلکا سا غمگین سا دھواں لہراتا ہوا اوپر کو اٹھ جائے

لیکن ٹھہریئے بھی۔ اس قدر شاعری کی ضرورت نہیں بس یونہی سمجھ لیجئے کہ ایسی ہی کچھ ناقابل بیان ناقابل تشریح سی کیفیت اس وقت شاہینہ پر چھائے جا رہی تھی بلکہ طاری ہو رہی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جانے کیا کیا محسوس ہو رہا تھا کیونکہ ہماری اس احمق سی دنیا میں سب کی باتیں ایسی عجیب سی ہو جاتی ہیں کہ جنکی تشریح نہیں ہو سکتی اور نہ کوئی ان کی معقول وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ جانے کیوں پر ایسا ہوتا ہے ضرور۔ ہمیشہ، کہ جب . . . لیکن خیر کہانی بے ربط ہو جائے گی۔ اور پھر آپ عقلمندوں کے نزدیک اس زندگی میں سب سے گہرے گہرے اور اونچے اونچے نشیب و فراز ہیں اور یہ زندگی ایک دورا ہا ہے۔ ایک چھوٹا المیہ ہے یا طربیہ یا المیہ طربیہ دونوں یا ایک خیر ادفو۔

کیونکہ یہ رخشندہ کا خط تھا جسے وہ اچانک کم از کم پچیس مرتبہ پڑھ چکی تھی اور اب اسے خوف ہو رہا تھا کہ کہیں اسے ڈاکٹر سے اپنی سائیکو انالسس کروانی نہ پڑ جائے

زندگی بھی واقعی کیسی عجیب چیز ہے بے انتہا عجیب بالکل بے سرو پا، رخشندہ کا خط اسی طرح قالین پر پڑا ہوا تھا بھئی اللہ یہ کرسمس کی صبح تھی۔ کیرل گانے والوں کی ٹولیاں دور نکل چکی تھیں اور پہاڑی خوبانیوں کی ڈھلوان کے پرے کتھیڈرل کی دوسری طرف سے بیگ پائپ کے تیز اور مدہم سروں کی لہریں برفانی ہوا میں تیرتی ہوئی دریچے کے شیشے سے ٹکرا کر اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ہر سال یہ بیگ پائپ بجانے والے ۲۵ دسمبر کی صبح کو اسے اسی طرح جگا دیا کرتے تھے اور

وہ جھنجھلا کر پھر تکئے میں منہ چھپا لیتی تھی مگر اب تو ساری کہانی ہی ختم ہو چکی ہے ۔ توبہ اف وہ ہولے ایک جھونکے سے درخشندہ کا خط اڑتا ہوا آتش دان میں جا گرا۔ اس نے اٹھ کر دریچہ بند کر دیا اور دیوان پر گر گئی۔ صبح کی ہلکی ہلکی قرمزی روشنی دیواروں پر پڑ رہی تھی کتھیڈرل کا گھنٹہ بج رہا تھا اور "GANIS BROUGH" کا بونو لئے دیوار پر سے جھانک کر مسکرا رہا تھا۔

• بلو بولے ہ شاہینہ نے آنکھیں بند کر لینی چاہئے ۔ لیکن تصویر کے شیشے پر بہت سی دھندلی دھندلی رنگین پرچھائیاں ناچنے لگیں ۔

جب میں بڑا ہو کر ڈیڈی کی طرح میجر بنوں گا اور رشی سے شادی کروں گا تو تم اور سلیم ہمارے یہاں مہمان آنا میں راجپور میں یوکلپٹس کے جنگلوں میں ایک سب سے بڑا اور اونچا سا چاکلیٹ اور کیک کا گھر بناؤں گا پھر اس میں رشی سنو وائٹ کی طرح رہا کرے گی۔

ہشت بدتمیز، کہیں ہر وقت چاکلیٹ کھاتے کھاتے بیمار جو پڑ جاؤ گے تو جناب عالی میں تو کبھی آپ کو دیکھنے بھی نہیں آؤں گی اور ڈبل فیس لونگی ہمیشہ، سلیم تم بھی کبھی نہ جانا ان لالچی خرگوشوں کے گھر، میاں عمر بھر پڑے رہیں گے یونہی اور ہم تو اپنے ٹھاٹھ سے ہوائی جہاز میں اڑے اڑے پھرا کریں گے صبح کو چاند میں جا کر چائے پی، دوپہر میکسیکو پہنچ گئے، رات کو گھر، آہا کیسے مزے کی زندگی ہوگی ۔ لیکن رخشندہ! لکھا تھا۔ خدارا شی میرا خط پڑھ کر اپنے آپ کو غمگین مت کر لینا۔ میں تم کو پورے چھ سال بعد لکھ رہا ہوں کتنی طویل مدت ہے اور میں کس قدر احسان فراموش ہوں۔ یقیناً مجھے تم سے معافی مانگنی چاہئے ایک یتیم اور کمزور لڑکی جس نے تمہارے گھر پر تمہارے گھر والوں کے رحم و کرم پر پرورش پائی ہو وہ ایسی باغی اور سرکش نکل جائے سوچو تو شی تم میں ہمیشہ ہنسنے والی رہی تھیں کیسی عجیب عجیب باتیں لکھ رہی ہوں ۔ کیوں کہ زندگی نے مجھے رونا بھی سکھا دیا ہے۔ شاید میں اب بھی تم کو خط نہ لکھتی اور تم کو معلوم نہ ہونے پاتا کہ میں کہاں ہوں اور کیا کر رہی ہوں لیکن گزشتہ ہفتہ پونہ سے بنگلور آتے ہوئے میری ایمبولنس کار ایک اور فوجی لاری سے ٹکرا کر کھڈ میں گر گئی اور میری یونٹ کے آفیسر کمانڈنگ کو مجھ سے پوچھ کر تمہیں میرے زخمی ہو جانے کی اطلاع دینی پڑی۔ کیونکہ اس وسیع دنیا میں میری "NEXT OF KIN" اتفاق سے تم ہی ہو۔ پریشان نہ ہونا اب میں اچھی ہوتی جا رہی ہوں۔ کرسمس آنیوالی ہے اور نہایت سرگرمی سے اس کے استقبال کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ کاغذی ربن اور رنگین جاپانی قندیلیں مصنوعی مسکراہٹیں اور لالہ کے پھولوں سے بھرے ہوئے گلدان، کینٹین میں رات گئے تک گیتوں اور قہقہوں کا شور رہتا ہے اپنے گھروں سے ہزاروں میل دور پڑے ہوئے امریکن اور آسٹریلین فوجی ہر وقت خوش رہنے کی کوشش کرتے ہیں ہر وقت چیخ چیخ کر گاتے رہتے ہیں انسان اپنے آپ کو خود فریبی میں مبتلا رکھنے کا کتنا شوق ہے "الیس بلوگاؤن" کا ریکارڈ تیزی سے بج رہا ہے۔ یاد ہے بلوائے کون ہے۔ اللہ۔ اچھا اب ختم کرتی ہوں، ہمارا میجر ابھی اپنا راؤنڈ لینے کے لئے آنے والا ہے۔ اس نے ابھی مجھے لکھنے پڑھنے کی اجازت نہیں دی ہے۔ یا اللہ میں اسقدر احمق سی ہوتی جا رہی ہوں ۔ صبح وہ مجھ پر جھکا ہوا میرا ٹمپریچر لے رہا تھا اور میرا جی چاہ رہا تھا کہ وہ فوراً وہاں سے ہٹ جائے ۔ میرے راستے سے الگ ہو جائے ۔ اور وہ پھر نئے راگ سنانے پر آمادہ نظر آتا ہے۔ اس کی نیلی آنکھیں دیکھ کر مجھے وہ گزرے دن اور پرانی باتیں اس قدر تیزی سے یاد آنے لگتی ہیں بہن میں اس چھ سال کے طویل عرصہ میں بھولنے میں خاصی کامیاب ہو چکی ہوں۔ خدا کے لئے شی شی مسکراؤ'

دس برس پہلے کرسمس کی ایسی برفانی صبح تھی' جب رخشندہ بھاگی بھاگی اس کے کمرے میں آئی تھی اور اس سے کہا تھا کاہل بلی جلدی اٹھو۔ مہمان آ گئے ہیں، اور شاہینہ

ے ہی لحاف پرے پھینک کر برش سے جلدی جلدی
ھیک کراتا جان کے کمرے میں پہنچی جہاں وہ مہان
اپنے بچوں کو سینٹ جوزف اکیڈمی میں داخل کر
آئے تھے برآمدہ میں ڈھیروں اسباب پھیلا
دران بچوں کی گوری سی ممی سیاہ فرکے لبادے
ں کی ممبی سے باتیں کر رہی تھی ان کے ڈیڈی بھی
معروف تھے اور دوسے حد شریر بڑی بڑی نیلی
ور بھورے بالوں والے لڑکے بیحد مسکین صورت
ب ہولڈال پر چڑھے بیٹھے تھے ان میں سے ایک
یں ہلائے جا رہا تھا اور دوسرا جس کی ناک
ور زکام کی وجہ سے ٹماٹر سرخ ہو رہی تھی۔
کے ہاتھ سے چائے دانی گرانی کی فکر میں تھا
جھکی ہوئی چائے بنا رہی تھی۔

نے اپنی بہنوں کو سلام نہیں کیا ؟"
نہیں کیا کرتے لڑکیوں کو سلام۔ ہونہہ احمق گلہریاں،،
ب اسلم بری بات ،، ان کے ڈیڈی نے ڈانٹا"
ما ہم سے دوستی نہیں کرو گے ننھی بلو بولے" ؟

ہیں اسکیٹنگ آتی ہے باکسنگ کرو گی ! ہمیں اپنے
ڈیا دکھاؤ ، اور بہت جلد وہ چاروں کیڈبری
کے البم، میکنو، لیڈی سلنڈ، ملکی ہاوس اور ریل
ں کے ڈھیر میں منہمک ہو گئے جیسے ہمیشہ کے ساتھی
ندگی بھر اسی طرح ایک ساتھ خوبصورت اور
ھلونوں سے کھیلتے رہیں گے۔

سلم نے سینئر کیمرج فرسٹ گریڈ میں پاس کیا "بلو بولے
لو گے بتاؤ" ،، رخشندہ نے پوچھا۔

ہونہہ، بہت انعام دینے چلی ہیں۔ ذرا شکل تو اپنی
ملاحظہ فرمایئے۔ میں خود تم کو نہ دے ڈالوں
ں گرہن۔ مانگ کیا مانگتی ہے۔ اے لڑکی ،،
سر تمہارا۔ گدھے کی دم کہیں کے "

"سر تو فی الحال نہیں دے سکتا اس کی مجھے خود کافی
ضرورت ہے اور جو چاہیے لو۔ اسکیٹس کی بالکل
نئی جوڑی خریدی ہے۔ لو گی۔"

"جی۔ میرے پاس خود ہیں اسکیٹس۔ آپ اپنے پاس
ہی رکھئے اپنے"

واللہ کیا آپ کے اسکیٹس ہیں نیلام میں خریدے تھا نا
اور اسکیٹنگ آپ کس قدر نفیس کرتی ہیں گویا ہماری نیا ڈگمگ
ڈولے رہے کرکٹ کھیلتی ہیں تو کرکٹ سکھا کر آپ نے میری
جان پر کیا احسان کر دیا۔ آپ تو مر کر بھی ایک مچل اگو ور
نہیں بن سکتے اگر ہمیں پل اوور بننے ہوتے تو پھر خدا
نے لڑکیاں کس مصرف کیلئے بنائی تھیں۔

نیلو فر اور نرگس کے شگوفوں سے گھرا ہوا راستہ
اسی طرح طے ہوتا رہا ہے۔ لیکن اگر منزلیں مختلف نہ ہوتیں
تو ستاروں کی راہوں کا یقین کسے آتا۔

اور اب اتنے برسوں کے بعد شاہینہ پھر اسی سایہ دار
روش پر آہستہ آہستہ قدم رکھتی ہوئی نیچے اتر رہی تھی جس
پر اس کا دل کا ساتھی کل اس لئے اس کے ساتھ نہیں چل
سکا تھا کیونکہ وہ اس کے فرقے سے تعلق نہ رکھتا تھا اور
اسلم بے دلی سے سیٹی بجاتا ہوا اس کے ساتھ ساتھ اسلئے
آ رہا تھا کیونکہ وہ ایک نائیٹ کی لڑکی تھی اور وہ اس
کے منگیتر کی حیثیت سے کرسمس گزارنے دیرہ دون مدعو کیا
گیا تھا۔ پھر وہ آلوچوں کی ٹہنیوں کے نیچے چلتے چلتے رک
اور اس کی طرف مڑ کر کہنے لگی۔

" ٹھیک ٹھیک بتاؤ کیا تم واقعی میرے ساتھ خوش
رہ سکو گے ؟ "

" کوشش تو کروں گا" اس نے بے تعلقی سے ایک
پتہ توڑ کر کہا۔

" اسلم میں تم سے التجا کرتی ہوں بنگلور واپس چلے جاؤ

«اور ہو رخشندہ پر کرم کرنا چاہتی ہیں۔ آپ بہت جلد اس کا خیال آیا۔

اطمینان رکھو۔ وہ تم سے ایک اور احسان کی آرزو مند نہیں ہے وہ پوری طرح تندرست ہونے سے پہلے ہی ہسپتال چھوڑ کر کہیں اور جا چکی ہے۔» اسلم نے بے پروائی کے ساتھ کہا۔ ہوا کا جھونکا پتوں میں سے سرسراتا ہوا نکل گیا۔

اسلم یکایک نہایت تلخی سے بولا: مجھے تم سے نفرت ہے اور تمہارے گھر والوں سے نفرت ہے سچ کہتا ہوں مجھے تم سے اس دن سے نفرت ہے جب میں نے پہلی مرتبہ بچپن میں تم کو رخشندہ کے ساتھ ایک خادمہ کا برتاؤ کرتے دیکھا تھا، وہ پھاٹک تک پہنچ گئے۔

«اچھا اب اجازت ہے؛ خدا حافظ»

وہ اپنی ڈوج میں بیٹھا اور وہ زناٹے سے ڈھلوان پر سے اترتی ہوئی کتھیڈرل کے دوسری طرف جا کر نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

اور پھر ہنگ پائپ اس طرح بجتا رہا۔ ہوا نے دریچہ کا پٹ پھر کھول دیا تھا۔ شاہینہ نے اٹھ کر دوبارہ اسے بند کیا۔ باہر بارش کے پہلے قطروں سے بھیگی ہوئی سڑک دور تک خاموش اور سنسان پڑی تھی۔

یہ ازلی راستے نہ جانے کیوں شروع ہوئے اور کہاں جا کر ختم ہوں گے۔

(اردو فلم انڈیا۔ لاہور)
سالنامہ ۱۹۴۷ء

دلبر عثمانی
نیازیان۔ امروہہ (یوپی)

غزل

میں نظروں کو ملانا چاہتا ہوں
نیا جادو جگانا چاہتا ہوں

تصور میں بلانا چاہتا ہوں
مئے الفت پلانا چاہتا ہوں

جہاں میں لٹ گیا تھا دل کے ہاتھوں
اُسی کوچہ میں جانا چاہتا ہوں

پسند آئی تھی جو ان کو زیادہ
غزل پھر وہ سنانا چاہتا ہوں

منائیں گے وہ پھر کیسے میں دیکھوں
میں ان سے روٹھ جانا چاہتا ہوں

محبت کے جہاں وعدے ہوئے تھے
وہ مندر پھر بنانا چاہتا ہوں

گزاروں کیسے لمبی زندگانی
حسینوں میں ٹھکانا چاہتا ہوں

گرے بجلی تو بجلی کو جلا دے
میں ایسا آشیانا چاہتا ہوں

دلبر پھر وہ مجھ سے روٹھ جائیں
میں پھر ان کو منانا چاہتا ہوں

تبصرہ

ب: کوکن کے افسانے
: انجم عباسی
: ۱۵۲
: ۵۰ (پچاس روپے)
پتہ: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ
دریا گنج، نئی دہلی ۲

ن کا علاقہ جغرافیائی اعتبار سے مہاراشٹر کا زرخیز خطہ
یالی شادابی کی وجہ سے اہمیت کا حامل بھی۔ یہ علاقہ
پر شاداب ہے ادب کے لیے بھی زرخیز ترین ہے
، قبل شمالی ہند کو اردو کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ اگرچہ
بھی مانی جاتی ہے مگر مہاراشٹر کی ادبی خدمات اور
غ کو دیکھتے ہوئے شمال کی مرکزیت میں کچھ شبہ
لگا ہے۔ کوئی مانے نہ مانے مگر میں مہاراشٹر کو اردو
ا مگر سمجھتا ہوں اس لیے اسے مرکز کہنے ہوئے
، نہیں ہوتی۔ اور کوکن مہاراشٹر کا ایسا حصہ ہے
ب کے لیے پرخلوص، بے لوث طریقے، بے نعرہ
ہے۔ اس کی مثال وہاں کے ابھرتے ہوئے
ایک طویل فہرست ہے جن میں کچھ نام معروف
، کے آتے ہیں۔ اس طویل فہرست سے دس نام
ن کے افسانے" مرتب انجم عباسی کی کتاب
میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔

کوکن رائٹرز گلڈ نے اب تک ۱۹ تصنیفات مختلف موضوعات پر شائع کی ہیں۔ مجھے اس کی تمام کتابوں پر روشنی نہیں ڈالنی ہے۔ لہٰذا اس گلڈ کی تازہ ترین کتاب "کوکن کے افسانے" پر اکتفا کرتے ہوئے مضمون کو آگے بڑھاتا ہوں۔ سب سے پہلے مرتب انجم عباسی کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے کوکن کے جم غفیر افسانہ نگاروں کی بھیڑ سے دس اچھے معروف افسانہ نگاروں کا انتخاب کیا۔ اور ان کے دو دو افسانوں کو کتاب میں شامل کیا۔ یہ اُن کی سوجھ بوجھ کی ضمانت ہے کہ ۲۰ افسانہ نگاروں کی بھیڑ نہیں جاتی۔ اگر ایسا ہوتا تو تخلیق کار کی اکلوتی تخلیق سے اُس کے معیار، اسلوبِ فن کا اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ افسانہ نگار کو سمجھنے میں بھول ہو جاتی۔ "کوکن کے افسانے" ایک علاقائی معیاری افسانوی مجموعہ ہے۔ کتاب کا پہلا اور دوسرا افسانہ "سے ری ہڑی زا" اور "دوسرا بھوروں خان" نور پرکار کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ دونوں افسانے جداگانہ اینگل اور موضوع لیے ہوئے ہیں۔ پہلا افسانہ کسی حد تک افسانوی اسلوب پر پورا نہیں اترتا مگر دوسرا افسانہ بالخصوص اس کا پلاٹ اور بھوروں خان کے کردار سے ابھرتا ہوا پیکر بھوروں خان اس بات کی بصیرت ہے کہ نور پرکار ایک اچھے افسانہ نگار ہیں۔ دونوں افسانوں کا پلاٹ افسانہ نگار کے

ذہن میں ابھرتا ہوا چھوٹا سا خیال ہے جسے افسانہ نگار نے اپنے کینوس (Canvas) پر برتا ہے۔ بیانیہ میں علاقائی اثرات نمایاں ہیں۔ دونوں افسانے اچھے ہیں۔

مجموعہ میں دوسرا نام فقیر کلے کا ہے۔ اُن کے دو افسانے "رُکے ہوئے لمحے" اور "عام آدمی کا دکھ" فلاسفی کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ افسانوں کی بناوٹ میں ایکسی ٹیکنک اور بیانیہ کا استعمال ہوا۔ موضوع مختلف اور داخلی ہیں۔ "عام آدمی کا دکھ" اُن میں اچھا افسانہ ہے جملے مربوط ہیں افسانوں میں فلسفہ کو ملحوظ رکھ کر افسانوی کیفیت پر موضوع کو بہتر طریقے سے برتا گیا ہے چونکہ فلسفہ بذات خود خشک سبجیکٹ (Subject) ہے اس لیے اس میں خشکی پیدا ہو گئی ہے۔ باوجود اس کے دونوں ہر لحاظ سے (Matured) افسانے ہیں۔

مجموعہ میں تیسرا نام شیخ اسماعیل کا آتا ہے۔ اگر تعارف میں ان کے تعلق سے کچھ نہ لکھا جاتا تب بھی پہلا افسانہ پڑھنے کے بعد یہ واضح ہو جاتا کہ ان کا تعلق افریقہ سے قریب تر ہے۔ پہلا افسانہ "ماما جوگا" افریقہ کی معیشت اور اقتصادیات کا ایک پہلو پیش کرتا ہے۔ افسانہ روایتی اور واقعے سے متاثر ہے۔

یونس اگاسکر کے دونوں افسانے "دل بے اختیار" اور "نکڑ کا درخت" اچھے اور معیاری ہیں۔ دونوں (Decisive) افسانے ہیں۔ بیانیہ کی گرفت بھرپور اور مستحکم ہے۔ افسانہ پڑھنے کے بعد قاری Freshness محسوس کرتا ہے، فن اور اسلوب کے ساتھ برتے گئے ہیں یقین نہیں آتا کہ ایک تنقید نگار اور محقق اچھے افسانے بھی لکھ سکتا ہے۔ "کیچ بڑو" اور "کنواری لڑکی" افسانوں کے خالق کا نام ساحر شیوی ہے۔ پہلا افسانہ اچھا ہے افسانوں کے بیان میں شعری آہنگ افسانہ نگار کے شاعر ہونے کی غمازی کرتا دکھائی دیتا ہے۔ آدم نصرت کے دو افسانے "طوفان" اور "کھاڑی کا پُل" مختلف موضوع اور آہنگ لیے ہوئے ہیں۔ پہلے افسانے کا پلاٹ چھوٹا ہے دوسرے کا مرکزی خیال چھوٹا مگر پھیلاؤ لئے ہوئے ہے۔ پہلے میں افسانویت دوسرے میں ڈرامائیت اور خطیبانہ رنگ زیادہ جھلکتا ہے۔ مگر قاری ٹیکنک کی وجہ سے اس جانب دھیان نہیں دیتا۔ مجموعی طور پر دونوں افسانے اچھے ہیں۔

"نئے موضوع کی تلاش" اور "اونچے قد کا اونچا آدمی" خالد اگاسکر کے مجموعے میں شامل افسانوں کا نام ہے دونوں داخلی اور الگ الگ اسلوب کے ساتھ بنے گئے ہیں ایک میں ڈرامائیت زیادہ ہے دوسرے میں افسانویت، بیان اور زبان میں Flow ہے۔ دونوں معیاری افسانے ہیں۔

نورجہاں نور اور رشیدہ قاضی کے افسانے نسوانی آہنگ لئے ہوئے ہیں۔ کہانیاں روایتی ہیں۔ کوئی نیا اینگل اور ڈائمنشن بھی پیدا نہیں ہوا۔ بعض کے کلائمکس کا اختتام سے پہلے ہی علم ہو جاتا ہے۔ اس لیے قاری کی دلچسپی کم ہو جاتی ہے۔ رشیدہ قاضی کا افسانہ "معصومہ" میں افسانویت آخر تک برقرار ہے۔ البتہ moving ڈرامائی ہے۔ یہ افسانہ ٹیکنک اور بیان کے لحاظ سے بھی بہتر ہے۔

کتاب کی فہرست میں آخری نام مرتب انجم عباسی کا آتا ہے۔ ان کے قد کا اندازہ اگرچہ افسانوں کی بنیاد پر کیا جائے تو یہ ناانصافی ہوگی۔ مرتب چاہے تو خود کو کتاب میں اچھی سے اچھی جگہ رکھ سکتا تھا مگر انجم عباسی اپنے کو آخر میں رکھ کر اپنے قدآور ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ ویسے ان کے افسانے روایتی ہیں۔ کتاب کی ترتیب و انتخاب میں معیار کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس کی ترتیب و اشاعت میں مرتب کا خلوص و محبت اس کے سرورق اور طباعت کی دیدہ زیبی سے جھلکتا ہے۔ لہٰذا وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

ام الدین نظام
بی، اے، ویرانی مارگ، بمبئی

سس، یہ سفر، ختم کہاں ہونا ہے
ں ہی ہر موڑ پہ منزل کا گماں ہونا ہے

علامت ہے یہاں "قبر" برائے ترسیل
ر اِس قبر کو شاعر کا مکاں ہونا ہے

سربستہ ہے تو، میرا خدا ہے، حق ہے
رکو اِک بار مگر مجھ پہ عیاں ہونا ہے

ی خواہش کو بکھر جانا ہے خوابوں کی طرح
دکو دھول، تصور کو دھواں ہونا ہے

در کھلنے ہیں ابھی حسنِ غزل کے اسرار
رے لہجے کو ابھی اور جواں ہونا ہے

ں کڑی دھوپ ہوں اور برف ہے اک شخص نظام
ب ٹھہرنا ہے مجھے، اس کو رواں ہونا ہے

دوشِ غور و فکر پر اپنا جنازہ دیکھنا
زندگی پر سوچنا، مرقد کا نقشہ دیکھنا

میں شکست و فتح دونوں کا ہوں لذت آشنا
رن میں میں اتروں گا یارو، تم تماشہ دیکھنا

رونقِ خانہ پہ ہم نے "قل" کی مٹی ڈال دی
اب وصیت میں عزیزو، اپنا حصہ دیکھنا

ہم ہیں شہزادے خودی کے، وہ طلب کا دیو ہے
اپنی قامت دیکھنا اور اس کا جثہ دیکھنا

یہ اسیرِ دام ہو جائے تو مشکل ہے نجات
اپنے اندر اڑ رہا ہے جو پرندہ دیکھنا

طویل شب کو کبھی مختصر نہیں کرتے
ہم آفتاب کو پیغامبر نہیں کرتے

ہم آنسوؤں میں نہیں، دھڑکنوں میں جیتے ہیں
مگر وہ آنکھ سے دل تک سفر نہیں کرتے

کھنڈر سے ایک علاقہ ہمیں بھی ہے لیکن
گزار دیتے ہیں دن، شب بسر نہیں کرتے

یہ بے سواد مناظر، یہ بے نمک چہرے
نظر میں رہتے ہیں اور دل میں گھر نہیں کرتے

عجیب لوگ ہیں، دنیا سے مطمئن بھی نہیں
کسی سے کوئی گلہ بھی مگر نہیں کرتے

زمانے بھر کو سناتے نہیں غزل اپنی
نظام رائیگاں اپنا ہنر نہیں کرتے

غزلیں

منظر نوساروی
لال چال اسٹیشن روڈ
نوساری۔ (گجرات) ۳۹۶۴۴۵

کون ڈرتا ہے ناکامیاں دیکھ کر
چل پڑا ہوں میں دشواریاں دیکھ کر

ظلمتوں میں چھپنے لگی روشنی
عزمِ انساں کی تابانیاں دیکھ کر

ہے دشمن میرا آندھیوں میں دم
ہنس رہی ہیں مجھ سے بجلیاں دیکھ کر

ایسا لگتا ہے بدلے گا رنگ چمن
آج موسم کی انگڑائیاں دیکھ کر

عزمِ نو کر دیں دلمیں پیدا لگا
زندگانی کی دشواریاں دیکھ کر

کیوں نہ منظرؔ تمنا بہاروں کی ہو
اپنے گلشن کی ویرانیاں دیکھ کر

O

میرا کمزور جب سے دل ہوا ہے
جو آسان کام تھا مشکل ہوا ہے

نہ جانے کتنا خون دل ہوا ہے
آبلے یوں نہیں ہمکو ملے ہیں

ہمارا خوں سرِ محفل ہوا ہے
چھپا سکے وہ کیسے جرم اپنا

سکونِ دل کسے حاصل ہوا ہے
بہار آنے کو آتی ہے چمن میں

جو پتھر راہ میں حائل ہوا ہے
اڑا دو اپنی ٹھوکر سے اسے تم

لہو میں وہ نشہ شامل ہوا ہے
اثر ہے جس کے بہکے گا زمانہ

پشیماں خود میرا قاتل ہوا ہے
بلا کے آج تو مقتل میں مجھکو

بڑی مشکل سے منظرؔ زندگی میں
سکونِ دل مجھے حاصل ہوا ہے

O

شرقی ملیح آبادی
۹۲۷/۱۶ الہادت پور کانپور (یو۔پی)

O

سرمستیِ طلب کے جو تیور بدل گئے
منزل سے دور ہم کئی منزل نکل گئے

تم نے بھی رفتہ رفتہ فراموش کر دیا
پھر ہم بھی احتیاط کے سانچے میں ڈھل گئے

پر درد روشنی کا ہر افسان ہے مگر
تھی وقت کی وہ دھوپ کہ چہرے بدل گئے

ہیں سادہ دل ضرور۔ مگر ایسے بھی نہیں
بہلا لیا کسی نے جہاں ہم بہل گئے

ہر بار ضبطِ غم نے سنبھالا بہت مگر
کم ظرف تھے جو اشک وہ آنکھوں سے ڈھل گئے

شمعِ اُمید۔ یاد کے فانوس۔ دل کے داغ
کیا کیا چراغ بزمِ تمنا میں جل گئے

یہ کیسا انقلاب جہاں ہے کہ اے خدا
بدلے تو زندگی کے سبھی رخ بدل گئے

اب ابتدائے عشق کی سرمستیاں کہاں
وہ دن گزر گئے۔ وہ زمانے بدل گئے

شرقیؔ وہ آج ہو گئے آمادۂ کرم
ہم جب حدودِ شوق سے آگے نکل گئے

O

غزلیں

انجم ترابی

بہ سرِ تبلیغِ وفا دیر کے مندر کے سوا
منزلِ دار بھی ہے کعبہ و منبر کے سوا

فرد کرے گا میرا کارِ عصائے موسیٰ
راہ میں کچھ نہیں اب غم کے سمندر کے سوا

مانتے ہی نہیں معبود کسی کو ہرگز
آمریت کے امیں اپنے تدبر کے سوا

ان چراغوں میں نہیں کوئی اجالوں کا امام
تمتماتے ہوئے رخسارِ منور کے سوا

میری تخلیق کا حاصل ہی نہیں کیا؟ یارب!
ایک گمنام حقیقت کے تصور کے سوا

دوستو! اور نہ کچھ پاؤ گے آنکھوں میں میری
صرف خوابوں کے بھٹکتے ہوئے منظر کے سوا

چوم لیتے رہیں میرا ہاتھ ادب سے احباب
کیا، میں کچھ اور بھی ہوں خاک کے پیکر کے سوا

ہمدم دوست! میرے زخم کی گہرائی کا راز
کس نے تشہیر کیا؟ آپ کے خنجر کے سوا

وارثوں کیلئے کیا چھوڑ کے دنیا سے اٹھوں
اور کچھ بھی نہیں اک کرب کی چادر کے سوا

کبھی گونجا ہے! سرِ بزمِ نگاراں انجم
نغمۂ تارِ نفس، زخمۂ نشتر کے سوا

اعجاز انجم
۲۹۰۶، تایکلواڑی پادرہ، ناسک-۴۲۲۰۰۱

کب خوشبوؤں میں ڈوبا سفر دے گیا ہے
یادوں کی جلتی راہ گزر دے گیا ہے

مہر و وفا، خلوص و محبت کے دام میں
بے رحم قاتلوں کا نگر دے گیا ہے

وہ بھی ستم ظریف کہ انسانیت کے نام
شعلوں میں ڈوبتا ہوا گھر دے گیا ہے

یہ کس نے چھین لی ہے سمندر کی شفقتیں
یہ کون موج موج بھنور دے گیا ہے

پلکوں سے جس کی راہ کے کانٹے ہٹائے تھے
انجم وہ شخص دیدۂ تر دے گیا ہے

۱۰۰۰ اکروڑ روپے کی کپاس کے فروخت کا بزنس، گھریلو اور ایکسپورٹ مارکیٹ میں گانٹھوں کی ایک ریکارڈ فروخت

مہاراشٹر اسٹیٹ کو آپریٹیو کاٹن گروورس مارکٹنگ فیڈریشن لمٹیڈ نے موجودہ مالی سال سنہ ۹۱-۱۹۹۰ء کے دوران ۱۰۰۲ کروڑ روپے کا ایک ریکارڈ بزنس کیا ہے۔ اس مدت کے دوران ۵۴۲ کروڑ روپے (۱۶،۶۴ لاکھ گانٹھیں) کی کپاس گھریلو بازار اور ۲۱۸ کروڑ روپے (۴،۸۵ لاکھ گانٹھیں) کی ایک ریکارڈ ایکسپورٹ کیا گیا۔ مزید کپاس کے بیج ۲۴۲ کروڑ روپے (۵۱،۵۰ لاکھ کوئنٹل) کے فروخت کئے گئے۔ سنہ ۹۰-۱۹۸۹ء اور سنہ ۹۱-۱۹۹۰ء کے گذشتہ دو موسموں میں دشواریوں کے باوجود مالی سال میں ۲۱،۹۴ لاکھ گانٹھیں کی ایک ریکارڈ فروخت کی گئی جو کہ ملک میں کپاس کی سرفہرست پیداوار ہے۔ شری این جیارامن، اس فیڈریشن کے منیجنگ ڈائرکٹر کے طور پر اپنے فرائض کے انجام دہی میں مصروف ہیں۔

سنہ ۹۰-۱۹۸۹ء کے موسم کے لیے کسانوں کو ۱۳۰ کروڑ روپے کی ادائیگی کی گئی اور امدادی قیمت کی بنیاد پر ۶۰۰ کروڑ روپے کی ۹۸،۱۰۰ لاکھ کوئنٹل خام کپاس خریدی گئی۔ ۱۳ کروڑ روپے کا اس سلسلے میں قائم فنڈ میں سے عطیہ لیا گیا۔

سنہ ۹۱-۱۹۹۰ء کے موسم میں کسانوں کو ۸۲ کروڑ روپے کی ایک زائد قیمت ادا کی گئی۔ اور ۴۶۵ کروڑ بطور امدادی قیمت ۶۶ لاکھ کوئنٹل خام کپاس کی خریداری کے لیے دیئے گئے۔

سنہ ۹۱-۱۹۹۰ء کے کپاس موسم کے بہترین دور کے موقعہ پر قیمت اونچی ہوگئی اور فیڈریشن نے مارکیٹ کی اس پائیداری کو برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔

اروناوتی ندی پر پل

حکومت مہاراشٹر نے شیرپور دیہات میں شمالی مندر کے قریب سولا دے، انتواد، شیرپور، کرداند لوکی، سڑک پر اروناوتی ندی پر پل کی تعمیر کے کام کی انتظامی منظوری دے دی ہے جس پر لاگت کا تخمینہ ۱۵ لاکھ روپے ہے۔

انتظامی منظوری

حکومت مہاراشٹر نے ضلع وردھا میں کاجل سارلہ منورا کو (ہنگن گھاٹ کنڈکی سڑک کو جوڑنے) ملانے والی سڑک کے کام کی انتظامی منظوری دیدی ہے جس پر لاگت کا تخمینہ ۱۲ لاکھ روپے ہے۔

گائے کا دودھ ، صارفین کو آگاہی

بمبئی عظمیٰ دودھ اسکیم ، بروز بدھ ۳ اپریل سے صرف گائے کا دودھ جس میں ۳٫۸ فیصد چربی ۔ اور ۸٫۵ فیصد ایس این ایف ہوگا۔ ۶٫۵۰ روپے فی لیٹر کے حساب سے فروخت کرے گی۔

گائے کا دودھ نارنگی دھاریوں والے ڈھکن والی بوتلوں میں فروخت کیا جائے گا جس پر "گائے کا دودھ" تحریر ہوگا۔

رسمی ملاقات

وائس ایڈمرل ایچ۔ جانسن، ویسٹرن نیول کمانڈ نے ۳ اپریل کی صبح راج بھون میں گورنر مہاراشٹر شری سی۔ سبرامنیم سے ایک رسمی ملاقات کی۔

انتظامی منظوری

حکومت مہاراشٹر نے بھنڈارا، ایوت محل ریاستی خاص شاہراہ پر جور تھولی کے قریب ایک پل کی تعمیر کے کام کی انتظامی منظوری دے دی ہے جس پر لاگت کا تخمینہ ۲۰٫۲۲٫۰۰۰ روپے ہے۔

انتظامی منظوری

حکومت مہاراشٹر نے دیرادا، سجت پور مند گاؤں سڑک (۵۰ کلومیٹر) (ضلع کی خاص شاہراہ) کی تعمیر کے کام کی انتظامی منظوری دیدی ہے جس پر لاگت کا تخمینہ ۱۹٫۶۴٫۰۰۰ روپے ہے۔

مبارکباد

شری اُتم ایس سوناونے، ڈپٹی منیجر گورنمنٹ سنٹرل پریس بمبئی، اڈوانس پرنٹنگ ٹکنولوجی میں جرمنی سے خصوصی کورس مکمل کرکے واپس لوٹ آئے ہیں۔

انٹرنیشنل انڈسٹریل ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن ویب کرامینیٹ پالیگراف ٹیکنیکل یونیورسٹی کارل مارکس اسٹراڈ لیزنگ گرافک آرٹس اور جرمن ڈیموکریٹک ریپبلک کی جانب سے مالی طور پر مشترکہ جاری کردہ یہ کورس شری سوناونے نے لیزنگ، کارل مارکس اسٹراڈ اور ڈریسڈن سے مکمل کیا ہے۔

شری سوناونے کول دھپیر سے موضع سے تعلق رکھتے ہیں جو کہ پونے ضلع کے پرندر تعلقہ میں واقع ہے آپ نے بمبئی میں سنہ ۱۹۶۰ء میں پرنٹنگ ٹیکنولوجی میں کورس مکمل کیا تھا۔

اپنی ذاتی محنت کے بل بوتے پر ترقی کرتے کرتے شری سوناونے ڈپٹی منیجر کے عہدے تک پہنچے۔ اس عہدے سے قبل آپ گورنمنٹ سنٹرل پریس بمبئی میں بھی اہم عہدوں پر کارگزار رہے ہیں۔

دہلی نیشنل ملٹری ڈیفنس کالج کے افسران نے ۱۲ مارچ کو ریاست کے چیف سکریٹری شری سرینواسن سے منترالیہ میں ملاقات کی یہ اسی موقع پر لی گئی تصویر ہے۔

رویندر ناٹیہ مندر کو خوبصورت بنانے کیلئے اسپانسرڈ مطلوب

مہاراشٹر فلم اسٹیج اینڈ کلچرل ڈیولپمنٹ کارپوریشن بمبئی نے رویندر ناٹیہ مندر، پربھا دیوی اور فلم سٹی گورے گاؤں بمبئی کو مزید خوبصورت بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔

خواہشمند اسپانسرڈ شری ایم. بی. پٹوردھن، جوائنٹ منیجنگ ڈائرکٹر مہاراشٹر فلم اسٹیج اینڈ کلچرل ڈیولپمنٹ کارپوریشن لمیٹڈ فلم سٹی گورے گاؤں (ایسٹ) بمبئی ۴۰۰۰۶۵ سے رابطہ قائم کریں۔

انتظامی منظوری

حکومت مہاراشٹر نے ضلع گڈچرولی میں دھانورا، پنگڈا، گوڈلوائی، کروپا سڑک پر چھوٹے پل تعمیر کرنے کا انتظامی منظوری دیدی ہے جس پر لاگت کا تخمینہ ۱۱ لاکھ روپے ہے۔

کپاس کی حصولی

ریاست کے ۱۱ زون میں ۲۰ مارچ ۱۹۹۱ء تک ۶۵۸۴۰۵۳ کوئنٹل کپاس اور ۱۱۳۳۲۶۱ گانٹھیں بنائی گئیں۔

اس مدت کے دوران خریدی گئی کپاس کوئنٹل میں اور حاصل کی گئی گانٹھیں درج ذیل ہیں۔

ناگپور: ۱۰۳۸۲۵۳ (۱۶۵۹۲۵) ۔ ایوت محل ۱۰۶۳۵۵۸ (۱۹۲۹۸۲) ۔ آکولہ: ۸۹۸۳۶۵ (۱۷۵۹۱۱) امراؤتی: ۹۴۷۰۲۹ (۱۶۸۵۲۳) کھام گاؤں: ۳۳۷۴۵۸ (۶۲۷۳۸) ۔ اورنگ آباد: ۶۴۹۸۸۲ (۹۵۷۲۰) پربھنی: ۱۰۸۳۴۲۵ (۱۸۱۳۷۹) ۔ ناندیڑ: ۳۳۸۵۱۶ (۵۷۰۰۰) جلگاؤں: ۲۰۷۰۶۷ (۳۰۰۰) ۔ دھولے: ۶۴۵۵ (۲۹۵)۔ اور پھلٹن: ۱۴۰۴۶ (۲۷۸۸)۔

مہاراشٹر الیکٹرک سٹی بورڈ کی ریکارڈ کارکردگی۔

۸ اپریل: مہاراشٹر اسٹیٹ الیکٹرک سٹی بورڈ (ایم ایس ای بی) نے سال ۱۹۹۰-۹۱ء ایک دوسری قابلِ ذکر کامیابی ۱۵۹ سب اسٹیشن بشمول ۲۱ ای ایچ، وی، ٹی، سب اسٹیشن نصب کرکے حاصل کی۔ یہ سال گذشتہ کے نصب کئے گئے سب اسٹیشنوں سے تین گنا ہیں۔ سال ۱۹۹۰-۹۱ء کے دوران ۳۱ ۲۳ ایم وی اے کی طاقت والے ٹرانسمیشن لگائے گئے۔

اس بات کا اعلان ایم ایس ای بی کے چیرمین شری پی۔ ابراھام نے ۱۹۹۰-۹۱ء کے دوران بورڈ کی کارگذاری کا جائزہ لینے والی میٹنگ کے دوران کیا۔ آپ نے مزید فرمایا کہ اس ضمن میں موجودہ تکنیکی خامیوں کو دور کرکے مسائل پر قابو پایا جائے گا۔

آپ نے فرمایا کہ ۳۳ کے وی اور ۳۱۹۰ کے ایم ایس کی لائنس ۱۹۹۰-۹۱ء کے دوران لگائی گئی ایک سال میں اتنی ساری لائینوں کی تنصیب بذاتِ خود ملک بھر میں ایک ریکارڈ ہے۔

ایم ایس ای بی کی دوسری قابلِ ذکر کامیابی یہ ہے کہ امسال اس نے چندر پور میں ۵۰۰ ایم ڈبلیو سیٹ قائم کیا۔ شری ابراھام نے فرمایا کہ ایم ایس ای بی نے ایک ریکارڈ ٹائم میں ۵۰۰ ایم ڈبلیو سیٹ لگائے۔ ملک بھر میں پہلے اسٹیٹ الیکٹرک سٹی بورڈ کا درجہ حاصل کرلیا۔

آپ نے فرمایا کہ ایم ایس ای بی نے اس سال ۴۶۸ ایم ڈبلیو کی مانگ کو ۶۰۰ ایم ڈبلیو لگاکر اور گذشتہ سال کی ۵۸۸۳ ایم ڈبلیو کی مانگ کو پورا کرلیا ہے۔

تھرمل جنریشن کی فیصد تناسب یونٹ ۴۶ء ۸۶ فیصد سے بڑھکر ۶۰ء ۷۶ فیصد تک ہوگیا ہے پلانٹ لوڈ فیکٹر ۰۴ء ۵۹ فیصد سے بڑھکر ۶۵ء ۶۰ فی صد تک ہوگیا ہے جس سے ۱۹۸۹-۹۰ء میں جنریشن ۲۷۰۰۰ ملین یونٹس سے بڑھ کر سال ۱۹۹۰-۹۱ء میں ۲۸۵۷۲ ملین یونٹس تک ہوگیا۔ جس سے بیرونی زرِمبادلہ میں ۱۰ کروڑ روپے کی بچت کی جاسکی۔

شری ابراھام نے فرمایا کہ صارفین کی تکالیف کو دور کرنے کے لیے ایم ایس ای بی کی جانب سے متعدد اقدامات کیے جارہے ہیں۔ آپ نے مزید فرمایا کہ بورڈ کے کارکردگی کو مزید بہتر بنایا جائے گا۔

انتظامی منظوری

حکومتِ مہاراشٹر نے ضلع کولہاپور میں ارلے دیہات میں شیتور، ترپے، وارون، اُدگری، نیوالے، دھاکلے، چاندیل، کوندی (ریاست کی خاص شاہراہ) کے قریب وارنا ندی پر پُل کے کام کی انتظامی منظوری دیدی ہے۔ جس پر لاگت کا تخمینہ ۶۹،۰۰۰، ۳، روپے ہے

خبریں تصویروں میں

وزیراعظم شری چندر شیکھر نے بمبئی تشریف لانے پر سابق وزیراعظم شری مرارجی ڈیسائی کی مزاج پرسی کی۔ اس ملاقات کے موقع پر لی گئی تصویر۔

****

******

بھارت جین مہامنڈل کی طرف سے ۲۵ مارچ سنہ ۱۹۹۱ء کو مہاویر جینتی کے موقع پر منعقدہ تقریب میں وزیراعظم شری چندر شیکھر کو ایک یادگار تحفہ پیش کیا گیا۔ زیر نظر تصویر میں وزیراعلیٰ شری شرد پوار بھی دیکھے جاسکتے ہیں

****

یوم مسلح افواج کے موقع پر مہاراشٹر کے گورنر شری سی سبرامنیم فلیگ ڈے میں اپنا عطیہ پیش کر رہے ہیں۔

گورنر مہاراشٹر شری سی. سبرامنیم نے ۱۰ اپریل کو راج بھون میں دعوتِ افطار کا اہتمام کیا. زیرِ نظر تصویر میں گورنر موصوف کے ہمراہ اسمبلی کے اسپیکر شری مدھوکر راؤ چودھری، شری رام راؤ آدِک، وزیرِ مالیات اور شری سید احمد وزیرِ مملکت برائے توانائی کو دیکھا جاسکتا ہے.
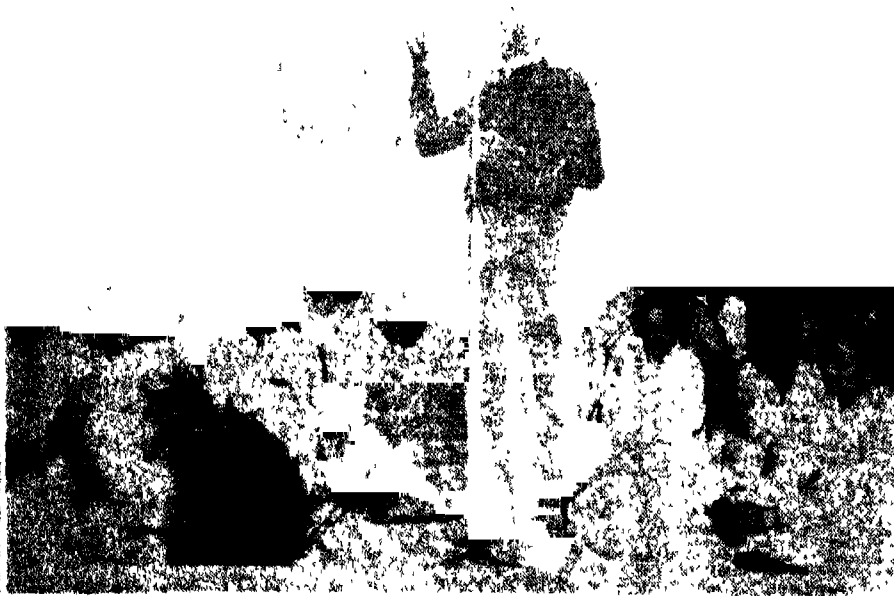
وزیرِ مملکت برائے اطلاعات و رابطۂ عامہ شری اردن گجراتی نے ۱۰ اپریل ۱۹۹۱ء کو مہاراشٹرا وِکاس منڈل، ممبئی کی طرف سے منعقد کردہ ایک ریلی کا افتتاح کیا. زیرِ نظر تصویر میں وزیرِ موصوف عوام سے خطاب فرما رہے ہیں.

قارئین کی رائے

محمد شیخ عثمان
لائبریرین، انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
۹۲، ڈاکٹر ڈی۔ این روڈ۔ بمبئی ۱...۴

قومی راج، اگست ۱۹۹۰ء کا شمارہ پڑھا۔ یوں تو یہ قرۃ العین حیدر صاحبہ کا خصوصی شمارہ ہونا چاہئے تھا لیکن یہ آپ کی طرف سے ظاہر نہیں ہوتا ہے اس اشاعت (خصوصی اشاعت) پر میں مبارکباد پیش کرتی ہوں۔ قرۃ العین حیدر سے ایک غیر رسمی گفتگو" اور "پت جھڑ کی آواز" کا شامل ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ آپ دور اندیشی مستقل مزاجی اور ثابت قدمی کے ساتھ اردو ادب کی خدمت کر رہی ہیں۔

میں قومی راج کی اس بڑھتی ہوئی ترقی اور کامیابی کے لئے تہ دل سے دست بدعا ہوں۔

★ متین انصاری
۲۴۳، مزہورہ، پونے ۱۱

"قومی راج چہار سمت مقبولیت کی طرف گامزن ہے اس رسالہ کا نکلنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا ادب میں شاعری۔ ہر ماہ اس کا شدت سے انتظار رہتا ہے۔ جتنی آپ نمبر جو آپ نے نکالا ہے اس کا کوئی مثل نہیں۔

خصوصاً پروین شاکر (پاکستان) کی نظم، نظام الدین نظام صاحب کی غزلیں اور مخمور صاحب کی تخلیقات دل کو بھا گئی اور اس پر طرہ یہ کہ "ایک غیر رسمی گفتگو عینی آپا" سے بہت سی معلومات فراہم کر گیا اور دوسرے بھی مضامین معیاری تھے۔ اور اچھے لگے۔

★ مس ریحانہ عبدالکریم شیخ
ائیر انڈیا کالونی، امرت نگر
گھاٹ کوپر (ویسٹ)، بمبئی

اکتوبر کا شمارہ نظر نواز ہوا، کافی پسند آیا اس شمارے کے صفحہ ۲۶ پر جناب عرفان پربھنوی کی غزل، پڑھ کر حیرت ہوئی کیونکہ تخیلات اور غزل کی بحر و بندش سبھی میرے ۷۰ سالہ نانا جان جناب شیخ ہارون برق (تھانے) کی مورخہ ۲۰ راپریل ۱۹۸۹ء میں لکھی ہوئی غزل سے بالکل ملتے جلتے پائے گئے سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم اسے محض اتفاق سمجھیں یا تخیلات کا سحر انگیز معجزہ نما ٹکراؤ۔ جناب برق صاحب سے دریافت کرنے پر انھوں نے بھی استعجاب کا اظہار کیا اور کہا کہ ایسا کیوں کر ہوا یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے اور کہا کہ ان کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں کیونکہ اس سے پہلے بھی ان کے ساتھ اسی طرح کا حادثہ پیش آچکا ہے مراسلہ کے ہمراہ مصنف کی غزل ارسال ہے۔

"رہو کہیں بھی مگر دل سے رابطہ رکھنا
دلوں کے بیچ محبت کا سلسلہ رکھنا"

★ ماسٹر غلام احمد راہی
وڈے گاؤں، تعلقہ بالاپور ضلع اکولہ (مہاراشٹر)

ماہ اگست اور ستمبر ۱۹۹۰ء کے دونوں شمارے ملے دونوں شمارے بہت ہی نمایاں اور اپنی بے مثال خوبیوں کے ساتھ گیان پیٹھ ایوارڈ یافتہ "قرۃ العین حیدر" کے فن پر بڑی خوبی سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ میں ایکتا کمیٹی اور ودربھ اردو ایکشن کمیٹی کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ دوستوں کو خریداری کے لئے توجہ دلاتا رہا ہوں امید ہے خط کے ہمراہ دو دوستوں کے منی آرڈر سالانہ خریداری کے مل جائیں گے۔

قومی راج

جلد ۱۸ — شمارہ ۵

۱۰ مئی سنہ ۱۹۹۱ء

سالانہ ۵۰ روپے
قیمت فی شمارہ ۲ روپے

ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر خصوصی نمبر

ہندی اور مراٹھی میں ہر ماہ کی یکم اور پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ انگریزی، گجراتی، سندھی اور اردو زبان میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

خط و کتابت کا پتہ:
ایڈیٹر قومی راج
ڈائرکٹوریٹ آف انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز
گورنمنٹ آف مہاراشٹر
۱۷ واں منزل، نیو ایڈمنسٹریٹو بلڈنگ
مقابل منترالیہ ممبئی ۴۰۰۰۳۲

چیف ایڈیٹر: شری ارون پاٹنکر

منیجنگ ایڈیٹر: آر۔ جی۔ مانیدیو

ایڈیٹر: فیروزہ فیاض خان

اس شمارے میں

ڈاکٹر شنکر دیال شرما
(نائب صدر جمہوریہ ہند)

بابا صاحب امبیڈکر

ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر ایک اعلیٰ دانشور، با اثر مقرر، موحد، مصنف نیز ریسرچ جیورسٹ تھے۔ ان سے زائد وہ ایک نہایت اہم انقلابی رہنما تھے۔ انھوں نے ایک سچے کھوجی کی حیثیت میں انسانی حقوق نیز انسان کے فخر کو اعلیٰ انسانی تہذیب کی جانب گامزن کرنے کے مقصد سے شہرت دلائی۔

ہمارا یہ فخر منصفانہ ہے کہ ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر کو ہم ہندوستان کا سپوت کہنے کے لیے دعوا کریں۔ لیکن ان کا صحیح معنوں میں ایک خاص شخصیت کی شکل میں تخمینہ کرے گی۔ لیکن ان کی زندگی کسی خاص علاقے کے باشندوں کے لیے ہی نہیں بلکہ انسان کی روح کے نجات کے لیے خود سپرد تھی۔ ان کا پیغام پوری دنیا کے ان سبھی مقامات اور حالات کے لیے معنی رکھتا ہے جہاں انسان انسان کے تئیں ناانصافی کرتا ہے۔

ہندوستان کی لوک سبھا کے سینٹرل بھون میں بابا صاحب امبیڈکر کے مجسمے کا قیام اس بات کی علامت ہے کہ ہندوستانی عوام نیز اس ملک کی سرکار ہندوستان کے سماجی نظام اور سیاست میں ان کے ذریعہ بنائے گئے اور قائم شدہ مقدس انسانی نظریہ کو نہایت اہم مانتا ہے۔ اس اہم موقع پر ہم بابا صاحب امبیڈکر کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے شکریہ ادا کرتے ہیں نیز ان کے ذریعہ بنائے گئے راستے کے تئیں ہماری پوری قوم کے عزم کو دوہراتے ہیں۔ آج آزادی کے چار دہے بعد بھی اس المناک اور کڑوے سچ کو بھی نہیں دیکھ سکتے کہ اگرچہ سیاسی نظریئے سے ہم آزاد ہیں لیکن ہمارا ملک منصفانہ سماجی نظام کے انسانی اصولوں سے ابھی بھی بہت دور ہے۔ انسانی شہرت نیز بنیادی انسانی حقوق کو ضرب لگتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی وجود کے بے تنازعہ بنیادی پہلوؤں کے لیے آئین اور قانون میں بلند معیاری گنجائشات ضروری ہیں۔ لیکن آج سماج کے کچھ خاص طبقے ہمارے بے رحمانہ ظلم استحصال کا شکار ہوتے ہی رہتے ہیں۔ ذات پرستی کا برا اثر جس نے صدیوں سے ہندوستان کو کمزور بنایا ہے اس سے آج بھی ہندوستانی زندگی دوچار ہے۔

ڈاکٹر محمد منشاء الرحمٰن خان منشا
اسٹار کی ٹاؤن ۔ ناگپور

بابا امبیڈکر

مردِ ذیشان تھے بابا امبیڈکر
ہند کی آن تھے بابا امبیڈکر
لاکھوں انسانوں کو زندگی بخش دی
قوم کی جان تھے بابا امبیڈکر
خود تھا قانون کو جن کی ہستی پہ ناز
ایسے ودھوان تھے بابا امبیڈکر
عِلم و فن، فہم و دانش کے پیشِ نظر
خاص انسان تھے بابا امبیڈکر
وقت کی آندھیوں میں جلائے چراغ
کتنے بلوان تھے بابا امبیڈکر
پچھڑے، کچلے، دلت لوگوں کے واسطے
زیست سامان تھے بابا امبیڈکر
صاف بتلاتی ہے ان کی نام آوری
اعلیٰ انسان تھے بابا امبیڈکر
ہر کوئی گاتا ہے ان کی عظمت کے گُن
ان کی ہمّت کے گُن ان کی جرأت کے گُن
ان کی بے مثل فہم و فراست کے گُن
ان کے ایثار کے ان کی عظمت کے گُن
نازشِ ملک و ملّت ہیں امبیڈکر
اپنے بھارت کی عزّت ہیں امبیڈکر

تاریخ زندگی ڈاکٹر باباصاحب امبیڈکر

۱۴ اپریل ۱۸۹۱ء — مدھیہ پردیش میں مہو کے مقام پر پیدا ہوئے۔

۱۹۰۰ء — گورنمنٹ سکنڈری اسکول ستارا میں داخل ہوئے۔

۱۹۰۸ء — بمبئی یونیورسٹی سے میٹرکولیشن کیا اور ایلفنسٹن کالج میں داخلہ لیا۔ پہلی شادی ہوئی۔

۱۹۱۲ء — اکنامکس اور پالٹکس کے ساتھ بی۔ اے۔ پاس کیا۔

۱۹۱۵ء — ایم۔ اے۔ پاس کیا۔

۱۹۱۷ء — کولمبیا یونیورسٹی نے آپ کو پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری عطا کی۔ ہز ہائینس مہاراجہ بڑودہ کے ملٹری سکریٹری مقرر ہوئے

۱۹۱۸ء — سڈنہم کالج، بمبئی میں پالٹکس اور اکنامکس کے پروفیسر رہے

۱۹۲۰ء — ہفتہ وار اخبار "موک نایک" جاری کیا۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے برطانیہ گئے۔

۱۹۲۱ء — بیرسٹری کے لئے "گریز ان" میں داخل ہوئے

۱۹۲۳ء — بیرسٹر بنے۔ بمبئی صوبائی قانون ساز کی رکنیت حاصل کی۔

۱۹۲۷ء — مہاڑ میں چودھر تالاب ستیہ گرہ کی "بہشکرت بھارت" نامی ہفت روزہ اخبار جاری کیا۔

۱۹۲۸ء — گورنمنٹ لاء کالج میں پروفیسر۔ سائمن کمیشن کی بمبئی صوبائی کمیٹی کے رکن ہوئے۔

۱۹۳۰ء — ناسک میں کالا رام مندر ستیہ گرہ۔ ہفت روزہ اخبار "جنتا" جاری کیا۔

۱۹۳۲ء — دستور ہند میں ترمیم کے لئے جائنٹ کمیٹی کی رکنیت قبول کی۔

۱۹۳۵ء — گورنمنٹ لاء کالج، بمبئی کے پرنسپل مقرر ہوئے۔

۱۹۳۶ء — ایک آزاد لیبر پارٹی قائم کی۔

۱۹۳۹ء — بمبئی لیجسلیچر کے ممبر بنے

۱۹۴۱ء — بودھ جن پنچایت سمیتی (بھارتیہ بودھ جن سمیتی) قائم کی۔

۱۹۴۲ء — آل انڈیا شیڈولڈ کاسٹ فیڈریشن کا قیام

۱۹۴۵ء — پیپلز ایجوکیشن سوسائٹی قائم کی

۱۹۴۶ء — گورنر جنرل ایکزیکٹو کونسل سے استعفیٰ۔ انگلینڈ روانہ ہوئے۔

۱۹۴۷ء — پنڈت جواہر لال نہرو کی مرکزی کابینہ میں وزیر قانون بنائے گئے۔ مسودہ دستور کمیٹی کے چیئرمین مقرر ہوئے۔

۱۹۴۸ء — دوسری شادی۔

۱۹۵۰ء — میلنڈ کالج قائم کیا۔ دستور ہند پیش کیا۔ کولمبو میں منعقدہ عالمی بدھسٹ کانفرنس میں بحیثیت نمائندہ شرکت کی

۱۹۵۲ء — راجیہ سبھا کے ممبر۔ کولمبیا یونیورسٹی نے "ایل۔ ایل۔ ڈی" کی اعزازی ڈگری عطا کی۔

۱۹۵۴ء — سدھارتھ کالج آف کامرس اینڈ اکنامکس قائم کیا۔ عالمی بدھسٹ کانفرنس میں شرکت کے لئے رنگون گئے

۱۹۵۵ء — بھارتیہ بودھ مہاسبھا قائم کی۔

۱۹۵۶ء — سدھارتھ کالج آف لاء قائم کیا۔ بودھ دھرم قبول کیا آپ کے ساتھیوں کی عام تبدیلی مذہب۔ کھٹمنڈو میں عالمی بدھسٹ کانفرنس میں شرکت کی۔

۶ دسمبر ۱۹۵۶ء — مہاپری نروان

ڈاکٹر بی. آر. امبیڈکر

ڈاکٹر امبیڈکر اور پارلیمانی جمہوریت

۲۸/ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو ڈی. اے. وی. کالج، جالندھر، پنجاب کے طلبہ کی پارلیمنٹ کے اجلاس میں "پارلیمانی جمہوریت" پر ڈاکٹر بی. آر. امبیڈکر کی تقریر۔

ِنسپل، معزز صدر و معزز اسپیکر!

میں آپ سب کا مشکور ہوں کہ آپ نے مجھے اپنی پارلیمنٹ
ں خصوصی اجلاس سے خطاب کرنے کی سعادت بخشی. میں
ایک مضمون سے دوسرے مضمون اور ایک پیشہ سے دوسرے
ں طرف بڑھتا رہا ہوں۔ انگلینڈ سے واپسی کے بعد ۱۹۱۹ء
ں نے اپنا کیریر بمبئی کے گورنمنٹ کامرس کالج میں پولٹیکل
ں کے پروفیسر کی حیثیت سے شروع کیا. لیکن بہت جلد میں
وس کیا کہ عوامی خدمت انجام دینے کے خواہشمند فرد کے لئے
نوکری مناسب و موزوں نہیں ہے. گورنمنٹ سرونٹ، ہمیشہ
ن کے اصولوں سے جکڑا رہتا ہے. لہذا میں دوبارہ انگلینڈ
وہاں سے بار ایٹ لاء کی سند لے کر لوٹا. اب کی بار جب
ِدوستان لوٹا تو کچھ عرصہ کے لئے میں نے وکالت کا پیشہ اختیار
ندمیں گورنمنٹ لاء کالج، بمبئی میں پرنسپل کا عہدہ قبول
س طرح میں دوبارہ درس و تدریس کے پیشے کی طرف آگیا.
ول تک میں لاء کالج کا پرنسپل رہا. پھر ۱۹۲۵ء میں گورنمنٹ
آف انڈیا ایکٹ کے تحت پہلی مرتبہ مجلس قانون ساز قائم ہوئی اس وقت میں نے ملازمت سے دستبردار ہو کر سیاست میں قدم رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت سے آج تک میں پیشۂ وکالت اور عوام کی خدمت میں برابر مصروف ہوں۔

معلم کا پیشہ مجھے ہمیشہ سے عزیز رہا ہے اور طلبہ سے مجھے خصوصی لگاؤ ہے. کابینہ سے میرے استعفے کے بعد طلبہ سے خطاب کرنے کا یہ میرا پہلا موقع ہے. ملک کے مستقبل کا دارومدار بڑی حد تک طلبہ ہی پر ہے۔ طلبہ کا شمار ملک کے دانشور طبقہ میں کیا جا سکتا ہے اور ان میں اتنی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ عوام کی رائے پر اثر انداز ہوں. لہذا آج آپ سے خطاب کرتے ہوئے میں انتہائی مسرت محسوس کرتا ہوں۔

آپ کے پرنسپل صاحب نے مجھے آپ سے خطاب کرنے کے لئے مدعو کرتے وقت مضمون کی تخصیص نہیں کی اور نہ ہی میرے ذہن میں کوئی خاص موضوع تھا، لیکن جیسا کہ اکثر میرے ساتھ ہوا ہے اچانک میرے ذہن میں موضوع آگیا اور میں نے "پارلیمانی حکومت"

کے موضوع پر آپ سے چند باتیں کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ چونکہ مجھے بہت کم وقت دیا گیا ہے اس لئے میں "پارلیمانی حکومت" کا مختصر جائزہ پیش کروں گا۔

دستور کی نوعیت :

دستور کی نوعیت کے سوال پر دستور ساز اسمبلی میں مباحثہ کے دوران مختلف رائیں پیش کی گئی تھیں۔ بعض حضرات برطانوی سسٹم کے حق میں تھے تو بعض امریکی سسٹم کے حق میں، چند ایک حضرات ان دونوں کی مخالفت میں تھے۔ لیکن ایک طویل بحث کے بعد آخر کار اکثریت اس بات پر متفق ہوئی کہ برطانوی طرز پر پارلیمانی نظام ہندوستان کے لئے مناسب ہے۔

بعض حضرات پارلیمانی طرز حکومت کو پسند نہیں کرتے۔ کمیونسٹ روسی طرز کی حکومت چاہتے ہیں۔ سوشلسٹ بھی ہندوستان کے حالیہ دستور کی مخالفت کرتے ہیں اور وہ اس کے خلاف احتجاج بھی کر رہے ہیں۔ انہوں نے واضح کر دیا ہے کہ اگر وہ برسرِ اقتدار آئے تو دستور میں ترمیم ضرور کریں گے۔ ذاتی طور پر میں پارلیمانی جمہوریت کا حامی ہوں۔ ہمیں اس کا مفہوم سمجھنا چاہئے اور دستور میں اسے برقرار رکھنے کی کوشش کرنا چاہئے۔

پارلیمانی حکومت :

پارلیمانی حکومت سے کیا مراد ہے؟ برطانیہ کے دستور پر والٹر بیجہٹ کی ایک تصنیف ہے جسے بلاشبہ کلاسیکی دستاویز کہا جا سکتا ہے۔ بعد میں لاسکی اور دستوری حکومت کے دیگر ماہرین نے والٹر کے نظریات کو مزید واضح کیا۔ والٹر نے پارلیمانی حکومت کی تعریف ایک جملہ میں کی ہے وہ کہتا ہے کہ :

"پارلیمانی نظام کے معنی صلاح و مشوروں سے حکومت نہ کہ ہنگامہ آرائی کے ذریعہ"

آپ دیکھیں گے کہ برطانوی نظام میں کبھی بھی فیصلہ لیتے وقت 'ہاتھا پائی' نہیں ہوتی۔ ہمیشہ بحث کے بعد فیصلے لئے جاتے ہیں جب کہ فرانس میں فیصلے لیتے وقت اکثر و بیشتر گھونسے چلتے ہیں ــ!

فی الوقت ہم پارلیمانی جمہوریت سے واقف ہیں۔ لیکن ایک وقت تھا کہ جب ہندوستان میں پارلیمانی اداروں کا دور دورہ تھا۔ اگر آپ 'مہاپری نروان سوتر' کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو میرے اس دعوے کے حق میں ثبوت فراہم ہو

ان ’سکناؤں‘ میں درج ہے کہ جب کشمیہ (کشی نگر)
بدھ قریب المرگ تھے، یہ خبر ”ملاؤں“ تک پہنچائی
فت ان کا اجلاس جاری تھا۔ وہ پارلیمانی نظام کے
عمل کرتے تھے۔ انھوں نے طے کیا کہ اجلاس جاری
پارلیمانی کارروائی ختم ہونے کے بعد ہی ’کشمیرا‘ کے
ہوں گے۔ یہ اور ایسے کئی واقعات سے یہ واضح ہو
’پارلیمانی نظام‘ ہمارے لئے نیا نہیں۔

کار:

نی نظام کے طریقہ ’کار سے متعلق بے شمار اصول ہیں۔
(MAY) کے مرتب کردہ اصولوں پر عمل کیا جاتا ہے۔
جو ہر پارلیمانی نظام میں اپنایا جاتا ہے‘ یہ ہے کہ
بغیر کسی مسئلہ پر بحث نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ
سوال پر بحث نہیں ہوتی۔ قدیم زمانے میں ہمارے
اصول پر عمل کیا جاتا تھا۔ مزید برآں خفیہ رائے دہندگی
ہمارے لئے نیا نہیں۔ بدھشٹ سنگھوں میں یہ
تھا۔ ان کے بیلٹ پیپر ”سلاتیر یکا گراہکاس“ کہلاتے
ستی سے ہم اس عظیم روایت کو کھو چکے ہیں۔ ہمارے
لئے یہ حل طلب مسئلہ ہے کہ آخر یہ پارلیمانی ادارے
میں سے غائب کیوں ہو گئے؟ لیکن مجھے یہ محسوس
یا تو وہ ایسا کر نہیں سکتے یا پھر وہ کرنا نہیں چاہتے۔
ستان، دنیا کا صف اول کا ملک تھا اس زمانے میں
ادی حاصل تھی وہ کہیں اور نہیں پائی جاتی تھی۔ پھر کیا
ہمارا وہ تمدن باقی نہیں رہا؟ کیوں ہندوستان پر
ان شہنشاہیت مسلط ہوئی؟ ہم پارلیمانی اداروں سے
۔ آج پارلیمانی طرز حکومت ہمارے لئے نئی بن گئی ہے
دیہاتوں میں جاتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے دیہاتی
اور ”پارٹی“ جیسے ناموں سے ناواقف ہیں۔ انھیں یہ
چیز لگتی ہے۔ آج پارلیمانی اداروں کی بقا ہمارے لئے
بڑا مسئلہ ہے۔ لہذا ہمیں چاہیئے کہ عوام کو پارلیمانی طرز
سے متعلق مکمل معلومات فراہم کریں اور انھیں اس طرز
کے فوائد سے روشناس کرائیں۔ پارلیمانی طرز حکومت کی
جو تعریف بیزٹ (BAZZOT) نے کی ہے اس سے ہم واقف ہیں
لیکن آج اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس طرز حکومت کی
تین خوبیاں ہیں۔

تین اہم خوبیاں:

پارلیمانی طرز حکومت میں وراثتی راج نہیں ہوتا اس میں حاکم
عوام کا منتخب کردہ فرد ہونا چاہیئے۔ دوسرے لفظوں میں اسے عوام
کی پوری حمایت حاصل ہونی چاہیئے۔ پارلیمانی نظام حکومت میں آمرانہ
راج کی گنجائش نہیں۔

دوسری خوبی اس طرز حکومت کی یہ ہے کہ عوام سے متعلق کوئی
بھی قانون عوام کے منتخبہ عام اشخاص کی مرضی کے بغیر وضع نہیں
کیا جا سکتا۔ کوئی بھی فرد واحد یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ سب کچھ جانتا
ہے اور وہ خود قانون بنا سکتا ہے اور حکومت کر سکتا ہے۔ تمام
قوانین پارلیمنٹ میں عوام کے نمائندے وضع کرتے ہیں۔ عوام ہی ایسے
عام اشخاص کو مشورہ دے سکتے ہیں جن کے لئے قانون وضع کیا جاتا
ہے۔ یہی فرق ہے آمریت اور جمہوری طرز حکومت میں۔ آمریت میں
بادشاہ یا شہنشاہ مطلق العنان ہوتا ہے تمام امور سلطنت اس کے
نام سے انجام پاتے ہیں۔ جمہوریت میں امور ریاست ملک کے سربراہ
کے نام سے چلائے جاتے ہیں لیکن صحیح معنوں میں عنان حکومت
عوام کے نمائندوں کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ عوام کے منتخب کردہ
نمائندے سربراہ کے نام پر حکومت چلاتے ہیں۔

اس طرز حکومت کی تیسری اور آخری قابل ذکر خوبی یہ ہے کہ
عوام کے منتخب کردہ نمائندوں کو نہیں ریاست کے سربراہ کے
مشیر وصلاح کار کہا جا سکتا ہے۔ معینہ مدت کے بعد دوبارہ عوام
کا اعتماد حاصل کرنا ہوتا ہے۔ پہلے برطانیہ میں عام انتخابات
سات سال کے عرصہ کے بعد ہوتے تھے۔ چارٹسٹس (CHARTISTS)
لوگوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ وہ سالانہ انتخابات چاہتے
تھے۔ ان کے اس مطالبہ کے پیچھے جو مقصد کارفرما تھا وہ بڑا ہی
قابل تعریف ہے گو کہ ایسا کرنا ممکنات میں سے نہیں لیکن اگر یہ
ایسا کیا جاتا تو یہ عوام کے لئے بڑی خوش آئند بات ہوتی۔ پارلیمانی
انتخابات پر کافی سرمایہ خرچ کرنا ہوتا ہے لہذا ۵ سال کی مدت پر
اتفاق کیا گیا۔

۲ دو ستون:

پارلیمانی طرزِ حکومت کو محض زبانی جمع خرچ کے ذریعہ حکومت کرنے کا طریقہ سمجھنا غلط ہوگا۔ اس طرزِ حکومت کے دو ستون ہیں، وہ ہیں ۱۔ حزبِ مخالف اور ۲۔ آزادانہ اور منصفانہ انتخابات۔

گذشتہ ۲۰ - ۳۰ سالوں سے ہم صرف ایک سیاسی پارٹی کے زیرِ اثر ہیں۔ پارلیمانی جمہوریت کی ٹھیک سے کارفرمائی کے لیئے حزبِ مخالف کی ضرورت اور اہمیت کو ہم تقریباً فراموش کر چکے ہیں۔ ہم سے ہمیشہ یہی کہا گیا ہے کہ مخالفت یا حزبِ مخالف بُری چیز ہے جہاں ہم پھر یہ بھول جاتے ہیں کہ ہماری قدیم تاریخ ہمیں کیا سکھاتی ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں 'وید' اور 'سمرتی' کی ترجمانی کرنے کے لیئے "نبندھ کار" موجود تھے، وہ اشلوک اور سوتروں کی تفسیر بیان کرتے وقت پہلے "پُروا پکش" یعنی سوال کے ایک رُخ پر روشنی ڈالتے اور بعد میں "اُتر پکش" یعنی دوسرے رُخ کو زیرِ بحث لاتے تھے۔ اس طرح وہ یہ احساس دلاتے تھے کہ یہ سوال کوئی معمولی نہیں بلکہ متنازعہ فیہ ہے، اس پر بحث کی جا سکتی ہے اور اس سلسلے میں شک و شبہات کی گنجائش بھی ہے۔ بعد ازاں وہ "ادھیکرن" یعنی دونوں رُخوں کا تنقیدی جائزہ لیتے تھے۔ بالآخر وہ 'سدھانت' یعنی اپنا فیصلہ سُناتے تھے۔ اس سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ ہمارے پراچین گرو بھی دو پارٹی نظامِ حکومت کو مانتے تھے۔

پارلیمانی جمہوریت میں اگر کسی مسئلہ کے دو رُخ ہوں تو عوام کو دونوں رُخوں سے واقفیت حاصل کرنے کا حق ہوتا ہے۔ لہٰذا جمہوری نظام کو چلانے کے لیئے حزبِ مخالف بے حد ضروری ہے۔ حزبِ مخالف کو آزاد سیاسی زندگی کی کلید کہا جا سکتا ہے اس کے بغیر جمہوریت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ پارلیمانی نظامِ حکومت کے علمبردار دو ممالک برطانیہ اور کینیڈا میں اس کی اہمیت کو سمجھا گیا ہے وہاں حزبِ مخالف کے رہنما کو حکومت تنخواہ دیتی ہے وہ حزبِ مخالف کو ایک ضروری جز سمجھتے ہیں۔ ان ممالک کی رائے ہے کہ حزبِ مخالف کو بھی حکومت کے معاملے میں چوکس رہنا چاہیئے، ممکن ہے کہ حکومت بعض حقائق کو چھپانے کی کوشش کرے یا پھر صرف یک طرفہ پروپیگنڈا شروع کر دے۔ لیکن ان دو ممالک میں حزبِ مخالف کی وجہ سے حکومت ایسا نہیں کرسکتی۔

آزادانہ و منصفانہ انتخاب:

آزادانہ و منصفانہ انتخاب، پارلیمانی جمہوریت کا دوسرا ستون ہے۔ سماج میں خون خرابے کے بغیر پُرامن طریقے سے ایک پارٹی سے دوسری پارٹی کے ہاتھوں میں اقتدار کی منتقلی کے لیئے آزادانہ و منصفانہ انتخابات بے حد ضروری ہیں۔ زمانۂ قدیم میں ایک راجہ کے انتقال پر محل میں ایک خون ضرور ہوتا تھا۔ ہندوستان کی تاریخ بھی یہی رہی ہے، اس سے آزادانہ و منصفانہ انتخابات کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ عوام کو یہ پورا اختیار ہونا چاہیئے وہ جسے چاہیں اسے مجلس قانون ساز میں بھیجیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا برسرِ اقتدار سیاسی پارٹی حزبِ مخالف کو پنپنے دے گی؟ کانگریس کسی طرح حزبِ مخالف نہیں چاہتی۔ کانگریس متفرق مکتبۂ فکر کے افراد کو ایک چھت کے نیچے لانا چاہتی ہے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا اس ملک کی سیاسی زندگی میں یہ رجحان اچھا ہے؟ پھر آزادانہ اور منصفانہ انتخابات

ں؟

س حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ بڑے سرمایہ دار بھی
ـ کی سیاست میں ایک بڑا رول ادا کرنے کی کوشش میں
سرمایہ داروں کی جانب سے کانگریس کو بطور عطیہ دیجانے
ری خطرناک ثابت ہو سکتی ہے. اگر اہل زر کسی سیاسی
ر الیکشن فنڈ میں عطیات دے کر انتخابات پر اثر انداز
یں تو آپ سوچ سکتے ہیں کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا. اگر وہ
تاب جیت جاتی ہے تو ظاہر ہے کہ یہ سرمایہ دار اس سے
کے طالب ہوں گے. اس پر اثر انداز ہوں گے اور یہی
ے کہ قانون ان کے حق میں ہوں اور وہ خوب فائدہ اٹھا
. میں آپ حضرات سے پوچھتا ہوں کہ کیا ان حالات کے
یمانی طرزِ حکومت میں عوام کے مفاد کی حفاظت کی جا سکتی
ں آپ کو یاد دلانا چاہوں گا کہ مہابھارت میں کورو اور
جنگ میں 'بھیشما' اور 'درونا' کورو کے ساتھ تھے ـ
پر تھے جبکہ کورو حق پر نہیں تھے. بھیشما کو اس کا احساس
یسی نے اس سے پوچھا کہ وہ کیوں کورو کے ساتھ ہے
ق پر نہیں ہیں تو اس نے جواب دیا " مجھے نمک حلال
ہئے. اگر میں نے کوروں کا دیا ہوا کھایا ہے تو مجھے ان
دینا ہوگا چاہے وہ حق پر نہ ہوں "

ہی ہو رہا ہے. کانگریس بنیوں، مارواڑیوں اور دوسرے
ـ دوں سے مالی امداد لے رہی ہے، چونکہ کانگریس " ان
ھا رہی ہے لہٰذا یہ صاف ظاہر ہے کہ ہر نازک وقت پر
ـ ان کا ساتھ دینا ہوگا "

ے اپیل :

بھی دیکھ رہے ہیں کہ سرکاری ملازم بھی اسی برسرِ اقتدار
پارٹی کی حمایت میں انتخابات پر اثر انداز ہوتے ہیں جو
ان کے بال بچوں کا پیٹ بھرتی ہے اور یہ کوئی اور نہیں
پرشاد مکھرجی ہی تھے جنھوں نے دہلی میں بھارتیہ جن سنگھ
یہ اجلاس میں سرکاری ملازمین پر الیکشن کے دوران
ی مدد کرنے کا کھلا الزام لگایا تھا اور ایسے الیکشن کو

باطل قرار دیا تھا. کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ان حالات میں پارلیمانی جمہوریت کامیاب ہو سکتی ہے؟

اگر اس ملک میں پارلیمانی جمہوریت ناکام ہوتی ہے اور میری بیان کردہ مذکورہ بالا وجوہات کی بنا پر اس کا ناکام ہونا یقینی ہے تو نتیجتاً بغاوت، نراج اور کمیونزم ہی رونما ہوگی. اگر برسرِ اقتدار حضرات یہ نہیں سمجھتے کہ عوام موروثی اقتدار کو گوارہ نہیں کرینگے تو یہ ملک کہیں کا نہ رہے گا. ایسی صورت میں شاید کمیونزم آ جائے اور روس حاوی ہو جائے. پھر ہماری شخصی آزادی اور حریت جاتی رہے گی یا پھر برسرِ اقتدار پارٹی کی ناکامی پر عوام کا ناراض طبقہ بغاوت شروع کردے اور نراج پھیل جائے.

معزز حضرات!

میں چاہتا ہوں کہ آپ ان امکانات اور خدشات کو شدت سے محسوس کریں. اگر آپ چاہتے ہیں کہ اس ملک میں پارلیمانی جمہوریت اور پارلیمانی نظامِ حکومت برقرار رہے، ہمیں اظہارِ خیال، تقریر اور عمل کی آزادی حاصل رہے، ہماری آزادی ہر طرح محفوظ رہے اور ہم انفرادی آزادی کے فطری حق سے کبھی محروم نہ ہوں، تو بحیثیت طالب علم اور سمجھدار افراد آپ کا یہ فرض ہے کہ آپ صحیح معنوں میں پارلیمانی نظامِ حکومت برقرار رکھنے کیلئے ہر طرح کوشش کریں.

آخر میں، میں آپ کا شکر گذار ہوں کہ آپ نے مجھے آپ سے خطاب کرنے کا موقع دیا.

قلمی دوستی

رسالے کے ذریعے ... تخلیقات کے خانے پر پابندی ... مکمل پتہ، پن کوڈ نمبر کے ساتھ ضرور تحریر فرمائیں مضمون کاغذ کے صرف ایک ہی طرف اور صاف لکھیں اور قلمی نام کے ساتھ اصلی نام بھی تحریر کریں. غیر مطبوعہ مضامین کی نقل اپنے پاس ضرور رکھیں.

یوسف ناظم
۲۸ ابہال بلڈنگ ۳ باندرہ ریکلیمیشن
باندرہ ویسٹ بمبئی ۴۰۰۰۵۰

ڈاکٹر امبیڈکر کے بارے میں ایک سوال

ہندوستان کی جن بڑی شخصیتوں کو میں نے دیکھا اور سُنا ان میں سے چند تو ایسی ہیں جن کا جہاں بھی کوئی موقعہ ملتا ہے ذکر کرنے کو جی چاہتا ہے۔ سروجنی نائیڈو تو خیر حیدرآباد ہی کی تھیں اور ان کا دیدار کیجئے یا ان سے ملاقات، تقریباً عام بات تھی کسی بھی جلسے میں آ جاتیں۔ مشاعرے میں پہونچ جاتیں اور یہ تاثر دیتیں گویا وہ سمندر کی ایسی موج ہیں جو الگ نہیں ہونا چاہتیں۔ اُن کے صحیح قد و قامت کا اندازہ اس وقت ہوا جب وہ گورنر بنیں اور انھوں نے بتایا کہ گورنر کو گورنر ہونا چاہیئے یا شیر نر۔ پیپرمنٹ کی گولی نہیں ہونا چاہیئے۔ پھر وہ مسز ارونا آصف علی تھیں۔ فارسی اور اردو کی شیدائی۔ تقریر کرتیں تو کیا مجال کوئی بدیسی لفظ زبان پر آ جائے۔ وہ خود کان جواہر تھیں اور لوگ انہیں سنتے تو ہمہ تن گوش ہو جاتے۔ دیواروں کو جو کان دیئے گئے ہیں اس کی وجہ بھی شاید یہی ہو کہ وہ ایسی دلآویز تقریریں سن سکیں۔ پھر مجھے موقعہ ملا راؤ کرشنن کرشنا سنن اور روبھہ بھائی پنت کو سننے کا۔ راؤ کرشنن سے تو میں ان ہی کی ایک کتاب خرید کر جل گاؤں میں ان سے اس کتاب پر ان کے دستخط حاصل کیے تھے ــــ ڈاکٹر امبیڈکر کو سننے اور دیکھنے کا موقعہ ملے گا اس کی مجھے توقع نہیں تھی لیکن جب آج سے کوئی ۴۰، ۴۲ سال پہلے ملند کالج کے افتتاح کی تقریب ہوئی تو نہ صرف ڈاکٹر امبیڈکر اور نگ آباد آئے ساتھ میں ان کیا راج گوپال چاری اور شاید ڈاکٹر راجندر پرشاد بھی تھے۔ بڑی شاندار تقریب تھی۔ ایک تو کالج کے قیام کی خوشی اور پھر ہندوستان کی جنگ آزادی کے سورماؤں کا اجتماع۔ وہ دَور ہی تھا علم اور عمل کا۔ زورِ بازو کا زمانہ نہیں تھا۔ اُس زمانے میں سیاست کا مقصد

قربانی تھی خود کی قربانی۔ دوسروں کا ذبیحہ نہیں۔ اس تقریب کا ماحول خالص علمی تھا گوکہ انتظام سرکاری تھا۔ اسوقت راجوارڈے وہاں کلکٹر تھے، ساہیتہ کے آدمی تھے۔ یہ راز مجھ پر اسی دن منکشف ہوا۔ انہوں نے راج گوپال چاری کی انگریزی تقریر کا مراٹھی میں فی البدیہہ ترجمہ کیا۔ دو مائیکروفون تھے راج گوپال انگریزی کا جملہ بولتے اور راجوارڈے فوراً دوسرے مائیک سے اس کا ترجمہ سنا دیتے۔ یہیں ڈاکٹر امبیڈکر کو سُنا اور دیکھا، مشہور وہ پست اقوام کے لیڈر تھے لیکن بڑے بڑے دانشوران کی علمی اور خاص طور پر قانونی قابلیت سے مرعوب تھے۔ ڈاکٹر امبیڈکر کی شخصیت کو میں پُراسرار شخصیت کہوں گا اس لیے کہ ایک ہی وقت میں وہ ن پڑھ اور تعلیم کے نام تک سے بے بہرہ لوگوں کے قاید تھے اور ساتھ ہی ساتھ وہ ملک کے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے میں بھی اپنے تبحرِ علمی کے بل پر مقبول اور محترم تھے ہ اس لحاظ سے سپاہی بھی تھے اور سپہ سالار بھی۔ کروڑوں وام کے قلوب اور ذہنوں کو مسخر کرنا صرف امبیڈکر کے حصے میں تھا۔

ان خلفشار اور انتشار کے دنوں میں جب ملک ینی آزادی اور تقسیم کی دہلیز پر تھا، ملک کو ایک ماہرِ قانون ی ضرورت تھی۔ ماؤنٹ بیٹن کے منصوبے کے مطابق طے ہو چکا تھا کہ اب انگریز اس ملک سے چلے جائیں گے در یہ بھی طے ہو چکا تھا کہ ملک کا ایک بڑا حصہ بھی چلا جائے گا۔ اس اتھل پتھل کے ماحول میں دلجمعی کے ساتھ م کرنا اور وہ بھی ایسا اہم اور نازک کام جس پر ملک کے ستقبل کا دار و مدار ہو، جس میں آنے والی نسلوں کے عاشی، سماجی اور سیاسی مسائل کا حل ہو، تحفظ اور ی کی ضمانت ہو، ایسا کام اپنے ذمے لینے اور اسے انجام تک پہونچانے کا بیڑا اٹھانا، ڈاکٹر امبیڈکر جیسے عالی ہمت، مخلص اور ذہین و فہیم شخص ہی کے بس کا تھا۔ انھیں دستورِ ہند مرتب کرنے کا کام دیا گیا۔ وہ دستور ساز اسمبلی کے صدر چنے گئے۔ جس وقت وہ صدر چنے گئے لوگوں کو اندازہ نہیں تھا کہ اس پیچیدہ اور دشوار گزار راستے پر یہ شخص اتنی پامردی اور ثابت قدمی کے ساتھ چل سکے گا۔ امبیڈکر کی صحت گر رہی تھی اور دستور ساز اسمبلی کے کچھ اراکین اپنی دوسری مصروفیتوں میں الجھے ہوئے تھے۔ وقت تنگ تھا۔ یہ سنہ ۱۹۴۸ء کی بات ہے۔ ڈاکٹر امبیڈکر کے دونوں پاؤں اعصابی درد سے متاثر تھے اور تکلیف اتنی شدید تھی کہ وہ ایک مرتبہ تو مسلسل ۴ دن تک پلک بھی نہیں جھپکا سکے۔ ڈاکٹروں نے کی تشخیص یہ تھی کہ اگر اس درد کا فوری طور پر علاج نہ ہو سکا تو یہ آگے چل کر لاعلاج ہو جائے گا۔ ڈاکٹر امبیڈکر اسی حالت میں ہندوستان کے دستور کا مسودہ تیار کرتے رہے۔

قانون داں لوگوں کی کئی قسمیں ہوتی ہیں وہ جو صرف وقت گزارنے کے لیے قانون کی تعلیم حاصل کرتے ہیں وہ بھی بہرحال قانون داں ہوتے ہیں۔ پھر وہ کہ ایک جونیر کی حیثیت سے کسی کا ہاتھ بٹاتے ہیں، پھر خود سینیر ایڈوکیٹ۔ عدالت خفیفہ کے وکیل، دیوانی کے وکیل فوجداری کے وکیل، ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے وکلا، سالیسٹر، پبلک پرازیکیوٹر، رجسٹرار وغیرہ وغیرہ لیکن ان سب میں معزز ترین شخص ہوتا ہے جیورسٹ امبیڈکر جیورسٹ تھے۔ ایڈوکیٹ بننے اور وکالت کا پیشہ اختیار کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ عدالت موجود ہو لیکن جیورسٹ بننے کے لیے کسی

جیوری کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ ہندوستان کی عدلیہ میں جیوریاں نہیں ہوتیں۔ یہاں تنہا جج یا زیادہ سے زیادہ کسی مشترکہ بینچ کی عقل و فہم پر بھروسہ کیا جاتا ہے۔ جیورسٹ اُس اسکالر کو کہتے ہیں جو ملک ملک کے قانون اور دستاویز سے واقف ہو۔ قانونی نکات اور دستوری مسائل کو اپنی گرہ میں باندھ لے۔ جیورسٹ بذات خود ایک کمپیوٹر ہوتا ہے۔ چلتی پھرتی لائبریری اور ہمہ وقتی تیار اور مستعد حافظ قانون ہوتا ہے۔ ڈاکٹر امبیڈکر یہی سب کچھ تھے۔ ۲۰ نومبر ۱۹۴۹ء کو ڈاکٹر امبیڈکر نے جو تقریر کی وہ کبھی بھلائی نہیں جا سکے گی۔ ان کے الفاظ تھے "کیا تاریخ پھر اپنے آپ کو دہرائیگی؟" انھوں نے ایوان کے اراکین سے پوچھا تھا اور کہا تھا کہ ہمیں ان لوگوں پر نظر رکھنی ہے جو ملک پر اپنے ذاتی عقائد کو ترجیح دیتے ہیں۔ ڈاکٹر امبیڈکر نے صاف لفظوں میں کہا تھا اگر ہم نے ان لوگوں کو چھوٹ دے دی تو ہماری آزادی خطرے میں پڑ جائے گی اور کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم اسے ہمیشہ کے لیے کھو دیں۔ ہمیں اپنے خون کے آخری قطرے تک اس کی حفاظت کرنی ہے۔ ۱۹۴۵ء میں ڈاکٹر امبیڈکر کی زبان سے نکلی ہوئی یہ تنبیہ آج بھی دہرائی جا سکتی ہے۔ ڈاکٹر امبیڈکر نے دستور سازی کا کام ۲ سال ۱۱ مہینے ۱۷ دن میں مکمل کیا۔ دستور ساز اسمبلی کے کل ۱۹ اجلاس ہوئے جن میں سے شروع کے ۱۰ اجلاس ابتدائی کاموں کے لیے وقف تھے۔ گیارہواں اجلاس جو اہم ترین اجلاس تھا ۱۶۵ دن تک چلتا رہا۔ دستور مرتب کرنے کے لیے ۳ سال کی مدت بظاہر لمبی معلوم ہوتی ہے لیکن سوائے امریکہ اور جنوبی افریقہ کے ملکوں کے دوسرے ملکوں مثلاً کینیڈا اور آسٹریلیا میں تو اس کام پر اور زیادہ وقت صرف ہوا۔ اور پھر ہمارے ملک میں مسائل کی کوئی حد ہے۔ زبانیں، علاقے، مذاہب، فرقے، وغیرہ وغیرہ۔ الامان الحفیظ۔

یہ سارا کام ڈاکٹر امبیڈکر نے تنہا انجام دیا۔ دستور ساز اسمبلی کے جملہ ۷ اراکین تھے۔ ان میں سے ایک ممبر نے ایوان سے استعفیٰ دیدیا۔ ان کی جگہ پُر کرنے میں وقت لگا۔ ایک ممبر کی وفات واقع ہوگئی اور جگہ خالی ہی رہی۔ ایک رکن ملکی مسائل میں اتنا مصروف رہا کہ دستور ساز اسمبلی کو وقت ہی نہیں دے سکا۔ ایک رکن امریکہ میں مصروف رہا اور دو اراکین دلی سے باہر رہنے کی وجہ سے کام کی طرف توجہ نہ دے سکے۔ ان سب غیر موجود اراکین کے ذمے کا کام بھی ڈاکٹر امبیڈکر ہی نے نپٹایا۔ ڈاکٹر امبیڈکر کہنے کو آدمی تھے لیکن درحقیقت کئی پاور ہاؤس کے خود کار مشین تھے۔ حوصلے، لگن، محنت اور خلوص کی تابندہ مثال۔

کہا جاتا ہے کہ سیاسی رہنماؤں کو سمجھنا مشکل ہوتا ہے گاندھی جی کے بارے میں لوگ ششدر رہا کرتے تھے ان کی جادوئی شخصیت حیران کن تھی۔ لیکن جہاں تک ڈاکٹر امبیڈکر کا تعلق ہے انھیں سمجھنا بہت آسان تھا۔ گاندھی جی کی بھی ہندوستان کو اتنی ہی ضرورت تھی جتنی امبیڈکر کی۔

ماہرینِ قانون کی نظر میں دستورِ ہند کی ایک ایک سطر ڈاکٹر امبیڈکر کی ذہانت اور فراست کی نشاندہی کرتی ہے۔ ڈاکٹر امبیڈکر کے نظریات کبھی گنجلک نہیں رہے۔ ان میں قانونی نکات کو اپنے اندر جذب کر لینے کی غیر معمولی صلاحیت تھی۔ ان کا ذہن صاف تھا۔ اور کسی بھی قانونی نکتے کے بارے میں انھیں کبھی کنفیوزن نہیں

ہوا۔ ۱۹۵۰ء میں جب کولمبیا یونی ورسٹی نے باباصاحب امبیڈکر کو اُن کے دستورِ ہند مرتب کرنے کے کارنامے پر ایل۔ ایل۔ ڈی کی ڈگری پیش کی تو تعارف کے طور پر اس وقت یہ الفاظ کہے گئے: "ہندوستان کے قومی رہنماؤں میں سے ایک شخص جو اپنی ذات میں سماجی مصلح اور انسان کے بنیادی حقوق کا دلیر محافظ ہے۔" پنڈت جواہر لال نہرو اور ڈاکٹر راجندر پرشاد جو خود علم و دانش میں اونچی سطح کے ممتاز افراد تھے، ڈاکٹر امبیڈکر کو ان کی انتھک محنت اور غیر معمولی علمی قابلیت کو ہمیشہ سراہتے رہے۔ کولمبیا یونی ورسٹی کی ڈاکٹر آف لاز اینڈ لیٹرس کی ڈگری، امبیڈکر کے قد و قامت کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ ڈاکٹر امبیڈکر کا جادو ان کی تقریروں میں نہیں ان کے عمل میں تھا۔ انھوں نے پست اقوام کو واماندگی کے اندھیرے سے نکالنے کے لیے صرف لچھے دار تقریریں نہیں کیں، اپنا مذہب ترک کیا اور بودھ مت کو اپنایا۔ وہ ہر سطح پر ہر کسی سے نبرد آزما ہوئے لیکن ایک محب وطن اور سچے ہندوستانی ہونے کے ناتے انھوں نے اپنے مشن پر سوراج کو ہمیشہ ترجیح دی۔ اس توقع کے ساتھ کہ ایک وقت آئے گا جب ہندوستان کا پچھڑا ہوا طبقہ اپنے ہم وطنوں کے ساتھ ساتھ، ان نعمتوں میں برابر کا حصہ دار ہوگا جو سوراج کی دین ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر امبیڈکر کی رہنمائی میں جو دستور مرتب ہوا یہ اسی کا فیض ہے کہ ہمارا عدلیہ، انتظامیہ اور قانون ساز اسمبلیاں اپنے اپنے فرائض کو جانتی ہیں۔ اسی دستور نے ہمیں برابر برابر کے حقوق دیئے ہیں۔ دستورِ ہند جو ۴۰۰ صفحات پر مشتمل ہے، دنیا کے تمام ممالک کے دستوروں میں سب سے زیادہ ضخیم اور بسیط دستور ہے۔ ڈاکٹر امبیڈکر دل سے چاہتے تھے کہ ہندوستان کا ہر شہری خوشحال، خوش و خرم اور خوش قسمت رہے ہمارے ترنگے میں اشوک چکر اور ہمارے قومی نشان تین مورتی، کے پیچھے انصاف، مساوات، بھائی چارگی اور محبت کا فلسفہ ہے۔ یہ صرف نشان اور علامتیں نہیں، ہماری آرزوئیں اور تمنائیں بھی ہیں۔ ڈاکٹر امبیڈکر نے اس دستور کے بارے میں کہا تھا:

"میرا اعتقاد ہے کہ دستور ساز اسمبلی نے ہندوستان کے لیے جو دستور مرتب کیا ہے وہ قابلِ عمل ہے۔ لچکدار ہونے کے ساتھ ساتھ مضبوط و مستحکم ہے اور ملک میں پیدا ہونے والے تمام حالات میں خواہ وہ امن کا ماحول ہو یا جنگ کا مرحلہ، یہ دستور سازگار ثابت ہوگا۔"

ہندوستان نے اس دستور کے نفاذ کے بعد یعنی ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء سے آج کی تاریخ تک امن و امان کے دن بھی دیکھے ہیں، جنگوں سے بھی اس کا سابقہ پڑا ہے۔ ملک کے اندرونی حالات میں صدر راج اور ایمرجنسی کے مرحلے سے بھی اسے گزرنا پڑا ہے لیکن ان تمام تشویشناک اور پرخطر موقعوں پر بھی دستور جس پر ڈاکٹر امبیڈکر کے دستخط ہیں، ہمارے کام آیا ہے۔

ڈاکٹر امبیڈکر اب آپ پسند کیجیے کہ عوام کے لیڈر کی حیثیت سے بڑے تھے یا ایک قانون داں اور جمہوریسٹ کی حیثیت سے عظیم۔ یاد رکھیے یہ سوال نہ صرف اہم ہے بلکہ لازمی بھی ہے۔

ڈاکٹر بابا صاحب بھیم راؤ امبیڈکر
حیات اور کارنامے

بابا صاحب امبیڈکر کے آبا و اجداد گاؤں امباوڑے جو ضلع رتناگری کے منڈن گڑھ سے ۵ میل کے فاصلے پر ہے رہتے آئے تھے۔ ان کے دادا مالوجی سکپال ایک خوش حال مہار خاندان سے تھے۔ وہ فوج میں ملازمت کرتے تھے فوج سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ سرکاری ملازمت میں رہے ان کے والد بھی فوج میں ملازم تھے۔ ان کے نام رام جی سکپال تھا۔

بابا صاحب بھیم راؤ امبیڈکر کا جنم ۱۴ را پریل ۱۸۹۱ء میں اندور کے پاس مہو چھاونی میں ہوا۔ ان کا نام بھیم سکپال تھا ـــــ مہاروں کو مہاراشٹر میں اچھوت مانا جاتا تھا۔ مہار فرقے کے لوگ نہایت نڈر، باصلاحیت اور ہمت والے ہوتے تھے۔ وہ خوش حال تھے۔

بلکہ کئی جگہ تو یہ آیا ہے کہ ـــــ مہاراشٹر دراصل مہار۔ راشٹر تھا۔ مہار لوگ ہی پہلے پہلی انگریزوں سے ملے۔ وہ ان کی فوج میں بھرتی ہوئے۔ مہاروں کی بھرتی ۱۸۹۲ء میں روک دی گئی تھی ۱۹۱۷ء میں پھر شروع ہوئی۔ اسی وقت مہار بٹالین ۱۱۱ر کا جنم ہوا۔ بھیم کی ماں کا نام بھیما بائی تھا۔ ان کا مائیکہ گاؤں مربا تھانہ میں تھا۔ ان کا خاندان بھی خوش حال تھا ان کے والد اور ان کے چھ چاچا فوج میں بھرتی تھے۔

رام جی سکپال اپنے بچوں کو مراٹھی انگریزی حساب پڑھاتے تھے، وہ گوشت نہیں کھاتے تھے وہ کرکٹ اور فٹ بال کے اچھے کھلاڑی رہے۔ اس وقت اچھوتوں میں خاص طور پر مہاروں میں کبیر پنتھ

یامانند پنتھ اور ناتھ پنتھ کا اثر تھا۔ بھیم راؤ کے والد رام جی کبیر کے ماننے والے تھے۔

بھیم راؤ ابھی چھ سال ہی کے تھے کہ ان کی ماں بھیما بائی کا انتقال ہو گیا۔ اسی وقت ان کے والد بھی نوکری سے سبکدوش ہو گئے۔ وہ لوگ کل پانچ بہن بھائی تھے ان کی پھوپھی میرا بائی نے ان بچوں کی دیکھ بھال کی۔

بھیم راؤ کے والد کی سادھی ستارا میں ہے۔

ستارا میں بھیم راؤ کی پڑھائی لکھائی ہوئی۔ ہائی اسکول میں ایک استاد تھے وہ برہمن تھے۔ مگر بھیم راؤ کو بہت عزیز رکھتے تھے بھیم راؤ بھی ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بھیم راؤ نے اپنا خاندانی نام بدل کر ان سے امبیڈکر کر لیا ـــــ امبیڈکر استاد کا نام تھا۔ بھیم راؤ نے ۱۹۰۷ میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ان دنوں کسی مہار بچے کیلئے بڑی بات تھی۔

بھیم راؤ اور ان کے خاندان کو مبارک باد دینے کیلئے ایک تہنیتی جلسہ کیا گیا جس کی صدارت ایس۔ کے بولے نے کی۔

بولے اس وقت ستیہ شودھک ادارے کے لیڈر تھے اس جلسے میں ایک اور لیڈر بھی آئے جنھوں نے امبیڈکر کو گوتم بدھ کے تعلق سے ایک چھوٹی سی کتاب تحفتاً دی۔ ان کا نام تھا۔ کے لے۔ کیلوسکر۔ بھیم راؤ پڑھنے میں ذہین تھے۔ ان کے استاد ان سے پہلے ہی خوش تھے۔ ان کے والد سے کہا گیا کہ امبیڈکر کو آگے پڑھایا جائے۔ انہیں الفنسٹن کالج میں داخل کرایا۔

امبیڈکر کو کتابیں پڑھنے کا شوق تھا ان کے اس شوق سے والد کافی خوش تھے وہ امبیڈکر کے اس شوق کے لئے ادھار پیسے لے کر انھیں دیتے تھے یہاں تک کے بھیم راؤ کو پیسے دینے

★ "میں نے یہ پختہ عزم کیا ہوا ہے کہ میں اُن مظلوم لوگوں کی جن میں پیدا ہوا اور پرورش پا رہا ہوں خدمت کرتا ہوا مرونگا۔"

ـــــ (ڈاکٹر امبیڈکر)

کے لئے گھر کے زیور بھی بیچ دیا کرتے تھے۔

امبیڈکر نے جیسے ہی ہائی اسکول پاس کیا ان کی شادی کر دی گئی۔ امبیڈکر نے کئی لڑکیاں دیکھیں اور پسند نہیں کی۔ ایک شادی طے کر کے چھوڑنے کی وجہ سے برادری کی پنچایت میں انھیں پانچ روپیہ جرمانہ دینا پڑا۔

جس لڑکی سے بھیم راؤ امبیڈکر شادی ہوئی اس کا نام رامی تھا۔ جس کو بدل کر رما بائی کر لیا گیا۔ اس وقت بھیم راؤ کی عمر ۱۷ سال اور رما بائی کی عمر ۹ سال تھی۔

بھیم راؤ نے بمبئی کے الفنسٹن کالج میں داخلہ لیا۔

انھیں دنوں بڑودہ کے مہاراجہ نے اعلان کیا کہ وہ کچھ اچھوت طلبا کو وظیفہ دے کر پڑھانا چاہتے ہیں۔ امبیڈکر باصلاحیت تو تھے ہی۔ انھیں مہاراجہ بڑودہ کا پچیس روپیہ فی ماہ کا وظیفہ مل گیا۔

ان دنوں امبیڈکر کے والد مزدوروں کی بستی میں مکان نمبر ۵۰-۱ میں رہتے تھے انکے پاس آمنے سامنے دو کمرے تھے۔ ان میں سے ایک کمرہ بھیم راؤ کے پڑھنے کے لئے چھوڑ دیا گیا تھا۔ ۱۹۱۲ء میں انھوں نے بی اے کا امتحان دیا آگے تعلیم جاری نہ رہ سکی۔ ان کو بڑودہ ریاست میں نوکری کرنی پڑی۔ فوج میں لیفٹیننٹ کا عہدہ دیا گیا اپنی نوکری کے دو ہفتے ہی پورے کر پائے تھے کہ تار ملا۔

"والد صاحب بیمار ہیں۔ حالت خراب ہے۔"

وہ اپنے والد کو دیکھنے کے لئے چل پڑے۔

بڑودہ سے بھی جاتے ہوئے وہ ایک اسٹیشن پر والد کے لئے مٹھائی لینے اتر گئے اور گاڑی چھوٹ گئی۔ امبیڈکر کو وہیں رکنا پڑا۔ نتیجتاً وہ اپنے والد کو زندہ حالت میں نہ دیکھ پائے۔

وہ ہمت ہار بیٹھے۔

بہت دنوں تک یہ کیفیت رہی۔

مگر بہت جلد وہ اپنے خوابوں کو پورا کرنے نکل پڑے۔

کیونکہ ایک موقع ان کی راہ دیکھ رہا تھا۔ مہاراجہ بڑودہ نے پھر کچھ طلبا کو امریکہ میں کولمبیا یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم دلوانے کا فیصلہ کیا۔ امبیڈکر کو یہ موقع مل گیا وہ ہندوستان کے پہلے اچھوت اور مہار تھے جو پڑھنے کیلئے باہر گئے تھے ـــــ وہاں کوئی چھواچھوت نہیں تھی ـــــ اس لئے امبیڈکر کا دل لگ گیا۔

امبیڈکر نے ۱۹۱۵ء میں "Ancient Indian Commerce" پر تھیسس کی، اکونومکس میں ایم اے کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۱۶ء میں امبیڈکر نے

"National Devident for India a Historic and Anolylic Study"

کے موضوع پر تھیسس لکھ کر یونیورسٹی کو دی یہ تھیسس آٹھ سال بعد

"The Erolvation of Provincial Finance in British India "

نام سے شائع ہوئی۔ یہ بڑودہ کے مہاراج "سیاجی راؤ" کو منسوب کی گئی تھی۔

ریاست بڑودہ سے ہوئے سمجھوتے کے مطابق ۱۱ر نومبر ۱۹۱۸ء سے ۱۱ر مارچ ۱۹۲۰ء تک امبیڈکر نے وہاں ملٹری سکریٹری کے طور پر کام کیا اور مہاراجہ کولہاپور شاہی چھترپتی کی مدد سے دوبارہ لندن پڑھنے چلے گئے۔ لندن میں انھوں نے لندن اسکول آف اکونومکس اور پالیٹیکل سائنس میں داخلہ لیا وہ

★ فرض کی ادائیگی کرتے جاؤ۔ کامیابی ملے نہ ملے یا ناواقف لوگ ہمارے کام کی تعریف کریں یا نہ کریں لیکن کام میں جٹے رہو۔
(ڈاکٹر امبیڈکر)

کسی قسم کی تفریح نہیں کرتے تھے اور نہ پڑھنے کے علاوہ انھیں کوئی شوق تھا۔ بلکہ اپنی بیوی سے بھی کہہ دیا تھا کہ ضرورت پڑنے پہ زیورات بیچ دے مگر کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلائے۔

۱۹۲۱ء میں امبیڈکر کو ماسٹر آف سائنس کا خطاب دیا گیا ان کا تھیسس تھا "امپیریل فائنانس ان برٹش انڈیا" ایک اور تھیسس انھوں نے بون یونیورسٹی کو بھی دی جس کی بہت تعریف کی گئی۔ اس طرح امبیڈکر نے ایم اے، ایم ایس سی، پی ایچ ڈی، ایس سی اور بار ایٹ لا کی ڈگریاں پائیں۔

★ اس بات کو یاد رکھو کہ دنیا میں بڑی کامیابیاں سخت جدو جہد کے بغیر حاصل نہیں کی جاسکتیں۔

(ڈاکٹر امبیڈکر)

کتابوں کا شوق اتنا تھا کہ نیویارک سے دو ہزار کتابیں لے کر آئے۔ دوسری گول میز کانفرنس کے وقت بھی لندن سے کتابیں خریدیں۔ ان کا کتب خانہ بہت بڑا تھا۔ وہ بغیر کھائے پیئے مطالعہ میں غرق رہتے۔ کبھی کبھی تو کھاتے ہوئے بھی کتابیں پڑھتے رہتے۔ رات وہیں سو بھی جاتے۔ ان کے کتب خانہ میں فلسفہ، قانون، مذہب، معاشیات، سماجیات، سیاست نہ جانے ایسے کتنے موضوعات پر کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا۔

ہندوستان کے کسی بھی ہندو ادارے نے یا کالج نے انھیں کوئی اعزاز نہیں بخشا، لیکن عثمانیہ یونیورسٹی نے ۱۹۵۳ء میں انھیں ایل ایل ڈی کے خطاب سے نوازا۔ اس سے پہلے ۱۹۵۲ء میں یہی خطاب انہیں کولمبیا یونیورسٹی دے چکی تھی۔

وہ کئی موضوعات کے جاننے والے تھے۔ بولتے تو بے تکان بولتے رہتے ان کی تحریروں اور تقریروں میں سیکھنے کے مواقع ہوتے ان کے یہاں مواد پر معنی اور اثر انگیز ہوتا۔

وہ ایک راہ نما کی طرح بات کرتے۔ نہ صرف بات بلکہ عمل بھی کرتے۔

ان کی کتاب "دی لے تھاٹ آن پاکستان" نے جناح کے علاوہ گاندھی جی کو بھی متاثر کیا تھا۔

وہ سوچتے تھے کہ اچھوتوں پر پابندیاں قوتوں کے ذریعہ لگائی گئی ہیں وہ قانون سے ہی دور کی جاسکتی ہیں۔

جن دنوں امبیڈکر تن من دھن سے اچھوتوں کی لڑائی لڑ رہے تھے اور انھیں آزادی دلانے کی لڑائی لڑ رہے تھے۔ ان کے گھر بیٹا تولد ہوا۔ اس کا نام رکھا گیا راج رتن ——— اپنے بیٹے سے انھیں بہت پیار تھا لیکن وہ اپنے خاندان کو زیادہ وقت نہیں دے پاتے تھے۔ وہ بہت جلد بگڑ جاتے تھے۔ غصہ ہو جاتے تھے ان کے کتب خانے میں کسی کو آنے کی اجازت نہ تھی لگاتار پڑھائی، دورے اور لگاتار لوگوں سے ملنے جلنے کی وجہ سے ان کے پاس گھر کی طرف دھیان دینے کے لئے وقت نہیں تھا۔ وہ اتنے

مصروف تھے کہ اپنے بیٹے کی شادی میں بھی نہ جا سکے ان کی بیوی سوتیا امبیڈکر شادی میں شریک ہوئیں سروجنی نائیڈو، ان کو مسولنی کہا کرتی تھیں۔ اوپر سے بھلے ہی کٹھور ہوں مگر اندر سے

بہت نرم تھے ایک بار سنیما دیکھ رہے تھے ان کے دل پر اس کہانی کا اتنا اثر ہوا کہ بیچ میں ہی اٹھ کر چلے آئے ایسے ہی ایک بار ان کا کتا بیمار پڑا تو بار بار اسی کے تعلق سے پوچھتے رہے۔

بڑھاپے میں جب موقع ملتا موسیقی سنتے تھے۔ شام کو ستار بجانا سیکھتے تھے۔ چرچل کی طرح وہ خوبصورت تصویریں بناتے تھے۔ ان کے مکان، کتب خانہ، قیمتی اور بہت سارے کپڑوں کی طرح کے قلم، کارٹ کئی طرح کے خوبصورت جوتے، تصویریں دیکھ کر ان کی خوش ذوقی کا پتہ چلتا ہے۔

ان کے مضامین پڑھ کر ان کی کتابیں پڑھ کر ان کے علم وفن کا لوہا ماننا پڑتا ہے ان کا ایک ایک لفظ ہماری علمیت میں اضافہ کرتا ہے اور راہ نمائی کرتا ہے وہ وقت کی اہمیت جانتے تھے تبھی اتنے کم وقت میں اتنا بہت سا کام کر سکے۔

پیوپلس ایجوکیشن سوسائٹی کے اصرار پر کتب خانہ سدھارتھ کالج بمبئی کو دینے کیلئے تیار ہو گئے۔ جب کہ کالج نے نہ صرف آدھا دھن دیا یہ دھن بدلانے دیا تھا اس کے بعد انھوں نے دوسرا کتب خانہ تیار کر لیا وہ مہاتما پھلے، کبیر اور بدھ سے متاثر رہے۔

(۲)

ان کے تین آدرش تھے۔ گوتم بدھ، کبیر اور مہاتما پھلے کبیر کا ہی اثر تھا کہ وہ مذہبی مزاج کے تھے۔ غیر جانبدار اور نڈر تھے۔ مہاتما پھلے کے زیر اثر وہ "برہمن واد" کے خلاف ہوئے۔ انھوں نے اچھوتوں کو ایک جگہ جمع کیا تعلیم حاصل کرنے اور ظلم کے خلاف آواز اٹھانے پر اصرار کیا اسی وجہ سے انھوں نے اپنا مذہب بدلا اور

★ سیاسی طاقت ہی سبھی بیماریوں کا واحد علاج نہیں طاقت سماج سدھار میں ہے اپنے برے رجحانات کو ترک کرو اپنے رہن سہن میں تبدیلی کرو تاکہ عام خاطر و مدارات دوستی کے مستحق بن سکو۔ (ڈاکٹر امبیڈکر)

عام لوگوں (اچھوتوں) سے بھی اپنا مذہب بدلوایا۔
مہاتما پھلے کے علاوہ اور کئی ہستیاں تھیں جو پچھڑے لوگوں کے سدھار کا کام کرتی تھیں۔ مہاراشٹر میں ہی نہیں مہاراشٹر سے باہر بھی ــــ مہاتما پھلے وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے پونا میں اچھوتوں کے لئے پانی کھول دیا تھا۔ انھوں نے ۱۸۷۳ء میں "ستیہ شودھک سماج" کی بنیاد ڈالی پھر ساتھ ہی ساتھ بڑودہ کے مہاراج اور کولہاپور کے راجہ ان کی مدد کرتے رہے ــــ پھر کچھ حادثات ایسے ہوئے جنھوں نے امبیڈکر کو اندر سے ہلا کر رکھ دیا (چند یہاں دئے جاتے ہیں)

(۱) ایک بار بھیم راؤ کو بڑے زور کی پیاس لگی انھوں نے کسی کوئیں سے پانی نکال کر پی لیا جب لوگوں کو پتہ چلا تو انھوں نے انھیں مارا پیٹا۔

(۲) برسات ہو رہی تھی ایک مکان کی دیوار کے قریب ذرا آڑ میں اسکول جاتے ہوئے امبیڈکر کھڑے ہو گئے جب مالکن نے دیکھا تو یہ معلوم ہونے پر "یہ لڑکا اچھوت ہے۔" اس نے ایک دھکا ایسے مارا کہ امبیڈکر دور کیچڑ میں گر گئے ان کی کتابیں بھیگ گئیں کپڑے خراب ہو گئے۔

(۳) جب وہ ہائی اسکول میں پڑھتے تھے تو استاد نے انھیں بلیک بورڈ پر آکر ایک سوال حل کرنے کو کہا ــــ مگر بلیک بورڈ کے پیچھے بچوں کے کھانے کے ڈبے رکھے ہوئے تھے وہ جب تک وہاں سے ہٹا نہیں لئے گئے تب تک امبیڈکر کو بلیک بورڈ تک پہونچنے نہیں دیا گیا۔

(۴) وہ سنسکرت پڑھنا چاہتے تھے۔ لیکن ایک برہمن استاد نے انھیں پڑھانے سے منع کر دیا۔ انھیں فارسی پڑھنی پڑی۔

ان حادثات کا ان پر گہرا اثر پڑا انھوں نے یہ طے کیا کہ پچھڑے ہوئے اور اچھوت لوگوں کو اس ذلیل زندگی سے ضرور اونچا اٹھائیں گے۔

بمبئی میں کچھ سال انھوں نے سڈنہم کالج میں بھی پڑھایا مگر وہاں بھی ان کے پانی پینے کا گھڑا الگ ہوتا تھا!

انھوں نے اسٹاک اور شیئر میں صلاح دینے کا کام شروع کیا تو اچھوت ہونے کی وجہ سے ان کے پاس کوئی نہ آتا تھا۔

۱۹۲۰ء میں انھوں نے ایک اخبار "موک نائک" شروع کیا اس میں صرف پچھڑے لوگوں کی خبریں ہوتی تھیں۔

ان دنوں بڑودہ، ناگپور، ستارا وغیرہ میں کچھ سبھائیں بدلنے لگی تھیں۔ پچھڑی جماعتوں کے سدھار کے لئے لوگ آگے آئے تھے مگر جو لوگ ان کی رہنمائی کر رہے تھے وہ پچھڑے لوگ نہیں تھے! امبیڈکر نے کہا "ان لوگوں کو یا ان اداروں کو اچھوتوں کی بات کہنے کا حق نہیں ہے جو اچھوت نہیں ہیں"

ناگپور کی سبھا میں وہ شریک ہوئے اور وہاں انھوں نے فیصلہ کیا ـــــــ "ہندوستان کے قوانین میں اچھوتوں کے بنیادی حقوق ضرور شامل کئے جانے چاہئے۔"

امبیڈکر ہمیشہ اس سوچ و فکر میں لگے رہتے کہ اچھوت مزدور اور عام آدمی کس طرح سکھی ہو سکتا ہے۔ کیسے بھر پیٹ کھانا کھا سکتا ہے۔

انگلینڈ سے لوٹنے کے بعد انھوں نے طے کیا کہ اپنی زندگی چلانے کیلئے وہ وکالت کریں گے اور باقی وقت اچھوتوں اور غریبوں کی خدمت میں لگائیں گے۔

انھوں نے ۱۹۲۳ء میں وکالت شروع کردی۔

مگر ان کی وکالت نہیں چلی کیونکہ وہ اچھوت تھے اور

لوگ سوچتے تھے کہ انگریز ججوں کو انگریز وکیل ہی متاثر کر سکیں گے۔ مگر امبیڈکر نے ہار نہیں مانی

(۳)

اچھوتوں کیلئے کام کرنے کی آوازیں چاروں طرف سے اٹھ رہی تھیں۔ مگر انھیں مناسب راہ نمائی نہ ملنے کی وجہ سے وہ کارگر اور موثر نہ ہو پائی تھیں۔ ڈاکٹر امبیڈکر نے سمجھ لیا کہ اچھوتوں کے بھلے کے لئے قانون بنانا نہ بنانا ایک جیسا ہے کیونکہ ان کو عمل میں لانے والے اونچی ذات کے ہندو ہیں جو ان کو لاگو کرتے ہی نہیں!

امبیڈکر چاہتے تھے کہ اچھوت اپنے حقوق کو پہچانیں مستعد رہیں۔ وہ اپنے آپ میں ایسی طاقت پیدا کریں کہ اپنے حق منوا سکیں۔ وہ انھیں خود اعتمادی فخر اپنے حقوق سے آگاہ کرانا چاہتے تھے۔ اس کے لئے انھوں نے بمبئی سے ایک پندرہ روزہ 'بہشکرت بھارت' اپریل ۱۹۲۷ء کو شروع کیا اس کے پرچار سے بہت سے اچھوتوں نے بھیک مانگنا چھوڑ دیا' جھوٹن لینا بند کر دیا۔ دوسرے امبیڈکر نے آواز بلند کی کہ مندر' کوئیں اور تالاب ہر ایک انسان کیلئے میسر ہونے چاہیں۔ کیونکہ اچھوتوں کا ان دنوں مندر میں جانا اور کوئیں تالاب سے پانی لینا منع تھا۔

بمبئی ودھان سبھا میں فیری ایس۔ کے بولے نے ایک تجویز پیش کی۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ

"ودھان سبھا سفارش کرتی ہے کہ اچھوت سماج کو عام پانی کی جگہوں جیسے کنوئیں تالابوں دھرم شالاؤں جن کی تعمیر اور دیکھ ریکھ سرکاری پیسوں سے ہوتی ہے۔ سرکاری اسکول' عدالتیں، اسپتال کا استعمال کرنے دینا چاہئے"

بمبئی سرکار نے اا ستمبر ۱۹۲۳ء کو یہ حکم جاری کرکے اس ضمن میں پہل کی لیکن یہ زیادہ تر ضلع پریشد وا اور کمیٹیوں کی طرف سے لاگو نہیں کی گئی۔

۵ا اگست ۱۹۲۶ء کو پھر شری بولے ودھان سبھا میں دوسری تجویز پیش کی کہ از اور ضلع بورڈوں کو سرکاری فنڈ نہ دیا جا جنھوں نے تین سال پہلے کی تجویز لاگو نہ کی ہو محدنگر پالیکا نے محد کے ضلع کے چودار تالاب فرقوں کے لوگوں کے لئے کھول دیا۔ لیکن کے اس کام سے محد کے اونچی ذات کے ہندو مشتعل ہو اٹھے۔

۱۹ اور ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو محد میں اچھو ایک بڑا اجتماع ہوا جس میں دس ہزار سے زیا نے حصہ لیا۔

ڈاکٹر امبیڈکر اس اجتماع کے صدر تھے انھوں نے کہا

(۱) اچھوت اونچ نیچ کا خیال چھوڑ دیں۔
(۲) اپنی مدد اپنے آپ کرنے تعلیم حاص اور عزت اور فخر سے جینے کی قسم کھائیں
(۳) مردہ جانور کھانا چھوڑ دیں۔

محد میں اکٹھے ہوئے اچھوتوں کے بار اونچی ذات کے ہندوؤں میں ایک افواہ گئی کہ اچھوں کا جلوس ویریشور مندر گیا ہے۔ ہندوؤں نے نعرہ لگا دیا کہ "دھر میں ہے۔ مورتی کا تقدس ختم ہو گیا ہے۔"

اونچی ذات کے ہندو اجتماع میں گھس اور اچھوتوں کو مارنا شروع کیا ——— ا ڈاک بنگلے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ کافی تک ہو ہلا مچا رہا۔ کسی نہ کسی بہانے سے اچھو ستائے جاتے رہے ۲۵ دسمبر ۱۹۲ کو م میں پھر ایک اجتماع کیا گیا۔ اس دن نا الف کی جڑ منو اسمرتی کو ڈاکٹر امبیڈکر کی میں جلایا گیا اس اجتماع کے لئے ایک مسلا

منواسمرتی کو جلایا گیا۔ کیونکہ منواسمرتی نے ہی اچھوتوں کا معاشرتی، اقتصادی، مذہبی اور سیاسی استحصال کیا اور انھیں غلام بنائے رکھا۔
۲۵ دسمبر ۱۹۲۷ کو منواسمرتی کو جلایا گیا ــــ
منواسمرتی کیا ہے۔؟
ــــ "منواسمرتی میں لکھا ہے شودر اگر برہمن، شتریہ اور ویشو کو پاپی کہہ کر گالی دے تو اس کی زبان کاٹ دی جائے۔
ــــ اگر شودر غصّے میں برہمن اور دوسرے اونچے فرقوں کا نام بھی لے تو جلتی ہوئی دس انگل کی لوہے کی سلاخ اس کے منہ میں ڈال دینی چاہئے۔
ــــ اگر شودر برہمن کو گھمنڈ سے مذہب کا اُپدیش دے تو راجا اس کے منہ اور کان میں کھولتا ہوا تیل ڈلوا دے وغیرہ وغیرہ ......
منوسمرتی کے قصّے کے بعد ــــ ہندو سماج نے ڈاکٹر امبیڈکر کو اپنا دشمن سمجھا۔

زمین دی ــــ مقامی دکانداروں نے (اچھو)توں کو اپنے یہاں سے کوئی سودا سلف نہیں دیا۔ امبیڈکر بمبئی سے ساتھیوں کو لے کر ساری چیزیں باہر سے آئیں وہاں پر تین ہزار (لو)گ رضا کار تیار رہتے۔
کلکٹر نے پروگرام ملتوی کرنے کو کہا ــــ
یہ وہ وقت تھا، جب پیشوا کے راج میں طے شدہ سڑکوں پر خاص وقتوں میں اچھوت چل سکتے تھے۔ جب ان راستوں پر جاتے تھے تو تھوکنے کیلئے گلے میں ہنڈی لٹکائے رہتے تاکہ زمین پر گرا ان کا تھوک ہوا کے ساتھ ہندوؤں کا تقدس کا نہ ختم کر دے۔

دوسری طرف اچھوتوں نے مردا گوشت کھانا چھوڑ دیا۔ مردہ جانوروں کی کھال اتارنا چھوڑ دیا اور کھانا مانگنا چھوڑ دیا۔
"بمبئی دو دھان سبھا کی تجویز کے مطابق عام تالاب وغیرہ اچھوتوں کیلئے کھول دیئے گئے ہیں۔ لیکن ۱۲ آدمیوں نے مل کر ایک مقدمہ یہ کہہ کر ڈال دیا کہ وہ تالاب ذاتی ملکیت ہے اس لئے آپ لوگوں کو عدالت کے فیصلے تک رکنا پڑے گا......"
ضلع کلکٹر نے اجتماع میں کہا۔
لیکن بعد میں پتہ چلا کہ جج نے اسٹے آرڈر اٹھا لیا ہے۔ تب پھر کیا تھا۔
۲۷ دسمبر ۱۹۲۷ کو ڈاکٹر امبیڈکر نے اپیل کرتے ہوئے کہا۔

تم بہادر لوگ ہو۔ جو لوگ اپنے حقوق کے لئے
ن قربان کر دیتے ہیں وہ پھلتے پھولتے ہیں۔ اب
قت آگیا ہے۔ جہاں تک میری بات ہے میں خطرے
ھیلنے کو تیار ہوں۔ پہلا قانون توڑنا، دوسرا وکیل
ونے کے ناطے اخلاقی قاعدہ توڑنا تیسرا سزا
نے کیلئے تیار رہنا۔"

امبیڈکر نے اجتماع میں آئی عورتوں سے
خاطب ہوکر کہا " کبھی مت سوچو کہ تم اچھوت ہو۔
صاف ستھرے رہو۔ اونچی ذات کے ہندوؤں کی عورتوں
کی طرح تم بھی کپڑے پہنو۔ کپڑے اور اچھے کپڑے
پہننے کی تمہاری خواہش کوئی نہیں روک سکتا۔ اگر تمہارے
شوہر اور لڑکے شراب پیتے ہیں تو انھیں کھانا مت
دو۔ اپنے بچوں کو اسکول بھیجو۔ عورتوں کے لئے
بھی تعلیم ضروری ہے۔ اگر تم لکھنا پڑھنا جان جاؤ
بہت ترقی کروگی۔"

سب جوش و خروش سے تالاب پر گئے۔ تالاب
کا پانی پیا اور مطمئن ہوئے ——— جب تالاب کا
پانی اچھوتوں نے پی لیا تب ہندوں نے ویریشور
مندر پہ جلسہ بلایا اس میں تجویز رکھی کہ تالاب
گندہ ہوگیا ہے اسے خالص کیسے کیا جائے۔
طے کیا گیا کہ ۱۰۸ گھڑے پانی تالاب سے نکالا
جائے پھر منتروں کے ساتھ میں گھڑے، مٹھا،
گائے کا گوبر، دودھ اور گائے کے پیشاب سے
بھر کر تالاب میں ڈالے جائیں، ایسا ہی کیا گیا
پھر پانی کے خالص ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔
تالاب اچھوتوں کیلئے کھول دیا گیا۔

اسی طرح رائے گڈھ کے گنگا ساگر تالاب
کا پانی پینے کیلئے بھی ستیہ گرہ کیا گیا — پھر ناسک
کے کالارام مندر میں داخل ہونے کی پوجا بنائی گئی۔
بابا صاحب امبیڈکر نے اس کے علاوہ بلوتا
اور مہار وتن کے چنگل سے ان کو چھڑوایا۔

ہیری ڈیٹری آفیسز کے قانون کے مطابق
مہاراشٹر میں مہاروں کو کوئی چھوٹی سی نوکری
دی جاتی تھی وہ دن رات کام کرتے تھے۔ چھٹی
لینی ہوتی تب اپنی جگہ باپ، بھائی یا کسی کو دیتے
تھے اس مشکل خدمات کے بدلے ایک چھوٹا سا زمین
کا ٹکڑا کھیتی کرکے زندگی چلانے کیلئے انھیں ملتا
تھا اس کو وتن کہتے تھے۔

بلوتا کا مطلب وطن دار فصل پران کسانو
سے جو گاؤں میں ہوتے تھے۔ کچھ اناج مانگنا تھا
اس طرح کے اور بہت سے سدھار کے کام امبیڈکر
نے کئے ——— جیسا کہ اکثر ہوتا ہے خود مہارو
کے ایک گروپ نے ان سے دشمنی بھی مول لی
مگر وہ دھن ... کے پکے تھے۔ کام کرتے رہے

(۴)

بابا صاحب امبیڈکر نے سیاست میں عملی
طور پر حصہ لیا۔ وزیر قانون رہے۔ گول میز
کانفرنس میں شریک ہوئے۔ اچھوتوں کو۔
کر، گاندھی جی اور ان میں کافی بحث و مباحثہ
ہوا۔ گاندھی جی اچھوتوں کو ہندوؤں سے الگ کر
سدھار نہیں کرنا چاہتے تھے جبکہ امبیڈکر سوچتے
تھے کہ ہندوؤں سے الگ ہوئے بنا اچھوتوں کو ان
کے حقوق نہیں دیئے جا سکتے نہ صرف اچھوتوں
کے لئے بلکہ نچلے طبقے کے مظلوم لوگوں کے لئے کام
انھوں نے ودھان سبھا میں کئی تجویزیں پیش کیں
جیسے اپریل ۱۹۴۸ء میں مزدوروں کو "پیڈ ہا
ڈے" دلانے کے مقصد سے ایک بل پیش کیا

ملوں اور کارخانوں کے سامنے دھرنا د
کی تجویز کو منظور کرایا ان کا خیال تھا کہ ہڑتا
کا استعمال صرف مزدوروں کی حالت سدھا

اسلئے ہونا چاہئے۔ ان کا نعرہ تھا۔ دنیا کے مزدوروں تعلیم یافتہ ہو — منظم رہو اور جدوجہد کرو۔

اس کے علاوہ ایک اور کام — بمبئی پردیش کے رتناگری کولابہ (اب رائے گڑھ) اور تھانہ ضلعوں میں ایک رواج تھا جسے کھوت کہا جاتا تھا — کھوت کا مطلب یہ کہ — انگریزوں نے گاؤں کی زمین کی چھوٹی چھوٹی اکائیاں کر کے لوگوں کو جوتنے کو دی تھیں۔ ان چھوٹے کسانوں کے اوپر ایک 'کھوت' ہوتا تھا، جو زمین کا لگان وصول کر کے سرکار کو دیتا تھا اور اپنی مرضی سے کسی بھی کسان کو اس کی زمین سے بے دخل کر دیتا تھا اور ان پہ ظلم کرتا تھا۔ زمینداری کا ہی یہ ایک چھوٹا روپ تھا۔

ڈاکٹر امبیڈکر نے بمبئی ودھان سبھا کے پونہ اجلاس میں ۱۷ ستمبر ۱۹۳۷ء کو ایک بل "کھوتی ابولیشن بل" پیش کیا۔

اچھوتوں اور دلتوں کے سدھار کے کئی کام اور ستیہ گرہوں کے علاوہ عملی سیاست میں اپنی مدلل تقریروں کی وجہ سے انھوں نے کئی مزدوری بل پاس کروائے۔ اس کے علاوہ انھوں نے تعلیمی خدمات بھی انجام دیں۔ انھوں نے پیپلس ایجوکیشن سوسائٹی قائم کی جس نے ۲۰ جون ۱۹۴۶ء کو ایک کالج شروع کیا۔ سدھارتھ کالج۔ پھر اس سوسائٹی نے پونہ میں بھی اس طرح کا ایک اور کالج شروع کیا۔

امبیڈکر کا سب سے بڑا کارنامہ — ہندوستان کی قانون سازی کا ہے — یہ ایک مجلس دستور ساز کمیٹی تھی اس کے اہم رکن امبیڈکر تھے۔

(۵)

وہ کہتے تھے کہ اچھوت اپنا مذہب تبدیل کر کے ہی آزاد ہو سکتے ہیں۔ مذہب کی تبدیلی اچھوتوں کے لئے بے حد ضروری ہے۔ انھوں نے سبھی مذاہب کا مطالعہ کیا اور بدھ مذہب کو اپنے لئے اور اپنے ماننے والوں کے لئے چن لیا۔

۱۴ اکتوبر ۱۹۵۶ء کو بزرگ بھکشو چندر منی کے ذریعے ایک ساتھ پانچ لاکھ لوگوں کو دکشا دلائی۔

بدھم شرنم گچھامی
دھمم شرنم گچھامی
سنگھم شرنم گچھامی

کی آوازوں کے ساتھ سارا آکاش گونجنے لگا یہ
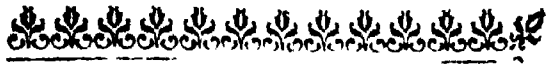
ریزرویشن کا تحفظ مانگتے وقت اقلیتوں کو یہ طے کر لینا چاہیئے کہ ہندوستان کی ایکتا کے اصولوں پر آنچ نہ آئے۔

ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر

پہلا موقع تھا جب ایک ساتھ لاکھوں لوگوں نے مذہب تبدیل کیا۔

اپنی آخری کتاب "دی بدھا اینڈ کارل مارکس" کا آخری باب پورا کر کے ۴، دسمبر ۱۹۵۶ء کو ٹائپ میں دے دیا۔

روزانہ کی طرح ۵، دسمبر ۱۹۵۶ء کو راجیہ سبھا گئے حصہ لیا۔

رتو نے ڈاکٹر امبیڈکر کے پیر دبائے۔ سر میں تیل کی مالش کی جس سے تھوڑا آرام ملا تھوڑا چاول کھایا۔ ریڈیو سے گانے بھی سنے۔

رتو کے سہارے اٹھے۔ کچھ کتابیں دیکھیں ایک کتاب اپنے بستر پر رکھ لی۔

اس کے بعد انھوں نے اپنی کتاب "دی بدھا اینڈ ہز دھرم" کا پیش لفظ اور تعارف جو ٹائپ ہو رہا تھا، ٹھیک کر رہا تھا اس کے بعد اترسے اور جوشی کو لکھے خط پڑھے۔

حسب معمول تھرمس میں کافی اور مٹھائی ان کے بستر کے پاس رکھ دی گئی — اور پھر وہ سو گئے۔

۶، دسمبر ۱۹۵۶ء کو ساڑھے چھ بجے ان کی بیوی بستر کی طرف گئیں تو دیکھا تکیے پہ پاؤں رکھے سو رہے ہیں . . . . .

پتہ نہیں انھوں نے دنیا کب چھوڑی! ان کی بیوی اور رتو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے —

ان کی موت اشوک وہار دہلی میں ہوئی تھی۔
اچھوتوں کا مسیحا نہیں رہا —
غریبوں کا غم خوار چلا گیا —

حوالے انگریزی امبیڈکر: لائف اینڈ مشن ، دھننجے کیر
ہندی امبیڈکر: جیون درشن ، ڈی آر نم

(ترجمہ م، ناگ)

شری شنکر راؤ کھرات

مہاڑ کے چودار تالاب کی ستیہ گرہ

منو نام کے ایک رشی ہو گزرے ہیں۔ جن کے بنائے ہوئے اصول یا قوانین ہندوستان کے گوشے گوشے میں قائم تھے۔ چھوا چھوت کا زہریلا بیج انھیں کے ہاتھوں بویا گیا تھا۔ جو آگے چل کر ایک بھیانک درخت کی شکل میں سماج میں پھیل گیا تھا۔ اس کی زہریلی جڑیں ملک کے گاؤں گاؤں تک پھیل گئی تھیں۔ جس نے ہندوستان کے کروڑوں نچلی ذات والے ہریجنوں اور شدروں کی بلی لی۔ برسہا برس سے یہ قربانیاں جاری تھیں۔ ان کچلے ہوئے نچلی ذات کے لوگوں کا مساوات و رواداری کے خواب دیکھنا بھی ان کے تئیں ایک بھیانک جرم قرار دیا جاتا تھا۔ وہ انسان کے روپ میں جنم لے کر بھی جانوروں سے بدتر زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ انہیں اتنا دُور رکھا جاتا کہ ان کا سایہ تو کجا ان کے جسم سے مس کر کے آنے والی ہوا کو بھی اونچی ذات والے اپنے آپ سے دُور رکھا کرتے تھے۔ ساری ذلتیں ان ہی پر ختم تھیں۔ اونچی ذات والوں کے لیے محنت مزدوری کر کے ان کی خاطر اپنا پسینہ بہا کر بھی کھانے کی تھالی کے لیے گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا تھا۔ وہ اگر نہ بھی ملے تو کام کرنا اس کی زندگی کا عمل تھا، حاکم کے حکم کی تعمیل اور اس کی خوشی نیچی ذات والوں کی زندگی کا اصل مصرف تھا۔ علم، تہذیب اور اقتصادی خوشحالی کے سارے دروازے ان پر بند تھے۔ جب تک زندہ رہو غلام بنے رہو۔ جب مرو اپنی جگہ کسی کا تقرر کر کے مرجاؤ۔ یہ اصول تھا۔

منو مہاراج کا ہزاروں سال قبل کا لکھا اور سماج کے لیے بنائے ہوئے یہ اصول تفریق کا بویا ہوا بیج۔ آج ہریجنوں کے لیے وبال بن گیا تھا۔ ہندوستان کے سات کروڑ دلت جو نسل در نسل کچلے چلے آرہے تھے غیر انسانی زندگی جینے پر مجبور تھے۔ اس اذیتناک زندگی کے خلاف آواز اٹھانا ان کے لیے ضروری بن گیا تھا۔ مگر اس کے لیے

ضرورت تھی اپنے ہی کسی لیڈر کی کسی ایسے لیڈر کی جو انھیں اس چنگل سے نکالے۔ انھیں یگانگت، بھائی چارہ، مساوات، بنیادی حقوق حاصل کرنے کے آزادانہ ماحول میں لے آئے۔ یہ کام انجام دیا ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر نے مہاڑ نامی مقام کے چودار تالاب پر اچھوتوں کو لے کر ایک پانی بھرنے کے لیے آواز اٹھائی۔ اس ستیہ گرہ کی تاریخ میں بڑی اہمیت مانی جاتی ہے۔ چھوا چھوت کی مضبوط گرفت اس ستیہ گرہ سے ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ اچھوت کو سماج میں انسان بن کر جینے کا حق یہیں سے ملا ہے۔

دراصل یہ وہ تالاب تھا جہاں ہر مذہب کا انسان پانی بھر سکتا تھا مگر اگر کسی کو اجازت نہ تھی تو وہ اچھوت یا ہریجن تھا ایک انسان دوسرے انسان کو کسی طرح نچلی سطح تک پہنچا سکتا ہے اس کی یہ ایک مثال تھی۔ ہمیں بھی ایک عام آدمی کی طرح اس تالاب سے پانی لینے کی اجازت دی جائے۔ یہی ان کی مانگ تھی۔ یقیناً ہندوستانی تاریخ میں یہ صفحہ کالا صفحہ کہلائے گا کہ سماجی مساوات کی مانگ کے لیے انسانیت کی بقا کے لیے یہ ستیہ گرہ کرنا پڑا تھا۔ یوں تو راؤ بہادر بولے لے پانی کے عام تالاب اور کنوئیں تمام مذاہب اور ذاتوں کے لیے کھلے رکھے جانے کا قانون ۱۹۲۳ء میں بمبئی کی Legislative Concil (لے کانسل) میں پیش کیا تھا۔ جسے ۱۹۲۶ء میں منظوری بھی مل گئی تھی۔ مگر افسوس کہ سماجی برابری کا یہ قانون مہاڑ کے "چودار تالاب" پر لاگو نہیں کیا گیا تھا۔ اور یہ تالاب اچھوتوں پر بند ہی تھا۔

۱۹ر۲۰ر مارچ کو قلابہ (حالیہ رائے گڑھ) میں اچھوتوں ہریجنوں کی ایک پریشد بلائی گئی تھی۔ اس اجلاس کو ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر اس سے خطاب کرنے والے تھے۔ اور یہیں سے یہ "مکتی سنگرام" یا آزادی کی جنگ شروع ہونے والی تھی۔ بابا صاحب کے خیر خواہ اس اجلاس کو کامیاب بنانے میں دن رات جٹے ہوئے تھے جن میں خصوصی طور پر اننت راؤ چترے، سریندر ناتھ ٹپنس TIPINS، گپتے، پردھان وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

کوکن کے اضلاع میں اس ستیہ گرہ یا اجلاس کا اعلان ہوا۔ اور کوکن کے نشیب و فراز میں چودار تالاب کے ستیہ گرہ کی آواز گونجنے لگی۔ بالآخر ۱۹ر مارچ ۱۹۲۷ء کا وہ دن آ ہی گیا جس کا ان سماجی طور پر کچلے ہوئے لوگوں کو انتظار تھا۔ کوکن کے مختلف دور دراز کے علاقوں سے اچھوت خواتین و مرد مہاڑ میں آ پہنچے تھے انہیں اپنی مکتی یا آزادی کی امید یہاں کھینچ لائی تھی یا شاید اپنے چہیتے لیڈر بابا صاحب کے درشن کی خواہش۔ بابا صاحب میں انھیں اپنے آزاد مستقبل کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔

ن آنے والوں کے جسم پر جو کپڑے تھے ان سے غریبی ٹپک
ی تھی۔ اسی غریبی کے بوجھ سے دبی چہرے کی جھریاں بھی
ماف نظر آرہی تھیں۔ باوجود اس کے چہرے پر امید، آس
در خوشی کا اظہار بھی تھا۔ فوج کے بہادر جوان خاص طور
ر اپنے سینے پر بہادری کے تمغے لگائے یہ مکتی سنگرام لڑنے
کے لیے آئے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ یہ بھی نچلی
ات ہی کے تھے۔ میٹنگیں ہوئیں۔ قراردادیں منظور ہوئیں،
اکٹر بابا صاحب نے ہر کام میں راہنمائی کی۔

۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کا دن بھی نمودار ہوا۔ سرکاری قانون
کے مطابق چودار تالاب سے پانی بھر لانے کے فیصلے پر عمل
برا ہونا طے پایا۔ پندرہ ہزار دلت خواتین و مرد مورچے
کی تیاری میں سرگرداں تھے۔ مساوات، رواداری اور انسانی
حقوق کی خاطر لڑنے کے لیے مشہور تاریخی مورچہ چل پڑا۔ ایک
طویل سفر جسے منظم طریقے پر طے کرنا تھا۔ مورچے کے سربراہ
ڈاکٹر بابا صاحب ہی تھے۔ سارے قدم ایک ساتھ بڑھ رہے
تھے۔ اپنی مانگوں کے نعرے لگاتے ہوئے لوگ۔

مورچہ منڈپ سے نکل کر مہاڑ بس اسٹینڈ کے قریب
شیشور کے مندر سے ہوتا ہوا تالاب کی جانب بڑھ رہا تھا
مہاڑ کی سڑکوں کے اطراف اونچی ذات والے اس ناممکن کو
ممکن ہوتا دیکھ کر کڑھ رہے تھے۔ ان کے چہروں پر غصہ صاف
نظر آرہا تھا۔ مگر اطراف میں لگے ناریل اور کٹھل کے درخت
خوشی اور فخر سے سینہ تانے مورچے کا انتظار کر رہے تھے۔
گویا آشیرواد دے رہے ہوں۔
مورچہ تالاب تک پہنچ گیا۔ بابا صاحب نے اپنے مبارک
ہاتھوں سے تالاب کے پانی کو چھوا۔ پانی ساکت اور ٹھنڈا تھا۔
جیسے پانی بھی ان کا سواگت کر رہا ہو۔ تالاب کی مچھلیاں بھی
ان کے حضور میں آکر کھڑی ہوگئی تھیں۔ وہاں سے فارغ ہوکر
مورچے کے لوگ اسی سبھا منڈپ میں لوٹ آئے تھے۔ فرطِ
مسرت سے مشن میں کامیابی پر جن لوگوں نے اپنے ساتھ روٹی
چٹنی لائی تھی اسے کھول کر کھانے بیٹھ گئے۔ اچانک اس خوشی
میں بھنگ پڑ گیا۔ اور اونچی ذات والوں کی جانب سے حملہ ہوا۔
حملہ آوروں نے لکڑیوں اور گنڈاسوں سے آؤ دیکھا نہ تاؤ بوڑھے
جوان اور بچوں کا کوئی خیال نہ کرتے ہوئے ڈنڈے برسانے
شروع کیے۔ غریبوں کے لیے بنے ہوئے کھانے میں مٹی انڈیل
دی مگر باوجود اس کے نچلی ذات والوں نے صبر کے دامن کو
تھامے رکھا۔ امن و آشتی سے اونچی ذات والوں کی مار کھا کر
بابا صاحب کے حکم کی تعمیل کرتے رہے۔ کوئی احتجاجی قدم
نہ اٹھایا۔ وگرنہ پندرہ ہزار دلتوں کے لیے یہ مٹھی بھر مہاڑ کے
اونچی ذات والے کچھ زیادہ نہ تھے۔ بابا صاحب اہنسا چاہتے تھے۔
شانتی ہی میں انھیں کرانتی کی تلاش تھی۔
۲۰ مارچ کی سبھا دوپہر کے وقت ہونا طے پائی تھی۔
جوق در جوق لوگ چلے آرہے تھے۔ آج بابا صاحب جلسۂ عام
سے خطاب کرتے ہوئے انسانیت کے معنی بتانے والے تھے
انسانیت کے حقوق کا اعلان کرنے والے تھے۔ نچلی ذات
کے لوگوں پر آج انسانیت کے معنی واضح ہونے تھے۔ آج
انھیں آزادی اور مکتی کی بات بابا صاحب کی زبانی سنائی دینی
تھی۔ ناامیدی کے راکشش کو جلانا تھا۔ آج کا دن ان کے لیے
بڑے تہوار کا دن تھا۔ ساری نگاہیں بابا صاحب کی آمد پر
مرکوز تھیں۔ بابا صاحب کے آمد کی خبر آنے پر ان کے استقبال
کے لیے جھک گئیں۔ سارے ہاتھ احتراماً جڑ گئے۔

بابا صاحب کی بھرپور جوانی ان کی بھری پُری شخصیت
جسے دیکھ کر بھلا کون خوش نہ ہوتا؟ اور پھر اپنی ذات
میں بابا صاحب جیسے مہاپرش نے جنم لیا ہے۔ اس بات کا

انھیں فخر تھا اور آج بھی ہے۔ بھلا ان کے دیدار پر کون نہ دلت خوش نہ ہوتا۔ تالیوں کی کھڑکھڑاہٹ اور جے جے کار کی آوازیں بلند ہوئیں۔

جلسے کے افتتاح میں منوسمرتی کو نذرِ آتش کرنے کا پروگرام طے تھا۔ یہ وہ گرنتھ ہے جس پر ہندو مذہب کی بنیاد کھڑی ہے۔ جس کے ہر لفظ میں چھواچھوت اور اونچ نیچ کی تعلیم دی گئی ہے۔ اونچی ذات کے ہندو اس کا بڑا احترام کرتے ہیں۔ بابا صاحب کا بچپن بھی منو کے اصولوں کا شکار رہا۔ لہٰذا اگر بابا صاحب نے اپنے دلت بھائیوں کے ساتھ مل کر منوسمرتی کو نذرِ آتش کرنے کا ارادہ کیا تو کیا برا کیا؟ منوسمرتی کی کچھ باب بابا صاحب کی کتاب "اصل میں شدر کون؟" کے کچھ اقتباسات پیش ہیں۔

منوسمرتی کے مطابق۔

• دنیا بنانے والے برہمو دیوتا نے برہمن، کھتری، ویش اور شدر کو اپنے منہ، بانہہ، پنڈلی، اور پیروں سے اپنے سکون کی خاطر پیدا کیا۔"

(باب نمبر ۱ شلوک نمبر ۳۱)

برہمو دیوتا نے مذکورہ ذات کے لوگوں کی ذمہ داریاں بھی ظاہر کی ہیں۔ برہمنوں کے ذمے درس و تدریس، تحصیلِ تعلیم، دان، پنڈت جیسی ذمہ داریاں سونپ دی گئی ہیں۔ عوام کی حفاظت، دان وغیرہ جیسی ذمہ داریاں کھتریوں کے ذمہ ہیں۔ ڈھور ڈنگر سنبھالنا، بیوپار کرنا، سود پر پیسے دینا، کھیتی باڑی کرنا یہ کام ویشوں کے ذمہ دیئے گئے ہیں۔ اور شدروں کے ذمہ ان تمام تین ذات کے لوگوں کی خدمت لکھ دی گئی ہے۔

• شدروں کے مردہ جسم گاؤں کی شمالی سمت ہی سے لے جانے کی اجازت ہے بقیہ برہمن، کھتری اور ویش اپنی ذات کے لوگوں کے مردہ جسم مشرق مغرب یا جنوب کی سمت سے لے جا سکتے ہیں۔"

(باب نمبر ۵ شلوک نمبر ۹۲)

• کوئی شدر ذات کا شخص کسی برہمن لڑکی کے عشق گرفتار ہو جائے تو اُسے پھانسی کی سزا سنا دی جائے۔"

(باب نمبر ۹ شلوک نمبر ۳۶۶)

"برہمنوں کی خدمت گزاری کے لیے شدروں کو وجود میں لایا گیا ہے۔ غلامی ان کے زندگی کی ساتھی۔

اور اس خدمت گذاری کے عوض اسے برہمن کے گھر کا بچا ہوا کھانا، پرانے کپڑے، پرانی لکڑی کا سامان دے دیا جائے۔"
(باب ۱۰ اشلوک ۱۲۱ تا ۱۲۵)

- اونچی ذات میں جنم لئے ہوئے کسی انسان کی برائی کرتا ہوا کوئی شدھر دکھائی دے تو اس کی زبان کاٹ دی جائے۔"

- نچلی ذات میں جنم لینے والا اونچی ذات میں جنم لئے ہوئے انسان کے برابر بیٹھا ہوا ملے تو اس کی پنڈلیوں پر داغ دے کر اُسے سرحد پار کر دیا جائے یا راجہ کو اختیار ہو کہ اس کی پنڈلی کاٹ دے۔"
(باب ۸ شلوک ۲۸۱)

- راجوں مہاراجوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ اگر کوئی راجہ کسی شدھر کو متواتر دیکھتا رہے تو دلدل میں جس طرح گائے دھنستی چلی جاتی ہے اسی طرح راجہ کا راج گھاٹ بھی دھنس جائے گا۔ شدھروں کو کوئی صلاح مشورہ تک نہ دے جو ان کی نذر کیا ہوا اناج، یا گھی وغیرہ تک انھیں دینے کی منوسمرتی میں ممانعت ہے۔ نہ ہی انھیں قانون پڑھایا جائے اور نہ ہی انہیں مذہبی تعلیم دلائی جائے۔ اگر کوئی اونچی ذات والا اس کی خلاف ورزی کرے گا وہ شدھروں ہی کے ساتھ نرک میں جل جائے گا۔ شدھروں کی ملکیت میں کوئی چیز نہیں ہوتی ساری چیزوں پر صرف اونچی ذات والوں ہی کو اختیار ہے۔ انھیں اپنی ملکیت میں صرف گدھوں اور کتوں ہی کو رکھنے کی اجازت ہے۔ ٭

بھلا جس منوسمرتی میں شدھروں اور دلتوں کے تعلق سے اس طرح کے کلمات استعمال کیے گئے ہوں اسے اگر بابا صاحب نے نذرِ آتش کیا تو کیا برا کیا ____؟

جوں ہی بابا صاحب نے اُسے نذرِ آتش کیا سارے نچلی ذات والوں کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔ منو سمرتی جل کر راکھ ہو گئی۔ اور اس کے ساتھ انسانیت کا نیا جنم ہوا۔ اسی لمحے آکاش پر کالے بادل چھائے بوندا باندی بھی ہوئی گویا سورگ سے امرت کی دھار لگ گئی جو غلامی کی زنجیریں ٹوٹ گئیں اور آج ہی کا دن آزادی اور مکتی کا دن قرار دیا گیا۔

ترجمہ: وقار قادری
۹، جواشے بیلا۔ تیسرا منزلہ
موری روڈ، ماہم، بمبئی ۱۶

علی سردار جعفری

ابوالکلام آزاد
آہنگِ جلال و فرہنگِ جمال

مولانا ابوالکلام آزاد ایک دلآویز اور شاندار شخصیت کے مالک تھے ایک تراشے ہوئے ہیرے کی طرح ان کی شخصیت کے کئی پہلو تھے اور ہر پہلو دلکش اور تابناک۔ ایک شعلہ بیان مقرر، ایک آتش نفس ادیب، ایک بے باک صحافی، ایک سر بکف مجاہدِ آزادی، ایک سیاسی رہنما، ایک دانشور، عالمِ دین، ایک صاحبِ نظر مفسرِ قرآن اور اسی کے ساتھ موسیقی کے عاشق اور ستار نواز، اچھی شاعری کے سودائی، اچھی صحبتوں کا دلدادہ، لیکن حلقہ پسند آزادی کی تحریکوں کی طوفانی موجوں سے کھیلنے والا لیکن گوہرِ آبدار کی طرح موجوں سے الگ۔ وہ دل و دماغ تھا جو روایتی عقائد سے بیزار ہو کر تشکیک کی منزل میں داخل ہوا، بے یقینی کے صحراؤں سے گزرا اور پھر ایمان و یقین کے گلزار میں نشیمن بنالیا۔ ان کی تحریر و تقریر کا جلال و جمال اسی شخصیت کا اظہار اور اسی شخصیت کا پرتو ہے۔ ان کا آتشیں آہنگ اپنے تاریخی عہد کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔ جب کوئی قوم بیدار ہونے لگتی ہے اور تاریخ کروٹ بدلتی ہے اور حوصلہ مند نابغوں کی آواز بلند ہوتی ہے تو سرگوشیاں صورِ اسرافیل میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اس وقت کی تحریر و تقریر میں دلبری اور قاہری یکجا ہو جاتی ہیں۔

دلبری بے قاہری جادوگری است
قاہری با دلبری پیغمبری است

یہی آہنگ شعر کی شکل میں اقبال کا پیام ہے، جوش کی شاعری میں ہے اور اسی کا ورثہ ترقی پسند ادب کے پاس ہے۔

مولانا کی زندگی میں بوستانِ سعدی کی ایک حکایت بہت اہمیت کی حامل ہے ـ

شبے یاد دارم کہ چشمم نخفت	شنیدم کہ پروانہ با شمع گفت
کہ من عاشقم گر بسوزم رواست	ترا گریہ و سوز باری چراست
بگفت اے ہوادار مسکین من	برفت انگبین یار شیرین من
چو شیرینی از من بدر می رود	چو فرہادم آتش بسر می رود
ہمی گفت و ہر لحظہ سیلاب درد	فرو می دویدش برخسار زرد
کہ اے مدعی عشق کار تو نیست	کہ نہ صبر داری نہ یارائے ایست
تو بگریزی از پیش یک شعلہ خام	من استادہ ام تا بسوزم تمام

اس کا مفہوم یہ ہے کہ ایک رات جب مجھے نیند نہیں آرہی تھی تو میں نے پروانے کو شمع سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں تو عاشق ہوں میرے لیے جل جانا روا ہے لیکن تو کیوں آنسو بہا رہی ہے اور جل رہی ہے۔ شمع نے جواب دیا کہ میرا یار شیریں یعنی شہد مجھ سے جدا ہوگیا ہے اور جب یہ شیرینی میری زندگی سے چلی گئی تو فرہاد کی طرح میرے دل و دماغ میں آگ بھڑک اٹھی۔ یہ کہتے کہتے شمع کا سیلابِ درد اس کے زرد رخسار پر بہنے لگا۔ اس نے پھر پروانے سے کہا کہ اے عشق کے دعویدار عشق تیرے بس کا روگ نہیں ہے کیونکہ نہ تو صبر کی طاقت ہے اور نہ قوتِ برداشت۔ تو تمام حالات میں شعلے سے دور دوڑتا ہے اور مجھے دیکھ کہ میں خاموش کھڑی ہوئی جلے جا رہی ہوں تاکہ جل کر ختم ہو جاؤں۔

مولانا نے یہ حکایت اپنے بچپن میں آج سے پچانوے سال پہلے اپنے والد کی زبان سے سنی تھی۔ آزاد کی کہانی میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے اس واقعے کو آزاد کی زبان سے یوں بیان کیا ہے۔

> شب کی پچھلی پہر کا وقت اور فی الواقع شمع دان کی موجودگی اور پروانوں کا ہجوم ہر طرف چھایا ہوا سناٹا تھا۔ والد مرحوم کے خاص لہجے میں اشعار کا دہرانا اور ایک حالتِ تواجد میں بار بار پڑھنا۔ ان سب باتوں کا میرے دل پر بڑا ہی اثر پڑا تھا اور ایک ایسی کیفیت آئی تھی کہ آج تک میں اسے محسوس کرتا ہوں۔ مجھے اس وقت ٹھیک ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کے سامنے ہر شمع دان اور اڑتے ہوئے پروانوں کا نظارہ ہو رہا ہے۔ میں اسی طرح شمع کی طرف دیکھتا رہا گویا اس کی آواز سننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ والدہ مرحوم پر بھی اس وقت بڑی کیفیت طاری ہوگئی تھی، سبق جاری نہ رہ سکا اور

مقالہ "آہنگِ جلال و فرہنگِ جمال" ۱۶ اگست ۱۹۸۸ء کو ساہتیہ اکیڈمی کے سمینار میں پڑھا گیا تھا۔ ساہتیہ اکیڈمی کی اجازت سے اشاعت کے لئے پیش کر رہا ہوں۔ (سردار)

یت کے عالم میں یہ شعر دہراتے رہے۔

تو مگریزی از پیش یک شعلہ خام
من استادہ ام تا بسوزم تمام

ہے کہ مولانا آزاد کا دل ساری عمر اس مصرعے کو دہراتا رہا ہے کہ من استادہ
ان کی زندگی کا سب سے بڑا استعارہ ہے۔ آزادی یا رشتہ میں ہے اور پروانے
کے دل کے شعلے کو دور سے دیکھا اس کی روشنی اور حرارت کو محسوس کیا لیکن اس
جہاں یہ شعر صادق آتا ہے

پھر دیکھا کچھ بجز اک شعلہ پر پیچ و تاب
شمع تک تو ہم نے دیکھا تھا کہ پروانہ گیا

زندگی کے لئے سانچے خود بنائے تھے اور اسے خود سنوارا اور نکھارا تھا اقتدار
چیز کا جوں کا توں قبول کر لینا ممکن نہ تھا۔ مذہبی عقائد خاندانی روایات
نظام، برطانوی استعمار غرض ہر چیز اس اقتاد طبع کی زد پر تھی ان کا خاندان
فخر و شرف حیات دنیوی پر نہیں بلکہ فقر و مسکینی پر رہا ہے۔ اس ورثے کو
ھا کے ساتھ قبول کیا اور آگے بڑھایا لیکن خاندان کی دوسری روایات
پیرزادے تھے اور مرید آ کر ان کے ہاتھ پاؤں چومتے تھے اور ہاتھ باندھ کر
تھے جس سے ان کو وحشت ہوتی تھی اسلئے انہوں نے پیری مریدی کے سلسلے
خاندان عقائد و افکار میں بے حد قدامت پرست تھا اور اپنے مسلک سے
ہو تا کفر و زندقہ تصور کرتا تھا اس تقلید کی چار دیواری میں باہر کی مخالفت
سکتا تھا۔ (غبار خاطر)

بچپن ہی میں سمجھ گئے تھے کہ یہ قدامت پرستی نقصان دہ ہے اور اس سے
دل دیکار فرماتے ہیں ۔ پھر خود اس تعلیم کا حال کیا تھا جس کی تحصیل میں
ا ایک ایسا فرسودہ نظام تعلیم جسے فن تعلیم کے جس زاویہ نظر سے بھی دیکھا جائے
طریق تعلیم کے اعتبار سے ناقص، مضامین کے اعتبار سے ناقص، انتخاب
درس و املا کے اسلوب کے اعتبار سے ناقص۔

ہنی کا اندازہ کرنا مشکل ہے تو بلا تیرہ سال کی عمر تک پہونچتے پہونچتے اپنے
ودگی کو محسوس کرنے لگا تھا۔

آنکس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نکرد

نے کے زمانے سے پہلے ہی بالغ ہو چکا تھا اب بھی سکون و اطمینان سے بہت دور
ا کہ کس منزل کی تلاش و جستجو ہے۔ کیسی آرزو ہے کیا تمنا ہے لیکن ایک خلش
اظہار جن الفاظ میں کیا ہے وہ ذہنی تعمیر کی نئی سمتوں کے پتے دیتے ہیں ابھی پندرہ برس
کہ طبیعت کا سکون ہلنا شروع ہو گیا تھا اور شک و شبہے کے کانٹے دل میں چبھنے
ہوتا تھا کہ جو آوازیں چاروں طرف سنائی دے رہی ہیں ان کے علاوہ
اور علم و حقیقت کی دنیا صرف اتنی ہی نہیں ہے جتنی سامنے اکھڑی ہوئی ہے
تی گئی یہاں تک کہ چند برسوں کے اندر عقائد و افکار کی وہ تمام بنیادیں

جو خاندان تقلید اور گرد و پیش نے چن تھیں یک قلم متزلزل ہو گئیں اور پھر وہ وقت آیا کہ اپنی
جلتی ہوئی دیوار کو خود ہاتھوں سے ڈھا کر اس کی جگہ نئی دیواریں چننی پڑیں... بے شک کہ یہی
چبھن تھی جو شام آنے والے یقین کے لئے دلیل راہ بنی بلاشبہ اس نے پچھلے سرمایوں سے تہی دست
کر دیا تھا مگر نئے سرمایوں کے حصول کی لگن بھی لگا دی تھی جس نے یقین اور طمانیت کی منزل
مقصود تک پہنچا دیا۔"

اس منزل مقصود تک پہونچنے میں ایک عشق مجازی نے بھی مدد کی جس کو مولانا نے لغزش
کا نام دیا ہے۔

"بلاشبہ یہ لغزش تھی لیکن اس لغزش کو کیا کہئے جو محبوب کے قدموں پر
گرا دے مقصود تو ساری باتوں سے اس تک پہونچنا ہے اگر لغزش دستی ہی راہ
شناس جائے تو کیوں ہزار دل استقامتیں اس پر قربان ہوں۔"

اسی زمانے میں موسیقی کا شوق پیدا ہوا۔ ان کے کان مجاز کی مترنم صداؤں سے آشنا تھے
کہیں سے فقیر اللہ سیف خاں کی کتاب "راگ درپن" کا ایک قلمی نسخہ ہاتھ آ گیا اس نے شوق کو مہمیز کیا
اور حسن اتفاق سے والد کے مریدوں میں ایک اچھا گویا بھی مل گیا اس کا نام مسیتا تھا اور
انبالہ کا رہنے والا تھا۔ اس نے چھپ چھپ کر مرشد زادہ کو ستار کی تعلیم دے دی اب عالم
جہاں جاتے ستار ساتھ جاتا ایک چاندنی رات میں تاج محل کی چھت پر جا کے رخ بیٹھ کر ستار
بجانے کا اور اس سے لطف اندوز ہونے کا ذکر بڑے رومانک اور والہانہ انداز سے کیا ہے
اس عالم میں آسمان سے ستارے جھڑتے ہوئے نظر آئے اور تاج کی برجیاں ہلنے لگیں اس تجربے
سے طبیعت کا توازن اور فطری لطافت حاصل ہوئی اور اس مقصد کے حصول کے بعد مولانا نے
یہ شغل ترک کر دیا کیونکہ وہ اور کاموں میں حائل ہوتا تھا۔ لیکن موسیقی کے ذوق اور تاثر
جو دل کے ایک ایک ریشے میں رچ گیا تھا دل سے نکالا نہیں جا سکتا تھا۔ چنانچہ آخری سانس
تک مولانا نے اس لطافت کو اپنی روح کے اندر سمیٹے رکھا اور اس کا اظہار جابجا ان کی تحریروں
اور تقریروں میں نظر آتا ہے ستار کے تاروں سے صرف پھول نہیں جھڑتے بلکہ بجلیاں بھی
برستی ہیں۔

اسی زمانے میں مولانا کا تیسرا عشق شروع ہوا وہ لیلائے آزادی کے زلف گرہ گیر کے شکار
ہو گئے موسیقی کے ذکر میں ایک جگہ یہ لکھا ہے کہ حسن آواز میں ہو یا چہرے میں تاج محل میں ہو یا
نشاط باغ میں حسن ہے اور حسن اپنا فطری مطالبہ رکھتا ہے۔ مولانا سے لیلائے آزادی کا مطالبہ
شدید تر تھا۔ سلاسل و زنداں کے سوا ہر چیز سے لاتعلقی۔ اس کے بعد مولانا ۵۰ سال اور زندہ رہے
جن میں سے ۱۰ سال قید و بند کے نذر ہو گئے۔

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کی ابتدا تک ہندوستان اور ایشیا پوری طرح بیدار
ہو گئے تھے اور آزادی کا جشن جلد سے جلد منانا چاہتے تھے صدیوں کا جمود ٹوٹ رہا تھا مغربی ایشیا
میں جمال الدین افغانی نے اتحاد اسلامی کے نام پر ایک باغیانہ لہر دوڑا دی تھی جس کو ہندوستان کے مسلمانوں
نے بھی محسوس کیا چند سال افغانی کلکتہ میں بھی رہنے پر مجبور ہوئے یہ گیم جنرل ارونبد گھوش اور
نوعمر ٹیگور کا کلکتہ تھا اور اس کے ابر آلود سیاسی آسمان پر بہت سی بیتاب بجلیاں
چمک رہی تھیں ان میں جمال الدین افغانی کی پیدا کی ہوئی بجلیاں بھی تھیں جو یوروپی استعمار اور

شہنشاہیت کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دینا چاہتی تھیں۔ مولانا کے دل و دماغ میں نئی روشنی پیدا ہو گئی یہ ان کی زندگی کا اہم اور سب سے بڑا موڑ تھا اس زمانے کے تعین کے لئے ہم ۱۹۰۵ء کی تاریخ مقرر کر سکتے ہیں جب ان کی عمر صرف سترہ سال کی تھی وہ اسلامی علوم کی تکمیل اور عالم دین کا مرتبہ حاصل کر چکے تھے۔ سامراج دشمنی رگ و پے میں موجزن تھا اور بنگال میں سیاسی موجیں طوفانی شکل اختیار کر رہی تھیں اس وقت لارڈ کرزن کی شاطرانہ سیاست سے تقسیم بنگال کا واقعہ پیش آیا جس کا مقصد ہندوؤں اور مسلمانوں میں مستقل نفاق پیدا کرنا تھا بنگال وندے ماترم کے نعروں سے گونج اٹھا جس کی صدائے بازگشت ملک کے دل پر سنائی دی اور مدراس میں سبرامنیم بھارتی کے شعروں میں اس وقت انگریزوں نے نہایت چالاکی سے مسلمانوں کی طرف خاص نگاہ التفات سے دیکھا ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے زخموں کو مندمل کرنا چاہا مگر مولانا نے عام مسلمانوں کے برعکس انگریز سامراجیوں سے ربط ضبط پیدا کرنے کے بجائے بنگال کی خفیہ انقلابی جماعتوں میں شرکت اختیار کر لی جو بنگالی ہندوؤں نے برطانوی سامراج سے لڑنے کیلئے بنائی تھیں ان کے ہاتھوں میں بم تھے اور وہ پھانسی کے پھندے گلے میں ڈالنے کو تیار تھے ان کو دہشت پسند کا نام دیا گیا ان دہشت پسندوں کے علاوہ مولانا آزاد کی ملاقات اروبند گھوش سے بھی ہوئی جو بہت بڑے انقلابی رہنما تھے مولانا کے خیالات پر ان کے خیالات کا اثر پڑا اور ان کے اخبار کرم یوگی مولانا کے مطالعے میں رہنے لگا ایک اور انقلابی شیام سندر چکرورتی تھے۔

ایک مسلمان عالم دین کا اس ہندو تحریک میں شریک ہونا حیرت ناک تھا لیکن اس کا محرک حب الوطنی اور آزادی کا جذبہ تھا۔ انقلابی اور ترقی پسند ہندو عام طور سے یہ محسوس کرتے تھے کہ مسلمانوں کا درمیانی طبقہ انگریزی اقتدار کا خوشامدی اور حاشیہ بردار ہے پہلی بار مولانا نے اس خیال کو ان کے دل سے نکال دیا تقریباً اسی وقت علی گڑھ میں فضل الحسن حسرت موہانی نے بال گنگا دھر تلک سے اپنا سیاسی رشتہ قائم کیا تھا بڑی دلچسپ بات ہے کہ حسرت موہانی کی پہلی گرفتاری تلک کی گرفتاری سے ایک دن پہلے ہوئی تھی علی گڑھ میں تو ایک دیوانے کے جیل میں بند ہو جانے سے کوئی ہلچل نہیں ہوتی لیکن بمبئی میں تلک کی چھ سال کی سزا کے خلاف مزدوروں نے چھ دن کی مکمل ہڑتال کی جس پر لینن نے لکھا کہ اب سامراج کی خیر نہیں ہے اور چند سال بعد ۱۹۱۲ء میں جب حسرت موہانی مختلف جیلوں میں دوسری سزا بھگت رہے تھے تو مولانا آزاد نے ان کی بیوی نشاط النساء کو ایک خط میں لکھا

"موجودہ عہد سے اس مقام کے فہم و قدر شناسی کی امید نہیں۔ عہد صرف تخم ریزی کا ہے جو کاشتکاری کے کاموں میں سب سے زیادہ محنت طلب اور مشکل وقت ہے فصل کاٹنے کا وقت نہیں ہے جب وہ وقت آئے گا تو دنیا ان لوگوں کو یاد کرے گی جنہوں نے بیج بونے کی محنت اپنے ذمہ لی تھی اور پھل کھانے کی لذت آنے والوں کے لئے چھوڑ دی تھی اس وقت آسمان و زمین ان لوگوں کی بھلائی پر شہادت دیں گے اور وہی دنیا جو اس وقت غافل سو رہی ہے اٹھے گی تاکہ ان کی پرستش کرے حسرت جو کچھ کر رہا ہے ہندوستان اس کو پچاس برس بعد سمجھ سکے گا۔ اس وقت اس سے زیادہ امید نہ رکھئے کہ چند اخباروں میں دو چار مضمون نکل جائیں گے اور وقت کی حالت دیکھتے ہوئے یہ بھی خلاف توقع ہے جو حالت اس بارے میں دنیا کی متفقہ تاریخ تبلائی ہے اس کا مقتضیٰ تو یہ ہے کہ ہر طرف سے تحسین کی جگہ ملامت کی صدائیں اٹھیں اور لوگ کہیں یہ تو پاگل ہو گیا ہے۔"

اس عرصے میں مولانا آزاد علامہ شبلی نعمانی سے ملے اور بڑی شدت سے ان کا اثر قبول کیا شبلی مولانا آزاد سے اکتیس سال بڑے تھے لیکن دونوں کی رفاقت علمی، دینی اور سیاسی سطح پر تھی شبلی ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے اور انگریزی سیاست کے دشمن اور ان کا طرز فکر میں خیالات ان کے ادبی کارناموں میں ان کی شاعری بھی شامل ہے جس میں بلا کا جوش و خروش تھا اور یہ سارے اثرات مولانا آزاد کے لئے کشش کے باعث تھے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ شبلی کی نظم "شہر آشوب اسلام" نے جس میں براہ راست برطانوی شہنشاہیت سے مخاطب ہے۔ آزاد کو متاثر نہ کیا ہو۔

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک
چراغ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک
یونہی پھیلے کرے تہذیب انسانی کے استاد
یہ ظلم آرائیاں تا کے یہ حشر انگیزیاں کب تک
یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے!
ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک
یہ مانا قصۂ غم سے تمہارا جی بہلتا ہے
سنائیں تم کو اپنے درد دل کی داستاں کب تک
سمجھ کر یہ کہ دھندلے سے نشاں رہ گئے ہم میں
مٹاؤ گے ہمارا اس طرح نام و نشاں کب تک
پرستاران خاک کعبہ دنیا سے اگر اٹھے
تو پھر یہ احترام سجدہ گاہ قدسیاں کب تک
جو گونج اٹھے گا عالم شور ناقوس کلیسا سے
تو پھر یہ نغمۂ توحید و گلبانگ اذاں کب تک

یہی دل تھا جو آزاد کی نثر میں دھڑک رہا تھا۔ "الہلال" کی قیامت خیز نثر میں۔

یہی زمانہ ریشمی رومال تحریک کا تھا ایک خفیہ تحریک جس کے روح رواں شیخ الہند مولانا محمود الحسن تھے جنہیں انگریزی سامراج کی مخالفت کے جرم میں مکہ معظمہ میں گرفتار کیا گیا اور مالٹا میں قید کیا گیا شیخ الہند دیوبند کے بانیوں میں تھے جس نے ہمیشہ تحریک آزادی کا ساتھ دیا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کا سنگ بنیاد رکھنے والے بھی یہ سوال پاکستان کے ایک ترقی پسند دانشور نے اٹھایا ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ تحریک آزادی کے زمانے میں جتنے علمائے دین تھے وہ سب نیشنلسٹ تھے اور مسلم فرقہ پرستی کا پرچم بلند کرنے والے حضرات یورپ کے تعلیم یافتہ جدید ذہن کے لوگ تھے۔

اس زمانے میں مولانا آزاد کے دو مشغلے تھے ایک صحافت جس کی مثال اس سے پہلے نہیں ملتی یہ الہلال کا دور ہے جس کا مقصد مسلمانوں کو للکارنا اور بیدار کرنا تھا یہ خون جگر سے لکھی ہوئی نثر حب الوطنی کا ولولہ بھی پیدا کر رہی تھی اور برطانوی سامراج پر بجلیاں بھی گرا رہا

۱۔ مہاڑ میں ۱۰/ جون سنہ ۱۹۲۹ء کو پہلی نابجی ویدک شادی میں ڈاکٹر باباصاحب امبیڈکر
۲۔ سدھارتھ کالج میں طلبا کی رہنمائی کرتے ہوئے
۳۔ گاندھی جی کا برت ختم ہونے پر یروڈا جیل میں
۴۔ اورنگ آباد میں ملند کالج کے لئے جگہ کے انتخاب کیلئے سمجھاتے ہوئے ڈاکٹر باباصاحب
۵۔ کورگاؤں میں رانا استمبھ کے قریب سنہ ۱۹۲۶ء

۲ ۔ ۳

۴ ۵

۲۔

ساحب کے والدِ محترم شری
ر رام جی بھالوجی امبیڈکر۔
اندان کے ہمراہ۔
احب امبیڈکر اپنے ساتھیوں
،
احب کے دوست و ساتھی
لارام
دکے ملند سائنس کالج
بابا صاحب امبیڈکر کی ذاتی اشیاء

۵۔

مولانا کا دوسرا مشغلہ تھا شمال کی دہشت پسند تحریک کے ساتھ کام کرنا۔ یہ کہنا مشکل ان کے کام کی کیا نوعیت تھی لیکن جو نشانات ملتے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس کو برطانوی استعمار کے خلاف استعمال کرنا جائز سمجھتے تھے جس کا نام مسلح بغاوت ہے پندرہ سولہ سال طویل ہے ہندو دہشت پسندوں کے ابتدائی گروہ وہ تھے جو بال گنگا تلک اور اروبند گھوش کے حلقہ اثر میں تھے ان میں مولانا نے اپنے علاوہ اور بھی نوجوانوں کو شرکت پر آمادہ کیا چند سال بعد انہوں نے خود بھی پوشیدہ تنظیمیں قائم کیں مسلم نوجوان آگے آگے تھے دار الارشاد ایک ایسی ہی تنظیم تھی جو ۱۹۱۳ء میں قائم ہوئی اس میں ہندو نوجوان کو بھی شریک کیا گیا اور مشرقی بنگال کے تمام اضلاع میں شاخیں قائم کی گئیں برطانیہ دشمن تحریک تھی اور اس کا مقصد برطانوی اقتدار کو ختم کرنا تھا ۱۹۱۵ء کے بعد پہلی بنگال کے مسلم نوجوان ہندو نوجوانوں کے دوش بدوش ایک مشترکہ تحریک آزادی میں سرگرم ہو رہے تھے اس کا کوئی علم نہیں ہے کہ اس خفیہ انقلابی جماعت کے عملی اقدامات تھے۔

اس زمانے کی تحریروں میں جو آہنگ ہے وہ انقلابی ہے اور جہاد فی سبیل اللہ کا بار بار آتا ہے ۱۴ جنوری ۱۹۱۳ء کے الہلال میں تحریر فرماتے ہیں جہاد فی سبیل اللہ کے معنی یہ کہ ہر طرح کے ظلم و تشدد، معاصی و ذنوب اور شیطان ضلالت و انسان کے پیدا ہوئے غرور باطل سے انسانیت کو نجات دلانے کے لئے اپنی تمام قوتوں سے کام لینا اس راہ میں ہر طرح کی جسمانی اور قلبی دکھ اٹھانا حتیٰ کہ سولی کے تختے اور جلاد کی تیغ کش کو بھی اس کی خاطر گوارہ کر لینا ... اسلام نے توحید کا سبق پڑھایا توحید کی تکمیل کے یہ ہیں کہ انسان تمام انتہائی قوتوں، اطاعتوں اور فرمانبرداریوں کو صرف اللہ کے لئے مخصوص کر دے اور ان میں کسی کو شریک نہ کرے پس چند انسانوں کو اپنا لیڈر بنا کے ان کے ہر حکم کو بلا چوں و چرا تسلیم کرنا یا گورنمنٹ اور حکام کی ہر خواہش کے آگے سر جھکا ایک ایسا شرک جلی ہے جو توحید کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا۔

یہ نکتہ اہم ہے کہ باطل ظلم و استبداد اور حکومت وقت کی سفاکیوں کے سامنے سجدہ کا نام شرک ہے اور شرک یعنی خدا کے ساتھ کسی اور کو شریک کرنا اسلام میں سب سے بڑا گناہ ہے۔

اس مضمون میں آگے چل کر مولانا فرماتے ہیں کہ:

ملک و انسانیت کی خدمت آزادانہ حیات سیاسی و ملی کا حصول اور خود مختارانہ حکومت کے حاصل کرنے کے لئے باقاعدہ مساعی ۔ یہ تمام مقاصد و مصالح اگر دوسری قوموں کو بربنائے جذبۂ قومیت و وطنیت عزیز ہیں تو ہر قائل کلمۂ توحید کو مذہباً اور دیناً محبوب ہونے چاہئیں۔

مولانا کی زبان اور تمام استعارے اسلامی ہیں کیونکہ ان کی ساری تعلیم اسی نہج پر ہوئی لیکن اس میں مسلمانوں کو الگ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانے کی کوئی ترغیب نہیں دی گئی ہماری تحریک آزادی میں مذہب کا ایک مخصوص کردار رہا تلک اور گاندھی نے گیتا کو مشعل راہ بنایا۔ آزاد نے قرآن سے روشنی حاصل کی لیکن ان سب کا پیام حریت اور آزادی مساوات اور انسانی نجات ہے اس مقصد کی وضاحت مولانا نے ۱۱ جنوری ۱۹۲۲ء کو قول فیصل میں کی ہے

> میں نے ۱۹۱۲ء میں ایک جرنل الہلال جاری کیا ... الہلال نے تین سال کے اندر مسلمانان ہند کی مذہبی اور سیاسی حالت میں بالکل نئی حرکت پیدا کر دی ... الہلال نے مسلمانوں کی تعداد کے بجائے ایمان پر اعتماد کرنے کی تلقین کی اور بے خوف ہو کر ہندوؤں کے ساتھ مل جانے کی دعوت دی اس سے وہ تبدیلیاں رونما ہوئیں جن کا نتیجہ متحدہ خلافت و سوراج ہے۔ بیوروکریسی ایسی تحریک کو زیادہ عرصے برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

پھر پریس کی ضمانت اور اپنی نظر بندی کے ذکر کے بعد فرماتے ہیں کہ۔ ہندوؤں میں آج مہاتما گاندھی زندگی کی جو روح بیدار کر رہے ہیں الہلال اس کام سے ۱۹۱۴ء میں فارغ ہو چکا تھا۔ اس روح کی بیداری کا مقصد مولانا نے یکم ستمبر ۱۹۱۲ء کے الہلال میں تحریر کر دیا تھا۔

> "اسلام خدا کی بخشی ہوئی آزادی کو قائم کرنے والا اور شخصی استبداد و جبر کا مخالف ہے ... وہ ایک جمہوریت اور مساوات کی روح ہے اور اس حکومت کو خدا کی مرضی کے مطابق نہیں سمجھتا جو پارلیمنٹری اور دستوری نہ ہو"

ان مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ الہلال کا یہ دور اول مولانا کی آزادی کامل کی جو انقلابی تحریک سے براہ راست جڑا ہوا ہے۔ انقلابی تحریک اور الہلال مولانا کے دل و دماغ کے دو الگ الگ گوشے نہیں تھے ان کے سینے میں دو روحیں نہیں تھیں ایک ہی روح تھی جس کی جلوہ گری مختلف شکلوں میں ہو رہی تھی۔

ایک ترقی پسند پاکستانی دانشور نے اس عہد کے بارے میں اس طرح اظہار خیال کیا ہے:

> The confiscation of the Al-Hilal press in 1914 and of the al-Balagh in 1916, the externment of Azad from Bengal in the same year, and his imprisonment in Ranchi upto the end of 1919, seem to be connected not only with his anti-colonial pronouncements in those weeklines, nor with his prominent participation in the more radical wings of both the Congress and the Muslim League but also, perhaps centrally, with his role, uncovered by the British authorities, in organising armed struggles in Bengal...at least a couple of the known members of Azad's secret organisation later joined the communist movement. This is particularly interesting in the light of the British intelligence's alligation that Azad attempted to organise another armed group after his release from Ranchi and that in 1921 he sent an emmissary Fazl ul Haq Shelbarahi, to a Bolshevik camp near Kabul with a letter of introduction. ... Finally Azad's very close association with Sheikh-ul-Hind, Maulana Mahmoud-

ul Hasan, whose own efforts to organise anti Briti[illegible] uprisings were vastly more ambitious, gains al[illegible] [illegible] a different kind of significance if we take into a[illegible] [illegible] Azad's own inclination in that direction

(Pakistan Progressive- Fall 88 page 14)

اس وقت کابل میں ہندوستانی انقلابیوں کا ایک اہم مرکز قائم ہو چکا تھا۔ کر کے وہاں پہونچے تھے وہ سوویت یونین اور اس کے سسٹم سے راہ پیدا کر رہے تھے انہیں انقلابیوں نے ۱۹۲۴ء میں آزاد ہندوستان کا پہلا دستور مرتب کیا اس کا انگریزی مسودہ اسکو کے ایک کتب خانہ میں ہے جس پر مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے ساتھی ظفر حسن ایبک کے دستخط ہیں ان انقلابیوں کو بادشاہ امان اللہ خاں کی حمایت حاصل تھی تین چار سال بعد ۱۹۲۶ء میں برطانوی سامراجی سازشوں نے تخت و تاج سے محروم کر دیا ان کا جرم صرف اتنا نہیں تھا کہ انہوں نے ہندوستانی انقلابیوں کو پناہ دی تھی بلکہ جیسا کہ محسن کے پاس سب سے پہلی افغانستان سفارت بھیجی گئی تھی اس میں مولانا عبیداللہ سندھی کے بھتیجے عزیز احمد بھی شامل تھے انہوں نے آزاد ہندوستان کا پہلا دستور مرتب کرنے میں عبیداللہ سندھی کے ساتھ کام کیا تھا۔

ظاہر ہے کہ یہ صورت حال برطانوی اقتدار کے لئے خاصی خطرناک تھی اس لئے مولانا آزاد اس کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹک رہے تھے۔

مولانا اس منزل تک اپنے ذاتی شعور سے پہونچے تھے اس میں کوئی نظریاتی بحث کا دخل نہیں تھا ان کی نیشنلزم بالکل فطری تھی جیسے ماں کے پیٹ سے بچہ پیدا ہوتا ہے، خاک سے کونپل پھوٹتی ہے، شاخ پر پھول کھلتا ہے۔ سورج کی روشنی زمین پر اترتی ہے ویسے ہی وطن کی محبت پیدا ہوتی ہے۔ مولانا نے جس زمین جس ہوا جس پانی سے محبت کی اس کے حسن سے عشق کیا جس کے سنگیت کی روح کو اپنے اندر بسایا جس کی آواز دل سے لطف اندوز ہوئے جس کی زبان اور شاعری پر وجد کیا اس کی آزادی اور عظمت کے لئے ابنائے وطن کے ساتھ مل کر جہاد کیا اسی کا نام نیشنلزم ہے ۱۹۲۰ء میں مولانا گاندھی جی سے ملے اور ملک کی تحریک آزادی کے سب سے بڑے دھارے میں شامل ہو گئے جس کا مقصد لا تفریق مذہب و ملت سب کے لئے آزادی حاصل کرنا تھا۔

مولانا کا ذہنی افق پہلے ہی سے بہت وسیع تھا کیونکہ ان کے سینے میں وہ حدیث رسول تھی کہ۔ اللہ نے ساری دنیا کو میرے لئے سجدہ گاہ بنایا ہے۔ جب جواہر لال نہرو کے آنے کے بعد کانگریس کا افق وسیع ہوا اور آزادی ناقابل تقسیم ہے کا نعرہ تحریک کے شعور کا حصہ بنا اور ان کا ہر مورچہ ہندوستان کی تحریک آزادی کا مورچہ بن گیا تو آزاد کو ایک اپنا ہم خیال مل گیا جس نے خود مولانا کے علم و فضل کے سامنے ادب اور احترام سے اپنا سر جھکا دیا۔

۲۱-۱۹۲۰ء کے بعد مولانا کا راستہ صاف اور واضح تھا اسلامی شعار اور متحدہ قومیت میں انہیں کوئی تضاد نظر نہیں آیا۔ اس بات کو بڑی وضاحت کے ساتھ رام گڑھ کے خطبہ صدارت میں پیش کیا ہے۔

"میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں اسلام کے تیرہ سو برس کی شاندار روایت میرے ورثے میں آئی ہیں میں تیار نہیں کہ اس کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں اسلام کی تعلیم اسلام کی تاریخ اسلام کے علوم و فنون اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں۔ لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے بیدار کیا ہے اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی۔ وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں میں ہندوستان کی ایک ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا عنصر ہوں میں اس متحدہ قومیت کا ایک اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جائے گا میں اس تکوین کا ایک ناگزیر عامل ہوں میں اپنے اس دعوے سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا۔

"ہندوستان کے لئے قدرت کا یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ اس کی سرزمین انسان کی مختلف نسلوں، مختلف تہذیبوں، اور مختلف مذہبوں کے قافلوں کی منزل بنے۔ ابھی تاریخ کی صبح بھی نمودار نہیں ہوئی تھی کہ ان قافلوں کی آمد شروع ہو گئی... ان ہی قافلوں میں آخری قافلہ ہم پیروان اسلام کا بھی تھا یہ بھی پچھلے قافلوں کے نشان راہ پر چلتا ہوا یہاں تک پہونچا اور ہمیشہ کے لئے بس گیا یہ دنیا کی دو مختلف قوموں اور تہذیبوں کے دھاروں کا ملان تھا یہ گنگا جمنا کے دھاروں کی طرح پہلے الگ الگ بہتے رہے لیکن پھر جیسا کہ قدرت کا اٹل قانون ہے دونوں کو ایک سنگم میں مل جانا پڑا ان دونوں کا میل تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا جس دن یہ واقعہ ظہور میں آیا اسی دن سے قدرت کے مخفی ہاتھوں نے پرانے ہندوستان کی جگہ ایک نئے ہندوستان کے ڈھالنے کا کام شروع کر دیا۔

"تاریخ کی پوری گیارہ صدیاں اس واقعہ پر گذر چکی ہیں اب اسلام بھی اس سرزمین پر ویسا ہی دعویٰ رکھتا ہے جیسا دعویٰ ہندو مذہب کا ہے ہماری گیارہ صدیوں کی مشترک تاریخ نے ہماری ہندوستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامان سے بھر دیا ہے، ہماری زبانیں ہماری شاعری، ہمارا ادب ہماری معاشرت ہمارا ذوق، ہمارا لباس ہمارے رسم و رواج ہماری روزانہ زندگی کی بے شمار حقیقتیں کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگ گئی ہو، ہماری بولیاں الگ الگ تھیں مگر ہم ایک ہی زبان بولنے لگے، ہمارے رسم و رواج ایک دوسرے سے بیگانہ تھے مگر انہوں نے مل کر ایک نیا سانچہ پیدا کر لیا ہمارا پرانا لباس تاریخ کی پرانی تصویروں میں دیکھا جا سکتا ہے مگر اب وہ ہمارے جسموں پر نہیں مل سکتا یہ تمام مشترک سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے اور ہم اسے چھوڑ کر اس زمانے کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے جب ہماری ملی جلی زندگی شروع نہیں ہوئی تھی ۔۔۔۔

"ہماری اس ہزار برس کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچہ ڈھال دیا ہے ایسے سانچے بنائے نہیں جا سکتے وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا کرتے ہیں اب یہ سانچہ ڈھل چکا اور قدرت کی مہر اس پر لگ چکی ہم پسند کریں یا نہ کریں مگر اب ہم ایک ہندوستانی قوم اور ناقابل تقسیم ہندوستانی قوم بن چکے ہیں علیحدگی کا کوئی بناوٹی تخیل ہمارے اس ایک ہونے کو دو نہیں بنا سکتا ہمیں قدرت کے فیصلے پر رضامند ہونا چاہئے اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جانا چاہئے۔"

مولانا شروع ہی سے جمال الدین افغانی اور ان کے شاگرد رشید محمد عبدہ کی وسیع تر اتحاد اسلامی کی تحریک سے وابستہ تھے اور یہ بات روز روشن کی طرح واضح تھی کہ ہندوستان کی آزادی مغربی ایشیا کے مسلم ممالک کی آزادی کی کنجی ہے اور یہ تحریک ہندو مسلم اتحاد کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے صرف دو راستے تھے یا تو ہندوؤں سے الگ ہو کر برطانوی سامراج کی ریشہ دوانیوں کے شکار ہوں یا ان کے ساتھ متحد ہو کر ہندوستان اور مغربی ایشیا کے مسلم ممالک کی آزادی کا پرچم بلند کریں مولانا نے دوسرا راستہ اختیار کیا اور سوراج کی تحریک اور خلافت تحریک ایک ساتھ چلنے لگیں اس وقت انہوں نے اپنے ایک فیصلہ میں جو مسئلہ خلافت اور جزیرۃ العرب سے متعلق تھا ہندوستان کی متحدہ قومیت کی وضاحت میثاق مدینہ کی روشنی میں فرمائی۔

ہندوستان کے سات کروڑ مسلمان، ہندوستان کے بائیس کروڑ ہندو بھائیوں کے ساتھ مل کر ایسے ہو جائیں کہ دونوں مل کر ہندوستان کی ایک قوم اور ایک نیشن بن جائیں آپ میں سے اب مسلمان بھائیوں کو سنانا چاہتا ہوں کہ خدا کی آواز کے بعد جو سب سے بڑی آواز ہو سکتی ہے وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان تھی اس وجود مقدس نے جو صلح نامہ لکھا بعینہٖ اس کے الفاظ یہ ہیں ہم ان تمام قبیلوں سے جو مدینے کے اطراف میں بسنے ہیں صلح کرتے ہیں اتفاق کرتے ہیں اور ہم سب مل کر ایک نیشن بنانا چاہتے ہیں ایک قوم بنانا چاہتے ہیں

نیشن اور قوم کے الفاظ امت واحدہ کے لئے استعمال ہوتے ہیں دیوبند کے علماء نے بھی کانگریس اور نیشنل تحریک کا ساتھ دینے کے لئے امت واحدہ کے تصور کی حمایت کی مولانا نے یہ شرعی جواز پندرہ بیس سال کے عملی تجربے کے بعد پیش کیا ان کا اپنا قلب تو مطمئن تھا وہ براہ راست اسلام تک یکلخت پہونچ رہے تھے جنہوں نے اس کی تکفیر کی لیکن آج یہ مسئلہ ہمارے سامنے ہے کہ کیا ہندوستان میں بسنے والے ہندو اور مسلمان دو قومیں ہیں یا امت واحد

اس کے ساتھ مولانا کا تصور، وحدت ادیان تھا یعنی تمام مذاہب کا اتحاد ہمارے ملک میں جہاں ہندو، مسلم، بدھ، جین، سکھ، عیسائی، پارسی، اور قبائلی مذاہب کے ماننے والے ایک ساتھ رہتے ہیں وحدت ادیان نجات کا نیا راستہ ہے ہر مذہب کے دو پہلو ہوتے ہیں ایک صورت یعنی ظاہری اور دوسرا مادہ یعنی روحانی یا داخلی۔ مولانا کے استدلال کے مطابق جب کہ مذاہب کی ظاہری صورتیں مختلف ہوتی ہیں ان کے عبادت کے طریقے مختلف ہوتے ہیں تو ان کی روحانی حقیقت ایک ہوتی ہے اگر صورتیں الگ الگ ہیں اور روح ایک ہے تو اختلافات کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

اس تصور سے جو ایک انسان دوستی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے وہ ناقابل شکست ہے اس نکتے کو مولانا جلال الدین رومی نے اپنی حکایات کے ذریعے پیش کیا ہے آپ شمعوں کو تقسیم کر سکتے ہیں لیکن نور کو تقسیم نہیں کر سکتے مولانا آزاد کے نزدیک صرف اسلام اور مسلمانوں سے محبت کافی نہیں ہے۔ ساری ہی نوع انسان محبت کی مستحق ہے اور اس محبت کے ذریعے مسلمان خدا تک پہونچ سکتا ہے۔ آخر غیر مسلموں کی تعداد مسلمانوں سے زیادہ ہے جو شخص صرف مسلمان سے محبت کرتا ہے اور غیر مسلم سے نہیں وہ یہ جانتا ہی نہیں ہے کہ محبت کیا ہے اس کی مثال میں شمع اور پروانے کا ذکر کیا ہے کہ پروانے کو شمع کی جستجو ہے لیکن اگر پروانہ صرف مسجد کی شمع کو تلاش کرتا ہے تو اس کو یہ نہیں معلوم کہ کس چیز کی جستجو ہے۔ (انگریزی سے ترجمہ)

یہ تصور جغرافیائی سرحدوں میں تقسیم انسانی کے نفسیات کو آفاقی دل بنا دیتا ہے جاوید نامہ میں اقبال بھی اس منزل پر پہونچے ہیں جس کے پرچم پر قومی اور مذہبی تقسیموں کے بجائے احترام آدمی لکھا ہوا ہے۔ ؎

حرف بد را بر لب آوردن خطاست　　کافر و مومن ہمہ خلق خداست
آدمیت احترام آدمی　　باخبر شو از مقام آدمی
سالہا اندر جہاں گردیدہ ام　　نم بچشم مہرباں کم دیدہ ام
میرد و حولی بر خواص آمد حرام　　دیدہ ام صدق و صفا ادعا

("جواہر آزاد" سے ماخوذ)

تجدید خریداری کیلئے گذارش

اس شمارے سے اگر آپ کی مدت خریداری ختم ہو رہی ہے یا ختم ہو چکی ہے تو آج ہی آئندہ مدت کے لئے رقم خریداری بذریعہ منی آرڈر روانہ فرما دیجئے تاکہ رسالہ آپ کی خدمت میں مسلسل جاری رہے۔
بصورت دیگر مدت خریداری ختم ہو جانے کے بعد رسالہ کی ترسیل ممکن نہ ہو سکے گی۔ خریدار حضرات بطور خاص نوٹ فرمالیں۔ تجدید خریداری کی رقم روانہ فرماتے وقت منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر (جو آپ کے پتے کی سلپ کے اوپر درج ہوتا ہے) ضرور درج فرمائیں۔ نیز اپنا نام، پتہ، پن کوڈ نمبر بھی صاف صاف تحریر فرمائیں۔ (ادارہ)

ایم ۔ جمال علوی
آشیانہ ۔ ۹۱ ۔ ۲۹۹ ۔ پرانا نخاس ۔ لکھنؤ ۳

وہ ۱۶ جنوری ۱۹۵۷ء کی ایک بھیگی خنک، خوبصورت، پرتکلف اور حسین' البیلی صبح تھی ۔ کسی الہڑ، نازک اندام اور شرمیلی دوشیزہ کی طرح ' بار حیا سے سکڑی ہوئی اور نرم نرم نیلگوں کہر کی ریشمی' حسن پاش نقاب میں اپنا رخ روشن چھپائے، لیکن اپنی رعنائیوں کی تابندگی اور جلوہ ہائے رنگیں کی روح پرور دلکشی سے بھاتی اور سب کو ایک دعوت عام دیتی ہوئی' میرے سامنے ایک شان بے نیازی سے سکرا رہی تھی اور میں اپنے طالبعلمی کے بیکراں سکون میں گم، لامتناہی اطمینان وطمانیت سے، شاداب آرزوؤں کے خوابیدہ ہجوم وسہ آتشہ خمار میں چور، آتی ہوئی جوانی کو ایک گونہ شبابی والہانہ پن سے خوش آمدید کہہ رہا تھا' بلکہ خوشی سرمستی کے رازہائے سربستہ کے باب در باب کھولتے ہوئے، مترنم اور گنگناتے ہوئے تصورات کے آکاش پر' اپنے سنہرے خیالات کی قرمزی کمندوں سے، ملوّن اور جوان تخیلات کے قلعے فتح کرتے ہوئے، ایک عالم بے خودی میں، ہوش وآگہی کی حقیقی منزلوں سے دور، امنگوں اور حوصلوں کی روانی میں' مدھوش کن اکبرآباد کی پرمسرت فضاؤں سے دارالحکومت دہلی کے قطعی نامانوس ماحول میں' اجنبی گلیوں سے گذرتا ہوا، پہاڑ بھوجلہ کے علاقہ میں فرقت ماموں (غلام احمد فرقت کاکوروی) کے یہاں بالکل اچانک ہی نازل ہو چکا تھا۔

فرقت ماموں سے اُس دن مولانا کی ملاقات طے تھی اور وہ وہیں جانے کی تیاری میں مصروف تھے ۔ مولانا موصوف کی فرمائش پر وہ انہیں اپنی ایک کتاب، "ناروا" پیش کرنے جا رہے تھے۔ میں مولانا کی بے پناہ صلاحیتوں اور سیاسی دور اندیشیوں، مفکرانہ تحریروں، عالمانہ مباحثوں، اثرانگیز خطابتوں اور مذہبی سوجھ بوجھ کا معترف ہونے ہوئے بھی ان سے بیحد بدظن تھا۔ اس لئے اس خبر نے میری طبیعت کی تمام ترجولانیوں کو کچھ اس طرح دور بھگا دیا جیسے کسی بادہ خوار کی بازاری تاجپوشی سے اس کا نشہ! میں نے ردعمل کے طور پر، حسب معمول بڑے ہی جوش وخروش سے' وہیں مولانا کے خلاف اپنی زہرافشانی شروع کر دی کیونکہ مجھے مولانا آزادی کے بعد، ہندوستانی مسلمانوں کو قطعی بے آسرا چھوڑ دینا، قوم کے دکھ درد میں انکی رہنمائی سے منہ موڑ لینا، طبیعت میں انکے خلاف سخت بیزاری اور منافرت کے جذبات پیدا کئے ہوئے تھا۔ دوسرے مولانا سے میرے تنفر کی ایک بڑی وجہ میرا یہ خیال بھی تھا کہ اُس آتش بیان مقرر، قابل قدر صحافی، مترنم نثر کے مصنف، کانگریس کے سب سے طویل عرصہ تک رہنے والے صدر اور امام الہند نے دوسرے لیڈروں کا آلۂ کار بن کر' مذہب کی آڑ میں' اپنی ساری صلاحیتیں، اپنا سارا زور خطابت اللہ

ت وادب اور یہاں تک کہ قرآن وحدیث تک کو ترک
رسیاسی مقاصد کے لئے استعمال کر ڈالا اور مقصد براری
دی ملتے ہی ع "جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے" کے
ن لوگوں "نے مولانا کی فطرت کو سمجھتے ہوئے، ان کو عملی
ست پر بڑی خوبصورتی سے کچھ اس طرح شہ دی کہ
کانگریس کے صدارت سے مستعفی ہو کر خود اپنے کو
شگی کے عالم میں، مفلوج معطل بنا ڈالا اور انہیں لوگوں نے
ارت تعلیم کا قلمدان تھما کر، ایک بےحد فعال شین کو،
رگی عطا کرکے اور ناکارگی کا لبادہ پہنا کر، کچھ اس طرح
منے عالم رسوائی میں پیش کر دیا کہ انہیں اپنے کو اور
لینے کے علاوہ اور کوئی چارہ ہی نظر نہیں آیا۔
ے ان جلے کٹے خیالات سے زچ ہو کر، مبحث کو فوری
ہونے کے لئے اور اپنی طے شدہ ملاقات کے وقت
رکھتے ہوئے، فرقت ماموں نے مجھے مولانا سے ملکر اپنے
و بطور شکایت خود مولانا سے بیان کرنے اور ان سے
تگو کرنے کو کہا اور میں نے ایک غیر متعلق شخص سے
ے کے بجائے، انکے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے، بڑی
ہ اُن ہی کے ساتھ مولانا سے ملاقات کرنا منظور کر لیا۔ دل
ت کی ایک عظیم دنیا بسائے میں بھی اُن کے ساتھ ہی مولانا
ا پہونچا۔ مولانا انکے منتظر تھے۔ دو منٹ کے رسمی سے
بعد، مولانا، فرقت ماموں سے اپنی ادبی گفتگو میں کچھ اس
مغول ہو گئے کہ میرا تو وجود ہی جیسے فراموش کر بیٹھے۔ فنِ
ادب میں طنز و مزاح کے موضوع پر بولتے ہوئے مولانا
ہ میری پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ وہ ادبیت اور
، احساسات کی آگ سے مزین، جوشش میں بھی ہوش
روان، ایک دریا تھے۔ انکی بے پناہ معلومات اور
عالمانہ گرفت اور انہماک نے، مجھ پر خصوصی طور پر نظر
نے کا، انہیں موقع ہی نہیں دیا۔ یہاں تک کہ رخصت
وقت آگیا کیونکہ تھوڑی ہی دیر بعد مولانا کو مرکزی تعلیمی
ٹنگ کی صدارت کرنا تھی، جس کے لئے دو اصحاب
ایت پر حاضر تھے اور دو بار اسی ضمن میں مولانا کو اطلاع
ا تھی۔ رخصتی کیلئے کھڑے ہوتے ہوئے مولانا نے
ہ فرقت ماموں سے میرے بارے میں بھی سوال کر دیا

اور انہوں جواباً مسکراتے ہوئے مختصراً مولانا سے میری بدظنی کا ذکر
کر دیا اور اپنی بات یہاں ختم کی کہ یہ حضرت خود آپ سے آپ کی
شکایت کرنے یہاں حاضر ہوئے تھے۔ مولانا نے ایک بار پھر ہمیں
بیٹھ جانے کا اشارہ کرتے ہوئے، بالکل اچانک ہی مجھ سے مخاطب
ہو کر اپنی نگاہوں میں ایک عقابی شوخی لہراتے ہوئے، اپنا سوال
میری جانب کچھ اس طرح پھینکا کہ جس کی ذہنی چوٹ آج بھی میرے
دل و دماغ پر تازہ ہے۔

"تو صاحبزادے، میں اپنی شکایات خود آپ ہی سے سننے کا
مشتاق ہوں" الفاظ کا یہ جملہ اس قدر اچانک تھا کہ میں انکے عالمانہ رعب
سے مسحور، ایک گونہ حواس باختگی کے عالم میں "بے زبانی ہے زبان میری"
کی تفسیر بن کر رہ گیا، ذہن میں سوالات اور الفاظ کے جس قدر تانے
بانے بنا رکھے تھے کہ یہ کہونگا اور اس جواب پر یوں کہونگا، سب
کا سب تار و پود ہی بکھر کر رہ گیا۔ خیالات کے بنائے ہوئے بےحد
مضبوط قلعے اچانک ہی مسمار ہو گئے اور خالی الذہنی کی سی کیفیت
میں، بمشکل تمام ہکلاتے ہوئے، جھجکتے ہوئے، ٹوٹے پھوٹے الفاظ
میں نہ معلوم کس طرح میں نے اپنا مطمع نظر اُن پر واضح کرنے کی ایک
ناکام سی کوشش کر ہی ڈالی۔ جواباً مولانا کا ارشاد خود انکے الفاظ میں
ملاحظہ فرمائیں جسے مولانا نے مجھے نوٹ کرا دیا تھا۔

"میرے بھائی، میرا تاریخی نام فیروز بخت رکھا گیا تھا۔ بخت
کی فیروزی اور طالع کی ارجمندی تو میری اپنی لغزشوں اور میرے
اپنوں کی ٹھوکر دل کی پامالی اور نصیب کی درندگی میں بسر ہو چکا۔

خیال تھا کہ باقی عمر دم لینے اور سستانے میں گذر جائیگی۔ لیکن آپکا نئی نسل کا، ماضی کی ان ناکامیوں اور عمر رفتہ کی ان مجبوریوں سے کچھ بہت زائد توقعات والبستہ کرلینا اور وہ بھی ایک ایسے مو ضعیف سے۔ جسے خود اس کی قوم نے اپنی بھرپور قوت سے چینی کے گلدان کی مانند پٹک کر ریزہ ریزہ کر دیا ہو۔ علاوہ ازیں قیام پاکستان نے قطعی طور پر جس شخص کا اپنے ہی ملک میں ذہنی، روحانی

حتیٰ کہ جسمانی طور پر شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا ہو، نا امیدیوں، ناکامیوں نامرادیوں اور ناموافق ماحول کے بیچ جس کا حال اب صرف اسی ایک مصرع میں ادا کیا جاسکتا ہو۔

چیل چیلوں کے نجاست خانے میں بیچارہ پپیہا کیا بولے!

آپ اسی مصرع کی روشنی میں موجودہ حالات کا جائیزہ لیں گے تو بات پوری طرح آپ کی سمجھ میں آجائیگی!!

کہتے ہوئے مولانا ہم سے ہاتھ ملاکر رخصت ہوگئے اور میں مجسم درد کی تصویر بنا ہوا، اپنے ذہن میں انکے، الفاظ دوہراتے ہوئے دم بخود، ایک منٹ تک تو وہیں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔

رقمِ خریداری

بذریعہ منی آرڈر بھجوائیں۔ وی۔ پی۔ پی نہیں بھجوائی جاتی ہے۔ منی آرڈر کوپن پر اپنا نام و پتہ صاف صاف اُردو کے ساتھ ہندی یا مراٹھی میں بھی لکھ دیں۔ اسی طرح رسالہ فوراً ہی جاری ہوسکے گا۔

(ادارہ)

زبیر اعظمی
پُر دلیس پورہ، ییولہ، ضلع ناشک

جب وہ ماہ تمام آتا ہے
آسماں سے سلام آتا ہے

گردشِ دہر اب ٹھہر جانا — دلبر خوش خرام آتا ہے

زندگی جب اداس رہتی ہے — لب پہ تیرا ہی نام آتا ہے

چشم ساقی سے جو نہیں پیتا — وہ سدا تشنہ کام آتا ہے

عشق کا درس یاد کرنے پر — حکم جس دوام آتا ہے

مر کے بھی وہ کبھی نہیں مرتا — دوسروں کے جو کام آتا ہے

عشق کی اب جہاں میں خیر نہیں — چارہ سازِ نظام آتا ہے

تختۂ دار تیرا احساں ہے — وقتِ نیلِ مرام آتا ہے

کتنی حسرت سے تاکتا ہے زبیرؔ
جب کوئی شادکام آتا ہے

شجر نگاروی
سیتا مارکیٹ، نزد کوتوالی، جی۔ بی روڈ گیا (بہار) ۸۲۳۰۰۱

اُردُو ادَب میں صنفِ رباعی

فارسی ادب نے شعر و سخن کی جو آبیاری کی ہے اور پند و نصائح
ے ساتھ ساتھ ہی عروسِ غزل کو اصنافِ غزل سے سجا کر سنوار کر پیش
یا ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ اس وقت کے حالات آج کی طرح
تنے الجھے ہوئے نہیں تھے اور عوام کے مسائل اتنے اذیت ناک
ہرگز نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی شاعری میں عوام کے ذہنی
رب اور بے چین زندگی کا تذکرہ شاذ و نادر ہی ملتا ہے۔

حضرت سعدی کا ایک شعر ہے:

چناں قحط سالے شد اندر دمشق
کہ یاران کردند فراموش عشق

اس شعر میں رنج و الم عشق کی روداد تو ہے لیکن انتشار خلفشار
م کی معاشی بدحالی اور اس بیس کے ذہنی تناؤ کا شائبہ نہیں ملتا۔ نظم
ں تمام ترکیفیات و حسیات قحط سے پیدا شدہ حالات پر مبنی
یں۔ حضرت سعدی نے عوام کو خوب سے خوب تر انداز و بیان
ں نصیحتیں کی ہیں۔ قطعات میں بھی اور رباعیات میں بھی۔ ان کی
یات بھی لاحول ولا قوۃ الا باللہ کے چار اعرابوں کے ردّ و
لا کے علاوہ پانچویں چھٹی یا اور کسی بھی بحر میں نہیں ہیں۔

لاحول ولا قوۃ الا باللہ کو خداوندانِ صنفِ رباعی نے چار طرح سے
اعراب میں بدل کر لکھا ہے جو ذرا ذرا سا فرق ہے چاروں مصرعوں
کو رباعی کا مزاج عطا کرتا ہے۔ کبھی ایک مصرع میں ہلکا سا تناؤ رہتا
ہے کبھی دوسرے مصرع میں تھوڑا سا دباؤ اور کبھی آخری مصرع میں
ایک لفظ کا جھکاؤ کچھ زیادہ ہو جاتا ہے۔

صائب الرائے رباعیات نے یوں لکھا ہے،

۱: لاَحَولَ ولا قوۃَ الاّ باللہ ــ ہائے ہوز مخفی
۲: لاحَولَ ولا قوۃَ الاّ باللہ ــ ہائے ہوز ظاہر
۳: لاحَولَ ولا قوۃٌ الا باللہ ــ لام پر دو دو الف کی آواز ظاہر کرتا ہے۔ ہائے ہوز بھی ظاہر ہے
۴: وَلاحَولٌ ولَا قوۃٌ الّا باللہ ــ

جس طرح مفعول مفاعیل مفعولن فعلن کے ردّ و بدل سے
رباعی کے مصرعوں کو ترتیب دیا جاتا ہے اسی طرح لاحول ولا، کو
بھی اعرابوں کے ذریعہ مصرع کو مزاجِ رباعی عطا کیا جاتا ہے۔

صنفِ رباعی پر مضمون نگار حضرات یہ ضرور لکھتے ہیں کہ
چوبیس ۲۴ اوزان ہیں اور یہ چوبیس اوزان افاعیل اور زحاف کے

تبدیلی و تبدل سے وجود میں آتے ہیں۔ اور ان سب بحروں کا سرچشمہ بحر ہزج ہے۔

مضامین بر رباعی میں رباعیوں کی مثالیں بھی نظر سے گزرتی رہی ہیں۔ لیکن کسی نے بھی رباعی کی چار بحروں کے علاوہ پانچویں، چھٹی یا کسی اور بحر میں رباعی کی مثال پیش نہیں کی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ رباعی کے لیے صرف چار بحر ہی کافی اور شافی ہیں۔

کچھ لوگ غیاث اللغات میں رباعی کی چار بحروں کو غلط اور سراسر غلط بتاتے ہیں۔ کچھ حضرات چار بحروں کو درست سمجھتے ہوئے بھی چوبیس بحروں کی بات ضرور کرتے ہیں لیکن مثال کسی بھی شاعر کی رباعی سے (بجز چار بحور کے) پیش نہیں کرتے۔

بہت ساری غزلیں بحر ہزج میں ہیں۔ دو شعر پڑھ دیجئے تو رباعی معلوم ہوگی لیکن جو مزاج اور کیفیت رباعی کی ہے اس کو مزاج دانِ رباعیات ہی سمجھ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر کے کے رشی کے یہ دو شعر:

آس امید لگاتے رہیئے کوئی بہانہ بھی بناتے رہیئے
ان کی عادت یونہی روٹھے رہنا آپ کا فرض مناتے رہیئے

میرا خیال ہے اگر کے۔ کے رشی صاحب مجمع میں یہ دو شعر بنام رباعی پڑھ دیں تو بہت سارے ذہن بحر رباعی پر تیرتے نظر آئیں۔

قطعات کے اشعار کی تعداد بھی یارانِ ادب چار مصرع سے اسی پچاسی اشعار تک لکھتے ہیں۔ ٹھیک ہے لکھتے رہیں لیکن قطعہ جو چار مصرعوں میں لطف و سرور دیتا ہے وہ بات اور کیفیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ پھر اگر قطعہ ایک سو ستر بہتر مصارعہ تک لکھا ہو تو میں اس کو قطعہ کا مقام نہیں دیتا۔ قصیدہ، مدح، منقبت، مناجات وغیرہ وغیرہ ہو سکتا ہے۔ مثنوی کی بات بھی کچھ کرتا چلوں۔ مثنوی کے بحور تو مخصوص ہیں۔ مخصوص بحروں کے بعد مثنوی بھی اپنا رنگ پھیکا محسوس کرنے لگے گی۔ میرا کہنا ہے۔ رباعی اپنی چار بحر[illegible] قطعہ اپنے فورم میں اور مثنوی اپنی مخصوص بحروں میں ہی بھلے ہیں۔ صرف غزل ہی ایسی صنفِ سخن ہے کہ ہر بحر میں اپنی جاذبیت، دلکشی، روشنی، شگفتگی اور اپنی خوبصورتی برقرار رکھتی ہے۔ اب کچھ مشاہیر اور علم و فکر اور فن شاعری پر عبور رکھنے والے شعرا کی رباعیات پیش ہیں۔ ہر رباعی اور سبھی رباعیاں صرف چار ہی بحروں کے اندر ہیں۔ میر ببر علی انیس[illegible]

بروزن: لاحول ولا قوۃ الا باللہ — ہائے ہوز مخفی

رتبہ جسے دنیا میں خدا دیتا ہے وہ دل میں فروتنی کو جا دیتا[illegible]
کرتے ہیں تہی مغز ثنا آپ اپنی جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا[illegible]

بروزن: لاحول ولا قوۃ الا باللہ — ہائے ہوز ظاہر

میر ببر علی انیس:

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے بلبل کی زباں پہ گفتگو تیر[illegible]
ہر رنگ میں جلوہ ہے تیری قدرت کا جس پھول کو سونگھتا ہوں با[illegible]

لاحول ولا قوۃ الا باللہ، ہائے ہوز مخفی ہے۔

انیس:

دنیا بھی عجیب سرائے فانی دیکھی ہر چیز یہاں کی آنی جانی د[illegible]
جو آکے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا جو جا کے نہ آئے وہ جوانی[illegible]

بروزن: لاحول ولا قوۃ الا باللہ: ہائے ہوز ظاہر ہے دو الف کی آواز۔

مرزا سلامت علی دبیر:

قطرے کو گہر کی آبرو دیتا ہے قد سرو کو گل کو رنگ و بو د[illegible]
بیکار شخص ہے تصنع بیکار عزت وہی عزت ہے جو تو د[illegible]

پروانے کو دھن شمع کو لو تیری ہے عالم میں ہر اک کو تگ و دو تیر[illegible]
مصباح و نجوم و آفتاب و مہتاب جس نور کو دیکھتا ہوں ضو تیر[illegible]

جگت موہن رواں

افلاس اچھا نہ فکرِ دولت اچھی   جو دل کو پسند ہو وہ نعمت اچھی
جس سے اصلاحِ نفس ناممکن ہو   اس عیش سے ہر طرح مصیبت اچھی

حرص و ہوسِ حیات فانی نہ گئی   اس دل سے ہوائے کامرانی نہ گئی
ہے سنگِ مزار پر ترا نام رواں   مرکر بھی امید زندگانی نہ گئی

ولی الرحمان ولی :

اللہ رے ادائے بے نیازِ ہستی   الجھی ہوئی ہے زلفِ درازِ ہستی
کی عقل نے موشگافی لیکن   کھل ہی نہ سکا طلسمِ رازِ ہستی

رباعی کا پہلا لفظ اللہ میں ہائے ہوز کی آواز ظاہر نہیں ہے۔ تیسرے مصرع میں لاحول کا پہلا نمبر ہے اور یہ خوبی یا باریکی رموز دانِ رباعیات ہی سمجھ سکتے ہیں۔

تلوک چند محروم :

لاحول ولا قوۃ الا باللہ ۔ ہائے ہوز کی آواز مخفی ہے ۔

دنیا تھی یہی صدق و صفا کی دنیا   رحم و کرم و مہر و وفا کی دنیا
انساں نے بنا دیا بالآخر اس کو   جور و ستم و کذب و ریا کی دنیا

شاد عظیم آبادی :

بروزن : لاحول ولا قوۃ الا باللہ ؛ ہائے ہوز مخفی ۔

دنیا میں بلا کے مجھ کو مہماں کیا   کیا کچھ نہیں میرے لئے ساماں کیا
طاعت پہ نہ بخشا کہ وہ مزدوری تھی   یوں بخش کے اس نے اور احساں کیا

رباعی کے آخری مصرع میں لاحول ولا قوۃ الا باللہ سے استفادہ کیا ہے ۔

شاد عظیم آبادی :

چالاک ہیں سب کے سب بڑھے جاتے ہیں   افلاک ترقی پہ چڑھے جاتے ہیں
مکتب بدلا، کتاب بدلی، لیکن   ہم اب بھی وہی کتاب پڑھے جاتے ہیں

تیسرا مصرع میں ایک رکن کی کمی نے رباعی کا مزاج بدرجۂ اتم پیدا کر دیا ہے ۔

خواجہ الطاف حسین حالی :

بروزن : ولاحولَ ولا قوۃَ الا باللہ ؛ ہائے ہوز ظاہر ہے ۔

جو لوگ ہیں نیکیوں میں مشہور بہت   ہوں نیکیوں پر اپنی نہ مغرور بہت
نیکی ہی اب بدی ہے گر ہو نہ خلوص   نیکی سے بدی نہیں ہے کچھ دور بہت

حالی کا تیسرا مصرع لاحولَ ولا قوۃَ الا باللہ کے وزن میں ہے۔ اور رباعی کا مزاج بھی یہی ہے کہ تیسرا یا چوتھا مصرع تنوین کے کم و بیش سے کہا جائے ۔ ایک رباعی اور حالی کی سنئے ۔ اسی وزن میں ،

کیا تم سے کہیں جہاں کو کیسا پایا   غفلت ہی میں آدمی کو ڈوبا پایا
آنکھیں تو بے شمار دیکھی لیکن   کم تھیں بخدا کہ جس کو بینا پایا

بہرکیف : رباعی کی صرف چار بحروں کی حمایت اگر غلط کر رہا ہوں تو دانشورانِ رباعیات دیگر بحور میں بھی رباعیاں سنانے کی زحمت فرمائیں ۔

نشاد اختر انصاری
ایڈیٹر "ہمہ گیر"
مومن پورہ چوک . ناگپور ۱۸

صارفین کی ذمہ داریاں فرائض و حقوق

صارفین غیر معمولی طور پر معیشت کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں ان کی حفاظت و بہتری کے لیے یوں تو کئی قوانین نافذ کئے گئے ہیں . جو ان کے حقوق کی روشن ضمانت دیتے ہیں. جن کی رو سے صارفین کو دھوکہ دہی، رشوت خوری، اور دیگر ناجائز کاروباری ہتھکنڈوں سے بچایا جاتا ہے. آج گاہکوں کے سامنے ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ ضروری اشیاء کی تیاری، ناپ تول اور مہر بند کرنے تک کے تمام مراحل سے وابستہ بیوپاری کوئی دھوکہ دہی نہ کرنے پائیں. ایسے معاملات میں صارفین کو پشت پناہی کی ضرورت ہوتی ہے. چنانچہ مہر بند اشیاء کی تقسیم و فروخت کے لیے ایک ٹھوس قانون کی ضرورت شدت سے محسوس کی گئی.

آج دنیا کے تمام ترقی یافتہ ممالک میں صارفین کے تحفظ اور مہر بند اشیاء کی خرید و فروخت کے متعلق قوانین نافذ ہیں جن کی رو سے صارفین کی حقوق کی حفاظت کی جارہی ہے اب گاہکوں کی اپنی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ایسی کوئی بھی شئے جو پیکنگ کی گئی ہو دوکان سے خریدیں تو اس پر مروجہ وزن، چیز کی پہچان، تیار کردہ تاریخ، پیکنگ کی تاریخ اور قیمت وغیرہ اچھی طرح دیکھ لیں ہر اعتبار سے اطمینان کر لینے کے بعد ہی کسی بھی اشیاء کی خریداری مناسب ہے .

عام طور پر کوئی بھی مہر بند شئے کا ٹھیک ناپ اس کی اونچائی یا موٹائی سے معلوم نہیں ہوتا جب تک کہ پیکنگ کے اوپر وزن تحریر نہ ہو. اگر یہ خامی رہ جائے تو گاہک کے لیے یہ سہولت ختم ہو جاتی ہے کہ وہ متعلقہ چیز خریدے یا نہ خریدے. اکثر اوقات دیکھنے میں

آتا ہے کہ پیکنگ کے اوپر شئے کی تفصیل اتنی باریک درج کی جاتی ہے کہ اُسے پڑھا نہیں جاسکتا۔ یا پھر کسی ایسے کونے میں لکھ دی جاتی ہے جہاں خریدار کی توجہ مشکل سے مبذول ہو۔

بعض اوقات ایسے الفاظ مثلاً "جب پیکنگ کی گئی کل وزن"۔ "پیکنگ کا کل وزن" وغیرہ کے استعمال سے خریدار کو گمراہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ اسے اس بات کا احساس نہ ہوسکے کہ اصل چیز کا وزن کیا ہے۔ ان تمام معاملات سے نمٹنے کے لئے اس بات کو ضروری قرار دیا گیا ہے کہ پیکنگ کے اوپر مہر بند شئے کا ٹھیک ناپ تول لازمی طور پر صاف صاف تحریر کیا جائے جس سے صارفین کا وقت ضائع نہ ہونے پائے۔

آج عوامی تقسیم کے نظام کو اس طرح ترتیب دیا جارہا ہے کہ یہ قومی اقتصادیات کا ایک قابل اعتماد جُز بنا ہے۔ مُلک کے تمام علاقوں خصوصاً دیہی علاقوں کو اس نظام کے دائرے میں شامل کیا جارہا ہے۔ صارفین کی سہولت کے لیے ضروری اشیاء اور دیگر اشیاء کی تقسیم کے لیے نئی دوکانیں تیزی سے قائم کی جارہی ہیں۔ عوامی تقسیم کاری مرکزوں کو وسعت دینے کا کام بھی جاری ہے۔

ہمارے مُلک میں آج اوزان و پیمائش کے لیے میٹرک سسٹم کا استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ سیر، پاؤنڈ، اونس وغیرہ پیمانوں کی اب کوئی قانونی حیثیت نہیں رہ گئی ہے۔ علاوہ ازیں ایک ہی طرح کی اشیاء جوکہ وزن اور پیمانے کے اعتبار سے بھی مساوی ہوں ان کی پیکنگ میں یکسانیت پیدا کرنے کی گنجائش نکالی گئی ہے تاکہ صارفین کے لیے مذکورہ شئے کی خاصیت اور قیمتِ خرید کے درمیان فرق کا اندازہ کرنا آسان ہوجائے۔

آج کے اس جدید دور میں جبکہ صنعت و حرفت اور تکنیکی معلومات میں دن بدن اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ چنانچہ مہر بند اشیاء کی فروخت میں باقاعدگی پیدا کرنا بھی اتنا ضروری ہے جس سے نہ صرف اشیاء کی تازگی باقی رہتی ہے بلکہ اُن اشیاء کے استعمال کی مدت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ تکنیکی مہارت کے استعمال سے مہر بند چیزیں ماحولیات کے بُرے اثرات سے محفوظ رہتی ہیں۔

عام طور پر بہت سے بیوپاری بناوٹی قلت کا ڈھونگ رچاکر اشیاء کی قیمتوں میں زبردستی اضافہ کردیتے ہیں۔ گاہکوں کی سوجھ بوجھ اور دانش مندی ایسے منافع خور اور کالا بازاری کرنے والے بیوپاریوں کا ... فاش کرسکتی ہے۔ صارفین کے مفاد کی حفاظت کی خاطر بنائے گئے قوانین کا سب سے اہم پہلو اشیاء کی پیداواری قیمت کو نظر انداز کرتے ہوئے اشیاء کی قیمتوں میں ناجائز اضافہ کی کوششوں سے صارفین کو بچانا ہے۔ صارفین کے استحصال کی روک تھام کے لیے آج ہر ممکنہ کوشش کی جارہی ہے۔ زیادہ سے زیادہ کوشش اس بات پر کی جارہی ہے کہ صارفین کو عمدہ کوالیٹی کی اشیاء، مناسب داموں پر زیادہ مقدار میں ملیں صارفین کے رضاکارادارے، عوامی تقسیم کے نظام کی موثر کارکردگی کو یقینی بنانے اور صارفین کے مفاد کی زیادہ کارگر ڈھنگ سے حفاظت کرنے کے سلسلے میں کافی مدد دے سکتے ہیں۔

دیہی سطح پر صارفین میں ضروری شعور اور بیداری پیدا کرنے کے لیے مقامی نمائندہ تنظیموں کی خدمات حاصل کی جانی چاہیئے۔ یہ بات بھی اتنی ہی ضروری ہے کہ صارفین کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہر وقت ہونا چاہیئے۔ ان کے تعاون کے بغیر اس سلسلے میں کامیابی ملنا مشکل ہے۔

قارئین معاونین سے گذارش ہے کہ اپنی تخلیقات کے ساتھ یا پشت پر اپنا مکمل پتہ، پن کوڈ نمبر کے ساتھ ضرور تحریر فرمائیں۔ مضمون کاغذ کے صرف ایک ہی طرف لکھیں اور قلمی نام کے ساتھ اصل نام بھی تحریر کریں — غیر مطبوعہ مضامین کی ایک نقل اپنے پاس ضرور رکھیں۔

(ادارہ)

مقدر حمید

زویا

"ہم ایک دوسرے سے مل چکے ہیں ایک بار۔ یاد کرو"۔

"نہیں یاد آتا"۔

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجھ میں کوئی ایسی بات نہیں کہ صرف ایک ملاقات میں کسی کو یاد رکھ سکوں"۔

"نہیں۔ ایسا بھی نہیں۔ کم از کم تمہاری گفتگو سے تو یوں نہیں لگتا۔ تم سے بات کرکے تمہیں بھول جانا ناممکن سا ہے"۔

"تو پھر ایسا صرف بات چیت کی حد تک ہوگا۔ صورت شکل کے اعتبار سے اتنی بخشی ہوئی ہوں کہ یاد رکھنے کو کسی کا جی نہ چاہے"۔

"یہ بھی عام نہیں ہوتا۔ جس کی آواز اتنی دلکش، جس کی گفتگو ذہانت کی غماز، جس کی شخصیت سراپا خلوص کا پیکر محسوس ہو، وہ بھلا کیوں کر ..."

"تو پھر بھلا کہ تم جو بلند قامت، حسین صورت اور باعث رشک شخصیت کے مالک ہو، تو اپنے سوا کوئی اور تمہاری نظر میں جچتا ہی نہ ہوگا، ہینڈسم!"

"یعنی دوسرے لفظوں میں تم مجھے خودپسند اور مغرور کہہ رہی ہو؟"

"یہ تو نہیں کہا میں نے"۔

"پھر؟"

"پھر یہ کہ ـــ ہاں ـ میں نے جو کارڈ بھیجا تھا، ملا؟"

"ملا اور بے حد پسند آیا۔ بلکہ دنگ رہ گیا یہ دیکھ کر کہ تم اتنی خوبصورت تصویریں بنا لیتی ہو۔ چاروں طرف گھنے درختوں کے جھنڈ اور خوش رنگ پھولوں سے لدی جھاڑیوں میں گھرا ہوا ایک چھوٹا سا گھر، نیلا آسمان، ایک خاموش سی پگڈنڈی، دُور کہرے میں ڈوبے پہاڑیوں کے سلسلے، قدرت کی پُراسرار، گونجتی بولتی خاموشی ـ اور ان سب سے بڑھ کر وہ جملے جو تم نے زندگی کے تعلق سے قلم بند کیے .... غضب ہیں! اگر یہ جملے تمہارے اپنے ذہن کی اختراع ہیں تو یقین جانو تمہاری فکر اور ذہانت کے آگے میرا قد ماشے کی طرح سمٹ جائے، جو کہیں سے اخذ کیے ہوں تو تمہارے لاجواب انتخاب اور نظر...."

"بس بس بس۔ تعریف کے اتنے انبار لگاؤ کہ میں خود اپنی ہی نگاہوں سے اوجھل ہو جاؤں۔ سچی میں ایک بیحد معمولی سی لڑکی ہوں"۔

"نہیں، تم جو بھی ہو، غیر معمولی ہو زویا۔ بس اب اور ضبط
ہوتا۔ بتاؤ کب مل رہی ہو؟"
"ابھی نہیں"
"پھر وہی ضد۔"
"ضد نہیں۔ ضرورت۔ ہاں۔ اس طرح تم سے نہ
رف ٹیلی فون اور خط سے تبادلہ خیال کرکے میرے دل و
انبساط کی جس کیفیت سے آشنا ہوتے ہیں، میں اُس
لو اتنی جلدی گنوانا نہیں چاہتی۔ ایک بات کہوں؟ واقعہ
لہ... کم از کم میرے مشاہدے میں یہی آیا ہے کہ... جتنے
نگے خوبرو لڑکے ہوتے ہیں ان کی بالائی منزل عموماً خالی
ہے۔ یعنی ذہنی اعتبار سے وہ بس یوں ہی ہوتے ہیں۔
لہ تمہارے یہاں زندگی کو، دنیا کو، انسانی رشتوں کو ایک
یت، ایک نئے انداز سے دیکھنے کی کوشش نمایاں نظر آتی
تمہارے رویوں میں، اور یہ ایک ایسا وصف ہے جس نے
برے لیے اس قدر پُرکشش بنا دیا ہے۔"
"لہذا، تم ہم مل جائیں تو زیادہ اچھی بات ہوگی کہ نہیں!"
"کہا نہ کہ ہم پہلے مِل چکے ہیں۔"
"او ہو اب بیسیوں ملاقاتیں، بے شمار محفلیں جانے
ابے خبری کا لمحہ تھا۔ خیر، پھر ایک بار مِل جائیں تو.....
و، کہیں ایسا تو نہیں کہ تم ڈرتی ہو؟"
"شاید"
"یہ کیا بات ہوئی؟"
بھی اور نہیں بھی۔ جارج برنارڈ شا جو انتہائی ذہین
صحت اور صورت کے اعتبار سے بخشے ہوئے تھے، ان
س عہد کی ایک بے حد دلکش و حسین لیکن ذہانت میں
خاتون نے شادی کی تجویز سامنے رکھتے ہوئے دلیل پیش
ہمارا بچہ بے مثال اور فخرِ انسانیت ہوگا۔ شا نے پوچھا وہ
؟ کہنے لگیں اُس کو میرا حسن اور تمہارا دماغ جو ملے گا وراثت
میں۔ شا نے برجستہ کہا مجھے معاف کریں، محترمہ۔ جو کہیں
اُسے آپ کا دماغ اور میری وجاہت مل گئی تو بیڑہ غرق!"

وہ بس اسی طرح وقت بے وقت فون کرتی، لطیفے سناتی
خود کمپوزڈ کیے نہایت خوب صورت اور پُرمغز فقروں سے
آراستہ گریٹنگ کارڈ بھیجتی اور ہر گذرتے دن کے ساتھ
میرے دل و دماغ پر ایک پُراسرار ہستی کی طرح محیط ہوتی جا
رہی تھی۔ ہر چند کہ اس کی شخصیت میرے لیے محض آواز کی
شخصیت لیکن بہت سارے پہلو اس کے مزاج کے ایسے
اجاگر ہوتے جاتے تھے جن سے چکا چوند کی کیفیت پیدا
ہو چلی تھی۔ ذہن کے کینواس پہ اُبھرتی ہوئی ترچھی لکیریں ایک
شبیہ بن تی جارہی تھیں جو ایک ہم درد، ایک مخلص دوست، ایک
ہم پیالہ و ہم نوالہ بے تکلف یار کی تھی۔ ایسی تصویر جو بیک وقت
بے حد قریب اور بہت دُور تھی۔

زویا اس کا اصل نام نہیں تھا، بس یوں ہی ایک نام دے
دیا تھا بے حد اصرار پر۔ جن دنوں زویا سے اس ٹیلی فونی اور
مکتوباتی ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا وہ بڑے خلفشار کا دَور
تھا میرے لیے۔ حالات نے مجھے ایک عجیب دوراہے پر لا کھڑا
کیا تھا۔ شاتی مجھ سے دُور، بھوپال چلی گئی تھی اور اُس کے چلے
جانے کے بعد اچانک محسوس ہوا تھا کہ اُس کے اس طرح جانے
سے کیسا خلار پیدا ہو گیا تھا زندگی میں۔ اس کی جُدائی سے اس بات
کا انکشاف ہوا کہ کیسے میں نے شاتی کی رفاقتوں کو اپنی ضرورت
بنا لیا تھا ان جانے میں۔ تقریباً ہر روز ملنے اور اتنے قریب
رہنے کے باوجود کبھی وہ بات نہ کہہ سکا اور جب خیال آیا تو بہت
دیر ہو چکی تھی۔ شاتی نے اپنے کریئر کو اپنی منزل ٹھہرا لیا تھا، وہ
یکے بعد دیگرے معرکے سر کیے جارہی تھی۔ ایم ایس سی امتیازی
نمبروں سے کرنے کے بعد حیاتین و غذائیہ میں خصوصی تربیت
حاصل کی اور اُسے UNESCO اور WHO جیسی بین الاقوامی

تتلیوں سے آ گرا آئے تھے۔ سردست وہ ایک مقامی کالج میں لیکچرر تھی اور خط لکھ کر اپنے اس ڈائلما کا ذکر کیا تھا کہ وہ امریکہ جائے یا نہ جائے، مجھے اپنے خالی پن کا احساس تھا۔ جب شانی میری زندگی سے نکل ہی چکی ہے تو پھر اس سے میرے لیے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ کہاں جا رہی ہے! — پھر شانی کیوں بار بار خط لکھ کر دوستی جتاتی ہے؟

کون سی بات ہے بین السطور جسے میں پڑھ نہیں پا رہا ہوں بڑی کشمکش تھی اور بڑی اداسی تھی زندگی میں اُن دنوں۔ اس بے سمتی کے سفر میں سواتی مل گئی اور لمحہ بھر کو یوں محسوس ہوا جیسے قلب و ذہن کے سارے خلا پُر ہو گئے ہوں۔ سواتی سے نزدیکیاں ساری کلفتوں اور محرومیوں کا علاج تھیں گویا۔ تاہم ایک گمنام سی خلش تھی۔ درد کی ایک لہر جس کا اُور چھور سجھائی نہ دیتا۔

ایک شام ایسے ہی بے دلی اور مایوسی کا شکار ہو رہا تھا کسی کام میں کہیں جی نہیں لگ رہا تھا۔ ساری کائنات بے معنی، ساری کوششیں فضول اور سارے راستے بے منزل لگ رہے تھے کہ عین اس عالم میں زویا نے فون کیا۔

"ہزار برس جیو زویا۔ آج سے پہلے شاید کبھی اتنی شدت سے کسی دوست کی ضرورت نہ محسوس ہوئی ہوگی"

"ہزار برس کی بد دعا سے قطع نظر، ایسی کیا بات ہوئی؟"

"سخت ناامیدی ہے، انتہائی بے زاری ہے۔"

"ارے۔ تمہیں پتہ نہیں ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن نے ذہنی امراض کے تدارک کا مرکز بمبئی میں کھولا ہے۔ جب بھی مایوسی اور اداسی ذہن پر چھائے فوراً 300329، ڈائل کرو"

"مذاق چھوڑو لیکن یہ سچ ہے کیا۔ پہلے کیوں نہ بتایا۔۔۔ کیا نمبر ہے۔۔۔ بدمعاش کہیں کی۔ یہ تو ہمارا نمبر ہے!"

"بس اپنے فون کے پاس بیٹھے رہیں۔ خاکسار سے گفتگو کا خط اٹھائیں سب بے دلی نامرادی ڈپریشن رفو چکر۔ رہی فیس تو وہ جناب اکٹھی وصول کر لی جائے گی۔"

"زویا تم مجسم لطف و کرم ہو۔ ایسی روح ہو جو کسی تتلی کی طرح آسمانوں سے۔۔۔"

"اچھا بس۔ سنو میں نے ایک عجیب خواب دیکھا کل رات۔ وہی سنانے کی غرض سے تمہیں فون کیا۔ میں نے دیکھا کہ تم ساحل پر جھاگ اڑاتی موجوں سے پرے روپہلی ریت سے سیپیاں چُن رہے ہو۔ سمندر سے آنے والی ہواؤں نے تمہارے بال بکھرا دیئے اور تمہاری آنکھوں کو تتلی رنگ سپنوں سے بھر دیا۔ میں تم سے کچھ فاصلے پر تھی ہاتھ بڑھا کر چھونا چاہا تو یکلخت تم بہت دُور چلے گئے۔۔۔"

دوسرے دن اس کا بھیجا ہوا ایک کارڈ ملا۔ انگور کی بیلوں پر منڈلاتی تتلیاں۔ لکھا تھا: "جب تک یادیں ہیں، گزرا ہوا کل باقی ہے۔ جب تک امید ہے، آنے والا کل رہے گا اور جب تک دوستی برقرار ہے، ہمارا آج خوب صورت ہے!

ایک اور کارڈ، رابرٹ ہنری کی نظم کے ساتھ۔ ہماری زندگی کے وہ لمحے، دن اور رات کے وہ تھوڑے سے پل، جب ہمیں ظاہر سے پرے دیکھنے کی بینائی اچانک مل جائے۔ ہمارے مسرور ترین نہایت بیش قیمت لمحے ہیں۔"

آگے لکھا تھا، "بائی دی وے آپ مجھے نصیحت لیں کہ آپ کو اس کی ضرورت ہے۔ ویسے میں خود نصیحتوں پر عمل نہیں کرتی!" کچھ روز بعد پھر ایک کارڈ!

"وہ جسے ہم بہت پیچھے چھوڑ آئے
وہ جو آنے والا کل سامنے لائے گا
یہ سب غیر اہم اور معمولی ہے
عظیم اور حسین وہ کیفیت ہے
جو ہمارے درمیان ہے — زویا"

را ایک برس گزر گیا۔ زویا "ان دیکھی لیکن جانی پہچانی
گی کا ایک حصہ، ایک ضرورت بنتی چلی گئی۔ وہ جو
ف ٹیلی فون اور خطوں کے وسیلے سے مجھ تک
تھی لیکن رگِ جاں سے قریب تھی۔ ہمارے بیچ
یب سا بے نام رشتہ پروان چڑھتا رہا۔ دُوریوں کے
ام ترنزدیکیوں اور اپنائیت کا اٹوٹ بندھن۔ اس
لوفان آئے اور گزر گئے۔ کریئر، دوستی، علالت، ناکامی،
ہوئی خوشیاں، رنجشیں، جُدائیاں ــــ ایک طرف
ی جو قریب رہ کر دُور تھی اور دُور چلے جانے کے بعد نزدیک
ں تو دوسری طرف سواتی جس کا قُرب تشنگی کو تیز تر کرتا
۔ شانی نے ایک دن انتہائی برافروختگی کے عالم میں
نکالی تھی: یہ تمہاری فون سکھی، زویا، جو بھی نام ہے
ایک فراڈ ہے۔ کیا تم دل پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتے ہو
ں بالکل کچھ بھی کالا نہیں ہے؟ خواہ مخواہ کی فلسفیانہ
یہ بے نام رشتہ ہے، پاکیزہ محبت ہے وغیرہ وغیرہ
ے۔ میں خوب سمجھتی ہوں ان سوڈ وانٹ لیکچولز
ں کو"۔ تقریباً یہی کچھ سواتی نے کہا تھا۔ اور میں سوچنے
کیا سچ مچ اس رشتے کے پاؤں زمین پر ٹکے ہوئے ہیں،
یا یہ جذبہ، یہ احساس آسمان کی بلندیوں پر نہیں جیسا
تا ہے؟

زدیا نے کہا تھا: اگر کبھی یوں ہوا کہ ہم تم مل گئے تو پھر
ہ کرو جب میری شادی ہو گی تو مہورت کے وقت
ں میرے سامنے رہنا۔ میری نظر کے سامنے۔ ایک پل
ٹنا۔ پھر جب تمام رسمیں پوری ہو جائیں اور میں اگنی
د پھیرے لے لوں، تب تم جانا۔ میں اسی عرصہ میں
ہرہ ایک پل کو بھی نگاہ سے اوجھل نہیں ہونے دونگی"۔

"یہ کیا بات ہوئی۔ منڈپ میں تمہارے سامنے کیوں،
تمہارے آگے آگے پھیروں میں کیوں نہیں" میں نے شرارتاً
کہا اور وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی تھی۔ شانی کے چلے جانے کے
بعد میرا سواتی سے میل جول یقیناً شانی کو ایک آنکھ نہ بھایا
لیکن حیرت ہے کہ اس نے کبھی اس کا اظہار نہ ہونے دیا۔ نہ ہی
سواتی نے کبھی کوئی بات شانی کے خلاف کہی۔ لیکن ان دونوں
نے وقتاً فوقتاً اپنے رویے سے نشاندہی کی تھی کہ وہ زدیا
سے خوف کھاتے ہیں۔ سواتی نے تو ایک روز صاف لفظوں میں
کہا تھا: تمہاری دوستی فون کی حد تک ٹھیک ہے۔ کہیں مل گئے
تو آفت"۔
"کیوں"؟
"کیوں کہ مجھے ڈر لگتا ہے۔ میں تمہیں کھو دُوں گی"۔

آخر کار میرے مسلسل تقاضوں اور روز افزوں اصرار نے
زدیا کو اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کرنے پر مجبور کر دیا۔ وہ دن میری
زندگی کا مسرور ترین دن تھا جب اُس نے فون پر حامی بھری
اور اگلے ہفتے سوموار کو ٹھیک آٹھ بجے صُبح جُوہو کے ساحل
پر مہاتما گاندھی کے مجسمے کے قریب ملنے کا وعدہ کیا۔ اُس نے
اور بہت ساری باتیں۔ یہ کہ اس کا منگیتر بھی مجھ سے ملنے کو بے چین
ہے اور اپنی اس "بالمشافہ" ملاقات کے بعد کسی دن مناسب
موقع پا کر ہم دونوں کو بھی ملائے گی۔

اپنی زندگی کے بہت سارے پہلو ہم نے ایک دوسرے
کے سامنے کھُلی کتاب کی طرح رکھ دیئے تھے۔ اُس کا منگیتر،
میری گرل فرینڈس، مصروفیات، ہابی، شوق، سارے
نشیب و فراز۔ میری بے تابی کو ہر گزرتا ہوا دن مہمیز کر رہا تھا،
پھر جب صرف دو روز باقی رہ گئے تو طے ہوا کہ اب ٹیلی فون کی
گفتگو بند۔ میں نے آنے والی عظیم خوشیوں کا خیال

کرکے اس قربانی کے لیے آمادگی ظاہر کردی۔ اور ہر لمحہ ہر گھڑی اپنی اس محسنہ، اپنی مخلص دوست سے ملاقات کے منظر تصویر کرنے میں جٹ گیا۔ یوں ملیں گے، یوں بات شروع کریں گے۔ ہم نے ایک دوسرے کے جو نقوش ذہن میں بنائے ہیں نہیں، صرف میں نے، کیوں کہ اس کے کہنے کے مطابق اُسنے مجھے دیکھا ہے، لیکن میں ..... ہوسکتا ہے مجھے یاد آئے کہ ہم پہلے کب ملے تھے، کب دیکھا تھا ایک دوسرے کو۔

زویا سے ملنے کی تڑپ نے دنیا و مافیہا سے بے خبر کردیا تھا۔ ایک ایک لمحہ صدیوں جتنا طویل ہو چلا تھا اور جب سوموار کا سورج طلوع ہوا تو میں وقت سے پہلے ہی مقررہ جگہ پہونچ کر بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ آٹھ بج گئے۔ وہ گھڑی آئی اور نکل گئی۔ صبح سے شام ہوگئی، زویا نہیں آئی۔ مجھ پر غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ کیوں کیا ایسا مذاق اُس نے۔ بہت غصہ آیا۔ کرنے دو اب کی فون، نہیں بولوں گا میں اُس سے۔ بالکل بات نہیں کروں گا۔ اور یہ الولا اس وقت تک نہیں ٹوٹے گا جب تک وہ تلافی نہ کردے۔ وہ رات میں نے غم اور غصے میں تڑپ کر کاٹی۔ دوسرے دن، ہر آہٹ پر چونکا، ہر پل زویا کے فون کا انتظار کیا۔ ایک کے بعد ایک، دن اور رات گزرتے رہے، انتظار طویل تر ہوتا گیا اور آخرکار مایوسی میں بدل گیا۔ زویا نے پھر کبھی نہ خط لکھا نہ فون کیا۔

آج اتنے دنوں بعد زویا کے متعلق سوچتا ہوں تو لگتا ہے وہ اب بھی میرے قریب ہے۔ اوّل اوّل جو وسوسے دل میں آئے تھے کہ اُسے کچھ ہو نا گیا ہو، خدانخواستہ اس روز کسی حادثے کا شکار نہ ہوگئی ہو — ذہن نے تمام اندیشوں کو نکال پھینکا ہے۔ میں مجبور محض تھا کہ جب بھی بات ہوتی زویا کی طرف سے، نہ اُس کا پتہ میرے پاس تھا، نہ ٹیلی فون نمبر۔

لطف زا رابطے کی کوئی صورت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ کبھی کبھی لگ وہ ساری باتیں خواب تھیں۔ دوستوں سے میں نے اپنے ا کرب کو بیان کرنا چھوڑ دیا تھا کہ کوئی یقین نہ کرتا اور وہ ا بالوں کو میرا دماغی خلل سمجھنے لگے تھے۔ لیکن میں جانتا ہو زویا مستقل طور پر مجھ میں سماگئی ہے۔ اپنے دوستوں کے رویوں میں خلوص میں، عزیزوں کی گفتگو میں، جانے ا جانے چہروں میں، ہر جگہ اس کی جھلکیاں ہیں، کبھی سوچتا ہوں، زویا سے اُس صبح ملاقات ہوگئی ہوتی تو کیا وہ مجھ اتنی ہی قریب ہوتی جتنی اب ہے؟

ماضی کے آئینے سے

محمد حسن عسکری

جھلکیاں

تخلیقی صلاحیت کا اصل منبع انفرادی طور سے ادیب ذات ہے یا اجتماعی طور سے پڑھنے والوں کی شخصیت؟ اس ال کا جواب شیکسپیئر کیا دیتا، یہ تو ہم معلوم نہیں کر سکتے۔ لیکن دکے بہت سے ادیبوں کے نزدیک خود ان کی ذات تخلیق کا سرچشمہ . یں چونکہ باقاعدہ ادیب نہیں، کبھی کبھار لکھنے کی کوشش کرتا ں، اور اس امید میں رہتا ہوں کہ اگر پڑھنے والے مدد کریں تو میں مجھ جیسے معمولی لکھنے والے کچھ بہتر لکھ سکتے ہیں، اس لئے میں کہتا نا ہوں کہ تخلیقی صلاحیت دراصل پڑھنے والوں میں ہوتی ہے۔ پھر یہ بھی یقین رہا ہے کہ ذہنی اعتبار سے پڑھنے والوں کی حالت اتنی ب نہیں ہوئی جتنی ادیبوں کی ہوئی ہے۔ اس کا ثبوت پڑھنے والوں نٹو کی موت کے بعد دے دیا۔ یوں ادب کی موجودہ حالت سے ھی بدظن یا غیر مطمئن ہیں، لیکن اگر ادیبوں کے دل میں اچھا لکھنے کی ش ہوتی تو وہ اس سلسلے میں کچھ کرتے۔ مثلاً ایک کرنے کی چیز ں تھی کہ سارے ادیب بالجہر سہی اپنے دل میں ہی یہ اعتراف کر لیتے م سب کے سب معمولی صلاحیتوں کے لوگ ہیں، مگر اشتراک اور ن کے ذریعے معمولی صلاحیت سے بھی پورا کام لیں گے۔ اس کا ایک ز یہ تھا کہ دو دو چار چار کے گروہوں میں بٹ کر من ترا حاجی م تو مرا حاجی بگو کرنے کے بجائے افسانے اور نظمیں سامنے رکھ کر سوچا ۔ قابل قدر یا نئی چیزیں کہاں ملتی ہیں کہاں نہیں ملتیں، اور خامیاں کس ا ہیں۔ یعنی تعریف یا تنقیص کے بجائے ایک دوسرے کی کاوشوں کی نوعیت اور سمت متعین کرنے کی کوشش کی جاتی۔ اس کے بجائے ہمارے ادیب نئے پودنے اور پرانے پودنے بنتے پھرتے ہیں۔ دوسری طرف یہ حال ہے کہ پڑھنے والے اپنے ادیبوں سے بالکل ہی اکتا چکے ہیں۔ رسائل کے موٹے موٹے خاص نمبر جو اتنے مقبول ہوتے ہیں۔ اسکی وجہ صرف یہی ہے کہ پڑھنے والے محسوس کرتے ہیں کہ آج کل لکھنے والے پیدا ہو رہے ہیں نہ موجودہ لکھنے والوں سے کوئی امید وابستہ کی جاسکتی ہے اس لئے بہتر ہے کہ پرانے ادب کے متعلق گپ شپ سے ہی دل بہلا یا جائے۔ جو لوگ ادیب بن چکے ہیں انہیں اپنی پگڑی سنبھالنے کی فکر ہے، جو لوگ ادیب بننا چاہتے ہیں وہ ادیب بننے کا ارادہ کرنے کے بعد ہی بے فکر ہو جاتے ہیں کہ ہم تو اردو ادب میں لافانی ہو ہی گئے۔ پڑھنے والے دونوں گروہوں سے بے نیاز ہیں انہیں یہ تماشا دلچسپ تک نہیں معلوم ہوتا۔

اس قسم کے "ادب" سے بے تعلق برت کے پڑھنے والوں نے اپنی صحت مندی کا ثبوت تو ضرور دیا ہے۔ لیکن اپنی تربیت کی طرف وہ بھی متوجہ نہیں ہوئے۔ پچھلے پندرہ برس کے عرصے میں جو چیز پڑھنے والوں کی ذہنی تربیت میں ہارج رہی ہے وہ ادیب بننے کا شوق ہے۔ پھر اس زمانے میں ادیب بننا آسان بھی رہا ہے۔ لیکن موٹے موٹے خاص نمبروں کا ایک فائدہ یہ ضرور ہوا ہے اب ہر مہینے دو چار نئے پھول کھلنے بند ہو گئے۔ ادھر اگر یہی حال رہا تو شاید نئے لکھنے والوں کے لئے کوئی میدان ہی نہ رہے خیر، بعض لوگ تو اس

وقت بھی ہمیں یہی یقین دلاتے رہیں گے کہ اردو ادب زندہ ہے۔
بہر حال اس وقت دو تین مہینے کے اندر لا فانی ادیب بن جانے میں جو دقتیں پیش آ رہی ہیں ان سے اردو ادب کو یہ فائدہ پہنچ سکتا ہے کہ پڑھنے والے اپنی اہمیت سے واقف ہو جائیں۔

اس کا طریقہ یہ ہے کہ پڑھنے والے پڑھنا سیکھیں۔ ادیب بننے کے لئے نہیں، بلکہ محض پڑھنے کے لئے۔ کیونکہ یہ خود ایک تخلیقی عمل ہے۔ آپ کہیں گے کہ میں تو مدرسوں کی سی باتیں کر رہا ہوں۔ لیکن اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ پندرہ بیس سال سے اردو ادب طالب علموں اور کالجوں میں دم توڑتا رہا ہے۔ طالب علموں سے کہا جائے کہ پڑھنا سیکھیں تو انہیں اس کی کچھ ضرورت نہیں ہوتی۔ ادیبوں کی بیٹھک البتہ ہوتی ہے۔ ادیبوں کی انجمنیں تو بنتی ہی رہی ہیں، اور کم سے کم آجکل کچھ نہیں کر رہی ہیں۔ اب تو پڑھنے والوں کے گروہ بننے چاہئیں۔ لڑنے لڑانے اور ریفری بازی کے لئے نہیں بلکہ ساتھ مل کر پڑھنے کے لئے۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ سات آٹھ دوست صدر اور سکریٹری کا انتخاب کئے بغیر ایک حلقہ بنا لیں جس میں لوگ کتابیں اور رسالے پڑھ کر تبادلۂ خیال کیا کریں۔ ادبی گپ شپ تو حلقہ بنائے بغیر بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر التزاماً لوگ اس کام کے لئے جمع ہوں اور ایک دوسرے سے استفادہ کریں تو پڑھنے والے اپنی ذہنی تربیت خود کر سکتے ہیں۔ لیکن ایسے حلقے کا بنیادی مقصد یہ نہ ہونا چاہیے کہ اس کے سب رکن ادیب بن جائیں گے۔ یہ تو ثانوی چیز ہے۔ ایسے حلقے میں تو وہی لوگ شامل ہو سکتے ہیں جو محض پڑھنے کو ایک قابل قدر سرگرمی سمجھتے ہوں۔ اس لئے ان حلقوں میں نہ تو ادیبوں کو آنے کی اجازت ہو نہ پروفیسروں کو۔ یہ دو طبقے ایسے ہیں کہ جہاں ان لوگوں کا قدم پہنچا، ادب رخصت ہوا۔ ظاہر ہے کہ یہ حلقے یا تو طالب علم بنائیں گے یا کلرک۔ طالب علموں اور کلرکوں دونوں میں اتنی ذہنی تازگی موجود ہے کہ وہ پڑھنے اور بحث کرنے کے طریقے خود نکال سکتے ہیں۔

یہ میری تجویز نہیں ہے، بلکہ یہاں تو آٹھ دس طالب علموں نے آجکل کی ادبی فضا سے اکتا کر اس قسم کا ایک حلقہ قائم کر بھی دیا ہے ہو سکتا ہے کہ اور شہروں میں بھی طالب علموں کو اس کا خیال پیدا ہوا ہو۔ اگر ایسے حلقوں میں کچھ اس قسم کا تعاون پیدا ہو سکے جیسا کہ ٹکٹ جمع کرنے والوں میں ہوتا ہے تو بھی یہ صورت ہمارے ادبی ماحول کے لئے نہایت سازگار ہوگی۔ فضول تعلی کی ضرورت بھی کیا ہے اگر پڑھنے والوں کو اس شوق سے اتنی دلچسپی اور انہماک پیدا ہو گیا جتنا ٹکٹ جمع کرنے والوں کو ہوتا ہے تو بھی غنیمت ہے۔ ہم نے تو یہ دیکھا ہے کہ ٹکٹ جمع کرنے والوں کو ملکوں کے نام یاد ہوتے ہیں ہمارے ادیبوں کو تو اپنے سوا کسی مصنف کا نام بھی نہیں آتا۔

غرض ادبی جمود کا ایک ہی علاج ہے کہ پڑھنے والے اپنا ذہنی جمود ختم کریں۔ کم سے کم وہ لکھنے والوں سے اتنا تو کہہ سکیں کہ ہمیں لکھنا نہیں آتا ہے۔ لکھنے والوں میں تو باہمی رقابت کی وجہ سے اشتراک اور تعاون پیدا نہیں ہو سکتا۔ پڑھنے والوں کے درمیان اشتراک ایسی مشکل چیز نہیں۔ اگر ٹکٹ جمع کرنے والے شہر در شہر انجمنوں کا سلسلہ قائم کر سکتے ہیں تو پڑھنے والے بھی آٹھ آٹھ دس دس کی جماعتیں بنا سکتے ہیں پڑھنے والوں کو واضح طور سے معلوم ہو جائے کہ ہمیں کیا پڑھنا چاہیئے تو لکھنے والوں کو بھی جلد یا بدیر پتہ چل ہی جائے گا۔ یا پھر انہیں پڑھنے والوں میں سے نئے لکھنے والے بھی نکل آئیں گے۔

تبصرہ

تبصرہ نگار: عباس مجتہد

نام کتاب: کشف الاذکار
مرتبہ: معین الدین جینا بڑے
لیکچرر شعبۂ اردو بمبئی یونیورسٹی
ناشر: سنسار پبلشنگ ہاؤس
۱۰۵/اے، مرلی سٹ مدھو بمبئی ۴۰۰۰۲۰
صفحات: ۱۲۸
قیمت: ۴۰؍ روپے۔

نئی نسل کے ساتھ ایک المیہ یہ بھی ہے کہ وہ مطالعے سے جی چراتی
چند باہمت نوجوان اگر مطالعے پر کمربستہ ہو بھی جائیں تو تحقیق
ین کے دشت میں جانے سے گھبراتے ہیں۔ وہ اسے خارِ مغیلاں
کہتے ہیں۔

لیکن معین الدین جینا بڑے نے کشف الاذکار مثنوی جس کا
ہی نسخہ موجود ہے، پر تحقیق کی ہے اور یہ کتاب اسی کا نتیجہ ہے۔

جب ہم دکنی ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس ادب میں دو موضوعات
ہمارا زیادہ سابقہ پڑتا ہے۔ پہلا موضوع تصوف کا اور دوسرا موضوع
ستان و مثنوی کا ہوتا ہے۔ چونکہ تصوف کا موضوع بڑا ہی دقیق اور
یدہ ہے۔ اس پر جن کا رجحان دکنیات کی طرف راغب بھی ہوتا
وہ تصوف سے اپنا دامن بچاتے ہیں۔ مگر معین الدین جینا
ے نے اسی کو چنا اور تحقیق کی۔

کشف الاذکار کے واحد نسخہ کو معین الدین صاحب نے نہ
ن مرتب کیا ہے بلکہ ترتیبِ متن کے اصولوں کی روشنی میں ایک
ت ہی بسیط اور محققانہ مقدمہ ہمارے روبرو پیش کیا ہے۔ جس میں
ود کے موضوع کے ساتھ مکمل انصاف ملتا ہے۔ اس موضوع پر
جو بحث انھوں نے اپنے مقدمے میں پیش کی ہے وہ عام قاری کے لیے
سودمند ہے۔ کیونکہ موصوف نے اسلامی تصوف کے دقیق رموز و
نکات کو بڑی سلیس زبان میں سمجھایا ہے جس سے ان کے محققانہ شعور کا
اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ انھوں نے تصوف کے اقسام کو گوشوارے
بنا کر بڑے ہی سائنٹفک انداز میں سمجھایا ہے۔

ڈاکٹر قیوم صادق کی تصنیف "بیجاپور کی اردو مثنویاں" سے
اقتباس لے کر، "ایک گمراہ کن نسخہ" عنوان کے تحت بڑی مدلل بحث
کی ہے، اور ثابت کیا ہے کہ کشف الاذکار شاہ شریف کی مثنوی ہے
گویا انھوں نے مستقبل کے مورخ کو فریب سے بچایا ہے خود مرتب نے
صفحہ ۴۲ تا صفحہ ۴۸ پر اپنا ملمع پیش کیا ہے۔

مرتب نے مثنوی کشف الاذکار کا معراج العاشقین سے تقابلی
مطالعہ پیش کیا ہے اور نتائج اخذ کیے ہیں اور بتایا کہ معراج العاشقین
کا موضوع وسیع ہے۔ لیکن وہ حصہ جو کشف الاذکار کے موضوع سے
مماثل ہے، رسالہ کشف الاذکار کے منشور کی صدائے بازگشت معلوم
ہوتی ہے۔

اس مثنوی کا اصل فارسی مثنوی سے بھی تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے
عنوان کے تحت مرتب نے بڑے ہی عالمانہ انداز میں مثنوی کے کل
ابیات اس کی شروعات اور اختتام پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اور
فارسی مثنوی میں کون کون سی بیت نہیں ہیں، ان کا ذکر کیا ہے۔ نیز ترجم
شاہ شریف کے فارسی کے کن قوافی کو برتا اور کیوں برتا۔؟ اس کی
وجوہات بھی بیان فرمائی ہے۔ دکنی زبان کا مزاج تصوف کی اصطلاحات
کو برتنے کا انداز مگر تمام امور پر معلومات بہم پہنچائی ہے۔

اصل فارسی مثنوی دکن کے مشہور شاعر شیخ محمود خوش دہاں نے
لکھی ہے۔ شیخ صاحب پر تحقیق کام بھی ہوا ہے اس میں ضمنی طور پر ان کی
اس مثنوی اور ترجمے کا بھی ذکر آیا ہے۔

مرتب نے اس مثنوی کا لسانی تجزیہ بھی کیا ہے۔ کتابت و طباعت
گوارہ اور قیمت بھی مناسب ہے۔ سنسار پبلشنگ ہاؤس کے زیر اہتمام
یہ کتاب شائع ہوئی۔ یہ کتاب مکتبہ جامعہ سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

چار غزلیں

★ قتیل راجستھانی

۳۱۔ بی، بیتھم اپارٹمنٹ
۴۰۰۔ ایس وی۔ پی روڈ
بوریولی
بمبئی نمبر ۴۰۰۱۰۳

راستہ منزلیں ٹھکانہ بن
خود کو پہچان خود شناسا بن

راہ منزل ہو تیرے نقش قدم
اپنے کردار میں یگانہ بن

تیرا ظاہر بھی تیرا باطن ہو
حسن اخلاق سے تو ایسا بن

ہے یہ بہتر ترا عملوں سے
حرف ہی بن مگر دعا کا بن

تو گنا جائے گا مثالوں میں
پتھروں کے نگر میں شیشہ بن

پہلے اخلاق کے دریچے کھول
بعد اس کے قتیل جیسا بن

وہ نہ منزل سے مل سکے ہوں گے
راستے میں جو رک گئے ہوں گے

رات پھولوں سی کاٹنے والو!
خار سے دن بھی کاٹنے ہوں گے

آدمی کا غموں سے رشتہ ہے
زندگی ہے تو حادثے ہوں گے

پتھروں سے ہے سامنا ان کا
جن درختوں میں پھل لگے ہوں گے

روٹھ جانا ہے فطرتِ محبوب!
پیار ہوگا تو رت جگے ہوں گے

دل یونہی خوش نہیں ہوا ہے قتیل
سلسلے ٹوٹ کر جڑے ہوں گے

منظر جو صبا تو نے دیکھا اُسے کہہ دینا
رُت آگئی پھولوں کی اتنا اُسے کہہ دینا

برسی ہے گھٹا کھل کر گلشن ہو کہ جنگل ہو
ہے سبز لباسوں کا چرچا اُسے کہہ دینا!

جس موڑ پہ بچھڑے تھے شاید وہیں مل جائیں
یادوں کے دیئے روشن رکھنا اُسے کہہ دینا

چاہا تھا کہ لکھوں گا میں نام ترا جس پر
کاغذ ہے ابھی تک وہ کورا اُسے کہہ دینا

جس پیڑ کے سایے میں وعدے تھے نبھانے کے
ہر شام وہ ملتا ہے تنہا اُسے کہہ دینا

ہر بات قتیل اُس کی اب مان کے چلتے ہیں!
آسان سمجھتے تھے جینا اُسے کہہ دینا

حالات روکتے ہی رہے راستہ مرا
روشن لباسیوں نے بھرم رکھ لیا مرا

چہرے کی ہر خراش تبسم میں گم رہی
منھ دیکھتا ہی رہ گیا کل آئینہ مرا

میں دل کی بات کے مشکل میں پڑ گیا
رسوائیوں سے روز رہا سامنا مرا

یادوں کے آئینے میں نظر آ رہا ہے وہ
تنہائیوں سے ٹوٹ گیا سلسلہ مرا

لے آئی زندگی مجھے ساحل کی گود میں
طوفاں کی موج موج نے پیچھا کیا مرا

منزل کی راہ میں تھے کئی حادثے قتیل
مجھ کو بچا کے لے گیا حرفِ دعا مرا

غزلیں

• جلیل ساز
مومن پورہ، ناگپور ۱۸

دیکھیں لوگ فیصلہ کرکے
جان کو جسم سے جدا کرکے

آسماں اس قدر بلند نہیں
آپ اٹھیں تو حوصلہ کرکے

ہم کہ ستھرا طبھی ہیں رشتو بھی
پی گئے زہر مسکرا کرکے

خود کو محدود کر رہا ہے بشر
نت نئے دائرے بنا کرکے

پس شمس و قمر کچھ اور بھی ہے
دیکھئے تو نظر اٹھا کرکے

عظمتیں تو عمل سے ملتی ہیں
آدمی کو بنام دیں بانٹا
کس نے دیر و حرم بنا کرکے
عظمتیں تو عمل سے ملتی ہیں
آزمائیے دعا کرکے

کجروی گمرہی کا باعث ہے
چلئے سب سے قدم ملا کرکے
مسئلے خود بخود الگ آئیں گے
آپ دیکھیں تو گھر بنا کرکے

آج کے لوگ! اے خدا کی پناہ
خوش ہیں اپنوں کا دل دکھا کرکے
وقت ظالم بھی مہرباں بھی ہے
سازؔ دیکھا ہے آزما کرکے

نصیر پرواز
12/1092/12 گووند پورہ
بھوپال (ایم پی)

سکوت فکر و نظر محشر صدا ہے مجھے
مذاق شب کی طرح وقت سن رہا ہے مجھے
مرا شعور اندھیری تہوں میں پیاسا ہے
زمانہ خواب کی مانند دیکھتا ہے مجھے
میں لمحہ لمحہ کسی کرب کی گرفت میں ہوں
مری حیات کسی جرم کی سزا ہے مجھے
تعلقات کے سب راستے تمام ہوئے
وہ اجنبی کی طرح اب بھی سوچتا ہے مجھے
میں ایک قطرۂ بے نور چشم یاس میں ہوں
ترا خلوص وفا ہی سنوارتا ہے مجھے
لیے پھرا ہوں اسے رکھ کے خشک ہونٹوں پر
یہ کائنات کوئی حرف مدعا ہے مجھے
چھپی ہیں دیدۂ دنادیدہ وسعتیں مجھ کو
یہ آسمان و زمیں ایک نقش پا ہے مجھے
وہ اجنبی تھا مگر اپنے ذہن کی حد تک
بھٹکے ہاتھ مرا ساتھ لے گیا ہے مجھے
حقیقتاً میں کسی عہد کی وراثت ہوں
شعور لوح تفکر پہ کھینچتا ہے مجھے
میں لحظہ لحظہ فضا میں بکھرتا جاتا ہوں
وجود دست صبا خردہ فنا ہے مجھے
ہیں شہر شہر تذبذب کی آندھیاں عریاں
ہر ایک شخص بکھرتا ہوا لگا ہے مجھے
تمام عالم امکاں مری نظر پرواز
خود اپنے قلب کی وسعت سے ڈر لگا ہے مجھے

• نور شادانی
۸۶ - اودہ پور
فاطمہ مسجد، اندور

اب خزاں پہ نہ بہاروں پہ نظر جاتی ہے
اب تو بس ان کے اشاروں پہ نظر جاتی ہے

کتنے غمناک نظاروں پہ نظر جاتی ہے
گل سے ٹکرا کے جو خاروں پہ نظر جاتی ہے

زندگی پرنئے انداز سے ڈھلتی ہے نگاہ
جب تیرے شوخ اشاروں پہ نظر جاتی ہے

میرے حصے میں شب غم کی سیاہی ہے مگر
جانے کیوں چاند ستاروں پہ نظر جاتی ہے

چھیڑنا چاہتا ہوں نغمۂ الفت لیکن
دل کے ٹوٹے ہوئے تاروں پہ نظر جاتی ہے

دونوں عالم کے تسلسل کو سمجھنے کے لیے
اب ترے ناز کے ماروں پہ نظر جاتی ہے

نکھر نکھر جاتی ہے احساس خزاں سے نورؔ
جب کبھی مست بہاروں پہ نظر جاتی ہے

خمار جالندھری
آل انڈیا ریڈیو جالندھر

دو غزلیں

نتیجہ ہے یہی مجھ پر تمہاری مہربانی کا
زمانے کو ملا عنوان اک، تازہ کہانی کا

تمہارے ظلم پر دانستہ میں خاموش ہوں لیکن
غلط مطلب نہ لے لینا مری اس بے زبانی کا

اگر بھولے کبھی بھی ہونٹوں کو دو تکلیف جنبش دیں
ترنم پھوٹ نکلے آبشاروں کی روانی کا

بتاؤں کیا شب فرقت جو میرے دل پہ گزری ہے
نگاہوں میں ہے منظر تیرے اشکوں کی روانی کا

روا رکھیں گے کب تک آپ یہ ظلم و ستم آخر
کرو کچھ خوف لوگو اب بھی قہر آسمانی کا

جو آیا ہے جہاں میں جائے گا اک دن یقیناً وہ
ازل سے ہے یہی دستور اس دنیائے فانی کا

خمارِ خوش بیاں بھی محفلِ رنداں کی رونق تھے
مگر اب ولولے دل میں نہ وہ عالم جوانی کا

اک بتِ کافر پہ ایمان لائیں کیوں؟
سر یونہی پتھر سے ہم ٹکرائیں کیوں؟

رونق ہستی اسی کے دم سے ہے
گردشِ دوراں سے ہم گھبرائیں کیوں؟

اپنی فطرت ہی میں یہ شامل نہیں
بے بلائے اُن کے گھر ہم جائیں کیوں؟

باز یہ اُلفت سے آتا ہی نہیں
دل کو ہم بے فائدہ سمجھائیں کیوں؟

جو کبھی ہم کو نظر آتے نہیں
وہ ہمارے خواب میں بھی آئیں کیوں!

راس آجائے جنہیں غم آپ کا
وہ فریبِ عیش و راحت کھائیں کیوں؟

مشغلہ یہ اُن کو ہے بے حد عزیز
وہ جفا و جور سے باز آئیں کیوں!

بندہ پرور یہ بھی کوئی بات ہے
آپ باتوں سے مجھے بہلائیں کیوں!

عشق کا دم بھرنے والے اے خمار
عشق کے انجام سے گھبرائیں کیوں!

• بجیس الہ آبادی
مکان نمبر ۸۱۴-۳-۱۱، بلتے پلی،
حیدرآباد (اے پی) ۵۰۰۰۰۸

غزل

کردار جس کا ٹھیک نہیں آدمی کہاں
انسانیت کی اُس کو ہوا تک لگی کہاں

تہذیب جس کسی میں نہ ہو آدمی کہاں
اخلاق و بُردباری و شائستگی کہاں

محشر خرامیاں ہوں جہاں وہ گھڑی کہاں
لات منات کی ابھی محفل جمی کہاں

بے ربطگی، حیات کا عنوان بنے گی وہ
جس میں سرورِ زیست نہ ہو آدمی کہاں

طاقت نہیں ہے پاؤں میں اے زندگی بتا
اس دورِ بے بسی میں، مجھے لے چلی کہاں

جوبات وقت کی ہے، وہی ہوگی وقت پر
دورِ الم میں تذکرۂ سرخوشی کہاں

منصور کی مراد بر آئی ہے دار پر
عاشق کو دردِ عشق کی دولت ملی کہاں

اخلاق صرف لفظوں میں گم ہو کے رہ گئے
انسانیت کی بزم ابھی تک سجی کہاں

اخلاق صرف لفظوں میں اُلجھے ہوئے ہیں آج
انسانیت کی بزم میں سنجیدگی کہاں

کامل کمال عشق ابھی تو ہوا نہیں
بجیس کو دل لگانے کی لذت ملی کہاں

غزلیں

روشن لال روشن بنارسی
ڈی ۲۴/۱۱۲ اے راماپورہ وارانسی ۲۲۱۰۰۱ (یوپی) بھارت

محبت ہے ایمان جس آدمی کا
یہ جاں بھی اسی کی یہ دل بھی اسی کا

محبت سے ملنا، محبت سے رہنا
یہ ہے فرض سب پر، یہ حق ہے سبھی کا

کرے قتل بھی آدمی، آدمی کو
مسیحا بھی ہے آدمی، آدمی کا

بھلی بھی ہے دنیا، بری بھی ہے دنیا
ازل سے تصادم ہے نیکی بدی کا

حقیقت میں یہ زندگی، زندگی ہو
یہ مقصد ہے روشن میری شاعری کا

نہیں میرا کچھ میرا میخانہ نہیں
ساقیا! حقدار ہے کیوں میرا پیمانہ نہیں

بھکاری ایک روٹی کے لئے کرتے ہیں جنگ
درحقیقت یہ لڑائی فرقہ وارانہ نہیں

مصلحت کی روشنائی سے رقم جو کی گئی
وہ کہانی ہو کسی کی، میرا افسانہ نہیں

اہل دل اہلِ وفا، اہلِ جنوں کے ماسوا
باریابِ بزم جاناں کوئی فرزانہ نہیں

[illegible]
اور روشن واقف آداب [illegible] نہیں

شجاع الدین شاہد
نارتھ بمبئی سارٹنگ آفس اندھیری بمبئی ۹۳

دل درد آشنا بھی ہوا، غم شناس بھی
جینے کا یہ ہنر ہے میاں اپنے پاس بھی

ہم ظلمتوں کو تحفے میں دیتے ہیں اک چراغ
پھر آندھیوں میں رکھتے ہیں جلنے کی آس بھی

اب کے برس بھی خون کے بادل برس پڑے
لیکن نہ بجھ سکی ابھی دھرتی کی پیاس بھی

لمحے شبِ فراق کے کتنے طویل ہیں!
تیرا قیاس بھی یہی، میرا قیاس بھی

رنگینیاں جہان کی تم کو ملیں تو کیا
تنہائیوں کا درد ہے شاہد کے پاس بھی

ہم تو اہلِ عشق تھے کس نام سے جانے گئے
حسن والے تو زمانے میں خدا مانے گئے

دوست کیا، دشمن ہیں کیا، خون کے رشتے ہیں کیا
وقت آیا تو سبھی رشتے بھی پہچانے گئے

چاند سا اس کا بدن تھا، پھول سا نازک تھا وہ
ہم بھی تھے مدہوش اس پہ پھول برسانے گئے

قد بہت اونچا نہ تھا پر معجزہ ہو ہی گیا
فدا آور دل بھیڑ میں ہم بھی تو پہچانے گئے

شاہد خود کے واسطے جو بے طلب بننا پڑا
تب تری محفل میں ہم بے دست و پا مانے گئے

عبدالاحد ساز

سطح پہ آئے نہ بنے!

ہجر کا روگ لگا لیں گے اُسے چاہ کے ہم
واقعہ یہ ہے کہ بن روگ لگائے نہ بنے

اُف وہ بیمار سی رعنائی فسردہ سا جمال
کیفیت شعر میں اس حسن کی لائے نہ بنے

ادھ کھلی پلکوں میں مستی ہے کہ اِک سحرِ اَلم
ڈوب جائیں تو کبھی سطح پہ آئے نہ بنے

کون سا غم ہے اسے غم سے ہے کیا رُخ پہ نکھار
اس سے پوچھے نہ بنے، اُس کو بتائے نہ بنے

ناز میں آنکھوں میں پُر عجز پیامِ فرقت
اس کو دیکھیں، مگر آنکھ اس سے ملائے نہ بنے

جیسے کھو جائے کہانی میں کوئی شہزادی
نہ ملے وہ تو اُسے ڈھونڈھ کے لائے نہ بنے

عمر سکتے میں گنوا دیجئے، کیا کیجئے ساز
یہ وہ لمحہ ہے کہ بن عمر گنوائے نہ بنے

اب مسرت رُوح پر چھاتی نہیں
آتشِ غم دل کو پگھلاتی نہیں

ایک سی ظلمت کہ ظلمت کیا کہیں
روشنی ضد جس کی کہلاتی نہیں

کر دیا ہے شور نے یوں بے مزاج
خامشی سی شے پسند آتی نہیں

یہ تعقل، یہ گھٹن، یہ بے بسی!
اور یہ کہ رُوح گھبراتی نہیں

یہ محلّے، اپنے بچپن کے کھنڈر
جن سے اب کوئی صدا آتی نہیں

چھڑ اُٹھے دم بھر کہیں سازِ اجل
زندگی کی کوئی لے بھاتی نہیں

پھیکی زرد دوپہر

خاموش ڈھلی دوپہر،
آکاش کا کھویا کھویا نیل،
تھکی تھکی بیمار ہوا،
وقت کے چلتے ڈورے سے کچھ ویراں سُونے لمحے
احساس کی زرد لکیریں،
یاد کے پھیکے سائے،
دُور دور بے رنگ اُفق:
شانت سمندر کی صورت اِک پھیلا پھیلا سا ٹھہراؤ،
بجھا بجھا اچٹا سا دل،
اُدبی اُدبی سوچ،
اکتاہٹ میں اک انجانی وحشت سی
سُونے لمحوں کے باہر،
جیون کے گزرتے شور کا اِک بوجھل سا خیال
اس پھیلے پھیلے ٹھہراؤ کی بے کیفی میں
غرقابی سی
ویرانی سی

دوسری عالمی مراٹھی کانفرنس ، گورنر کا نیک خواہشات کا پیغام

مہاراشٹر کے گورنر شری سی ، سبرامنیم نے ماریشس میں موکا میں شروع ہونے والی دوسری عالمی مراٹھی کانفرنس کے بابت اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا ہے
گورنر موصوف نے اپنے پیغام میں فرمایا کہ دنیا میں مراٹھی بولنے والے عوام کو ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر آنے کا سنہری موقع ہے ۔ جہاں وہ اپنے خیالات کا تبادلہ میری ادب ، نظریات اور مشترکہ طور پر ادبی پروگرام کا انعقاد کرکے مراٹھی زبان اور ثقافت کو مالا مال کر سکتے ہیں ۔

پوسٹ آفس ڈپازٹ کی شرح سود میں اضافہ

حکومت مہاراشٹر نے پوسٹ آفس کے تین اور پانچ سال ٹائم ڈپازٹ اکاؤنٹس کے شرح سود پر بڑھوتی کی ہے بہ نظر ثانی یکم اپریل ۱۹۹۱ء سے کی گئی ہے اس بات کا اعلان ڈائرکٹوریٹ آف سمال سیونگ حکومت مہاراشٹر نے کیا ۔
تین سالہ ڈپازٹ اکاؤنٹس کے مقابلہ میں شرح سود کو ۱۱ فیصد تک کر دیا گیا ہے جبکہ اس سے قبل یہ ۱۰ء۵ فیصد تھی ۔ پانچ سالہ ڈپازٹ اکاؤنٹس کو ۱۱ فیصد سے بڑھا کر ۱۱ء۵ فیصد تک کر دیا گیا ہے ۔

پانچ سالہ ریکرنگ ڈپازٹ اسکیم بھی یکم اپریل ۱۹۹۷ء سے ۳۱ / مارچ ۱۹۹۱ء کے دوران ایسے اکاؤنٹس میں بھی فیصد کی بڑھوتی کی گئی ہے ۔

عراق کے لیے ضروری اشیاء کی فراہمی
ہندوستانی جہاز روانہ

۳۰ / اپریل کی شب کو ضروری اشیاء کے ہمراہ انڈین ریڈ کراس سوسائٹی نئی دہلی کے ذریعے شپنگ کارپوریشن آف انڈیا چارٹیڈ کا اوشین لائن بمبئی سے عراق کے لیے روانہ ہوگیا ۔ اس جہاز میں آٹا ، میدہ ، چاول ، شکر ادویات بسکٹ ، چائے اور دودھ پاؤڈر جیسی اشیاء جنگ سے متاثرہ لوگوں اور مہاجرین کے لیے روانہ کی گئی ہیں ۔

صنعتی تنازعہ :

حکومت مہاراشٹر نے میسرز ریلوگیس اور جنرل سروس اور میسرز لارڈس گیس سروس بمبئی کے آجرین اور ان کے ملازمین کے مابین صنعتی تنازعہ (دونوں لمیٹڈ کے) کو شری ایم . آر . بھوپے کی صنعتی عدالت میں تصفیہ کی غرض سے سپرد کر دیا ہے ۔
اسی طرح میسرز راج کمل کلامندر پرائیویٹ لمیٹڈ پریل اور ان کے ملازمین کے مابین صنعتی تنازعہ کو شری اے ، ڈی ، دیشپانڈے کی صنعتی عدالت بمبئی میں تصفیہ کی غرض سے سپرد کر دیا ہے ۔

ریاست کی سات یونیورسٹیوں میں اُردو شعبے، ماہم میں اُردو گھر کی تعمیر

اُردو اکادمی کے جلسۂ تقسیم انعامات میں وزیر ہاؤسنگ پروفیسر جاوید خان کا اعلان

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکیڈمی کے جلسۂ تقسیم انعامات کے موقعہ پر وزیر ہاؤسنگ پروفیسر جاوید خان تقریر فرمارہے ہیں۔ آپ کے داہنی جانب وزیر مملکت برائے توانائی شری سید احمد اور بائیں جانب شری اختر الایمان اور شری ارون گجراتی وزیر مملکت برائے جنرل ایڈمنسٹریشن نظر آرہے ہیں۔

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کے تعاون سے ریاست کی سات یونیورسٹیوں میں اردو کے خصوصی شعبے قائم کئے جائیں گے۔ یہ اعلان وزیر ہاؤسنگ واوقاف اور مہاراشٹر اردو اکادمی کے چیئرمین پروفیسر جاوید خان نے کیا۔ اکادمی کے سالانہ جلسۂ تقسیم انعامات کے موقعہ پر اپنی صدارتی تقریر میں وزیر موصوف نے مزید بتایا کہ اردو گھر کی تعمیر کے لیے ماہم میں ایک قطعہ آراضی حاصل کرلیا گیا ہے اور یہ کہ مہاراشٹر ہاؤسنگ بورڈ کے ذریعہ اردو گھر کی تعمیر دس ماہ میں مکمل کرلی جائے گی۔ پروفیسر جاوید خان نے کہا کہ اس اردو گھر میں لائبریری وسیع وعریض ہال اردو ادبا و شعراء کے قیام گاہ اور ایک آڈیٹوریم ہوگا۔

اس موقعہ پر پروفیسر جاوید خان نے بطور خاص کہا کہ ضلع پریشد کی اردو پرائمری اسکولوں کی نگرانی کے لیے

اردو انسپکٹرس آف ایجوکیشن کی تقرری کے لیے سرکاری سطح پر تگ و دو جاری ہے۔ انہوں نے اردو عوام کو تیقن دلایا کہ ایس ایس سی اور ایچ ایس سی کے اردو ذریعہ تعلیم کے پرچے اردو ہی میں چھپا کریں گے۔ انہیں کسی اور زبان میں چھاپنے کی سرکار کی کوئی پالیسی نہیں ہے۔

اردو اکادمی کے وائس چیئرمین اور وزیر مملکت برائے توانائی و اوقاف جناب سید احمد نے اپنی تقریر میں اردو والوں سے اپیل کی کہ وہ اپنے بچوں کو اردو ذریعہ تعلیم سے ہی تعلیم دلوائیں تاکہ اردو پڑھنے لکھنے اور بولنے والی نسل برقرار رہے۔

وزیر مملکت برائے جنرل ایڈمنسٹریشن شری ارون گجراتی نے یقین دلایا کہ اردو گھر کی تعمیر میں وہ ہر ممکن تعاون کریں گے انھوں نے یہ بھی کہا کہ وہ اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے لیے ہر آن تیار ہیں۔

ممتاز و معروف شاعر جناب اختر الایمان نے اپنے ہاتھوں سے انعامات و اسناد تقسیم کرنے کے بعد اپنی تقریر میں کہا کہ اردو ادیبوں کے ساتھ ہر دور میں زیادتی ہوتی رہی ہے۔

اردو اکادمی کے ممبر سکریٹری جناب یوسف ناظم نے اپنی تعارفی تقریر میں انکشاف کیا کہ اردو اکاڈمی کے تعاون سے مراٹھواڑہ یونیورسٹی میں جون سنہ ۱۹۹۱ء سے اردو کے خاص شعبہ کا آغاز ہونے جا رہا ہے جس کے لیے اکادمی نے پانچ لاکھ روپے ادا کر دیئے ہیں۔

اکادمی کی جوائنٹ سکریٹری محترمہ نورالعین علی نے رسم شکریہ ادا کی۔

منترالیہ کے کمیٹی روم میں منعقدہ مہاراشٹر اردو اکادمی کے اس سالانہ جلسۂ تقسیم انعامات میں انعام یافتگان کی جانب سے ممتاز شاعر قاضی سلیم نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اردو لکھنا پڑھنا اور بولنا بھی کسی اعزاز سے کم نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ انعام میں رقم کو کوئی اہمیت نہیں ہوتی بلکہ اہمیت تو سند کی ہوا کرتی ہے۔

اس جلسۂ تقسیم انعامات میں جناب اختر الایمان کے دست مبارک سے انعامات و اسناد تقسیم کیے گئے قومی سطح کا تیس ہزار روپے کا انعام رشید حسن خان (دہلی) ریاستی سطح کا پچیس ہزار روپے کا انعام قاضی سلیم (اورنگ آباد) اور اردو مراٹھی خدمات کے لیے پندرہ ہزار روپے کا انعام ڈاکٹر یونس اگاسکر (بمبئی) کو دیا گیا۔ علاوہ ازیں سات ہزار روپے کے انعامات حامد اللہ ندوی، شبیر آصف اور انور قمر کو جبکہ پانچ ہزار روپے کے انعامات ڈاکٹر خورشید نعمانی، تاجدار تاج، چار ہزار روپے کے انعامات عبدالباری مومن، رشید اعجاز، م. ناگ، محمد اجمل کلیم، شمس اعجاز، امجد عثمان، محمد علیم، ظفر مہدی اور تین ہزار روپے کا انعام محمد یوسف انصاری ۔ اور دو ہزار کا انعام رفیق احمد کو ان کی تخلیقات اور صحافتی خدمات کے عوض میں دیئے گئے۔

رشید حسن خان، ساجد رشید، عبدالاحد ساز کو بھی انعامات سے نوازا گیا۔ علاوہ ازیں ایس ایس سی ایچ ایس سی اور بی۔ اے میں امتیازی نشانات سے کامیابی حاصل کرنے والے گیارہ طلبہ و طالبات کو بھی انعام و اسناد سے نوازا گیا۔

شہر کی علمی، ادبی، صحافتی شعبوں کی اہم شخصیات نیز مولانا ضیاء الدین اور اردو اکادمی کے ممبران نے اس تقریب میں بطور خاص شرکت فرمائی۔ امسال کل ایک لاکھ اکہتر ہزار روپے کے انعامات تقسیم کیے گئے

مہاراشٹر لاٹری عوام اور ریاست کی بہبود کے لیے

اگر آپ نے مہاراشٹر اسٹیٹ لاٹری میں انعام کیا ہے تو آپ کو لکھ پتی بننے کے مواقع میسر ہوسکتے ہیں اگر آپ نے رقم نہیں حاصل کی تو آپ کو اس پریشانی نہیں ہونی چاہیے کیونکہ مہاراشٹر اسٹیٹ لاٹری کو حاصل کئے گئے خالص منافع کو مہاراشٹر کی فلاح و بہبود پر خرچ کیا جاتا ہے۔ یہ بات کسی دوسری لاٹری کے خریدنے پر صادق نہیں آتی ہے۔ اس لیے شری دھرم راج واتھیکر، ڈائریکٹر آف مہاراشٹر اسٹیٹ لاٹریز نے عوام سے اپیل کی ہے کہ وہ صرف مہاراشٹر اسٹیٹ لاٹری کے ٹکٹ خرید کر مہاراشٹر اسٹیٹ کی خوشحالی میں اپنا بھرپور تعاون دیں۔

ڈائریکٹر آف لاٹریز نے ایک وضاحتی بیان میں فرمایا کہ ممبائی لکشمی لاٹری جو کہ حال ہی میں جاری کی گئی ہے وہ مہاراشٹر اسٹیٹ لاٹری نہیں ہے یہ بات اشتہارات اور دیگر پبلسٹی میڈیا کے ذریعہ علم میں آئی ہے کہ ممبائی لکشمی نامی ایک نئی لاٹری وجود میں آئی ہے کچھ عبارت اور اعداد ممبائی لکشمی کے ٹکٹوں پر مراٹھی زبان میں چھپی ہے جس سے عوام کو یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ مذکورہ لاٹری مہاراشٹر اسٹیٹ لاٹری کا ایک حصہ ہے۔

ڈائرکٹوریٹ آف اسٹیٹ لاٹریز کو کچھ موصول ہونے والے خطوط کے ذریعہ یہ بات علم میں آئی کہ کچھ لاٹری ایجنٹس گاہکوں کو بہکانے کے لیے ممبائی لکشمی لاٹری کو مہاراشٹر اسٹیٹ لاٹری کا ایک حصہ بتلانے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔

ڈائرکٹر آف مہاراشٹر اسٹیٹ لاٹریز نے اس لیے یہ وضاحت جاری کی ہے کہ یہ بتایا جاسکے کہ ممبائی لکشمی لاٹری کا مہاراشٹر اسٹیٹ لاٹری سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

حکومت نے ایل آئی سی کے قرض کی ادائیگی کی ذمہ داری لی

حکومتِ مہاراشٹر نے لائف انشورنس کارپوریشن آف انڈیا کی ۱۳۱۴۲۱ر لاکھ روپے کے ضلع پریشد کو دیئے گئے ایل آئی سی قرض کی ادائیگی اور نئی دیہی پائپ فراہمی آب اسکیم سال ۱۹۹۰۔۹۱ء کی ذمہ داری لی ہے۔

اسکیم سے فیضیاب ہونے والے ضلعوں کے نام اور قرض کی رقم لاکھ روپے میں اس طرح ہے:
رائے گڑھ: ۶۳،۵۵ ۔ رتناگیری ۴۰،۵۴ ۔ سندھودرگ ۶،۹۵ ۔ ناسک ۱۲۶،۵۰ ۔ دھولے ۱۶۱،۶۰ ۔ جلگاؤں، ۱۳۹،۴۳ ۔ احمد نگر ۱۶،۳۵ ۔ پونے ۱۲۶،۲۸ ۔ ستارا: ۱۱۳،۰۵ ۔ سانگلی: ۹۵،۰۴ ۔ شولاپور: ۸۶،۷۷ ۔ کولہاپور: ۱۹۳،۸۱ ۔ اورنگ آباد ۲۱،۸۲ ۔ جالنا، ۳۱،۰۵ ۔ پربھنی: ۲۲،۵۹ ۔ عثمان آباد ۱۴،۰۵ ۔ لاتور: ۴۰،۷۳ ۔ امراؤتی: ۶۶،۸۸ ۔ ایوت محل، ۱۵،۴۴۔

شری رام تولانی

حکومتِ مہاراشٹر نے شری رام تولانی، ایم ایل سی کو شری رمیش دوبے، ایم ایل اے کی جگہ ریاست میں کاسمیٹکس اینڈ سوپ مینوفیکچرنگ انڈسٹری کے شیڈول ایمپلائمنٹ کی اقل ترین اجرت کا چیئرمین مقرر کیا ہے شری دوبے کی ریاستی کابینہ میں شمولیت کے بعد یہ جگہ خالی ہوگئی تھی۔

کپاس کی حصولی

کپاس کی حصولی اسکیم کے تحت ریاست کے
ن میں ۲۲ اپریل ۱۹۹۱ء تک ۸۴،۸۳۲،۶۵،
، کپاس خریدی اور ۸۰۷ ، ۷۰ ، ۱۲ گانٹھیں بنائی

زون کے ترتیب سے خریدی گئی کپاس کوئنٹل میں اور
ی گانٹھیں اس طرح ہیں:

ناگپور:	۱۰۳۸۲۵۳	(۱۹۶۳۴۹)
ایوت محل:	۱۰۶۳۵۷۲	(۲۰۹۸۰۱)
آکولہ:	۸۹۸۳۶۵	(۱۸۵۴۸۷)
امراوتی:	۹۴۷۷۵۵	(۱۸۳۶۶۲)
جامگاؤں:	۳۳۷۴۵۸	(۶۵۴۶۵)
ورنگ آباد:	۶۴۹۸۸۲	(۱۱۰۹۸۸)
پربھنی،	۱۰۸۳۴۲۵	(۲۱۲۹۵۱)
ناندیڑ:	۳۳۸۵۲۲	(۶۵۶۲۹)
بلگاؤں:	۲۰۷۱۰۲	(۳۶۵۵۸)
دھولے:	۶۴۵۵	(۷۲۲)
بلٹن،	۱۴۰۴۳	(۳۱۹۵)

رسمی ملاقات

مسٹر ڈیوڈ جے فٹن، فرسٹ سکریٹری، برٹش
ی کمشنر یٹ، نئی دہلی نے وزیر مالیات مہاراشٹر
رام راؤ آدیک، سے منترالیہ میں ۳ مئی کو
ت کی۔
شری پی۔ بی راجگون، پرنسپل سکریٹری (مالیات)
س موقع پر موجود تھے۔

قانون کی اشاعت

حکومت مہاراشٹر نے مہاراشٹر کیروسین ڈیلرس لائسنسنگ (تیسری ترمیم) قانون بابت ۱۹۹۱ء کو ریاستی گزٹ غیر معمولی کے حصہ IV-A مورخہ ۱۲ اپریل ۱۹۹۱ء میں شائع کر دیا ہے۔

انتظامی منظوری:

حکومت مہاراشٹر نے ضلع بیڑ کے تعلقہ کیج میں کیج۔ دھاوڑ علاقائی پائپ فراہمی آب کے کام کی انتظامی منظوری دے دی ہے جس پر لاگت کا تخمینہ ۸۰۰، ۶۵، ۴۷، ۹ روپے ہے۔

فراہمی آب اسکیم

حکومت مہاراشٹر نے ضلع پونے کے تعلقہ حویلی میں منجری (بی، کے) دیہی فراہمی آب اسکیم کے کام کی انتظامی منظوری دیدی ہے جس پر لاگت کا تخمینہ ۰۰۰، ۱۵، ۴۲، ۱ روپے ہے۔

ضلع پریشد قوانین

حکومت مہاراشٹر نے مہاراشٹر ضلع پریشد ڈسٹرکٹ سروس (بھرتی) (تیسری ترمیم) قوانین بابت ۱۹۹۱ء کو حکومت کے گزٹ غیر معمولی مورخہ ۸ اپریل ۱۹۹۱ء کے حصہ IV-B میں شائع کر دیا ہے۔

خبریں ۔ تصویروں میں

صدر جمہوریہ ہند شری آر۔ وینکٹ رمن کو یونیورسٹی آف فلپائنس کی طرف سے گذشتہ دنوں منیلا میں نائب صدر فلیپ منڈیلا کے ہاتھوں "اعزازی ڈاکٹریٹ" کی ڈگری دی گئی۔ اسی موقع پر لی گئی تصویر۔

مہاراشٹر کا سکار کلیان منڈل کے للت کلا بھون میں نصب کیے گئے کمپیوٹر کا افتتاح، وزیر مملکت برائے روزگار شری ارون مہتہ نے کیا۔ اس موقع پر لی گئی اس تصویر میں شری مدھوکر کو لتے بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

ب چیمبر آف کامرس انڈسٹری کی طرف سے ۹ اپریل ۱۹۹۱ء کو بمبئی میں خلیج کے بحران کے بعد ایکسپورٹ کے مواقع کے موضوع
سیمینار کا اہتمام کیا گیا جس کا افتتاح وزیر مالیات مہاراشٹر شری رام راؤ آدک نے کیا۔ اسی موقع پر لی گئی یہ تصویر ہے۔

ے یکجہتی مہاراشٹر شاخ کی جانب سے ۱۲ اپریل کو بمبئی کے شیواجی پارک میں "عید ملن" کی تقریب منعقد کی گئی
نع پر لی گئی اس تصویر میں وزیر ہاؤسنگ پروفیسر جاوید خان تقریر کر رہے ہیں۔ ان کے بائیں جانب بمبئی کے لئے مصر
ل جنرل شری بلال آرمونا س، مہاراشٹر کے صدر پروفیسر اقبال گایا، ایران کے قونصل جنرل شری علی
سابق وزیر شری دادا صاحب روپوتے اور سابق ایم۔پی شری کا شرد دیکھے نظر آ رہے ہیں۔

قارئین کی رائے

قیصر عثمانی
۶ء ۔ محبوبی بلڈنگ (سامنے)
پشپا پارک، ملاڈ (ویسٹ) بمبئی ۔ ۴۰۰۰۹۷

اس مرتبہ (شمارہ ۱۰ جنوری ۱۹۹۱ء) اس لحاظ سے بھی قابلِ تعریف ہے کہ اس میں شعر و ادب سے متعلق کئی خوبصورت نگارشات بھی شامل ہیں۔ یوسف ناظم نے اپنے معلومات افزا مضمون کے ذریعہ کرشن چندر کے طنز و مزاح کے نیم پوشیدہ گوشے پر اچھی خاصی روشنی ڈالی ہے اور مشتاق مومن نے ندا فاضلی کی شاعری کے اچھوتے رنگ سے واقف ہونے کا موقع فراہم کیا ہے۔ سلام بن رزاق کا مراٹھی سے ترجمہ " مدرسہ " اور سعادت حسن منٹو کے ادب پارے بھی پڑھنے کی چیزیں ہیں۔ منظومات کا حصہ بھی متاثر کرتا ہے۔
اس کامیاب شمارے کے لیے دلی مبارکباد قبول کیجئے۔

رفیق جعفر
ملاڈ، بمبئی ۹۵

جون ۹۰ء کے شمارے میں میری کہانی " مکڑی فرد جال سماج " کی اشاعت عمل میں آئی تھی جس میں میرا پتہ بھی شائع ہوا تھا۔ کہانی کو مختلف مقامات پر رہنے والوں نے پسند کیا۔ یہ قومی راج کی مقبولیت کا ثبوت ہے اور میں اس رسالہ کے ذریعہ ان تمام قارئین کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

جولائی ۹۰ء کے شمارے میں محبوب راہی کی کتاب " گل بوٹے " پر میرا تبصرہ شائع ہوا ہے جس میں کہیں کہیں لفظوں کی ترتیب بدل گئی ہے۔ پتہ نہیں یہ کیسے ہوا۔

" قومی راج " جب سے ماہنامہ کی صورت میں شائع ہونے لگا ہے منتخب مواد شائع ہو رہا ہے۔ جس کی علمی اور ادبی اہمیت مصدقہ ہے۔

جولائی ۹۰ء کے شمارے میں خورشید نعمانی کا مضمون " ادب میں ترسیل " غور طلب ہے اور قابلِ ستائش ہے۔ سید احمد قادری صاحب کا مضمون " غالب اور قرآن " اپنی نوعیت کا بہترین مضمون ہے۔ سی، ایل کاوش صاحب اور محمد خالد عابدی صاحب کی تخلیقات پسند آئیں۔ نجمہ شیخ کا مضمون معلوماتی ہے جسے میں نے دو بار پڑھا اور محفوظ کر لیا۔ " سینٹرل لائبریری، بمبئی " کے تعلق سے اتنا اچھا مضمون میری نظر سے پہلی بار گذرا ہے۔ بہرحال اس بار نثری حصہ، شعری حصہ پر بھاری ہے۔
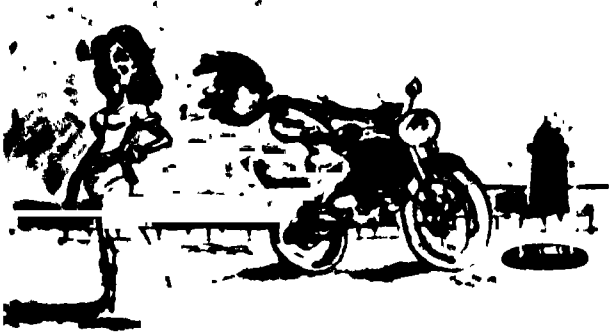
اطمینان کرلیں کہ آپ کی نظریں کہاں ہیں اور جانا کس طرف

قومی راج

سابق وزیر اعظم شری راجیو گاندھی کو خراج عقیدت

10/6

قومی راج

۱۰ر جون ۱۹۹۱ء

ندی کا ور مراٹھی میں ہر ماہ کی یکم اور پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، انگریزی، گجراتی، سندھی اور اردو زبان میں ہر ماہ کی ۱۰ ر تاریخ کو شائع ہوتا ہے

الانہ ۲۵ روپے قیمت فی شمارہ ۳ روپے

شمارہ ۶ ۱۸

بلشر ۔۔۔۔ شری ارُن پاٹنکر

اسک ایڈیٹر ۔۔۔۔ آر۔ جی۔ مایڈیو

ایڈیٹر ۔۔۔۔ فیروزہ فیاض خان

سیل زر کا پتہ

اسسٹنٹ ڈائریکٹر (ایڈمنسٹریشن)
ڈائرکٹوریٹ جنرل آف انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز
گورنمنٹ آف مہاراشٹر، بیرک نمبر ۱۹
مقابل سروچی بلڈنگ، نزد منترالیہ، بمبئی ۴۰۰۰۲۱
Tel 2021530

سلت کا پتہ

ایڈیٹر قومی راج
ڈائرکٹوریٹ جنرل آف انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز
گورنمنٹ آف مہاراشٹر
۱۷واں منزل، نیو ایڈمنسٹریٹو بلڈنگ،
مقابل منترالیہ بمبئی ۴۰۰۰۳۲
Tel. Nos. { 2 2

اس شمارے میں

بم دھماکے میں راجیو گاندھی ہلاک

مدراس سے ۵۰ کلومیٹر دور سری پیرمبدور نامی مقام پر ۲۱ مئی شب ۱۰ بجکر ۲۰ منٹ پر ایک طاقتور بم پھٹنے کے سبب شری راجیو گاندھی اور دیگر افراد ہلاک ہوگئے۔ سابق وزیراعظم شری راجیو گاندھی اپنی انتخابی مہم کے دو روزہ دورہ پر یہاں پہنچے تھے۔ دھماکے کے نتیجے میں ان کے چہرے کے پرخچے اڑ گئے اور بقیہ جسم بری طرح مجروح ہوگیا۔ فوراً ہی جلسہ گاہ میں بھگدڑ مچ گئی اور لوگ راجیو گاندھی کو تلاش کرنے لگے۔

شری راجیو گاندھی لوک سبھا اور تمل ناڈو اسمبلی انتخابات کے سلسلے میں ایک عوامی اجتماع سے خطاب کرنے کے لئے پیرمبدور پہنچے تھے۔ شب ۱۰ بجکر ۲۰ منٹ پر یہ واردات رونما ہوئی۔ اس وقت اسٹیج پر راجیو گاندھی کو گلدستے اور شالیں پیش کی جارہی تھیں۔

سابق وزیراعظم طے شدہ وقت سے ایک گھنٹہ تاخیر سے پہنچے تھے۔ بم اسٹیج سے چند گز کے فاصلے پر پھٹا۔

دھماکے کے فوراً بعد وہاں پر موجود ہر شخص راجیو گاندھی کی فکر میں غلطاں تھا۔ تب ہی ایک اعلیٰ پولیس افسر نے لہو میں تر ان کی لاش کی شناخت کی اور فوری طور پر پورے علاقے کے محاصرہ کا حکم دے دیا۔ چند ثانیوں میں جب کے موبیلار وہاں پہنچے اور انہوں نے نعش کو ایک کپڑے میں لپیٹ کر وہاں سے منتقل کر دیا۔

جلسہ گاہ جانے سے قبل شری راجیو گاندھی نے پیرومبدور کی ایک شاہراہ پر نصب ان کی والدہ مسز اندرا گاندھی کے مجسمے کو پھولوں کے ہار پہنائے تھے۔

دیگر ہلاکین میں سیکوریٹی کے ۲ افسران اور تین خواتین بھی شامل ہیں۔ عوامی جلسہ کا مقام جہاں مذکورہ واردات رونما ہوئی مین روڈ سے ملحق ایک کھلا میدان تھا۔

کانگریس (آئی) صدر آندھرا پردیش سے اپنے دورے سے پہنچے تھے۔ اس دوران ان کی اہلیہ سونیا گاندھی اور بچے پرینکا اور راہل ان کے ہمراہ نہیں تھے۔

جس وقت شری راجیو گاندھی کی لاش کی شناخت ہوئی، وہاں موجود کانگریس کے بے شمار حامی زار و قطار رونے لگے

تاثرات

شرد پوار:

وزیر اعلیٰ شرد پوار نے شری راجیو گاندھی کے قتل کے سلسلے کو نا قابلِ بیان صدمہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ شری راجیو گاندھی کا قتل ملک اور ملک کی نئی نسل کے لیے ایک نا قابلِ تلافی نقصان ہے انہوں نے مزید کہا کہ اس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ملک تشدد کی کس قدر شدید لہر کی لپیٹ میں ہے۔

سوشیل کمار شندے:

مہاراشٹر کے شہری ترقیات کے وزیر سوشیل کمار شندے نے شری راجیو گاندھی کے قتل کو جمہوریت کا قتل بتایا ہے۔

سبرامنیم سوامی:

مرکزی وزیر تجارت و انصاف سبرامنیم سوامی نے کانگریس (ا) صدر راجیو گاندھی کے قتل کو قوم دشمن عناصر کی بزدلانہ حرکت سے تعبیر کیا۔ کہا کہ حکومت گناہگاروں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کرے گی۔

وی این گاڈگل:

کانگریس (ا) رہنما وی این گاڈگل نے شری راجیو گاندھی کے قتل پر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا کہ شری راجیو گاندھی کے قتل سے ملک نے ایسے لیڈر کو کھو دیا جو اکیلے ہی ملک کی سالمیت اور اتحاد برقرار رکھنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

گورنر مہاراشٹر:

مہاراشٹر کے گورنر ڈاکٹر سی سبرامنیم نے شری راجیو گاندھی کے قتل کو ایک قومی سانحہ قرار دیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس بحرانی دور میں ملک نے ایک عظیم قومی رہنما کو کھو دیا ہے۔

وسنت ساٹھے:

سینئر کانگریس (ا) لیڈر اور سابق مرکزی وزیر شری وسنت ساٹھے نے راجیو گاندھی کے قتل پر گہرے صدمے کا اظہار کیا ہے۔ ان کے قتل کو ملک اور ملک کی جمہوریت کے لیے ناقابلِ تلافی نقصان بتایا۔

پی اپیندر:

نئی دہلی سے موصولہ اطلاعات کے مطابق قومی محاذ تلگو دیشم رہنما پی اپیندر نے مدراس کے قریب بم دھماکے میں شری راجیو گاندھی کے قتل پر گہرے صدمے کا اظہار کیا۔ اس مذموم حرکت کی شدید مذمت کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ قوم ایک اہم ترین رہنما سے محروم ہو گئی ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ جمہوریت میں اس قسم کی حرکت کی گنجائش نہیں ہے۔

مرلی دیورا:

بمبئی ریجنل کانگریس (ا) کمیٹی کے صدر مرلی دیورا نے راجیو گاندھی کے قتل پر دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ شہر بمبئی میں ۶ لوک سبھا حلقہ انتخاب میں کانگریس امیدواروں کی الیکشن مہم روک دی گئی ہے۔ انہوں نے کہا کہ کل پُر امن طور پر بمبئی بند رہے گی۔

پروفیسر جاوید خان:

ریاستی وزیر ہاؤسنگ پروفیسر جاوید خان نے کہا کہ فرقہ پرستوں کی سازش رہی ہے کہ ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کر لیے جائیں تاکہ سیکولرزم کو ختم کیا جا سکے۔ شری راجیو گاندھی کا قتل ملک کی تاریخ میں سب سے گھناؤنا کام ہے اور رہتی دنیا تک اس طرح کی تخریبی اور انسانیت دشمن حرکات کو نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا رہے گا۔

سید احمد:

وزیر مملکت برائے توانائی شری سید احمد نے کہا کہ جو شخص آج سیکولرزم کے لیے لڑ رہا تھا۔ اس کو قتل کر دیا گیا۔ یہ اس ملک کا سب سے بڑا المیہ ہے کیوں کہ ملک کو ایک رکھنے اور سیکولرزم کو برقرار رکھنے میں نہرو، اندرا اور راجیو گاندھی اور ان کے خاندان نے جو قربانیاں دی ہیں اسے ہندوستانی بھول نہیں سکتے۔ سید احمد نے کہا کہ کل ناگپاڑہ بند رہے گا۔

سلیم زکریا:

چیئرمین حج کمیٹی سلیم زکریا نے کہا کہ ملک اور مستقبل کے لیے راجیو گاندھی ایک روشن چراغ تھے اور ہندوستانیوں کو ملک سے کافی ساری امیدیں وابستہ تھیں کہ راجیو گاندھی کی رہنمائی میں ایک مستحکم حکومت قائم ہو۔

۲۲ مئی کو دہلی کے ہوائی اڈے پر فضائیہ کے ایک خصوصی طیارے کے ذریعے بدھ کے دن مقتول راجیو گاندھی کی لاش لائی گئی۔ صدر شری آر وینکٹ رامن نائب صدر شری شنکر دیال شرما اور وزیراعظم شری چندر شیکھر ہوائی اڈے پر موجود تھے۔

آخری دیدار

سابق وزیراعظم راجیو گاندھی کی لاش مدراس سے زبردست حفاظتی بندوبست کے درمیان ہندوستانی فضائیہ کے ایک خصوصی طیارے کے ذریعے دہلی لائی گئی۔ صبح ۱ بجکر ۲۰ منٹ پر پالم ہوائی اڈے پر پہنچتے ہی لاش حاصل کرنے والوں میں صدر جمہوریہ شری آر وینکٹ رمن، وزیراعظم شری چندر شیکھر شامل تھے۔ دل شکستہ شریمتی سونیا گاندھی اور بیٹی پرینکا لاش کے ہمراہ تھیں۔ ہوائی اڈے پر موجود کانگریس (ا) لیڈروں میں شری پی شیو شنکر، شری شرد پوار، شری اے آر انتولے، شری سنیل دت، شری بھجن لال، شری ایچ کے ایل بھگت اور شریمتی نجمہ ہبت اللہ شامل تھیں۔
صدر جمہوریہ شری آر وینکٹ رمن، وزیراعظم اور شری بھگت نے طیارے سے لاش حاصل کی تھی۔

اس کے بعد شری راجیو گاندھی کی لاش ایک ایمبولنس کے ذریعے سخت حفاظتی بندوبست کے درمیان پوسٹ مارٹم، اصلاح اور مسالہ لگاکر محفوظ رکھنے کے لیے آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز میں لائی گئی۔

سیکڑوں کانگریسی ورکروں نے ہاتھوں میں سیاہ جھنڈیاں لیے بسوں اور ٹیمپو میں سفر کرتے ہوئے انسٹی ٹیوٹ کے باہر، مسز گاندھی کی سرکاری قیام گاہ، اور جنپتھ اور تین مورتی ہاؤس پر قتل کے خلاف احتجاجی مظاہرہ کیا۔

راجیو گاندھی کی لاش صبح ۳۰ ۔ ۷ کے لگ بھگ تین مورتی لائی گئی۔ اب لاش دو دنوں تک تین مورتی ہاؤس میں رکھی گئی، تاکہ عوام اپنے رہنما کا آخری دیدار کر سکیں۔

سوگواروں کے امنڈتے ہوئے سیلاب نے یہاں تیز ہاؤس پر ایک کے بعد ایک کانگریس (ا) صدر کی ... سے درشن کئے جب کہ حکومت نے آنجہانی رہنما کی یاد میں دنوں کے سرکاری سوگ کا اعلان کیا ہے۔

لاش جواہر لال نہرو کی سرکاری قیام گاہ تین مورتی ہاؤس جانے سے کئی گھنٹے قبل ہزاروں سوگوار وزیراعظم کی آخری دیکھنے کے لیے وہاں جمع ہو گئے تھے۔

کابینہ نے جس کا اجلاس شری وینکٹ رمن کے ساتھ ایک طویل گفتگو کے بعد منعقد ہوا، شری گاندھی کے قتل کو ایک وہ بزدلانہ فعل قرار دیا۔

پوری ہندوستانی قوم اور ملک کی جانب سے غمزدہ کے لیے اظہار تعزیت کرتے ہوئے کابینہ نے کہا کہ ملک ایک ایسی ہونہار شخصیت سے محروم ہو گیا ہے جس نے بحران میں قیادت فراہم کی تھی۔

نب) جمعہ کی سہ پہر کو نئی دہلی میں سابق وزیر اعظم راجیو گاندھی کا جسدِ خاکی کا تابوت تین مورتی ہاؤس سے باہر لایا جا رہا ہے۔ سب کے آگے راہل گاندھی کو دیکھا جا سکتا ہے (بائیں طرف کی تصویر) تو پ کی ارتھی بردار توپ گاڑی شکتی استھل کے قریب پہونچتے ہوئے دیکھی جا سکتی ہے۔

راجیو گاندھی کا آخری سفر

راجیو گاندھی کا آخری سفر تین مورتی بھون سے شروع ہوا
ستان کے پہلے وزیر اعظم اور راجیو گاندھی کے نانا پنڈت جواہر
ر کی رہائش گاہ تھا اور جسے قومی یادگار میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔
وں نے اپنی والدہ آنجہانی اندرا گاندھی اور اپنے بھائی (آنجہانی) سنجے گاندھی
ز اپنا بچپن گزارا تھا۔

بری، بحری اور ہوائی فوج کے سربراہان جنرل ایس۔ ایف
ں، ایڈمرل ایل۔ رام داس اور ایئر چیف مارشل ایس کے مہرا
ری راجیو گاندھی کے پھولوں سے ڈھکے ہوئے تابوت کو اٹھا کر
پر رکھا تو سفید ہیلی کاپٹر نے اوپر سے پھولوں کی پنکھڑیاں گرائیں۔
بڑا سوال افراد" راجیو گاندھی امر رہے" کے علاوہ" راجیو گاندھی
بیدان، یاد کرے گا ہندستان: اور" جب تک سورج چاند
ا راجیو تیرا نام رہے گا" کے نعرے لگا رہے تھے۔ اس کے بعد
یمنٹ کے دو دستوں نے جن میں ہر دستے میں ۳۳ فوجی تھے
تیار آئے کے" اور پائلٹ جیپ کے پیچھے پوزیشن سنبھالی۔ دہلی
کے جنرل آفیسر کمانڈنگ میجر جنرل ایس سی کشیپ نے ارتھی کے
کی قیادت کی جس کے پیچھے بحری اور فضائی فوج کے دستے بھی
تھے۔

راجپوتانہ رجمنٹل سنٹر کے دو بینڈ دستے رفتار مارچ کے
ساتھ دھن بجا رہے تھے۔ بندوق راجیو گاندھی کے تابوت کے سرہانے
ان کی ایک بڑی تصویر تھی۔

ارتھی کے جلوس کے ساتھ بہت سے غیر ملکی مندوبین اور قومی
لیڈران پیدل چل رہے تھے۔ چلچلاتی دھوپ میں سوگوار شہریوں کا ٹھاٹھیں
مارتا سمندر جلوس کے دونوں طرف موجود تھا۔

تین مورتی بھون سے نکل کر جلوس وزیر اعظم کے دفتر کے پاس
سے گزرا وہاں سے راج پتھ ہوتا ہوا انڈیا گیٹ کے پاس آیا، جو
جنگِ آزادی کے دوران شہید ہونے والوں کی یادگار ہے۔ اور جہاں
مسلسل آگ جلتی رہتی ہے۔ وہاں سے جلوس راشٹرپتی بھون کی طرف آیا
جہاں ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴ کو اس وقت کے صدر جمہوریہ گیانی ذیل سنگھ نے شری
راجیو گاندھی کو وزیر اعظم بننے کے لیے حلف دلایا تھا اس کے بعد جلوس
بائیں جانب مڑ گیا اور کناٹ سرکس کی طرف آیا اس کے بعد بائیں جانب
دہلی کی طرف مڑ گیا جسے مغل شہنشاہ شاہجہاں نے بنایا تھا۔

اس طرح پرانی دہلی کے کھنڈرات سے گزرتا ہوا ارتھی کا جلوس

شکتی استھل پہاکر رکھا جو مہاتما گاندھی کی سادھی شانتی بن کے درمیان واقع ہے۔

متعدد غیر ملکی وفود اور ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں مقتول سابق وزیر اعظم راجیو گاندھی کے جسد خاکی کو آج یہاں پورے سرکاری اعزاز کے ساتھ شکتی استھل پر سپرد آتش کر دیا گیا۔ مذہبی منتروں کی گونج میں جب سہ پہرہ بجکر ۲۵ منٹ پر راجیو گاندھی کے جواں سال بیٹے راہل نے اپنے باپ کی چتا کو آگ دی تو توپی بینڈ نے الوداعی دھن بجائی۔ توپوں نے سلامی دی اور فوجیوں نے احترام کے طور پر اپنے ہتھیار اُلٹے کر لیے۔ تاریخ یقینی طور پر ان دو اندوہناک واقعات کی گواہ رہے گی۔ جب شکتی استھل کی آغوش میں ایک ماں اور اس کے بیٹے کو (دونوں وزیر اعظم تھے) محض دس سال کے اندر سپرد آتش کیا گیا۔

مسز راجیو گاندھی کی اطالوی نژاد بیوہ سونیا گاندھی کو جو سفید ساری میں ملبوس تھیں، ان کی بیٹی پریانکا پکڑے ہوئے تھی جب کہ چتا پر اُٹھتے ہوئے شعلے ان کے مقتول شوہر کے جسد خاکی راکھ میں تبدیل کر رہے تھے جس کے لیے اب سے ۲۳ سال قبل انھوں نے اپنا وطن اٹلی چھوڑ کر ہندستان کو اپنا گھر بنایا تھا۔

شکتی استھل پر بلکتے ہوئے لاکھوں سوگواروں میں غمزدہ قومی لیڈروں کے علاوہ ۶۴ ملکوں کے نمائندے تھے جو ایک ایسے محبوب لیڈر کا آخری سفر دیکھ رہے تھے جس نے پانچ برس تک دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کی قیادت کی تھی۔

لاکھوں لوگ جو چتا پر اپنے لیڈر کا انتم سنسکار دیکھنے کے لیے آئے تھے، اس وقت صدر رنج صدمہ سے جنونی ہو گئے تھے جب قومی ترنگے میں لپٹا ہوا، راجیو گاندھی کا جسد خاکی تین مورتی بھون سے یہاں لایا گیا۔

۶۴ ملکوں کے نمائندوں میں امریکہ، چین، پاکستان اور روس کے بھی لیڈران شامل تھے۔

مشہور شخصیتوں میں امریکہ کے نائب صدر ڈان کوائل۔ پاکستان کے وزیر اعظم نواز شریف۔ روس کے نائب صدر جی۔ آئی۔ نیا یف۔ پی ایل او لیڈر یاسر عرفات۔ چین کے نائب وزیر اعظم دو ایکس زوکیان۔ برطانیہ کے ولی عہد پرنس چارلس۔ سری لنکا کے وزیر اعظم ڈی۔ ایم۔ ویجے تنگے۔ نیپالی وزیر اعظم کے۔ پی۔ بھٹہ رائے۔ بنگلہ دیش کی صدر بیگم خالدہ ضیا شامل تھیں۔

راجیو گاندھی کے قتل پر برطانوی وزیر اعظم کو صدمہ

لندن ۲۱ مئی۔ برطانوی وزیر اعظم جان میجر نے راجیو گاندھی کے قتل پر شدید حیرت اور رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ ایک بہادر انسان تھے۔

ایک دوسرے بیان میں برطانوی خارجہ سکریٹری ڈگلز ہرڈ نے راجیو گاندھی کی ہلاکت کو ایک افسوسناک المیہ قرار دیا۔

آنجہانی راجیو گاندھی کو خراج عقیدت پیش کرنے والوں میں پاکستانی اپوزیشن کی سربراہ بے نظیر بھٹو۔ بنگلہ دیش کی بیگم حسینہ واجد۔ بھوٹان کے شاہ جگمے سنگرے وانچک بھی موجود تھے۔

زبردست سیکورٹی انتظامات کے تحت ہونے والے سنسکار میں تقریباً تمام بڑے قومی لیڈر موجود تھے۔ جن میں صدر ... آر وینکٹ رمن۔ نائب صدر ... شنکر دیال شرما، وزیر اعظم چندر شیکھر سابق وزیر اعظم ... وی پی سنگھ بھی تھے۔

زمین سے ۲۵ x ۳۱ میٹر اونچے بنے ہوئے پلیٹ فارم پر شری کی چتا بنائی گئی تھی جس کے قریب ان کی بیوہ سونیا گاندھی، نہرو خاندان کے قریبی ساتھی نٹور سنگھ، امیتابھ بچن اور راجیو کے مشیر آر۔ کے۔ دھون کھڑے ہوئے تھے۔ راجیو کی چتا اس مقام کے قریب ہی بنائی گئی جہاں پر ان کی ماں آنجہانی اندرا گاندھی کے خاکی کو سپرد آتش کیا گیا تھا

آنجہانی شری راجیو گاندھی کے استھی کلش کو تین مورتی ہاؤس سے مہاراشٹر کے وزیر اعلیٰ شری شرد پوار، ایم۔ پی۔ سی۔ سی (آئی) کے صدر شری شیواجی راؤ پاٹل نیلنگیکر نے حاصل کیا۔ اس موقع پر تین مورتی ہاؤس میں لی گئی اس تصویر میں شری مرلی دھر بھنڈارے (ایم پی)، شری ونت ساٹھے، شری شرد پوار وزیر اعلیٰ مہاراشٹر، اور شری کرپا شنکر جنرل سیکریٹری ایم۔ پی۔ سی سی (آئی) بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

سابق وزیر اعظم آنجہانی شری راجیو گاندھی کے استھی کلش کو ۳۰ مئی ۱۹۹۱ء کے روز ناسک میں گوداوری ندی کے رام کنڈ میں سپرد آب کیا گیا۔ اس موقع پر لی گئی اس تصویر میں ایم۔ پی۔ سی۔ سی (آئی) کے صدر شری شیواجی راؤ پاٹل نیلنگیکر اور شری شرد پوار وزیر اعلیٰ مہاراشٹر دیکھے جا سکتے ہیں۔

آنجہانی راجیو گاندھی اور بمبئی

بمبئی والے ۹ رمئی ۹۱ء کا آخری دورہ کبھی بھلا نہ پائیں گے!

بمبئی سے شریمتی راجیو گاندھی کا پرانا رشتہ ہے وہ یہیں ۲۰ راگست ۱۹۴۴ء کو کیمپس کارنر کے ایک پرائیوٹ ہسپتال میں پیدا ہوئے تھے اسوقت شریمتی اندرا گاندھی نے کہا کہ راجیو کی پیدائش ان کے لئے بہت خوش کن تھی اور وہ بہت ہی تندرست تھا۔ لیکن بدصورت نظر آرہا تھا۔

دو دنوں بعد ماں کے ساتھ راجیو گاندھی کو شریمتی کرشنا ہٹی سنگھ کے گھر لے جایا گیا۔ وہ کارمائیکل روڈ پر رہتی تھیں وہ آنجہانی اندرا گاندھی کی پھوپھی ہیں۔ راجیو کی پیدائش سے قبل ہی شریمتی اندرا گاندھی یہاں مقیم تھیں۔ اس وقت راجیو گاندھی کے والد اور نانا مسٹر جواہر لال نہرو جیل میں تھے کہتے ہیں کہ شریمتی اندرا گاندھی نے ڈاکٹر سے کہا تھا بیٹا ہوگا نہ۔

!میرے والد کو کوئی بیٹا نہیں ہے۔

وقت گزرتا گیا شری راجیو گاندھی پائلٹ ہو گئے جب بھی وہ بمبئی آتے۔ انڈین ایرلائنس کے پائلٹوں کی رہائش گاہ میں ٹھہرتے جب ان کی اہلیہ سونیا گاندھی ساتھ ہوتی تو وہ تاج کے شاپنگ آرکیڈ میں خریداری بھی کرتے کے پائلٹ ساتھی بتاتے ہیں کہ ملک میں بڑھتی ہوئی گرانی کے سلسلے میں وہ گفتگو کیا کرتے تھے۔

راجیو کو جوہو بیچ پر بھی گھومنے کا بڑا شوق تھا دوستوں کے ساتھ وہاں گھومتے سنہری مچھلیاں خریدتے اور دہلی کے اپنے تالاب میں انھیں رکھتے کئی بار وہ کھمبالاہل میں واقع نیروز گاندھی کے رشتے دار چندن پٹیل کے گھر کھانا کھانے جاتے۔ پٹیل خاندان سے ان کا کافی لگاؤ تھا وزیر اعظم بننے کے بعد ان کا آنا جانا بہت کم ہو گیا تھا

پٹیل خاندان کے علاوہ وہ امیتابھ بچن کے خاندان سے بھی ان کے تعلقات تھے۔

مشہور فلمی اداکارہ بیگم پارہ سے بھی ان کے مراسم تھے۔

وزیر اعظم کی حیثیت سے بھی جب وہ بمبئی آتے تو لوگوں کا دل جیتا کرتے ۱۹۸۵ء میں بمبئی کیلئے ایک سو کروڑ کا گرانٹ بھی انھوں نے منظور کیا بمبئی میں کانگریس کے صد سالہ جشن کے موقعہ پر انھوں نے تاریخی تقریر کی تھی جس میں سٹے کے دلالوں کو ہٹانے کا تذکرہ کیا تھا:

آخری بار آنجہانی سابق وزیر اعظم شری راجیو گاندھی گذشتہ ۹ رمئی کو اپنی جائے پیدائش بمبئی آئے تھے اسوقت وہ بڑے ہلکے پھلکے نظر آرہے تھے شاید پہلی بار اس وقت بمبئی والوں نے انھیں قریب سے دیکھا اور چھوا تھا پولس پہرے کو ہٹا کر شری راجیو گاندھی کو ہار پہنائے تھے اور ان کی یہی آخری ملاقات تھی۔
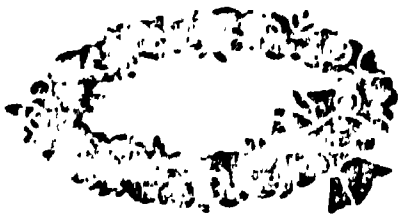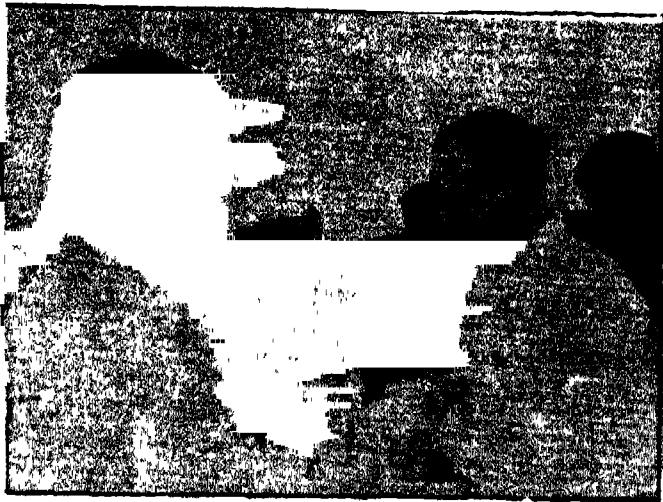
وزیر اعلیٰ مہاراشٹر شری شرد پوار، سابق وزیر اعظم شری راجیو گاندھی کے ہمراہ۔ "اپنا اُتسو" کے فنکاروں کے ساتھ

وزیر اعظم شری راجیو گاندھی کا بمبئی پہنچنے پر گرم جوشی کے ساتھ استقبال

چند یادگار تصاویر
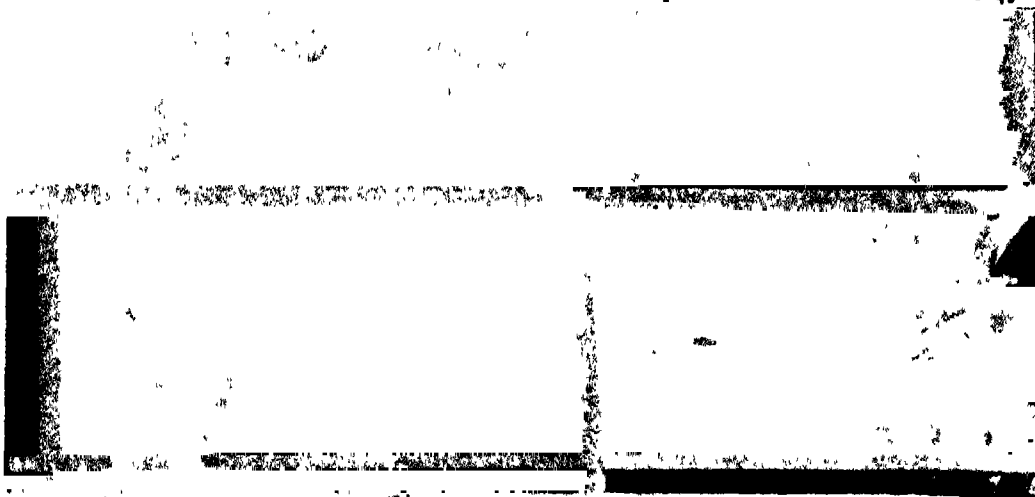
فرانس کے صدر متراں اپنی اہلیہ اور ہندوستان کے وزیر اعظم راجیو گاندھی اور ... کے ساتھ پیرس میں فرانسیسی فیسٹیول کے افتتاح کے موقع پر۔

وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے ۲۶ مئی ۱۹۸۹ء کو بمبئی پردیش کانگریس کمیٹی (آئی) کی طرف سے بمبئی کے ذرائیوان قیرہ میں جھونپڑ پٹی کے غریب بچوں کو اسکول یونیفارم تقسیم کئے۔ زیر نظر تصویر میں وزیر اعلیٰ شری شرد پوار، بمبئی کانگریس کمیٹی (آئی) کے صدر شری مرلی دیوڑا بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

راج بھون بمبئی میں وزیر اعظم شری راجیو گاندھی "گولڈن آور" پروجیکٹ کے افتتاح کے موقع پر تقریر فرماتے ہوئے اس پروجیکٹ کے تحت فوری طبی امداد کے لئے ایمبولینس فراہم کی جاتی ہیں۔

وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے ٹاٹا میموریل سینٹر، بمبئی میں ۲۲ بستروں والے نرگس دت کریٹیکل کیئر یونٹ کا افتتاح فرمایا۔ تصویر میں شریمتی سونیا گاندھی اور شری سنیل دت ایم۔پی بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے قوم کے نام دھروا ری ایکٹر کو منسوب فرمایا۔ اسے بھابھا اٹامک انرجی کی جانب سے جاری کیا گیا ہے۔

حبوب راہی
قام: بارسی ٹاکلی. ضلع اکولہ
ہاراشٹر) ۴۴۴۴۰۱

قتل ہے یہ سارے ہندوستان کا

رھی کا قاتل کون ہے ؟
ں سازش میں شامل کون ہے
کس نے مارا اِس عظیم انسان کو
موت کیوں آئی نہ اُس شیطان کو
ھی ایسا بیدردانہ قتل
وہ بھی ایسا سفاکانہ قتل
کیا فقط یہ راجیو کا قتل ہے
یہ وطن کی آبرو کا قتل ہے
ہے یہ دیش کے دستور کا
ہے یہ روشنی کا نور کا
یہ نہیں ہے قتل اک انسان کا
قتل ہے یہ سارے ہندوستان کا
ادر شانتی کا قتل ہے
، کی کرانتی کا قتل ہے
قتل یہ جنتا کی آشاؤں کا ہے
قتل یہ ٹھنڈی گھنی چھاؤں کا ہے
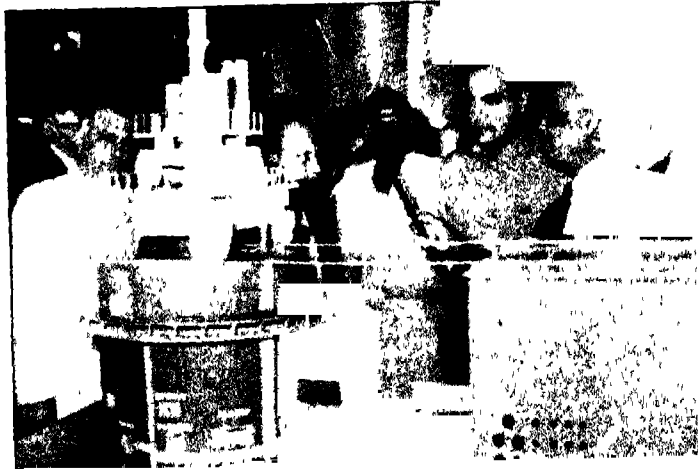
قتل یہ انسانیت کا قتل ہے
قتل یہ جمہوریت کا قتل ہے
قتل سارے مذہبوں دھرموں کا ہے
قتل یہ سارے بھلے کرموں کا ہے
یہ وطن کی ایکتا کا قتل ہے
یہ ہماری سبھیتا کا قتل ہے
یہ اہنسا کے اصولوں کا ہے قتل
پیار کے رنگین پھولوں کا ہے قتل
قتل یہ بھارت کے مستقبل کا ہے
قتل یہ ملاح اور ساحل کا ہے
آج سارے جگ میں ہاہا کار ہے — قاتلوں پر ہر طرف پھٹکار ہے
دیش بھر میں خونیوں کا زور ہے — ہر طرف ان بھیڑیوں کا زور ہے
بہہ رہا ہے ایک دریا خون کا — لگ گیا ہے ان کو چسکا خون کا
راجیو تو ہو گئے مر کر امر — سوچتا ہے آج ہر انساں مگر
کیا ہوا وہ دیش کے پیاروں کا راج
کیا رہے گا یونہی ہتیاروں کا راج ؟

امر ہے راجیو گاندھی

اور اب!

بربریت کا
تشدد کا چلن
کس قدر عام ہوا جاتا ہے
زندگی
تیرا طرب خیز نگر
شہر آلام ہوا جاتا ہے
صبح کا عکس
جسے کہتے ہیں
منظر شام ہوا جاتا ہے
کیسے جلاد ہیں
یہ تو سوچیں
ملک بدنام ہوا جاتا ہے

سوچتا ہوں
تو لرز جاتا ہوں
پھر جو ڈھاتے ہیں کیسے ہوں گے
جن کے جبڑوں سے
ٹپکتا ہے لہو
کتنے سفاک وہ چہرے ہوں گے
پھر
مرے ذہن میں آتا ہے سوال
کیا سبھی ہاتھوں میں
نیزے ہوں گے ؟

پتیاں آگ میں ڈھل جاتی ہیں
حادثے یوں بھی رقم ہوتے ہیں
پہلے خوشبو میں ہوا کرتی تھیں
اور اب، پھولوں میں بم ہوتے ہیں

انجم رومانی

کسی سے کون کمتر، کیا تفوق
الکشن کا تشدد سے تعلق؟
سبق جمہوریت کا ہے یہ نادال
جو دل جیتے وہی ہے مرد میداں
یہ ننگ آبرو احساس پستی
حصول اقتدار اور اتنی مستی
چلے گی قتل و خوں کی کب سیاست
عوام اس کی نہیں دیں گے اجازت
فریب و مکر کب چلتا ہے اتنا
نراج و راج میں ہے فرق کتنا
عناصر ہوں تو پھر سے جڑ سکے گی!
صداقت کی نہ گردن اڑ سکے گی!
جھلس کر جسم کو پگھلا رہے گا
مگر کردار کا ڈھانچہ رہے گا
اب آ گئے اِک نئے طوفاں کا ڈر ہے
اُمر ہے راجیو گاندھی اُمر ہے

اسحاق ملک
انجمن تعمیر ادب۔ ۸۷۳-۱-۲۲/ سلطانپورہ۔
حیدرآباد ۲۴ (اے پی)

جمیل کاکی۔

فاطمہ بائی بلڈنگ ۴۹، کے مارگ،

جیکب سرکل، بمبئی ۱۱

راجیو گاندھی کی قربانی

یش کی خاطر مٹنے والے ویر کی ہے یہ امر کہانی
د کر ولے بھارت والو راجیو گاندھی کی قربانی
ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے لیکن دیش نہ ٹوٹنے پائے
ں خود کا بلیدان کروں گا دیش پہ گر کوئی آنکھ اٹھائے
ری ماں بھی تھیں بلیدان مجھے تو ہے یہ ریت نبھانی
یاد کر ولے بھارت والو راجیو گاندھی کی قربانی

ن کے گھر کی ریت یہی ہے سارا تن من دیش کی خاطر
جیو نے قربان کیا ہے اپنا جیون دیش کی خاطر
ھوں نے آخر کر دکھلایا جو تھی انھوں نے من میں ٹھانی
یاد کر ولے بھارت والو راجیو گاندھی کی قربانی

اپنے پرکھوں کے رستے پر چل کر دیش کا نام کیا ہے
بھارت جس پر ناز کریگا راجیو نے وہ کام کیا ہے
ان کی کہانی کہے ترنگا اور کہے گنگا کا پانی
یاد کر ولے بھارت والو راجیو گاندھی کی قربانی

جب تک سورج چاند رہیگا راجیو جی کا نام رہیگا
ایک رہے یہ بھارت پیارا انکا یہ پیغام رہے گا
ان کی باتیں یاد آتی ہیں آنکھ میں بھر آتا ہے پانی
یاد کر ولے بھارت والو راجیو گاندھی کی قربانی

دیش میں ہو قومی یکجہتی اور مٹے نفرت کی آندھی
قومی ایکتا کی راہوں پر چلے عمر بھر راجیو گاندھی
ان کی راہوں کو اپنا لیں گر ہے ہمیں شردھا دکھلانی
یاد کر ولے بھارت والو راجیو گاندھی کی قربانی
دیش کی خاطر مٹنے والے ویر کی ہے یہ امر کہانی

ریاض احمد خان

اکیسویں صدی کا معمار

۲۴ مئی کو شکتی استھل پر سابق وزیر اعظم اور کانگریس کے صدر راجیو گاندھی کے جسد خاکی کو آگ کے شعلوں نے نگلنا شروع کر دیا اور اس طرح ہندوستان کے سیاسی افق پر چمکتا اور دمکتا ہوا ستارا غروب ہو گیا۔ ہندوستان اور ہندوستانی عوام کے لیے یہ ایک ایسا المیہ ہے جس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ دنیا دیکھتی کی دیکھتی ہی رہ گئی اور لمحوں میں ہندوستان کے مقبول ترین سابق وزیر اعظم ہلاک ہو گئے اور دنیا والے اور ہندوستانی عوام کف افسوس ملتے رہ گئے۔ کسے معلوم تھا کہ اس ہمیشہ مسکراتے ہوئے چہرے کو اس کی موت باوجود مشکلات کے سری پرم بدور لیے جا رہی ہے۔ جہاں سے وہ خود نہیں بلکہ دوسروں کے کاندھوں پر سوار ہو کر واپس لوٹے گا۔

یوں تو سابق وزیر اعظم راجیو گاندھی نے سیاست میں قدم رکھتے ہی بے شمار تقریریں کی ہیں مگر اپنی موت سے چند لمحے پہلے ان کی زبان سے نکلنے والے آخری الفاظ وہ تھے جو انھوں نے سری پرم بدور پارلیمنٹری حلقہ انتخاب کی امیدوار شریمتی مارگتم چندر شیکھر سے کہے: "میں ان لوگوں سے کیا بات کروں" شریمتی چندر شیکھر نے جواباً ان سے کہا کہ آپ لوگوں کو دیہی ترقی کے بارے میں بتلائیں۔ اور اس کے بعد زبردست دھماکا ہوا جس نے راجیو گاندھی کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔ ہندوستانی عوام سے راجیو گاندھی کا سدا مسکراتا ہوا چہرہ موت کے ظالم ہاتھوں نے زبردستی چھین لیا۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ راجیو گاندھی کوئی سیاست داں نہیں تھے۔ انھیں سیاست سے ذرہ برابر بھی دلچسپی نہیں تھی۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ ان کی رگوں میں جو خون دوڑتا پھرتا تھا اس میں سیاسی جراثیم ضرور موجود تھے۔ اسی طرح راجیو گاندھی کی شریک حیات سونیا گاندھی بھی راجیو کے سیاست میں ان کی خلاف تھیں۔ خاندانی چپقلش جب بہت بڑھ گئی تو سونیا گاندھی نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر راجیو گاندھی سیاست میں حصہ لیں گے تو وہ ان سے علاحدگی اختیار کر لیں گی۔ مگر سنجے گاندھی کی موت کے بعد خاندان میں سوائے راجیو گاندھی کے کوئی ایسا فرد نہ تھا جو اس ذمہ داری کو پورا کر سکے۔ شریمتی اندرا گاندھی نے ایک طرف راجیو گاندھی کے لیے سیاسی راہیں ہموار کرنا شروع کر دیں اور دوسری طرف سونیا گاندھی کو سمجھانا شروع کر دیا جس کا نتیجہ

شریمتی راجیو گاندھی نے وزیر اعظم کی حیثیت سے حلف لیا۔

یہ ہوا کہ راجیو گاندھی کو عملی طور پر سیاست میں داخل ہونا پڑا۔
شریمتی اندرا گاندھی کو اسباب کا یقین تھا کہ پنجاب کا کبھی نہ حل ہونے والا مسئلہ ایک اژدھے کی طرح منہ کھولے کھڑا ہے۔ جب مذاکرات سے یہ مسئلہ حل نہ ہو پایا تو اندرا گاندھی نے ایک سخت قدم اٹھایا جس کے نتیجے میں آپریشن بلواسٹار رونما ہوا۔ یہی وہ مقام تھا جہاں سے پنجاب کے جنگجو نہرو خاندان کے دشمن ہو گئے۔ اندرا گاندھی بڑی دور اندیش تھیں یہ مگر پھر بھی کچھ سیاسی دباؤ اور کچھ ملک کے استحکام کی خاطر انہیں یہ اقدام کرنا ناگزیر ہو گئے تھے۔ اسی ایکشن کا پہلا بھرپور وار شریمتی اندرا گاندھی کو اپنی زندگی دے کر جھیلنا پڑا مگر ان میں اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ یہ عظیم قربانی دے کر اپنے آپ کو امر کر گئیں اسوقت ملک میں ایک کہرام مچ گیا۔ راجیو گاندھی کے ناتواں کاندھوں پر وزارت عظمیٰ کا بوجھ آپڑا جسے وہ سہار لے گئے اور ۳۱ر اکتوبر ۱۹۸۴ء کو وزیر اعظم کی حیثیت سے حلف لیا ہندوستان کے ساتھ ساتھ بدیسی ملکوں کی نظریں بھی ہندستان کی سیاست پر تھیں۔ کیسے بھی یقین نہیں تھا کہ ایک ناتجربہ کار شخص اس بوجھ کو اٹھا سکیگا۔ مگر راجیو گاندھی نے اپنی اور اپنے خاندان کی عظمت کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے فرائض منصبی بہترین طریقہ سے ادا کرنا شروع کر دیئے۔ اور دنیا پر یہ ظاہر کر دیا کہ ہندوستان میں راست سیاستدانوں کی کمی نہیں ہے دسمبر ۱۹۸۴ء میں عام انتخابات کا اعلان کر کے راجیو گاندھی نے اپنی سیاسی بصیرت کی دھاک بٹھا دی اور لوک سبھا کی ۵۱۰ نشستوں میں سے ۴۱۵ نشستوں پر کانگریس کو کامیابی بخشی۔ یہ صحیح ہے کہ عوام نے راجیو گاندھی کو بھرپور تعاون دیا اور اس تعاون میں ان کی دلی ہمدردیاں بھی شامل تھیں۔
راجیو گاندھی ۳۱ر اکتوبر ۱۹۸۴ء سے یکم دسمبر ۱۹۸۹ء یعنی مکمل پانچ سالوں تک وزیر اعظم کے فرائض انجام دیتے رہے راجیو گاندھی کی سیاسی حکمت عملی کا بین ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے پنجاب اور آسام کے مسائل حل کرنے پر زور دیا اور دونوں مسائل حل کرنے کے لیے سمجھوتہ کیا بدقسمتی تھی کہ ان پر عمل نہیں ہو سکا اور دونوں منصوبے دہشت پسندوں کا نشانہ بن گئے۔ راجیو گاندھی نے ہمت نہیں ہاری

وزیراعظم شری راجیو گاندھی نے اقوام متحدہ کے چالیسویں سالانہ خصوصی اجلاس میں ہندوستانی مندوبین کے ہمراہ شرکت فرمائی شری سوشیل کمار شندے، وزیر برائے مالیات اور منصوبہ بندی، مہاراشٹر مندوبین میں شامل تھے۔ آپ وزیراعظم کے پیچھے دیکھے جا سکتے ہیں۔

بلکہ وہ جب بھی کوئی مناسب موقع ہاتھ آتا اپنے دلی جذبات کا اظہار کرتے اور ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتے پنجاب کے دہشت گردوں نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ وہ ایسا کوئی بھی حل قابل قبول نہیں سمجھیں گے جس کی بنا پر انہیں اپنے مسلک سے ہٹایا جا سکے۔ باوجود مذاکرات کے یہ مسائل ہر روز بڑھتے ہی چلے گئے اور آج جب راجیو گاندھی نہیں رہے یہ مسائل بھی الجھے ہوئے ہیں۔ راجیو گاندھی کی خواہش تھی کہ وہ پنجاب کا مسئلہ اور اس کے ساتھ آسام کا مسئلہ حل کر سکیں مگر جہاں ضد اور ہٹ دھرمی آجائے وہاں کسی مسئلہ کا حل ہونا غیر یقینی امر ہے

آج ملک میں کمپیوٹرائی زیشن میں جو ترقی حاصل ہوئی ہے وہ صحیح معنوں میں انہیں کی انتھک محنت کا نتیجہ ہے ملک کو ۲۱ ویں صدی میں لیجانیوالا یہ دُور اندیش صحیح معنوں میں ۲۱ ویں صدی کا معمار ہے۔ ملک کی اس سمت پر ترقی صحیح معنوں میں شری راجیو گاندھی کی مرہون منت ہوگی۔ اس وقت جبکہ دیگر سیاسی رہنما ملک کی تنسیخ کرنے کے در پے تھے اسوقت شری راجیو گاندھی نے ۲۱ ویں صدی میں قدم رکھنے کا حوصلہ عوام کو دیا۔ شریمتی اندرا گاندھی نے ملک کی سالمیت اور بقا کی خاطر اپنی جان دی تھی۔ راجیو گاندھی اس عظیم قربانی کو رائیگاں نہیں جانے دینا چاہتے تھے۔ انھوں نے ہر ملک سے کمپیوٹر، ٹیکنولوجی حاصل کرنے کے لیے راہیں استوار کریں اور اس میں زبردست کامیابی حاصل کی۔

الیکشن سنہ ۱۹۹۱ء

جیتنے کی راجیو گاندھی کو پوری امید تھی۔ اسی امید اور یقین کے ساتھ انھوں نے ملک کے دُور دراز علاقوں کا دَورہ کیا اپنے ہر دَورہ میں انھوں نے عوام سے کہا کہ "کبھی میں آپ کے سامنے وزیراعظم کی حیثیت سے تقریر کرتا تھا مگر اب کانگریس کے صدر کی حیثیت سے مخاطب ہوں۔ عوام کو نہ تو وزیراعظم سے دلچسپی تھی اور نہ کانگریس صدر سے۔ انہیں اگر دلچسپی تھی تو صرف راجیو گاندھی کی ذات سے تھی۔ اس مرتبہ عوام نے تہیہ کر لیا تھا کہ راجیو گاندھی کو دوبارہ اقتدار دلائیں گے تاکہ ملک کو استحکام حاصل ہو اور دیگر سیاسی پارٹیوں کے روز روز کے نت نئے جھگڑوں سے نجات حاصل ہو مگر راجیو گاندھی کی موت نے عوام کے خوابوں کو چکنا چور کر دیا۔ اب ان کی نگاہیں کسی مخلص کو اس بھیڑ میں تلاش کرتی ہیں جس کا ملنا ایک ناقابل یقین بات ہے۔

اپنے ملک کے مسائل کے ساتھ ہی ساتھ شری راجیو

م شری راجیو گاندھی کی ۲۸ دسمبر ۱۹۸۸ء کو بمبئی میں "اندرا گاندھی انسٹی ٹیوٹ برائے ڈیولپمنٹ ریسرچ کے افتتاح کے موقع پر لی گئی تصویر۔

، پڑوسی ملکوں سے بھی خوش گوار تعلقات قائم
خواہشمند تھے اسی جذبہ کے تحت سری لنکا کے
جے آر۔ جے وردھنے کی درخواست پر لائبریشن
ن تمل ایلم سے نبرد آزما ہونے کے لیے ہند
ا ہدہ کیا اور ہندوستانی امن فوج کو سری لنکا
، پڑوسی ملک میں حالات ساز گار ہو سکیں۔ اس
ب کہ ہند۔ سری لنکا معاہدہ ہو رہا تھا تمام ملکوں
ستانی سیاست اور خاص طور سے راجیو گاندھی کی
ی کی تھی وہ اس لیے کہ اگر سری لنکا میں امن قائم ہوتا
سے بدیسی حکمرانوں کو وہاں اپنا تسلط قائم کرنے کا
ملے گا اور اسی وجہ سے ہمارے ملک کو بھی استحکام
و گاندھی کے یہ جذبات تھے۔ دوسری طرف لائبریشن
ف تمل ایلم نے ہندوستانی امن فوج کی ہر طرح سے

تذلیل کرنا شروع کردی۔ وہ ہر قیمت پر عوام کے دلوں میں
ہندوستانی امن فوج کے بارے میں نفرت پیدا کرنا چاہتے
تھے۔ دہشت گرد اپنے اس اقدام میں کامیاب ہوئے کیوں کہ
سری لنکا میں ہندوستانی فوج قدر و منزلت کی نظروں سے
نہیں دیکھی جانے لگی۔ بجائے اس کے ملک میں پھیلی ہوئی
لاقانونیت کا ذمہ دار بھی ہندوستانی امن فوج کو قرار دیا گیا۔
یہ ایک حقیقت ہے کہ سری لنکا کے صدر جے وردھنے خواہش
تھے کہ ان کے ملک میں امن قائم ہو اور اس کے ساتھ ہی
ساتھ ہندوستانی امن فوج بھی باعزت طور پر واپس ہو
مگر دہشت گردوں نے نفرت کے خلیج کو وسیع تر کر دیا۔
اور مجبوراً راجیو گاندھی کو اپنی امن فوج واپس بلانا پڑی۔ آج
بھی سری لنکا میں بدامنی پھیلی ہوئی ہے اور حالات کسی طور
پر بحال نہیں ہو پا رہے ہیں۔ راجیو گاندھی نے جب ہند

نہرو سائنس سینٹر، بمبئی میں ڈاکٹر سروج گوس، ڈائریکٹر برائے قومی کونسل آف سائنس میوزیم نے وزیراعظم شری راجیو گاندھی کو ایک نمونہ بتاتے ہوئے اس بات کی تشریح کر رہے ہیں کہ سیٹالائٹ کیونکر بیضوی محور پر حرکت کرتا ہے۔
(بائیں سے دائیں) دیکھے جا سکتے ہیں:۔ شریمتی سونیا گاندھی، وزیراعلیٰ شری شیواجی راؤ پاٹل نیلنگیکر، مرکزی وزیر برائے انسانی وسائل کی ترقیات شری پی وی نرسمہا راؤ۔

سری لنکا معاہدہ کیا تھا اسوقت انہیں یہ وہم و گمان بھی نہیں تھا کہ سری لنکا کے لیبریشن ٹائیگرس آف تامل ایلم ان کی جان کے دشمن ہو جائیں گے۔ حالانکہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ راجیو گاندھی نے باوجود اندرونی مخالفت کے سری لنکا سے آئے ہوئے تمل پناہ گزینوں کو تمل ناڈو میں پناہ دی۔ انھیں پناہ گزینوں نے تمل ناڈو میں افراتفری پیدا کر دی اس کے باوجود بھی انہیں ملک سے نہیں نکالا گیا۔

شری راجیو گاندھی کے قتل کے بعد ابتک جو تفتیش ہوئی ہے اس سے ظاہر ہو چکا ہے کہ ان کے قتل کی سازش میں لیبریشن ٹائیگرس آف تمل ایلم کا ہاتھ ہے۔ اس قتل کی عدالتی تحقیق بھی ہو رہی ہے۔ شواہد جمع کیے جا رہے ہیں۔ اندازے لگائے جا رہے ہیں

بھلا ہو ملک کے رہنماؤں کا جنھوں کا جنھوں نے بروقت عوام سے امن و امان برقرار رکھنے کی اپیل کی ہے۔ ہندوستانی عوام نے بھی بڑی سمجھ داری سے کام لیتے ہوئے صبر کا دامن تھام رکھا ہے۔ وزیراعظم کا عہدہ سنبھالنے کے بعد شری راجیو گاندھی پر پہلی مرتبہ دلی میں مہاتما گاندھی کی سمادھی پر ۲ر اکتوبر ۱۹۸۶ء کو حملہ ہوا۔ یہ حملہ ہلاک ثابت نہیں ہوا اور وہ بچ گئے۔ دوسری مرتبہ سری لنکا میں اس وقت پیش آیا جب وہ گارڈ آف آنر کی سلامی لے رہے تھے۔ ان پر یہ حملہ ۳۰ر جولائی ۱۹۸۷ء کو ہوا جبکہ ایک نیوی کے سپاہی نے اپنی رائفل کے بٹ سے ان کے سر کو نشانہ بنایا۔ راجیو گاندھی کی زندگی تھی جو وہ بال بال بچ گئے۔ مگر سری پیرم بدور میں جو تیسرا حملہ ہوا وہ مہلک اور جان لیوا ثابت ہوا۔ ہندوستان کی تاریخ میں ۲۱ر مئی کی شب ایک تاریخی اہمیت رکھیگی۔

شری راجیو گاندھی کی موت سے جو خلاء پیدا ہو گیا ہے اسے برسوں پُر نہیں کیا جا سکتا۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ کانگریس نے بلا شبہ جنگِ آزادی میں کامیابی حاصل کی اور ایک سو سات سال تک ملک کی خدمت کرتی رہی مگر اب حالات بہت مختلف نظر آرہے ہیں۔ ڈر ہے کہ کہیں ہندوستان کی سب سے قدیم سیاسی جماعت ختم نہ ہو جائے۔ فی الحال تو کانگریسیوں نے اتفاق رائے سے کام لیا ہے۔ الیکشن نتائج ظاہر ہونے کے بعد کی ذمہ داری سے نبرد آزما

وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے مہاراشٹر کے سوکھے سے متاثرہ علاقوں کا اچانک دورہ کیا تھا۔ زیر نظر تصویر میں آپ باول گاؤں میں رہنے والوں کا احوال دریافت کر رہے ہیں۔ سابق ایم۔ ایل۔ اے شری سوریہ کانت پلانڈے گاؤں سے متعلق معلومات دیتے ہوئے دیکھے جا سکتے ہیں۔ تصویر میں شریمتی سونیا گاندھی اور اس وقت کے وزیر اعلیٰ مہاراشٹر شری شنکر راؤ چوان بھی نظر آ رہے ہیں۔

وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے ۱۱ر نومبر ۱۹۸۹ کو راج بھون بمبئی میں "مہاراشٹر" نامی کتاب جسے مانگ پبلیکیشنز کی طرف سے شائع کیا گیا ہے کا اجراء فرمایا۔ اس کتاب کی اشاعت کا اہتمام حکومت مہاراشٹر نے کیا تھا۔ تصویر میں نظر آ رہے ہیں: گورنر شری کرنا پربھاکر راؤ اور وزیر اعلیٰ شری شیو اجی راؤ پاٹل نیلنگیکر۔ یہ کتاب ریاست مہاراشٹر کے صد سالہ جشن کی ایک یادگار ہے۔

ہونا انتہائی ضروری ہے۔ کاش کانگریسی ان زریں اصولوں پر عمل پیرا ہوں جنہیں قائم رکھنے کے لیے مہاتما گاندھی اور راجیو گاندھی نے قربانی پیش کی ہے۔ اب ملک کسی قربانی کا طلبگار نہیں ہے اب تو صرف یکجہتی کا طلبگار ہے جس کے بغیر ملک کا استحکام ممکن نہیں ہے۔

لاجپت رائے
ڈ/۵۰۱۹، اہل نگر، نائیگاؤں (بسین)
ضلع تھانے ۴۰۱۲۰۷

یہ سنہ ۱۹۶۱ء کی بات ہے۔ اُن دنوں میں کمیونسٹ پارٹی کے اردو ہفتہ وار "عوامی دَور" (جواب حیات کے نام سے شائع ہوتا ہے) میں کامریڈ سجاد ظہیر کے معاون کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ میں اور بنے بھائی (سجاد ظہیر) جب دوپہر کا کھانا کھا کر دفتر واپس لوٹے تو دیکھا کہ کامریڈ ڈانگے وہاں موجود تھے۔ چھت پر چلتے ہوئے بجلی کے پنکھے پر ان کی نظر تھی اور ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے ظاہر تھا کہ انہیں پنکھا بند کیے بغیر اتنی دیر کے لیے چلے جانا ناگوار لگا تھا۔ اپنی خفگی کا اظہار انھوں نے حسب عادت مذاق سے کیا۔ "پنکھا چل رہا تھا اور میں نے سوچا یونہی" ہوا ضائع ہو رہی ہے، کیوں نہ میں ہی کھا لوں"۔ یہ کہہ کر وہ کرسی پر بیٹھ گئے اور بنے بھائی سے کہا "چلئے اب جرمانے کے طور پر چائے پلایئے"۔

کامریڈ ڈانگے کافی خوش پوش انسان تھے اور امیر نہ ہونے کے باوجود رہنے سہنے کے ڈھنگ کے معاملے میں کافی باذوق تھے۔ مگر فضول خرچی کے سخت خلاف تھے اور خاص طور پر پارٹی کے اخراجات میں بے حد کفائت شعاری کے قائل تھے۔ اپنے بچپن کی زندگی کے تجربات سے انھوں نے محنت کش عوام کے مفاد کی حفاظت کرنا سیکھا تھا۔

سنہ ۱۸۹۹ء میں بمبئی میں ایک غریب برہمن پریوار میں پیدا ہوئے مگر ایک سال کی عمر کے تھے کہ ماں کا انتقال ہو گیا باپ نے بچے کو ایک غریب مراٹھا عورت کے حوالے کر دیا جس نے شری پد امرت ڈانگے کی دیکھ بھال سگی ماں کی طرح کی۔ وہ اُسے بمبئی سے ناسک لے آئی۔ سنہ ۱۹۰۹-۱۰ء تک ڈانگے ناسک کے اسکول میں پڑھتے رہے۔ ناسک ان دنوں انگریزی حکومت کے خلاف انقلابی سرگرمیوں کا ایک اہم مرکز تھا۔ لوک مانیہ تلک، ویر ساورکر، وشنو گنیش پنگلے وغیرہ کے نام اور کارنامے لوگوں کے نام پر تھے۔ کم عمر اسکول کا طالب علم ڈانگے اس ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ان کی ایک غریب موسی بھی تھی جو سبزی فروخت کرنے کے لیے ناسک کے قریب دیولالی آیا جایا کرتی تھی اور اکثر اوقات ڈانگے کو بھی ساتھ لے لیتی

اپنے ماسری کے جواہر لال نہرو اور اندرا گاندھی۔

سیوا گرام آشرم کے احاطے میں۔ [illegible]
کا استقبال کرتے ہوئے۔

پارلیمنٹ ہاؤس میں ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر کی تصویر کا افتتاح کرتے ہوئے۔

مسز اندرا گاندھی اور صاحبزادے راجیو گاندھی ۔

اپنی کابینہ کے دیگر لیڈروں کے ہمراہ
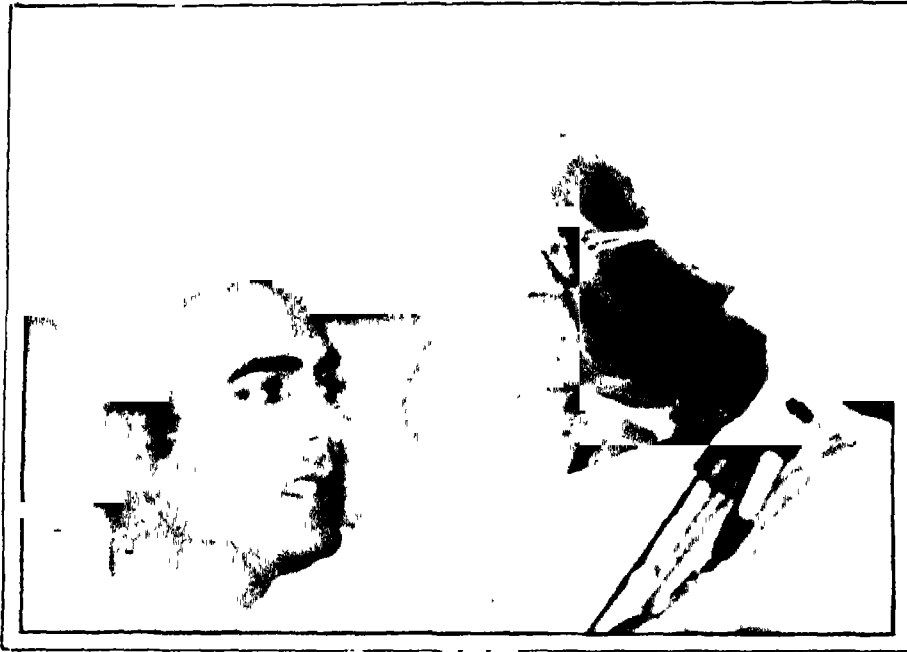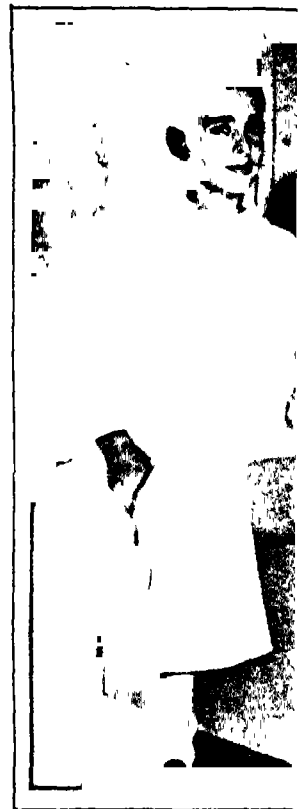
دیوالی اُن دنوں ایک اہم قومی چھاؤنی تھا اور ڈانگے نے اپنے بچپن میں ہی انگریز فوجیوں کی خرمستیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ ناسک ریلوے اسٹیشن کے قریب جہاں ڈانگے رہتے تھے، غریب مزدوروں، رکشا چلانے والوں اور دوسرے محنت کش لوگوں کا بسیرا تھا۔ ڈانگے نے ان کی زندگی اور ان کی تکالیف کو بھی دیکھا۔

چونکہ ناسک میں اعلیٰ تعلیم کی اور زیادہ گنجائش نہیں تھی اسی لیے ڈانگے کے والد انہیں بمبئی واپس لے آئے اور انھوں نے بھارڈا ہائی اسکول (نزد آزاد میدان) میں داخل کرا دیا جو ان دنوں بمبئی کے بہترین اسکولوں میں سے ایک سمجھا جاتا تھا ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد سنہ ۱۹۱۷ء میں ڈانگے بمبئی کے ولسن کالج میں داخل ہو گئے اور طالب علموں کو منظم کرنے لگے۔ انھوں نے کالج میں بائبل کی جبری تعلیم کے خلاف آواز اٹھائی اور اس سے پہلے کہ وہ بی، اے پاس کرتے سنہ ۱۹۲۰ء میں انہیں کالج سے نکال دیا گیا۔

کالج کے دنوں کے دوران ہی وہ لوکمانیہ تلک کے قریب آئے اور قومی سیاست میں زور و شور سے حصہ لینے لگ گئے تلک کے ترغیب پر ہی ڈانگے نے بمبئی کے کپڑا مل کے مزدوروں کو منظم کرنا شروع کیا۔ اور آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس (AITUC) کی بنیاد رکھی لیکن اس سے پہلے کہ پہلی کانفرنس منعقد ہوتی، اگست سنہ ۱۹۲۰ء میں تلک سورگ باش ہو گئے۔ اس لیے یہ کانفرنس ۳۱/ اکتوبر سنہ ۱۹۲۰ء کو منعقد ہوئی جس کی صدارت تلک کے سیاسی دوست اور قومی رہنما لالہ لاجپت رائے نے کی۔

روس کے اکتوبر سنہ ۱۹۱۷ء کے انقلاب نے جن لوگوں کو متاثر کیا تھا ان میں تلک بھی تھے۔ ڈانگے نے روسی انقلاب اور مارکس اور لینن کے نظریات کا مطالعہ تلک کی وجہ سے ہی کیا اور تب انھوں نے اپنی پہلی کتاب "گاندھی بنام لینن" (سنہ ۱۹۲۱ء) میں شائع کی۔ گاندھی جی کے بارے میں ڈانگے کے خیالات پورے طور پر مارکسی نقطۂ نظر سے صحیح نہیں تھے لیکن ان دنوں ہندوستان میں کمیونزم (اشتراکیت) کے متعلق کتابوں کی کمی تھی اور اُس کے مکمل اور جامع مطالعہ کیلئے سہولتیں نہیں تھیں، مگر اس کتاب کی اہمیت اتنی ہے کہ اس سے پہلے ہندوستانی سیاست کو مارکسی نظریہ سے سمجھنے کی کوشش کی ابتدا ہوگئی۔ ایم این رائے نے ڈانگے کی اس کتاب کو پڑھا اور اُن سے رابطہ قائم کیا۔

سنہ ۱۹۲۵ء میں آگے چل کر ڈانگے نے ایم این رائے شوکت عثمان اور مظفر احمد کے ساتھ مل کر ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کی بنیاد رکھی۔

کمیونسٹ پارٹی کے پہلے منشور میں پارٹی کے اصولوں کا اعلان کرتے ہوئے۔ سب سے پہلا اصول یوں تحریر کیا گیا:

> "ہماری پارٹی کی نظر میں ایک ملک کا کسی دوسرے ملک اور قوم پر حکومت کرنا ایک غیر منصفانہ اور غیر قدرتی عمل ہے اور اسی لیے ہماری نظر میں ہر ہندوستانی کا یہ فرض ہے کہ وہ جلد از جلد سوراج حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرے"

میں مندرجہ بالا اقتباس پیش کرنا اس لیے ضروری سمجھ رہا ہوں کہ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ ہندوستان میں (مشرقی یورپ کے ممالک کی طرح) کمیونسٹ تحریک روس یا کسی اور بیرونی طاقت نے نہیں چلائی تھی۔ ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی (جیسا کہ اس کے پہلے منشور کے پہلے آرٹیکل سے ظاہر ہے) کی بنیاد کے پیچھے حب الوطنی کا جذبہ تھا۔ یہ تحریک ان لوگوں نے چلائی تھی جو انگریزی سامراج کے مخالف تھے اور اپنے ملک کو آزاد دیکھنا چاہتے تھے۔ قومی آزادی کی تحریک اور کمیونزم کے لیے جدوجہد میں کوئی بھی نظریاتی اختلاف اور تضاد نہیں ہے۔

لیکن ایک بات نظریاتی طور پر صحیح ہو سکتی ہے لیکن نظریے کے اطلاق میں غلطی ہو سکتی ہے۔ اور ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی اس قسم کی غلطی کا بار بار شکار ہوتی آئی ہے ہندوستان کی کمیونسٹ تحریک میں کامریڈ ڈانگے کی اہمیت اس لیے ہمیشہ رہے گی کہ انہوں نے ہمیشہ پارٹی کو قومی دھارے سے الگ نہ ہونے سے روکا۔ کمیونزم ایک بین الاقوامی تحریک ہے۔ روس میں اس وقت جو تبدیلیاں گورباچیف کی رہنمائی میں لائی جا رہی ہیں۔ اس وقت ان پر بحث مطلوب نہیں ہے۔ گورباچیف غلط راستے پر ہیں یا صحیح راستے پر، اس کا فیصلہ تاریخ کرے گی۔ لیکن روس میں ہونے والی ان تبدیلیوں سے ایک بات صاف ہو گئی ہے کہ روس کے قومی مفادات کو بین الاقوامی کمیونسٹ تحریک کے مفادات کے مترادف سمجھنا غلط ہے اور تھا۔

سنہ ۱۹۸۵ء سے پہلے روسی کمیونسٹ پارٹی کی پالیسیوں کو اس طرح سے پیش کیا جاتا رہا کہ گویا وہ دنیا بھر کی کمیونسٹ پارٹیوں کے لیے حرفِ آخر ہوں۔ بین الاقوامی کے نام پر روس کے قومی مفادات کو دیگر کمیونسٹ پارٹیوں کو اپنے ملک کے قومی مفادات سے انحراف کرنے کے لیے مجبور کیا گیا۔ یہ جبر ضروری نہیں ہے کہ اوپر سے لادا گیا ہو۔ مگر بہت سے کمیونسٹ، دنیا بھر میں، روسی کمیونسٹ پارٹی سے الگ ہو کر سوچنے کے عمل کو کفر سمجھتے تھے۔

میں سنہ ۱۹۴۲ء کا ذکر نہیں کروں گا، جب کہ ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی نے گاندھی جی کے "ہندوستان چھوڑو" آندولن کی مخالفت کی تھی۔ اور قومی تحریک سے کٹ گئی تھی۔ کیوں کہ میں خود اُن لوگوں میں سے ہوں جو نظریاتی طور پر پارٹی کو غلط نہیں سمجھتے تھے۔ سنہ ۱۹۴۲ء سے پہلے کمیونسٹ اتحادیوں (امریکہ، برطانیہ، فرانس وغیرہ) اور فسطائیوں (جرمنی، جاپان) کے درمیان جنگ کو سرمایہ دارانہ جنگ سمجھتے تھے اور عوام کو اس جنگ سے الگ رہنے کی ترغیب دیتے تھے۔ لیکن سنہ ۱۹۴۲ء میں جب جرمنی نے روس پر حملہ کر دیا اور روس بھی اپنی قومی ضروریات کے پیشِ نظر اتحادیوں کے ساتھ شامل ہو گیا تو کمیونسٹوں نے اس سرمایہ دارانہ جنگ کو "عوامی جنگ" کا نام دے دیا اور چوں کہ اس وقت روس بھی امریکہ، برطانیہ اور فرانس کا حلیف بن چکا تھا، اس لیے ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی نے بھی انگریزوں کے خلاف جنگِ آزادی کو ملتوی کر دینے کی بات کہی اور جرمنی و جاپان کی شکست کو سب سے اہم مقصد قرار دیا۔

روس پر جرمنی کے حملے نے یقیناً دوسری جنگِ عظیم کے کردار کو بدل دیا تھا۔ گاندھی جی اُس وقت کہا تھا کہ اگر روس ہار گیا تو دنیا کے غریب ملکوں کے آنسو کون پونچھے گا۔ جواہر لال نہرو بھی روس کے طرفدار تھے اور ملک کی پوری قومی تحریک روس سے ہمدردی رکھتی تھی۔ مگر گاندھی جی نے اور کانگریس نے انگریزوں کو جرمنی اور جاپان کے خلاف جنگ میں تعاون دینے کے لیے یہ شرط رکھی کہ وہ ہندوستان کو پہلے آزادی دیں۔ کیوں کہ آزاد ہندوستان ہی فاشزم کے خلاف لڑائی میں حصہ لے سکتا ہے۔

اِس کے برعکس کمیونسٹ پارٹی کی رائے تھی کہ ہندوستان کی آزادی کو شرط بنا کر فاشزم کے خلاف جنگ میں انگریزوں سے تعاون کیا جائے کیوں کہ روس کی ہار اور فاشزم کی جیت کے بعد ہندوستان اور دیگر غلام ملک انگریزوں کی غلامی کی بجائے جرمنی اور جاپان کے غلام بن جائیں گے۔ اِس کے برخلاف انگریز اگر جیت بھی گئے تو وہ اتنے کمزور ہو جائیں گے کہ ہندوستان اور دیگر ممالک

کو غلام بناکر رکھنے کی ان میں سکت نہیں رہے گی۔
نظریاتی طور پر کمیونسٹ پارٹی کا تجزیہ صحیح نکلا۔ ۱۹۴۵ء میں جرمنی اور جاپان پر انگریزوں نے تو فتح حاصل کرلی۔ مگر ہندوستان سمیت دیگر نوآبادیاتی ملک بھی سامراج کی گرفت سے آزاد ہوگئے۔ نظریاتی طور پر صحیح ہونے کے باوجود جب ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی نے ۱۹۴۲ء کی Quit India تحریک میں حصہ نہیں لیا تو وہ قومی تحریک سے کٹ گئی تھی۔ بعد میں کمیونسٹ پارٹی نے تسلیم کیا کہ گو وہ نظریاتی طور پر صحیح تھی مگر عوام کو اپنا نظریہ سمجھانے میں ناکام رہی اور اُن سے کٹ گئی۔

لیکن یہ ایک پیچیدہ دَور تھا۔ ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی نے ۱۹۴۲ء میں چاہے غلطی کی ہو۔ مگر ہر کمیونسٹ کو اپنی پارٹی کے نظریہ کی صحت پر یقین تھا۔ اور وہ پارٹی کے ساتھ ڈٹ کر کھڑا رہا۔

کامریڈ ڈانگے نے پارٹی کو اس وقت بھی غلطی سے لڑا جب وہ ۱۹۴۸ء میں بائیں بازو کی انتہاپسندی کا شکار ہوکر تلنگانہ اور دیگر مقامات میں ہتھیار بند انقلاب کے راستے پر چل پڑی تھی۔

بڑی مشکل سے کمیونسٹ پارٹی کو کامریڈ ڈانگے انتہا پسندی کے راستے سے نکال کر لائے اور کانگریس سے "تعاون اور جد وجہد" کی پالیسی پر کمیونسٹ پارٹی کو گامزن کیا۔ مگر جب چین نے ۱۹۶۲ء میں ہندوستان پر حملہ کیا تو ایک بار پھر ہندوستانی کمیونسٹ تحریک اس تذبذب کا شکار ہوگئی کہ ایک کمیونسٹ ملک (چین) اور اپنے ملک ہندوستان کے درمیان ٹکراؤ کی صورت میں وہ کیا کرے۔ کمیونسٹ نظریے کے مطابق کوئی کمیونسٹ ملک دوسرے ملک پر قبضہ کرنے کے لیے حملہ آور نہیں ہوسکتا۔

...جیسی نظریے اور عمل میں تضاد بھی ہوسکتا ہے۔ اس بات کو ہمیشہ سے کمیونسٹ ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ چین نے نہرو کو سامراج کا پٹھو کہنا شروع کیا۔ لیکن کامریڈ ڈانگے نے کھل کر چین کی مخالفت کی اور نہرو کا ساتھ دیا اور کہا کہ چین کا ہندوستان پر حملہ غلط ہے اور ہم اپنے وطن ہندوستان کے ساتھ ہیں۔
لیکن ہندوستان پر چینی حملے کو لے کر ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی دو حصوں میں بٹ گئی۔ دوسرے نظریاتی سوالات کو بھی آڑ بناکر مارکسی کمیونسٹ پارٹی (CPM) وجود میں آگئی اور وہ ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی (CPI) سے الگ ہوگئی۔

بعض وجوہات کی بنا پر ۱۹۷۹ء میں کامریڈ ڈانگے کو CPI کی صدارت سے استعفیٰ دینا پڑا۔ وہ پارٹی کی مرکزی انتظامیہ اور پولٹ بیورو سے الگ ہوگئے اور پھر انہیں "آل انڈیا کمیونسٹ پارٹی" AICP نام سے ایک نئی کمیونسٹ پارٹی کی تشکیل کی مدد کے الزام میں CPI سے (جس کی بنیاد رکھنے والوں میں سے وہ خود ایک تھے) نکال دیا گیا۔ یہ اپریل ۱۹۸۱ء کی بات ہے۔

یہ اتفاق کی بات ہے کہ ٹھیک دس برس بعد اپریل ۱۹۹۱ میں وہ اِس دنیا سے چل بسے۔ ان کی موت راجیو گاندھی کی شہادت کے ایک دن بعد ہوئی۔ یہ بھی ایک تمثیلی حادثہ ہے۔ اپنی عمر کے آخری دس برسوں میں وہ اندرا گاندھی اور راجیو گاندھی کے زیادہ قریب آگئے۔ جب اندرا جی اور راجیو بمبئی آئے وہ کامریڈ ڈانگے سے ضرور ملتے تھے۔ سیاسی طور پر کامریڈ ڈانگے بے عمل ہو چکے تھے۔ اُن کی نئی پارٹی AICP ایک برائے نام پارٹی تھی اور کمیونسٹ تحریک کو دیکھتے ہوئے بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ وہ تنہا اور بغیر کسی نوٹس کے اِس دنیا سے کوچ کر جائیں گے۔ اُس شخص جس

نے ہندوستانی مزدور تحریک کو جنم دیا، جو مزدور عوام کا لاڈلا تھا۔ اُن کے بغیر آخری سفر کے لیے روانہ ہوگا۔ لیکن ہندوستان کے عوام الگ قسم کے لوگ ہیں۔ وہ اپنے سیاسی اختلافات کو اپنے رہنماؤں کے احترام میں آڑے نہیں آنے دیتے۔ کامریڈ ڈانگے جب مرے تو تمام رنگ کے کمیونسٹوں نے اُن کے جنازے میں شرکت کی۔ ملک کی حکومت نے اُن کی قومی آزادی کی جدوجہد میں کی جانے والی قربانیوں کو پارٹی تنگ نظری سے بالاتر ہو کر انہیں سرکاری اہتمام کے ساتھ ان کا انتم سنسکار کیا۔ ان کا جنازہ پریل کی اشمی دلوی بلڈنگ سے لے جایا گیا جہاں سے انھوں نے بمبئی کے گرنی کامگاروں کی رہنمائی کی تھی۔

اب جبکہ روس میں اور دنیا کے دوسرے ملکوں میں کمیونسٹ پارٹیاں چل چلاؤ کے دور سے گذر رہی ہیں ہندوستان میں کمیونسٹ تحریک کا کیا مستقبل ہے؟ یہ ایک پیچیدہ سوال ہے۔ اور اس کے لیے ایک الگ بحث کی ضرورت ہے۔ لیکن ہندوستانی کمیونسٹ تحریک اپنی تمام غلطیوں کے باوجود اسی سرزمین کی پیدائش ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ بین الاقوامی کمیونسٹ تحریک کی اور اپنی غلطیوں کا پھر سے جائزہ لے گی اور اُسی نظام کو قائم کرنے میں ضرور کامیاب ہوگی جس کا سائنٹفک خاکہ مارکس نے پیش کیا تھا مستقبل کی کمیونسٹ تحریک میں کامریڈ ڈانگے کی شخصیت کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا۔

تصحیح: قومی راج (۱۰ مارچ ۱۹۹۱ء) کے شمارے میں صفحہ ۳ کے دوسرے پیراگراف کو اس طرح پڑھا جائے "مہاتما جیوتی با پھلے نے تعلیم نسواں اور بیواؤں کی شادی کو عام کرنے اور ذات پات جیسی برائیوں کو سماج سے دور کرنے کیلئے اپنی ساری زندگی وقف کر دی تھی۔"

رباب جعفری
ثنا سیتا محل، بومن جی پیٹٹ روڈ،
بمبئی ۴۰۰۰۳۶

یاد

ننھے ننھے ستارے فلک پر
جگمگاتے رہے جھلملاتے رہے
چاند ہنستا رہا
کہکشاں مانگ بھرتی رہی
نیلگوں آسماں کی
حسنِ عالم سجاتی رہی
نقرئی ندیاں
کوہساروں سے بہتی رہیں
آبشار اپنے نغمے سناتے رہے
اور سمندر کی بیتاب، سیماب موجیں
سینۂ آب پر کھلکھلاتی رہیں
رات کی خم بہ خم کاکلیں
اپنی خوشبو لٹاتی رہیں
اور ایک یاد شاداب پھولوں کی مانند
میرے دل کے چمن کو بساتی رہی

مضطرب نظامی ۔ لکھنؤ (یوپی)

تنقید و تحقیق سے تبصرے اور تنقیص تک

یہ خیال بھی ایک واضح حقیقت ہے کہ زندگی ہو یا فن، دونوں کو نکھارنے کے لیے علم کی گہرائیوں کا جائزہ لینے کی اتنی شدید ضرورت نہیں جس قدر محسوسات اور شعور کی صلاحیت سے منفرد عنوان نمایاں کرنے کی ہے یہی اعجاز ایک نیا رخ اختیار کر سکتا ہے۔ مگر اس میں اصول اور خالص نظریہ شامل ہو محض پرکھ پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ وہ توجیہ جو زندگی اور مسائل کائنات کی طرف رجوع کرے اس کی تشریح ضروری ہے کیوں کہ بیسویں صدی اپنے جلو میں انگنت مسائل لے کر رونما ہوئی ہے۔ ایک سمت تو زبوں حالی و پراگندگی کا منظر، تو دوسری جانب فکر و شعور کے خوشنما جال بچھے ہیں۔ ایسے عالم میں نجات کی راہیں ہموار کرنے کے لیے ایک نئے ماحول کی ضرورت ہے وہ اس لیے کہ صحیح نباضی کرنے والا زندگی کا امین ہوتا ہے۔ اور زندگی کو وہ حسین پیکر میں دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ ناامیدی کا قائل نہیں ہوتا بلکہ ایسے عالم میں بھی اپنی جد و جہد سے فتح کا پرچم لہرا دیتا ہے اور زندگی کو نئی جہت سے روشناس کرنے کے لیے عزم محکم کے ساتھ آگے بڑھتا ہے اور اپنی صلاحیتوں کو تاریخ کا سنہرا باب بنا دیتا ہے۔

نفسیاتِ انسانی بذاتِ خود گلِ صد رنگ ہے جس میں جمالیاتی شعور وہ کسی عنوان کا ہو خوشبوئے ابدی ہے کیونکہ اسی شعور کی خوشبو محسوسات کی عام روش سے ہٹ کر وجدانی کیفیت کی آئینہ دار ہو جاتی ہے اور اسی وجہ سے فنکار پاکیزہ احساسات کی بنا پر اظہاریت کی جو راہ تراشتا ہے وہ اسکے حقیقی جذبے اور ماحول کے تاثرات کی دلیل ہوتی ہے۔

بہر حال انسان کی اہمیت اور زندگی کے کچھ مظاہر ہوتے ہیں۔ کچھ افادی کچھ غیر افادی۔ افادی عنصر وہ ہیں جو حیاتِ انسانی کے ہر ماحول میں لحظہ بہ لحظہ مسلسل اثر پذیر ہوتے رہتے ہیں اور اسی واسطے ان کی فوقیت آفاقی ہو جاتی ہے۔ جو فنکار ایسے عناصر کو اہمیت دیتے ہیں وہ ادب کی ہر روش کو کہکشاں بناتے ہوئے گذر جاتے ہیں اور جو اس خصوصیت کو نظر انداز کرتے ہیں وہ کوئی تاریخی سرمایہ ادب میں نہیں چھوڑتے نہ دیر تک محل کی زینت بنتے ہیں۔ ان کا ادب و فن قاری کے لیے غیر افادی اور سعی رائگاں ہوتا ہے۔ کیوں کہ انسان اور انسانیت کی کڑیاں ایک دوسرے سے وابستہ ہیں انسان کی انسانیت اور احساس کی

جد و جہد نے نئی زندگی کو روشنی دے کر کائنات کو پرکھنے کیلئے راہ ہموار کی۔

غالب: آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا'
میر: آدمی ہونا بہت مشکل ہے یاں'

یوں تو ہر انسان اپنی جگہ بہر حال انسان ہے لیکن انسانیت زندگی پر ایک جلا ہے اگر اس پر جلا نہیں ہوتی تو یہ آئینہ زنگ آلود ہو جاتا ہے۔ اس لیے انسانی شعور رفتہ رفتہ زندگی کی تہیں کھولتا رہا اور زندگی پر اس عہد سے انسانیت اثر پذیر ہونے لگی۔ جب سے انسان نے تہذیب و تمدن کے دائرے میں آکر اجتماعی شکل میں زندگی کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی اور انسانیت کے شعور نے آخر انسانی زندگی کے الجھے ہوئے حالات اور سماجی ماحول کو بدل کر نئے مستقبل سے روشناس کیا، ہمیں نئے شعور سے صرف یہی نہیں حاصل ہوا کہ خارجی دنیا مادی یا روحانی ہے اور مسلسل حرکت میں ہے بلکہ ہمیں با اصول زندگی گزارنے کا شعور بھی عطا کیا اور اسی شعور نے انسان کے اندر علم، تحقیق، و تنقید کا جذبہ نمایاں کیا۔

یہ ممکن ہے کہ ہم کسی واقع اور حادثہ کے سبب سے آگاہ نہ ہوں لیکن اب ہمارے فہم سے یہ بات باہر نہیں ہے کہ جو بھی واقعہ ہوگا اس کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہوگا لیکن ہر واقع کا صرف سبب ہی لازم نہیں بلکہ ہر سبب کا ایک نتیجہ بھی ہوتا ہے اور یہی متواتر عمل ہے جس سے ہمارا علم آج ایسے بام عروج پر ہے کہ ہم حال سے لیکر مستقبل تک پیشین گوئی بھی کر سکتے ہیں۔

زبان کے لحاظ سے کسی بھی ادبی شاہکار کی تنقید ملک کے جغرافیائی صورت یا حالات کی بنا پر کیوں نہ ہو مگر فطری طور پر کچھ اصول قدرِ مشترک ہوتے ہیں یہ تو ہو سکتا ہے کہ تنقیدی نظریات جداگانہ ہوں لیکن انھیں نظریات میں تنقیدی فضیلتیں بھی مضمر ہیں بشرطیکہ تنقید دیانتداری پر منحصر ہو تو تخلیق کے درجہ پر فائض ہو جاتی ہے۔ اور یہی تنقید ادب کی نباضی کر کے افادیت اور ارتقا کا سبب بنتی ہے۔

(تنقید) اجتماعی کے ہر نشیب و فراز کا تجزیہ کر کے ظاہر و باطن کے توازن کے ساتھ امتیازی لمحات کی نشاندہی کرتی ہے
(تنقید) اجتماعی اور انفرادی حالات کو کسوٹی پر پرکھ کر انسانی زندگی کے دیگر پہلوؤں اور رازہائے سربستہ میں جھانک کر نقاب کشائی کرتی ہے۔

(تنقید) فن اور فنکار کے درمیان تحسین رابطوں کی کھوج کر کے خیالات کے الجھے ہوئے ریشم کو سلجھا کر ایک توازن پیش کرتی ہے۔

(تنقید) بیک وقت خار و گل بھی ہے' اور عطرِ خالص بھی۔
(تنقید) تنقید جب فکر کی گہرائیوں کا جائزہ لیتی ہے تو تخریبی اور تعمیری پہلو بہ ہر رنگ ابھر آتے ہیں۔ پھیلاؤ ایک کوزے میں سمٹ آتا ہے۔ اور وسعتیں بے پایاں ہو جاتی ہیں۔ فن کے تخریبی پہلو کی نشاندھی صحت مند ادب کی طرح بن جاتی ہے۔ عصبیت کے پردے چاک ہو جاتے ہیں۔ تعمیری پہلو جب اجاگر ہوتا ہے تو اعلیٰ اور پاکیزہ ادب کی زیبائش اور بھی حیات آفریں ہو جاتی ہے۔

(عصری تنقید و تحقیق) تنقید و تحقیق کا بنیادی مقصد ایک پرکھ ہے جس سے حالات کی پرتیں کھلتی ہیں اور واضح کرتی ہیں کہ کس چیز پر کتنا ملمع ہے یعنی کتنا کھوٹا ہے اور کتنا کھرا۔ کیوں کہ زندگی کے ہر شعبہ میں ادب سے لے کر ذاتیات تک یہ جراثیم سرایت کیے ہیں۔ لیکن صحیح تنقید و تحقیق کی حقیقت ماہیت کو رونما کرتی ہے۔ مگر کچھ اُدبا کے ہاں مختلف النوع تعصبات زیادہ تر مشترک ہیں کیوں کہ ایمانداری کا جذبہ ایک مشکل امر ہے۔

معتبر حوالے کے بغیر تنقید و تحقیق قابلِ اعتماد نہیں ہوتی عام طور پر صاحبِ تحقیق شائع شدہ کتابوں پر اکتفا کرتے ہیں جو اختلاف و متن یا انتسابات کے زیر اثر حوصلہ مندی کے ساتھ شائع شدہ سرمائے کے نمونے پیش کرتی ہیں لیکن ہر محقق

ایسا نہیں کرتا۔ یعنی گمشدہ چیزوں کی فراہمی اور جو سرمایہ کسی وجہ سے منظر عام پر نہیں آسکا اس کی تلاش کو تحقیق کا مقصد سمجھتا ہے۔ محقق جب تک مطمئن نہیں ہوتا وہ ہر سرمایہ کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ابتدا میں تحقیق کی بنیادی روش شکوک پر ہوتی ہے۔ اور رفتہ رفتہ مغالطہ کی راہ سے گذر کر یقین کی منزلوں میں پہنچتی ہے

(تنقید) صالح تنقید نگار کے اصولوں میں اسکے فن کا عرفان جھلکتا ہے۔ اس لیے ہر تنقید نگار کا فریضہ ہے کہ تعصب سے گریز کرکے فنکار کے اندرون کا جائزہ لیکر اس کے فنی شعور میں رقص کرتے ہوئے جذبات و احساسات کو نمایاں کرے اور تنقیدی مطالعہ کے ساتھ یہ معلوم کرے کہ مصنف کے جذبات و خیالات میں حقیقی سبب موجود ہے کہ نہیں وہ اس لیے کہ ایک بہترین جذبہ صرف اس بنیاد پر کہ اس کے لیے باضابطہ سبب موجود نہیں ہے کسی اہمیت کا حامل نہیں ہوتا۔

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ ادب و تاثر کے خصوصی اور عمومی، عالمی اصولوں کے درمیان تناسب اور سبب کی صورت کیا ہوگی۔ کون سا گوشہ محدود اور کون سا آفاقی ہوگا یہ ادبی تنقید کا نہایت اہم اور نازک مسئلہ ہے اس میں اختلاف، بحث اور نفرت کا پہلو بھی آجاتا ہے ان حالات میں ادب پارے کی عالمیت پر ایک ضرب کاری پڑتی ہے ایسے عالم میں اعلیٰ تنقید نگار ہر ادبی تنقید میں فکر و فن کا جو مرکب ہوتا ہے اس کی مجموعی قدروں کا معیار قائم کرتا ہے اور فروعی جذبات کو نظرانداز کردیتا ہے (بقول رسکن) آتش بازی کا دلفریب نظارہ کسی مجمع کے لیے وقتی طور پر نظر فریب تو ہوسکتا ہے مگر کسی کلی کا کم کم کھل کر پھول بنجانا جو جذبۂ تاثر اور مشاہدے کا سبب بنتا ہے وہ شاعرانہ تاثر کے ساتھ روح میں بالیدگی پیدا کرتا ہے اس مشاہدے اور تاثر کی جتنی بھی تعریف و توجیہ کی جائے وہ کم ہے

اسی صورت سے کسی ادبی سرمایہ کا مطالعہ کرتے وقت یہ بات لازم و ملزوم ہوجاتی ہے کہ جذبۂ تاثر کے ساتھ سرمایہ میں کیا خاص بات ہے کہ اگر یہ سرمایہ وقتی جذبات کی آئینہ داری کرتا ہے تو یہ سرمایہ محدودِ دائرہ ہوکر رہ جاتا ہے۔ برخلاف اس کے اگر ادب میں صحت مند بیداری ہے تو مستقبل کی کرنیں پھوٹ پڑتی ہیں اور تنقید نگار ان کرنوں کو سمیٹ کر ہر نئی صبح کے لیے آفتابِ درخشاں بنا دیتا ہے۔

(ہڈسن) نے تنقید کی تعریف میں لکھا ہے، تنقید وہ اثاثہ ہے جو ادب کے لیے لکھا گیا ہو اور اس ادب میں چاہے وضاحت کی کوشش کی گئی ہو یا تعریف و توصیف۔ لیکن تمام اوصاف زندگی کی تشریح کرتے ہیں۔

(تبصرہ) دراصل تبصرے کی بنیادی حقیقت کو مکمل طور پر تنقید تو کہنا مشکل ہے کیوں کہ یہ عنوان تنقید سے ایک علاحدہ حیثیت رکھتا۔ اس کے باوجود تبصرے میں کبھی کبھی تنقیدی پہلو ضرور آجاتے ہیں۔ مغربی تبصرہ نگار اس بات پر زیادہ متفق ہیں کہ تبصرے میں براہِ راست تنقید اس لیے نہیں ہوسکتی کہ تنقید ایک الگ فن ہے۔ عام طور پر جو بھی فنکار اپنے افکار عالیہ پیش کرتے ہیں اور جن خیالات کے تحت اپنی فکری اور جذباتی کیفیت کی وضاحت کرتے ہیں قاری اس سے باقاعدہ واقف ہوجائے اس لیے تبصرہ نگار کا صرف یہ کام رہ جاتا ہے کہ وہ دیانتداری سے تمام عنوانات پر گہری نظر ڈال کر لطیف انداز میں اس کی وضاحت کردے جن سے تمام موضوعات آبدار ہوکر آئینہ کی طرح منور ہوجائیں

تبصرہ، یعنی ادبی دنیا میں ایک خاص تعارف و وضاحت کا حامل ہے لیکن تنقیدی نظریہ کے ساتھ فکری خصوصیات پر روشنی ڈالنے سے تجزیہ کا پہلو بھی نمایاں ہوجاتا ہے جسمیں عیوب اور محاسن کی بحث لازمی ہوجاتی ہے اسی سے کچھ ادبا کا خیال ہے کہ تبصرے میں معائب و محاسن کا جائزہ لینا ہی

غلط ہے لیکن تبصرہ نگار کے لیے ان دونوں اصولوں سے رُوگردانی دشوار طلب ہے۔ تبصرہ نگار اگر سچائی سے کام لیتا ہے تو تعارف کے پیکر میں چند تنقیدی خیالات کی توجیہ بھی ناگزیر ہے کیونکہ مطالعے کے بعد ہی کچھ اصول مرتب کئے جاتے ہیں جو تبصرے میں اجاگر ہو جاتے ہیں لیکن یہ لحاظ بھی بہت ضروری ہے کہ تبصرہ براہ راست تنقیص نہ ہونے پائے (تنقیص) سے عام طور پر کشمکش اور رنجش کا ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر تبصرہ اور تنقید ساتھ ساتھ ہوں تو پھر کچھ باتیں تبصرہ نگار پر فرض ہو جاتی ہیں یعنی وہ بہ نظر غائر مطالعہ کرے کہ فنکار نے اپنے جزئیات واحساسات کو جس ذمہ داری سے پیش کیا ہے وہ اس میں کہاں تک کامیاب ہے اس کے علاوہ تبصرہ نگار کو یہ حق بھی نہیں کہ فنکار کے جزئیات، نجی مسائل یا اس کی وہ راہ جو اس نے اپنی منزل تک پہونچنے کے لیے تراشی ہے وہ کیسی ہے اور اس کے وجوہ کیا ہیں۔

حالی نے ایسی تبصرہ نگاری کی بنیاد ڈالی تھی کہ لیکن کچھ تبصرہ نگاروں نے تبصرے اور تنقید کو تنقیص بنا دیا جس سے کچھ اچھے نتائج برآمد نہیں ہوئے۔ کم ہی ایسے مفکر ہوں گے جو تنقید و تنقیص کے اس پہلو کو گوارا کریں جس میں ان کی کوتاہیوں کی نشاندہی کی گئی ہو۔ خود ستائی کی تہیں اتنی دبیز اور گہری ہیں کہ ان پرتوں کا جائزہ لینا بھی دشوار تر ہے بہرحال بنیادی طور پر ایماندار تبصرہ نگار کسی فن پارے پر تبصرہ کرتے وقت فنکار کے فن کو قوتِ حرارت (NETENERGI) میں تبدیل کر دیتا ہے۔ تو بصیرت و شعبگی، برجستگی، لمس، حسن سماعت، یا غور و فکر کے پیکروں کو اپنے احساس و شعور وسعتِ لاشعور اور داخلی دلکشیوں میں سمو کر اپنی نبضِ حرارت سے کام لیتا ہے تو تبصرے میں (THIRD DIMENTION) یعنی گہرائی کچھ زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ تبصرہ نگار جب فن کے رنگوں میں ڈوب کر فنکار کے تجربے اور اس کا رشتہ مستقبل کے خوش آئند مسئلوں سے جوڑ کر ایک حقیقی پیکر کے جلو میں صدہا صداقتوں کا حسن اور اس کی جلوہ پاشیوں میں رنگ آمیزی کرتا ہے تو ادبی سرمایہ کا چہرہ زیادہ نکھرتا ہے۔

لیکن کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ عام طور پر تبصروں میں روایتی انداز ہوتا ہے۔ تبصرے سے تخلیقی اہمیت اور جمالیاتی قدروں کا احساس کم رونما ہوتا ہے۔ یوں تو تبصرہ نگاروں نے اپنے نظریوں کی حد بندی کی ہے چند فارمولے، کچھ کتابیں اور اقتباسات، یا پھر حریفانہ کشمکش کے سوا کچھ بھی نہیں یہاں کہنا ضرور یہ ہے جس تبصرہ میں فنکار کے پُراسرار عمل کا تجزیہ نہ ہو تا فن کی پاکیزگی پر روشنی نہ ڈالی گئی ہو۔ جس نے فن کے ذاتی منش نہ پائے ہوں۔ حقائق سے گریز کیا ہو ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ تبصرے کے کچھ اصول ہیں اور یہ تبصرہ نگار کی ذمہ داری ہے۔

ساجد رشید -
چیتے بلڈنگ، مالک
باندرہ (مغرب)
بمبئی ۴۰۰۰۱۱

دوپہر

دربار عام کے صدر دروازے پر ایک جم غفیر بادشاہ کا وہ تاریخی فیصلہ سننے کے لئے بے تاب تھا جو آنے والی نسلوں میں ضرب المثل بننے [والا] تھا: وزراء بادشاہ کی دائیں طرف کی صف میں اپنی اپنی نشستوں پر دم بخود بیٹھے ہوئے تھے۔ [سب کی] آنکھیں اس بوڑھے پر جمی ہوئی تھیں جس نے پرانی دھوتی اور پھٹا انگرکھا پہن رکھا تھا۔ بوڑھے [کے س]اتھ ایک نوجوان عورت بھی تھی جس نے میلی دھوتی کا ہاتھ بھر لمبا گھونگھٹ کاڑھ رکھا تھا۔ [اس عور]ت کی گوری کلائیاں اور پیروں کی دودھ جیسی ایڑیاں اس کے خوبصورت ہونے کی ضمانت [دے] رہی تھیں۔

بوڑھے مدی نے بادشاہ کے حضور میں فریاد کی تھی کہ ولی عہد سلطنت نے اس کے گھر کے [سامن]ے سے گذرتے ہوئے گھوڑے کی پیٹھ سے اچک کر اس کے آنگن میں جھانک لیا تھا۔ جہاں اس کی [بہو ب]یٹھی نہا رہی تھی۔ ولی عہد نے اس پر اکتفا نہ کرتے ہوئے اپنے سینے پر لگے گلاب کے پھول کو نکال [کر اس ل]ڑکی بہو پر پھینک کر اسے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا تھا۔ آج بوڑھے کی اس فریاد کا فیصلہ ہونا [تھا]۔

بوڑھے کی فریاد اور اس کی بہو کا بیان سننے کے بعد بادشاہ نے چند لمحوں کے لئے خاموشی اختیار [کی۔ ا]س نے درباریوں کو ایک خوفناک کشمکش و پنج میں ڈال دیا تھا۔ وزیر اعظم اپنی خونخوار نظروں [سے ا]یسی بوڑھے کو تو کبھی اس کی خوب صورت جوان بہو کو گھورنے لگتا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا بادشاہ [کی] فراخ دلی اور نرمی نے رعایا کو کچھ زیادہ ہی حساس اور بے باک بنا دیا ہے کہ وہ اب شاہی [خاند]ان پر بھی انگلی اٹھانے کی جرأت کرنے لگی ہے۔

ادھر صدر دروازے پر کھڑی خلقت سوچ رہی تھی کہ بوڑھے نے اپنے نوجوان بیٹے کے جوش و خروش کے دباؤ میں آکر بادشاہ سے انصاف کا تقاضہ کر کے خود اپنے حق میں کانٹے بو لئے ہیں۔ "آج بڈھے کی خیر نہیں" انہیں لوگوں میں گھرا بوڑھے کا نوجوان بیٹا فیصلے کی گھڑی کا منتظر تھا۔

بوڑھے کے پیروں میں ایک بے نام سے خوف کے تحت رعشہ آگیا تھا۔ بادشاہ کی چند لمحوں کی خاموشی اس کے اعصاب پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ وہ اس لمحے کو کوس رہا تھا جب اس نے بیٹے کے غصے کے رعب میں آکر بادشاہ سے فریاد کی تھی۔

بادشاہ نے کھنکھار کر حلق صاف کیا اور سب کی نظریں بوڑھے کے استخوانی ڈھانچے سے اچٹ کر بادشاہ کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ بادشاہ نے بائیں ہاتھ سے دائیں ہاتھ کی درمیانی انگلی میں پھنسی زمردی انگوٹھی کو دھیرے دھیرے گھماتے ہوئے اپنا فیصلہ سنایا۔

"ہمارے نظام میں فرد پر انصاف کو فوقیت حاصل ہے۔ انصاف بادشاہ کے بیٹے سے لے کر گڈریئے تک یکساں ہے۔ ہم نے آج تک ملزم کی شناخت اس کے ابدادا کی نیک نامی سے نہیں بلکہ "فرد جرم" سے کی ہے۔ ہمیں غریب بوڑھے اور پاک باز خاتون سے پوری ہمدردی ہے کہ ان کی عزت پر شاہی خاندان کے ایک فرد نے غلط نگاہ ڈالی۔ جس کی سزا یہ ہے کہ ولی عہد کی بیگم بوڑھے مدی کے اس آنگن میں غسل فرمائیں گی اور جس گھوڑے پر ولی عہد سوار تھے اسی گھوڑے پر اس خاتون کا شوہر بیٹھ کر ولی عہد کی بیگم پر گلاب کا پھول پھینک کر ان پر اسی طرح سے ایک نگاہ غلط ڈالے گا۔"

بادشاہ کے اس فیصلے کو سُن کر درباریوں کو سکتہ طاری ہوگیا۔ شعلہ بار آنکھوں سے گھورتے ہوئے مصاحبوں کے ہاتھوں کی گرفت تلوار کے دستوں پر سخت ہوگئی۔ دیوانِ عام کے صدر دروازے پر کھڑی رعایا بادشاہ کے اس غیر متوقع فیصلے کو سن کر جذبات سے بے قابو ہوگئی۔ "حضور کا اقبال بلند ہو" کے نعروں سے محل گونج اٹھا۔ رعایا کے اس خیال پر بادشاہ نے آج ثبت مہر کردی تھی کہ بادشاہ سلامت کے نزدیک رعایا اور شاہی خاندان کی عزت اور وقار میں کوئی امتیاز نہیں ہے۔

بادشاہ کا فیصلہ سن کر بوڑھے پر لرزہ طاری ہوگیا۔ شاہی خاندان کی بہو کو مجھ کم ذات کا لڑکا بے پردہ دیکھے گا! نہیں نہیں یہ کیسے ہوسکتا ہے! سیکڑوں برس کی گھٹی بوڑھے کے چہرے کی جھریوں سے جھانکنے لگی۔ وہ دونوں کو جوڑ کر بادشاہ سے بڑی لجاجت سے بولا۔

"حضور کا سایہ ہم غریبوں پر قیامت تک سلامت رہے۔ حضور میں نے انصاف پالیا ہے۔ آپ کے فیصلے نے میرے بزرگوں کی عزت رکھ لی ہے۔ اب مجھے کچھ اور نہیں چاہیے۔ اب مجھے کچھ اور نہیں چاہیے۔ کچھ نہیں۔" کہتے کہتے بوڑھے کی آواز بھرّا گئی اور آنکھوں سے آنسو بہہ کر اس کے چہرے کی جھریوں کو سیراب کرنے لگے۔

بوڑھے کی اس التجا کو سن کر درباریوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ مصاحبوں کی گرفت تلوار کے دستوں پر ڈھیلی پڑگئی۔ دربارِ عام کے صدر دروازے پر کھڑے لوگوں میں سے کسی کے چہرے پر خوشی کے رنگ کے چہرے پر غصے کے رنگ کسی کے چہرے پر شک کے تاثرات پھیل گئے۔ بوڑھے کا بیٹا غصے سے تلملایا بھولے بھیڑ کو چیر کر باہر نکل گیا۔

بوڑھا ہاتھ جوڑ کر بادشاہ کے حضور میں دوہرا ہوگیا۔ درباریوں، مصاحبوں، امرا، اور وزراء کے چہرے اندر کسی فتح کو محسوس کرکے دمک اٹھے۔ بوڑھے نے بہو کو اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ اور الٹے قدموں دربار سے صدر دروازے کی طرف مڑ گیا۔ بوڑھے کی بہو گھونگھٹ کاڑھے اپنے سسر کے پیچھے سائے کی طرح چل دی۔ وہ جب داروغۂ زنداں کے قریب سے گذری تو داروغۂ زنداں نے اپنی تجربہ کار آنکھوں سے اسے کپڑوں کے اندر تک ٹٹول ڈالا۔

بوڑھے نے جیسے ہی گھر میں قدم رکھا اس کا بیٹا برس پڑا۔

"تم نے بادشاہ سلامت کے فیصلے کو کاٹ کیوں دیا؟ یہی لئے نا کہ بادشاہ کے بیٹے کو سزا ملتی اگر ہماری برادری میں سے کسی کے خلاف ہوتا یہ فیصلہ تو کیا تم ایسے ہی چھوڑ دیتے۔ تم نے.........."

"آہستہ بولو بیٹا" بوڑھا پھٹی پھٹی آنکھوں سے آس پاس دیکھتے ہوئے خوف سے بولا۔ کوئی سن لے گا تو غضب ہوجائے گا۔ بیٹا ہم بہت چھوٹے لوگ ہیں۔ وہ شاہی خاندان، ہمارے ان داتا بھلا کیسے ہوسکتا ہے کہ..."

بیٹے نے باپ کی بات سے اتفاق نہیں کیا اور غصے سے ہانپتا گھر سے باہر چلا گیا۔

○ ○

اُس رات بوڑھے، بیٹے اور بہو پر ہی نہیں پورے چمار ٹولے پر قیامت گذری۔ وہ جیپ لے کر چمار ٹولے کی گلیوں میں گھس گئے اور آدمی طوفان کی طرح سارے چمار ٹولے کو روند ڈالا۔ عورتوں، بوڑھوں اور بچوں میں کوئی تمیز باقی نہیں رکھی۔ عجیب ڈاکو تھے، لوٹ نہیں رہے تھے بس سب کچھ تہس نہس کر رہے تھے۔ مال و اسباب سے لے کر عصمت تک! جو لٹ رہے تھے خود انہیں پتہ نہیں تھا کہ آخر یہ سب کیوں ہو رہا ہے۔ کون کیسی دشمنی نکال رہا ہے۔ بوڑھے کے کچے مکان میں گھس کر انہوں نے بوڑھے اور اس کے بیٹے کو رائفل کے کندوں سے مار مار کر ادھ مرا کر ڈالا۔ دو کڑیل جوانوں نے ان کی مشکیں کس دیں۔ بقیہ دو نے بوڑھے کی بہو کو رائفل کی زد پر لے لیا۔ کمان جیسی گھنی مونچھوں والے موٹے بدشکل آدمی نے نشے میں جھومتے ہوئے بہو کو بے لباس کیا۔ بوڑھے نے آنکھیں بند کرلیں اور سر جھکا لیا۔ بوڑھے کے بیٹے نے یکبارگی چھوٹ بھاگنے کی کوشش کی لیکن اس کے سر پر پڑنے والی بندوق کے دستے کی ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ اندھیرے میں ڈوب گیا...

○ ○

ادھر جب سورج پہاڑیوں میں چھپا اور محل پر اندھیرا پھیلا تو موم کی شمعیں روشن کردی گئیں۔ بادشاہ اپنے حرم میں بیگمات کی آغوش میں چلے گئے۔ ولی عہد نے بادشاہ کے مصاحبوں کے ساتھ ناؤ نوش کی محفل سجائی۔ بادشاہ کے مصاحب اس وقت ولی عہد کے مصاحب بن گئے تھے۔ اور ولی عہد کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔

ولی عہد نے نشے سے بوجھل پلکوں کو اٹھا کر وزیر اعظم کی طرف دیکھا۔

"فرمائیے حضور"

وزیر اعظم نے جھکتے ہوئے انکساری کا مظاہرہ کیا۔

"آج تو ابّا حضور نے ہماری جان ہی لے لی تھی"

ولی عہد کا اشارہ بادشاہ کے فیصلے کی طرف تھا۔

"اگر بوڑھے نے ابّا حضور کے فیصلے کو مان لیا ہوتا تو۔ اُف خدایا..."

ولی عہد نے آنکھیں بند کرکے نقرئی جام خالی کردیا۔

"حضور بادشاہ سلامت نے فیصلہ دے کر اپنی عظیم عقلیت کا ثبوت دیا ہے۔ بادشاہ سلامت اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ پست ذات بوڑھا جس کی سات پشتوں نے حضور کے اجداد کے جوتے گانٹھے ہیں۔ اس میں یہ جرأت پیدا ہی نہیں ہوسکتی کہ وہ بادشاہ سلامت کے فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کا تصور بھی کرسکے۔"

وزیراعظم کا تجربہ سن کر دلی عہد کی آنکھیں چمک اٹھیں اور وہ آبا معنوی کی علمیت کا دل سے قائل ہو گیا۔

○ ○

دس میل کا سفر پیدل طے کر کے وہ تینوں باپ، بیٹے، بہو تحصیل پہونچے ہیں۔ ان کے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ وہ یہاں تک بس میں آتے۔ گھر سے چلتے سمے بوڑھے نے کپڑے کے چھے میں جو کا ستو باندھ لیا تھا۔ ایک چائے کی دکان پر نل سے پانی لے کر لوٹے میں تک ستو گھول کر باپ بیٹے نے پیا۔ بہو سے لاکھ کہا مگر وہ صبر اور باہر کے درد سے سسک سسک کر انکار کرتی رہی۔

جیٹھ کا سورج سر پر ہے۔ دھوپ کے طمانچے چہروں پر پڑنے لگے ہیں۔ وہ جب تھانے پہنچے تو سنتری نے بوڑھے کو حقارت اور بہو کو شہوت بھری نظروں سے دیکھ کر کہا۔

"کیا بات ہے؟ بلاتکار (زنا بالجبر) کی رپٹ کرنے آئے ہو کیا؟ سالے تم چمار لوگن نے افسروں کو پھنسانے کے لئے بلاتکار کا اچھا بہانہ بنا لیا ہے۔"

"جی سنتری جی ——— ہم ڈاکوؤں کے بارے ۔ ۔ ۔"

بوڑھا تھانے کی سنگلاخ عمارت کو دیکھ کر ہی ڈر گیا تھا اس کی آواز نکل ہی نہیں رہی تھی۔

"ہم کو داروغہ جی سے ملنا ہے۔" بوڑھے کے بیٹے نے ہمت سے کام لیا۔

"کچھ نذرانہ لائے ہو؟" سنتری نے رعب جماتے ہوئے پوچھا۔

"نذرانہ کیسا؟" بوڑھے کے بیٹے نے حیرت سے پوچھا۔

"نذرانہ نہیں ہے تو کیا اپنی مہریا کو نذرانے میں دو گے؟" سنتری نے بہو کو اوپر سے نیچے تک گھورتے ہوئے ڈپٹ کر کہا۔

"کون ہے بے بڈھے؟" اندر سے کہیں ایک پاٹ دار آواز آئی۔

"داروغہ جی دو تین چمار ایک چمارن ہے۔ سرکار سے کچھ رپٹ لکھانا چاہتے ہیں۔" سنتری گڑبڑا سے ہی چیخا۔

"بھیجا دو۔" وہی آواز آئی۔

"جاؤ وہ سامنے والے کمرے میں چلے جاؤ۔ داروغہ جی آرام کر رہے ہیں۔" سنتری نے ہاتھ اٹھا کر ایک طرف اشارہ کیا۔

تینوں جھجکتے ہوئے داروغہ جی کے کمرے میں پہونچے۔ بدن سے ننگا، کمان جیسی گھنی مونچھوں والا موٹا، بدشکل آدمی میز پر پیر پسارے ایک دیہاتی سے ہاتھ دبوا رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی بہو کی گھٹی گھٹی چیخ نکل گئی اور وہ بے تحاشہ بھاگ نکلی۔ دونوں باپ بیٹے اس کے پیچھے پکے آوازیں دیتے رہے تھے مگر وہ دوڑتی ہوئی تھانے کی سنگلاخ عمارت سے باہر نکل گئی۔ مسلسل بازار میں جا لیا۔ وہ کسی گوریا کی طرح ہانپ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔

"یہ وہی ہے دادا، وہی ہے۔ بھاگ چلو یہاں سے بھاگ چلو۔"

بہو نے کانپتے ہوئے جلدی جلدی کہا۔ باپ بیٹے دونوں کی آنکھوں میں رات کی شکلیں واضح ہونے لگیں۔

وہ تینوں گاؤں جانے والی کالی سڑک پر چلچلاتی دھوپ میں ننگے پیر چل رہے تھے۔ سڑک کے دونوں کناروں پر پھیلے سوکھے کھیت دھوپ سے جل جل کر ہانپ رہے تھے۔

"دادا ہمیں ایسے چپ نہیں بیٹھنا چاہیئے۔" کچھ دیر بعد بوڑھے کے بیٹے نے رک کر ہانپتے ہوئے کہا۔

"تب کیا کیا جائے بیٹا؟"

بوڑھے نے سہمی نظروں سے بیٹے کے ارادے کو جاننا چاہا۔

"ہم عدالت میں جائیں گے۔ جج صاحب سے انصاف مانگیں گے ان لوگوں کو ایسے چھوڑ دینا پاپ ہو گا۔"

بہو یکبارگی چونک پڑی۔ بوڑھا گھور کر بیٹے کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"نہیں بیٹا نہیں" ——— کیا پتہ وہاں بھی یہی سب ——— جج صاحب بھی ——— نہیں بیٹا نہیں۔"

بوڑھے کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر دھوپ سے تپتے چہرے کی جھریوں میں جل گئے۔

وہ تینوں تھکے ہارے آگ برساتے آسمان کے نیچے اور تپتی زمین کے اوپر ایک نہ ختم ہونے والی سڑک پر دھیرے دھیرے چلے جا رہے ہیں۔

○ ○

ماضی کے آئینہ سے

احمد ہمیش

علّامہ اقبال اور ہندوستان کی پُرانی تاریخ کا احترام

"ھمالہ" کے علاوہ بانگِ درا کی دوسری چند نظمیں ہندوستان کی پُرانی تاریخ کے نمائندہ اور عظیم کرداروں کی ترجمان ہیں۔ نظم "رام" میں شری رام چندر جی کی عظمت کو اقبال نے انتہائی احترام سے پیش کیا ہے۔ اس حد تک کہ خطۂ مغرب کے سب فلسفی رام کے آگے سر جھکاتے ہیں۔ اور اسی لیے رام کے وجود پہ ہندوستان کو ناز ہے ؎

اعجاز اس چراغِ ہدایت کا ہے یہی
روشن تراز سحر ہے زمانے میں شامِ ہند
تلوار کا دھنی تھا، شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں جوشِ محبت میں فرد تھا

دراصل اقبال نے وطنیت کے سیاسی تصور پر ضرب لگائی کیوں کہ اس کے پس منظر میں انگریزوں کی جھوٹی سیاست تھی جو اپنا گھر بھر کے کمزور کا گھر تباہ کر رہی تھی چنانچہ انہوں نے وطنیت کی قدیم وحدت کو موضوع بنایا یہ وہ موضوع تھا جس کی ابتدا "وحدت الوجود" کے نظریے سے ہندوستان میں شری شنکر آچاریہ نے کی تھی

اس کی رُو سے کائنات کو وجود کی وحدت مانا گیا۔ رام تیرتھ کا عقیدہ بھی وحدت الوجود کا نظریہ تھا۔ انہوں نے گنگا میں سمادھی لگائی تھی۔ ہندوؤں کے اس عظیم کو اقبال نے لبیک کہا ؎

ہم بغل دریا سے ہے اے قطرۂ بیتاب تو
پہلے گوہر تھا بنا، اب گوہرِ نایاب تو
نفیٔ ہستی اک کرشمہ ہے دلِ آگاہ کا
لا کے دریا میں نہاں موتی ہے اِلا اللہ کا

کون نہیں جانتا کہ گرو نانک نے مذہبی ... کے اعلیٰ تصورات اور اصولوں سے ہندوستان کو روشن کیا۔ البتہ اقبال نے جس انداز سے نانک کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے، اس کی مثال اس سے قبل کہیں نہیں ملتی۔

پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مردِ کامل نے جگایا خواب سے

بیبت یہ ہے کہ اعتراض کرنے والے "بانگِ درا"
۱۹۰ء سے پہلے کی نظموں کے دور کو یکسر رد کر کے اس
ہند کی نظموں کو صحیح نظریہ کی نظمیں گردانتے ہیں۔ اور
ظریہ اُن کے خیال میں اقبال کا ملی نقطہ نگاہ ہے
اس ایک نکتہ پر توجہ نہیں دیتے کہ اقبال نے
سلام کو کسی ایک قوم کے نقطۂ نگاہ تک محدود نہیں
روپ جا کر انہوں نے انگریزی سامراج سے پِٹا
ہوئے عرب ملکوں کی پست حالی دیکھی۔ اسرائیلی
علاحدہ عربوں کی دشمن بھی اور ٹرکی سے قرآن
نی نظام کو عربوں کا اثاثہ قرار دے کر خارج
یا تھا۔ یہ وہ حالات تھے جن میں اقبال نے
یا کہ عربوں کی پست حالی اور ترکوں کی تنگ نظری
ا زیادہ قابلِ توجہ اسلام کا نظامِ حیات ہے۔
ہمہ گیر ترویج سے ہی قرآنی نظام کا قیام ممکن
تا ہے۔

چنانچہ اقبال نے اسلام کا ہمہ گیر تصور اس طرح
کیا کہ دوسرے مذاہب کی سچائیاں اور ان کے
اسلام سے مختلف نہ ہوں بلکہ ایک دوسرے کے
ہوں۔ بالِ جبریل کی ابتدا بھرتری ہری کے شعر سے
ہوئے اقبال نے ویدانت کی وسعت کو سمیٹا
جاننا چاہیے کہ اقبال کے صوفیانہ خیالات ایرانی
ندی اثرات کے میل سے اس درجہ پر پہنچے کہ
مذاہب کی صفات یکجا ہوگئیں۔ خود ایرانی
ب کوئی علاحدہ تہذیب نہیں۔ اس کی جڑیں
تہذیب میں گڑی ہوئی ہیں۔ اس ضمن میں ایک
مثال بالِ جبریل کی نظم "پیرِ رومی اور مرید
ہے۔ اس میں کچھ مکالمے ہیں جو پیرِ رومی اور مرید
کے درمیان ادا کیے گئے ہیں۔ مریدِ ہندی، مشرق
ت حالات سے باخبر ہے اور پیرِ رومی کا احترام
بھی مانتا ہے،

مریدِ ہندی پوچھتا ہے:

زندہ ہے مشرق تری گفتار سے
اُمتیں مرتی ہیں کس آزار سے

(یہاں کسی ایک امت کے آزار کا نہیں، بلکہ تمام امتوں
کے آزار کا ذکر ہے)

پیرِ رومی:

ہر ہلاکِ امت پیش کہ بود
زانکہ بر جندل گماں بردند عود

(جو بھی امتیں پہلے تباہ ہوئیں انھیں پتھر کی جگہ
عود کا گمان ہوا)

مریدِ ہندی:

ہند میں اب نور ہے باقی نہ سوز
اہلِ دل اس دیس میں ہیں تیرہ روز

(اہلِ دل میں ہر قوم اور ہر مذہب کے لوگ شامل ہیں)

پیرِ رومی:

کارِ مرداں روشنی و گرمی است
کارِ دوناں حیلہ و بے شرمی است

پیرِ رومی، اس سبب سے مریدِ ہندی کو باخبر کرتے
ہیں، جس سے ہند میں دیوتاؤں اور فرشتوں کا نور باقی نہ
رہا۔ اور سبب بس اتنا سا ہے کہ ہند کے لوگوں نے
ہمت کھو دی ہے۔ ہمت جو مردوں میں ہوتی ہے مردوں
کا کام روشنی اور گرمی ہے۔ ہیچ آدمیوں کا کام حیلہ اور بے
شرمی ہے۔ قرآن اور ویدانت میں بے شرموں اور حیلے سے
کام لینے والوں کی مذمت کی گئی ہے۔ قرآن اور ویدانت
دونوں کے اقوال مردوں کو روشنی اور گرمی کی بشارت
دیتے ہیں۔

(آئینہ، بمبئی)
۱۹۶۵

نام کتاب : علی سردار جعفری اپنی بہنوں کی نظر میں ۔
مرتب : کالی داس گپتا رضا ۔
پبلشر : ساکار پبلشرز، پرائیویٹ لمیٹڈ، جولی بھون نمبر ا
۱۰ ، نیو مرین لائنز، بمبئی نمبر ۲۰
قیمت : ۴۰ روپے ۔

علی سردار جعفری کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ، اردو ادب کی تاریخ کا کوئی طالب علم علی سردار جعفری کی خدمات کے چشم پوشی کا مرتکب ہو ہی نہیں سکتا ۔ وہ ہند و پاک کے صفِ اول کے لکھنے والوں میں بلند مقام رکھتے ہیں انجمنِ دار المصنفین، ترقی پسند تحریک نیز نئی شاعری کی دہلیز تک اور اس کے ساتھ ترقی پسندی کی توسیع (مثبت معنوں میں) تک جو قد آور شخصیت مسلسل اپنے لہجہ کی کشش اور توانائی کے ساتھ گذشتہ ۴۵ برسوں سے اردو ادب کے آسمان پر درخشاں ہے وہ یہی شخصیت ہے، علی سردار جعفری اپنے وسیع تر مطالعے کے تناظر میں اپنے رجحانات نیز اقبال، رومی، اسکر وائیلڈ کے مطالعے ۔ مطالعے کا ذوق ؛ اشتراکیت اور سوشلزم کے نظریات پر ان کی نظر، نظم و نثر پر یکساں قدرت ، اظہار کی توانائی ، انیس و اقبال کی شاعری کی سی بلند آہنگی ۔ بیان کی صداقت ۔ صداقت پر ایمان ، قلم کی قوت و اہمیت کا احساس ، ہاتھوں کی قدرت اور اس کی کرشمہ سازی کا یقین اور اس کے علاوہ بہت سارے پہلو سردار جعفری کی تہہ دار شخصیت کی نمایاں علامتیں اور ان کی شناخت ہیں ۔

یہاں علی سردار جعفری کی دانشوری، علمی لیاقت ادبی خدمات اور ان کی وضعداری کا جائزہ، مقصد نہیں ہے بلکہ ماہرِ غالبیات کالی داس گپتا رضا نے جو کتاب مرتب کی ہے اور جسے علی سردار جعفری کی دونوں بہنوں رباب جعفری اور ستارہ جعفری نے بھائی سے پرخلوص اور بے لوث محبت کے زیرِ اثر تحریر کیا ہے ۔ اس پر مختصراً اظہارِ خیال مقصود ہے ۔ اس کتاب کا آغاز کالی داس گپتا رضا صاحب کے " حرفے چند " سے ہوتا ہے ۔ سردار جعفری نے اپنے خیالات کا اظہار " چند باتیں " کے عنوان سے کیا ہے، رباب جعفری صاحبہ نے " پیش لفظ " میں ان مضامین کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی ہے ، اس کے بعد نسبتاً تین طویل مضامین ہیں جنہیں بالترتیب ستارہ جعفری اور رباب جعفری نے " سردار بھائی " ، " بھائی " اور " بھائی کے شب و روز " کے عنوان سے ترتیب دیا ہے ۔

علی سردار جعفری کی یہ (مختصر) سوانح حیات بہنوں کی بھائی سے انتہائی محبت کا نتیجہ ہے ۔ اس انتہائی محبت اور عقیدت کے جذبے کے تحت یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں جو کچھ تحریر کیا گیا ہے ۔ واقعات کی صحت اور دیانت دار ساتھ اسے لفظوں کا مناسب جامہ پہنایا گیا ہے، جہاں غیر ضروری پیوندکاری کا عمل دخل نہیں ہے ۔ حالات :

واقعات کے بیان میں دونوں بہنوں کی (بزرگانہ) شخصیت غیر واقعہ کی متحمل ہو ہی نہیں سکتی تھیں، زبان کی سادگی کے ساتھ جعفری صاحب کی ابتدائی زندگی کے متعلق بچپن کے شب و روز، چھوٹی چھوٹی دلچسپ مگر اہم باتوں ریاست کا ذکر، آسودگی روزگار، سردار بھائی کے مزاج کی نشو و نما خاندان کا ماحول، تہذیب، وضعداریاں، بلرام پور سے علی سردار کی ہجرت اور اس کا سبب، اشتراکی رجحانات کی طرف ان کی طبیعت کا مائل ہونا، ان حالات میں شعر و ادب کی خدمات، رسالوں کی اشاعت، جیل کی صعوبتیں، اور پھر بمبئی کی زندگی کا حال نیز احوالِ دردن خانہ جو بہنوں نے مل کر بہم پہنچایا ہے اسے کوئی اور شاید لفظوں کا یہ پیراہن نہ دے سکتا۔ اسی لیے یہ مضامین اور اہم بلکہ دستاویزی ہو جاتے ہیں۔ چونکہ علی سردار جعفری کی تخلیقات نصاب میں شامل رہتی ہیں۔ اور رہیں گی اس لیے میرا خیال ہے کہ ہر اردو اسکول میں اور کالج کی لائبریریوں میں اس کتاب کو ہونا چاہیئے تاکہ ادب کے طالب علم، عالم گیر شہرت کے مالک ادیب و شاعر کے متعلق اپنی معلومات میں اضافہ کر سکیں۔

کتاب کی خوبصورت طباعت کیلئے کالی داس گپتا اور مواد کی فراہمی کے لیے دونوں بہنیں بجا طور پر داد کی مستحق ہیں۔ ●

غیور جعفری جواہر پرنٹنگ پریس۔
گجری بازار، کامٹی، ضلع ناگپور، مہاراشٹر

غزل

سب سے الگ ہر اک سے جدا چاہیئے مجھے
جو بھی ہو میری اپنی صدا چاہیئے مجھے

پھولوں کی ڈالیوں کی طرح جو کرے سلام
کہتے ہیں لوگ ایسی "انا" چاہیئے مجھے

آواز کوئی دیتا ہے "باہر سے بند ہے"
دروازہ کھول دو کہ ہوا چاہیئے مجھے

دیکھوں تو آسمان کہاں تک بلند ہے
صحرائے کرب، دشتِ بلا چاہیئے مجھے

میں زندگی کی راہ میں ثابت قدم رہوں
ٹوٹے ہوئے دلوں کی دعا چاہیئے مجھے

سچائیوں کا زہر" گوارہ ہے آپ کو!
کہتی ہے زندگی، نہ ذرا چاہیئے مجھے"

زندہ تو ہیں "ضمیر میاں" آج کل مگر!!
رہتے کہاں ہیں اُن کا پتہ چاہیئے مجھے

۔٭۔

ریاستی خبریں

ریاست مہاراشٹر اردو اکیڈمی کی میٹنگ
شری راجیو گاندھی کو خراج عقیدت پیش کی گئی

بمبئی یکم جون۔ مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکیڈمی کی میٹنگ گذشتہ روز جناب وزیر ہاؤسنگ اور چیرمین اکیڈمی پروفیسر جاوید خان کی صدارت میں منترالیہ کے کمیٹی روم میں منعقد کی گئی۔ اس میٹنگ میں مختلف امور بشمول تمام اردو جاننے والوں کے مسائل پر مکمل تبادلۂ خیال کیا گیا۔ میٹنگ میں وزیر موصوف پروفیسر جاوید خان نے بعض مسائل کا حل فوری طور پر اپنے تجربے کی بنیاد پر کر دیا جس پر موجود تمام ممبران نے اپنی خوشی اور اطمینان کا اظہار کیا۔

اس میٹنگ میں جن اہم امور پر تبادلۂ خیال کیا گیا وہ اس طرح ہیں۔ اردو ڈراموں کے لیے اسٹیج کا انتخاب، آڈیو اور ویڈیو کے ذریعے اردو زبان سکھانے کا انتظام، مسودوں کی طباعت کے طریقۂ کار، بغرض فروغ نیز دفتر کو موصول ہوئے اہم خطوط میں دیئے گئے مشوروں پر کارروائی۔

بعد ازاں وزیر ہاؤسنگ پروفیسر جاوید خان نے ملک کے سابق وزیر اعظم مسٹر راجیو گاندھی کے وحشیانہ قتل پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے اس کی پرزور مذمت کی اور فرمایا کہ ملک کی اقلیتیں اپنے ایک ہمدرد اور نگہبان سے محروم ہو گئیں اس موقع پر اکیڈمی کے تمام ممبران نے دو منٹ کی خاموشی اختیار کر کے آنجہانی کو خراج عقیدت پیش کی۔

شری ارون گجراتی کو ڈیکاس رتنا ایوارڈ

انٹرنیشنل فرینڈشپ سوسائٹی نئی دہلی نے حکومت مہاراشٹر کے وزیر مملکت برائے جنرل ایڈمنسٹریشن شہری قیادت اور انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز شری ارون گجراتی کو اپنے "ڈیکاس رتنا" ایوارڈ کے لیے منتخب کیا ہے۔

سوسائٹی مختلف میدانوں میں گرانقدر خدمات انجام دینے والی اہم شخصیات کو یہ ایوارڈ ہر سال دیتی ہے۔ سوسائٹی نے اب تک "ڈیکاس رتنا" ایوارڈ مندرجہ ذیل شخصیات کو دے چکی ہے۔

مرکزی وزیر اشوک سین، شری سبودھ کانت سہائے اور شری اجیت نگم فلم اسٹار راجیش کھنہ اور پران، مشہور کارڈیولوجسٹ ڈاکٹر بی کے گوئل، صنعت کار شری ایس۔ کے۔ مودی، جسٹس فاطمہ بی بی اور جسٹس پی۔ این بھگواتی، سابق چیف آف آرمی، اسٹاف جنرل وی این شرما اور بہت سے دیگر امسال سوسائٹی نے شری گجراتی کو اس باوقار ایوارڈ "ڈیکاس رتنا" کے لیے منتخب کیا ہے۔

۲۰ نکاتی پروگرام کا جائزہ

حکومت ہند کی وزارت برائے پروگرام کی عمل آوری کی جانب سے اپریل ۱۹۹۱ کے آخر تک حکومت مہاراشٹر کی ۲۰ نکاتی پروگرام ۱۹۸۶ کے تحت مختلف اسکیمات پر کی گئی ترقی کا جائزہ لیا گیا جو کہ درج ذیل ہے۔

سالانہ کارکردگی کے اعداد قوسین میں

بائیو گیس پلانٹ (۱۳۳) بچوں کو لگائے گئے ٹیکے (۱۱۹)۔ پمپوں کو بجلی فراہم کی گئی (۱۱۶) آنگن واڑی (۱۱۳) سمال اسکیل انڈسٹری یونٹ (۱۰۴) آئی سی ڈی ایس بلاکس (۱۰۰) پینے کے پانی کے مسئلے (۹۸)۔

انتظامی منظوری

حکومت مہاراشٹر نے ضلع پونے کے تعلقہ مریل میں اندری اسپولی دیہی فراہمی آب اسکیم کے کام کی انتظامی منظوری دے دی ہے جس پر لاگت کا تخمینہ ۳۹۵ر۴۲، ر۱۴ روپے ہے۔

معمر ٹریڈ یونین رہنما ایس اے ڈانگے کا طویل علالت کے بعد انتقال

وزیر اعلیٰ شری شرد پوار، مرنال گورے اور جوٹی کے لیڈران کا اظہار تاسف

ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے بانی اور معمر ٹریڈ یونین رہنما سری پادمرت ڈانگے طویل علالت کے بعد ۲۲ رمئی کو بمبئی میں فوت ہو گئے۔ شری ڈانگے کافی عرصے سے تنفس کے عارضے میں مبتلا تھے۔ آج سویرے ۱۵-۸ بجے ہندوجا ہسپتال میں حرکت قلب بند ہو جانے اور تنفس رک جانے کے سبب فوت ہو گئے ان کی عمر ۹۱ برس تھی۔

ان کے پسماندگان میں ان کی دو بیٹیاں روزا دیشپانڈے اور شیلا رضا شامل ہیں۔

شری ڈانگے کا جنم ۱۰ راکتوبر ۱۸۹۹ء میں ہوا تھا انھوں نے بال گنگادھر لوکمانیہ تلک کے شانہ بشانہ کام کیا تھا لیکن انہیں شہرتِ دوام اس وقت حاصل ہوئی جب انہوں نے ایک کتابچہ لکھا تھا جس میں انہوں نے مزدور طبقے کے لیے لینن کی تھیوری اور نظریات کی پرزور وکالت کی تھی۔

بعدازیں انہیں ولادیمیر استنوویچ لینن کی جانب سے سوویت یونین مدعو کیا گیا۔ اس سفر پر انہیں خفیہ طریقے سے نیپال ہو کر روانہ ہونا تھا۔ لیکن برطانوی پولس کو ان کی سوویت یونین روانگی کی سن گن لگ گئی اور انہیں اپنا سفر ترک کرنا پڑا

۱۹۲۴ء میں کانپور سازش معاملے میں انہیں ۴ سال
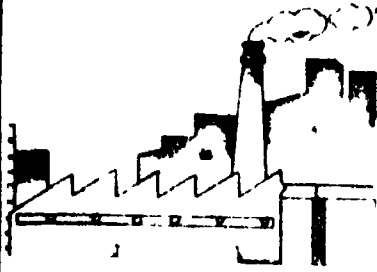
قید کی سزا سنائی گئی۔ میرٹھ سازش معاملے میں بھی انہیں سزا سنائی گئی تھی۔

شری ڈانگے نے آزادی سے قبل اور بعد اپنی زندگی کے ۱۳ بیش قیمت سال قید میں گذارے۔ انہیں ملک کی جنگباز مزدور تحریک کا بانی بھی خیال کیا جاتا ہے۔

۱۹۸۱ء میں قومی بورژوائی اور مزدور طبقے کے ضمن میں ان کے خیالات پر اختلاف کی بنا پر انہیں کمیونسٹ پارٹی سے خارج کردیا گیا تھا۔

یکم مئی سنہ ۱۹۸۲ء کو انہوں نے اپنی بیٹی روزا دیشپانڈے کی قائم کردہ آل انڈیا کمیونسٹ پارٹی میں شمولیت اختیار کرلی۔

شری ڈانگے کو سوویت یونین کا اعلیٰ ترین شہری اعزاز آرڈر آف لینن دیا گیا تھا۔

مہاراشٹر کے وزیر اعلیٰ شرد پوار اور ریاستی کانگریس (I) کمیٹی کے صدر شیواجی راؤ نلنگیکر نے کمیونسٹ رہنما ایس اے ڈانگے کی موت پر اظہار تاسف کیا ہے۔

جنتادل کی ریاستی صدر مرنال گورے نے بھی شری ڈانگے کی موت پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے انہوں نے مزید کہا کہ شری ڈانگے کی موت سے ملک کا ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے

مہاراشٹر کے گورنر سی سبرامنیم نے شری ڈانگے کو نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ موصوف بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ شری ڈانگے ایک عظیم محب وطن ہونے کے علاوہ ایک مایہ ناز اسکالر بھی تھے۔ انہوں نے جدوجہد آزادی کے دوران ان کے کردار اور مزدوروں کے لیڈر کے طور پر ان کی کارکردگی کو سراہا۔ انہوں نے شری ڈانگے کو پارلیمان کے ایک معزز و منفرد شخصیت بھی بتایا۔ گورنر موصوف نے کہا کہ قومی و سماجی مفکر کے طور پر وہ نئی نسل کے لیے ان کی زندگی مشعل راہ ہے۔

کامریڈ ایس اے ڈانگے بین الاقوامی شہرت کے مالک ایک بڑے دانشور اور سیاسی رہنما تھے۔ وہ ان بے لوث اور بے مثال مجاہدین آزادی کی آخری کڑی تھے جن کے لیے ہم کسی مبالغے کے بغیر لفظ "عظیم" کا استعمال کرسکتے ہیں۔

ستارہ فراہمیٔ آب اسکیم

حکومتِ مہاراشٹر نے (ضلع ستارا) شہر ستارا میں فراہمیٔ آب اسکیم کے کام کی انتظامی منظوری دے دی ہے جس پر لاگت کا تخمینہ ۸۱ء۲۴ لاکھ روپے ہے۔

مہاراشٹر کی نئی لاٹری "سوداامنی"

ہر جمعہ کو ڈرا

۷۲ء۷ لاکھ روپے کی مالیت کے انعامات

حکومتِ مہاراشٹر نے ریاستی لاٹری کی منی لاٹری کو بند کرنے کا فیصلہ کیا ہے جو کہ ہر جمعہ کو نکالی جاتی ہے اور اس کی جگہ نئی لاٹری "سوداامنی" اسی دن سے دلکش انعامات کے ساتھ جاری کی جائے گی۔ اس بات کا اعلان مہاراشٹر اسٹیٹ لاٹری کے ڈائرکٹر شری دھرم راج واگھ کرنے کیا۔

اس لاٹری کا پہلا ڈرا بروز جمعہ ۲۱ جون ۱۹۹۱ کو شام ۵ بجکر ۴۰ منٹ پر بمبئی میں منعقد کیا گیا ہے۔ اس لاٹری کی ٹکٹ کو عوام بہت جلد صرف ایک روپیہ ادا کر کے حاصل کر سکیں گے۔

ہر ہفتہ اس لاٹری میں ۳ سیریز کے لیے فی سیریز ۴ لاکھ ٹکٹ ہوں گے۔ عام انعام ایک لاکھ روپے کا ہوگا۔ علاوہ ازیں ۴۰ انعامات ۰۰۰ ایک ہزار، ۲۴۰ انعامات ۵۰۰ روپے، ۱۲۰ انعامات ۱۰۰ روپے، ۱۲۰۰ انعامات ۲۰ روپے اور ۱۲۰۰۰ انعامات ۱۰ روپے، اور ایک لاکھ اور ۲۰ ہزار انعامات ۴ روپے کے ہوں گے۔

"سوداامنی" لاٹری میں کل انعامات کی رقم ۷۲ء۷ لاکھ روپے کی ہوگی۔ اس بات کی توقع ہے کہ عوام حسبِ معمول اس لاٹری کا بھی خیر مقدم کریں گے۔

قوانین کی اشاعت

حکومتِ مہاراشٹر نے مہاراشٹر ضلع پریشد ڈسٹرکٹ سروس (بھرتی) (پانچویں ترمیم) قوانین بابت ۱۹۹۱ کو شائع کر دیا ہے۔

اس ضمن میں اطلاع نامہ ریاستی گزٹ غیر معمولی کے حصہ IV-B مورخہ ۲ مئی ۱۹۹۱ میں شائع کر دیا گیا ہے۔

کپاس کی حصولی

کپاس کی حصولی تقسیم کے تحت ریاست کے ۱۱ زونوں میں ۴ مئی ۱۹۹۱ تک ۶۵۸۴۲۶ کوئنٹل کپاس حاصل کی گئی اور ۱۳۰۳۳۷۰ کپاس کی گانٹھیں بنائی گئیں۔ اس مدت کے دوران زونوں کی ترتیب سے حاصل کی گئی کپاس اور گانٹھیں بنائی گئیں، درج ذیل ہیں۔

ناگپور	۱۰۳۸۲۱۹	(۲۰۴۵۵۲)
ایوت محل	۱۰۶۳۵۷۲	(۲۱۲۷۰۲)
آکولہ	۸۹۸۳۷۶	(۱۸۸۹۳۵)
امراوتی	۹۴۷۷۹۱	(۱۹۰۶۶۰)
کھام گاؤں	۳۳۷۴۵۸	(۶۸۹۲۴)
اورنگ آباد	۶۴۹۸۸۵	(۱۲۹۸۲۱)
پربھنی	۱۰۸۳۴۰۸	(۲۲۳۷۴۹)
ناندیڑ	۳۳۸۵۲۵	(۶۸۲۴۶)
جلگاؤں	۲۰۷۰۹۴	(۴۱۱۹۸)
دھولے	۶۴۵۵	(۷۲۲)
چلیس	۱۴۰۴۳	(۳۱۹۵)

ضروری گزارش

اس شمارے کے بارے میں بلا جھجک اپنی رائے ہمیں آج ہی لکھئے اور اپنے دوستوں کو "قومی راج" سے متعارف کرائیے۔ انہیں سالانہ خریداری کے لیے توجہ دلائیے۔
ہمیں آپ کے بھرپور تعاون کا انتظار رہے گا۔ (ادارہ)

(SPH)

قارئین کی رائے

محمد عبدالباسط باسط حیدرآبادی
مکان نمبر ۱۳/۵/۱۳۳ ، کارروان حیدرآباد (ملک پ) ۵۰۰۲۶۰

قومی راج ۱۰ دسمبر ۱۹۹۰ء جناب بخش الہ آبادی کے توسط سے نگاہ سے گذرا۔ پڑھنے کے بعد شری شرد پوار کی قابلِ ستائش قومی خدمات کے بارے میں اہم معلومات حاصل ہوئیں۔ شری شرد پوار سے متعلق مضامین اور منظومات خوب ہیں۔ جس قدر بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ تفصیل لکھنے کا موقع نہیں کیونکہ اچانک سابق وزیر اعظم راجیو گاندھی کی حادثاتی موت سے متاثر ہو کر خاکسار کا ہاتھ تھر تھرا رہا ہے۔ زیادہ کچھ لکھنے کی سکت نہیں ہے۔

رؤف خیر (ایم اے) لکچرر
بیت الخیر ۱۹/۳۰۲-۱۰-۹۔ دلاور شاہ نگر، رسالہ بازار، گولکنڈہ حیدرآباد

قومی راج حسبِ معمول منتخبہ تخلیقات نظم و نثر پر مشتمل ہے۔ وزیرِ اعلیٰ شری شرد پوار سے متعلق معلومات بھی ہیں اور ادب کی خدمت بھی ہے۔
"ڈاکو ٹلے کریں گے" پر یوسف ناظم صاحب کا تبصرہ اس شمارے کی جان ہے۔ خاص طور پر مصنف کے نام (ناگ) کی رعایت سے بہت کچھ پُرلطف ریمارکس پڑھنے میں آئے۔ وہ ہر حرف بات میں بات پیدا کرنے کے ماہر ہیں۔ غزلیں بھی خوب ہیں۔

ایم۔ کلام آزاد
دلاور پور۔ مونگیر ۸۱۱۲۰۱ (بہار)

دسمبر ۱۹۹۰ء کا ماہنامہ "قومی راج" اپنی تمام حُسن، خوبیوں، عمدہ طباعت و کتابت کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ جناب شرد پوار پر نظمیں و مضامین پسند آئے۔ واقعی وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ عبدالقیوم انصاری کا افسانہ "وہ بوڑھا"، اونچ نیچ، ذات پات کی بنیاد پرستی و قدیم طرزِ معاشرت پر لکھا گیا ہے۔ اچھا لگا۔ غزلوں میں قیصر الجعفری، ایم کوٹھیاوی راہی، منظر نوساروی، صلاح الدین نیر اور خلیل انجم کے اشعار خاص طور پر پسند آئے۔
سید عبدالرحمن کا "خواجہ احمد عباس، انسانیت کے علمبردار" ایک اہم معلوماتی مضمون ہے۔ م۔ ناگ کی کتاب "ڈاکو ٹلے کریں گے" پر یوسف ناظم کا تبصرہ جاندار ہے۔ پرچے میں ادبی مضامین، نظموں اور افسانوں کی شدت سے کمی محسوس ہو رہی ہے۔ مزید توجہ دیں تو یہ دن دونی رات چوگنی ترقی کرے۔

تجدیدِ خریداری کیلئے گذارش

اس شمارے سے اگر آپ کی مدتِ خریداری ختم ہو رہی ہے یا ختم ہو چکی ہے تو آج ہی آئندہ مدت کے لئے رقمِ خریداری بذریعہ منی آرڈر روانہ فرما دیجئے تاکہ رسالہ آپ کی خدمت میں مسلسل جاری رہے۔
بصورتِ دیگر مدتِ خریداری ختم ہو جانے کے بعد رسالہ کی ترسیل ممکن نہ ہو سکے گی۔ خریدار حضرات بطورِ خاص نوٹ فرمالیں۔ تجدیدِ خریداری کی رقم روانہ فرماتے وقت منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر (جو آپ کے پتے کی سلپ کے اوپر درج ہوتا ہے) ضرور درج فرمائیں اور اپنا نام، پتہ، پن کوڈ نمبر بھی صاف صاف تحریر فرمائیں۔ (ادارہ)

۱۰ جولائی ۱۹۹۱ء شمارہ ۔

قومی راج

...مراٹھی میں ہر ماہ کی یکم اور پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے
انگریزی گجراتی سندھی اور اردو زبان میں
ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

زر سالانہ ۵ روپے
قیمت فی شمارہ ۳ روپے

چیف ایڈیٹر
...ارون پاٹنکر

مینجنگ ایڈیٹر
آر۔جی۔ مانیدیو

ایڈیٹر: فیروزہ فیاض خان

ترسیل زر کا پتہ:
اسسٹنٹ ڈائریکٹر (ایڈمنسٹریشن)
ڈائرکٹوریٹ جنرل آف انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز
گورنمنٹ آف مہاراشٹر، بیرک نمبر ۱۹
مقابل سروجی بلڈنگ، نزد منترالیہ، بمبئی ۴۰۰۰۲۱
Tel. 20215

مراسلت کا پتہ:
ایڈیٹر قومی راج
ڈائرکٹوریٹ جنرل آف انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز
گورنمنٹ آف مہاراشٹر
۱۷ واں منزلہ، نیوایڈمنسٹریٹو بلڈنگ
مقابل منترالیہ بمبئی ۴۰۰۰۳۲
Tel. Nos. 202065, 202395

اس شمارے میں

صفحہ نمبر

★ ڈاکٹر کے. بھگتہ وتسل راؤ
۲-۲-۱۱۴۴/۱/8،
پوسٹ آفس لین، نیو نلہ کنٹہ،
حیدرآباد (اے۔پی) نمبر ۴۴ ۵۰۰۰

وزیراعظمِ ہند
شری پی۔ وی۔ نرسمہا راؤ

ہمارے وزیراعظم پی۔ وی کے نام سے آندھرا پردیش میں مشہور ہیں۔ دراصل پورا نام پاملہ پرتی ونکٹ نرسمہا راؤ ہے۔ موضع ونگرا (ضلع کریم نگر) سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ موضع کریم نگر سے (۹۰) کلومیٹر کی دوری پر حضور آباد سے ۲۵ کلومیٹر کی دوری پر ہے۔ چھ سو مکانات سے لیس یہ گاؤں چھ ہزار افراد پر مشتمل ہے۔ ان کا دو منزلہ بنگلہ ہے۔ باقی مکانات کھپریل کے ہیں۔ اسی مکان میں ۲۸ جون ۱۹۲۱ء کے دن پی۔ وی پیدا ہوئے۔ ان کے والد سیتارام راؤ، والدہ رکمنی نے آٹھ سال کی عمر میں شری پی۔ وی رنگا راؤ کو گود میں دیا۔ ابتدائی تعلیم ونگرا میں حاصل کی۔ ثانوی تعلیم حضور آباد میں جاری رکھا۔ حیدرآباد میں اعلیٰ تعلیم شروع کی۔ فرگوسن کالج پونا سے بی۔ ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔ ناگپور یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری حاصل کی۔ ساہتیہ رتن کا امتحان بھی کامیاب کیا۔ سوامی رامانند تیرتھ کی سرکردگی میں وندے ماترم کی مہم میں حصہ لیا۔ ڈاکٹر بی۔ رام کشن راؤ سے وکالت کے پیشہ میں وابستگی تھی۔ حصولِ تعلیم کے دوران ہمیشہ امتیازی نشانات حاصل کرتے رہے۔ وہ چاہتے تو ممتاز قانون دان، جج بن سکتے تھے لیکن اُن کے دل میں عوام کی خدمت کرنے کی اُمنگ تھی۔ انھوں نے خدمت کرنے کو اپنا شعار بنالیا۔ ریاست حیدرآباد کانگریس کے ایک سرگرم کارکن کی حیثیت سے سیاسی زندگی کا آغاز ۱۹۵۶ء سے کیا۔ ۱۹۵۷ء میں نائب صدر چُنے گئے۔ ۱۹۵۷ء میں منتھنی حلقہ سے اسمبلی کے لیے چُنے گئے۔ ریاستی اسمبلی کے تقریباً (۲۰) سال تک رکن رہے۔ آندھرا پردیش میں وزارتی عہدوں پر فائز رہے ۱۹۷۱ء سے لیکر ۱۹۷۳ء تک وزیراعلیٰ رہے۔ لاڈر فارمس [illegible] انکا زبردست کارنامہ ہے۔ ۱۹۷۴ء میں آل انڈیا کانگریس کے جنرل سکریٹری بنے ۱۹۷۷ء و ۱۹۸۰ء حلقہ ہنمکنڈہ سے پارلیمان کے لیے منتخب ہوئے۔ حکومتِ ہند کے وزیر داخلہ، وزیر دفاع، وزیر انسانی وسائل

وفرد رہے۔ وزیر خارجی امور کی حیثیت سے کئی بیرونی ممالک کا دورہ کیا اور ممتاز علماء و سربراہوں سے ملاقات کی ۱۹۸۴ء
و ۱۹۸۹ء میں رام ٹیک حلقہ سے پارلیمان کے ممبر بنے۔ ہمیشہ ان کی مسرت عوام سے حق رائے دہی کے ساتھ منتخب ہونے میں ہی رہی ہے۔ راجیہ سبھا یا قانون ساز کونسل کے وہ کبھی رکن نہیں تھے۔ کانگریس پارٹی کے ہمیشہ وفادار رہے۔ نہرو کی عالمگیریت کے شیدا تھے۔ علمبردار تھے۔ شریمتی اندرا گاندھی و شری راجیو گاندھی کی قیادت میں دیش کی ترقی میں کئی کارنامے کر دکھلائے۔ انہوں نے عالمی تخیل میں بنیادی تبدیلی لائی۔ غیر جانبدارانہ مہم کو بلند کیا۔ روس امریکہ ایک طرف، روس چین دوسری طرف ان کے تعلقات میں ہمواری کی کوشش کی۔ نئی تعلیمی پالیسی کو ۱۹۸۶ء میں پارلیمان میں انھوں نے پیش کیا تھا جسے پوری قوم نے سراہا۔ "نوودیہ ودمالیہ" کا نعرہ تعلیمی ضروریات میں ایک انقلابی تبدیلی لانے کا ایک اسکیم ثابت ہوا۔ علم کو وہ ہراج کی بولی نہیں سمجھتے تھے۔ جب ملک ایک نازک دور سے گذر رہا ہے اُس وقت انھوں نے ایک بھاری ذمہ داری اپنے سر پر لی اور ۲۱ر جون ۱۹۹۱ء کے دن وزیر اعظم ہند کا عہدہ سنبھالا۔ وندھیاچل کے نچلے خطے سے جنوبی ہند سے، آندھرا پردیش سے، تلگو بولنے والوں کی طرف سے اولین فرد ہیں جنھوں نے وزیر اعظم ہند کی کرسی سنبھالا ہے۔ تلگو، ہندی، مراٹھی، ملیالم، تامل، بنگالی کے علاوہ عربی فارسی، اسپانش و دیگر پردیسی زبانوں پر حاوی ہیں۔ گیان پیٹھ ایوارڈ کمیٹی کے صدر رہ چکے ہیں۔ دکھشن بھارت ہندی پرچار سبھا کے صدر رہ چکے ہیں۔ لندن اسکول آف اکنامکس کے ایک علمی مباحثہ میں حصہ لیا۔ پبلک اکونٹس کمیٹی کے صدر رہ چکے ہیں۔

شری پی وی کا خاندان بھی نامور ہے۔ ان کی بہن، دو بھائی ہنمکنڈہ میں ہیں۔ ان کے تین بیٹے، پانچ بیٹیاں اور تین پوتے، نواسے، پوتیاں، نواسیاں ہیں۔ اولین فرزند ڈاکٹر پی وی رنگا راؤ حلقہ ہنمکنڈہ سے اسمبلی کے رکن ہیں۔ دوسرے فرزند شری راجیشور راؤ سمنٹ صنعت کار ہیں۔ تیسرے فرزند شری پربھاکر راؤ ٹی وی صنعت کار ہیں۔ ان کی بڑی بیٹی ہنمکنڈہ میں مقیم ہیں۔ دو بیٹیاں امریکہ میں ڈاکٹر ہیں۔ ایک بیٹی جے این ٹی یو میں لیکچرار ہے۔ دوسری بیٹی شیوا شری گرافکس سے وابستہ ہیں۔

شری پاملہ پرتی وینکٹ نرسمہا راؤ بنیادی طور پر ایک ادیب ہیں۔ طاقتور قلم کار ہیں۔ کئی کہانیوں کے مصنف ہیں چھوٹے بچوں کی کتابوں کے اسباق کی چھپائی میں بھی وزیر تعلیم کی حیثیت سے دلچسپی دکھلائے۔ وشوانا تھ ستیہ نارائنہ کوی سامراٹ کی کتاب "ویئی پڑیگو" کا ہندی میں سہسر پھن کے طور پر ترجمہ پیش کیا جو ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ انگلستان و امریکہ کے کئی مقامات پر انھوں نے دور حاضرہ کے کئی عنوانات پر جامع تقاریر کئے۔ کانگریس کا انتخابی منشور کی تیاری میں انھوں نے ساتھ دیا۔ ہندوستانی زبانوں میں ایک ہی قسم کے اصطلاحات کے استعمال کے حامی ہیں۔ کمپیوٹر سائنس میں ان کی مہارت کی ستائش شری راجیو گاندھی نے کی۔

شری پی، وی کو پانچ دہوں کا سیاسی تجربہ ہے۔ ادبی سرمایہ ہے۔ تہذیبی ورثہ ہے۔ قومی ورثہ ہے۔ ملنساری کی کیفیت ہے۔ کھوج کرنے کا جذبہ ہے۔ رہن سہن نہایت ہی سادہ ہے۔ پیش آنے میں مدبرانہ انداز ہے۔ پُرخلوص لہجہ ہے ایک مقرر ہیں، مفکر ہیں، ساتھ ہی ساتھ مزاح سے دل موہ لیتے ہیں۔ کھیل کود سے دلچسپی ہے۔ موسیقی سے لگاؤ ہے۔ مکالمے منطق سے لدے ہوئے ہوتے ہیں۔ بات چیت میں عالمانہ انداز پایا جاتا ہے۔ وفاداری، جذبۂ خدمت، محنت، جذبۂ ایثار کام کرنے کی جدت، قبول کرنے کی صلاحیت، رہبری، ہدایت کاری، جدید ترین انکشافات سے واقفیت رکھنے کی صلاحیت شری پی، وی میں ہم دیکھ سکتے ہیں۔ ان کے دوست واحباب میں محنت کش عوام کی کمی نہیں، عالموں کی افراط ہے تو ممتاز ماہرین

(باقی صفحہ ۶ پر)

مہاراشٹر کے نئے وزیر اعلیٰ

شری سدھاکر راؤ نائیک

وزیراعلیٰ شری سدھاکر راؤ راجیوسنگھ نائیک ۲۱ر اگست ۱۹۳۴ء کو ضلع ایوت محل کے علاقہ پوسد میں گہمائی ٹے کے مقام پر پیدا ہوئے۔ آپ نے ناگپور یونیورسٹی سے آرٹس میں گریجویشن کیا ہے۔ آپ نے اپنے زمانۂ طالب علمی سے ہی سماجی اور سیاسی زندگی کا آغاز کر دیا تھا۔ آپ اچاریہ ونوبا بھاوے کے نعرے "زمین خدا کی ملکیت ہے" سے بہت متاثر ہوئے اور آپ نے سرودیہ لیڈر اچاریہ ونوبا بھاوے کی "بھودان تحریک" میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ آپ نے سماجی بیداری کے لیے نوجوانی سے ہی کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ "بھودان تحریک" ضلع ایوت محل میں کافی مقبول ہوئی۔ جہاں ایک لاکھ ہیکٹر سے بھی زیادہ زمین "بھودان تحریک" کے تحت حاصل کی گئی۔ بھارت کے پہلے وزیر اعظم شری پنڈت جواہرلال نہرو بذات خود ایوت محل تشریف لائے اور اس تحریک کو کامیاب بنانے والوں کو مبارکباد دی۔

کالج کی تعلیم کی تکمیل کے بعد شری نائیک نے نوجوانوں کو سماجی خدمات کی جانب راغب کرنے کے لیے "متر منڈل" قائم کیا۔ آپ نے دیہی علاقوں کے تعلیمی طور پر پسماندہ طلبا کے لیے رہائش گاہ فراہم کرنے کے لیے "کملا نہرو ہوسٹل" قائم کیا۔ جہاں آپ نے بطور اعزازی ٹیچر کے بھی کام کیا۔ کملا نہرو ہوسٹل، تعلیم کے خواہشمند دیہی طلبا کے لیے روشنی کا مینار بن گیا۔ اس ادارے کے ذریعہ یہاں مہاتما گاندھی، پنڈت جواہرلال نہرو اور ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر کی تعلیمات کا پرچار کیا جاتا ہے۔ آپ نے سماج کے کمزور طبقات کے لئے "ہیلتھ کیمپ" کا بھی اہتمام کیا۔ اس طرح "متر منڈل" نے یہاں مہاتما گاندھی اور ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر کا پوسد میں رتبہ بلند کیا۔

شری سدھاکر راؤ نائیک کے سیاسی کیریر کا آغاز زمانہ طالب علمی سے ہی ہو گیا تھا۔ آپ گوپالی ولیج کے سرپنچ منتخب ہوئے۔ بعدازاں آپ کے قدم سیاست میں مضبوط سے مضبوط تر ہوتے گئے اور ایوت محل ضلع پریشد کے صدر، ریاستی

جسلیچر منتخب ہوئے اور ریاستی کابینہ میں شامل ہوئے۔
ی مدت کے دوران شری نائیک نے ایوت محل ضلع کانگریس
ے سکریٹری کے طور پر کام کیا۔

شری نائیک، پیدائشی کسان تھے اور ان کے والد
نجہانی شری راجو سنگھ نائیک اور ان کے چچا شری آنجہانی
ری وسنت راؤ نائیک نے پوسد علاقے کا ہول مقام پر
رعی اصلاحات کیں۔ پیدائشی کاشتکار ہونے کے ناطے سے
ہوں نے بھی بڑھ چڑھ کر زرعی اصلاحات میں آنجہانی شری
سنت راؤ نائیک کی وزارت کے زمانہ میں جبکہ وہ وزیر اعلیٰ
ہاراشٹر تھے کئی اہم زرعی اصلاحات کیں جس سے ایوت محل
نقشہ ہی بدل گیا۔

شری سدھاکر راؤ نائیک نے زرعی ترقی کے لیے بحیثیت
پنچ، پنچایت سمیتی سبھا، ضلع پریشد صدر اور ریاستی کابینہ
حیثیت وزیر گرانقدر خدمات انجام دیں۔ بطور ضلع
شد کے صدر آپ نے پوسد میں "زرعی اور مویشی پالن" کی
ش کا اہتمام بھی کیا۔

شری سدھاکر راؤ نائیک کو آنجہانی شری وسنت دادا
کی وزارت میں ۱۹۷۷ء میں بطور وزیر مملکت شامل
یا۔ بحیثیت وزیر آپ نے ڈیری ڈیولپمنٹ، ہاؤسنگ،
شری، لیجسلیٹو افیرس اور محصول کے قلمدان سنبھالے۔ آپ
پنے سپرد کئے گئے محکموں میں پورے خلوص، لگن اور
محنت سے کام کیا۔ بحیثیت وزیر محصول آپ نے گرانقدر
خدمات انجام دیں اور بحیثیت وزیر تعلیم آپ کے عہد میں امراوتی
یونیورسٹی قائم کی گئی۔ تعلیم سے آپ کو خاص رغبت ہے جس
زمانہ میں آپ نے تعلیم کے میدان میں ماہرین کی ایک کمیٹی
بنائی جس کی سفارشات کی روشنی میں "قومی تعلیمی پروگرام
بنایا گیا۔ وزارت تعلیم کے دوران کئی پرائیوٹ انجینئرنگ
اور پالی ٹیکنک ادارے قائم کئے گئے۔ آپ نے بطور وزیر
تعلیم جو خاص اسکیم وضع کی تھی وہ "ساوتری بائی پھلے پالک
اسکیم" تھی۔ جس کے ذریعہ غریب لڑکیوں کے لیے جو تعلیم حاصل
کرنے کی خواہش کے باوجود تعلیم حاصل نہیں کر سکتی تھیں ان
کو تعلیم دلوانے کا انتظام کیا گیا۔ لڑکیوں کے لیے بارھویں جماعت
تک مفت تعلیم کا انتظام کیا گیا جس کے سبب خواتین میں
تعلیم کو فروغ حاصل ہوا۔

شری مدھوکر راؤ نائیک نے ہی لڑکیوں کے لیے "پریہ
درشنی ہوسٹل" قائم کیا۔ آپ نے "عالمی سال برائے خواتین" کے
دوران "خواتین کے ہوسٹل" کی اسکیم کی تجویز پیش کی۔ شری
سدھاکر راؤ نائیک اپنے طالب علمی کے ہی زمانہ سے سماجی اور
سیاسی میدانوں میں مصروف رہے۔ بعد ازاں آپ ادب، تھیٹر،
اور موسیقی کی جانب مائل ہوئے۔ کالج کی تعلیم مکمل کرنے کے
بعد شری سدھاکر راؤ نائیک نے پوسد سے ایک ہفتہ وار
اخبار "گرام سوراج" جاری کیا۔ آپ نے اپنے اخبار
کا استعمال سماجی تعلیم کے فروغ دینے کے لیے کیا اور ودربھ
علاقہ کے ادیبوں اور صحافیوں کے لیے ایک فورم کی تشکیل کی۔
آپ نے اپنے اخبار میں دیہی علاقوں کے صحافیوں کو ان کی
صلاحیتوں کا استعمال کرنے کے لیے بھرپور مواقع دیئے۔ آپ
کی چیئرمین شپ میں ہی ایوت محل پترکار بھون ٹرسٹ قائم کیا
گیا۔ بعد ازاں آپ نے مراٹھی رسالے "سونالی" کی ادارت
قبول کی۔ جس میں تمام ریاست کے ادیبوں کے رشحات قلم
شامل کیے جاتے تھے۔ ایوت محل میں "سونالی لٹریری
کانفرنس" کا انعقاد ہر سال کیا جاتا ہے۔ آپ نے
۱۹۶۳-۶۴ء میں پوسد میں ودربھ لٹریری کانفرنس کی سلور
جوبلی کا بھی اہتمام کیا۔

شری نائیک عظیم سنت شری گاڈگے مہاراج کی تعلیمات
سے بیحد متاثر ہوئے۔ آپ نے بطور وزیر برائے ثقافتی امور

عوام میں سنت تکڑوجی کے ادب کو عوام میں روشناس کرایا۔ تھیٹر اور ادب سے آپ کو بے حد لگاؤ ہے۔ شری نائیک اپنی بے پناہ سیاسی معروفیات کے باوجود ادبی اور ثقافتی پروگراموں کے لیے اپنا وقت نکال لیتے ہیں۔

شری سدھاکر راؤ نائیک دلتوں اور سماج کے کمزور طبقات کے لیے بیحد فکرمند رہتے ہیں۔ آپ کو نومیڈک اور ویمکت جاتیوں کے افراد کی حالت زار کا تجربہ ہے اس لیے آپ نے قبائلی عوام کو سماج میں ان کا جائز مقام حاصل کرنے کے لیے متحد کیا۔ آپ نے ۱۹۸۱ء میں ایوت محل میں "آل انڈیا بنجارہ کمیٹی" کے کنونشن کا اہتمام کیا جس میں آنجہانی شریمتی اندرا گاندھی نے خاص طور پر شرکت فرمائیں۔ اور اس کنونشن کی صدارت قبول کی۔ آنجہانی شریمتی اندرا گاندھی نے ان غریب عوام کی حالت سدھارنے کے شری نائیک کے عزم کی سراہنا کی۔

شری نائیک دلت کی تنظیموں کی مدد کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ اور ان کی ہر ممکن ہمت افزائی بھی کرتے رہتے ہیں۔

شری سدھاکر راؤ نائیک میں مشکل سے مشکل مسائل کو بخوبی حل کرنے کی خداداد صلاحیت موجود ہے۔ آپ ایک تجربہ کار رکن اسمبلی ہیں آپ وہاں بڑے سے بڑے مسائل کے بارے میں پوچھے گئے سوالات کا تشفی بخش انداز میں جواب دیتے رہے ہیں اور آپ بے شمار صلاحیتوں کے مالک ہیں۔

صفحہ نمبر ۳ سے آگے "وزیر اعظم ہند"

کی بھی تعداد زیادہ ہے۔ عوامی خدمت انجام دینے والوں سے بھی کافی ربط رہا ہے۔ عالمی کتابوں کے میلوں سے بھی رغبت رہی ہے۔ قدامتی اُموسے شناسائی ہے تو جدیدیت سے وہ کنارہ کش نہیں۔ کبھی کہیں اختلاف رائے سے پیش آنے کا سماں آجائے تو خاموشی و تحمل سے کام لیتے ہیں اور مشتعل ہونے نہیں پاتے۔ وہ ایک تنظیم ساز ہیں۔ قانون سے واقف ہونے کے علاوہ صاحب رائے ہیں۔ وہ قابلیت، اہلیت، دانشمندی علمی امور، و تجربہ کے مبدا، ہیں، ذخیرہ ہیں، وسیلہ ہیں۔ چھوٹے بڑے سے ادب سے خندہ پیشانی سے پیش آتے ہیں۔ محبت کے ماحول میں گفت گو جاری رہ پاتا ہے۔

علمی، سیاسی، ادبی خدمات انجام دینے سے ان کی مصروفیات کی وجہ سے صحت پر بھی اثر ہوا تھا۔ ذیابطیس کی شکایت رہی۔ دل کے عارضہ میں مبتلا ہونے کی وجہ سے جراحی بھی کی گئی اور صحت یابی میسر ہوئی۔ اب وزیر اعظم ہند کی حیثیت سے قوم کی معاشی ترقی میں تبدیلی لانا چاہتے ہیں۔ قوم کو عالمی سطح پر ایک خاص مقام دلوانا چاہتے ہیں۔ ہندوستان کی عظمت کو چار چاند لگانے میں کئی ترقیاتی منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے میں مصروف ہو چکے ہیں۔ تعلیم کے احاطہ میں انقلابی تبدیلی لانے کے خواہاں ہیں۔

وقت کی پکار ہے کہ ہر پارٹی کے کرتا دھرتا دیش کی ترقیاتی منصوبوں کو آگے بڑھانے میں ان کا ساتھ دیں۔ امن کو بحال کرنے میں مل جل کر کام کریں۔ قومی یکجہتی کی افزائش کریں۔ آندھرا پردیش کے عوام کے لیے خصوصاً باعثِ فخر ہے کہ ایک ہمدرد، ادیب اور سرگرم کارکن، تجربہ کار سیاست داں کو قوم کو رہنمائی کرنے کا موقع عطا ہوا ہے۔ آئے دن عوام ان کے خدمات سے فیض یاب ہوتے چلے جائیں اور ملک ترقی کی طرف گامزن ہو

مہاراشٹر کی نئی کابینہ

وزیر اعلیٰ شری سدھاکر راؤ نائیک کی زیر قیادت نئی کابینہ کے وزراء اور وزرائے مملکت کے نام اور متعلقہ محکمہ جات کی تفصیلات یوں ہیں ——

کابینہ کے وزراء

وزراء کے نام —————— محکمہ جات

(۱) شری سدھاکر راؤ راجو سنگھ نائیک
(وزیر اعلیٰ)
جی۔ اے۔ ڈی (بشمول پروٹوکول)
اطلاعات و رابطۂ عامہ، داخلہ (بشمول جیل)
سیاحت، شہری آراضی کی حد بندی اور وہ تمام محکمہ جات جو دیگر وزراء کو نہیں دئے گئے ہیں۔

(۲) شری رام راؤ واسن راؤ آدک
مالیات اور منصوبہ بندی

(۳) ڈاکٹر پدم سینہ باجی راؤ پاٹل
آبپاشی کمانڈ ایریا ڈیولپمنٹ اور توانائی

(۴) شری سوشیل کمار سنبھاجی راؤ شندے
شہری ترقیات قانون و عدلیہ

(۵) شری شیواجی راؤ باپو صاحب دیشمکھ
امداد باہمی، سابق فوجیوں کی بہبود، پارلیمانی امور اور ٹرانسپورٹ

(۶) شری ولاس راؤ دگڑو جی راؤ دیشمکھ
صنعت

(۷) شری وجے سنگھ شنکر راؤ موہیتے پاٹل
امور عامہ، ایکسائز، ثقافتی امور

(۸) شری رام داس اٹھاولے
سماجی بہبود، نشہ بندی، پسماندہ طبقات، روزگار اسکیم

(۹) شری جواہر لال امولک چند درڈا
غذا و شہری رسد، نکاسیٔ آب، اوقاف۔

(۱۰) شری اننت راؤ نارائن تھوپٹے
تعلیم، ٹیکنیکل تعلیم، ازآدارسانی

(۱۱) پروفیسر جاوید خان
ہاؤسنگ، جھونپڑپٹی سدھار، مکانوں کی مرمت، تعمیر نو اور اوقاف

(۱۲) شریمتی پشپا تائی وینکٹ راؤ ہرے
صحت عامہ، خاندانی بہبود، طبی تعلیم، ادویہ

(۱۳) شری شنکر راؤ گینوجی کولہے
محصول

(۱۴) شری رو ہیداس چدامن پاٹل
زراعت، باغبانی، محنت و روزگار

(۱۵) شری مدھوکر راؤ کاشی ناتھ پچڈ
قبائلی ترقیات، جنگلات اور سماجی جنگلبانی

(۱۶) شری ولاس راؤ بال کرشن پاٹل
مویشی پالن، ڈیری ترقیات اور ماہی گیری

وزراء مملکت

وزرائے مملکت کے نام ——— محکمہ جات

(۱) شری لکشمن راؤ رنگناتھ پانسکر
امداد باہمی، تجارت

(۲) شری رنجیت اروند راؤ دیشمکھ
آب پاشی، کمانڈ ایریا ڈیولپمنٹ

(۳) شری شیام عرف جناردھن بالکرشنا اشٹیکر
کھیل کود، بہبود نوجوانان، صنعت سیاحت

(۴) شری مدن بافنا
مالیات، پارلیمانی امور

(۵) شری اسودن لال گووردھن داس گجراتی
عام انتظامیہ (بشمول بیورو کریٹ) شہری ترقیات، اطلاعات
و رابطہ عامہ اور شہری آراضی حد بندی

(۶) شری ارون دتاترے مہتا
عامہ (بشمول جیل) محنت، پارلیمانی امور، ثقافتی امور

(۷) شری شیواجی راؤ کرشنا جی شنڈگے
مویشی پالن، ڈیری ترقیات اور ٹرانسپورٹ

(۸) شری رمیش ماتا پرشاد دوبے
ہاؤسنگ، جھگی جھونپڑی سدھار اور ہاؤس ریپئر اور تعمیر نو

(۹) شری ڈاکٹر ونے بھاؤ صاحب کھانزنکر
صحت عامہ، خاندانی بہبود، طبی تعلیم وادویہ، سابق
فوجیوں کی بہبود۔

(۱۰) شری بھاسکر راؤ بابو راؤ پاٹل کھتگاؤنکر
امداد باہمی، بازآبادکاری

(۱۱) شری دھرم راؤ بابا اترام
قبائلی ترقیات، جنگلات اور سماجی جنگل بانی

(۱۲) شری چنگ راؤ شری پتی کدم
تعلیم، ٹیکنیکل تعلیم

(۱۳) شری قاضی عبدالخالق عبدالقادر
[illegible]، اوقاف

(۱۴) شری چندر پال آنند راؤ عرف بابا صاحب کھاڈے
دیہی ترقیات، اسپیشل اسسٹنس (انٹیگریٹڈ ڈیولپمنٹ چھوڑ کر)

(۱۵) شری مدھوکر راؤ رنگوجی گھاٹے
سماجی بہبود، نشہ بندی، بہبود [illegible]

(۱۶) شری بی۔ ڈی۔ عرف اتا صاحب نروٹے
غذا، سول سپلائی اور [illegible]

(۱۷) شری نیورتی نامدیو راؤ عرف بابو صاحب [illegible]
داخلہ

(۱۸) شری اجیت اننت راؤ پوار
زراعت، باغبانی، توانائی

(۱۹) شری شیواجی راؤ انکش راؤ پنڈت
روزگار، ضمانت روزگار اسکیم

(۲۰) شری پرتھوی پرتاپ راؤ بھونسلے
بلدیات اور سرکاری آراضی (ڈیولپمنٹ چارج)
صنعت، بینک اور ایکسائز

(۲۱) شری سبودھ کشور ساؤجی
محصول

وزیر اعلیٰ شری سدھاکر راؤ نائیک کا پالیسی بیان

ضروریات زندگی کی چیزیں عوام تک پہونچانے کیلئے اہم اقدامات

ذخیرہ اندوزی اور کالا بازاری کرنے والوں کے خلاف سخت کارروائی

نائیک

مہاراشٹر کے وزیر اعلیٰ شری سدھاکر راؤ نائیک نے ۵ جولائی کو آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن کے ذریعہ ریاستی عوام سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان کی حکومت ضروریات زندگی کی چیزوں کو آسانی سے عوام تک پہونچانے کے لئے ذخیرہ اندوزوں اور بلیک والوں کے ساتھ سختی سے نپٹے گی۔

گزشتہ ۲۵ جون کو وزیر اعلیٰ کا عہدہ سنبھالنے کے بعد شری سدھاکر راؤ کا حکومت کی پالیسی سے متعلق پہلا بیان ہے۔

انھوں نے اپنے اس پیغام میں عوام کو بتایا کہ آج عوام گرانی سے کس قدر پریشان ہیں اس کا انھیں پوری طرح سے احساس ہے اور چونکہ تہواروں کا سیزن بھی قریب آتا جا رہا ہے اس لئے ان کی حکومت عوامی تقسیم کاری کے نظام کی مستعدی کو بڑھانے کے لئے پوری کوشش کرے گی تاکہ عوام کو ضروریات زندگی کی چیزوں کو حاصل کرنے میں تکالیف کا سامنا نہ کرنا پڑے انھوں نے یہ اعلان بھی کیا کہ ان کے پیشرو وزیر اعلیٰ نے اپنے تین سالہ دور اقتدار میں عوامی فلاح وبہبود سے متعلق جن اسکیموں کا اعلان کیا تھا ان کی حکومت ان تمام اسکیموں پر سختی سے عمل درآمد کرے گی۔ اور مہاراشٹر کو اول درجہ کی ترقیاتی مستحکم اور خوشحال ریاست بنانے کی کوشش جاری رکھے گی۔

وزیر اعلیٰ نے اعلان کیا کہ ان کی حکومت ریاست کے ہر خطہ کو ترقی کے مساوی مواقع فراہم کرے گی اور تمام خطوں سے متعلق جو ترقیاتی اسکیمیں سرد خانوں کی زینت بنی ہوئی ہیں۔ انھیں باہر نکال کر ان کو عملی جامہ پہنانا ان کی حکومت کی اولین ذمہ داری ہوگی۔

ملک کی معاشی حالت پر اظہار تشویش کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ نے عوام سے اپیل کی کہ ملک کی معاشی آزادی کو بچانے کے لئے عوام تھوڑی بہت قربانی کے لئے بھی تیار رہیں انھوں نے ریاستی عوام سے یہ اپیل بھی کی کہ آپس میں متحد ہو کر علیحدگی پسند طاقتوں کو اس سرزمین پر تنہا کر دیں اگر ان علیحدگی پسند طاقتوں کو اس سرزمین پر پنپنے دیا گیا تو ملک کی ترقی کا متاثر ہونا لازمی ہے۔

وزیر اعلیٰ نے بتایا کہ بند شدہ کپڑے کی ملوں اور دیگر بیمار صنعتی یونٹوں کے تئیں حکومت کا رویہ ہمدردانہ ہے اور اگر ٹریڈ یونینیں ان بیمار صنعتی یونٹوں کو امداد باہمی کے بنیاد پر چلانے کے لئے تیار ہوں تو حکومت ان کے ساتھ ہر ممکن تعاون کرنے کے لئے تیار ہے۔

وزیر اعلیٰ نے عوام کو یقین دلایا کہ کانگریس (آئی) نے جو انتخابی وعدے کئے تھے ان کی حکومت ان وعدوں کو ایمانداری کے ساتھ پورا کرنے کی بھی کوشش کرے گی۔

چند نئے وزراء اور وزراء مملکت کا تعارف

کابینی وزراء:

شری ولاس راؤ بال کرشن پاٹل

تعلیم: بی۔ اے۔ ایل۔ ایل بی۔
مراٹھی، ہندی اور انگریزی زبان سے واقفیت۔
پارٹی: کانگریس (آئی)
پیدائش: ۱۵ رجولائی ۱۹۳۸ء میں آپ انڈالے تعلقہ کراڈ، ضلع ستارا میں پیدا ہوئے۔
پیشہ: کھیتی باڑی۔

ستارا ضلع مدھیہ ورتی سہکاری بنک کے چیئرمین، ستارا ضلع گراہک سنگھ کے ڈائریکٹر، تعلیمی بورڈ کے چیئرمین اور تعلیمی اداروں سے ۱۹۶۷ء سے ۱۹۸۰ء تک متعلق رہے۔ ستارا ضلع پریشد کے ممبر۔ شروع سے ہی انڈین نیشنل کانگریس کے سرگرم رکن رہے۔
۱۹۸۰-۸۵ء میں قانون ساز اسمبلی کے ممبر رہے۔ ۱۹۸۹ء میں مہاراشٹر قانون ساز اسمبلی کے لیے پھر چنے گئے۔
مشاغل: مطالعہ، کھیل کود (کبڈی)

وزراء مملکت:

شری دھرم راؤ بابا اترام

شری دھرم راؤ بابا آترام ۲۰ ر اکتوبر ۱۹۵۳ء کو ضلع گڈچرولی کے اہیری موضع میں پیدا ہوئے۔
آپ نے شری شیواجی پریسٹری ملٹری اسکول پونے سے ایس ایس سی کا امتحان پاس کیا۔ آپ کا تعلق گڈچرولی میں مندرج قبیلہ "راج گونڈ برادری" سے ہے۔

آپ نے جس اسکول میں تعلیم حاصل کی اسے اپنی شخصیت کو نکھارنے، اپنی سماجی ذمہ داریوں کو سمجھنے اور حب الوطنی کے جذبہ کو بیدار کرنے کا محرک سمجھتے ہیں۔

آپ وجے دشمی کریڈا کیندر میشو کمیٹی کے صدر ہیں جو نہ صرف اسپورٹس سرگرمیوں کو بڑھاوا دیتی ہے بلکہ ایتھلیٹکس میں ٹورنامنٹ بھی منعقد کرتی ہے۔

شری اترام مختلف وقتوں میں مختلف عہدوں پر فائز رہے جن میں سے چند ایک کا ذکر یوں ہے:

اہیری پنچایت سمیتی کے صدر، زرعی پیداوار مارکیٹنگ کمیٹی کے صدر (تینوں بلاک اہیری، اٹاپلی اور سرونچا) سنجے گاندھی ریلیف کمیٹی کے صدر، ون ویبھو سیکشن منڈل الاپلی کے صدر بھی رہے جس کی کئی اسکولیں اور کالج اور ان کی شاخیں ہیں۔

اہیری گرام پنچایت کے پانچ سال تک ممبر، دھرم راؤ فارسٹ لیبر کوآپریٹیو سوسائٹی، اہیری کے لائف ممبر، ضلع چندرپور کی ضلع پریشد کے ممبر، ضلع گڈچرولی ٹرائیبل ایگزیکٹیو کمیٹی، تعلقہ کوآرڈینیشن کمیٹی کے ممبر، ضلع پلاننگ اور ڈیولپمنٹ کونسل کے ممبر، ضلعی ویجیلنس کمیٹی کے ممبر، ٹرائیبل ڈیولپمنٹ کارپوریشن، ناشک کے ڈائریکٹر، ٹرائبل ویلفیئر کمیٹی (حکومت مہاراشٹر) کے ممبر، نومیڈک اور ویمکت جاتی ویلفیئر کمیٹی حکومت مہاراشٹر کے ممبر، ویلفیئر ایڈوائزری کمیٹی (حکومت مہاراشٹر) کے ممبر اور ضلع گڈچرولی کانگریس کمیٹی کے صدر۔

آپ نے وائیلڈ لائف ایڈوائزری بورڈ، بمبئی اور وائیلڈ لائف وارڈن (آنریری) ضلع چندرپور اور گڈچرولی کی جانب سے نمائندگی کی۔

آپ کے مشاغل:
فٹ بال، ہاکی، کبڈی، والی بال، اور شطرنج ہیں۔

آپ مہاراشٹر لیجسلیٹیو اسمبلی کے لیے سرونچا (منضبط قبیلہ) حلقۂ انتخابات سے فروری سنہ ۱۹۹۱ء کو کانگریس (آئی) کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے۔

آپ شری سدھاکر راؤ نائیک کی وزارت میں ۲۸ر جون سنہ ۱۹۹۱ء کو وزیر مملکت برائے قبائلی ترقیات، جنگلات اور سماجی جنگل بانی کے وزیر کی حیثیت سے شامل کئے گئے۔

شری اترام کی اہلیہ کا نام شریمتی سنہہ دیوی ہے۔ آپ کا ایک لڑکا اور دو لڑکیاں ہیں۔

آپ ہندی، مراٹھی، تیلگو، انگریزی بخوبی بول سکتے ہیں۔ آپ کی مادری زبان "گونڈی" ہے۔ آپ ماڈیا بولی بھی بول سکتے ہیں۔ دونوں زبانیں (گونڈی، اور ماڈیا) مراٹھی زبان کی لڑکیاں ہیں۔

شری عبدالخالق قاضی

تعلیم: بی اے۔ ایل ایل بی۔
پیدائش: سنہ ۱۹۴۰ء۔

۱۹۸۵ء اور ۱۹۹۰ء میں اُمرگا حلقۂ انتخاب سے ودھان سبھا کے لیے کانگریس (آئی) امیدوار کی حیثیت سے چنے گئے۔ ۱۹۶۲ء میں امداد باہمی تحریک سے سیاست میں داخل ہوئے۔

اُمرگا تعلقہ کوآرڈینیشن کمیٹی کے ممبر کے روپ میں سماجی کارکردگیوں کی شروعات۔ دس سالوں سے عثمان آباد ضلع کانگریس (آئی) کے ضلع سیکریٹری۔ مہاراشٹر اسمبلی سب کمیٹی کے تین سال صدر رہے سچ کمیٹی کے ممبر رہے اور کچھ عرصہ تک صدارت کی۔

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکیڈیمی کے دو سال تک ممبر رہے اُمرگا میونسپلٹی کے صلاح کار رہے۔ اُمرگا تعلیمی کمیٹی کے ڈائریکٹر رہے۔ ٹیلی فون صلاح کار کمیٹی کا کئی سالوں تک کام دیکھا اور ساتھ ہی ساتھ دیگر اہم عہدوں پر ذمہ داریاں سنبھالیں۔

شری عبدالخالق قاضی نے مہاراشٹر کے سابق سینچائی وزیر شری پدم سنہہ پاٹل کی سربراہی میں کولہاپور۔ اُمرگا تعلقے میں کولہاپور طرز کے بندھ بنانے میں حصہ لیا۔ اسی طرح کورے گاؤں سینچائی پروجیکٹ کو جلد پورا کرکے اُمرگا شہر کے لیے پینے کے پانی کی دشواریوں کو دُور کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اور مورو پ میں درمیانی درجے کے سینچائی پروجیکٹ کے کام کو تیز رفتاری بخشی۔ اُمرگا میں صنعتی بستی قرولی مرکز اور ساتھ ہی تعلقہ میں سہکاری شکر کارخانہ ہو، اس بات کو آگے بڑھانے میں سرگرم عمل رہے۔

شری مدھوکر راؤ رنگوجی راؤ گھاٹے

تعلیم: بی۔اے۔
زبان: مراٹھی، انگریزی، ہندی۔
پارٹی: کانگریس (آئی)
موکھیڑ (مندرج جاتی) سے چناؤ۔
پیدائش: ۵ر جون ۱۹۴۲ء کو بیلولی تعلقہ موکھیڑ ضلع ناندیڑ میں پیدا ہوئے۔
اہلیہ: شریمتی پرمیلا۔ ۲ لڑکے ۵ لڑکیاں۔
پیشہ: کھیتی باڑی۔

آپ کا تعلق کئی تعلیمی اداروں مثلاً شاہیر انا بھاؤ ساٹھے ودیالیہ اور شاہیر انا بھاؤ ساٹھے کنشٹھ مہاودیالیہ تعلقہ موکھیڑ نیز جگجیون رام ودیارتھی ہوسٹل اور ویگلیور میں دلت جاتی تعلقہ ودیارتھی ہوسٹل وغیرہ سے گہرا تعلق، مزدور اور پچھڑے درجے کے لوگوں اور چھوٹی جاتیوں کے لوگوں کے لیے کام کیا۔ مہاراشٹر راجیہ کھادی گرام ادیوگ منڈل کے ناندیڑ شاخ کمیٹی کے ممبر ۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۲ء تک رہے اور ۱۹۶۹ء میں مہاراشٹر قانون ساز اسمبلی کے لئے چنے گئے۔

آپ ایم۔ ایل۔ اے کی حیثیت سے ۱۹۷۶ء سے ۱۹۷۲ء

...۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۰ء تک اور ۱۹۸۵ء سے ۱۹۹۰ء تک ... آپ ۱۹۹۰ء میں دوبارہ ایم ایل اے چنے گئے۔

...اغل : کھیتی باڑی، مطالعہ، سماجی بہبود کے کام۔

شری اجیت پوار

پونے ضلع مرکزی بنک سے مارچ ۱۹۹۱ء میں ہوئے چناؤ میں ڈائریکٹر و چیئرمین کے لیے منتخب ہوئے۔ اندا پور تعلقہ میں چھترپتی سہکاری شکر کارخانہ کے لگ بھگ چھ سالوں سے ڈائریکٹر ہیں۔ بارامتی اور اندا پور تعلقوں میں بیس امداد باہمی و تعلیمی کمیٹیوں سے قریبی تعلق رہا۔ دودھ ڈیری اور مرغی پالن کمیٹیوں کے بارامتی میں شروعات کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

عمر : ۳۲ سال۔

تقریباً ۵ سالوں سے شری اجیت پوار نے امداد باہمی تحریک کے ذریعہ کئی نئی کمیٹیاں بنائیں اور ان کی سربراہی کی، بورڈ آف ڈائریکٹرز نے ڈسٹرکٹ پونے سنٹرل کوآپریٹیو بنک کی سربراہی شری اجیت پوار کو سونپی اس کے علاوہ کئی کمیٹیوں کی بھی سربراہی کی۔

چھترپتی سہکاری شکر کارخانہ، بھوانی نگر اور چھترپتی بازار جیسی کمیٹیوں کے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں شری اجیت پوار کو کام کرنے کا موقع ملا۔

...ی نیورتی نام دیوراؤ تھیٹے

...م : ایم اے۔ ایل ایل بی۔

... : کانگریس (آئی)

شیرور (ضلع پونے)

...ارچ ۱۹۳۷ء کو وڈو تعلقہ شیرور ضلع پونے میں پیدا ...ئے۔

اہلیہ کا نام شریمتی وجیہ مالا۔

... : دو لڑکے اور ایک لڑکی۔

پنچایت سمیتی شیرور کی صدارت، ضلع پریشد، پونے کی ...ت، تعلیمی، ثقافتی اور کھیل کود سے متعلقہ مختلف ادارہ ...ں کی صدارت۔ مارچ ۱۹۸۵ء میں قانون ساز اسمبلی کے چنے گئے۔

جن شعبوں میں شری اجیت پوار کو چیلنج کا سامنا کرنا پڑا انھوں نے اسے قبول کیا اور اس میں کامیابی حاصل کی۔

آپ نوجوانوں، بوڑھوں، کارکنوں اور عام لوگوں میں یکساں طور پر مقبول ہیں اور سب لوگوں کو ساتھ لے کر چلنا چاہتے ہیں۔ جس طرح وہ امدادِ باہمی کے ذریعہ سماجی و سیاسی شعبوں میں کام کر رہے ہیں اس سے ان کی اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں کا پتہ چلتا ہے۔

۱۹۶۳ء سے ۱۹۷۱ء تک ۹ سالوں تک پنچایت سمیتی بھیورائی کے صدر رہے۔ ۱۹۷۱ء سے بیڑ ضلع پریشد کے صدر بنے۔ جے بھیورائی سہکاری شکر کارخانہ کے بانی اور صدر رہے۔ ۳ سال تک مہاراشٹر اسٹیٹ الیکٹرسٹی بورڈ کے ڈائریکٹر رہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

آپ شری سدھاکر راؤ نائیک کی وزارت میں وزیر مملکت برائے سماجی بہبود و ضمانت روزگار منصوبہ مقرر ہوئے ہیں۔

شری شیواجی راؤ پنڈت

شری شیواجی راؤ انکش راؤ پنڈت کا جنم ۱۰ر اکتوبر ۱۹۳۶ء میں ضلع بیڑ کے تعلقہ بھیورائی میں ہوا۔ آپ نے بی۔ اے تک تعلیم حاصل کی ہے۔ آپ مراٹھواڑہ یونیورسٹی کے "والی بال" کے اچھے کھلاڑی مانے جاتے تھے۔ ۱۹۷۹ء میں ودھان سبھا کے ممبر چنے گئے پر بیڑ حلقۂ انتخابات سے چنے گئے۔ اس کے بعد ۱۹۸۵ء میں اور ۱۹۹۰ء میں درمیانی مدت میں ودھان سبھا کے لیے ودھان سبھا کے لیے چنے گئے۔

شری پردین پرتاپ راؤ بھونسلے

تعلیم: بی۔کام۔
پیدائش: ۱۹ر فروری ۱۹۴۹ء۔
پیشہ: کھیتی باڑی۔

پردین پرتاپ راؤ بھونسلے کے چاچا شری جگناتھ راؤ بھونسلے برطانوی فوج میں مراٹھا لائٹ انفینٹری میں کرنل افسر کمانڈنگ تھے۔ جد و جہدِ آزادی کے دوران انھوں نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا اور آزاد ہند فوج میں

شامل ہوگئے۔ آپ کے پتا شری پرتاپ راؤ دیوراؤ بھونسلے نے بھی آزادی کی جنگ میں حصہ لیا تھا۔

اپنے چاچا اور پتا کے نقشِ قدم پر چلنے والے شری پروین بھونسلے نے نوجوانی سے ہی سماجی بھلائی کے کاموں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ آپ نے سنہ ۷۲-۱۹۷۱ء میں ساونت واڑی میں واقع پنچم کھیم راج مہاودیالیہ کے جنرل سیکریٹری کا کام کیا۔ اور ادبی، ثقافتی اور کھیل کود کے میدانوں میں بڑھ چڑھ کر کام کیا۔

آپ مراٹھی، ہندی اور انگریزی زبانوں سے واقف ہیں۔ سنہ ۱۹۷۵ء میں آپ کو ساونت واڑی سٹی کانگریس (آئی) کے صدارت کے فرائض سونپے گئے ہیں۔ سنہ ۱۹۸۰ء میں آپ کو سندھودرگ ضلع کانگریس (آئی) کی صدارت سونپی گئی اور اس ضمن میں آپ نے کار ہائے نمایاں انجام دیے اور سنگٹھن کو مضبوط کیا۔ سنہ ۱۹۸۲ء میں آپ نے ڈسٹرکٹ یوتھ کانگریس (آئی) کی صدارت کی۔ اس کے علاوہ بھی آپ کئی ثقافتی و سماجی اور کھیل کود سے متعلقہ کمیٹیوں کے سرگرم رکن ہیں۔ سنہ ۱۹۸۹ء میں آپ قانون ساز اسمبلی کے لیے ساونت واڑی حلقہ انتخاب سے چنے گئے۔

شری سبودھ کیشو ساوجی

تعلیم: ایم۔ اے سیاسیات
زبان: مراٹھی، انگریزی، ہندی
پیدائش: یکم جولائی سنہ ۱۹۴۴ء
بمقام: ڈونگاؤں ضلع بلڈانہ
اولاد: ایک لڑکی، دو لڑکے۔
پیشہ: کھیتی باڑی اور کاروبار

سنہ ۶۴-۱۹۶۳ء میں ودربھ طلبا، کانگریس کے صدر چنے گئے اور انٹرنیشنل یوتھ آفیسرز کے ممبر چنے گئے۔ عوامی اقدام برائے ترقیات اور بلڈانہ ضلع جیل دیشتا کمیٹی کے ممبر بنے۔ ڈائریکٹر برائے دھل رکھا بائی شکشک پرسارک سنستھا رہے، ڈائریکٹر برائے سودھ بھوو ڈکلیان منڈل، سنجے گاندھی مجوزہ امداد باہمی بنک رہے۔ سنہ ۱۹۷۳ء سے کانگریس (آئی) کے لئے کاموں کی ذمہ داری سنبھالی۔ سنہ ۱۹۶۴ء سے سنہ ۱۹۷۴ء تک یوتھ کانگریس (آئی) کے چیف سیکریٹری رہے اور سنہ ۱۹۷۸ء میں مہاراشٹر ودھان سبھا کے ممبر چنے گئے۔

مشاغل: کبڈی، باسکٹ بال، اور سماجی بہبود کے کام۔

بھیکو باڈھو سبازُوٹے

۱۳ر نومبر ۱۹۲۰ء میں پیدا ہوئے "آتا" پیار کا نام ہے۔ آپ سبزیں کے بیوپاری ہیں۔

مہاتما گاندھی کی آواز پر ۱۹۴۲ء میں "ہندوستان چھوڑو" تحریک میں حصہ لیا۔ سنیوکت مہاراشٹر تحریک میں حصہ لیا اور گرفتار ہوئے کانگریس پارٹی کی مختلف کمیٹیوں کے لیے کام کیا۔ جنوبی مرکزی بمبئی ڈسٹرکٹ کانگریس آئی کمیٹی کے صدر اور بمبئی ریجنل کانگریس کمیٹی (آئی) کے نائب صدر کی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۹۴۹ء - ۱۹۵۷ء، ۱۹۶۱، ۱۹۶۸، ۱۹۷۳ء اور ۱۹۷۸ء میں بائیکلہ سے بمبئی میونسپل کارپوریشن کے لیے منتخب ہوئے۔ بی ایم آر ڈی اے، گرانٹس مشاورتی کمیٹی، ڈی جی ٹی اے، جیل کمیٹی، ٹیلی فون مشاورتی کمیٹی وغیرہ کے رکن رہے۔ آپ مہاراشٹر ہاؤسنگ اینڈ ایریا ڈیولپمنٹ اتھارٹی کے صدر رہ چکے ہیں۔ آپ چمبور کی حلقہ انتخابات میں ۱۹۸۵ء اور ۱۹۹۰ء میں مہاراشٹر اسمبلی کے لیے چناؤ جیت چکے ہیں۔

ڈاکٹر پتنگ راؤ شری پتی کدم

۸ر جنوری ۱۹۴۴ء کو موضع سونسل کا ناپور تعلقہ ضلع سانگلی میں پیدا ہوئے۔ تعلیم ایم اے۔ ایل ایل بی تک حاصل کی اور انتظامیہ کے مسائل کے موضوع پر ان کی تھیسیس کی وجہ سے پی ایچ ڈی ڈگری ۱۹۸۰ء میں پونا یونی ورسٹی سے حاصل کی۔ آپ نے تعلیمی اداروں کا ایک جال سا بچھا دیا جس میں بھارتی ودیا پیٹھ، ابتدائی، ثانوی اسکولیں انگریزی اور مراٹھی میں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ پالی ٹیکنک، انجینئرنگ، لاء کالج اور مینجمنٹ ادارے پونے میں جاری کئے۔ آپ نے بھارتی سہکاری بینکوں کی بھی بنیاد ڈالی اس کے علاوہ آپ بھارتیہ دھینو رتی سہکاری گراہک بھنڈار کے بھی بانی ہیں۔ وچار بھارتی میگزین، وچار ک وایس ہفتہ وار دیگر مکلہ جاتی پرچے بھی آپ کے جاری کردہ ہیں۔ گرامین وکاس پرتشٹھان بھی آپ نے جاری کی۔ مہاراشٹر اسٹیٹ روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے بھی آپ نے چھ سال کام کیا اور ۹ سال تک آپ نے اسٹیٹ کوآپریٹو کنزیومرس فیڈریشن کے ڈائریکٹر کا عہدہ سنبھالا۔ اس کے علاوہ بھی آپ ایگزیکیٹو اور سینیٹ آف پونے یونی ورسٹی ۹ سال تک رہے۔ آل انڈیا ٹیچرز کونسل کی سیلیبس کمیٹی کے رکن اور رعیت شکشن سنستھا کے ایگزیکیٹو ہیں۔

شری چھترپتی آنند راؤ کیدار نے بی۔ اے تک تعلیم حاصل کی۔ کسانوں کی مالی حالت کے مدِنظر آپ نے امدادِ باہمی کے شعبے میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ ۲۹ سال کی عمر میں آپ ناگپور ڈیولپمنٹ بورڈ کے سکریٹری چنے گئے۔ اس عہدے پر آپ پانچ سال تک رہے۔ ۶۷-۱۹۶۲ تک آپ ناگپور ضلع پریشد کے صدر رہے۔ آپ نے ناگپور ڈسٹرکٹ کوآپریٹیو اڈسٹریل سوسائٹی ہمرآپریٹیو گنگ اینڈ پریسنگ فیکٹری، ساؤنیر کوآپریٹیو شوگر مل پاٹن، سوانجی اسٹیٹ کوآپریٹیو مارکٹنگ فیڈریشن، ناگپور ضلع کوآپریٹیو اسپننگ مل، وغیرہ کی سربراہی کی۔ آپ نے تعلیمی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اور ناگپور میں "مہاراشٹر شکشن سنستھا" کے سکریٹری کی حیثیت سے تقریباً ۱۵ اسکول چلا رہے ہیں۔ کلمنا میں نیو ایگری کلچرل پروڈیوس مارکیٹ یارڈ آپ کی کوششوں کا ثمرہ ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا ایشیا کا سب سے بڑا یارڈ ہے۔

سی۔ اے عرف باباصاحب کیدار
۱۵ر نومبر ۱۹۲۳ء کی پیدائش

چلا چل

• شیخ ہارون برقؔ
الیاس اپارٹمنٹس، تیسرا منزلہ۔
ڈاکٹر انصاری روڈ دوسری کارابوڑی
تھانہ ۴۰۰۶۰۱

قدم سوئے منزل بڑھاتا چلا چل
حوادث کو ٹھوکر لگاتا چلا چل
گھٹا امن کی بنکے چھا جا جہاں پر
ستم کی تپش کو مٹاتا چلا چل

بغاوت کے خاروں کا کچھ غم نہ کرنا
گلوں کی طرح مسکراتا چلا چل
شبِ غم میں مضمر سحر کی ہیں خوشیاں
مصائب سے آنکھیں ملاتا چلا چل

ہر اک سنگدل موم بنکر رہیں گے
پیامِ محبت سناتا چلا چل
نقوشِ قدم سے گلستاں سجیں گے
عزائم کے پرچم اڑاتا چلا چل

اندھیرے جہالت کے کافور ہوں گے
چراغِ ہدایت جلاتا چلا چل
نہ گھبرا کبھی کفر کے اژدھوں سے
عصائے کلیمی اٹھاتا چلا چل

بڑھا کر قدم برقؔ راہِ خدا میں
ہر اک قصرِ باطل کو ڈھاتا چلا چل

نجمہ شیخ
لائبریرین انجمن اسلام
اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
بمبئی ۱

"باپو اور ہندوستانی عورت"

" انسان خوش کیسے رہے؟
عام انسان کے اس فلسفیانہ سوال کا جواب پانے کے لئے"، انسان اُس دن سے محو عمل ہے جس دن سے اس نے علم کا پھل چکھا۔ اور جنت سے نکالا گیا۔ اس جہان فانی میں انسان اپنے وجود کے ساتھ نفسیاتی خواہشات بھی لایا۔ یہ خواہشات ہنوز نامکمل ہیں۔ ان نامکمل خواہشات کے سبب انسان اپنے اندر ایک خلا سا محسوس کرتا ہے اسی چیز، خلا کا نام غیر آسودگی ہے دکھ ہے۔

انسان آسودگی یا سکھ کس طرح حاصل کرے!
سکھ کے حصول کے لئے مختلف نظریات اور مختلف راستے ہیں میرے نزدیک یہ نظریہ زیادہ پائیدار ہے۔ کہ انسان تبھی آسودہ حال ہوسکتا ہے جب اس کی ازدواجی زندگی پر مسرت ہو یوں تو یہ زندگی دو متضاد افراد کے باہمی رشتوں کا نتیجہ ہے۔ یہ باہمی رشتہ وہ رشتہ ہے جسے دنیا کے ہر مذہب نے ایک پاکیزہ بندھن سے تعبیر کیا ہے اور معاشرے کی بنیاد قرار دیا ہے یہ رشتہ ہے شوہر

اور بیوی کا رشتہ قرآن مجید کے الفاظ میں " ایکدوسرے کا لباس" ہیں شوہر اور بیوی کو ایک دوسرے کا لباس بتلانے سے دونوں کی اہمیت برابر واضح ہو جاتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی شوہر کو مجازی خدا جیسے لفظ سے نوازا گیا ہے جس سے شوہر کا پلہ" کچھ بھاری محسوس ہوتا ہے۔ جو ہر زاویئے سے صحیح ہے۔

سوال اس بات کا ہے کہ کیا ہر شخص مذہب کے اس فلسفہ کو سمجھ سکا ہے۔ یا نہیں؟ اگر سمجھ گیا ہے تو یقیناً اس کی زندگی پر مسرت ہوگی۔ ازدواجی زندگی میں خوشی کا مطلب ایک گھر میں خوشی ہے اگر ہم اس خوشی کو اجتماعیت کا جامہ پہنائیں تو اس کا مطلب ہوگا دوسرے کنبہ کی خوشی اور کنبہ کی خوشی میں ملک کی خوشی مضمر ہے۔

ہمارا ملک ہندوستان ایک وسیع ملک ہے یہ مختلف مذاہب کا گہوارہ بھی ہے۔ ہر مذہب کی تعلیم بنیادی باتوں پر مبنی ہوتی ہے۔ صرف زمانے اور مروجہ

در واج کے اعتبار سے اس کا روپ بدل جاتا ہے ہر دور اور ہر مذہب میں اصلاح کار یا پیامبر پیدا ہوئے ہیں ایسے ہی سماجی اصلاح کار یا پیغامبر کا نام ہے ۔ موہن داس کرم چند گاندھی ۔۔ مہاتما گاندھی ۔۔ اور باپو ،

گاندھی جی کا ہر پیغام اصلاحی ہوتا تھا۔ لیا بھی ہر پیغامبر کا پیغام اصلاحی ہی ہوتا ہے۔ لیکن گاندھی جی کے یہاں ہمیں اصلاح کے علاوہ بھی بہت کچھ ملتا ہے جو سیدھے سادھے الفاظ میں ہوتا ہے۔ زندگی کی حقیقتوں سے قریب ہوتا ہے اور ہر خاص و عام اس پر دسترس رکھتا ہے۔
۔ مثلاً ۔

انسانیت کا پیغام، سچائی کا پیغام، حسن واخلاق کا پیغام، مساوات کا پیغام وغیرہ وغیرہ، انسان کی ہمہ وقت مسکراہٹ ہر وقت اک نئے پیغام کی طرف اشارہ کرتی تھی۔

باپو نے اپنے خیالات کا اظہار نہایت سیدھے سادے اور دلنشیں انداز میں کرتے تھے حقیقت یہ تھی کہ انھوں نے نہ صرف ہندوستانیوں کو ذہنی اور اقتصادی طور پر بلکہ ان کی روحانی مذہبی معاشی اور سماجی نفسیات کا گہرائی سے مطالعہ بھی کیا ہندوستانیوں کی زندگی کو انھوں نے قریب سے دیکھا اور ان کے حالات کا جائزہ لے کر ایسی تعلیمات کا درس دیا جو ایک عام انسان کی زندگی سنوارنے میں اہمیت کی حامل ہے ان تعلیمات پر چل کر انسان اپنی زندگی کو خوش سے خوشتر بنا سکتا ہے مثال کے طور پر حسن اخلاق خاموشی کفایت شعاری سچائی بھائی چارہ، اتحاد، اتفاق، اور بری عادتوں سے چھٹکارا وغیرہ ایسی ہی تعلیمات میں جن پر ہر خاص و عام عمل پیرا ہو سکتا ہے۔

آیئے ہم باپو کی ان تعلیمات پر نظر ڈالیں جو انھوں نے ہندوستانی عورتوں کو دیں ہندوستان ایک غریب اور وسیع ملک ہے جہاں سادگی معصومیت جہالت اور بے روزگاری کا دور دورہ ہے یہاں کی عورتیں ان پڑھ شرمیلی معصوم حقائق پسند اور شوہر پرست ہیں باپو نے ان پیکر حسن و وفا پر خاص طور سے توجہ دی ہے۔

باپو نے ہندوستانی عورت کی تعلیم کی طرف خاص پر اشارہ کیا ہے ان کی نظر میں ہندوستانی عورت اور خاص طور پر ماں کا تعلیم یافتہ اور سمجھ دار ہونا از حد ضروری ہے ماں کی گود بچہ کی پہلی تربیت گاہ ہے جب تک ماں سمجھدار نہ ہوگی بچہ کی تربیت صحیح طور پر نہیں ہو سکتی بچہ کی تربیت صحیح طور پر ہوگی تو ملک طاقت ور ہوگا۔

ماں کی گود اور گھر کے علاوہ بچہ پر سماجی ماحول کا بھی اثر پڑتا ہے اس لئے سماج کو صاف ستھرا ہونا بھی بے حد ضروری ہے تعلیم کے ساتھ ساتھ سماج کے ایسے خاص نکات کی سمت عورتوں کا دھیان دلانا ضروری ہے جن سے ان کی زندگی سنوارنے میں مدد ملے اگر ہر ہندوستانی عورت کو اس طور سے سنوارا جائے تو آئندہ نسلیں خود بخود آراستہ ہو جائیں گی۔

باپو کی نظر میں ہندوستانی عورت میں سمجھ داری اور خیالات میں پختگی ضروری ہے۔ واضح رہے کہ اس کیلئے عورت کا اعلیٰ سطح پر تعلیم حاصل کرنا یا اسکول کالج میں جاکر باقاعدہ تعلیم حاصل کرنا ضروری نہیں بلکہ ان کا مقصد پختہ سماجی شعور پیدا کرنا ہے۔ ایک تعلیم یافتہ خاتون اپنے فرصت کے چند لمحوں میں قرب وجوار کی خواتین کو جمع کرکے معمولی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان میں پختہ سماجی شعور پیدا کرنا ہے ایک اور ایسی باتوں کی تعلیم دے سکتی ہے جن سے انھیں اپنی گھریلو اور سماجی زندگی کی تشکیل میں آسانی ہو۔

باپو ہندوستانی عورتوں کو ذہنی طور پر سنجیدہ بنانا چاہتے تھے تاکہ وقت آنے پر وہ خود کو پہچان سکیں اپنے حقوق و فرائض کو سمجھ سکیں اس طرح ان میں خود اعتمادی پیدا ہوگی اور وہ ذہنی آزادی کا راستہ خود تلاش کرسکیں گی گاؤں کی ان پڑھ اور معصوم عورتوں کو شراب بندی کے فوائد بتلائے جائیں چھوٹے کنبے کا فوائد سے آگاہ کیا جائے اور منشیات کے نقصانات کا علم لیا جائے۔ تاکہ وہ بڑھتی ہوئی آبادی بے روزگاری اور اس کے نتائج واثرات سے وقت پر آگاہ ہو جائیں یہ باتیں مذہب کے چند سیدھے سادے اصول اور سچائی کی طرف ہوں تاکہ عورتیں ان سے متاثر ہوسکیں حسن واخلاق عورت کا زیور رہے جس میں جسمانی خوبصورتی اور نسوانیت سے زیادہ عورت کے خیالات کا نکھار اور جذبات کا صاف ستھرا ہونا زیادہ اہم ہے۔

باپو عورت کی جسمانی کمزوری سے بخوبی واقف تھے شاید اسی لئے انھوں نے گاندھی یاترا میں عورتوں کو حصہ لینے سے منع کیا۔ لیکن وہ عورتوں کو ذہنی طور پر طاقتور بنانا چاہتے تھے۔ وہ عورتوں کو آزادیٔ خیال اور آزادیٔ آرا کا حق دیئے جانے کے قائل تھے۔ انھوں نے یہ حقوق اپنی بیوی کستوربا گاندھی کو مکمل طور پر دیئے تھے۔

گاندھی جی صحیح معنوں میں عورتوں کو وقت کے ساتھ بدلنا چاہتے تھے ہندوستان کی تاریخ اس بات کی شاہد

ہے کہ ہندوستانی عورتیں ہر دور میں مرد کے دوش بدوش رہیں۔

آج گاندھی جی کی تعلیمات کہاں تک عمل پیرا ہوئیں یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں ہے آج کی ہندوستانی عورت نے اپنے پیروں پر کھڑے ہوکر زندگی گزارنے کا فن سیکھ لیا ہے آج حکومت کی طرف سے شراب نوشی کے نقصانات چھوٹے کنبہ کے فوائد گھریلو صنعت اور صحت وتندرستی کی تعلیم کے لئے لاتعداد مراکز بن چکے ہیں۔

آج کی ہندوستانی عورت سیاست میں بھی تقریباً مرد کے برابر حق دار ہے اور ایسا کوئی میدان نہیں جہاں عورت کی ذات کی کمی ہو ہر طبقہ میں عورت کی ضرورت اور اہمیت آج کل عام ہوچکی ہے لیکن ہنوز دلی دور است کے مصداق ملک کی ایک تہائی عورتیں گاندھی جی کے خوابوں کی تعبیر بن سکیں ہیں۔
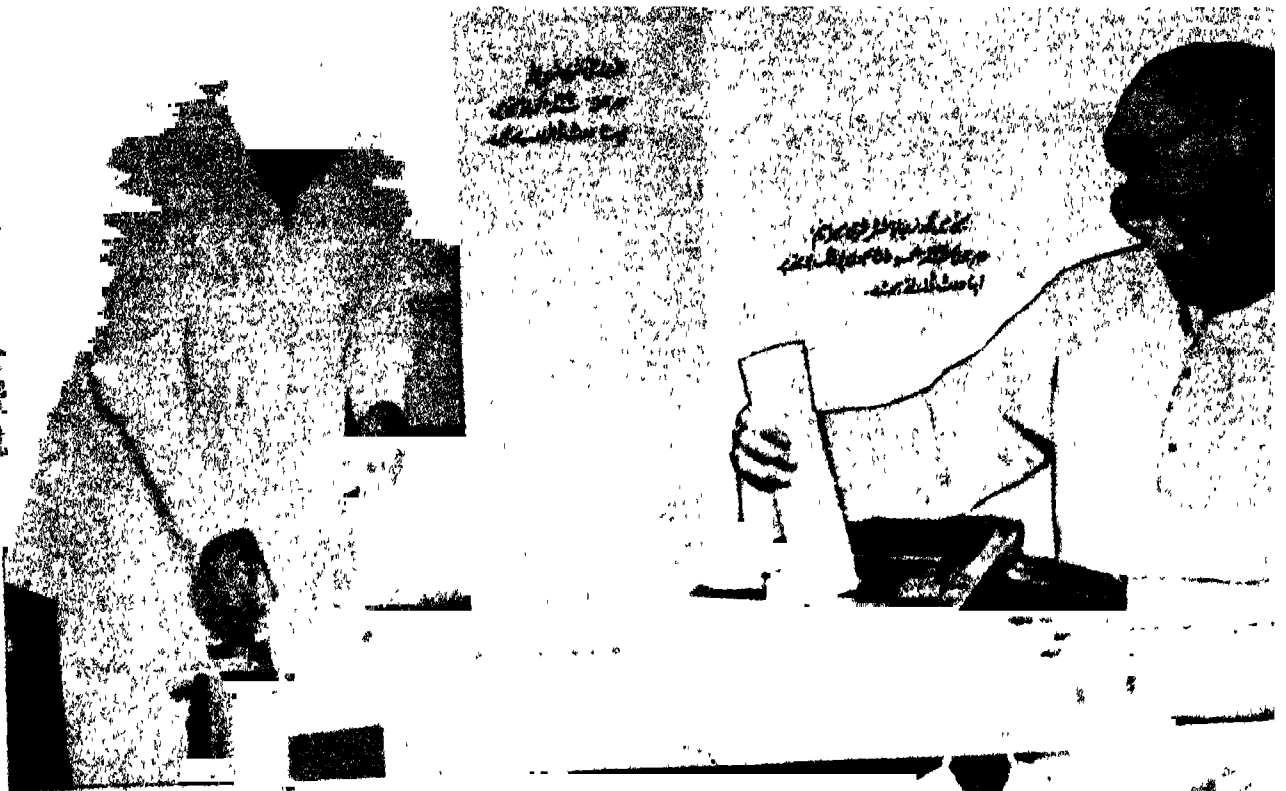
نالیگاؤں حلقہ انتخاب
میں ایک مسلم خاتون
اپنا ووٹ
ڈالتے ہوئے.

ڈاکٹر ایم۔آئی۔ساجد
کھام گاؤں

اردو میں اوّلیت کا مسئلہ

اردو زبان کے پہلے اور صاحب دیوان شاعر کے تعلق سے ماہرین السنہ و محققین کسی ایک خیال پر آج بھی وثوق کے ساتھ متفق نہیں ہو سکے چند قلی قطب شاہ کو اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر کہتے ہیں اور بعضوں کے نزدیک حضرت امیر خسرو دہلوی اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر (بلکہ اردو کے اوّلین شاعر) کہلانے کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔ اسی طرح اردو کے آغاز و ارتقاء سے متعلق بھی مختلف نظریات و خیالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ محمود شیرانی پنجاب کو اردو کا موسس اول کہتے ہیں محی الدین قادری زور دکن کو اردو کا گہوارۂ قدیم (اوّل) قرار دیتے ہیں اور شمالی ہند کے اہلِ علم و ادب دہلی کو اردو کا موسسِ اعلیٰ کہتے ہیں۔ اور آج بھی کم و بیش اسی صورتِ حال کا سامنا ہے۔

اردو کی ابتداء سے متعلق چند روز قبل ایک نئی اور قابلِ غور بات سامنے آئی ہے جس کی روشنی میں ایک اہم فیصلہ تک پہنچنے میں خاصی مدد ملتی ہے جناب جگن ناتھ آزاد نے ہفت روزہ "ہماری زبان" دہلی میں لسانیات کے محققین حضرات کو متوجہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ ــــ

"دسمبر ۱۹۷۰ء میں جب میں پاکستان گیا تو وہاں کے اہل علم حضرات کی طرف سے کتابوں کے تحائف میں ایک کتاب ایسی ملی جس کا ذکر میں خاص طور سے اس خط میں کرنا چاہتا ہوں اس کتاب کا نام ہے "انتخاب گنج شریف" اور یہ حضرت سید حاجی محمد گنج بخش قادری سرہ کی تصنیف ہے۔ اسے سید شرافت نوشاہی نے مرتب کیا ہے، تقدیم کے عنوان سے پروفیسر محمد اقبال مجددی شعبۂ تاریخ گورنمنٹ شاہ حسین کالج لاہور نے پینتیس ۳۵ صفحات پر مشتمل دیباچہ لکھا ہے اور استادِ محترم ڈاکٹر سید عبداللہ نے "چند سطور" کے زیرِ عنوان پیش لفظ لکھا ہے (مجھے اس کتاب کا ایک نسخہ پروفیسر محمد اقبال مجددی نے سفرِ لاہور کے دوران عنایت کیا تھا۔ پروفیسر محمد اقبال تقدیم "میں لکھتے ہیں" حضرت نوشہ گنج اردو اور پنجابی کے صاحبِ دیوان شاعر ہیں۔ اس وقت تک اردو ادب کی تاریخ میں جس صاحبِ دیوان شاعر کو اوّلیت حاصل ہے وہ محمد قلی قطب شاہ (۹۷۳ھ - ۱۰۲۰ھ) ہے حضرت نوشہ محمد قلی قطب شاہ سے چودہ سال پہلے پیدا ہوئے اور اس کی وفات سے چوالیس ۴۴ سال بعد وصال فرمایا" ڈاکٹر سید عبداللہ "چند سطور" میں تحریر فرماتے ہیں" گنج شریف کے مل جانے سے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اردو شاعری پنجاب میں دکن کے بعد نہیں شروع ہوئی اس کے ساتھ شروع ہوئی ہے بلکہ یوں سمجھئے کہ اس سے بھی پہلے کہ اس سے بھی پہلے کیونکہ گنج شریف میں محمد قلی شاہ کے کلام کے مقابلے میں زیادہ پختہ اور ترقی یافتہ زبان کے نمونے موجود ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ گنج شریف نے پروفیسر شیرانی کی تحقیق کے معیار سے بھی قدیم ترین سرمایۂ اردو کی نشان دہی کی ہے۔ جہاں تک زبان کی پختگی اور تصنیف کا تعلق ہے اردو کا اولین گھر یہی پنجاب تھا اور اب گنج شریف نے اس حقیقت کی ایسی توثیق کر دی ہے کہ جس کی تردید نہیں ہو سکتی۔"

(ہفت روزہ ہماری زبان" جشن ۲۲ مارچ ۱۹۷۱ء دہلی)

گو کہ قلی قطب شاہ اور حضرت نوشہ کے درمیان چودہ برس کا مختصر عرصہ ہے (ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد صاحب کے خط کی روشنی میں) لیکن جناب جگن ناتھ آزاد کا اس مراسلہ کو پیش کرنے کا انداز اور ہند و پاک کے ممتاز و معروف اور مستند

محقق ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کا وثوق کے ساتھ یہ کہنا کہ "اردو کا اولین گھر یہی خطۂ پنجاب تھا اور اب گنج شریف نے اس حقیقت کی ایسی توثیق کر دی ہے کہ جس کی تردید نہیں ہو سکتی! اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ حضرت نوشہ اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر تھے نیز یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ قلی قطب شاہ اور شمال ہند سے قبل پنجاب میں اردو کی داغ بیل پڑ چکی تھی اور اگر یہ سچ ہے تو پھر محمود شیرانی کی تحقیق بھی اہمیت اختیار کر جاتی ہے۔

اس طرح اردو کے پہلے اور صاحب دیوان شاعر کے ساتھ ساتھ اردو کے پہلے نثر نگار کا معاملہ بھی حتمی اور واضح صورت اختیار نہیں کر سکا۔ اردو کے پہلے نثر نگار کی حیثیت سے نام سامنے آتا ہے وہ ہے حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کا جبکہ اردو کے پہلے نثر نگار سید مخدوم شاہ حسینی ہیں۔ اس امر پر بحث کرتے ہوئے جناب

شری نواس لاہوٹی جو کہ ہفت روزہ ہماری زبان دہلی کے مشاورتی بورڈ کے رکن خصوصی بھی ہیں۔ ترقی اردو آندھرا پردیش (حیدر آباد) بزم اردو کے ترجمان جریدے "ضیائے ادب" کے مدیر کمال الدین علی کے مضمون "اردو کے اولین نثر نگار" پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں

"اس رسالہ کے مدیر کمال الدین علی خان کا مضمون "اردو کے اولین نثر نگار" جدید تحقیق کی روشنی میں جس کا سہرا ڈاکٹر حفیظ قتیل کے سر ہے بے معنی سا ہو کر رہ جاتا ہے اردو نثر کی پہلی مستند کتاب "کلمتہ الحقائق" ہے جو برہان الدین جانم کی تصنیف ہے۔ مضمون نگار نے "معراج العاشقین" کو اردو نثر کی پہلی تصنیف قرار دیتے ہوئے اسے خواجہ بندہ نواز سے منسوب کیا ہے۔ حالانکہ معراج العاشقین بارہویں صدی ہجری کی تصنیف سید مخدوم شاہ حسینی ملکانوری ہیں اور ڈاکٹر حسینی شاہد نے اپنی کتاب "شاہ امین الدین اعلیٰ حیات اور کارنامے" میں بڑی تفصیل سے اس پر روشنی ڈالی ہے۔"
(ہفت روزہ ہماری زبان ۱۲ / یکم اگست ۹۷ء دہلی)

درج بالا اقتباس سے دو باتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔ اوّل تو یہ کہ اردو کے پہلے نثر نگار کی حیثیت سے برہان الدین جانم کا نام سامنے آتا ہے جن کی کتاب "کلمتہ الحقائق" اردو کی پہلی نثری تصنیف ہے۔ دوم یہ کہ معراج العاشقین حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی نہیں بلکہ سید مخدوم شاہ حسینی ملکانوری کی تصنیف ہے اور جس کا سن اشاعت بارہویں صدی ہجری ہے۔

اب تک کی تحقیق کی روشنی میں متذکرہ بالا اقتباسات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اردو کے پہلے نثر نگار کا مسئلہ حل ہوتا نظر آتا ہے، ممکن ہے آگے چل کر کسی اور مستند تحقیق کی روشنی میں اس نازک مسئلہ پر کسی دوسرے گوشہ سے روشنی پڑے اور کوئی نئی بات منظر عام پر آئے۔ یہی صورت حال اردو کے پہلے اور صاحب دیوان شاعر کے تعلق سے بھی رونما ہو سکتی ہے اور دیگر اصناف ادب کے بارے میں بھی اور یہ بات اردو تحقیق کی سمت و رفتار سے منسلک ہے۔

ڈاکٹر آفاق فاخری
پوسٹ جلال پور ضلع فیض آباد
(یوپی) ۲۲۴۱۴۹

غزل

کوئی موسیٰ کہیں پہ عصا بھی نہیں
اور دریاؤں میں راستا بھی نہیں

شہر جن کے لہو سے چراغاں ہوا
ان کے گھر کو میسر دیا بھی نہیں

اپنی بے چہرگی دیکھنے کے لئے
اب کسی ہاتھ میں آئینا بھی نہیں

حلقۂ موسم گل میں تیرے بغیر
ذکر باد نسیم و صبا بھی نہیں

ہو گیا تم سے جو کچھ بنام ستم
اس طرح تو کوئی سوچتا بھی نہیں

تم نہ مانو نہیں یہ الگ بات ہے
اب تو ممکن کوئی معجزہ بھی نہیں

کون کس بات پر مجھ سے برہم ہے کیوں
مجھ کو آفاق اس کا گلا بھی نہیں

مظہر امام

غالبِ بے رنگ

غالب کو زمانے کی ناقدری کا ہمیشہ شکوہ رہا۔ ایسا نہیں کہ انہیں کسی نے پوچھا نہ ہو، ذوق کو استادِ شاہ ہونے کا شرف ضرور حاصل تھا، مگر غالب بھی مقربینِ خاص میں تھے شاہزادہ جواں بخت کا سہرا اگر ذوق کہتے تھے تو غالب بھی کہتے تھے اور پورے وقار کے ساتھ کہتے تھے لیکن پھر بھی انھیں یہی احساس رہا کہ ان کی قدر و منزلت نہیں۔

جو چاہیے نہیں وہ مری قدر و منزلت
میں یوسفِ بہ قیمتِ اول خریدہ ہوں

یہ احساسِ محرومی اسی انا کا پیدا کردہ تھا، جو اپنے مقابلے میں کسی کو سرفراز و سرخرو دیکھنا نہ چاہتی تھی اسی احساس نے ان کے دل میں رشک و حسد کا جذبہ پیدا کر دیا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ اگر اور کسی طرح نہیں تو وہ لفظی و معنوی غرابت اور پیچیدگی پیدا کر کے دوسروں کو متاثر و مرعوب کر سکیں!

غالب ایک عرصے تک مرزا عبدالقادر بیدل کے رنگِ سخن کا اتباع کرتے رہے ان کی مشکل پسندی اور معنی آفرینی اور سادہ سی بات کو پیچیدہ انداز میں پیش کرنے کی کوشش بیدل کے رنگِ سخن کی غمازی کرتی ہے لیکن غالب کو احساس ہوا کہ یہ طرز مطبوع و مقبول نہیں بن سکتا اور انکی شاعری اپنا مزاج، اپنا رنگِ سخن متعین کرنے میں ناکام ہے، تو وہ یہ کہہ کر اس رنگِ شعری سے دست کش ہو گئے!

طرزِ بیدل میں ریختہ کہنا
اسداللہ خاں قیامت ہے

وہ جس رنگ کا چلتے جامہ پہن لیتے انکی جامہ زیبی میں شبہ نہیں لیکن اس سے ان کے لباس کا کوئی مخصوص رنگ، جس سے انکی وضع قطع کی شناخت آسان ہو، ابھرتا نہیں تھا۔ لے دے کر ان کے اندازِ قد سے انھیں پہچانا جا سکتا تھا شکر ہے کہ یہ قد دوسروں سے یا کم سے کم اپنے ہم عصروں سے نکلتا ہوا ضرور تھا۔

انداز اً دو ہزار اشعار کے منتخب دیوان میں اعلیٰ درجہ کے غیر فانی اشعار بھی ہیں، محض اچھے اشعار بھی، اوسط درجے کے اشعار بھی اور نہایت ادنیٰ اشعار بھی۔

غالب کی اکثر غزلوں کے اشعار پر ایک نظر ڈالیے انہیں ایک طرح کی ناہمواری کا احساس ہوگا اور یہ بھی کہ شاید ان اشعار کا خالق ایک ہی شاعر نہیں ہے بلکہ کسی مشاعرے کی ہم طرح غزلوں کے اشعار ملا کر ایک غزل تیار کر دی گئی ہے جیسے۔

ذکر مرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں

وعدۂ سیرِ گلستاں ہے، خوشا طالعِ شوق!
مژدۂ قتل مقدر ہے، جو مذکور نہیں

شاہدِ ہستیِ مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ "ہے"، پر ہمیں منظور نہیں

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفی منظور نہیں

حسرت اے ذوقِ خرابی! کہ وہ طاقت نہ رہی
عشقِ پر عربدہ کی گوں تنِ رنجور نہیں

میں جو کہتا ہوں کہ "ہم لیں گے قیامت میں تمہیں"
کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ "ہم حور نہیں"

صاف دُردی کشِ پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ
وائے! وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں

یہ اشعار بھی دیکھئے۔ اشعار اپنے لہجے الفاظ اور اسلوب کے اعتبار سے اتنے مختلف ہیں کہ اگر "دیوان غالب" کے بار بار مطالعے سے ہمارے ذہن پر چھائے ہوئے نہ ہوں تو یہ اندازہ لگانا تقریباً ناممکن ہو جائے کہ یہ سارے اشعار ایک ہی شاعر کی تخلیق ہیں!

اسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

دھول دھپّا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

نقشِ نازِ بتِ طناز بہ آغوشِ رقیب
پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

غالبؔ کا مجموعۂ کلام اتنا مختصر ہے کہ اسے شروع سے آخر تک بار بار پڑھ لینا دشوار بھی نہیں پھر یہ دیوان دوسرے شعراء مثلاً میرؔ، سوداؔ، مومنؔ وغیرہ کے مقابلے میں کہیں زیادہ سہل الحصول ہے "دیوان غالب" کی اشاعت جتنی تعداد میں ہوئی ہے شاید اردو کی اور کسی کتاب کی نہیں ہوئی غالبؔ کو کچھ اتنی مقبولیت حاصل ہے اور ان کے اشعار کچھ اتنی بے تکلفی سے استعمال ہوتے ہیں کہ وہ زبان زد عام ہو گئے ہیں، اس لئے غالبؔ کے اشعار کو پہچاننے میں

غنی آغجان اکرد

غزل

اس جہاں میں اپنا ساتھی خود سے بہتر کون ہے
ہاں مگر میرا مخالف میرے اندر کون ہے

دیکھتے کیا! رہ گئے بس دیکھتے ہی دیکھتے
ہم ہیں یا آئینہ حیران و ششدر کون ہے

وہ مجسم رنگ و بو ہے میں سراپا آرزو
باغ تو اپنی جگہ خوشبو کا پیکر کون ہے

چلچلاتی دھوپ میں رہتا ہے جو سایہ فگن
ہر مسافر کو نوازے وہ صنوبر کون ہے

تیرتے ہیں شوق سے ٹھیرے ہوئے پانی میں سب
جان کر طوفاں میں اُترے وہ شناور کون ہے

جب حفاظت کی گھڑی میں قتل ہو جاتے ہیں لوگ
گھومتا ہے ہاتھ میں لیکر جو خنجر کون ہے

خامیوں پر کر مری اعجازؔ یہ کس کی نظر
لغزشوں پر ٹوکتا رہتا ہے اکثر کون ہے

دقت نہیں ہوتی یہ اشعار اپنے اسلوب، اپنے مزاج، اپنی مخصوص معنویت اور الفاظ کے دروبست سے نہیں پہچانے جاتے بلکہ اپنی شہرت کے باعث پہچانے جاتے ہیں۔
غالبؔ کا انفرادی رنگ یہی ہے کہ ان کا کوئی انفرادی رنگ

○ شاہد فریدی (علیگ)
جامعہ اردو۔ علی گڑھ

میکش بدایونی

اپنے دوستوں کے آئینہ میں

میکش بدایونی مرحوم کا تعلق بدایوں کے صدیقی گھرانے سے تھا۔ سنہ ۱۹۴۱ء میں ان کے والد ضیاء بدایونی پروفیسر ضیاء صدیقی بدایوں سے علی گڑھ بیت الحبیب' بدر باغ آگئے تھے اور یہاں کی ادبی فضاء میں میکش مرحوم شعور پختہ ہوا۔

میکش بدایونی باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے: وضع داری، انکساری، خلوص و محبت ان کا وصف تھا۔ علی گڑھ کی جہاں بہت سی خوبیاں ہیں وہاں یہ بھی فخر ہے کہ خلیل الرحمن اعظمی، اختر انصاری، جاوید کمال، مختار ہاشمی، شمیم قریشی، اور میکش بدایونی جیسے شاعر بھی پیدا کئے۔

مرحوم میکش کی شاعری کا لہجہ نہایت حسین اور دل کش ہوتا وہ جو بھی کہتے وہ شعر اپنی جگہ خوبیوں سے بھرپور ہوتا اور سامع کیلئے کشش رکھتا انھوں نے دورِ قدیم اور دور جدید کو دیکھا۔ !!
قدریں بدلنے لگیں لیکن میکش صاحب کی وہی نرالی ادا قائم تھی اور انہیں اپنی یہ ادا بہت پسند تھی ان کی یہ خوش ادا" وضعداری آخر دم تک قائم رہی۔ ... مرحوم کا دائرہ احباب نہایت وسیع تھا ہر طبقہ اور فکر و نظر کے لوگ ان کے شیدائی تھے، اپنے مخالفوں سے بھی وہ اس درجہ خلوص سے ملتے کہ وہ محبت کا دم بھرنے لگتا۔

میکش بدایونی سے میری ملاقات ۱۹۷۲ء تھی ان دنوں میں یونیورسٹی کا طالبعلم تھا میرے کلاس فیلو صحافی دوست توصیف چغتائی جو ان دنوں پاکستان ریڈیو اخبارات سے وابستہ تھے) کے ہمراہ ادبی محفلیں جمتیں تو میکش صاحب ضرور تشریف لاتے اور ان دنوں نادلٹی ٹاکیز کے سامنے کیفے دی ایروز ہوا کرتا تھا وہاں مرحوم نے ظفر مسعود برنی توصیف چغتائی' اشتیاق پھرامیونی ، اورنگ زیب اور راقم الحروف کے ساتھ یادگار شامیں گذاری ہیں۔ بنیادی طور سے ہم لوگ تو نثر نگار واقع ہوئے تھے لیکن شعر و سخن کے بیحد دلدادہ تھے جس کی وجہ سے پیاری پیاری موہنی صورتیں جب بھی شام افسانہ منایا جاتا تو ان محفلوں میں نظر آئیں،

ان ہی دنوں ہمارے عزیز دوست کلاس فیلو محمد علی طالب نے "شہر آرزو" نکالا جس کے معاون ساجد پرویز عرف حقہ ہوا کرتے تھے اور جو باقاعدہ میکش بدایونی کے شاگردوں میں سے ہیں اکثر میکش صاحب وہاں مسکراتے، جگمگاتے نظر آتے اور شاعری کے جوہر سے روشناس کراتے۔

جاوید کمال (رام پور) جو اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے میکش بدایونی سے بہت پیار کرتے تھے، ہردلعزیز نسیم قریشی صاحب تو میکش بدایونی کی" لے "کے بیحد دلدادہ تھے اور ان کے کلام کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا کرتے تھے۔

میکش بدایونی کی تعریف رمز آفاقی بڑے خلوص سے کرتے ہیں۔ ان کے سامنے شہریار کی شاعری جوان ہوئی اور بشیر بدر بھی چمکے لیکن میکش بدایونی کی طرز ادا ہی نرالی تھی۔ انھوں نے مشاعروں کے اکھاڑے سے ہمیشہ گریز کیا، شعری نشستوں میں جانے کا اتفاق ہوتا تو پوری محفل ان سے مسندِ صدارت کیلئے پر زور پیشکش کرتی۔

امین اشرف صاحب جو ان کے پڑوسی ہیں اور خود بھی شعر و سخن میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ ایک ملاقات کے دوران بتلایا کہ میکش بھائی کی موت سے علی گڑھ سونا ہوگیا ہے ان کے شعر اب بھی میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔

ایجوکیشنل بک ہاؤس کے کپتان اسد یار خاں نے ایک بار صحافی الطاف فریدی کے اردو جریدہ "نگ چننی" کا چیف ایڈیٹر بنا دیا تھا اور خوشی میں مرحوم سے لڈو بھی کھاتے تھے اور میکش صاحب کو میٹھا۔ اپنی شاعری کیطرح بیحد پسند تھا یہی وجہ تھی کہ زندگی کے ہر شعبہ میں میٹھا س رچ بس گئی تھی۔

میکش صاحب ہم لوگوں سے ہر اعتبار سے امتیازی حیثیت رکھتے تھے لیکن میکش صاحب کی شخصیت کی خوبی یہ تھی کہ ہر قسم کی سوسائٹی اور ہر عہد کے جوانوں، بچوں میں چلتے گھل مل جاتے کوئی بناوٹ اور تصنع نہ تھی مرحوم کی ایک ادا یہ بھی تھی کہ سواری سے زیادہ پیدل چلنے کو ترجیح دیتے طبیعت بارہ صنعت واقع ہوئی تھی۔

کسی دم قرار نہ تھا۔ پل بھر میں یہاں تو پل بھر میں وہاں نہایت چاق چوبند مسکراتے شیروانی میں ملبوس چلے آرہے ہیں۔
شہر کے مشہور شاعر مختار ہاشمی مرحوم سے میکش صاحب کے دوستانہ مراسم تھے جس کی وجہ سے بالائے قلعہ اکثر ان کی آمدورفت رہتی تھی۔ شہر کے نثر نگاروں میں فیاض رفعت عشرت امیر، توصیف چغتائی ظفر مسعود برنی، انوار علیگ، غیور عالم، رفیق حسین شاہین اور راقم الحروف کے علاوہ جانے پہچانے مقامی شعراء انجم مینائی (دیپک تنکوہ) دی۔ غوثی صاحب۔ ناز انصاری۔ مشفق امام، محمد احمد شبنم، شارق ادیب حسرت واحد جنا پرشاد راہی جاوید شہبازی مرحوم سے شعروادب پر طویل گفتگو ہوتی ان دنوں بالائے قلعہ محمد علی روڈ پر انصار شمسی کا مشہور ہوٹل اسکائی لارک تھا مرحوم میکش صاحب وہاں اکثر چائے پیتے نظر آتے زیادہ تر عثمانیہ ہوٹل۔ ادیبوں۔ شاعروں کی آماجگاہ ہوتا تھا۔
میکش بدایونی علی گڈھ کی محفلوں کی جان ہوا کرتے تھے جہاں بھی جاتے رونق بن کر چھا جاتے اور مشاعرے کے آخری وقت تک نہایت سنجیدگی سے شعراء کو سنتے داد دیتے یہ ان کے اعلیٰ ذوق کی مثال ہے۔
میکش بدایونی کے بھائی ظہیر احمد صدیقی جو ان دنوں شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی سے وابستہ ہیں ایک ملاقات کے دوران بتلایا کہ مرحوم پیدائشی شاعر تھے انھوں نے باقاعدہ کسی کی شاگردی اختیار نہیں کی سوائے والد محترم پروفیسر ضیاء بدایونی کے۔
میکش بدایونی مرحوم کے آخر دور تھے کہ شب و روز زیادہ تر ڈاکٹر مسرور کے کلینک پر گذر گئے تھے شام گئے جاتے اور گہری رات بیتے گھر لوٹتے یہاں کے ماحول میں ساغر جعفری، طالب محمود اور قدیر احمد صاحب مسلم مجلس کے صدر وغیرہ سے بہت مانوس تھے ....!
یہ ملاقاتیں، یہ باتیں جو شعری نشستوں کا ماحصل ہیں۔ بس ان کی غذا تھیں۔ دیکھتے دیکھتے اچانک بیماری موت کا بہانہ بنی، میڈیکل انسٹی ٹیوٹ لیجائے گئے جہاں فرشتہ اجل نے دامن تھام لیا۔
میکش بدایونی مرحوم کی شعری تخلیقات رسائل، اخبارات کے علاوہ دو مجموعہ کلام میکدۂ اور سلک گوہر پر مشتمل ہے۔
پسماندگان میں پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں چھوڑی ہیں میکش بدایونی کے انتقال نے علی گڈھ کے شعراء کرام کو ہی افسردہ نہیں کیا بلکہ اردو ادب کے پرستاروں کو بھی ملول رنجیدہ خاطر کیا ہے۔
مرحوم کو جنت الفردوس بخشے۔ آمین!

حفاظت کھنڈوی

غزل

دل ابھی دلبروں کی زد میں ہے
آئینہ پتھروں کی زد میں ہے

ریزہ ریزہ بکھر رہی ہے حیات
جب سے داکٹروں کی زد میں ہے

اونچی اونچی عمارتوں کا غرور
اجڑے اجڑے گھروں کی زد میں ہے

ہر زباں پر ہے الاماں کی صدا
قافلہ رہبروں کی زد میں ہے

چاند کو فتح کر چکا ہے مگر
آدمی ٹھوکروں کی زد میں ہے

اے حفاظت مآل اردو کیا
لشکری لشکروں کی زد میں ہے

قطعات

آپ ہندو نہ مسلمان سمجھ کر دیکھیں
کوئی رنا دار نہ دھنوان سمجھ کر دیکھیں
دھرم کے نام پہ طوفان اٹھانے والو
صرف انسان کو انسان سمجھ کر دیکھیں

کاش اس طرح ایک ہو جائیں
جس طرح رشتۂ گل و مالی
عید ہندو منائیں بھارت میں
اور مسلماں منائیں دیوالی

آپس کے اختلاف نے رسوا کیا ہمیں
اپنی چھری سے اپنا گلا کاٹتے ہیں ہم
فرقہ پرستیوں سے بلند ہو کے دیکھیے
کس کی زباں سے کس کا لہو چاٹتے ہیں ہم

نمی کے آئینہ سے

افسانہ

(ہندوستان کے مشہور افسانہ نگار پریم چند کے قلم سے)

(۱)

کے دل میں سربستہ ہی رہا۔ پورنما کو اس کی نظروں سے۔ باتوں سے۔ باقیدنے سے
رت کو اُس سے معمولی آداب ہمسائگی اور بچپن کی دوستی کے سوا اور کوئی تعلق بھی
جب وہ گھڑا لے کر کنوئیں پر پانی کھینچنے جاتی تو امرت خدا جانے کہاں سے
ہاتھ سے لے کر پانی کھینچ دیتا۔ جب وہ اپنی گائے کو سانی دینے نکلتی تو وہ اس کے
ہی لے لیتا۔ اور گائے کی ناند میں سانی ڈال دیتا۔ بنئے کی دوکان پر کوئی چیز
کی دوکان سے سبزی۔ امرت اکثر اسے مل جاتا اور اس کا کام کر دیتا۔ پورنما
لڑکا یا آدمی نہ تھا۔ اس کے باپ کا کئی سال پہلے انتقال ہو چکا تھا اور
تی۔ امرت پڑھنے جانے لگتا تو پورنما کے گھر جا کر پوچھ لیا کرتا۔ بازار سے کچھ
س کے گھر میں کھیتی باڑی ہوتی تھی۔ گائیں بھینسیں تھیں۔ باغ بغیچے تھے۔
وہ فصل کی چیزیں سوغات کے طور پر پورنما کے گھر دے آتا تھا۔ مگر پورنما
ں کی شرافت اور سیرچشمی کے سوا اور کیا سمجھے اور کیوں سمجھو۔ ایک گاؤں یا
ئی تعلق نہ رکھتے ہوں۔ مگر گاؤں کے رشتے سے بھائی بہن تو ہوتے ہی ہیں۔
کوئی خاص بات نہ تھی۔
رنما نے اس سے کہا بھی۔ تم دن بھر مدرسہ رہتے ہو۔ میرا جی گھبراتا ہے۔
دگی سے کہا۔ کیا کروں امتحان قریب ہے۔
ہوں جب میں چلی جاؤں گی تو تمہیں کیسے دیکھونگی۔ اور تم کیوں میرے گھر

امرت نے گھبرا کر پوچھا۔ کہاں چلی جاؤ گی تم؟

پورنما لجا گئی۔ پھر بولی۔ جہاں تمہاری بہنیں چلی گئیں۔ جہاں سب لڑکیاں چلی جاتی ہیں
امرت نے حسرت کے ساتھ کہا۔ اچھا وہ بات! اور خاموش ہو گیا۔ اس وقت تک یہ امر اس کے
ذہن میں نہ آیا تھا کہ پورنما کہیں چلی بھی جائے گی۔ اتنی دور تک سوچنے کی اُسے مہلت ہی نہ تھی۔
مسرت تو حال میں ہی مست رہتی ہے۔ آئندہ کی سوچنے لگے تو مسرت ہی کیوں رہے۔

(۲)

اور یہ سانحہ اس سے جلد رونما ہو گیا جس کا اسے گمان ہو سکتا تھا۔ پورنما کے لئے ایک پیغام
آگیا۔ معقول خاندان سے۔ اور پورنما کی ماں نے اسے بڑی خوشی سے منظور کر لیا۔ عسرت کی اس حالت
میں اس کی نظروں میں دنیا کی جو چیز سب سے زیادہ عزیز تھی وہ دولت تھی۔ اور یہاں پورنما
کیلئے فارغ البال زندگی کے سارے سامان موجود تھے۔ اُسے جیسے منہ مانگی مراد مل گئی۔ فکر وہ تو
گھلی جاتی تھی۔ لڑکی کی شادی کا دھیان آتے ہی اختلاج قلب ہونے لگتا تھا۔ مگر مشیت نے ہر ملکی
ایک جنبش سے اس کی ساری فکروں اور پریشانیوں کا خاتمہ کر دیا۔

امرت نے سنا تو دیوانہ ہو گیا۔ بے تحاشا پورنما کے گھر کی طرف دوڑا۔ مگر پھر لوٹ پڑا۔ ہوش نے
پاؤں روک دیئے۔ کیا فائدہ۔ اس کی کیا خطا! اپنے گھر آیا اور منہ ڈھانپ کر لیٹ رہا۔ پورنما چلی جائیگا
پھر وہ کیسے رہے گا ہیجان سا ہونے لگا۔ وہ زندہ ہی کیوں رہے۔ زندگی میں رکھا ہی کیا ہے۔
مگر یہ ہیجان بھی فرو ہو گیا۔ اور اس کی جگہ لی اس سکون نے جو طوفان کے بعد آتا ہے۔ وہ بے نیاز ہو گیا

جب پورنما جاتی ہی ہے تو وہ اب اُس سے کیوں ملے۔ اور اب پورنما کو اُس کی پرواہ ہی کیوں ہونے لگی۔ اور پرواہ تھی ہی کب۔ وہ خود ہی کتوں کی طرح اس کے پیچھے دُم ہلاتا رہتا تھا۔ پورنما نے تو کبھی بات بھی نہ پوچھی۔ اور اب اسے کیوں نہ غرور ہو۔ ایک لکھ پتی کی بیوی بننے جا رہی ہے۔ شوق سے جائے۔ امرت بھی زندہ رہے گا۔ مرے گا نہیں۔ یہی اس زمانے کی وفا ہے۔

مگر یہ ساری شورش دل کے اندر رہتی۔ بے عمل۔ اس میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ جا کر پورنما کی ماں سے کہے۔ پورنما میری ہے اور میری رہے گی۔ اُف! گاؤں میں کتنا کہرام مچ جائے گا۔ ایسا اندھیر گاؤں کی روایتوں نے کبھی سنا ہے؟ اور تاریخ نے کبھی دیکھا ہے؟

اور پورنما کا یہ حال تھا کہ دن بھر اس کی راہ دیکھا کرتی۔ وہ کیوں اس کے دروازے سے ہو کر نکل جاتا ہے۔ کیوں اندر نہیں آتا۔ کبھی رستے میں ملاقات ہو جاتی ہے تو کترا کر نکل جاتا ہے۔ وہ للسائے کر کنوئیں پر کھڑی رہتی ہے کہ وہ آتا ہوگا۔ مگر وہ نظر نہیں آتا۔

ایک دن وہ اس کے گھر گئی اور اس کے کمرے میں جا کر اس سے جواب طلب کیا۔ تم آج کل آتے کیوں نہیں؟

اور اس کا گلا بھر آیا۔ اسے یاد آیا کہ اب وہ اس گاؤں میں چند دنوں کی مہمان ہے۔ مگر امرت بے حس بیٹھا رہا۔ بے اعتنائی سے صرف اتنا کہا۔ امتحان قریب ہے۔ فرصت نہیں ملتی۔

اُس نے نگاہِ ملامت سے دیکھا۔ "دس پانچ منٹ کی بھی فرصت نہیں ملتی؟"

وہ شرمندہ ہو گیا۔ کیسے کہدے کہ یہاں دم مارنے کی بھی فرصت نہیں ملتی۔

"سوچتا ہوں جب تم جا ہی رہی ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

وہ کہنے جا رہا تھا۔ "تو اب محبت کیوں بڑھاؤں" مگر خیال آ گیا کتنی احمقانہ گفتگو ہے۔ کوئی مریض جب مرنے کے قریب ہو جاتا ہے تو کیا اس خیال سے اس کا معالجہ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس جوں جوں اس کی حالت نازک ہوتی ہے لوگ اور بھی زیادہ جوش پاس کے ساتھ دوا دوش کرتے ہیں۔ دکھتی جوہڑ جلد ہونے لگتی ہے۔ گفتگو کا پہلو بدل کر بولا۔ سنا ہے وہ لوگ بڑے مالدار ہیں۔

پورنما نے دردناک لہجہ میں کہا۔ تو اس میں میری کیا خطا؟ میں اپنی خوشی سے تو نہیں جا رہی ہوں۔ جانا پڑتا ہے اس لئے جا رہی ہوں۔

اور وہ شرما گئی۔ جتنا اسے کہنا چاہئے تھا شاید اُس سے زیادہ کہہ گئی۔ محبت میں بھی شیلیوں کی سی چالیں ہوتی ہیں۔

امرت نے اس کی طرف اس طرح دیکھا گویا تحقیق کرنا چاہتا ہے کہ ان لفظوں میں کچھ معنی بھی پوشیدہ ہیں یا نہیں۔ کاش اس کی آنکھوں میں وار پار دیکھنے کی طاقت ہوتی۔ اس طرح کی مایوسانہ گفتگو تو سبھی لڑکیاں کرتی ہیں گویا شادی ہوتے ہی ان کی جان پر بن جائے گی۔ مگر سبھی ایک دن اچھے اچھے گہنے کپڑے پہن کر پالکی میں بیٹھ کر چلی جاتی ہیں۔ ان الفاظ سے اس کی کچھ بھی تشفی نہ ہوئی۔ پھر ڈرتے ڈرتے بولا۔ تب تمہیں میری یاد کیوں آنے لگی۔

اور اس کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ ایسی وحشت خیز ندامت ہوئی کہ کمرہ سے باہر بھاگ جائے پورنما کی طرف تاکنے کی بھی جرأت نہ کر سکا۔ پورنما کہیں سمجھ جائے تو۔

پورنما نے سر جھکا کر جیسے اپنے دل سے کہا۔ تم مجھے اتنی ناسمجھی سمجھتے ہو تم آج سے بے قصور رہتے ہو نہیں اس وقت مجھ سے ہمدردی کرنی چاہئے۔ مجھے تشفی دینی چاہئے۔ اور تم مجھ سے تنے بیٹھے ہو۔ تمہیں بتاؤ میرے لئے دوسرا کون سا رستہ ہے۔ اپنے مجھے غیروں کے گھر بھیجے دے رہے ہیں۔ وہاں مجھ پر کیا گذرے گی۔ میری کیا حالت ہوگی یہ غم کیا میری جان لینے کے لئے کافی نہیں ہے۔ کہ تم اس میں اپنا غصہ بھی مل کر دو۔

اس کا گلا پھر بھر آیا۔ آج امرت کو اس ملامت میں پورنما کے سوزِ پنہاں کا یقین نصیب ہوا۔ اور اپنی کم ظرفی اور نفس پروری گویا کالکھ بن کر اس کے چہرے پر چکنے لگی۔ پورنما کے ان الفاظ میں کتنی صداقت تھی اور کتنی سرزنش اور کتنا اپناپن۔ غیروں سے کوئی کیوں شکوہ کرے۔ بیشک اس حالت میں اسے پورنما کی دلجوئی کرنی چاہئے تھی۔ یہ اس کا فرض تھا۔ اور اسے اس فرض کو خندہ پیشانی سے پورا کرنا چاہئے۔ پورنما نے محبت کا ایک نیا معیار اس کے سامنے رکھدیا تھا اور اس کا ضمیر اس معیار کے سامنے سر جھکا رہا تھا۔ بیشک محبت ایک بے نفس قربانی ہے۔ طویل اور جگردوز۔

اس نے پشیمان ہو کر کہا۔ مجھے معاف کر دو پورنما۔ میری غلطی تھی۔ حماقت۔

(۳)

پورنما کی شادی ہو گئی۔ امرت دل و جان سے اس کے اہتمام میں مصروف رہا۔ دولہا میرٹھ تھا۔ بالکل بھل بھل۔ توندل۔ کم رو۔ اور اس کے ساتھ بڑا مغرور اور بدمزاج۔ لیکن امرت اس انہماک سے اس کی خاطرداری میں مصروف تھا گویا وہ کوئی دیوتا ہے۔ اور اس کا ایک تبسم اسے جنت میں پہونچا دے گا۔ پورنما سے بات چیت کرنے کا امرت کو کوئی موقع نہ ملا اور نہ اس نے موقع پیدا کرنے کی کوشش کی۔ وہ پورنما کو جب دیکھتا روتے ہی دیکھتا اور آنکھوں کی زبانِ خاموش سے جتنی دلجوئی اور ہمدردی ممکن تھی وہ کرتا رہتا تھا۔

تیسرے دن پورنما رو دھو کر رخصت ہو گئی۔ امرت نے اس دن شیومندر میں جا کر بڑی عبودیت سے بھرے ہوئے دل سے دعا کی کہ پورنما ہمیشہ سکھی رہے۔ غم کی تازگی میں فاسد خیالات کا کہاں گذر۔ غم تو روحانی امراض کا ازالہ ہے۔ مگر دل کے اندر اسے ایک ہمہ گیر سُونے پن اور خلا کا احساس ہو رہا تھا۔ گویا اب زندگی ویران ہے۔ اس کا کوئی مقصد اور مدعا نہیں۔

تین سال کے بعد پورنما میکے آئی۔ اس دوران میں امرت کی بھی شادی ہو چکی تھی اور وہ زندگی کا جوا گردن پر رکھے لکیر پیٹتا چلا جا رہا تھا۔ مگر ایک موہوم سی تمنا۔ جس کی کوئی واضح صورت وہ نہ بنا سکتا تھا۔ تھرمامیٹر کے پارے کی طرح اس کے اندر محفوظ تھی۔ پورنما نے آ کر اس میں حرارت ڈال دی اور پارہ چڑھ کر سرسام کی حد تک جا پہنچا۔ اس کی گود میں ایک دو سال کا بچہ تھا۔ امرت اس بچے کو سارے دن گلے باندھے رہتا۔ صبح ہوتے ہی اس کے ناشتے کے لئے حلوا اور دودھ

اتا تو ٹھلاتا۔ اس کے بال صاف کرتا۔ اس کے پھوڑے پھنسیوں کو دھوتا
ت اس نے اپنے ذمے لے لی۔ یہ بھی اس سے سنا پل گیا کہ ایک لڑکے
ہانتک کہ کبھی کبھی اس کے ساتھ سو بھی جاتا۔
کے لڑکے ہو؟

توالا ہو کر اسے جگر سے چپٹا لیتا۔
اور بھی نکھر آیا تھا۔ کلی کھل کر پھول ہو گئی تھی۔ اب اس کے مزاج
قی۔ سنگار سے عشق۔ طلائی زیوروں سے لگا کر اور ریشمی ساڑی پہن کر
جاذب نظر ہو گئی تھی۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا امرت سے احتراز کرتا
رت کے اس سے بہت کم بولتی ہے۔ اور وہ بھی اس انداز سے گویا
رت اس کے بچے پر کس قدر جان دیتا ہے اور اس کی فرمائشوں کی کتنی
بظاہر اس کی نگاہوں میں ان باتوں کی کوئی وقعت نہ تھی۔ گویا یہ
ادا کرنا چاہئے۔ اس کے لئے وہ کسی شکریہ یا احسان کا حقدار نہیں۔
تی ہے۔ خبردار رونا نہیں۔ ورنہ ماموں تم سے کبھی نہ بولیں گے۔
جب اسے کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے وہ امرت کو بلا کر تحکمانہ انداز
تعمیل کرتا ہے۔ گویا اس کا غلام ہو۔ اور وہ بھی شاید کمبخت سے صاف

رنا سسرال چلی گئی۔ امرت اسے پہونچانے اسٹیشن تک آیا۔ جب وہ گاڑی
کو اس کی گود میں دیدیا۔ اور اس کی آنکھوں سے آنسو کی ایک بوند
اور آنکھوں پر ہاتھ پھیر کر آنسو پونچھ ڈالا۔ پورنما کر اپنے آنسو کیسے
با۔ اب نہ جانے پھر کب ملاقات ہو۔
انداز سے کہا۔ ہم تمہیں بہت پڑھے گا۔
۔ اس کی آواز قابو میں نہ تھی۔
خط تو بھیجا کرو۔

وں گی۔ یہ بھولو"
لگتا تو نہیں"

ی۔ امرت اس کی کھڑکی کی طرف دیکھتا رہا۔ ایک فرلانگ کے بعد
ڑکی سے سر نکالا۔ اور اس کی طرف دیکھا۔ پھر پیچھے کر گود میں لے کر لگا

امرت کا دل اس وقت اڑ کر اس کے پاس پہونچ جانا چاہتا تھا۔ اس وقت وہ اتنا
خوش ہے جیسے اپنی منزل مقصود پر پہونچ گیا ہو۔

―― (۴) ――

اسی سال پورنما کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ پورنما زچہ خانے میں تھی۔ ماں کا آخری دیدار
نہ کر سکی۔ امرت نے علاج معالجہ میں جتنی دوا دوش ہو سکی کی۔ کریا کرم کیا۔ براہمنوں کو کھلایا پلایا۔ بناوٹی
دعوت کی۔ جیسے اس کی ماں مر گئی ہو۔ انکے ماں باپ انتقال کر چکے تھے۔ کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہ
تھا۔

پورنما اب کس نانی سے ملنے آتی۔ اور اسے اب فرصت بھی کہاں تھی۔ اپنے گھر کی مالکن تھی
کس پر گھر چھوڑ کر آتی۔ اس کے دو بچے اور بھی ہوئے۔ بڑا لڑکا بڑا ہو کر اسکول میں پڑھنے لگا۔
چھوٹا دیہات کے مدرسے میں پڑھتا تھا۔ امرت سال میں ایک بار نائی بھیجکر خیر سلا منگا لیا کرتا
تھا۔ پورنما فارغ البال ہے۔ خوش ہے۔ اس کی تشفی کے لئے اتنا کافی تھا۔ امرت کے لڑکے بھی اب
سیانے ہو گئے تھے۔ خانہ داری کی فکروں میں پریشان رہتا تھا۔ اور عمر بھی چالیس سے آگے نکل گئی تھی
مگر پورنما کی یاد ابھی تک اس کے جگر کے عمیق ترین حصہ میں محفوظ تھی۔

دفعتاً ایک دن امرت نے سنا کہ پورنما کے شوہر کا انتقال ہو گیا۔ مگر تعجب یہ تھا کہ اسے رنج
نہ ہوا۔ وہ خواہ مخواہ اپنے دل میں یہ طے کر بیٹھا تھا کہ اس خبیث شوہر کے ساتھ پورنما کی زندگی تباہ
ہلاک نہیں ہو سکتی۔ ذہن کی مجبوری اور عصمت پروری کے لحاظ سے پورنما نے کبھی اپنے سوز جگر کا
اظہار نہ کیا ہو۔ مگر یہ غیر ممکن ہے کہ آرام اور فارغ البالی کے باوجود بھی اسے اس مکروہ صورت
انسان سے کوئی خاص محبت رہی ہو۔ یہ تو ہندوستان ہی ہے جہاں ایسی اپسرائیں ایسے نااہلوں کے
گلے باندھ دی جاتی ہیں۔ ورنہ کسی دوسرے ملک میں تو پورنما جیسی عورت پر ملک کے نوجوان
نثار ہو جاتے۔ اس کی مری ہوئی تمنائیں۔ پھر زندہ ہو گئیں۔ اب اس میں وہ شباب کی
جھلک نہیں ہے۔ نہ اس کی زبان پر وہ مہر خموشی ہے۔ اور پورنما بھی اب آزاد ہے۔ تقاضاء
سن نے اسے یقیناً زیادہ مہر پرور بنا دیا ہوگا۔ وہ شوخی اور الھڑپن اور بے نیازی تو کب کی
رخصت ہو چکی ہوگی۔ اس دوشیزگی کی جگہ اب آزمودہ کار نسائیت ہوگی۔ جو محبت کی
قدر کرتی ہے اور اس کی طلبگار رہتی ہے۔ وہ پورنما کے گھر ماتم پرسی کرنے جائے گا اور اسے
اپنے ساتھ لائے گا اور اس کے امکان میں اس کی جو کچھ خدمت ہو سکے گی وہ کرے گا۔ اسے اب
محض پورنما کے قرب سے ہی تشفی ہو جائے گی۔ وہ محض اس کے منہ سے سنکر روحانی مسرت پائے گا
کہ وہ اب بھی اسے یاد کرتی ہے۔ اب بھی اس سے وہی بچپن کی سی محبت کرتی ہے۔ جس سال پہلے
اس نے پورنما کی جو صورت دیکھی تھی۔ وہ بھرا ہوا جسم وہ رخساروں کی سرخی۔ وہ ملاحت۔ وہ
اس کی کچھی ہوئی ٹھنڈی جس میں امرت سے بھرا ہوا حوض تھا۔ وہ اس کی نفیس مسکراہٹ

وہی صورت بہت خفیف تغیر کے ساتھ ابھی اس کی آنکھوں میں تھی۔ اور وہ تغیر اب اسے اور بھی خوشگوار معلوم ہوتا تھا۔ ضرور زمانہ کی بیدردیوں کا اس کے اوپر کچھ نہ کچھ اثر ہوگا۔ لیکن اس کے جسم میں کسی ایسی تبدیلی کا وہ گمان بھی نہ کرسکتا تھا۔ جس سے اس کی دلفریبی میں کچھ فرق آجائے۔ اور اب وہ ظاہر کا اتنا گرویدہ بھی نہ تھا جتنا اس کی سنہلی تصویر کا اس کی نگاہ محبت کا اس کے اعتقاد کا۔ وہ مردانہ خود پروری کے زعم میں شاید یہ بھی سمجھتا تھا کہ وہ پُورنما کے ناآسودہ ذوق محبت کو اپنی ناز برداریوں اور گرمجوشیوں سے محظوظ کرے گا۔ اور اپنی پچھلی فروگذاشتوں کی تلافی کرے گا۔

حسن اتفاق سے ایک دن پُورنما خود اپنے چھوٹے لڑکے کے ساتھ اپنے گھر میں آگئی۔ اس کی ایک بیوہ موسی جو اس کی ماں کے ساتھ ہی اپنی بیوگی کے دن کاٹ رہی تھی۔ ابھی موجود تھی۔ وہ سونا گھر آباد ہوگیا۔

امرت نے اس کی آمد کی خبر سنی تو اشتیاق سے متوالا ہو کر دوڑا۔ بچپن اور شباب کی شیریں اور پرحسرت اور پرشوق یادگاروں کو دل کے دامن میں سنبھالتا ہوا جیسے کوئی بچہ اپنے ہمجولی کو دیکھ کر اپنے ٹوٹے پھوٹے کھلونے لے کر دوڑے۔

مگر اس کی صورت دیکھتے ہی اس کا اشتیاق اور ولولہ جیسے بجھ گیا۔ وہ سکتے کے عالم میں کھڑا رہ گیا۔ پُورنما آکر اس کے سامنے سر جھکا کر کھڑی ہوگئی۔ سفید ساڑی کے گھونگھٹ سے آدھا منہ چھپا ہوا تھا۔ مگر کمر جھکی ہوئی ماہیں سوت سی پتلی پشتِ پا کی رگیں ابھری ہوئیں۔ آنکھوں سے آنسو جاری جیسے کفن میں لپٹی ہوئی لاش کھڑی ہو۔

اس نے بھرے ہوئے گلے سے کہا۔ یہ تمہاری کیا حالت ہے پُورنما۔ میں تو ابھی زندہ ہی ہوں پُورنما کی موسی نے آکر کہا۔ بیٹھو بیٹا۔ دیکھتے ہو اس کی حالت۔ سوکھ کر کانٹا ہوگئی ہے۔ ایک چھن کو بھی آنسو نہیں تھمتے۔ ایک وقت سوکھی روٹیاں کھاتی ہے۔ اور کسی چیز سے مطلب نہیں۔ نمک چھوڑ دیا ہے۔ گھی دودھ سب تیاگ دیا۔ بس روکھی روٹیوں سے کام۔ اس پر بھی مہینے میں اکادشی برت اتوار۔ منگل۔ زمین پر سوتی ہے۔ ایک چٹائی بچھا کر لڑکے بچھاتے ہیں۔ گھر میں بھگوان کا دیا سب کچھ ہے مگر کسی کی نہیں سنتی۔ کہتی ہے جب بھگوان نے سہاگ ہی اٹھالیا تو سب کچھ متھیا (باطل) ہے جی بہلانے کے لئے یہاں آئی تھی۔ مگر یہاں بھی رونے کے سوا دوسرا کام نہیں۔ کتنا سمجھاتی ہوں بیٹی بھاگ میں جو کچھ لکھا تھا وہ ہوا۔ اب صبر سے کام لو۔ بھگوان نے تمہیں بال بچے دیئے ہیں ان کو پالو۔ چار کو کھلا کر کھا سکتی ہو۔ من پوتر چاہئے۔ بدن کو دکھ دینے سے کیا ہوگا۔ مگر سنتی ہی نہیں۔ تم سمجھاؤ تو شاید مانے۔

اور امرت ظاہر بے حس مگر باطن میں روح فرسا درد چھپائے کھڑا تھا۔ گویا جس بنیاد پر زندگی کی عمارت کھڑی کی تھی۔ وہ ہل گئی ہو۔ آج اسے معلوم ہوا کہ زندگی بھر اس نے جس چیز کو حقیقت سمجھا تھا وہ محض خواب تھا۔

نفس کشی اس کامل تسخیر اور عمل کے اس نا ہوانہ اجتہاد میں اس کی وہ پُر ارمان اور پُر اشتیاق محبت فنا ہوگئی۔ اور اس کے سامنے یہ نئی حقیقت جلوہ افروز ہوئی کہ دل میں اگر مٹی کو دیوتا بنانے کی قدرت ہے تو انسان کو دیوتا بنانے کی بھی قدرت ہے پُورنما اسی مکروہ انسان کو دیوتا بنا کر اس کی پرستش کر رہی تھی۔

اس نے احترام کے لہجہ میں کہا۔ تپسوی کو ہم جیسے غرض کے بندے کیا سمجھا سکتے ہیں موسی۔ ہمارا فرض ان کے قدموں پر سر جھکانا ہے۔ سمجھانا نہیں۔

اور پُورنما نے منہ پر کا گھونگھٹ ہٹاتے ہوئے کہا۔ تمہارا بچہ ابھی تک تمہیں پوچھا کرتا ہے۔

سالنامہ نیرنگ خیال

۱۹۲۶ء

تجدیدِ خریداری کیلئے گذارش!

اس شمارے سے اگر آپ کی مدتِ خریداری ختم ہو رہی ہے یا ختم ہو چکی ہے تو آج ہی آئندہ مدت کے لئے رقم خریداری بذریعہ منی آرڈر روانہ فرما دیجئے تاکہ رسالہ آپ کی خدمت میں مسلسل جاری رہے۔

بصورتِ دیگر مدتِ خریداری ختم ہو جانے کے بعد رسالہ کی ترسیل ممکن نہ ہو سکے گی۔ خریدار حضرات بطورِ خاص نوٹ فرمالیں۔ تجدید خریداری کی رقم روانہ فرماتے وقت منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر (جو آپ کے پتے کی سلپ کے اوپر درج ہوتا ہے) ضرور درج فرمائیں اور اپنا نام، پتہ، پن کوڈ نمبر بھی صاف صاف تحریر فرمائیں۔ (ادارہ)

نام کتاب: "شعور وادراک"
مصنف: محمد ایوب واقف
صفحات: ۲۷۲
قیمت: ۸۰ روپے
مبصر: ڈاکٹر شمیم اختر اعظم گڑھ، یوپی

گذشتہ دو دہائیوں میں جن اہلِ قلم نے مستقل محنت کے ذریعہ اردو کی تنقید نگاری اور خاکہ نویسی میں اپنا منفرد مقام بنایا ہے ان میں اردو کے جواں سال ادیب جناب محمد ایوب واقف کو خصوصیت کا مقام حاصل ہے۔ ان کے اس بلند مقام کے تعین میں ان کی کئی مطبوعات مثلاً "ذکرِ رفتگاں" "سردار جعفری شخصیت اور شاعری" "جگناتھ آزاد ایک مطالعہ" اور "مکاتیب منشی دیانرائن نگم" وغیرہ خصوصی کردار ادا کرتی ہے ان کی بالکل تازہ اور حالیہ کتاب کا نام "شعور وادراک" ہے۔ اس کتاب کو اردو ادب کے نثری سرمائے میں ایک خوبصورت اضافے کے طور پر تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ محمد ایوب واقف کی اس گراں قدر تصنیف میں کل تیرہ مضامین ہیں۔ ان کے عنوانات اس طرح ہیں ۱: اردو کا ایک نایاب مرثیہ" ۲: "اندراوت اور اس کا مصنف" ۳: "قلی قطب شاہ کی شخصیت کے کچھ دلچسپ پہلو" ۴: "جوش ملیح آبادی" ۵: "ملے سے ہندوستانی نہیں کہتے" ۶: اردو اور ہندی کا مسئلہ" ۷: ماہنامہ زمانہ کانپور کا ایک مستقل عنوان" ۸: خواجہ احمد عباس" ۹: مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن" ۱۰: سیتا محل سے اندلس کورٹ تک (ایک رپورتاژ) ۱۱: ایشیا کی عظیم بیٹی۔ قرۃ العین حیدر" ۱۲: پارو۔ ایک منظوم افسانہ" ۱۳: اختر الایمان سے دو ادبی ملاقاتیں ۔۔۔ ان مضامین کے علاوہ اس کتاب میں دو اور تحریریں شامل ہیں۔ ان میں ایک دیباچہ ہے اور دوسری تحریر ضمیمہ کے نام سے عین اختتام پر شامل ہے۔ اس کے تحت مصنف کی مشہور خاکوں پر مشتمل کتاب ذکرِ رفتگاں پر اکابرین علم وادب کی رائیں شامل ہیں۔ یہی کل سرمایہ ہے جو زیر نظر کتاب کی شکل میں ہمارے سامنے آیا ہے۔ ویسے تو اس کتاب کے سارے ہی مضامین انوکھے عنوانات پر ہیں اور ان پر مصنف سے پہلے یا تو بہت کم لکھا گیا ہے یا سرے سے لکھا ہی نہیں گیا ہے لیکن جہاں تک اس کتاب کی سب سے عمدہ تحریر کا سوال ہے میرے خیال سے وہ کتاب کا طویل اور مدلل دیباچہ ہے۔ اس میں لائق مصنف کی مشہور من کی بات کو بلا خوف وخطر پیش کر دیا ہے یہاں اپنی انفرادی اور دانشورانہ خیالات کے ذریعے مصنف اس بات کا حقدار نظر آتا ہے کہ اس کے قلم کی تاب وطاقت کا لوہا مانا جائے۔ ویسے تو محمد ایوب واقف صاحب خاکہ نگاری میں ذکرِ رفتگاں کی اشاعت کے بعد اپنا نقش بٹھا چکے ہیں اور ان کے اس نقش کو ہندوستان اور پاکستان کے مستند اور معتبر اہلِ قلم حضرات دادِ تحسین دے چکے ہیں لیکن اس کتاب میں شامل تین خاکے جو خواجہ احمد عباس" مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن اور قرۃ العین حیدر سے تعلق رکھتے ہیں اردو کے بہترین خاکوں میں رکھے جا سکتے ہیں ان خاکوں میں شخصیت کو پیش کرنے کا جو اسلوب انھوں نے اختیار کیا ہے اس کی جاذبیت اور کشش اپنے آپ میں ایک مسلّم الثبوت حقیقت ہے اور اس حقیقت کا اعتراف قاری کو اسی وقت ہوگا جب وہ زیر تبصرہ کتاب کے مطالعہ کے عمل سے گذریگا

کتاب کے دیگر مشمولات میں "سینا محل سے اندلس کورٹ تک" کے عنوان سے جو رپورتاژ شامل ہے وہ بھی انتہائی عمدہ چیز ہے۔ اس رپورتاژ میں متفرق عنوانات کو زیر گفتگو لایا گیا ہے اور ان پر بلا تکلف اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے لیکن بے پناہ معنی و مطالب رکھنے والے جملے تیر و نشتر کا کام کرتے ہیں۔ اختر الایمان نے اپنی دو ادبی گفتگو کی جو روئداد اس کتاب میں صاحب کتاب نے پیش کی ہے وہ اختر الایمان کی شخصیت اور شاعری کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے حد درجہ مفید اور کارآمد چیز ہے۔ محمد ایوب واقف صاحب نے اس کے شروع میں آٹھ صفحات پر مشتمل جو مضمون اختر الایمان صاحب کے فن پر لکھا ہے وہ ایک بے لاگ اور بے ضرر تبصرہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب شعور و ادراک افراتفری یا ردا داری میں پڑھی جانے والی کتاب نہیں ہے۔ اس کے سارے ہی عنوانات سنجیدہ مطالعہ کا مطالبہ کرتے ہیں اور اگر قاری پوری سنجیدگی کے ساتھ اس کتاب کا مطالعہ کرے گا تو یقینی طور پر اس کی معلومات میں بے پناہ اضافہ ہوگا۔ اس کتاب کی دیگر خوبیوں میں ایک بڑی اور اہم خوبی اس کا دلکش اور شگفتہ اسلوب نگارش ہے اور ظاہر ہے اس اسلوب نگارش کو بنانے اور سنوارنے میں مصنف نے برسوں کی محنت اور ریاضت سے کام لیا ہے

نام کتاب: آنچل اور پرچم۔ نظموں کا مجموعہ
شاعر: سروش یزدانی
صفحات: ۹۶ قیمت ۲۲/ روپے
ناشر: وقار پبلیکشنز، موتی چوک امراپور، ضلع بلڈانہ

تبصرہ نگار: ڈاکٹر محبوب راہی

سروش یزدانی علاقہ برار (ودربھ) کے کہنہ مشق شاعروں کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جن کے دم سے ۱۹۴۷ء کے بعد برسوں تک یہ علاقہ علمی و ادبی تحریکوں کا مرکز بنا رہا۔ اور جن سے روشنی پاکر آج اس علاقے میں شاعروں اور ادیبوں کی نئی نسل اپنی چمک دمک سے دنیائے شعر و ادب کو تابندہ کئے ہوئے ہے چار دہائیوں سے زیادہ طویل اپنے تخلیقی سفر کا ماحصل زیر تبصرہ مجموعہ سروش صاحب کا دوسرا شعری مجموعہ ہے جو خالصتاً روایتی انداز کی موضوعاتی نظموں پر مشتمل ہے۔ اس سے قبل ۱۹۶۰ء میں ان کی اسی نوع کی منظومات کا مختصر مجموعہ "انوارِ حیات" شائع ہو چکا ہے۔ چالیس سالہ تخلیقی سرگرمیوں کے پیش نظر یہ سرمایہ بے حد قلیل ہے لیکن اس کی وجہ سروش صاحب کی تخلیقی صلاحیتوں کی کمی ہرگز نہیں بلکہ یہ ہے کہ ان کی تمام زندگی بسلسلہ ملازمت ادبی مراکز سے دور دراز چھوٹے چھوٹے قصبات میں گزر گئی۔ انھیں وہ علمی و ادبی ہنگامہ آرائیاں، انجمن سازیاں، مشاعرے جلسے، سمینار اور ارباب ذوق کی صحبتیں نصیب نہ ہوسکیں جو تخلیقی قوتوں کی نشو و نما کے لیے کھاد پانی کا کام دیتی ہیں۔ اس کے باوجود محض اپنے ذوق طبع، ذاتی مطالعے، پروازِ تخیل اور خداداد ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے جدت پسندی مروجہ فیشن پرستانہ روش سے ہٹ کر سروش صاحب نے اعلیٰ تعمیری اقدار اور اخلاقی معیارات پر مبنی ایسے شاہکار ادب پارے تخلیق کیے ہیں جو ان کی انفرادی شناخت کا ثبوت ہیں اور جن کی مثالوں سے زیر تبصرہ مجموعہ اول تا آخر آراستہ ہے۔ سروش صاحب کی شاعری میں ترقی پسند ادب کے اس لہجے کی بازگشت سنائی دیتی ہے جس کی گھن گرج سے ۱۹۳۵ء تا ۱۹۶۰ء پوری ادبی دنیا گونجتی رہی ہے اور جو ۱۹۶۰ء کے بعد جدیدیت کے شور و غوغا میں گم ہوکر رہ گیا۔

آئے دن منظر عام پر آنے والے غزلیات کے مجموعوں کی بھیڑ بھاڑ میں "آنچل اور پرچم" کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ خالصتاً موضوعاتی نظموں کا مجموعہ ہے۔ مانا سیروں ہو خشک کرنے کے بعد غزل کا ایک مصرعہ تر دجود میں

تا ہے تاہم غزل کے اشعار چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، سوتے
جاگتے تخلیق کیے جا سکتے ہیں جب کہ نظم گوئی کے لیے ذہن کی
یسوئی، خیالات کی ترتیب و تنظیم اور فرصت کے رات و دن کا
میسر ہونا لازمی ہے۔

"آنچل اور پرچم" میں جہاں "ماں" "درسگاہ
طفلاں" "علم، شاعر اور عظمتِ وطن جیسی ہمہ گیر مقصدیت کی
حامل اخلاقی نظمیں شامل ہیں وہیں "لوناز جھیل" "مین کے
نارے اور" "بیرابر کی گرمی" جیسی علاقائی موضوعات پر
نظمیں بھی شامل ہیں جو شاعر کی اپنی مٹی سے جڑے رہنے کی
پرخلوص جذبے کی غماز ہیں۔

اس مجموعہ کو ایک انفرادی معنویت عطا کرنے والی دو
طویل نظمیں "امن" اور "جنگ" ہیں جن سے
سروش صاحب کے تبحر علمی کے ساتھ ان کی زود گوئی اور قادر
الکلامی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان میں ہر نظم پانچ پانچ
قسطوں میں منقسم ہے اور ہر قسط ۲۵ ر اشعار پر مشتمل ہے۔
اس اعتبار سے یہ دونوں نظمیں ڈھائی سو اشعار پر محیط ہے
فارسی الفاظ و تراکیب کی کثرت سے زبان قدرے ادق ہو گئی
ہے لہٰذا سہل پسندی کے اس دور میں یہ مجموعہ خواص کی چیز
ہو کر رہ گیا ہے۔

متذکرہ بالا نظموں کے علاوہ مختلف اچھوتے موضوعات
پر سروش صاحب کی مزید پندرہ نظمیں "آنچل اور پرچم"
کی دیدہ زیبی کے اضافے کا موجب ہیں۔ ڈاکٹر منشاء الرحمان
خان منشاء کے پیش لفظ کے علاوہ سروش صاحب کی شاعری
پر شارق جمال جیسے ماہر فن صاحب عروض، طرفہ قریشی مرحوم
جیسے استاد کامل شارق نیازی جیسے با علم اور صاحب الرائے
اور اخلاق آفریں جیسے مشہور محقق کے بیش بہا تاثرات شامل
ہیں۔ جدت پسندی کے اس دور میں صحت مند اور لازوال

ڈاکٹر ایم اے کاوش
کبری دیوبی، ۲۶۲۷۰۲

غزل

آنکھوں کے راستے سے دل میں اتر جو آئے
اس دل نشیں کو یارو کیسے کوئی بھلائے

مدت ہوئی مجھ کو اے دوست مسکرائے
اب میں ہوں اور میری ناکامیوں کے سائے

وہ نیم جاں کہ جس سے دامن قضا بچائے
یہ دیکھنا ہو جس کو وہ مجھ کو دیکھ جائے

وہ روبروئے جاناں کیا حال دل سنائے
جو عرض مدعا ہی پہلے سے بھول جائے

ہے حکم باغباں یہ بلبل کو آئے جائے
پر آشیاں چمن سے باہر کہیں بنائے

یہ سوچ کر کہ یہ سب ٹوٹے ہوئے ہیں تیرے
پھرتے ہیں دل کے ٹکڑے سینے سے ہم لگائے

ان سے بچھڑ کے کاوش یہ حال ہو گیا ہے
پھرتے ہیں اپنا لاشہ کاندھے پہ ہم اٹھائے

گم گشتہ روایات کی بازیافت کے لیے اپنی نوعیت کا یہ منفرد
مجموعہ ہر صاحب ذوق کی لائبریری کی زینت ہونا چاہیے۔ ☆

ستارہ جعفری
۲۱ سیتا محل، بومن جی پٹٹ روڈ،
بمبئی ۴۰۰۰۳۶

قصرِ حسین

ساحلِ بحر کے نزدیک تھا وہ قصرِ حسین
جس کے ہر کمرے سے خوشبو کی مہک آتی تھی
اُس کے دروازوں میں سے آتی تھی
پُرکیف ہوا
ریشمی آنچلوں سے چمن کے گذر جاتی تھی
شام کو ڈوبتے سورج کی سنہری کرنیں
گھر کے ہر ذرّے کو گلنار بنا دیتی تھیں
چودھویں شب کا قمر بحرِ عرب سے ملنے
اس طرح بڑھتا تھا جیسے کوئی بچھڑا ہوا
دوست
نیلے پانی پہ اُڑھا دیتا تھا شفاف ردا
چاندنی چاندی کی مانند پگھل جاتی تھی
موجیں دامن میں سمیٹے ہوئے ساری چاندی
بڑھ کے وہ قصرِ حسین چوم کے ہٹ جاتی تھیں
اس کے شاداب گلستاں میں بہار آتی تھی
جب
یاسمیں کی کہیں بیلے کی کلی کھلتی تھی
پھول سے نرم گلابوں سے مہکتے رخسار
ننھے بچوں کے چہکنے کی صدا گونجتی تھی

سوچتی ہوں کہ زمانے کا چلن بھی کیا ہے ؟
برگِ گل کی طرح خوشیاں بن کے بکھر جاتی ہیں

وہ گذرگاہیں جو آباد رہا کرتی تھیں
انگنت قدموں کو سینے پہ سہا کرتی تھیں
آج ویران ہیں، خاموش ہیں، سناٹا ہے

کسی بچے کے ہنسنے کی صدا آتی ہے
آج بھی مہکی ہوئی ٹھنڈی ہوائیں اکثر
بند دروازوں سے ٹکرا کے چلی جاتی ہیں۔

روشن لال روشن بنارسی
ڈی ۱۱۰/۷۴ رام پورہ
وارانسی — یو پی

ھزلو

O

قوم کے لیڈر ہوئے پھر پیر میخانہ بنے
بنتے بنتے شیخ جی کنٹراکٹ مولانا بنے

زندگی درکار ہے لوگو ترقی کے لئے
پہلے شوہر پھر خسر پھر آدمی نانا بنے

کل کو شادی ہوگئی ہوتی تو کیا ہوتا غضب
خیر گذری وقت پر رضوان رضوانہ بنے

وصل لیلیٰ حضرت مجنوں کو کوئی مشکل نہ تھا
ہاں مگر کچھ آپ کا حلیہ شریفانہ بنے

مکتب دنیا کی روشن یہ سند کیا خوب ہے
سر بہ سر جاہل جو بن جائے وہی دانا بنے

O

ظفر گورکھپوری
۲ فلور بیڈا یٹ سٹری نگر
رھیرگا ویسٹ بمبئی ۵۸

غزلیں

ا ہے موسم رنج و ملال کے بعد
جانا زہر کے استعمال کے بعد
پر آکر آپس میں مل جانا ہے
یسے سوچیں گے یہ وصال کے بعد
یں اور بھی کچھ دنیائیں تھیں
ھا لیکن دیگر احوال کے بعد
یک گئیں کیا دیکھ رہے ہو آنکھوں میں
کچھ ملے ہو کتنے سال کے بعد
اور چھان لیے کتنے آفاق
میں ٹھہرا اسکے عکس جمال کے بعد
ے اتنی جلدی کاغذ مت چھینو
کا ٹیڑھی میڑھی اشکال کے بعد
ے پیچھے جسم کی حالت آگے ہے
ن بھی آئے آئے ہنگ اور وال کے بعد

احساس کا چڑھا ہوا دریا اُتر تو جائے
تم سے بھی بات ہوگی، ذرا دل ٹھہر تو جائے
چہرے سے اس کے گرد تذبذب اتر تو جائے
وہ میرے گھر نہ آئے مگر اپنے گھر تو جائے
سفاک آندھیوں کی بشارت بجا، مگر
یہ آسمان پہلے پرندوں سے بھر تو جائے
خوشبو کو دیکھ لینا کوئی مسئلہ نہیں ہے
خاشاک کی حدود کے آگے نظر تو جائے
ایسی بھی چیخ کیا جسے دیوار روک لے
اتنی بلند ہو کہ پڑوسی کے گھر تو جائے
منظر سحر سے اور کوئی مانگ لائیں گے
کھڑکی کا زرد چاند کسی طرح مر تو جائے
مانیں گے ایک بار تیری آنکھ کا کہا
بے اعتباریوں کا یہ موسم گذر تو جائے
اپنے وجود ہی کے خلا کی طرف چلیں
جیسے بھی ہو اذیت شام و سحر تو جائے

زمیں پھر درد کا یہ سائباں کوئی نہیں دے گا
تجھے ایسا کشادہ آسماں، کوئی نہیں دے گا
ابھی زندہ ہیں ہم پر ختم کر لے امتحاں سارے
ہمارے بعد کوئی امتحاں، کوئی نہیں دے گا
ہوا نے صبح کی آواز کے پر کاٹ ڈالے ہیں
فضا چپ ہے، درختوں میں اذاں کوئی نہیں دیگا
اڑا کر خاک یوں ہی خاک ہو جائیں گے دیوانے
اب اس صحرا کو دیوار اماں کوئی نہیں دے گا
ملیں گے مفت شعلوں کی قبائیں بانٹنے والے
مگر رہنے کو کاغذ کا مکاں کوئی نہیں دے گا
خود اپنا عکس بک جائے اسیر آئینہ ہو کر
یہاں اس دام پر نام و نشاں کوئی نہیں دے گا
ہماری زندگی ہے وہ دشمن بھیگی ہوئی لکڑی
جلیں گے چپکے چپکے سب دھواں کوئی نہیں دے گا

صبیحہ سوہائی سحر
سی - ۱۶۱ - کریلی اسکیم - الہ آباد - ۲۱۱۰۱۶

یہ میں کب کہتی ہوں تم خط مجھے لکھا نہ کرو
ہاں مگر نامہ بروں میں مجھے رسوا نہ کرو

دل میں کیا جانیے مچ جاتی ہے ہلچل کیا کیا
نیم باز آنکھوں سے دیکھو مجھے دیکھا نہ کرو

کان دیواروں کے ہوتے ہیں یہ مشہور ہے بات
لب پہ تم حرفِ تمنا کبھی لایا نہ کرو!

دل پہ میرے جو گزرتی ہے رقم کرتی ہوں
اے جہاں والو! میرے شعر کا چرچہ نہ کرو

کیا پتہ نیند کہاں جا کے تمہاری ٹوٹے
خواب میں مجھ کو خدا کے لیے دیکھا نہ کرو

دل پہ اک بوجھ سا رہتا ہے کئی روز تلک
میرے محبوب! خفا مجھ سے ہوا نہ کرو

جسم تک آ کے نظر سب کی ٹھہر جاتی ہے
اس زمانے میں سحر عشق کا سودا نہ کرو

یہ کیسا شہر کا نقشہ دکھائی دیتا ہے
ہر ایک آدمی تنہا دکھائی دیتا ہے

ہمارے شہر کی تہذیب ہو گئی کیسی
ہر ایک شخص برہنہ دکھائی دیتا ہے

اسی نے دل پہ مسلسل لگائے ہیں نشتر
جو دیکھنے میں فرشتہ دکھائی دیتا ہے

کہاں سکون کی خاطر پڑاؤ ڈالوں گی
تمام آگ کا دریا دکھائی دیتا ہے

خدا گواہ ہے کہ واعظ بھی اور زاہد بھی
تری نگاہ کا مارا دکھائی دیتا ہے

اسی سے اپنے دکھوں کا علاج ہو نہ سکا
جو آپ اپنا مسیحا دکھائی دیتا ہے

میں اس کو جانتی پہچانتی نہیں پھر بھی
وہ شخص مجھ کو شناسا سا دکھائی دیتا ہے

یہ کیسا حادثہ گزرا ہے اس کے دل پہ سحر
کہ اس کا چہرہ فسردہ دکھائی دیتا ہے

غزلیں

ش نجمی
۱۲، خلیل چال۔ مقابل ایل، آئی جی کالونی
بھارے نگر، پائپ روڈ۔ کرلا بمبئی ۷۰

زخم موسم، تیری ہریالی بڑی اچھی لگی
دل جگر میں ٹیس کی موجودگی اچھی لگی

اس سفر میں کچھ نشاطِ رہگزر بھی چاہیئے
آبلوں سے پاؤں کی وابستگی اچھی لگی

بھ سمندر تک پہنچنے کی تڑپ باقی تو ہے
ان کو سیرابی ہمیں تشنہ لبی اچھی لگی

دھوپ کو ہم یوں تو ان آنکھوں نے دیکھے ہیں بہت
زندگی، مجھکو تری بے چہرگی اچھی لگی

بونس کی کٹیا میں جس نے آنکھ کھولی تھی اُسے
جگمگاتے شہر کی آوارگی اچھی لگے

دھوپ کے ریلے سے لیکر چھاؤں کی دہلیز تک
تیری جستجو کی ہر کڑی اچھی لگی۔

مست حفیظ رحمانی جرنلسٹ
۱۷۱/۲، اولڈ سیتاپور (یوپی)

آدمی دنیا کو جب سمجھا نہ تھا
زندگی میں ایسا ہنگامہ نہ تھا

ہر قدم پر آرزوئیں تھیں تمام
زندگی میں میں کہیں تنہا نہ تھا

ہر طرف چھائی ہوئی تھی بے حسی
شہر میں جیسے کوئی زندہ نہ تھا

اپنا مستقبل بھی ہوتا تابناک
مڑ کے ماضی کی طرف دیکھا نہ تھا

ہر قدم پر حادثہ تھا ہمسفر
راستے میں کوئی بھی اپنا نہ تھا

ایک آنسو بکا سونے کے بھاؤ میں
مجھکو اپنے غم کا اندازہ نہ تھا

مست ہے کوئی نہیں پرسانِ حال
میں نے اپنا فن کبھی سمجھا نہ تھا

مجاز کانپوری
۲۰، تن تن پورہ اسٹریٹ
نزد رائل ٹیلرس، بمبئی ۹

مجرم کی طرح سر کو جھکانے کے باوجود
بنتی نہیں ہے بات بنانے کے باوجود

فتنہ گروں کے شہر کا نقشہ بدل دیا
بارِ غمِ حیات اٹھانے کے باوجود

معیار کیوں گھٹایئے، رہیئے انا کے ساتھ
دولت تو دھوپ چھاؤں ہے پانے کے باوجود

موسم رہا ہے خشک ترے انتظار کا
برسی نہیں گھٹائیں بھی چھانے کے باوجود

قدرت کا یہ کرشمہ ہے قسمت کی بات ہے
گمنام وہ ہے شہر میں آنے کے باوجود

چلتی ہوئی ہواؤں کا کھل ہی گیا بھرم
جلتا رہا چراغ بجھانے کے باوجود

چمکا ہے آئینے کی طرح ہر نگاہ میں
ہر نقش زندگی کا مٹانے کے باوجود

مخلص نہیں ہے کوئی بھی اس عہد میں مجاز
ہم ہیں وفا شناس بتانے کے باوجود

کویت سے واپس آنے والوں کو معاوضہ

حکومت ہند کو ان بھارتیوں سے تفصیلات درکار ہیں جنہیں کویت اور گلف علاقہ میں عراق کے قبضہ کرنے کی صورت میں زبردستی واپس آنا پڑا تاکہ انھیں اس علاقہ سے واپسی کے وقت ہوئے نقصانات کا معاوضہ دلوایا جا سکے۔

حکومت ہند نے ریاستی حکومت کو متاثرہ عوام میں تقسیم کرنے کے لیے ایک پرفارما روانہ کیا ہے تاکہ اسے تفصیلات سے آگاہ کیا جا سکے۔ یو۔ این سیکوریٹی کونسل کے ریزولیشن نمبر ۶۷۸ کے تحت داخل کئے گئے دعویٰ کے معاوضے عراق کو ادا کرنے ہوں گے۔

مہاراشٹر میں بسے والے گلف علاقے سے واپس آنے والے بھارتیوں کی سہولت کے لیے ضلع کے کلکٹر کے آفس میں فارم رکھے گئے ہیں۔ فارم میں تنخواہ کے بقایاجات پروویڈنٹ فنڈ اور دیگر سہولیات معاہدہ کی منسوخی کی وجہ سے ہوئے نقصانات بینک ڈپازٹ اور بینک میں رکھی ہوئی اشیاء، رجسٹرڈ لوکل کمپنیوں کے شیئر ہولڈر، موٹر وہیکلز اور دیگر جائیداد کے بارے میں تفصیلات دینی ہوگی۔ فارم میں خود زخمی ہونے وغیرہ کی بھی تفصیلات دینی ہوگی۔

بھرے ہوئے فارم براہ راست اسپیشل کویت سیل ساؤتھ بلاک سینٹرل سکریٹریٹ ڈی، ایچ، کیو پوسٹ آفس پوسٹ بیگ نمبر ۴ نئی دہلی کو ۳۱ راگست ۱۹۹۱ء تک روانہ کیے جا سکتے ہیں اس کے بعد یو۔ این کمپنی سٹیشن کمیشن جن کا بھارت بھی رکن ہے اس کے سپرد کر دی جائے گی۔

حکومت ہند نے وضاحت کی ہے کہ تفصیلات اکٹھا کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حکومت ہند پر معاوضہ دلوانے کی کسی طرح کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔
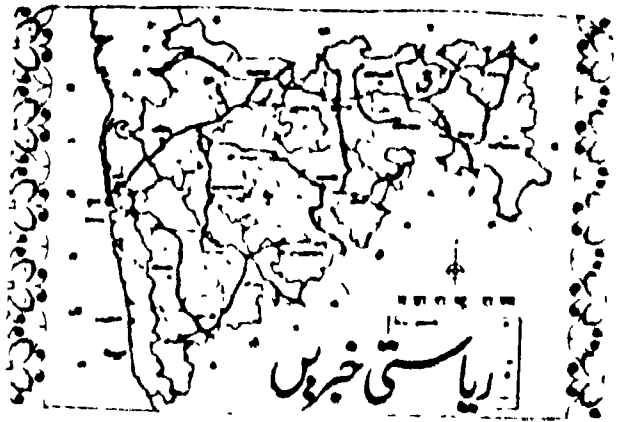
لاتور اور ناندیڑ میں فوج میں بھرتی

اورنگ آباد برانچ ریکروٹنگ آفس کی ریکروٹنگ ٹیم ۷ راور ۸ راگست کو لاتور اور ۲۱/۲۲ راگست کو ناندیڑ کا دورہ کرنے وہاں فوج میں بھرتی کا کام انجام دے گی۔

سولجر جنرل ڈیوٹی/سولجر کلرک/ایس کے ٹی اور سولجر ٹیکنیکل کی درخواست دینے والے امیدوار جنھیں کال لیٹر موصول ہوئے ہیں وہ ریکروٹنگ ٹیم کو رپورٹ کریں اسی دن اسکریننگ ٹیسٹ بھی لیا جائے گا اور درخواست فارم بھی تقسیم کیے جائینگے۔

امیدواروں کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے ہمراہ اصل ایس ایس سی سرٹیفکٹ، تعلیمی سرٹیفکٹ کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں اور تین عدد پاسپورٹ سائز تصاویر ساتھ لائیں۔

بزنس قوانین کی اشاعت

حکومت مہاراشٹر نے مہاراشٹر گورنمنٹ رولز آف بزنس (دوسری ترمیم) ۱۹۹۱ء کو ریاستی گزٹ غیر معمولی کے حصہ IV A مورخہ ۲۷ رجون ۱۹۹۱ء میں شائع کر دیا ہے۔

ٔ وزیراعلیٰ مہاراشٹر شری وسنت
ے مجسمہ کی بنیاد سابق وزیر شری
نے یکم جولائی ۱۹۹۱ء کو رکھی اس
یر مملکت برائے محصول شری
بی اور وزیر مملکت برائے ماہی گیری
ؤ بھنکر نظر آرہے ہیں

وزیر تعلیم شری اننت راؤ تھوپٹے اور
وزیر مملکت برائے تعلیم ڈاکٹر تپنگ راؤ کدم
نے حلف برداری کے بعد ۴ رجولائی ۱۹۹۱ء کو
منترالیہ میں متعلقہ افسران سے بات چیت کی اسی
موقع پر لی گئی تصویر۔

ڑہ ویلفیر سینٹر کی ۱۹ ویں سالانہ
ا پروگرام زینبیہ ہال
۱۹۹ء کو منعقد ہوا۔ اس
ملت برائے خوراک شہری رسد
زی بی، ڈی زوٹے تقریر

صویر میں دائیں سے بائیں شری
شری بشیر پٹیل ایم ایل اے
م ایل اے، اور شری زکریا اگاڑی
سٹیٹ ج کمیٹی۔ نظر آرہے ہیں۔

★ ایس، ایم شریف محبوب (اردو ادیب)
سی ۱۳ آر، آئی پارک سائٹ
وکھرولی، بمبئی ۷۹

"قومی راج" ہر ماہ پابندی سے مل رہا ہے۔ "قومی راج" اپنی ادبی خدمات کے لحاظ سے بے مثال ہے۔ ماہ ستمبر کے شمارے میں "قومی یکجہتی کے علمبردار مولانا ابوالکلام آزاد اور آزادی کے نقیب حسرت موہانی وغیرہ جیسے مضامین طلبا، اور طالبات کے لیے مفید مواد تعلیم ہے۔ میری ناقص رائے یہ ہے کہ طلبا، طالبات کی بہبودی کے لیے مہاراشٹر کے تمام ٹیکنیکل اداروں، کالجوں اور دیگر کورس کے کالجوں کے پتے کے ساتھ بھی شائع کرتے رہیں تاکہ ایس ایس سی میں کامیاب طلبا، اور ۱۲ ویں کامیاب طلبا، فائدہ حاصل کر سکیں اور انھیں مستقبل کے لیے رہنمائی حاصل ہو سکے۔

★ عثمان خاں عرفان پربھنوی
بھونی گلی۔ ضلع پربھنی (مہاراشٹر)

محترمہ ریحانہ (بمبئی) کے مطبوعہ مراسلے (قومی راج ۱۰ اپریل ۱۹۹۱ء) کے جواب میں عرض ہے کہ محترمہ نے اپنے نانا جناب شیخ ہارون صاحب برق (تھانے) اور میری غزل کے تخیلات اور بحر و بندش میں یکسانیت کے بارے میں جو اظہارِ خیال فرمایا ہے اس کا جواب میں نے انھیں ۲۱ جون کو بذریعہ ڈاک بھجوا دیا ہے۔ تاہم قومی راج میں اس لیے پیش کر رہا ہوں کہ کوئی غلط فہمی نہ ہو۔

غزل میں کبھی کبھار شاعروں کے تخیلات میں ٹکراؤ اور بحر و بندش میں یکسانیت ہو سکتی ہے، اس کے برخلاف پوری غزل ہی ایک جیسی ہو اور کوئی فرق نہ ہو تو اظہارِ تعجب کے ساتھ شبہ بھی صحیح ہو سکتا ہے۔

محترمہ نے اپنے مراسلہ میں لکھا ہے کہ برق صاحب نے غزل مذکورہ ۳۰ اپریل ۱۹۷۱ء میں لکھی لیکن انھوں نے یہ نہیں لکھا کہ کس اخبار یا رسالہ میں یہ غزل شائع ہوئی ہے کیوں کہ میری نظر سے آج تک یہ غزل نہیں گذری۔ میرا اور برق صاحب کا پہلا مصرعہ باعتبار خیال ملتا جلتا ہے لیکن دوسرا مصرعہ خیال اور بندش کے اعتبار سے بالکل الگ ہے۔ ردیف بھی الگ ہے ملاحظہ ہو:

"رہو کہیں بھی مگر دل سے رابطہ رکھنا"
دلوں کے بیچ محبت کا سلسلہ رکھنا"
(برق)

"رہو کہیں بھی مگر دل سے رابطہ رکھو
دلوں کے بیچ ذرا بھی نہ فاصلہ رکھو
(عرفان پربھنوی)

★ خورشید افسر بسوانی۔
جنرل سکریٹری، راشٹریہ ایکتا بھاشائی سمیتی
بسواں، سیتاپور۔ (یوپی)

قومی راج، زینت نگاہ بن رہا ہے۔ بلاشبہ قومی راج کے ذریعہ تخلیقی ادب، خوبصورت تراجم اور مہاراشٹر کی سیاسی و سماجی سرگرمیوں سے جو آگاہی ملتی رہتی ہے دوسرے رسالے سے ممکن نہیں ہے۔

قومی راج

جلد ۱۸ شمارہ ۸

۱۰ / اگست ۱۹۹۱ء 10/8/91

قومی راج

ہندی اور مراٹھی میں ہر ماہ کی یکم اور پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، انگریزی، گجراتی، سندھی اور اردو زبان میں ہر ماہ کی ۱۰ / تاریخ کو شائع ہوتا ہے

زر سالانہ ۲۵ روپے　　قیمت فی شمارہ ۳ روپے

چیف ایڈیٹر ——— شری ارون پاٹنکر

مینجنگ ایڈیٹر ——— آر۔ جی۔ مایڈلو

ایڈیٹر ——— فیروزہ فیاض خان

ترسیل زر کا پتہ:

اسسٹنٹ ڈائریکٹر (ایڈمنسٹریشن)
ڈائرکٹوریٹ جنرل آف انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز
گورنمنٹ آف مہاراشٹر، بیرک نمبر ۱۹
مقابل سروچی بلڈنگ، نزد منترالیہ، بمبئی ۴۰۰۰۲۱
Tel 2021530

مراسلت کا پتہ:

ایڈیٹر قومی راج
ڈائرکٹوریٹ جنرل آف انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز
گورنمنٹ آف مہاراشٹر
۱۷ واں منزلہ، نیو ایڈمنسٹریٹیو بلڈنگ،
مقابل منترالیہ، بمبئی ۴۰۰۰۳۲
Tel. Nos. 2023957, 2023006

اس شمارے میں

علاقہ کوکن کی ترقی کا سہ نکاتی پروگرام

سیاحت، پھلوں کی پیداوار اور ماہی گیری

معادنیات، جنگلات اور سمندر جیسی خداداد قدرتی دولتوں سے مالا مال ہوتے ہوئے بھی علاقہ کوکن اب تک پچھڑا ہوا ہے، گوکہ یہ بات نہیں ہے کہ حکومت نے کوکن کی ترقی اور خوشحالی کے لیے کوئی کوشش نہیں کی۔ کوکن کی ترقی کے لیے اس علاقے کے چار ضلعوں میں کارخانے کھولے گئے، پھلوں کے باغات کی اسکیمیں چلائی گئیں۔ کوکن کا ۷۲۰ کلو میٹر سمندری ساحل کا جائزہ لیتے ہوئے ماہی گیری یا مچھلی کے کاروبار کو بڑھاوا دینے کے لیے کتنے ہی اقدامات اٹھائے گئے۔

★ دنیش ڈیسائی

یہی نہیں بلکہ خوش قسمتی سے کوکن کے علاقے میں ترقی اور خوشحالی کے لیے کئی اسکیمیں بنائی گئیں۔

علاوہ اریں غالباً ۲۰ سال پیشتر کوکن میں صنعت وحرفت کی رفتار بڑھانے اور اسے صحیح صورت میں سرانجام دینے کے لیے کوکن ترقیاتی بورڈ کی تشکیل کی گئی۔ دراصل کوشش یہ رہی کہ اس ضرورت پر زور دیا جائے کہ صنعت وحرفت سے کوکنی آدمی واقفیت حاصل کرے اور اس کے قریب آئے۔ اسی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے کوکن ترقیاتی بورڈ نے پچھلے ۲۰ برسوں میں ۱۴۰ کروڑ روپے کی لاگت سے ۴۵۰۰ چھوٹے کارخانے کھولنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔

پھلوں کی پیداوار

کوکن کے ہر ضلع کی ترقی تیزی سے ہو۔ اگر کوکن کا چہرہ بدلنا ہے تو صنعت وحرفت کے ساتھ ساتھ سیاحت، پھلوں کی پیداوار اور ماہی گیری کو بڑھاوا دینے کے لیے یہ سہ نکاتی پروگرام پر بھرپور توجہ دینی ہوگی۔ اس لیے

پھلوں کا راجہ : آم

کومت کی جانب سے ٹھوس اقدامات اٹھائے جا رہے
ں۔ حکومت نے کل ۱۰۰ کروڑ روپے پھلوں کی پیداوار
لیے مختص کیے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت آم اور کاجو کی
اوار کے لیے تقریباً ۲ لاکھ ہیکٹر زمین کا انتخاب کیا گیا
ے۔ اور ساتھ ہی ساتھ پھلوں اور دوسری پیداوار کی
وسینگ کے لیے چھوٹے کارخانوں کا ایک سلسلہ
ارے جانے کی اسکیم ہے۔ اس طرح پھلوں کی پیداوار کے
یہ صنعت اور روزگار کے امکانات اور ذرائع پیدا
نے کے نقطۂ نظر سے یہ اقدامات اٹھائے گئے ہیں۔
ت قابلِ غور ہے کہ پھلوں کی پیداوار کی ترقی کے لیے
ن کا علاقہ قدرتی اعتبار سے کافی سے زائد موزوں و مناسب

ہوتے ہوئے بھی وہاں زمین کا صرف ۳ فیصد حصے میں ہی
پھلوں کے باغات ہیں۔ فی الحال تجرباتی طور پر کوکن ترقیاتی
بورڈ نے ایک ہزار ہیکٹر زمین پر پام کے درخت اگائے ہیں
اور یہ تجربہ کامیاب رہا ہے۔ اس طریقۂ کار کو ترجیح دینی
چاہیئے۔ اس اعتبار سے یہ کاروبار کفایتی اور کفالتی ہے۔ اسی
طرح ربر کی کاشت بھی کوکن میں کامیاب ہو سکے گی۔ اس
جانب ترقی بورڈ نے حوصلہ افزائی اور سرانجامی کا بیڑا اٹھایا ہے
پھلوں کی پیداوار، پام اور ربر کی کاشت کے ساتھ ساتھ
پروسیس کارخانوں کو بھی شروع کرنے کی ضرورت ہے۔

پھلوں کی کاشت کی اس اسکیم سے تقریباً ۴۰ کروڑ
روپیے کی آمدنی اور ساتھ ہی چھ لاکھ روزگار آنے والے

کاجو کے درخت

مناظر سے ڈھکے گلزار علاقوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے حکومت نے کوکن میں ۳۳ سیاحتی مراکز کھولنے کا اہم فیصلہ کیا ہے سیاحت ایک ایسی صنعت ہے جس سے آلودگی کا کوئی خدشہ نہیں ہے یہ صنعت کم سرمائے سے شروع کی جا سکتی ہے اور ساتھ ہی شروع کرنے کے لئے مدت بھی کم لگتی ہے۔ لیکن اس صنعت سے روزگار فراہم کے بڑے ذرائع پیدا ہو جاتے ہیں۔

مرکزی حکومت سیاحت کو صنعت کا درجہ دینے کا فیصلہ پہلے ہی کر چکی ہے۔ سنہ ۱۹۹۱ء کا برس "بھارت درشن برس" کے طور پر منایا جانے کا اعلان بھی کیا گیا ہے۔ ضروری نہیں کہ غیر ملکی سیاح کی بھیڑ کوکن کی طرف اُمڈے لیکن ہمارے ملک کے سیاحوں کو اس سے کافی فائدہ پہنچے گا۔ یہ تمام سیاحتی مراکز امسال مکمل ہو جائیں ایسا بھی نہیں۔ لیکن سیاحت کی ترقی کا پروگرام بہرکیف اسی برس شروع کرنا چاہیئے۔

حکومت نے مہاراشٹر کے محکمۂ سیاحت کے ترقیاتی بورڈ کو اس پروگرام میں پہل کرنے کو کہا ہے۔ پرائیویٹ سیکٹرز چند برسوں میں فراہم ہو سکیں گے۔ ضرورت ہے کہ یہ اسکیم زور و شور اور مکمل صلاحیتوں کے ساتھ شروع کی جائے۔
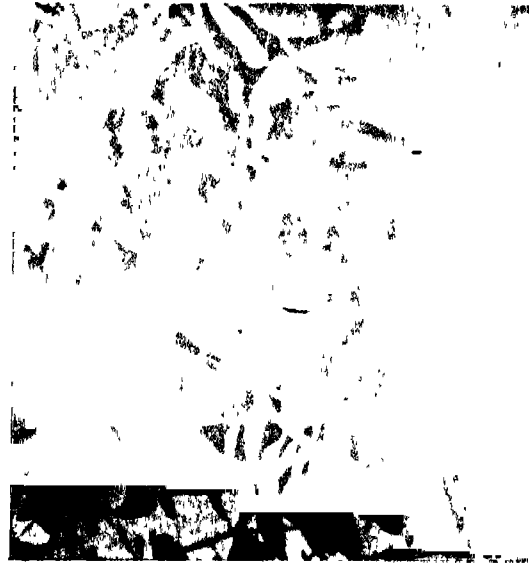
سیاحت

کوکن کی قدرت کا عنایت کردہ ۷۲۰ کلومیٹر طویل ساحل اور قدرتی
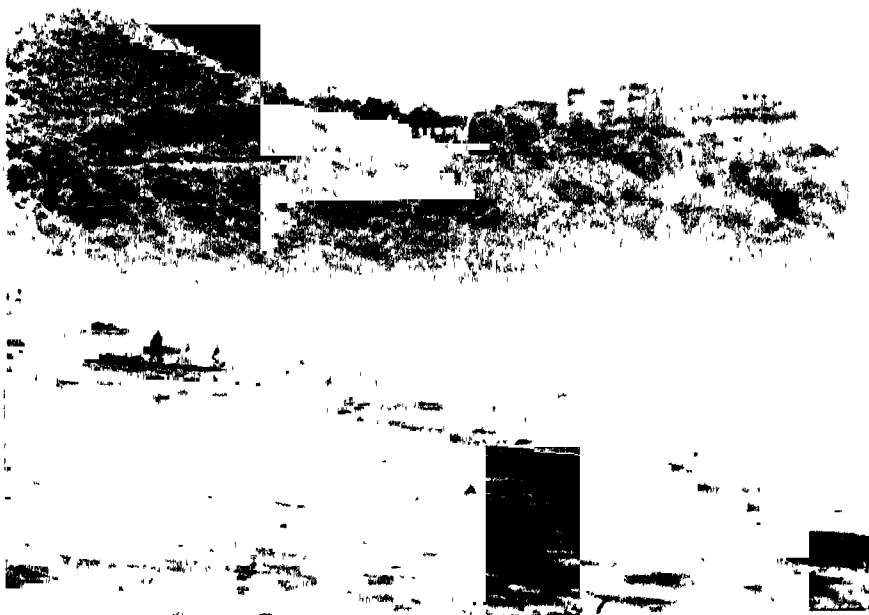
حکومت نے کوکن میں ۳۳ سیاحتی مراکز کھولنے کا نہایت اہم فیصلہ کیا ہے۔

ماہی گیری کے کاروبار کو بڑھاوا دینے کیلئے کوکن ترقیاتی بورڈ نے کوکن کے سمندری ساحلوں پر جھینگوں کی پیداوار کے لئے کئی منصوبے بنائے ہیں

کا تعاون بھی متوقع ہے۔ اس ضمن میں لگنے مالی دوسری سہولتوں کا انتظام پرائیویٹ سیکٹروں کے ذریعے انجام دیا جاسکتا ہے جبکہ سیاحت کا محکمہ (ترقی بورڈ) کے توسط سے سرکار مراکز تیار کرا سکتی ہے۔ اس اسکیم میں کوکن ترقیاتی بورڈ مالی معاونت کرے گا۔

ماہی گیری

سیاحت، پھلوں کی پیداوار کے علاوہ ماہی گیری کی ترقی کے امکانات بھی روشن ہیں نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اوشنوگرافی کے ریسرچ کے مطابق کوکن کے سمندری ساحلوں پر "جھینگوں" کی کافی پیداوار ہے، ویسے دیکھا جائے تو ان ساحلی علاقوں کی ماہی گیری کی پیداوار ۵ لاکھ ٹن ہے۔ اس لیے ماہی گیری کے کاروبار کو بڑھاوا دینا ضروری ہے۔ کوکن ترقیاتی بورڈ نے کولمبی اور کرندی (جھینگے اور چھوٹی مچھلی) کے پیداوار کی کئی اسکیمیں تیار کی ہیں۔ گو کہ ان اسکیموں پر کام کرنے کے لیے پرائیویٹ سیکٹرز کے تعاون کی بھی کافی ضرورت ہے۔ آج کیرلا ریاست میں بڑے پیمانے پر جھینگوں کی برآمد ہو رہی ہے۔ کوکن کے علاقے سے بھی اسی طرح کی برآمد کے امکانات روشن ہیں اس سے ملک کو بڑے پیمانے پر زرِمبادلہ بھی ملے گا اور روزگار بھی کافی تعداد میں فراہم کیا جاسکے گا۔ اس کے لیے حکومت ترقی بورڈ پرائیویٹ سیکٹر کی باہمی معاونت سے پیداوار، پروسیسنگ اور تقسیم کے باب میں ہمہ جہت پلاننگ کی جاسکے گی تاکہ یہ تینوں اسکیمیں بھرپور صلاحیتوں کے ساتھ سرانجام پاسکیں۔

مختصراً سیاحت، پھلوں کی پیداوار اور ماہی گیری کے کاروبار کی وجہ سے علاقہ کوکن کی کایا پلٹ ممکن ہے۔ دراصل کسی بھی علاقے کی ترقی اور خوشحالی کے لئے آمد و رفت کے زیادہ سے زیادہ ذرائع کا ہونا بہت ضروری ہے اور بدقسمتی سے آمد و رفت کے نقطۂ نظر سے کوکن بچھڑا ہوا علاقہ ہے — صرف "ممبئی۔ کوکن۔ گوا" ہی ایسی ایک شاہراہ ہے جو کوکن سے گذرتی ہے اس کی وجہ سے آمد و رفت میں سست رفتاری پیدا ہوتی ہے اور صنعت و حرفت کے مواقع اور ترقی کی رفتار دھیمی پڑجاتی ہے۔ اب خوش قسمتی سے کوکن ریلوے کی شروعات ہوگئی ہے اور ایسی امید کی جاسکتی ہے کہ آنے والی دہائی میں یہ کام بھی پورا ہوجائے گا۔

ویسے یہ بات اٹل ہے کہ ریلوے کی آمد و رفت سے ترقی تیزی کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس لیے کوکن ریلوے کوکن کی ترقی اور خوشحالی میں ہاتھ بٹائے گی۔ ایسی امید ہے۔ علاوہ ازیں علاقۂ کوکن میں آج کئی اچھی بندرگاہیں ہیں جو ضروری رکھ رکھاؤ اور دیکھ ریکھ نہ ہونے کی وجہ سے ناکارہ ہو کر رہ گئی ہیں۔ اگر اس طرف توجہ دی گئی تو کوکن کے لیے بحری راستہ بھی فراہم ہو سکے گا۔

اگر یہ کہیں تو بے جا نہ ہوگا کہ اب علاقۂ کوکن کے لیے بے توجہی کا دور ختم ہوا اور امید و بیم کا زمانہ شروع ہو گیا ہے۔ کوکن کی ترقی پر حکومت توجہ دے رہی ہے۔ کئی اسکیمیں تیار اور جاری کی جا رہی ہیں۔ خوش قسمتی سے کوکن ترقیاتی بورڈ نے اولاً کم ہی کیوں نہ ہو مگر "فائدہ" حاصل کیا ہے۔

اس بورڈ کے لیے زیادہ فنڈ حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ان حالات میں اہلِ کوکن کا یہ کارِ اوّل ہو جاتا ہے کہ وہ کھلے دل اور جوش و خروش سے ان اسکیموں میں شامل ہوں جن میں ان کے علاقے کی سرخروئی ہے۔ اس ترقی سے کوکن میں پیداواری کے ذرائع بڑھیں گے۔ روزگار کے مواقع فراہم ہوں گے۔ اور کوکن کے علاقے میں مستحکم ترقیاتی اقتصادیات کا ظہور ہوگا اور اس وقت کا سوروپ بدل جائے گا۔

मनी ऑर्डर अवकाशवाणी

تلخیص و ترجمہ: سعیدہ مختار
معرفت حامد خاں، جیا ٹائیز کمپاؤنڈ
بوریولی (ویسٹ) بمبئی ۴۰۰۰۹۲

• شفیع اللہ خاں راز اٹاوی (ایم۔ اے)
ایس۔ این کالج
کٹرہ پُر دل خاں۔ اٹاوہ (یوپی)
۲۰۶۰۰۱

غزل

آئینہ خانہ میں جب دیکھے گا منظر پیاس کا
آنِ واحد میں پگھل جائے گا پتھر پیاس کا

ہم نے اپنے خون سے سیراب کر دی سرزمیں
یاد رکھے گا ہمیں اک ایک منظر پیاس کا

واعظِ سیراب کی نیت پرکھنے کے لیے
رکھ دیا ساقی نے میخانہ سجا کر پیاس کا

مچھلیاں جس کی فصیلیں پار کر سکتی نہیں
شہر وہ آباد ہے پانی کے اندر پیاس کا

خون کا دریا رواں ہے آدمی کے جسم میں
پھر بھی رگ رگ میں تڑپتا ہے سمندر پیاس کا

آسماں پر جھوم کر چھائی ہوئی ہیں بدلیاں
ریگ زاروں سے نکل آیا ہے لشکر پیاس کا

کانچ کے پتلوں کے ہاتھوں میں ہے نظمِ میکدہ
اپنے دل پر رکھ لیا میں نے بھی پتھر پیاس کا

فائلوں میں تہ بہ تہ ہیں تشنگی کی عرضیاں
ختم ہو سکتا نہیں اے رازؔ دفتر پیاس کا

بھارت کی صدیوں پرانی سیکولر اقدار

سری نواس ایس لاہوٹی۔

سیکولرزم کو مستحکم بنانے کے لیے سب سے اہم پہلو عوام میں اس سلسلے میں بیداری پیدا کرنا ہے کہ تمام مذاہب کے بنیادی اصول ایک جیسے ہیں' ہمارے ملک کے تاریخی تجربے کے بعض پہلوؤں کی اہمیت کیا ہے نیز ملکی ماحول کو اور ہر ایک شہری کے مستقبل کو بہت زیادہ متاثر کرنے والے کچھ واقعات کا باہمی طور پر کیا کردار ہے۔

قدیم بھارتی روایت اس شدید واقعیت پسندی کی مظہر ہے جس کے ساتھ ایک مفکر نے ماخذ اور موجد کے بارے میں قیاس کیا اور نظریہ قائم کیا۔ "وجدانی علم" یا "ظاہرہ علم" کے سلسلے میں بھی واقعیت پسندی' منطق اور عاجزی وانکساری کا رویہ اپنایا گیا ہے۔ اس میں مضمر مفروضہ یہ تھا کہ حقیقت اس سے بھی کہیں بڑی اور نامعلوم ہو سکتی ہے۔ رگ وید کے فکر میں ایک امتیازی کھلاپن ہے اور اس میں بعض ایسے پر یقین دعوے بھی ہیں کہ حقیقت ایک ہے لیکن علما و فضلا اسے مختلف طریقوں سے بیان کر سکتے ہیں۔ اس طرح سیکولر فکر کے ایک کلیدی تصور کا اظہار کیا جاتا ہے جس میں کامل حقیقت تک منطقی اور وجدانی رسائی کے بہت سے راستوں کو تسلیم کیا گیا ہے اور سرودھرم سمبھو کے فلسفے کے لیے تصوراتی بنیاد فراہم کی گئی ہے جس پر سے مختلف مذہبی فکر کی صریحاً مختلف انجمنیں اسی اور واحد حقیقت کی جانب مائل ہوتی ہوئی دیکھی جاتی ہیں۔

یجروید میں کہا گیا ہے کہ تمام بنی نوع انسان کی جانب ایک دوست کی آنکھوں سے دیکھو۔ ہم ایک دوسرے کی جانب ایک دوست کی آنکھوں سے دیکھیں سیکولر نظریے کا ایک بہت ہی بامعنی اظہار اتھروید میں موجود ہے جہاں اس میں کہا گیا ہے کہ کاش زمین سے' جہاں مختلف عقائد اور زبانوں کے لوگ رہتے ہیں' ہم سب کو فائدہ پہنچنے اور اوما درارض ہمیں اپنے بچوں کی طرح آپس میں ہم آہنگی سے تال میل کرنے کی صلاحیت دے۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ نرمی سے بات کریں۔ رگ وید میں پر زور طور پر اعلان کیا گیا ہے کہ تمام بنی نوع انسان ایک ہی نسل سے ہیں۔

ذات پات کے نظام کی لعنت فکر کی اصل پاکیزگی کے بارے میں لاعلمی یا اس سے گریز کرنے کا نتیجہ ہے۔ ذات پات کے نظام کی سماجی وجوہات کسی فلسفیانہ عقیدے میں نہیں پائی جاتی ہیں یہ عدم تحفظ کے احساس سے پیدا ہوتی ہیں جس کے نتیجے میں مفروضہ کے ایک چھوٹے خول میں یکجا ہو کر گروہ بندی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

بودھ فکر نے بھارت میں سیکولرزم کی اقدار کو مزید مستحکم بنایا۔ بدھ مذہب نے انسان اور انسان کے درمیان سماجی تفریق کی مذمت کی۔ سنگھا کی کارکردگی میں جمہوری نظریہ اپنایا گیا اور اس میں مردوں اور عورتوں کو یکساں طور پر داخلہ ملا

مساوات، انسانیت اور رحم دلی بدھ مذہب کی اہم خصوصیات تھیں اور ان سے بھارت کی سیکولر اقدار مستحکم ہوئیں۔ اسطرح سے جین فکر نے عدم تشدد مفاہمت تمام جانداروں میں وحدت کے نظارے، مساوات اور خدمت پر زور دیا ہے۔ جین فکر بقائے باہم کے نظریے اور سیکولر نظریے پر مشتمل ہے اس طرح ویدک، ویدانتک اور بدھ و جین روایات نے ایک ساتھ رہ کر ملک کی اقدار پر گہرا اثر ڈالا اور ان میں مذہبی معاملات میں رواداری اور مفاہمت کے قدیم رویہ کو شامل کیا۔

ان اقدار کے سبب عوام نے مذہبی عقیدوں کے دیگر دھاروں کے داخل ہونے کو قبول کیا۔ عیسائی مذہب ۵۲ عیسوی میں ہندوستان پہنچا۔ اسلام عرب میں اپنے آغاز کے فوراً العبد یہاں پہنچا۔ دسویں صدی کے ایک عرب مصنف نے راشٹرکٹا حکومت کے شہروں میں مسلمانوں اور مسجدوں کے بارے میں لکھا ہے۔ ترو چراپلی میں ناتھیدولی کے مقبرے پر ۱۴۱ اے ایچ کندہ ہے حضرت علی بادشاہ صاحب کو مدورائی میں اس سے پہلے دفنایا گیا تھا۔ آٹھویں صدی کے آخر میں زرتشتوں کو مغربی ساحل پر پناہ دی گئی۔ اس سے پہلے یہودی مذہب بھارت کی سرزمین پر آچکا تھا۔ اس سلسلے میں دو پہلو قابل غور ہیں، پہلا یہ کہ بھارت میں عیسائی مذہب یا اسلام یا زرتشت مذہب کا ابتدائی ظہور اور فروغ کسی فوجی فتح کے نتیجے میں واقع نہیں ہوا تھا بلکہ بقائے باہم اور مصالحت کے رویے کی وجہ سے ان مذاہب کو جگہ ملی۔ دوسرا پہلو اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ عیسائی مذہب، اسلام اور زرتشت مذہب اپنے ساتھ روحانی اور انسان دوست فکر لائے جو بھارت میں مسلمہ مذہبی فکر سے ہم آہنگ اور مماثل تھا۔ اور جس کی مثال ویدک، ویدانتک، بودھ اور جین فلسفے کے بنیادی عقائد بن چکے تھے۔

ہندو اور اسلامی کلچر کے درمیان آپسی تال میل کا اظہار نہ صرف مذہبی تحریکوں اور فلسفے میں بلکہ زبان، ادب، فن تعمیر، موسیقی اور آرٹ میں بھی ہوا ہے۔

اسی طرح سے سیکولر آدرشوں سے سکھ عقیدے کی تشکیل ہوئی تھی، صدیوں سے ہندو اور مسلمان یکساں طور پر گرونانک کا احترام کرتے آئے ہیں۔

سکھ مذہب کے روحانی بانیوں یعنی گروؤں نے اور سکھ سربراہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے سیکولرزم کا پیغام دیا۔

بھارت میں سیکولر نظریہ کی مضبوط بنیاد کے باوجود انگریز ملک کے سیاسی اور اقتصادی امور پر اپنا غلبہ قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ ۱۸۵۷ء میں محب وطن قومیں تفریق سے بالاتر ہوکر غیر ملکی حملہ آور کے خلاف صف آرا ہوگئیں لیکن انگریزوں نے اس تجربے سے فوری طور پر دو سبق سیکھے۔ پہلا یہ کہ کسی مذہب میں مداخلت نہ کی جائے اور دوسرا یہ کہ مختلف مذاہب میں تنازعات کو زیادہ سے زیادہ بڑھاوا نہ دیا جائے۔ ۱۹۰۵ء میں بنگال کی تقسیم سے ملک کی سیکولر اقدار پر سیاسی اعتبار سے برا اثر پڑا۔

خفیہ طور پر ایک کھیل کھیلا گیا جس کے تحت مذہبی تفریق کو ادارے کی حیثیت دی گئی اور فرقہ وارانہ بنیاد پر خواہشات، ذاتی توقعات، رقابتوں اور ڈر و خوف کو ہوا دی گئی۔ فرقہ وارانہ نفرت کو بڑھانے کے لیے سیاسی واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا۔ اسکول کالج ہوسٹل اور یونیورسٹیاں مذہبی بنیادوں پر قائم کی گئیں تاکہ ہر طبقے میں پڑھے لکھے لوگوں کو ایک دوسرے کے خلاف کیا جا سکے۔ کھیل کود کے کلبوں اور مقابلوں کا اہتمام بھی مذہبی بنیاد پر کیا۔ ریلوے کے پلیٹ فارموں پر جہاں تمام فرقوں کے لوگ جمع ہوتے ہیں پینے کا پانی "ہندو پانی" اور "مسلم پانی" کے طور پر الگ الگ فراہم کیا گیا۔ آئینی اصلاحات کرنے اور جمہوری اداروں کے قیام کے لیے ڈالے گئے دباؤ کے جواب میں رائے دہندگان کو فرقہ وارانہ بنیادوں پر تقسیم کیا گیا۔

لیکن پھر بھی جدوجہد آزادی کی سیاسی قیادت آخری مرحلے تک سیکولر رہی۔ ملک میں سیکولر نظریے کو فروغ دینے میں مہاتما گاندھی کی قیادت اور فلسفیانہ نظریات نے اہم رول ادا کیا۔ انڈین نیشنل کانگریس کی قیادت اور اس کے کارکنان نظریاتی اعتبار سے سیکولر رہے لیکن انگریز فرقہ وارانہ جذبات کو ہوا دے کر سیکولر طاقتوں کو نقصان پہنچانے میں کامیاب ہو گئے۔ مسلم لیگ قائم کرنے میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد انگریزوں نے یہ پروپیگنڈہ کیا کہ کانگریس صرف ہندوؤں کی نمائندہ سیاسی جماعت ہے۔ کانگریسی رہنماؤں نے اس زہریلے پروپیگنڈہ کو رد کرنے کے لیے حتی الامکان کوششیں کیں لیکن سامراجی پروپیگنڈہ اور سازشیں ملک کی سیاسی اقدار کو نقصان پہنچانے میں کامیاب ہو گئیں۔ انگریزوں کی ہدایت کے مطابق ملک کی تقسیم کے بعد ملک کی تاریخ میں غیر معمولی پیمانے پر ہوئے فرقہ وارانہ فسادات نے مجاہدین آزادی کی برسوں کی پُرامن اور سیکولر کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ ہندوستان کی تقسیم کے لیے انگریزوں کا مقصد پورا ہو گیا۔ ان کا نظریہ تھا کہ ان کے اقتدار کے بغیر بھارت متحد نہیں رہے گا اور مذہبی بنیاد پر ہندوستان کے ٹکڑے ہو جائیں گے پنڈت جواہر لال نہرو نے ۲۴ر جنوری ۱۹۴۸ء کے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اپنی تقریر میں کہا تھا:

"بھارت پہلے کی طرح مختلف مذاہب کی سرزمین رہے گا جن کا یکساں احترام کیا جائے گا لیکن اس کا قومی نظریہ ایک ہوگا۔ تنگ نظر قوم پرستی کے لیے اس میں کوئی جگہ نہیں ہوگی بلکہ اس میں ایسی تعمیری قوم پرستی کے لیے جگہ ہوگی جو عوام میں یقین رکھتے ہوئے ایک بین الاقوامی نظام کے قیام میں بھرپور حصہ لے گی۔ بھارت کے آئین میں واضح طور پر مذہب اور فرد کے درمیان مذہب اور مذہب کے درمیان مذہب اور ریاست کے درمیان نیز مملکت اور فرد کے درمیان مطلوبہ تعلق کی واضح مفاہمت کی بنیاد پر سیکولرزم کا عزم کیا گیا ہے۔ وہ ان کی فطرت ہے۔"

آپسی بھائی چارہ اور ایک ہونے کا احساس ملک میں سماج کے تمام طبقوں میں موجود ہے۔ لیکن بدقسمتی سے کچھ شرارت پسند افراد اپنے مفاد کے لیے ماحول کو خراب کرتے ہیں۔ دہشت گردی کا مسئلہ اس طرح کے رجحانات کی پیداوار ہے۔ دہشت گردوں کے مسلک کا کسی سیاسی نظریے یا انسانی اقدار سے قطعی کوئی تعلق نہیں ہے۔ دہشت گردی جرم کی بدترین شکل ہے۔

یہ ہماری عوامی زندگی کا ایک حوصلہ افزا پہلو ہے کہ ملک کے ہر حصے کے ذرائع ابلاغ اور ذمہ دار سیاسی شخصیات نے پرعزم انداز میں اور قومی مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے دہشت گردی کے مسئلے سے نپٹنے کی کوششوں پر مثبت اثر ڈالا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے ملک کی سیکولر اقدار جو مختلف فرقوں اور مذاہب کے درمیان ہزاروں سال کی امتزاج مفاہمت اور رواداری کا نتیجہ ہیں، دہشت گردی کے باوجود مزید مستحکم ہو جائیں گی۔

حالیہ برسوں میں مذہب کو سیاست سے الگ کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ یہ بات اہم ہے کہ مذہب اور سیاست کو الگ الگ رکھنے کے سلسلے میں معقول اور محب وطن لوگوں کا مقصد واضح ہے۔ یہ مقصد فرقہ پرستی کو سیاست میں داخل ہونے سے روکنا ہونا چاہیئے۔ ہماری سیکولر اقدار کی تاریخ بھی ہمیں یہی بتاتی ہے۔

بھارتی اقدار میں سیکولرزم کا ہر ایک شہری کو خیال رکھنا چاہیئے۔ ہمارے قومی سیاسی نظام کی یہ خصوصیت اہمیت کی حامل ہے جو صرف ہمارے ملک تک ہی محدود نہیں ہے اس میں دنیا کے تمام لوگوں اور ملکوں کے لیے ایک پیغام ہے جس سے بنی نوع انسان کے بہتر مستقبل کے لیے رہنمائی ہوتی ہے۔

مولانا محمد علی - قومی ایکتا کے نقیب

عادل صدیقی

رئیس الاحرار مولانا محمد علی بہت بڑے محب وطن تھے، وہ ملک کے عوام کے سچے بہی خواہ تھے۔ انگریزوں کی غلامی سے ملک کو آزاد کرانا اپنا فریضہ سمجھتے تھے۔ وہ صرف اپنی ملت کے لیے ہی حقوق نہیں مانگتے تھے بلکہ ان کی شدید خواہش یہ تھی کہ ہندوستان کے سبھی فرقوں کو ان کے جائز حقوق ملیں۔ وہ ایک عرصہ کے غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ اس سرزمین میں جہاں مختلف طبقوں اور مذہبی فرقوں کے لوگ آباد ہیں اور سب کو اپنے اپنے مذہب سے گہرا تعلق ہے، قدرت نے مختلف اجزا کو باہم سمونے اور ان میں امتزاج پیدا کرنے کا ایک نادر موقع عطا کیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے اخبار "کامریڈ" کے ذریعے مسلمانوں کو ملک و وطن کی خدمت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کے لیے تیار کیا۔ یہ محض ایک اخبار ہی نہیں بلکہ مردہ دلوں میں جوش اور ولولہ پیدا کرنے والا ایک صور تھا۔ انھوں نے اس اخبار کے ذریعہ جرأت، حق گوئی اور راست بازی کی وہ روشن مثال قائم کی جو ہماری صحافت کی تاریخ میں انوکھی بات کہی جا سکتی ہے

وہ اس بات کو زور دے کر کہتے تھے کہ مختلف فرقوں کے مفادات میں ہم آہنگی اور توازن ضروری ہے کیوں کہ اسی ربط باہم سے ملک کا عام مفاد وابستہ ہے اور اسی کو ۷ راکتوبر ۱۹۲۶ء کے "ہمدرد" میں اپنے ایک مضمون میں انھوں نے مشترکہ قومیت قرار دیا ہے۔

مولانا محمد علیؒ قوم کے بے لوث قائد، بیباک صحافی، شعلہ بار مقرر، پرخلوص انسان اور علم کے بحر بے کراں تھے انھوں نے انگریزی زبان میں "کامریڈ" جاری کر کے صحافت کی دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ وہ انگریزی زبان کے ہر پیچ و خم سے بخوبی واقف تھے۔ انہیں انگریزی زبان پر مکمل قدرت حاصل تھی۔ اُن کی شعلہ بیانی دُور دُور تک مشہور تھی۔ رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں کہ کس بلا کے بولنے والے تھے، بولتے تو معلوم ہوتا کہ ابوالہول کی آواز اہرام مصر سے ٹکرا رہی ہے۔

محمد علیؒ ریاست رام پور میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۰۲ء

میں لنکن کالج آکسفورڈ سے بی اے آنرز پاس کیا۔ اس تعلیم نے ان میں بے محابا گفتگو کرنے کی صلاحیت پیدا کی محمد علی میں سب صلاحیتیں اور کمالات بدرجہ اتم موجود تھے جن سے ملکوں اور قوموں میں انقلاب لائے جاتے ہیں۔ مولانا سید ابوالحسن ندوی لکھتے ہیں کہ "مولانا محمد علی نے تحریکِ خلافت اور آزادیٔ وطن کے ساتھ تحریک ترکِ موالات کو ضم کر کے غیر ملکی حکومت کے خلاف نفرت اور بغاوت کی آگ بھڑکادی اور آزادیٔ وطن کا صور اس بلند آہنگی سے پھونکا کہ سارے ملک میں یہاں تک کہ فوج اور پولیس میں ایک جنبش اور مضبوط انگریزی حکومت میں ایک ارتعاش پیدا ہو گیا۔ ہندو مسلم اتحاد کا سماں سارے ملک میں نظر آتا تھا اور سب اس نشہ میں سرشار تھے۔ پھر بار بار جیل جاکر اور مہینوں و برسوں وہاں رہ کر جیل خانے کو ایک ہنسی کھیل بنادیا۔ اور حکومتِ ہند کو ایک آزمائش میں مبتلا کر دیا تھا۔

ہندوستان مختلف تہذیبوں اور مذہبوں کا سنگم ہے یہاں دو فرقوں کے درمیان تصادم ایک معمولی سے بات ہے۔ مولانا کی دُور رس نگاہوں نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ ہندو، مسلم اتحاد کے بغیر آزادی حاصل کرنا ناممکن ہے۔ چنانچہ انھوں نے دونوں فرقوں کے درمیان تعصب اور نفرت کی خلیج کو پاٹنے کی پوری پوری کوشش کی اور اپنی تحریروں اور تقریروں میں لوگوں کو اتحاد اور اتفاق کا درس دیا۔ ان کا قول تھا:

"سب جانتے ہیں کہ میں اپنے ملک کو آزاد کرانے کے لیے ہندو مسلم اتحاد ضروری سمجھتا ہوں اور ہمارا مذہب بھی ہمیں یہی تعلیم دیتا ہے "

وہ لکھتے ہیں:

دوستو! میری دعا ہے کہ خدا ہندو مسلمانوں کو اپنے اتحاد و اتفاق کی ایک جھلک پھر نصیب کرے۔ میری دعا ہے کہ دونوں اتحاد کی وہ تصویر اور آزادی کا وہ منظر سامنے رکھیں جو قومی اتحاد کی فضامیں دکھ سکتے ہیں "

بلاشبہ کتنی حسرت اور تڑپ ہے اِن لفظوں میں۔ کاش مولانا کی یہ آرزو پوری ہو جاتی اور ہندوستان امن وشانتی کا مثالی گہوارہ بن جاتا۔ وہ لکھتے ہیں:

"اے اتحاد! تو ضرور آئیگا، آدمیوں کو باہم ملادے گا اور قوموں کو متحد کر دے گا لیکن ہمارے سامنے نہیں جو تیرے انتظار کی تکلیف اٹھا رہے ہیں۔ تو آئے گا، ضرور آئے گا لیکن کب۔ ایک عرصہ کی مصیبتوں، صبر آزما التجاؤں، تکلیف دہ انتظار اور ہمت شکن انکار کے بعد .."

تحریک خلافت اور ترکِ موالات کی کامیابی کا سہرا مولانا محمد علی اور گاندھی جی کے سر ہے۔ یہ دونوں رہنما ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر پورے ملک کا دَورہ کر رہے تھے اور جگہ جگہ اُن کا پرجوش استقبال ہو رہا تھا۔ "مہاتما گاندھی کی جے ہو" اور "محمد علی کی جے ہو" کے نعرے پورے ملک میں گونج رہے تھے۔ ان دونوں کی آواز پر لوگوں نے اپنے خطابات واپس کر دیئے، بہت سے لوگوں نے انگریزی حکومت کی ملازمت چھوڑ دی، وکیلوں نے پریکٹس ترک کر دی۔ بدیشی مال کا بائیکاٹ کر دیا گیا۔ اس ہنگامی دَور میں مولانا محمد علی کی صدارت میں ۸ جولائی ۱۹۲۱ء کو لاہور میں خلافت کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا جس میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو بھی شریک تھے۔ اس اجلاس میں علماء نے قرآن وحدیث کی روشنی میں یہ ثابت کیا کہ برطانوی فوج میں ملازمت کرنا گناہ ہے۔ اس تجویز پر پانچ سو علماء کے دستخط تھے۔ اس تجویز کے منظور ہوتے ہی حکومت میں کھلبلی مچ

گئی۔ ۱۴؍ستمبر ۱۹۲۱ء کو مولانا محمد علی کو والٹیر کے اسٹیشن پر گرفتار کرلیا گیا۔ اُن کے ساتھ شوکت علی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا سید حسین مدنی، مولوی نثار احمد، پیر غلام مجدد سندھی اور جگت گرو شری بھارتی کرشن تیرتھ شنکر آچاریہ جی کو بھی گرفتار کرلیا گیا۔ ان تمام علما اور قائدین نے کراچی کانفرنس میں تقریریں کی تھیں۔ اُن پر تشدد اور فوج میں بغاوت کرانے کا الزام لگاکر مقدمہ چلایا گیا۔ مقدمے کی ابتدا ۲۶؍ستمبر ۱۹۲۱ء کو ہوئی اور یکم نومبر کو شنکر آچاریہ جی کو چھوڑ کر باقی سب کو دو دو سال کی قید کی سزا سنائی گئی۔ اس مقدمے میں مولانا محمد علی نے عدالت میں جو بیان دیا وہ سیاسی، ادبی اور مذہبی اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس بیان سے مولانا کی حب الوطنی، اُن کے کردار اور شخصیت پر روشنی پڑتی ہے اور اس کے ساتھ ہی دنیا کی مختلف قوموں اور ملکوں کی سیاسی اور مذہبی تحریکوں کے بارے میں معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ یہ بیان ان کی جرأت اور دلیری کا ثبوت ہے۔ اس کے بعد ملک میں جگہ جگہ جلسے ہوئے جس میں یہ شعر زبان زدعام ہوگیا تھا:

کہہ رہے ہیں کراچی کے قیدی
ہم تو جاتے ہیں دو، دو برس کو

اور یہ شعر:

بولیں اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دیدو

ان اشعار نے لوگوں کے دل و دماغ کو کس درجہ متاثر کیا تھا، اس کا نقشہ مولانا عبدالماجد دریابادی نے یوں کھینچا ہے:

"۱۹۲۲ کا ایک منظر۔ شام کا وقت ہے۔ امین آباد لکھنؤ کے چوراہے پر یہی "صدائے خاتون" دو دو پیسے میں بک رہی ہے۔ خدا جانے کتنی تعداد میں روز نکلتی ہے۔ لڑکے درد انگیز آواز میں گاگاکر پڑھ رہے ہیں۔ اکثر نواب مرزا شوق کی مثنوی زہرِ عشق کی دُھن میں صدہا راہگیر کھڑے سُن رہے ہیں پولیس کی لاری آئی، بہتوں کو پکڑ پکڑ کر جیل خانے پہنچا دیا۔ روز سہ پہر سے لے کر رات گئے تک یہی تماشہ رہتا ہے۔ جیل جانا ایک ہنسی کھیل ہوگیا ہے۔ پہلے جس کے نام سے لوگ تھراتے تھے، سہمے جاتے تھے اب خود اس کا جیل جانا مذاق سا معلوم ہونے لگا ہے محمد علی جب کانگریس میں آئے تو قوم کی قوم کو ساتھ لے کر آئے۔ محمد علی جیل گئے تو یہی آگ قوم پر گلزار بن گئی بسینکڑوں نہیں ہزاروں مسلمان، اچھے اچھے عالی خاندان، ذی مرتبہ، گریجویٹ، وکیل، بیرسٹر، ڈاکٹر، عالم فاضل ہنسی خوشی خلافت کا کلمہ پڑھتے ہوئے جیل بھرتے چلے گئے۔"

ان کی عمر مختصر تھی گویا ۵۲؍سال اور اس میں بھی اُن کی سیاسی زندگی کی عمر کل بیس سال تھی۔ اس کا کچھ حصّہ قید و بند کی نذر ہوا لیکن اس مختصر عرصۂ حیات میں انھوں نے ملکی و ملی سیاست میں عہد ساز کردار ادا کیا ہے۔

لندن میں گول میز کانفرنس میں شرکت کے وقت وہ اگرچہ علیل تھے تاہم جذبۂ حب الوطنی سے مجبور ہوکر وہ لندن جانے کے لیے آمادہ ہوگئے۔ دَورانِ سفر ایک یوروپی باشندے نے لندن جانے کا سبب دریافت کیا تو کہا کہ ہندوستان کی آزادی کے لیے آواز بلند کرنے لندن جارہے ہیں۔ چنانچہ محمد علی نے اس کانفرنس میں ہندوستان کی آزادی کے لیے وہ آواز بلند کی جس کی گونج ابھی تک زندہ و پائندہ ہے۔ انھوں نے بانگِ دہل

(باقی صفحہ ۱۴۲ پر)

ایڈز

خواتین میں بیداری پیدا کرنے کی ضرورت

ڈاکٹر (شریمتی) این اے ناتھ

ایڈز کا عالمی دن ۱۹۸۸ء سے ہر برس یکم دسمبر کو
یا جاتا ہے۔ اس کا مقصد ایڈز کی روک تھام کے لیے
گیر کوششوں میں اضافہ کرنا اور انہیں مستحکم بنانا ہے۔ اس
زین بیماری نے ساری دنیا میں مردوں، خواتین اور بچوں کو
ثر کیا ہے۔ ۱۵۷ ممالک ایڈز اور ایچ آئی وی کے
یکشن کے واقعات کی اطلاع صحت کی عالمی تنظیم کو دے
ے ہیں۔ اس تنظیم کے اندازے کے مطابق ساری دنیا میں
ر لاکھ سے زیادہ افراد ایچ آئی وی سے متاثر ہیں جن میں
ے ایک تہائی سے زیادہ کی تعداد خواتین کی ہے۔ یہ خدشہ
ے کہ سال ۹۱-۱۹۹۰ء کے دوران ۵ لاکھ افراد میں ایڈز
بیماری پیدا ہو سکتی ہے جن میں سے خواتین کی تعداد تقریباً
ر لاکھ ہوگی۔ ۱۹۹۲ء کے اختتام تک ۶ لاکھ سے زیادہ
تین میں ایڈز کی بیماری پیدا ہو چکی ہوگی۔

بھارت میں اب تک اس سلسلے میں ۶ لاکھ افراد کا معائنہ
کیا ہے جس کے نتیجے میں یہ پایا گیا ہے کہ ہر ایک ہزار افراد میں
۷ افراد ایچ آئی وی سے متاثر ہیں۔ ان میں سے ایک
ی خواتین ہیں۔ حاملہ عورتوں میں انفیکشن کی زیادہ شرح سے
کے نوزائیدہ بچوں پر بہت زیادہ اثر پڑے گا۔ اور بچوں
شرح اموات بھی کافی متاثر ہوگی کیوں کہ ایچ آئی وی انفیکشن
کا حامل بچہ لازمی طور سے ایڈز کا شکار ہو جائے گا اور
۵ برس کی عمر سے پہلے اس کی موت ہو جائے گی لیکن خواتین پر
ایڈز کا اثر محض تعداد کا معاملہ نہیں ہے۔

ایڈز خواتین کو نہ صرف فرد کی حیثیت سے متاثر
کرتی ہے بلکہ سماج میں اور خاندان میں صحت کی دیکھ بھال کرنے
والے، تعلیم دینے والے، بیوی، ماں اور آمدنی فراہم کرنیوالے
فرد کی حیثیت سے بھی متاثر کرتی ہے۔ خاندان اور سماج میں
خواتین کا کمتر درجہ ایچ آئی وی انفیکشن سے اُن کے متاثر ہونے
کا سبب بنتا ہے۔ سماج میں ماتحت کی حیثیت سے خواتین کا
کردار مختلف طبقوں میں مختلف ہو سکتا ہے لیکن اس کا اثر ہر جگہ
یکساں ہے۔ اس میں صحت، آمدنی اور سماج حقوق وغیرہ کے بارے
میں تعلیم، معلومات اور خدمات کے مساوی مواقع کی کمی شامل
ہے۔ اس میں مثال کے طور پر ایچ آئی وی انفیکشن سے اپنے آپ
کو بچانے کے بارے میں معلومات تک اُن کی رسائی متاثر ہوتی
ہے۔ ایڈز کا شکار ہو جانے کے سبب خواتین امتیاز
سماجی طور پر قبول نہ کئے جانے اور اپنے حقوق سے محروم
کر دیئے جانے کا شکار ہو سکتی ہیں۔

اس برس ایڈز کے عالمی دن کے موقع پر خواتین پر
توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ خواتین سمیت سماج میں ہر ایک شخص کو

اس بیماری کے سائنسی حقائق کے بارے میں معلومات ہونی چاہیئے۔ انہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ اس انفیکشن کا اثر کس طرح سے ہوتا ہے۔ یہ کس طرح پھیلتا ہے اور کس طرح کسی شخص کو یہ انفیکشن لگتا ہے اور اس سے بچنے کے لیے کیا کیا جا سکتا ہے۔ جو لوگ اس بیماری سے متاثر ہو چکے ہیں ان کی دیکھ بھال پیار محبت سے کی جانی چاہیئے اور ان کے ساتھ کسی قسم کا امتیاز نہیں برتا جانا چاہیئے۔

اب تک ہمارے ملک کے لوگ صحت کے بارے میں بیدار نہیں ہیں۔ وہ اس سلسلے میں بیدار تب ہی ہوتے ہیں جب اُن کے خاندان میں کوئی شخص بیمار پڑ جاتا ہے۔ لوگوں کو اپنی صحت کا خیال رکھنا چاہیئے۔ اور صحت مند زندگی گزارنے کے لیے اپنی طرزِ حیات میں تبدیلی لانی چاہیئے۔ انہیں بیماریوں کی روک تھام کرنے اور اچھی صحت برقرار رکھنے کے لیے انفرادی اور اجتماعی طور پر اقدامات کرنے چاہئیں۔ ان اقدامات سے اُن تمام سرگرمیوں میں اجتماعی شرکت حاصل ہوگی جو اچھی صحت برقرار رکھنے میں مددگار ہوتی ہیں۔

ایڈز کی روک تھام کے لیے لوگوں کو اپنی طرزِ زندگی بدلنے کی ضرورت ہے اور ایسے اقدامات کرنے کی ضرورت ہے جن سے ایچ آئی وی کے اثر سے بچایا جاسکے گا۔ لھٰذا ایچ آئی وی کے اثر سے بچنے کے اقدامات لوگوں کو کرنے چاہیئے۔ ایچ آئی وی کے انفیکشن اور ایڈز کے بارے میں لوگوں میں بہت سے غلط خیالات اور غلط فہمیاں ہیں ان کو دُور کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر ایک بار لوگ ایڈز کے بارے میں حقائق سے واقف ہو جائیں گے تو یہ غلط فہمیاں خود بخود دُور ہو جائیں گی۔ یہ بات یقینی ہے کہ صحیح معلومات کی مدد سے نیز درکار اقدامات کر کے اور طرزِ زندگی میں تبدیلی لا کر ملک میں ایچ آئی وی کے اثر کو پھیلنے سے روکا جا سکتا ہے۔

صفحہ ۱۲ سے آگے

مولانا محمد علی ۔ قومی ایکتا کے نقیب

اعلان کیا:

"میں اپنے ملک کو اسی حالت میں واپس جا سکتا ہوں جب کہ میرے ہاتھ میں آزادی کا پروانہ ہو ورنہ میں ایک غلام ملک میں واپس نہیں جاؤں گا۔ میں ایک غیر ملک میں جو اگر آزاد ہے، مرنے کو ترجیح دوں گا اور اگر آپ نے مجھ کو ھندوستان کی آزادی نہیں دی تو پھر آپ کو یہاں مجھے قبر کے لیے جگہ دینی پڑے گی۔"

مولانا محمد علی نے اپنے اس قول کو سچ کر دکھایا۔ یہ مرد مجاھد لندن میں یعنی ایک آزاد ملک میں ۴ جنوری سا۱۹۳۱ء کو اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملا۔ ایک مشہور مصنف ایچ جی ویلز نے لکھا کہ "محمد علی کا دل نپولین کا دل تھا، اُن کی زبان برن کی زبان تھی اور اُن کا قلم میکالے کا قلم تھا۔"

ماضی کے آئینے سے

اختر شیرانی

آرٹ

(انگریزی زبان کے شہرۂ آفاق اہلِ قلم ایمرسن کے خیالات)

چونکہ روح بذاتہٖ ترقی پذیر ہے اس لئے وہ اپنے آپ کو کامل طور پر دہراتی نہیں۔ مگر ہر ایک
ں میں ایک نئی اور لطیف تر تمامیت کی پیداوار کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ اس امر کا لطیف اور مفید
زن قسم کے فنون میں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ ہم فنون کی عام تفریق کو ان کے مقصد کے مطابق
ہ وہ فائدے کی صورت میں ہو یا حسن کی) استعمال کریں۔ اسی طرح ہمارے فنونِ لطیفہ میں نقل
ں بلکہ تخلیق مقصود ہے۔ منظری تصاویر میں مصور ایک ایسی حسین تر تخلیق کو نمایاں کرے گا۔ جو حقیقتاً
ل مناظر میں ہمیں نہیں ملے گی۔ مناظر کی تفصیلات کو جنہیں فطرت کی نثر کہنا چاہئے، وہ قلم انداز کر کے
ن روح اور عظمت کو ہمارے سامنے بے حجاب کرے گا۔ وہ سمجھ لے گا کہ منظر میں اس کی آنکھ کیلئے
ن موجود ہے۔ کیونکہ یہ ایک خیال کو نمایاں کرتا ہے، ایسے خیال کو جو اس کو اچھا معلوم ہوتا ہے اور یہ
ہلے کر وہی طاقت جو اس کی آنکھوں کی راہ سے دیکھتی ہے، اس صورت یا منظر میں بھی دیکھی جاتی ہے۔
فاذا دیگر وہ صرف فطرت کے اظہار کی قدر کرے گا، خود فطرت کی نہیں اور اس طرح اپنی نقل میں
ن نقوش کو ابھارے گا جو اسے لبھاتے ہیں۔ وہ تاریکی کو بہت تاریک اور روشنی کو بہت روشن
ھائے گا۔ ایک شخصی تصویر میں وہ نقوش کو نہیں بلکہ محض سیرت کو پیش کرے گا۔ اور پیش نظر شخصیت کو
ی طرح محض ایک نامکمل تصویر سمجھے گا۔ یا اس کے اپنے بلند نظرانہ معبود فکر کی تمثال!

اس تخلیقی جز کے سوا وہ کون سا ملاقہ اور انتخاب ہے جو ہم روحانی تحریک میں کار فرما دیکھتے
ں۔ کیونکہ یہ اس مطلق روشنی کا راستہ ہے جو ہمیں سادہ نقوش سے گہرے مطالب کی طرف پہنچنے کی
لیم دیتی ہے۔ انسان کیا ہے؟ اپنے ذاتی اظہار میں فطرت کی لطیف تر کامیابی! انسان کیا ہے؟

فطرت کے مظاہر — اجرامِ سماوی سے زیادہ نفیس اور سراپا تکمیل منظر!! اور اس کی گفتگو! اس کی
نقاشی کا شغف اور اس کی فطرت پر غلبی کیا ہیں؟ اس کی پہلے سے زیادہ حسین کامیابی!

تمام تھکا دینے والی مسافتیں اور ہا ان کی جسامتیں اور وسعتیں صرف ایک موسیقیانہ لفظ
یا پنسل کے ایک ہلکے سے نشانے میں جمع ہو جاتی ہیں۔ لیکن مصور کو اپنے عہد کے لوگوں کو اپنی کسبی
صنعت سے آشنا کرنے کے لئے اپنے ہم عصر اور قوم کے مستعمل و مروج نقوش استعمال کرنے چاہئیں
اسی طرح مصوری میں جدت ہمیشہ قدامت سے پیدا ہوتی ہے۔ اپنے عصر کی ذہنی فضیلت، اپنے
عمل پر ہمیشہ ایک ناقابلِ شکست مہر لگا دیتی ہے، اور تخیل کے لئے اس میں ایک ناقابلِ بیان
لطافت پیدا کر دیتی ہے۔

جس حد تک کسی مصور کے عہد کا روحانی ماحول اسپر اثر انداز ہوگا۔ اور اس کے عمل میں
جلد سے کار آئے گا، اسی حد تک اس میں ایک خاص خلاق پیدا ہو جائے گی، در مستقبل کے اہل فکر کیلئے
وہ ایک ناقابلِ فراموش، انجانی اور زمانی یادگار بن جائے گا۔

مصور کو اپنے دلی ارادوں کا علم نہیں ہوتا۔ نہ وہ اپنی آنکھوں کے ذریعے سے حقائق پذیر
ہو کر کچھ کرتا ہے۔ اپنے ہمعصروں کی محنت و کوشش کے انداز، ان کے طور طریقوں اور خیالوں بلکہ
خود اپنے ایک ایک سانس سے وہ غیر ارادی طور پر متاثر ہوتا ہے۔

مصور کے قلم اور مجسمہ ساز کے اوزار کے پیچھے ایک بے پناہ قوت کار فرما ہوتی ہے۔ جس کے

ھا اس کا کیا مطلب تھا۔

"جب میں ہومر کی ایلیڈ پڑھتا ہوں تو مجھے تمام آدمی دیو نظر آتے ہیں"

مجھے کبھی یہی احساس ہوتا ہے کہ مصوری اور مجسمہ سازی آنکھ کی "ورزش" کا نتیجہ اور ان کے احساس اور قدرت تشکیل کا کرشمہ ہے۔ کسی آدمی نے کبھی مذکورہ بالا فقرے کی طرح خیالی ں کی عظمت کو مدنظر رکھتے ہوئے، اسقدر دلکش تصویر نہیں کھینچی۔ ظاہر ہے کہ یہ نظریہ قائم کرتے ت میری نظروں کے سامنے کوئی آرٹ گیلری نہیں ہوتی۔ آخر اس تمام مجموعی نقشے کو صنعت کا نے رئی شکل میں تبدیل تو نہیں کیا نہ خاص طور پر ایک انسان کو دوسرے سے مختلف بنا کر دکھایا ہے کتاب پڑھنے کے بعد ان شکلوں کو دیکھے بغیر خود بخود اپنی روح پر ایک ایسا احساس طاری ی تے ہیں۔ جس سے ان کو پتہ چل جاتا ہے کہ یہاں بڑے آدمی کا کیسا نقشہ پیش کیا جائے اور پچھلے کا ا کبھی مصور کو ایک خیال آتا ہے کبھی دوسرا ہر لمحے کے بعد اس کے لئے، وہاں کی فضا، وہاں کے باب ہیں اور اگر وہ مٹی کی مورت سار رہا ہو تو مٹی میں ایک احتلاف سار دو سا ہو جاتا ہے۔ اس وقت رنگ، مرمر، تصویر رکھنے کے سٹینڈ اور سنگتراشی کے اوزاروں کا احساس نہیں ہوتا۔

اگر ہم تمام اشیاء کی موجودگی کو دست قدرت کا کرشمہ سمجھیں تو اس امر کی تشریح ہو جائے گی کہ اپنے بہترین آرٹ رکھنے والی تمام چیزیں عالمگیر طور پر قابل فہم ہیں۔ ان سے ہمارے دماغ میں سادہ ہ حالتیں جو کرائی ہیں۔ انہیں مذہبی رنگ سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے چہرے کے اثرات خاص روحانی رنگ لئے ہوتے ہیں۔ بعض اوقات یہی اثرات قدرتی اشیا یا انسان کی بنائی ہوئی ں کی شکل و ساخت سے ہو بہو واضح ہو جاتے ہیں جو تسی کے وقت ہمیں قدرت میں آرٹ تا ہے ۔۔۔ ایسا آرٹ جو ہر لحاظ سے مکمل ہوتا ہے۔ اور کسی جوہر قابل کی صنعت کا مانہ یا منت ں منت نہیں ہوتا۔ وہ فرد جس میں سادہ ذوق اور کائنات کی بڑی بڑی اشیا کے اثرات کرسکنے کی صفت ہوتی ہے، اور جو کسی خاص مقام کی فضا یا تہذیب سے متاثر نہیں ہوتا، آرٹ ، کا سب سے بڑا نقاد کہلانے کا مستحق ہوتا ہے۔ اگر ہم کائنات کی حسین اشیا کو دیکھنے کا عزم کرکے کی سیر و سیاحت کریں اور ہم میں ان کے جمالی اثرات کے احساس کا مادہ موجود نہ ہو تو نہیں وہ اشیا ہیں راس آئیں گی۔ بہترین حسن وہ ہے جو مقامی نہ ہو اور کسی چیز کے صرف خاکے میں موجود نہ ہو مثلاً کسی رکو دیکھ کر یا موسیقی کی گہری سے گہری اور ہلکی سے ہلکی آواز میں ہم اسے محسوس کر سکتے ہیں۔ یونانی ںوں، رومی عمارتیں، اور وینس کی تصویروں میں سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ ایک لگیر زبان بولتی سنائی دیتی ہیں۔ بالفاظ دیگر ان کے اثرات عالمگیر ہیں۔ ان کے مشاہدے کے وقت وس ہوتا ہے کہ ان میں قدرت، اخلاق، پاکیزگی، محبت اور امید سانس لے رہی ہے۔ ہم اپنے ساتھ ان کے لئے جو کچھ ساتھ لے کر جاتے ہیں۔ اس سے کچھ زیادہ انہیں دیکھ کر واپس لاتے ہیں نہیں بھنے کے بعد ان کے متعلق ہمارے دماغ میں ایک روشن تر تصویر کھنچ جاتی ہے۔ جب کوئی سیاح ا کی بارگاہ میں حاضر ہوتا ہے اور سے مختلف کروں، مجسموں، گلدانوں، تابوتی پتھروں، منقش ر مختلف قیمتی سے قیمتی اور حسین سے حسین چیزوں کے قریب سے گزرنے کا اتفاق ہوتا ہے تو نا ممکن ہے

ہر بھول جاتا ہے کہ کون سا سادہ اصول ان سب (اذکور مال) وجود میں لانے کا باعث ہوا ہے اور یہ کہ ان کی اصلیت خود اسی کے خیالات و قوانین سے متعلق ہے۔ وہ ان عجیب و غریب اشیا کے متعلق اصطلاحی اصولوں کا مطالعہ کرتا ہے۔ لیکن یہ فراموش کر دیتا ہے کہ یہ تمام اشیا ابتدا ہی سے حصہ پذیر نہیں تھیں۔ بلکہ مختلف ادوار ماضی اور مختلف ممالک سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان میں کی ہر چیز کسی مختلف صنعت کار کے دست قدرت کی منت کش ہے اور یہ کہ اس مجسمہ پر محنت کرتے ہوئے صنعت کار کو کسی دوسرے مجسمے کا خیال تک نہیں تھا۔ نہ اس وقت، طرز زندگی، طرز معاشرت، باہمی تعلقات، دھڑکتے ہوئے دلوں، دوچار ہوتی ہوئی نظروں، غربت، احتیاج، امید اور خطرات کے سوا اس کے روبرو کوئی اور نمونہ تھا جسے دیکھ دیکھ کر اس نے وہ مجسمہ تیار کیا تھا۔ حقیقتاً انہیں چیزوں نے اسے متاثر کیا تھا۔ لیکن اس کا کمال یہ ہے کہ وہ تمہارے دل و دماغ کو اپنے وطن کی فضا میں لے جاتا ہے۔

اپنی استعداد و صلاحیت کے مطابق فن کار اپنے عمل میں خود اپنی سیرۃ کے اظہار کے لئے بھی ایک راستہ چھوڑ دیتا ہے۔ جس چیز کی مدد سے وہ مجسمہ یا کوئی دوسری چیز تیار کرتا ہے۔ وہ اس کے راستے میں حائل نہیں ہوتی۔ مجسمے میں اپنی روح داخل کرتے وقت اس کے ہاتھ میں پتھر بھی موم ہو جاتا ہے اس کے تیار کردہ مجسمے اور اس کی ذات کے مابین ضرور باہمی تعلق ہوگا۔ اسے اپنے دماغ مروجہ قوانین اور رسمیہ تہذیب کے عوائد کا بار اٹھانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ نہ وہ یہ دیکھتا ہے کہ روما یا پیرس میں کیا کیا قوانین رائج ہیں۔ نیو ہیمپشائر کے کسی کھیت کے کنارے، معمولی لکڑی کا بنا ہوا اس کا گھر، یا گھنے جنگل میں بنی ہوئی جھونپڑی، یا تنگ و تاریک مکان، جہاں اسنے تنہائی کی غربت اور افلاس کی سختیاں محسوس کی ہوں گی۔ وہاں کے موسم، ماحول، اور طرز معاشرت کا احساس ہی کسی مصور کے لئے کافی ہے۔ وہ اس کی فضا اور تصویر کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر سکتا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ جب میں چھوٹا سا تھا، میں نے اطالوی مصوروں کی خوبیوں کے متعلق بہت کچھ سنا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ان کی عظیم الشان تصویریں مجھے بالکل اجنبی محسوس ہوں گی۔ اور اپنی وضعوں اور رنگوں کی مجموعی صورتوں میں میرے لئے حیران کن ثابت ہوں گی۔ میرے ذہن میں وہاں کے زر و طلا، وہاں کے لعل و جواہر، اور وہاں کے سپاہیوں کے نیزوں کے متعلق عجیب و غریب تصورات تھے۔ ویسے ہی تصورات جیسے اکثر مدارس کے بچوں کے دل و دماغ میں چکر لگاتے رہتے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ مجھے ایسی چیزیں نظر آئیں گی۔ جن کو میں خود نہیں جانتا تھا کیا ہیں؟ بالآخر جب میں روما گیا اور میں نے وہاں کی تصویروں کو اپنی آنکھ سے دیکھا تو مجھے محسوس ہوا کہ گویا میں ان سے پہلے سے آشنا تھا ایک ایک چیز میری آنکھوں میں کھب رہی تھی۔ میری آنکھوں کو ایک ایسا لازوال احساس ہو رہا تھا۔ جیسے میں پہلے بھی کئی صورتوں میں جن میں میں زندگی گزار رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں ایک ایک شکل سے واقف ہوں۔ ان کے لب جو جو باتیں کرتے ہیں وہ میں اپنے وطن ہی میں سن چکا ہوں یہی تجربہ مجھے نیپلز کے ایک گرجے میں ہوا۔ میں نے دیکھا کہ سب چیزیں وہی تھیں جن کو میں دیکھ چکا تھا۔ کوئی چیز نئی نہیں تھی۔ صرف اتنا فرق ضرور تھا کہ یہ گرجا میرے وطن سے دور تھا۔ باقی چیزیں وہی تھیں۔ جن سے میری نگاہیں آشنا تھیں۔ میں نے اپنے دل ہی دل میں کہا "نادان بچے ہزاروں میل

میں کا سفر کرکے، اور سمندر عبور کرکے یہاں کیا کرنے آیا ہے؟ ان چیزوں کو تو پہلے ہی اپنے وطن میں دیکھ چکا ہے"۔

یہی بات میں نے نیپلز کے مجسموں، اور رفائیل، اینجلو، ساٹیلی، تیشین، اور لیونارڈو ڈ فنشی کی تصویروں میں مشاہدہ کی۔ اسی طرح جو کچھ میں وسکن میں چھوڑ آیا تھا، یہاں بھی یعنی ویٹی کان میں، اور پیرس میں موجود تھا۔ حتیٰ کہ میرے لئے اس مقصد کی خاطر دنیا کی سیاحت بیکار ثابت ہونے لگی۔ اب ہر تصویر کے متعلق میرا تجربہ یہ ہوتا ہے کہ میری آنکھوں کو خیرہ نہیں کرتی۔ بلکہ مجھے اس میں کچھ نہ کچھ آشنائی نظر آتی ہے۔ تصویروں میں حد سے زیادہ فن کی نمائش غیر ضروری ہے۔ اکثر انسان عام فہم اور سادہ باتوں ہی سے متاثر ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام بڑی بڑی چیزوں میں سادگی کی جھلک نظر آتی ہے۔ یہی حالت تصویروں کی بھی ہے۔

رفائیل کی ایک تصویر "دی ٹرانسفگوریشن" اس حقیقت کی ایک روشن مثال ہے۔ تصویر کے تمام پیکر پر جمالیات کا ایک خاموش اور حلیم غازہ چمک رہا ہے۔ اور اس کی یہی ادا دل میں اتر جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ ہمیں ہمارا نام لے لے کر پکار رہی ہو۔ یسوع مسیح کے پر عظمت اور ضمیر بیں چہرے کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ باوجودیکہ اس تصویر کی دلکشی کے متعلق جو تصورات ہمارے دماغ میں ہوتے ہیں وہ ہمیں اس میں نظر نہیں آتے اور ہم کسی حد تک مایوس بھی ہو جاتے ہیں باایں ہمہ یہ سادہ سا لیکن جانا پہچانا اور آشنا چہرہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہمارے ہی کسی دوست کا ہے۔ اور ہم اس دوست سے ملاقات کر رہے ہیں۔

تصویر فروشوں کی واقفیت کی قدر و قیمت تو ضرور ہوتی ہے۔ لیکن جب تمہارا دل کسی چیز کے جوہر قابل سے متاثر ہو تو ان کی نکتہ چینی پر ہرگز کان نہ دھرو۔ کیونکہ یہ ان کے لئے نہیں تمہارے لئے بنائی گئی ہے۔ تم جو اس کی سادگی اور اس کے بلند احساسات سے آشنا ہو۔

فن کے بارے میں ہم بہت سی ضروری باتیں کہہ چکے ہیں۔ لیکن یہاں ہمیں نہایت کشادہ دلی سے اس بات کا اعتراف کر لینا چاہئے کہ فن جس شکل میں ہم اسے محسوس کرتے ہیں محض اس کی ایک ابتدائی شکل ہوتی ہے۔ ہم سب سے زیادہ تعریف فن کے مقصد کی کرتے ہیں اس کے اصل نتائج کو نہیں دیکھتے۔ آرٹ کے متعلق اس شخص کا نظریہ بالکل باطل ہوتا ہے۔ جو یہ خیال کرتا ہے کہ آرٹ کے ظہور کا بہترین زمانہ ماضی ہوتا ہے۔

"ایلیڈ یا" "ٹرانسفگوریشن" کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ ان کے مطالعہ و مشاہدہ سے ہمیں متعلقہ قوموں کی ایک خاص قوت کا اندازہ ہوتا ہے۔ بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی لہریں نزاکت کے دریا لہرا رہے ہیں اور ان سے فن کاروں کی زبردست قوت تخیل کا اندازہ ہوتا ہے۔ آرٹ اس وقت تک نامکمل ہے جب تک وہ دنیا کے عظیم و عالمگیر اثرات سے متاثر نہیں ہوتا۔ آرٹ اس وقت تک خام ہے جب تک وہ عملی اور اخلاقی رنگ اختیار نہ کرے۔ یعنی فعل ضمیر کی آواز سے نہ ہو اور وہ بھلا اور غریب کو اپنے اندر رکھی ہوئی مسرت کا احساس نہ دلائے۔ مختلف فنون کا عملی کام، تنہا مصوری کے عملی کام سے نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ وقتاً فوقتاً ایک ناقص او غیر مکمل احساس کی ناجائز پیدائش ہوتی رہتی ہے۔ آرٹ ایک ضروری شے ہے اور ضرورت ایجاد کا دوسرا نام ہے۔ یا اگر ہم ذرا زیادہ صحت اور پابندی سے اس کے معنی کریں تو ہم یوں کہیں گے کہ آرٹ ایک عالمگیر اور غیر محدود چیز ہے جو اپنے شکستہ یا بستہ ہاتھوں کی مدد سے بھی مصروف کار رہتا ہے۔ اپاہجوں کی سی تصویریں کھینچتا ہے اور دیو قامت انسانوں کی بھی جیسا کہ مختلف مجسموں اور تصویروں کے دیکھنے سے پتہ چل سکتا ہے۔ اس کا احترام انسان اور قدرت کی تخلیق کے کام سے کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا۔ وہ حالات کی دیواروں کو نظر انداز کرتے ہوئے دیکھنے والے کی آنکھ کو ایک ایسے عالمگیر تعلق اور قوت کا احساس دلاتا ہے۔ جس کی مدد سے وہ فن کار کی اس روح سے آشنا ہو جاتا ہے جو اس وقت اس کے اندر کار فرما ہوتی ہے۔ اس کا سب سے بڑا اثر یہ ہوتا ہے کہ اس وقت آرٹ نئے نئے مصوروں کی تخلیق کرتا ہے۔

ہم تاریخ میں پڑھتے ہیں کس طرح ایک مختلف طرز کا آرٹ تباہ ہو چکے ہیں مجسمہ سازی کا فن مصر میں اس طرح فنا ہو چکا کہ موجودہ زمانے میں ان کی تزئین کا اشاعت بالکل غیر ممکن ہو گی۔ ممکن ہے کہ ایک مفید آرٹ ہمارے وحشی انسانوں کی طرز پر مروج ان کے احساسات و ناکا رہ تھا۔ اشکال کے متعلق ان کے تصورات عجیب و غریب تھے۔ ان کے ہی معمولی معمولی اور ابتدائی احساسات اسقدر نفاست اور مادہ یکبارگی اختیار کرنے لگے تھے کہ ان میں مصوری کی جھلک نظر آنے لگی تھی۔ لیکن بہرحال یہ کام کسی دانا اور روحانی قوم کا نہیں بلکہ ایک غیر مہذب قوم کا تھا۔ پھولوں اور پتوں سے لدے پھندے بلوط کے درخت، یا ستاروں کی لازوال آنکھوں سے نیچے کی طرف جھانکنے والے آسمان کے تلے میں شاہراہ کے قریب کھڑا ہوتا ہوں۔ لیکن بالاشک آرٹ میں اور خصوصاً مجسموں کی ساخت میں، تخلیق کو ایک کونے میں جگہ دی جاتی ہے۔ قدرت ہمارے ہر قسم کے خیالوں کے مقابلے میں بازی لے جاتی ہے۔ قدرت کا راز ہمیں ابھی تک نہیں ملا۔ آرٹ گیلری پسند کرنا یا نہ کرنا، ہمارے مختلف اوقات کی مختلف حالتوں پر منحصر ہوتا ہے۔ ایسا وقت بھی آتا ہے جب ہم اسے ردی سمجھنے لگتے ہیں۔ کسی مجسمے کو دیکھ کر ہمیں معلوم ہو سکتا ہے کہ شکل و شباہت کا راز کسقدر عمیق ہے، اور مجسمہ سازی کی روح کسقدر صفائی سے اس کی زبان کی ترجمانی کرتی نظر آ رہی ہے۔ لیکن بعض آنکھوں کو یہی چیز بالکل غیر حقیقی۔ آرٹ کبھی یکسانی کا رنگ لئے ہوئے نہیں ہوتا، بلکہ ہمیشہ ندی کے بہاؤ کی طرح حرکت میں رہتا ہے۔ یعنی ایک حالت پر قائم نہیں رہتا۔ شیریں ترین موسیقی کسی بھی ساز سے نہیں بلکہ انسانی آواز سے ہی محسوس کی جا سکتی ہے بشرطیکہ جبکہ اس کے لہجے میں نزاکت، اظہار حقیقت، اور جرأت کے احساسات ملے ہوئے ہوں۔ بچپن، صبح، سورج، اور زمین کا تعلق کم ہو چکا ہے، وہ اب لازمی طور پر صبح کو ہی نہیں گایا جاتا۔ لیکن اس آواز کا ان چیزوں سے تعلق ضرور ہے۔ ایک شخص اپنے رویہ اور حسن کارکردگی کے لحاظ سے بجائے خود ایک مجسمہ ہے۔ ایک حسین عورت ایک تصویر ہے جو ہر دیکھنے والے کو ایک لطافت کے انداز سے دیوانہ کر دیتی ہے۔

اگر کسی انسان کے اختیار میں قدرت کے قانون تخلیق کے حقیقی اصولوں کی قوت ہو تو وہ

لطفت میں لے جائے گا۔ جہاں اُس کا جدا گانہ اور تفریقی
ی زندگی میں "ایجاد" اور "حسن" کے فواروں کا پانی خشک
ایک تھیٹر اور ایک رقص گاہ اس امر کا احساس دلاتے ہیں
ہم سب کی حیثیت مفلسوں کی سی ہے۔ نہ ہمارے پاس عزت
آرٹ غریبوں اور ادنٰے درجے کے لوگوں کی طرح ہے ۔
ت بار "خوذ دینسوں" اور "کیو پڈوں" کے سروں پر محسوس ہوتا
اس قسم کی تصویریں لانے پر معذرت کا اظہار کر رہا ہے لیکن
رکے دل میں صورت و شکل کی تخلیق کی زبردست خواہش پیدا
نہ روک سکا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عجیب و غریب شکلیں ظہور
فدزدان فن میں اپنی قابلیت کی نمائش کا نشان ڈھونڈتے
روزندگی کی آزمائشوں سے پناہ طلب کرتے ہیں۔ انہیں وہ
جیسے وہ اپنے حافظے اور قوتِ تخلیق کی مدد سے بناتے ہیں۔
ھتے ہیں اور اپنے احساسات کا اظہار کسی بھی کریہہ یا کسی
۔ آرٹ کا رجحان بھی اسی طرف ہوتا ہے جس طرف جسمانی قوت
مد بھی کسی چیز کے حسن اور کسی چیز کے مفاد میں تفریق کر کے کسی نا گزیر
ہے کہ ہر کسی کا انتہا ہو لیکن قوانینِ قدرت اس احساس مفاد کو پیچھے
نہ مذہب اور محبت کے لئے نہیں بلکہ مسرت حاصل کرنے کے لئے کیا جاتا ہے
کا رتبہ گر جاتا ہے، اعلیٰ حسن اسے تصویر کر کے ہر دینے، پتھر آواز یا
اس کو ایک نمائشی گز اور غیر مکمل حسن کی صورت ضرور نظر آ جاتی ہو
ہوتا کیونکہ مہارت کے ہاتھ کی رسائی وہاں تک نہیں ہوتی، جہاں تک

قدرت کی ہر چیز کار آمد اور حسین ہے۔ حسین اس لئے ہے کہ وہ زندہ ہے۔ جتنی تخلیقی ہم اس میں قوت
تخلیق موجود ہے۔ کار آمد اس لئے ہے کہ خوش اسلوب اور دلکش ہے۔ حسن کسی مجلس آئین ساز کی آواز پر ایک
جگہ سے دوسری جگہ منتقل نہیں ہوگا۔ نہ وہ ایسی یونان کی تاریخ انگلستان اور امریکہ میں دہرائے گا۔ اس کی
آمد ہمیشہ خود بخود ہوگی، اور یہ خود بخود بہادر اور سرگرم انسانوں کے قدموں سے ابھل پڑے گا۔ اگر ہم فن کے
جوہر قابل سے متوقع رہیں کہ وہ پرانے فنون میں اپنی جھلک دکھائے تو یہ ایک ناقص بات ہوگی۔ ایک جوہر
قابل نئی نئی اور ضروری چیزوں کھیتوں، سڑکوں، دوکانوں اور ملکیوں میں بھی حسن اور تقدیس کو تلاش
کرے گا۔ اگر یہ احساس کسی روحانی دل کو ہوگا تو اسے ریل کی لائن، انشورنس کے دفتر جائنٹ سٹاک کمپنی ہماری
ایسی مجلس وضع آئین و قوانین، اور ہماری تجارت وغیرہ میں (جنکو ہم محض فائدہ مند چیزیں سمجھتے ہیں) اس کی
جھلک نظر آ جائے گی۔ سوال یہ ہے کہ کیا میکینکل کاموں۔ کارخانوں ریلوں اور مشینوں میں ایک کمینہ
اور خود غرض روح نہیں کام کر رہی ہے؟ لیکن جب کسی کام کا مقصد نیکی ہو تو یہ انسان کو قدرت کی مسرور وادی میں
لیجاتا ہے۔ مثلاً بحر اطلانتک میں پڑنے والے انگلینڈ تک سفر کرنے والی کشتی جو ہر بندرگاہ پر نہایت پابندی
وقت سے پہنچتی ہے۔ انسان کی ایک مفید خدمت انجام دیتی ہے۔
اس سلسلے میں اس کی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ سینٹ پیٹرز برگ کے قریب دریائے نیوا میں دخانی
مدد سے چلنے والی کشتی اپنی عظمت کے لحاظ سے کسی تعریف کی محتاج نہیں۔ جب سائنس کے ساتھ دلوں میں محبت کے
جذبات بھی کارفرما ہوں گے اور سائنس کی قوتوں کے ساتھ محبت کی قوتیں بھی مل جائیں گی تو ادی قوتِ تخلیق میں ایک مزید
زبردست تحریک پیدا ہو جائیگی جس سے اس کی قوت تکمیل کو منتہائے کمال پہنچے گی۔

(اختر شیرانی)

سالنامہ نیرنگ خیال ۱۹۳۲ء

قلمی معاونین سے گذارش ہے کہ اپنی تخلیقات کے خاتمہ یا
پشت پر اپنا مکمل پتہ، پن کوڈ نمبر کے ساتھ ضرور
تحریر فرمائیں۔ مضمون کاغذ کے صرف ایک ہی طرف لکھیں اور قلمی نام کے
ساتھ اصل نام بھی تحریر کریں — غیر مطبوعہ مضامین کی ایک نقل اپنے
پاس ضرور رکھیں۔

(ادارہ)

رتی رواں کے پہلے خود امتیاز حاصل کرتا ہے۔ آرٹ ایک مصنوعی شباہت
انسان کی گذشتہ زندگی کے اصلی احساسات سے ہوتا ہے۔ جب انسان کا
ایک مجسمہ بناتا ہے جس میں وہ تمام دلکشی موجود ہوتی ہے جس کی ہیں لذت
بددماغ، اور کند ذہن تصور کرتے ہوئے، ان کے بجائے رنگوں کے
ین حاصل کرتے ہیں۔ زندگی کو وہ بے مزہ و بے کیف تصور کرتے ہیں۔ اور
ین دکھاتے ہیں۔ وہ دن کی طویل گھڑیاں، خیالی تعیش، اور خیالی لذت
ور اسطرح آرٹ کو داغ دار بنا دیتے ہیں۔ اس سے بعض لوگ یہ سمجھنے
کا نام ہی آرٹ ہے۔ کیا ان باتوں سے بالاتر کوئی کام کرنا زیادہ مفید
ت کے بجائے اپنے صحیح مقصد کی تکمیل بہتر نہیں؟ حسن کا صحیح مقصد یہ ہے کہ وہ
سے بچاؤ مفید اور لطیف فنون کے درمیان کا امتیازی پردہ اٹھا دے۔

دشتِ امکاں

رشید امجد

خزانے والا خواب برسوں پرانا تھا،
ایک صبح ناشتہ کرتے ہوئے ماں نے کہا تھا ــــــ "مجھے یقین ہے کہ اس گھر میں کہیں خزانہ ہے۔"
ان کی خاموشی پر وہ جھک سی گئی ــــــ "رات میں نے پھر وہی خواب دیکھا ہے۔"
اس نے پوچھا ــــــ "کون سا خواب؟"
"وہی خزانے والا ــــــ میں وہاں تک پہنچ بھی گئی تھی"
اس نے ہنستے ہوئے کہا ــــــ "تو پھر نکال کیوں نہ لائیں؟"
"بس" ماں نے جھرجھری لی ــــــ "میں وہاں تک پہنچ تو گئی، لیکن ــــــ"
"لیکن کیا؟" چھوٹی بہن نے جلدی سے پوچھا
"جب میں نے ہاتھ بڑھا کر اٹھانا چاہا تو ــــــ" ماں نے پھر جھرجھری لی، ایک لمحے کے لئے جیسے خواب اُس کی آنکھوں میں مجسم ہو گیا ــــــ "کسی نے میری کلائی پکڑ لی۔"

وہ ہنس پڑا ــــــ "خزانے کے سانپ کی بات تو سنی ہے لیکن سانپ نے کلائی کب سے پکڑنی شروع کر دی ہے"
ماں نے بُرا سا منہ بنایا اور بولی ــــــ "تم تو بس مذاق ہی اڑانے کے لئے ہو، لیکن میں سچ کہتی ہوں اس گھر میں کہیں خزانہ ضرور ہے، ایک دن تم ــــــ یاد رکھنا بس۔"

اس نے کندھے جھٹکے ــــــ "جلدی سے چائے بنا دیں، دفتر دیر ہو رہی ہے"
بس میں سوار ہوتے ہوئے اسے ایک لمحے کے لئے ماں کی بات یاد آئی اور خزانے کی نرم نرم گرمی اس کے جسم میں لہراتے لمس کی طرح رقص کرنے لگی، لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی نظریں اگلی سیٹوں سے جا چپکیں، وہ ابھی ابھی سوار ہوئی تھی اور کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی نظروں ہی نظروں میں سٹاپ آ گیا۔ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے سرگوشی کی ــــــ "واپسی پر چائے کا کپ چلے گا نا"
وہ مسکرائی اور اٹھلاتی ہوئی آگے نکل گئی۔
چائے پیتے ہوئے وہ چپ چپ رہی۔
اس نے پوچھا ــــــ "کیا بات ہے آج ہیڈ مسٹریس سے ڈانٹ تو نہیں پڑی؟"
"نہیں تو"
"پھر"
"بس اب تم ماں جی کو ہمارے گھر بھیج ہی دو"
وہ چپ ہو گیا، بہت دیر چپ رہا، پھر بولا ــــــ "بھیج دینے میں تو حرج نہیں، اور ماں آنا بھی چاہتی ہے، لیکن ــــــ"
"لیکن کیا؟"
"سوچتا ہوں کچھ ہاتھ کھل جاتا تو اچھا تھا"

لئے اسے خزانے کا خیال آیا، کیا معلوم واقعی گھر میں کہیں
۔اگر ہاتھ آجائے تو ـــــــ ایک گرم لہر نے اس

؛ وہ ہنسی ـــــــ "اندر ہی اندر ٹمک رہے ہو"
س نے سر ہلایا ـــــــ "خواب بھی عجیب

د اب نہ ہوتے تو ہم جیسوں کا کیا بنتا"
ـــــ "اسی تنخواہ پر گزارہ کرتے"
رشی رہی، پھر بولی ـــــ "تو کب آرہی ہیں ماں جی؟
ںسنے شانے اچکائے ـــــ "لیکن بہنوں کی شادی
اپ تو میرا ہے نہیں، آخر یہ سب کرنا تو مجھے ہی ہے"
"اس نے اس کا ہاتھ دبایا ـــــ "اب تم اکیلے ہو
ہوؤں گی"
ـــــ بس خیال سا آیا کہ کیا معلوم گھر میں کہیں خزانہ

تے ہوئے اس کا دل چاہا کہ ماں خزانے والی بات پھر
سس رات گیس اور بجلی کے بلوں کی فکر تھی کہ اگلے دن

خزانے اور خواب آنے گئے ہو گئے۔ اس دوران
، بات پکی کر آئی ۔
تے ہوتے ماں نے پھر خزانے کا ذکر چھیڑا اور بولی ـــــ "رات
یکھا ہے ـــــــ لیکن بس تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد
میری کلائی پکڑ لیتا ہے ٹھنڈے برف ہاتھ والا"
ـــــ "آپ نے مڑ کر نہیں دیکھا کہ وہ کون ہے؟"
جھرجھری لی ـــــ "ایک ٹھنڈا برف ہاتھ، میرا تو سارا جسم
انکھ کھل جاتی ہے"
ن سوچا ـــــ کیا معلوم واقعی یہاں خزانہ ہو، اور پہ کوئی

بہنوں نے اس کے سسرال تاریخ مقرر کرنے جانا تھا۔
گیا، کچھ دیر پڑھتا رہا، پھر جانے کیسے خزانے کا خواب
ں اس کے اندر داخل ہوا اور لمحوں میں سارے وجود

پر پھیل گیا۔

اس نے کتاب ایک طرف رکھ دی اور سوچنے لگا کہ اگر خزانہ ہے تو کہاں ہو سکتا ہے؟

برسوں سے خزانے کا ذکر سنتے سنتے ایک دو جگہیں اس کے ذہن میں کلبلاتی رہتی تھیں، لیکن دوسروں کی ہنسی اور اس خوف سے کہ کہیں اس کے تجسس کا مذاق نہ اڑایا جائے اُسے کبھی انہیں دیکھنے کی ہمت نہ ہوتی۔ اب گھر خالی دیکھ کر اس نے پہلے تھیلے سے چھینی اور ہتھوڑا نکالا اور بڑے دالان کی الماری کے آخری خانے کی طرف چل پڑا۔ یہ خانہ اسے ہمیشہ اندر سے کھوکھلا محسوس ہوا تھا۔ کیا معلوم اس کے پیچھے کوئی خفیہ خانہ ہو اور اس میں ـــــــ تختہ نکالتے نکالتے اس کا ہاتھ زخمی ہو گیا، لیکن خزانے کے گرم گرم لمس نے درد کا احساس ابھرنے نہ دیا۔ خانے کے پیچھے کچھ بھی نہیں تھا

لیکن وہ مایوس نہیں ہوا

سونے کے کمرے کے فرش کا ایک ٹکڑا بھی اسے مشکوک لگتا تھا۔ تختے کو اپنی جگہ جما کر اس نے سونے والے کمرے کی غربی دیوار کے ساتھ کی ان دو اینٹوں کو نکالا جو ذرا مختلف انداز سے لگی ہوئی تھیں۔ لیکن وہاں سے بھی کچھ نہ نکلا۔ ایک دو جگہیں اور بھی تھیں لیکن گھر والوں کی واپسی کا وقت ہوا جا رہا تھا۔

اگلے چند دن شادی کی تیاریوں اور ہنگاموں میں گزر گئے۔ بیوی کے آنے سے گھر میں کچھ آسانیاں ہو گئیں۔ اس کی تنخواہ نے کئی رکی ہوئی ضرورتوں کو پٹے لگا دیئے جہیز کی چیزوں نے خالی گھر کو بہت حد تک بھر دیا۔

اگلے دو سالوں میں بہنیں بھی بیاہ کر اپنے اپنے گھر چلی گئیں۔

اس دوران ماں کبھی خواب کا ذکر کرتی تو چند دنوں کے لئے خزانے کا تصورات ایک نئی گرماہٹ سے آشنا رکھتا۔ وہ موقع دیکھ کر مختلف جگہوں کی کھدائی کرتا رہتا۔ مایوس ہوتا، چند دن بعد کسی دوسری جگہ کا انتخاب کرتا ـــــــ پھر کچھ دن خزانے کا خواب اسے اپنی نرم گرم بغل میں دبائے رکھتا، پھر آہستہ آہستہ زندگی کی روا روی کی ٹھنڈک اس پر غالب آجاتی۔

ماں بھی اب خزانے کا ذکر سب کے سامنے نہ کرتی شاید اسے بہو کے سامنے اپنے خواب کا ذکر کرتے جھجک آتی تھی۔ لیکن کبھی کبھی جب بہو باورچی خانے میں ہوتی تو ادھر اُدھر دیکھ کر سرگوشی کرتی ـــــــ "خزانہ کہیں ہے ضرور"

وہ سنجیدگی سے پوچھتا ـــــــ "لیکن کہاں؟"

غزلیں

مرزا انیس عشرت
براق پورہ واشم۔

شوخیِ تحریر کا کچھ تو اثر ہونا ہی تھا
ایک دن رسوا مجھے دستِ ہنر ہونا ہی تھا

کر لیا دیوار و در کو ہم نے خود ہی منہدم
زلزلوں کے شہر میں گھر تو کھنڈر ہونا ہی تھا

آپ سے پہلے سمندر میں کوئی اترا کہاں
ورنہ کوئی نقش سطحِ آب پر ہوتا ہی تھا

کوئی منزل بھی نہ تھی لیکن سفر درپیش تھا
یعنی ان قدموں کو صرف رہگذر ہونا ہی تھا

اس کماں کا رخ مری جانب نہ تھا ورنہ مجھے
جنگ لڑنے کیلئے سینہ سپر ہونا ہی تھا

انصاف کی کرسی کو بکتے ہوئے دیکھا
مظلوم کو پھانسی پہ لٹکتے ہوئے دیکھا

جھلسے ہوئے چہرے ہیں پگھلتے ہوئے دل ہیں
اک آگ سی سینوں میں دہکتے ہوئے دیکھا

گذرا تھا میرے سامنے اک حسنِ مجسّم
بجلی تھی یا شعلہ تھا لپکتے ہوئے دیکھا

اللہ کوئی غم نہ انھیں دنیا کبھی کبھی
بچوں کو صبح میں نے چہکتے ہوئے دیکھا

جو بھول گئے عیش اور عشرت میں خدا کو
ایسے بھی کئی لوگ بھٹکتے ہوئے دیکھا

اور کبھی مذاق سے کہتا ——— "تو کیا سارے گھر کو کھود ڈالوں۔ ایک گھر ہی تو ہے ہمارے پاس"،

ماں چپ ہو جاتی اور خزانے کے ذکر پر کئی کئی مہینوں کی دھول پڑ جاتی۔ لیکن مرنے سے چند روز پہلے وہ تواتر سے خزانے کا ذکر کرنے لگی۔ ناشتے کی میز پر بہو کچھ لینے ادھر اُدھر ہوتی وہ سرگوشی میں کہتی ——— "پھر وہی خواب ——— ضرور یہ کوئی غیبی بشارت ہے"

بظاہر وہ اس کی بات پر توجہ نہ دیتا لیکن اندر ہی اندر اسے یقین سا ہونے لگا کہ خزانہ کہیں ہے ضرور۔ سب کی نظریں بچا کر وہ ان جگہوں کو بار بار دیکھتا جن کے بارے میں اسے شبہ تھا کہ وہاں خزانہ ہو سکتا ہے۔

ماں کے مرنے کے بعد بھی خزانے کا تصور اس کے ذہن سے پوری طرح محو نہ ہوا۔ مرنے سے ایک دن پہلے اُس نے پھر کہا تھا ——— "میرا خواب جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ یہ تو غیبی اشارہ ہے"۔

جب کبھی کمرہ خالی ہوتا تو وہ پرانے تھیلے سے اپنے اوزار نکال کر مختلف جگہیں ٹٹولتا۔ واپسی پر اس کی بیوی کسی اکھڑی ہوئی اینٹ یا الماری کا ٹوٹا فرش دیکھ کر استفسار کرتی تو وہ ادھر اُدھر کی باتیں کرکے ٹال دیتا۔ کچھ دن کے لئے خزانے پھر ذہن سے اتر جاتا۔

پھر کسی دن ماں یاد آجاتی تو خزانہ بھی چمکنے لگتا اور جب بیوی بچوں کو لے کر کسی دن میکے جاتی تو وہ اپنے اوزاروں کے تھیلے کو نکال لیتا ——— ہاتھ زخمی ہوتے دیواروں کا اکھڑا پلستر گھر کی خستگی میں اور اضافہ کر دیتا۔

پھر متعدد الماریوں، دیواروں اور فرش کے حصوں کو اکھیڑ اکھیڑ کر وہ تھک سے مایوس ہو گیا اور رفتہ رفتہ کئی سالوں میں خزانے کا خواب ، اس کی گرماہٹ اور چمک اس کی زندگی سے نکل گئی۔

لیکن اب برسوں بعد ناشتہ کرتے ہوئے جب اس کے بیٹے نے یہ کہا کہ "ابا میرا خیال ہے اس گھر میں کہیں خزانہ ہے" تو وہ چونک پڑا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

بیٹا ایک لمحے چپ رہا پھر بولا ——— "ابو میں نے رات خواب دیکھا ہے"

جواباً وہ کچھ نہیں بولا ——— اسے یاد آیا کہ اگلے ماہ وہ دونوں میاں بیوی ریٹائر ہو جائیں گے تو گھر کا سارا بوجھ بیٹے پر آن پڑے گا۔ اس نے اپنے کندھے پر اس ٹھنڈے برف ہاتھ کی ٹھنڈک کو محسوس کیا۔ ایک انجانا خوف اس کے سارے وجود پر چھا گیا۔ بڑی حیرت سے بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے سوچا ——— "خاندانی وراثت میں خواب بھی منتقل ہو جاتے ہیں"۔

—:—✦—:—

شعری مجموعہ: "بارش"
شاعر: نشتر اکبر آبادی
صفحات: ۹۶
قیمت: ۳۵/ روپے
ناشر: اسباق پبلی کیشنز۔ پونا ۴۱۱۰۰۶

نشتر اکبر آبادی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ اس لیے ان کے تعارف یا ان کی شخصیت پر الفاظ اور وقت صَرف کرنے کی چنداں ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

کہتے ہیں کچھ روایتیں ہمیشہ جوان رہتی ہیں، غزل کا حسن اس کا زندہ مثال ہے۔ آج غزل کو اس کے مزاج اور آہنگ نیز غالب رجحانات کے اعتبار سے دو سے زیادہ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک شعرائے شہر پونا نیز غزل کی سمت و رفتار کا تعلق ہے، میں بغیر کسی دعوے کے ایک اندازے کے مطابق یہ کہہ سکتا ہوں کہ پونا کے شعراء اور غزل گو شعراء کو دو حلقوں میں رکھا جا سکتا ہے اس طرح کہ پہلا حصہ ان شعراء پر مشتمل ہوگا جو غزل کے عام مزاج سے ہم آہنگ ہیں اور غزل میں روایت کی پاسداری کرتے ہیں۔ دوسرا حلقہ ان شعراء پر مشتمل ہوگا جنہوں نے نئی فضا کے ساتھ غزل میں نئے شعری رویے کو قبول کیا ہے اور لہجے، ڈکشن، لفظیات اور رجحانات کے اعتبار سے ان کے یہاں نیا پن اور تازگی بھی ہے، مگر وہ پچھلی تین دہائیوں کے عرصے میں غزل میں در آنیوالی صلابت، تجرید، غیر ضروری شکست و ریخت اور اوپر سے اوڑھی ہوئی جدیدیت سے گریز پا زیادہ مثبت انداز میں غزل کے تقاضوں کو پورا کرنے کی سعی کرتے ہیں۔

چنانچہ مزاج، لہجے اور لفظیات نیز علامات کے اعتبار سے نشتر دوسرے گروپ سے مطابقت رکھتے ہیں اور بنیادی طور پر غزل سنہ ۶۰ء اور اس کے بعد پروان چڑھنے والی ادبی نیز عصری فضا سے زیادہ قریب تر ہے۔ صالح اقدار اور مثبت پہلوؤں کی روشنائی، روایت کے شعور، لہجے کی گرائی، اظہار کی توانائی، نیز اسلوب کی سادگی سے نشتر کی غزلوں کا کینواس دلکش اور توجہ طلب بن جاتا ہے۔ نشتر ان شعراء میں سے ہیں جنھوں نے اپنی شناخت کے لیے اپنا اسلوب خود تلاش کرنے کی بھرپور سعی کی ہے۔ ان کے پاس ان کا اپنا لہجہ ہے اس لیے میرا اپنا خیال ہے کہ تحریک رویے اور رجحانات کی شاعری سے الگ ہوکر نشتر کی شاعری کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ علاوہ انہوں نے اپنے لیے جو شعری کائنات تخلیق کی ہے اس کے حوالے سے انھیں شناخت کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

نشتر اپنی کائنات کی تشکیل کے لیے مواد اپنے اطراف کی پھیلی بکھری زندگی سے مہیا کرتے ہیں، اور اس طرح موضوع کے اعتبار سے ان کی شاعری شہر کے حالات کا المیہ اور وقت کی داستان رقم کرتی ہے تلخ و ترش معاملات کی عکاسی سے شعریت پیدا کرتی ہے۔ تازہ کار تراکیب سے غنائیت کی بناء ڈالتی ہے

جہاں نشتر منافقوں کے شہر میں، بے چہرہ لوگوں کی بھیڑ
میں، لوہے کے پرندوں اور لکڑی کے کھلونوں کو آپس
میں گڈ مڈ پاتے ہیں، وہیں ان کی آنکھ سڑکوں سے افسانے
چنتی ہے۔ جہاں ہوس کار نظر جسم کا ذائقہ لے رہی ہے،
ایک طرف دل آویز چہرہ قاتل ہے جو آدمی کو پیڑ کی طرح
کاٹ رہا ہے۔ منظر وہ ہے کہ رگ و پے میں لہو جمنے لگتا
ہے۔ نشتر دن میں چراغ لے کر نکلتے ہیں۔ فساد کی راتوں
کا دکھ سہتے ہیں۔ تقدیر کا بھاری پتھر اور رشتوں کی بے
مائیگی ان کا مقدر بن جاتے ہیں۔ پھر بھی انہیں شہر کی بدنامیوں
میں جینے کا لطف آتا ہے۔ جہاں بدن کے جزیرے میں
اترنے کی خواہش کے ساتھ ساتھ خوف بھی لینا پڑا ہے
کہ جانے کب موج صبا کا طلسم ٹوٹ جائے۔

موضوعات کو برتنے میں شاعر نے خود کو تکلف
تصنع اور بے جا آرائش سے دور رکھا ہے۔ جس کے نتیجے
میں ان کے شعری پیکر زیادہ صاف اور واضح نظر آتے ہیں ؎

نشان قتل کے ہلکے کہیں پہ گہرے تھے
پتہ نہ چل سکا قاتل کے کتنے چہرے تھے

پلکوں سے اپنی راتیں جھٹک دو !
سڑکوں پہ کتنے سورج پڑے ہیں

شکاری بھٹکتا رہا رات بھر
اندھیروں میں جنگل گرفتار تھا

سبزے کی نمو روح کا مرہم ہے کہاں اب
ہے سخت عذابوں میں گرفتار بدن بول

اردو شاعری میں علامت نگاری ۱۹۶۰ء کے بعد
نئی غزل کے ساتھ نہایت تیزی سے داخل ہوتی ہے جس
نے تنوع میں اضافہ کیا ہے۔ مرزا غالب تو علامتوں کے
متعلق بہت پہلے کہہ چکے ہیں ع

بنتی نہیں ہے ساغر و مینا کہے بغیر

آج علامت نگاری جدید ہونے کی علامت نہیں شاعر
کی ضرورت ہے۔ غزل میں ان کا استعمال نیز ذاتی علامتوں
کو برتنا اب روایت ہے۔ نشتر کے یہاں علامتوں کا
استعمال نہایت نپے تلے انداز میں ہوتا ہے وہ اپنے قاری
کو علامتوں سے ہراساں نہیں کرتے۔ شعر کو مزید باطنی اور
تہہ دار بناتے ہیں ؎

چھت سے پابندیاں ہوئیں رخصت
اب کے بارش میں وہ نہائے گا !

رات کا قتل ہوا، نیند سے بچہ چونکا
درد کی راکھ اڑی خواب سنہرا ٹوٹا

کس طرح طے کرے فاصلہ آدمی
دھوپ کے شہر میں موم کا آدمی

کب سے سیراب کر رہا ہے زمیں
آج گندم کا ذائقہ لے گا

اکثر شعراء کے یہاں طنز بھرپور انداز میں سماج
خلاف ورزیوں پر حملہ آور ہوتا ہے۔ لیکن نشتر کے اشع
میں زیر لبی طنز "سنگ در دستِ ہوس" کی صورت اختیا
نہیں کرتا، بلکہ کارگہہ شیشہ گراں کا حسن لیے اپنے اندر مو
Hiello seeggashun خود کار مشورہ سے حس
پیدا کرتا ہے ؎

میں اتنی بھیڑ میں کس کس کو پارسا کہتا
کسی کی روح کسی کا لباس اجلا تھا

کس کس کے گھر میں گھی کے جلائے گئے چراغ
مجھ کو پڑوسی سے معلوم سب ہوا

دم بدم مشینی طور میں ڈھلتی ہوئی زندگی، صنعتی
کلچر کی عطا کردہ تلخیاں اور کرب ناکیاں، بڑھتا ہوا
احساسِ تنہائی، معصوم جذبوں کی پامالی کے ساتھ معتبر
ستونوں کے زمین بوس ہونے کا غم، سیاسی بازی گری
سے سڑکوں پر بڑھتا ہوا تماشہ اور ہجوم، غیر صحت مند
نعروں کا شور اور فضا میں تحلیل ہوتا ہوا زہر، حساس
طبیعت شاعر کو بے قرار کرنے کے لیے بہت ہے زندگی
کے تلخ حقائق سے پیدا شدہ یہ بے قراری نشتر کے یہاں
ان الفاظ میں ظاہر ہوتی ہے۔

تہذیب کے رسول کی دھرتی پہ کیا ہوا
اترا ہوا ہے چہرہ حرم کے سفیر کا

کس موڑ پہ ڈس لیں تجھے کب چھوڑ دیں تنہا
رشتوں کو کوئی نام نہ دے سانپ کا پھن بول

کس وقت کوئی تیر کسی سمت سے آئے
لوگ اپنی چھتوں پر بھی یوں بےخوف نہ ڈولیں

باہر کی فضائیں بھی شر انگیز بہت ہے
دروازہ رکھو بند ہوا تیز بہت ہے

ایک مرض جو پوری طرح سارے ہندوستانی
سماج کو اپنی لپیٹ میں لیے جا رہا ہے۔ اور اپنی بدترین
شکل میں جگہ جگہ رونما ہو رہا ہے نشتر کا یہ شعر اس
کی پوری داستان اور تفصیل ہے۔

ماچس کی ایک تیلی نے رونق اجاڑ دی
بستی کے ہر مکان کی صورت بگاڑ دی

بگڑی ہوئی اس صورت حال سے شاعر کا وہ ایقان
رخصت ہو رہا ہے جس کو نئے ذرائع ابلاغ نے، امن
اور شانتی کے وسیلے سے، زندگی کی طرف جدید تر رسائی
کے نام پر اس تک پہنچایا تھا۔ چنانچہ عدم ایقان کی
صورت میں شاعر یہ کہنے پر حق بجانب ہے کہ ؎

وہ جس کے ہاتھ میں مشعل تھی مر گیا کب کا
ستارے کون جڑے اب سیاہ چادر میں

اور شاعر چیخ پڑتا ہے ؎

سبزے کی نمو روح کا مرہم ہے کہاں اب
اے سخت عذابوں میں گرفتار بدن بول

مگر یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ یہ انسان، یہ
اشرف المخلوقات بہ حیوانِ ناطق ہر طرح کے ماحول میں
سانس لیتا رہتا ہے، ماہ و سال کی گرد آہستہ آہستہ
زخموں کو ڈھانپ لیتی ہے ؎

ہر ایک حادثہ کچھ روز یاد رہتا ہے
پھر اس کے بعد یہ ہوتا ہے بھول جاتے ہیں

نشتر کے اشعار اسی طرح زندگی کے نشیب و فراز کی
داستان سناتے، امید و بیم کے منظر دکھاتے ہوئے اپنی
شعری دنیا کی آبادکاری میں مصروف نظر آتے ہیں۔ جہاں
لہجے کی دھوپ سے تازگی، سبزے رین کا احساس بھی
ہوتا ہے ؎

پھر فضائیں کوئی پتنگ کٹے ۔ پھر کسی کو مرا خیال آئے
ہوا سے چادر اڑا لے گئی ۔ قبیلے کی لڑکی اٹھالے گئی

سینے سے لگاؤ گے تو پچھتاؤ گے ان کو
اسٹیج پہ کھیلے ہوئے کردار ہیں رشتے

بس منظر واضح ہو کر معنی میں اضافہ کرتا ہے، صرف ایک
شعر ملاحظہ ہو جسے اور بھی نقل کر چکا ہوں ؎

نشان قتل کے ملتے کہیں پہ گہرے تھے
پتہ نہ چل سکا قاتل کے کتنے چہرے تھے

یوں تو شاعری کیفیات اور حسیات کا دوسرا نام
ہے اور غزل حسیاتی شاعری کا آئینہ ہے۔ لیکن آج
ہم جسے غزل کی اصطلاح میں جدید حسیت کہتے ہیں
وہ سنہ ۶۰ کے بعد والی شاعری کی دین ہے۔ نشتر
کے کلام سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

جسم کی خواہشیں دھوپ میں جل گئیں
آسماں فصل کوئی اگنے نہ دے

میری تشریح کروگے تو بکھر جاؤں گا
مجھ کو الفاظ و معانی میں دبے رہنے دو۔

ایک اور بات جو مجھے ان کے یہاں اچھی لگتی ہے، وہ
ہے اپنے آس پاس کی، عام زندگی کی چھوٹی چھوٹی تصویریں
جنہیں وہ نہایت سادگی سے گفتگو کے انداز میں اپنے
قلم سے اتارتے ہیں، ملاحظہ ہو:

اپنے کئے کو تسلیم کر لو
جو سامنے ہیں سچائیاں ہیں

تہمتوں سے بھلا نہیں ہوتا
دو گھرانوں میں کیا نہیں ہوتا

کاش اک دوسرے کی سن لیتے
خون اتنا بہا نہیں ہوتا

نشتر اکبر آبادی کی تخلیقیت بکنار شعری کاوشیں
ان کے شعری مجموعے "بارش" میں اپنے حسن کے
ساتھ موجود ہیں اور ان کی فکری کاوشوں سے امید بھی
بندھتی ہے کہ آئندہ برسوں میں مزید دل کش اشعار سے
اپنی غزلوں میں اضافہ کریں گے۔

اندر سروپ سری واستوا
۷۰۔ بسوانی فتح پور۔ یو۔ پی۔ ۲۱۲۶۰۱

غزلیں

○

تنہا موسم کی ہوا کیا کرنا
زندگی شعلہ نما، کیا کرنا

رنج سے میری مرقع ہستی
غم کی مبہم فضا، کیا کرنا

چند سانسوں میں مقید ہستی
اس کو لفظوں میں ادا کیا کرنا

ہم پہ جو گذری ہے سب پر گذری
شکوۂ جور و جفا، کیا کرنا

جبر ہی جبر ہے ہر سمت یہاں
ان فضاؤں میں صدا، کیا کرنا

وقت ہے غم کا مسیحا، یارو
دل کے زخموں کی دوا، کیا کرنا

○

اک عالم سرور محبت کی طرح تھا
جلوہ تیرا، نظر میں عبادت کی طرح تھا

ٹوٹے ہوئے شیشوں کو کون جوڑ رہا تھا
انداز جنوں جسکا روایت کی طرح تھا

یہ گردش دوراں تو تھی شایان زندگی
ہر لمحہ درد و غم کا عنایت کی طرح تھا

اک موج سلسبیل مرے آنسوؤں میں تھی
اک بحر بیکنار محبت کی طرح تھا

اسرار زندگی کے عیاں رمز رمز سے تھے
جو خواب تھا آنکھوں میں حقیقت کی طرح تھا

الفاظ تھے ہونٹوں پہ کہ پر تول رہے تھے
انداز سخن اسکا شکایت کی طرح تھا

ہر غم سروپ تیرا مجھے دیتا ہے لذت
ہر لمحہ تیرے درد کا جنت کی طرح تھا

○

لوکمانیہ تلک کو خراجِ عقیدت

لوک مانیہ بال گنگا دھر تلک کی ۷۱ ویں برسی کے موقع پر یکم اگست ۱۹۹۱ء کو راجدھانی دہلی میں منعقدہ تقریب میں انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ شری ارجن سنگھ مرکزی وزیر برائے انسانی وسائل ترقیات جوکہ اس تقریب میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک تھے فرمایا کہ تلک کے نظریات کی آج بھی ہمیں ضرورت ہے۔ اس موقعہ پر تقریر کرتے ہوئے مرکزی وزیر امور داخلہ شری شنکر راؤ چوان نے فرمایا کہ ملک کی یکجہتی کی بقا کے لیے ان کے آہنی عزائم پر عمل کرکے ہی ہم انھیں بہترین طور سے خراجِ عقیدت پیش کر سکتے ہیں۔ اس تقریب کا اہتمام مہاراشٹر سنسکر دتک سمیتی نئی دہلی نے کیا۔

دیگر ممتاز افراد جنھوں نے خراجِ عقیدت پیش کیے بشمول لوک سبھا اسپیکر شری شیوراج پاٹل ڈپٹی چیرمین راجیہ سبھا ڈاکٹر (شریمتی) نجمہ ہبت اللہ، مرکزی وزیر برائے مالیات شری شانتا رام پوٹ دکھے، سمیتی کے صدر شری وسنت ساٹھے اور بے شمار ممبرانِ پارلیمنٹ موجود تھے۔

اس موقع پر لوک مانیہ تلک پرا سکول کے طلبہ کیلئے مضمون نویسی کے مقابلے میں جیتنے والوں میں انعامات تقسیم کیے گئے۔ شریمتی جیہ شری سلکھے نے اس مقابلے کا اہتمام کیا۔

ارون بونگیروار وزیراعلیٰ کے سکریٹری

شری ارون بونگیروار نے وزیراعلیٰ مہاراشٹر کے سکریٹری کا چارج لیا۔ شری بونگیروار سنہ ۱۹۶۷ء میں انڈین

شری رمیش جوبے، وزیر مملکت برائے ہاؤسنگ نے ۹ اگست ۱۹۹۱ء کو پرتیکشا نگر ٹرانزٹ کیمپ کا دورہ کیا۔ اسی موقع پر لی گئی تصویر۔

تریمبکیشور (ناسک) میں آنند اکھاڑہ کے سربراہ شری پرشوتم گیری مہاراج نے ۱۴ اگست ۱۹۹۱ء کو ناسک میں شروع ہونے والے "کمبھ میلے" کے سلسلہ میں وزیر برائے ہاؤسنگ جناب جاوید خاں سے ۹ اگست ۱۹۹۱ء کو منترالیہ میں ملاقات کی اسی موقع پر لی گئی تصویر

ایڈمنسٹریٹیو سروس (آئی اے ایس) میں شامل ہوئے۔

شری بونگیر وار (۴۸) ایک تجربہ کار اور لائق افسر ہیں۔ آپ نے ناگپور یونیورسٹی سے پوسٹ گریجویشن (ایم ایس سی) کی۔ آپ گذشتہ ۲۵ سالوں سے انڈین ایڈمنسٹریٹیو سروس میں شامل ہیں۔ اور اس دوران اسسٹنٹ کلکٹر آف رتناگیری، دھالو اور آکولہ چیف افسر آف وردھا ضلع پریشد ڈپٹی سکریٹری انڈسٹری ڈپارٹمنٹ گورنمنٹ آف مہاراشٹر منیجنگ ڈائرکٹر آف ایم ایس ایس آئی ڈی سی کلکٹر آف عثمان آباد اور ناگپور ضلع میونسپل کمشنر، پونے میونسپل کارپوریشن اور ڈیویژنل کمشنر اورنگ آباد اور پونے ڈیویژن جیسے اہم عہدے پر کام کرچکے ہیں۔ اس موجودہ عہدہ پر آنے سے قبل آپ سکریٹری ہوم (ٹرانسپورٹ، نشہ بندی اور جیل) کے فرائض کی انجام دہی میں مصروف تھے۔ بطور آئی اے ایس افسر آپ نے دہلی، حیدرآباد، احمد آباد، پونے اور لندن میں مختلف فیلڈ میں ٹریننگ حاصل کی۔ آپ نے انڈونیشیا اور تھائی لینڈ کا دورہ فیملی ویلفیئر پروگرام کی اسٹڈی کرنے کی غرض سے کیا۔

ڈیویژنل کمشنر پونے ڈیویژن آپ نے گرانقدر خدمات انجام دیں۔ دھالو، آلندی کا ڈیولپمنٹ پلان وغیرہ آپ کی قابل رہنمائی میں بنا۔ پونے ڈیویژن میں شجرکاری کی وسیع پیمانے پر مہم بھی آپ کی چلائی ہوئی ہے۔

شری بونگیر وار نے ان تمام مہم پر کامیابی کے ساتھ عمل آوری کی۔ پمپری، چنچوڑ میں شہری ضروریات کی فراہمی میں رابطہ قائم کرنے والی پربھے کمیٹی کے سلسلے میں کی گئی آپ کی کاوش ناقابل فراموش ہیں۔ شری بونگیر وار کی ہی کوششوں کی وجہ سے بال واڑی اسپورٹس کمپلیکس (نزد پونے) کا ابتدائی کام شروع کیا جا سکا۔

قانون کی اشاعت

حکومت مہاراشٹر نے لازمی اشیاء قانون ۱۹۵۵ء کے تحت مہاراشٹر شکر ڈیلرس لائسنسنگ قانون بابت ۱۹۶۳ء میں ترمیم کی ہے۔

یہ قانون اب مہاراشٹر شکر ڈیلرس لائسنسنگ (پانچویں ترمیم) قانون بابت ۱۹۹۱ء کے نام سے جانا جائیگا۔

اس ضمن میں اطلاع نامہ مہاراشٹر گورنمنٹ گزٹ غیر معمولی کے حصہ IV A مورخہ ۱۸ جون ۱۹۹۱ء کو شائع کر دیا گیا ہے۔

دی ایم پاٹل

حکومت مہاراشٹر نے پونے ڈیویژن کے ڈپٹی کلکٹر شری دی ایم پاٹل کو مہاراشٹر فلم اسٹیج اینڈ کلچرل ڈیولپمنٹ کارپوریشن ممبئی کا جوائنٹ مینجنگ ڈائرکٹر مقرر کیا ہے۔
ریاستی حکومت نے شری پاٹل کی پہلے مرحلہ پر دو سالوں تک کے لیے تقرری کی منظوری دی ہے۔

اندھیری میں دیوار گرنے کی جگہ کا رمیش دوبے نے دورہ کیا۔

وزیر مملکت برائے ہاؤسنگ شری رمیش دوبے ۱۹ر جولائی کو اندھیری کا دورہ کیا۔ اور اس مقام پر تشریف لے گئے جہاں ۱۸ر جولائی کو دیوار گرنے سے دو بچے ہلاک ہوئے تھے۔
آپ کے ہمراہ دو علاقائی کونسلر شری کرشنا شیٹی اور بھگونت راؤ پاٹل اور وارڈ آفیسر شری پوار تھے۔

روہا میں فوج میں بھرتی۔

قلابہ ممبئی کی برانچ ریکروٹمنٹ آفس ۱۲ر ستمبر کو صبح ۷ بجکر ۳۰ منٹ پر ضلع دائے گڑھ میں روہا میں پولس گراؤنڈ میں فوج میں بھرتی کا کام انجام دے گی۔

سولجر جنرل ڈیوٹی سولجر کلرک/ایس کے ٹی اور سولجر ٹکنیکل کی درخواست دینے والے وہ امیدوار جنھیں کال لیٹر موصول ہوئے ہیں انھیں آگاہ کیا جاتا ہے کہ وہ ٹیم کو رپورٹ کریں۔
امیدواروں کا اسکریننگ ٹیسٹ اور اسی دن درخواست فارم بھی جمع کیے جائیں گے۔
امیدواروں کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے ہمراہ اصل دستاویزات ساتھ لائیں زیروکس کاپیاں قبول نہیں کی جائیں گی۔

تجدیدِ خریداری کیلئے گذارش

اس شمارے سے اگر آپ کی مدتِ خریداری ختم ہو رہی ہے یا ختم ہو چکی ہے تو آج ہی آئندہ مدت کے لئے رقم خریداری بذریعہ منی آرڈر روانہ فرما دیجئے تاکہ رسالہ آپ کی خدمت میں مسلسل جاری رہے۔
بصورتِ دیگر مدتِ خریداری ختم ہوجانے کے بعد رسالہ کی ترسیل ممکن نہ ہو سکے گی۔ خریدار حضرات بطورِ خاص نوٹ فرمالیں۔ تجدیدِ خریداری کی رقم روانہ فرماتے وقت منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر (جو آپ کے پتے کی سلپ کے اوپر درج ہوتا ہے) ضرور درج فرمائیں اور اپنا نام، پتہ پن کوڈ نمبر بھی صاف صاف تحریر فرمائیں۔ (ادارہ)

خبریں۔ تصویروں میں

مہاراشٹر و گجرات کے جنرل آفیسر کمانڈنگ میجر جنرل گرکیرت سنگھ نے وزیر اعلیٰ شری سدھاکر راؤ نائیک سے حال ہی میں ودھان بھون میں ملاقات کی۔ اسی موقع پر لی گئی ایک تصویر۔

شری پرمود نولکھے نے مہاراشٹر لیجسلیچر اسمبلی کے حزبِ مخالف پارٹیوں کے لیڈر کی حیثیت سے چنے جانے کے بعد وزیر اعلیٰ شری سدھاکر راؤ نائیک سے ملاقات کی. اس موقع پر لی گئی تصویر میں شری شیواجی راؤ دیشمکھ وزیر برائے لیجسلیٹو امور اور حزبِ مخالف کے لیڈر شری منوہر جوشی بھی نظر آرہے ہیں.
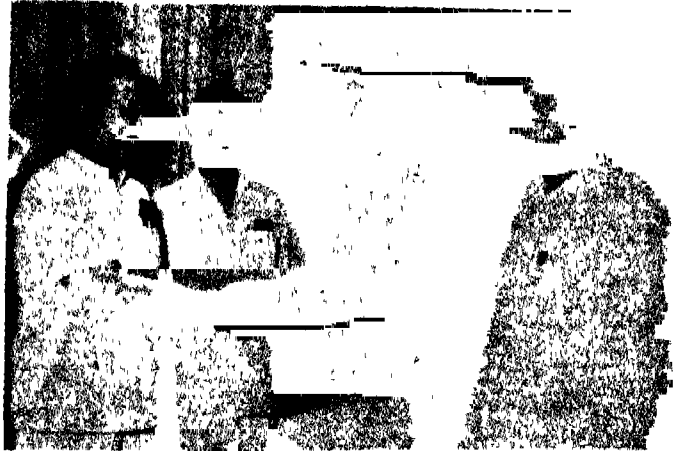
سہیوگی سیوا سنگھ کی جانب سے ضرورت مند طلبا میں مفت کاپیوں کی تقسیم کا کام بمبئی میں ۱۸ر جولائی سنہ ۱۹۹۷ء کو منروا تھیٹر میں وزیر مملکت برائے اطلاعات و رابطۂ عامہ شری ارون گجراتی کے ہاتھوں ہوا اس موقع پر لی گئی تصویر میں اس سنستھا کے صدر شری انکلیشوریہ اور سابق وزیر شری رام ناتھ پانڈے بھی نظر آرہے ہیں.

حکومتِ مہاراشٹر کے اشتراک سے سنسکرتی منڈل کی طرف سے مہاتما پھلے پر چوتھی جلد کا افتتاح وزیر اعلیٰ شری سدھاکر راؤ نائیک کے ہاتھوں ۲۹ر جولائی ۱۹۹۱ء کو ایم۔ ایل اے ہوسٹل میں منعقدہ تقریب میں عمل میں آیا۔ تصویر میں وزیر مملکت ڈاکٹر پتنگ راؤ کدم اور شری پرکاش موہے بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

بمبئی گجراتی سماج کی جانب سے آج کل ثانوی و اعلیٰ ثانوی امتحانات میں میرٹ لسٹ میں آنے والے طلبا کی اس ادارہ کی جانب سے وزیر مملکت برائے اطلاعات و رابطہ عامہ شری ارون گجراتی کے ہاتھوں ۲۶ر جولائی ۱۹۹۱ء کو حوصلہ افزائی کی گئی۔ اس موقع پر لی گئی تصویر میں وزیر مملکت ڈاکٹر پتنگ راؤ کدم، ادارہ کے سکریٹری شری ہیم راج شاہ اعد بے رام بھائی بھی نظر آرہے ہیں۔

"یوم بین الاقوامی آبادی" ۱۱ر جولائی ۱۹۹۱ء کو انٹرنیشنل انسٹی ٹیوشن سائنس دیونار میں منایا گیا۔ اس موقع پر وزیر صحت شریمتی پشپا تائی ہیرے تقریر فرما رہی ہیں۔

ماریشیس کے وزیر اعظم شری انی رود جگناتھ ۲۵ر جولائی ۱۹۹۱ء اپنے بھارت کے دورے کے موقع پر دہلی جاتے ہوئے بمبئی میں مختصر قیام کے دوران لی گئی زیر نظر تصویر میں مہاراشٹر کے چیف پروٹوکول افسر شری وینکٹ چاری موصوف کا ہوائی اڈے پر پھولوں کا گلدستہ پیش کر کے خیر مقدم کر رہے ہیں۔

موواڑ میں طوفانی سیلاب کی تباہی کا ایک منظر۔

مہاراشٹر اسٹیٹ اسمال اسکیل انڈسٹری کی جانب سے کف پریڈ ترتی موورتی امپوریم میں کپڑوں کی نمائش اور سیل کا ۳۰ر جولائی ۱۹۹۱ء کو وزیر مملکت برائے صنعت شری شیام اشٹیکر کے ہاتھوں افتتاح عمل میں آیا یہ اسی موقعہ پر لی گئی تصویر ہے۔

۱۰ اکتوبر ۱۹۹۱ء اور ۱۰ نومبر ۱۹۹۱ء (مشترکہ شمارہ)

10-10-91 & 10-11-91

قومی راج

ہندی اور مراٹھی زبان میں ہر ماہ کی یکم اور ۱۵ تاریخ کو اور گجراتی، سندھی انگریزی اور اردو زبان میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

جلد نمبر ۱۸، شمارہ ۱۹ اور ۲۰

زر سالانہ: ۱۲۵ روپے قیمت فی شمارہ: ۶ روپے

چیف ایڈیٹر:- اروِن پاٹنکر
مینیجنگ ایڈیٹر:- آر۔ جی۔ ماشیدیر
ایڈیٹر: فیروزہ فیاض خان

اس شمارے میں

بال کوی ٹھومرے

جیون دھارا

۱۸۹۰-۸-۱۳ء تریمبک باپوجی عرف بال کوی ٹھومرے کا دھرن گاؤں میں جنم۔

۱۸۹۸ — ۱۸۹۱ء ایرنڈول، یاول، جامینر، ویٹاود میں والد صاحب کے ساتھ عارضی سکونت کے دوران بچپن بیتا۔ اور مراٹھی کی تیسری جماعت تک تعلیم۔

۱۸۹۹ء ایرنڈول میں مراٹھی کی چوتھی جماعت پڑھی۔ شری دھرادر مہی پتی کی شاعری کا مطالعہ۔

۱۹۰۰ء۔ مکوئی میں منج کی رسم یہیں سے پانچویں جماعت سے فراغت۔ موروپنت کی شاعری پر تقریر — انعام ملا۔ مگر قبول نہیں کیا۔

۱۹۰۱ء۔ مضمون نگاری کا مطالعہ شرپور میں انگریزی تعلیم۔

۱۹۰۲ء۔ منوتائی عرف جی جی سے بھنڈارکر کی پہلی سنسکرت کی کتاب پڑھی۔ سرسوتی نند ناچ بھوش۔ نواپور میں پہلی نظم کی تخلیق "ون سکند"

۱۹۰۴-۵ء۔ کرشن راج بھاردواج کے بارے میں۔

سنسکرت رشاکنتل، مچھ کٹک، ڈراموں کا مطالعہ بھیاراؤ کالکر کے راشٹر پاٹھ شالہ میں داخلہ۔ سمرتی بھگت شی۔ک دیو کی پی ہی پرییٹری اسکول میں انگریزی پڑھی۔ داس بودھ کا مطالعہ

۱۹۰۶ء۔ رام چند کرشن وید اور شاعربن واسی کے ساتھ ایرنڈول سے روانگی۔ کشمیر، آگرہ، متھرا وغیرہ جگہوں پر سافری۔

ایرنڈول کے دیش کال ورتمان ہفت روزہ میں ملاس ایڈیشن — نظم کی اشاعت۔

۱۹۰۷ء۔ جل گاؤں کے پہلے کوی سمیلن (مشاعرہ) میں صدر ک۔ ر۔ کرتی کرنے بال کوی کا انتخاب بخشا ناریل اور انگوچھا دیکر عزت افزائی کی۔ (ر۔ن۔و) تلک سے تعارف۔ ماہنامہ "آنند" میں شاعری کی اشاعت

۱۹۰۸ء۔ باپوراؤ والد صاحب دیوراؤ ٹھومرے کا انتقال۔ اسودے گاؤں میں شری وی بھاجوشی کی لڑکی سے شادی۔

سنسکرت کے مطالعے کیلئے دودھ بھانڈے شاستری کے پاس ناسک کے لئے روانگی۔ رگھو یرات کا مطالعہ۔

سنسکرت رامائن پر چترا س پران ۔

ا۔ ناسک سے بڑودہ پروفیسری جی پینڈا سے
اسے انگریزی کا مطالعہ ۔ گجراتی شاعر کلاپی کی
کلاپی نو کیکارو ، کا مطالعہ ۔ گیانشوری
ے آنندی آنند گڑے ، اس شوخ نظم کی
ادر ہولی کے تہوار پر پڑھی ۔ م ۔ س اجلاس
ی گھالی بھائی ، نو کویتا ، کا انتخاب کرنے والی
سنائی ۔ شری تاتیا صاحب کونشکر ، شری
ب کیلکر ، منورنجن کے لوگ ، آنند کرتے آپٹے
بولے سے تعارف ۔ منورنجن میں شاعری مکھنی
ی ۔ کاویہ رتنا ولی میں شاعری کی اشاعت ۔

ریتلک کے گھر احمد نگر میں رہنے لگے ۔ امریکن
اسکول میں بتاریخ ۱-۱-۱۷ انگریزی
ہم میں داخلہ ۔ ڈاکٹر کرتی کر کی جانب سے ماہانہ
ہے وظیفہ ۔ شری کے ماسونالکر سے تعارف
ہ پونہ روانگی ۔

گو ندگرج عرف شری ر ۔ گ گڈکری سے تعارف
منڈل میں شمولیت ۔ اروند نظم کی تخلیق کی اور
احمد نگر میں پھر وارد ۔ ڈونیٹی اسکول میں ریتلک
ت میں ، بن واسی پھول ، نظم پر تقریر ۔ پھر پونہ
بکت میں شاعری کی اشاعت

۱۹۱ ۔ ساہتیہ اچاریہ ن ۔ چ کیلکر کی معاونت
یں کاویہ کلاپ شاعری کا مستقل عنوان شروع
، اندیل میں کسیری میں شاعری کی اشاعت ۔
کویت ، کے موضوع پر شاعرانت نے عرف
آپٹے سے بحث ۔ راستو ہنڈے میں بس گئے
لی رانی کی تخلیق ، راج پوت سردار (طویل نظم)
اور تخلیق کی شروعات ۔

۱۹۱۳ ۔ احمد نگر میں سات بھائی گلی میں جا بسے ۔
مشن اسکول میں سنسکرت اور مراٹھی کے معلم ۔
شانکر بھاشیہ کا مطالعہ ۔

۱۹۱۴ ۔ مہابلیشور میں کرشچن مشنری
کے اسکول میں پنڈت کا کام ، دھرم ویر ، نظم کی تخلیق

۱۹۱۵ ۔ ایس پی جی مشن کے ٹریننگ اسکول میں معلمی
ر ۔ ریتلک کی نظم کا انگریزی ترجمہ کرتے ہوئے ر ۔ ولسن
سے مدد ۔ شری ک ۔ م سونالکر سے ، رمائی ، کی
معلومات اور دیلار کی مکتی ۔

۱۹۱۶ ۔ پونہ چھوڑ کر نیوالی پہونچے رجنیس اداین ۔
ننگوئے اسکول کے ہیڈ ماسٹر ۔

۱۹۱۷ ۔ احمد نگر کے مشن اسکول میں پھر نوکری شریمتی
ڈبلیو ایم ہین کے مختلف شدہ سولہ کہانیوں پر سپرشٹ
چمتکار کے عنوان سے ترجمہ ۔

۱۹۱۸ ۔ رسنتا چا انو واد ، د آوامین نظموں
کی تخلیق ۔
سجا ولی نصیر آباد ریلوے اسٹیشن کے قریب ریلوے
لائن پار کرتے ہوئے ریل سے حادثہ اور دہیں موت ۔

(م ۔ ن)

ترجمہ
معین الدین عثمانی
۲۶۴۔ شاہو نگر۔ جلگاؤں ۴۲۵۰۰۱

بال کوی ٹھومبرے
کی
مراٹھی نظم

اودمبر (گلہر کا پیڑ)

اِدھر اُدھر کناروں پر ہریالی لے کر
نیلا سانولا سا چشمہ ٹیلوں میں بہتا ہے
پہاڑی سے پرے چار گھروں کا ننھا سا وہ گاؤں
جیسے ہو ہریالی کا کوئی جھمگٹ
آڑی ترچھی گزرے ہے سفید روشن پگڈنڈی
میری سبھری چراگاہوں میں !
لہروں کے میٹھے پانی پر پھیلائے تاریکی
بیٹھا لٹکائے پاؤں پانی میں گلہر کا پیڑ جیسے
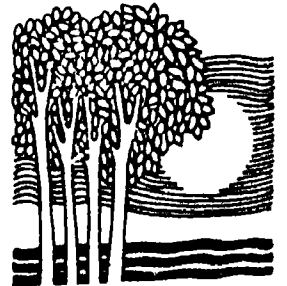
• ساغر ملک
تلولی پاڑگھا۔ ضلع تھانے (مہاراشٹر) ۴۳۱۱۰۱

مراٹھی کے ایک عظیم شاعر
بال کوی (شاعرِ اطفال)

بال کوی کا اصلی نام ترمبک باپوجی ٹھومرے تھا۔ یہ ۱۳؍ اگست ۱۸۹۰ء کو خاندیش کے ایک گاؤں دھرن گاؤں میں پیدا ہوئے۔ آج کل مہاراشٹر بھر میں ان کی پیدائش کا صد سالہ جشن منایا جا رہا ہے۔

۱۹۰۷ء میں مراٹھی کا پہلا مہاراشٹر کوی سمیلن (مشاعرہ) جلگاؤں میں منعقد ہوا۔ اس مشاعرہ میں اپنے وقت کے مشہور و معروف شعراء شرکت کے لئے آئے تھے۔ مسندِ صدارت پر ڈاکٹر کیرتی کر تشریف فرما تھے۔ اس وقت کے عظیم شاعر نا۔ وا ٹلک کی افتتاحی تقریر کے بعد ایک سترہ سال کا لڑکا اسٹیج پر آکر اپنی نظم پیش کرنے لگا۔ نظم پیش ہو رہی تھی، نہ صرف سامعین بلکہ صدر مشاعرہ بھی سراپا گوش ہو گئے۔

نظم کے اختتام پر صدر مشاعرہ ڈاکٹر کیرتی کر نے بے ساختہ اسے بال کوی (شاعر اطفال) کہہ کر مخاطب کیا اس کی اور اسکی نظم کی تعریف کی۔ ساتھ ہی اس کو ایک پگڑی دے کر اس کی حوصلہ افزائی کی۔ اسی دن سے ترمبک باپوجی ٹھومرے بال کوی کے نام سے مشہور ہوئے۔

اس نام کی جھلک ان کی اکثر نظموں میں ملتی ہے، بچہ، بچپنے ماں، ماتا وغیرہ کا ذکر ان کی شاعری میں جگہ جگہ ملتا ہے۔ ناچنا، اچھلنا کودنا، فطرت کے گن گانا، پھول، ستارے، جھرنے، ہوا اور پرندے وغیرہ سے مخاطب ہونا۔ ان سے دوستی کرنا، خوش ہونا کبھی روٹھنا اس طرح بچوں کے جذبات کا عکس ان کی نظموں پر ابھر آتا ہے۔

یہ سب باتیں سچ ہونے کے باوجود یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ وہ صرف بچوں ہی کے شاعر تھے اور انہوں نے صرف بچوں ہی کے لئے نظمیں لکھیں۔ بلکہ بڑوں کے لئے بھی خوبصورت نظمیں کہی ہیں۔ بقول شخصے "بال کوی کی نظمیں قاری کے دل پر نہ صرف اپنا نقش چھوڑتی ہیں بلکہ ایسا تاثر پیدا کرتی ہیں کہ برسوں تک قاری اس سے کھیلتا رہتا ہے۔" ان کی نظموں کے ہر مصرعے میں فطرت کے رنگ جھلملاتے نظر آتے ہیں۔ موسیقیت ان کی نظموں کی جان ہے۔

بال کوی کا مزاج سیدھا سادہ تھا سادگی ان کا وطیرہ تھا۔ ان کے یہاں خود نمائی اور خود غرضی کو بالکل جگہ نہیں تھی۔ مہاراشٹر میں بلکہ بھارت کے مختلف حصوں میں مراٹھی کا شاید ہی ایسا کوئی قاری ہوگا جو بال کوی کے نام سے اور ان کی نظموں سے ناواقف ہوگا۔

تلخیص: فیروزہ فیاض خان

بال کوی فطرت کا پجاری

ترمبک باپوجی ٹھومرے عرف بال کوی مراٹھی موجودہ دور کی شاعری کے اہم ستون ہیں جنھوں نے اپنی شاعری میں فطرت کے مناظر کی منظر کشی کی ہے مراٹھی شاعری کی تاریخ میں "شاعر فطرت" کے ناطے بال کوی کا نام ہمیشہ یاد رہے گا۔ جب دیکھا جائے تو موجودہ دور میں تقریباً تمام شعرا نے قدرتی مناظر کی عکاسی کو اپنا موضوع سخن بنایا ہے۔ لیکن کائنات اور فطرت ان دونوں کا امتزاج بال کوی کی شاعری میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

جدید مراٹھی شاعری کی تاریخ لگ بھگ ۱۰۰ سال پرانی ہے زیادہ تر شاعری پچھلی صدی میں کی گئی ہے لیکن کتنا ادب زندہ رہے گا کتنا فنا ہو جائے گا۔ یہ کہنا مشکل ہے۔ پھر بھی یہ تو کہا ہی جا سکتا ہے کہ جدید مراٹھی ادب میں کیشو سوت، گووند گرج اور بال کوی کے نام ہمیشہ زندہ رہیں گے، کیشو سوت کے بعد مہاراشٹر میں بال کوی کی جنم صدی منائی گئی۔ "کیشو سوت" کے یہاں آمد ہی آمد رہتی ہے۔ اپنی ذات کا عرفان ان کے یہاں ملتا ہے اور اس سے ایک نئے دور کا نئی شاعری کا آغاز ہوتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح گووند گرج اور بال کوی بھی مراٹھی شاعری کے "TREND SETTER" مانے جاتے ہیں۔ سو سال قبل ہندوستان میں انگریزوں کا راج تھا اسی وجہ سے حب الوطنی اور آزادی کا جذبہ لوگوں کے دلوں میں پنپ رہا تھا۔ ایسے وقت میں بال کوی کی شاعری میں فطری مناظر کی عکاسی کا نیا رجحان ملتا ہے۔ ۱۹۰۷ء میں جلگاؤں میں ایک کوی سمیلن میں ترمبک باپوجی ٹھومرے کو بال کوی کا خطاب دیا گیا۔ اس کے بعد قدرت کو شاعری میں ڈھالنے والا یہ شخص اپنی موت تک بال کوی ہی بنا رہا۔ مراٹھی شاعروں سے بال کوی نے [illegible] کیشو سوت، تلک، ذنا یک، گووند اگرج کے ساتھ ساتھ اس کا بھی نام آنے لگا۔ نئے دور کی شاعری کے پانچ ستون، مراٹھی شاعری میں امر ہو گئے۔

بال کوی کی شاعری سے ۲۰ سال قبل [illegible] بڑے پیمانے پر آئیڈیولوجیکل تبدیلی کا نتیجہ ہے اس تبدیلی کی کئی طرح شکلیں بال کوی کی شاعری میں اجاگر ہیں۔ لیکن ان سب کے باوجود بال کوی کی شاعری نمایاں طور پر ان سے الگ شکل میں دیکھی جاتی ہے اور وہ قدرت کی منظر نگاری ہے۔

انسانی زندگی دکھوں اور غموں سے بھرپور ہے۔ اسی بات کا احساس لیکن ان پر الگ سے غور و خوض کرنا ایک مشکل کام ہے بال کوی کی شاعری میں جو دکھ ہمیں دکھائی دیتا ہے وہ ان کا خود کا دکھ ہے۔ سماج کا دکھ یا سماجی مسائل کا بال کوی کی شاعری دخل گزر بہت کم ہے۔ زندگی کی مختلف خامیوں کو پُر نہیں کیا جا سکتا۔ اس بات کا بال کوی کو ہمیشہ سے دکھ رہا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انسانی زندگی خود غرضی سے معمور ہے یہی وجہ سماج میں نامساوات کی مانی جاتی ہے۔ ان کی ایک کویتا "آنندی آنند" میں

وہ کہتے ہیں کہ خود پرستی کے اس بازار میں کتنے لوگ روتے دکھائی دیتے ہیں۔ اور کمزور دفادار ہیں اور اس سکھ اور خوشی کو اس دنیا کے دکھ بھرے ماحول میں حاصل کرنا مشکل کام ہے۔ یہی وجہ تھی کہ فطرت کے مناظر کی عکاسی ان کا موضوع سخن بن گیا۔ اور انہوں نے اس سکھ کو وہاں کھوجنے کی کوشش کی۔

فطری مناظر اور انسانی زندگی کے درمیان ٹکراؤ کا انہیں افسوس تھا۔ حسن کی تلاش میں انہوں نے فطرت سے رشتہ جوڑ لیا۔ یہی وجہ ہے کہ قدرتی حسن اور اسکی بھرپور عکاسی کو انہوں نے بہت زیادہ اہمیت دی اور یہی ان کی شاعری کی بنیاد ہے۔

بال کوی جس حسن کو چاہتے ہیں۔ وہ حسن مادی نہیں بلکہ قدرت میں چھپا ہوا ہے۔ یہ حسن انہیں بادلوں جھرنوں چاند ... میں دکھائی دیتا ہے۔

۱۹۰۹ء میں منورنجن نامی رسالے میں جب ان کی کویتا "آنندی آنند گرھے" چھپی تو ان کا نام مراٹھی شاعری میں گونجنے لگا۔ تعلیم، نوکری جیسی کئی وجوہات انہیں ناسک، ارنڈول، بڑودا، مہابلیشور، پونے، میرال وغیرہ جگہوں پر لے گئیں۔ بال کوی نے پوری زندگی مالی مشکلات کا سامنا کرنے میں گزاری۔

ان کی شاعری قدرتی پس منظر اور قدرتی مناظر کی عکاسی پر مبنی ہے۔ ذاتی مسائل میں الجھے لوگوں کو بال کوی نے خوبصورتی کے بے مثال نمونوں سے روشناس کیا۔

شرادن، ماس، پھول رانی، اردن، سندھیا رجنی، نرجھراس، اور ندمیر وغیرہ نظمیں یادگار نظمیں ہیں۔ ان میں سے پھول رانی جیسی نظم قارئین کبھی نہ بھول پائیں گے۔ اس کے بعد مراٹھی میں اسی موضوع پر کئی نظمیں لکھی گئیں مگر وہ بات پیدا نہ ہو سکی۔

بال کوی انسانی جذبوں اور تجربات ان دونوں کو فطرت کے ساتھ جوڑ کر جو تجویز پیش کرتے تھے، وہ بے انکی شاعری سے اپنی شاعری میں کرتے تھے۔ مثال کے طور پر پھول رانی نظم میں اسی بات کو نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ سورج کی کرنوں میں پھول کا کھلنا ایک عام سی بات ہے لیکن شاعر نے اتنی سی بات کو ایک نازک عشقیہ داستان بنا کر بتایا ہے۔ سورج کی سنہری کرن دولہا ہے پھول رانی دلہن، دونوں کی شادی ہو رہی ہے اور ایسے وقت پر پرندے، ہوا، کرنیں، شجر تمام چیزیں اس تقریب میں حصہ لے رہی ہیں اور شبنم روپی پردہ جو پھول رانی اور سورج کے درمیان حائل ہے۔ وہ ہٹ جاتا ہے اور دونوں کا ملن ہوتا ہے۔

بال کوی کی نظموں سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ انسان کو ہمیشہ قدرت کے ساتھ دوستانہ رشتے قائم رکھنا چاہئے۔ فطرت ہنستی کھیل گاتی ہے۔ نڈر رہے۔ اور نہ ہی کسی کو نقصان پہونچاتی ہے۔ وہ صرف کھیلنا اور کھیلنا کودنا اور ناچنا جانتی ہے۔ اسی بات کو بال کوی نے ایک جھرنے کی مثال سامنے رکھ کر بتایا کہ جھرنا کس طرح ایک الہڑ بچے کی طرح کھیلتا ہے۔ بالکل بچے جیسا اور ساری کائنات میں چین ہی چین بھر دیتا ہے۔ ویسے تو بال کوی کی اکادمی تعلیم زیادہ نہیں مگر جب ان کی نظموں کو پڑھا جائے تو الفاظ کا خزانہ ہمیشہ موجود دکھائی دیتا ہے۔ بال کوی کیلئے نظمیں کہنا گویا مینا کماری کا کام ہے۔ چنندہ الفاظ اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ قدرت اپنی اصل شکل میں سامنے آ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔

اپنی چھوٹی سی زندگی میں بال کوی نے بڑی تعداد میں نظمیں لکھیں اور بہت معیاری شاعری کی ہے۔

بال کوی کا دور حب الوطنی کا دور کہا جا سکتا ہے۔ ان کے ہم عصر شعراء نے حب الوطنی پر زیادہ توجہ دی لیکن بال کوی نے اپنا دکھ، اپنی خواہش، اپنے جذبات یہ سب فطرت کو پیش کر دیا۔ پھر بھی دھرم دیر جیسی نظم حب الوطنی سے سرشار ہے۔ یہ بات سچ ہے کہ بال کوی کی شاعری نے مراٹھی شاعری کے قارئین کو بہت متاثر کیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے نثری ادب بھی چھوڑا ہے۔ جو بچوں کیلئے مخصوص ہے۔ "ودحیا" نامی ناول اور "سبھاجی فد" نامی ناٹک ادھورے رہ گئے تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ انہیں ادھورے پن سے انس تھا۔ ان کا ماننا رہا ہوگا۔ کہ ادھورا پن ہی انسانی سکھ اور خوشی کا دوسرا نام ہے۔ فطرت بھی مکمل کہاں ہے۔ مگر ہے کتنی خوش۔

(ڈاکٹر ساولے کے مضمون پر مبنی)

گوشۂ عصمت چغتائی

عصمت چغتائی ۱۹۱۱ء - ۱۹۹۱ء

★ فیروزہ فیاض خان

عصمت آپا
اردو افسانہ کی خاتونِ اوّل

یوں تو عصمت آپا کو میں اس وقت سے جانتی ہوں جب میں نے اردو میں کہانیاں پڑھنی شروع کی تھیں۔ مگر ان سے ایک طویل ملاقات ان کے گھر پر ہوئی تھی جب انھوں نے مجھے اور رام اورنگ آبادکر مرحوم کو بلایا تھا۔ اور "قومی راج" کے فلمی صنعت نمبر کے لئے مجھے ان کا انٹرویو لینا تھا۔

ہم لوگ کچھ ۵-۶ گھنٹے ان کے ساتھ رہے اور زیادہ تر وہی بولتی رہیں۔ باتوں باتوں میں انھوں نے بتایا کہ ۷۷ سال کی ہیں۔ نہ تو وہ اس عمر میں کہیں سے جھکیں تھیں اور نہ ہی تھکی تھیں۔ اتنی شگفتہ کہ جی نہیں چاہ رہا تھا اٹھنے کا مگر ایک بات کا احساس مسلسل ہوتا رہا کہ وہ کچھ CONPUSED ہیں۔ ان کی باتیں ریشم کے ان لچھوں کی طرح تھیں جو آپس میں الجھ گئے ہوں اور کسی طرح نہیں سلجھ سکتے۔

میرا مطلب تھا وہ فلم انڈسٹری سے متعلق کچھ کہیں مگر اس وقت وہ کسی اور موڈ میں تھیں اور اپنے بارے میں ہی بتاتی جا رہی تھیں۔ کہ کس طرح ان کے حسب و نسب کا سلسلہ چنگیز خاں سے ملتا ہے۔ اور انھوں نے کیسے استحصال اور جہالت کے خلاف لڑائی کی۔ اور اپنے بھائیوں کے شانہ بشانہ تعلیم حاصل کی اور انھوں نے کہا تھا،۔

" استحصال اور جہالت کے اندھیروں میں جب لوگوں کو بے دست و پا پاتی ہوں تو خود اپنے آپ پر غصہ آتا ہے اور میرے ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ اگر یہ چیزیں اب بھی زندہ ہیں تو کیا اس کی ذمہ دار میں خود نہیں ہوں؟ کیا اس میں میرا کوئی قصور نہیں؟ اور پھر میں لکھنا شروع کر دیتی ہوں۔ یہی میرے لکھنے کی بنیاد ہے۔ آزادی اور آزادی۔ یہی میرے افسانوں کی آواز ہے۔ "

زندگی بھر انھوں نے یہی کیا۔ ان خواتین کے بارے میں لکھا جو گھٹن کا، سماجی ناانصافیوں کا شکار تھیں اور محض شادی ان کا مستقبل تھا۔ "چوتھی کا جوڑا"، جسے بعد میں "گرم ہوا" کے نام سے فلمایا گیا۔

—— اردو افسانہ نگاری کا چوتھا ستون منٹو، بیدی،

کرشن چندر کے بعد ان کا نام لیا جاتا ہے۔

جب عصمت آپا نے "دنیا نہ مانے" نامی فلم دیکھی جو بیوہ کی دوبارہ شادی جیسے موضوع پر دلیرانہ اقدام تھا تو ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اور انھوں نے کہا کہ:۔ "میں نے اسی وقت سوچ لیا تھا کہ اگر میرے لئے کوئی جگہ ہے تو وہ ہے بمبئی اور جہاں میں کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کر سکوں۔ اور زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہونچ سکوں۔ وہ ہے فلمیں۔ انھوں نے بہت سی فلموں کے اسکرپٹ لکھے۔

عصمت آپا پر فحش نگاری کا بھی الزام لگایا گیا تھا۔ اور کہا جاتا ہے کہ خوشونت سنگھ جیسے صحافی نے ان کا افسانہ "لحاف" چھاپنے سے انکار کر دیا تھا اور چھپنے کے بعد ان پر مقدمہ چلایا گیا تھا۔ دراصل عصمت آپا جیسا بولتی تھیں جیسا سوچتی تھیں ویسا ہی لکھتی تھیں۔ فحش نگاری انہیں چھو کر بھی نہیں گئی تھی۔ کیوں کہ انھوں نے کچھ بھی عdsun lmeaa میں نہیں لکھا اس لئے کچھ بھی اُن کا لکھا مجھے neoulmer vulgar نہیں لگتا۔

عصمت آپا نے اردو ادب کو بہت کچھ دیا۔ اتنا کچھ کہ اس پوری صدی پر وہ حاوی رہیں گی۔ ان کے افسانوی مجموعے "چوٹیں، کلیاں، چھوئی موئی" "ایک بات" دوزخ۔ ان کے ناول۔ ضدی، ٹیڑھی لکیر، معصوم، سودائی، جنگلی کبوتر، دل کی دنیا، عجیب آدمی اور ایک قطرۂ خوں وغیرہ۔

عصمت آپا وطن پرست تھیں۔ اور سیکولر مزاج کی۔ انھوں نے باتوں باتوں میں مجھے بتایا تھا کہ ایک مرتبہ شاہد لطیف صاحب نے ان سے کہا کہ "چلو پاکستان چلتے ہیں، میں نے کہا کہ اگر زیادہ بولے تو میں ہندو ہو جاؤں گی۔"

انھوں نے مجھے بتایا تھا کہ یہاں ہمارے ملک میں، مجھے کبھی متعصبانہ رویے کی شکایت کا موقع نہیں ملا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی موت کے بعد دفن نہ کرنے کی وصیت کی۔

عصمت آپا کی دشمنی تھی اندھیروں سے انھوں نے جہاں جہاں کہانیاں لکھیں لوگوں کو کریدا محض ایک مقصد سامنے رکھ کر کہ زندگی میں اجالے ہوں اور اندھیرے ختم ہو جائیں۔ اس سلسلہ میں ان کے اقدام ہمیشہ بہت بولڈ تھے۔ اس سے قبل عورتوں نے اتنا بولڈ قدم نہیں اٹھایا تھا۔

انھوں نے مجھے بتایا تھا کہ میں نے بھگوت گیتا کا بہت گہرائی سے مطالعہ کیا۔ اور میرے نزدیک یہ دنیا کی سب سے اہم ترین کتاب ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ گیتا میں دنیا کے WISDOM کا نچوڑ موجود ہے۔

اردو کی خاتون اول افسانہ نگار آج ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں اور ان کی کمی کوئی پر نہیں کر سکتا ہے ہم قومی راج کا ایک گوشہ انہیں خراج عقیدت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

عصمت چغتائی ایک نظر میں

پیدائش :۔ ۲۱ر اگست ۱۹۱۱ء

وطن :۔ بدایوں (یوپی)

تعلیم :۔ بی اے، بی ایڈ

پہلی تخلیق :۔ فسادی (ڈرامہ) ۱۹۳۹ء مطبوعہ ساقی دہلی

مطبوعات :۔ افسانوی مجموعے، چوٹیں، کلیاں، چھوئی موئی ایک بات، دوزخ۔

ناول :۔ ضدی، ٹیڑھی لکیر، معصوم سودائی، جنگلی کبوتر، دل کی دنیا، عجیب آدمی، ایک قطرۂ خوں۔

مشہور ترین فلم اسکرپٹ :۔ گرم ہوا

فلم ساز کی حیثیت سے ان کی فلم :۔ سوسائٹی

موت :۔ ۲۴ر اکتوبر ۱۹۹۱ء

بھی ملکھا فرمان خسروی ہوگیا۔ اور اپنی زبان سے جو بھی کہا اُردو کی نثر کی شکل اختیار کرگیا۔ وہ اب بے قدیم مشرقی وضع اور خالص مشرقی طور طریقے کے گھرانے میں بھی مطلق العنان حاکم کی طرح رہیں، تو ظاہر ہے گھر کے باہر کی کھلی فضا نے ان کے عزائم اور ذہن میں کتنی جولانی اور وسعت نہیں پیدا کی ہوگی۔ ۱۹۳۰ء کے گردوپیش ہندوستانی مسلم خواتین کا لکھنا تو ایک طرف رہا پڑھنا بھی چنبھے کی بات تھی اور عصمت چغتائی نے میری معلومات کی حد تک اپنے والد محترم سے علی الاعلان کہہ دیا تھا کہ اگر انھیں مدرسے نہیں بھیجا گیا تو اچھا نہیں ہوگا۔ اور ان کے والد ماجد گو کہ ایک اعلا اور بارعب پولس آفیسر تھے، گھر کی اس بغاوت کو فرو نہ کرسکے اور عصمت چغتائی نے نہ صرف پڑھا بلکہ اس پردہ نشیں زمانے میں جس قسم کی کہانیاں لکھیں وہ مثنوی زہرِ عشق سے لذت میں کچھ کم نہیں تھیں۔ مثنوی زہرِ عشق اس زمانے میں گھروں میں شوق سے پڑھی جاتی تھی۔ لیکن سب سے عجب کہ غریب بیچاری عصمت چغتائی کی کہانیوں کی تھی۔ مرزا شوق خوش قسمت تھے کہ انھیں عدالت نہیں جانا پڑا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہوگی کہ ہمارے یہاں نثر کے مقابلے میں شاعری کو زیادہ مراعات حاصل ہیں۔ عصمت چغتائی اگر نثر کی بجائے شاعری کرتیں تو ان کا کلام بھی مستند ہوتا۔ اور سب یہی کہتے کہ اس میں کیا کلام ہے۔ عصمت چغتائی سے پتا نہیں کتنے قلم ٹوٹے اس کا حساب انھوں نے نہیں رکھا۔ گویا کہ انھوں نے کسی چیز کا حساب رکھا۔ انھوں نے لکھنے کے لیے روشنائی بھی استعمال نہیں کی۔ اپنے قلم کو بس آگ میں ڈبویا اور لکھا۔ اسلحہ ساز خنجر وغیرہ بنانے میں تو آگ بنانے میں کتنی محنت کرتے ہیں اور عصمت چغتائی نے گھر بیٹھے اپنے قلم کی نب کو اتنی آسانی سے آگ کر دیا ہے رومال کے کسنے پہ کشیدہ کاری فرمائی ہو لیکن انھوں نے اپنی تحریروں میں بیل بوٹے نہیں بنائے۔ چمکیاں نہیں ٹانکیں۔ بلکہ کچھ ایسی چیزیں رقم کیں کہ ان کی وضاحت کے لیے انھیں عدالت جانا پڑا۔ اس عدالتی کارروائی سے بھی وہ کچھ کم خوش نہیں ہیں۔ جب بھی اس واقعے کا ذکر کرتی ہیں خوشی سے پھولے نہیں سماتیں، کہتی ہیں۔ "جب ہم پر مقدمہ چل رہا تھا تو بہت اچھا لگ رہا تھا۔ جگہ جگہ ہمیں سے ملایا جاتا۔ جوق در جوق لوگ ہمیں دیکھنے آتے۔ اسٹیشنوں پر، ہوٹلوں پر، سڑکوں پر اور عدالت کے احاطوں میں لوگ ہی لوگ ہوتے اور ان سب کی توجہ کا مرکز ہم ہوتے — ویسے تو یہ کہنے میں بھی تکلف نہیں کرتے کہ ہاں ہاں ہم نے گالیاں بھی کھائی ہیں تو کیا ہوا۔ گالی کھانا کوئی بری بات تھوڑے ہی ہے اور ان گالیوں کا نتیجہ کیا نکلا؟ عدالت نے ہمیں صاف بری کر دیا۔" ان کی گفتگو اور طرزِ بیان سے تو کوئی بھی سننے والا یہی محسوس کرے گا کہ وہ عدالت کے فیصلے سے مطمئن نہیں ہیں اور غالباً وہ چاہتی تھیں کہ عدالت واقعی انصاف کرتی۔ محترمہ نے کچھ ایسا ہی مزاج پایا ہے انھیں آج تک معلوم ہی نہیں ہوسکا کہ وہ چاہتی کیا ہیں۔ ابھی ابھی انھیں مدھیہ پردیش حکومت کا قابلِ قدر ایوارڈ اقبال سمان ملا تو انھیں شکایت یہ پیدا ہوئی کہ یہ لوگ ایوارڈ وغیرہ کیوں دیا کرتے ہیں۔ ہم نے جو کچھ لکھا اپنے لیے لکھا۔ اپنے لیے کیا۔ اُن سے کیا لینا دینا ہے۔ بھوپال جانے کے تعلق سے بھی کچھ ایسی ویسی بات کی اور دریافت فرمایا کہ بھوپال کیسے جایا جاتا ہے۔ اور جب بھوپال گئیں تو ایک اسٹیشن آگے جاکر اتریں۔ وہ وقت سے ہمیشہ آگے ہی رہیں —

کچھ دن پہلے، میں نے اپنی نادانی کی بنا پر انھیں حیدرآباد آنے کی دعوت دی۔ بے حد خوش ہوگئیں۔ کہنے لگیں "ہاں ہاں حیدرآباد ضرور چلوں گی۔ برسوں ہوگئے وہاں گئے۔ عطاالرحمٰن اور فضل الرحمٰن سے ملوں گی۔ میرے تو وہاں اور بھی کئی لوگ ہیں جیلانی بانو کے ہاں ٹھہروں گی۔ انھیں فون کر دوں گی یا تم فون کر دینا، پیسے مجھ سے لے لینا وغیرہ۔" مجھے تو ان کی باتیں سن کر تعجب ہونا ہی تھا کہ یہ اتنی آسانی سے حیدرآباد جانے رضامند کیسے ہوگئیں۔ حد یہ ہوگئی کہ انھوں نے فرمایا میں ٹرین ہی سے چلوں گی۔ اور میں نے انھیں دو تین دن بعد بتایا کہ ٹرین سے ان کا ریزرویشن ہوگیا ہے تو بگڑ گئیں۔ بگڑ گئیں باضابطہ بپھر گئیں۔ پوچھا آخر میں وہاں کیوں جارہی ہوں۔ کسی دعوت تو دی نہیں ہے۔" میں نے کہا زندہ دلانِ حیدرآباد نے مجھے منتخب کرایا۔ اب مجھے آپ سے کیا چھپانا ہے کہ یہ سن کر انھوں نے فرمایا۔ "تم کون ہوتے ہو لے جانے والے۔ کیا میں آم کے اچار کی ہنڈیا ہوں کہ جو چاہے مجھے اٹھا لے جائے۔" میں نے لاکھ کہا کہ آپ کے کہنے ہی پر تو ریزرویشن ہوا ہے۔ صاف مکر گئیں کہ میں نے ایسا نہیں کہا تھا، اور میں ٹرین سے کیوں جاؤں۔ ٹرین تو بہت ہلتی ہے۔ یوں بھی اور میں نے عرض کیا کہ ٹرین تو پرسوں بھی ہلتی تھی جب آپ نے اسے سفر کے لیے پسند کیا تھا۔ بولیں "کچھ بھی ہو میں حیدرآباد نہیں جاؤں گی۔" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا کہ وہاں عطاالرحمٰن اور فضل الرحمٰن۔ فرمایا "میں بعد میں کبھی چلی جاؤں گی۔ مجھے کوئی جلدی تھوڑی ہی ہے کہ۔" میرے علم میں تو کوئی ایسا واقعہ نہیں ہے کہ عصمت چغتائی کو کسی نے کبھی جواب دیا ہو۔ اگر کسی نے جواب دیا ہے تو بس ان کے حافظے نے دیا ہے۔ اب تو وہ اپنی عمر بھی دو چار زیادہ بتلانے لگی ہیں۔ رہیں "انشر" کی لیکن کہتی ہیں کہ بہ خدا ہی کی موگئی ہوں۔ جب ان کی ہوں گی یقیناً کہیں گی کہ میری سچری ہوگئی ہے لیکن یوں نہیں چاہے گا کہ وہ سچری مکمل کریں۔ حال میں انھوں نے ایک اہم فیصلہ کیا ہے۔ وہ یہ کہ آئندہ وہ اپنی عمر آگے ہو کر لکھوایا کریں گی۔ ڈرتی ہوں گی کہ معلوم نہیں کس خط میں کس ایوارڈ کی اطلاع آجائے۔

ان کے بارے میں تو اتنی باتیں کہی جا سکتی ہیں کہ ڈھیر لگ جائے حالانکہ میں جانتا نہیں ہوں، تاہم دو تین باتیں سن لیجیے۔ عصمت چغتائی کا حیدرآباد سے دیرینہ تعلق ہے۔ ان کے ایک بہنوئی سراج الدین صاحب منصف تھے اور یہ پہلی مرتبہ جب حیدرآباد آئیں تو اپنے بہنوئی ہی کے گھر کاچی گوڑہ میں ٹھہریں۔ اور یہ اتفاق ہے کہ سراج الدین مرحوم کے دو کلاں کے تعلقات تھے وہ اس طرح کہ مرحوم اپنے زمانۂ ملازمت میں اور زمانۂ طالب علمی میں میرے وطن جالنہ بھی برسرِ کار رہے۔ اور مجھے بحیثیت مخبر وہاں آنے جانے کا موقع ملا۔ یہ غیر ضروری تفصیل اس لیے درمیان میں آگئی کہ میں فرحت اور اطمینان کے ساتھ بیان کرسکوں کہ محترمہ عصمت چغتائی سے مجھے اس نیاز حاصل ہوا، جب اس صدی کی چوتھی دہائی کی شروعات تھی۔ انھیں حیدرآباد کے ایک قدیم ہوٹل پر گاندھی میں استقبالیہ دیا گیا۔ سنہ ہوگا ۴۳ یا ۴۴ء۔ اس زمانے سارے ہندوستان میں بالعموم اور ریاست حیدرآباد میں بالخصوص سخت گوشے پردے کا رواج تھا۔ بلکہ اس کا اہتمام اور اس کے ساتھ ساتھ احترام کیا جاتا تھا۔ حیدرآباد کی تو گائے بھی پردے کی عادی تھیں۔ اور مردوں کی گائے کی کمائی زیادہ تر اسی نعمت غریق تھی لیکن اس رواج کی پابندی میں خود مرد بھی اپنی نگاہیں نیچی رکھا کرتے تھے حوصلے ان کے بلند تھے) جب لال ٹیکری پر موتو ہوٹل میں عصمت چغتائی بے حجاب انھوں نے بڑی فراخ دلی کے ساتھ مردوں کی طرف اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھا کمزور دل مرد مارے حجاب کے کٹ کٹ گئے، حیدرآباد میں یہ ان کی اولین رونما اولین کا لفظ شاید یہاں زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ رونمائی تو پہلی ہی اولین ہے۔ (میں واپس لیتا ہوں) عصمت چغتائی نے اس محفل میں وہی کیا جو نپولین نے روم میں

دہ آئیں دیکھا اور محفل کو نذر کر لیا۔ بنولین کے تعلق سے جو کچھ مشہور ہے ممکن ہے
لنے کا عنصر شامل ہو۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ مبالغے سے مبرّا ہے۔ قلی قطب شاہ
ں مبالغے کا رواج کم ہی ہے۔
ئی میں تو ہر محفل کی خاتون لوٹ رہی ہیں۔ اور ہر محفل میں ادب میں فحاشی اور عریانی
بنی اس رائے کا اظہار کرتی ہیں، جسے لوگ دلچسپی سے اس لیے سنتے ہیں
ہی رائے مختلف پیرایوں میں بیان کرتی ہیں۔ اور یہ رائے ہمیشہ نئی معلوم ہوتی
ابھی ابھی حال میں انھوں نے ایک افسانوی نشست کی صدارت کرتے ہوئے
کی تائید میں کہا کہ قدرت نے ہمیں قمیص پاجامہ پہنا کر نہیں پیدا کیا ہے۔

ب میں آپ سے کیا عرض کروں کہ انھوں نے ایک مرتبہ یہ بھی کہا کہ میں نے
فلیٹ حاصل کرنے کے لیے کی تھی۔ کیا کرتی، اکیلی تھی کوئی مجھے اپنا فلیٹ کرایے
کے لیے تیار ہی نہیں ہوتا تھا۔ اسکول انسپکٹرس تھی جس سے مکان
تی وہ انکار کر دیتا۔ عجیب عجیب مفروضات کا سہارا لیتا۔ مجھے مجبوراً شادی
، میں نے کہا جانے دیجیے۔ مرد بھی تو اسی مجبوری کی وجہ سے شادی کرتے ہیں۔
زمانہ ہی خراب آگیا ہے۔

ب مرتبہ معلوم نہیں ان کے جی میں کیا سمائی مجھے کھانے پر بلا لیا اور کہا
ساتھ آنا۔ کھانے پر بیٹھے تو خیال آیا آج تو ہماری حیثیت مہمان کی ہے۔
اچھی باتیں کریں گی۔ ایک ہی ثانیے میں یہ غلط فہمی دور ہو گئی۔ ڈانٹ
ب دیکھ کیا رہے ہو۔ کھاؤ میں خاطر داری نہیں کروں

ــــ عصمت چغتائی کسی کو خاطر میں لاتی ہی نہیں ہیں۔ وہ اُردو کو بھی کب
تی ہیں۔
ہر جی چاہتا ہے کہ انھیں ادب کی مدر ٹریسا کہوں۔ لیکن اب تو میں اُنھیں
ریہ کہہ چکا۔ کہا تو کون ہے لیکن آخر یہ تو کہوں کا ... ۔

جستہ:۔

ت چغتائی اپنی عمر کی سنچری مکمل نہیں کر سکیں۔
تنہائی راہ میں حائل ہو گئی۔ وہ بہت دلیر
تھیں۔ عمر بھر نہ کبھی گھبرائیں نہ کہیں جھجکیں۔
ئی برسوں سے انھوں نے کچھ لکھا بھی نہیں تھا
ان کے قلم کی ساری جولانی، دلکشی اور دلربائی
چہرے پر اور زبان میں سمٹ آئی تھی۔ انہیں
عزاز کے ایک جلسہ میں جب اپنے حالات
بیان کرنے لگیں تو انہیں وقت کا احساس

نہیں رہا۔ اور جب ان سے کہا گیا کہ "آپ تھک
گئی ہیں۔" تو انہوں نے بڑی تمکنت اور طمطراق
سے کہا "میں نہیں تھکی ہوں ـــ تم تھک گئے ہو۔"
وہ زندہ دل تھیں اور آنی کہ "برجستگی" ان کے
آگے ہاتھ جوڑے کھڑی رہتی تھی۔ آخر عمر میں ان
کا کلیجہ آگیا تھا۔ ان کی والدہ کی طرف سے جرات
کے ذہن و قلب کے دروازے پر آ کر دستک دیتی
رہتی تھیں۔ اس بات کا اعلان انہوں نے کئی مرتبہ
کیا تھا اور آخرکار ۲۰ اکتوبر سنہ ۱۹۹۱ء کو اس
آواز اور اس شکل کی تلاش میں خود کھو گئیں۔
ان کی والدہ نے انہیں یقیناً آغوش میں بھر لیا
ہوگا۔
عصمت چغتائی اولادِ نرینہ سے محروم رہیں لیکن
ان کی ساری تصانیف اولادِ نرینہ ہی تو ہیں۔

قارئین سے گذارش ہے کہ

○ دفتر سے خط و کتابت کرتے وقت "حوالہ نمبر" ضرور تحریر فرمائیں۔ جو آپ کے خط یا رسالہ کے ریپر کے اوپری حصہ پر درج ہوتا ہے۔
● جواب طلب امور کے لئے جوابی خط، لفافہ یا ڈاک ٹکٹ روانہ فرمانے کی زحمت نہ فرمائیں۔ ادارہ کی طرف سے ہر خط کا جواب روانہ کیا جاتا ہے۔
● منی آرڈر کوپن پر (منی آرڈر فارم کے نچلے حصہ میں) ہمیشہ اپنا پورا نام اور پتہ، پن کوڈ نمبر کے ساتھ صاف صاف اردو، مراٹھی، ہندی یا انگریزی میں ضرور تحریر فرمائیں۔ صرف دستخط سے نام اور پتہ کا علم نہیں ہوتا۔

ـــــ (ادارہ) ـــــ

فیاض رفعت

کچھ عصمت آپا کے تعلق سے

تقسیم وطن سے قبل جن افسانہ نگاروں کے مقام اور مرتبے کا تعین ہو چکا تھا ان میں سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، ممتاز شیریں، اور عصمت چغتائی کے نام نہایت اہم اور ممتاز ہیں۔ اور ان سبھی افسانہ نگاروں نے "انگارے" کے فنکاروں سے خوشہ چینی کی تھی۔ جن میں احمد علی، سجاد ظہیر، رشید جہاں نے بالخصوص ترقی پسند افسانے کو ایک نئی جہت اور نئی سمت عطا کی، ان کے یہاں ایک خاص طرح کی تلخی اور زہرناکی تھی۔ ان کا بنیادی مقصد سماج کی فرسودہ بناوٹی قدروں پر وار کرنا تھا۔

عصمت آپا نے اردو کہانی کے ان عظیم معماروں سے کردار نگاری اور شخصیت سازی کا فن تو سیکھا ہی ساتھ ہی ساتھ ان کی کرافٹ (CRAFT) کو بھی اپنی روح میں اتارا۔ مگر انھوں نے اپنی فن کی چھینی سے جو بت تراشے ان کا رنگ و روپ جداگانہ تھا۔ زندگی سے جن کرداروں کو انھوں نے منتخب کیا وہ بظاہر عمومی اور غیر اہم کردار تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کرداروں کے اندروں میں حزن و ملال، محرومی و تشنہ کاری کی ایک ایسی دنیا آباد تھی جو قاری کے ذہن و دل میں نشتر کی طرح اتر جاتی تھی۔ متوسط اور نچلے متوسط طبقے کی اس محرومی اور تشنہ کامی نے عصمت آپا کی آرٹسٹک سنسیبلٹی کو بے حد متاثر کیا تھا۔ جہاں تک اظہار کے سانچوں کا تعلق ہے عصمت آپا کی بولی ٹھولی ان کا محاورہ اپنے کہانی کاروں سے نہ صرف مختلف تھا بلکہ کہیں کہیں بہت زیادہ بولڈ بھی تھا۔ ان کے کردار جو زبان اوڑھتے پہنتے ہیں وہ ان کا فطری جامہ ہے جسے تراشنے خراشنے کا کام ایک ماہر فنکار نے کیا ہے جو ان کا مزاج آشنا ہی نہیں رمز شناس بھی ہے۔ جس نے گہرائی تک ان کی روح میں جھانکا ہے۔

مغربی یوپی اور اس کے گرد و نواح میں بولی جانے والی زبان کو عصمت آپا نے اپنے افسانے کا میڈیم بنایا ہے

اس زبان کا بنیادی خمیر گنگا جمنی تہذیب سے اٹھا تھا۔ اس زبان میں جو افسانوی مکالمہ تخلیق کیا گیا اس میں دلی کی ٹکسالی زبان کا تڑکا تھا۔ یہ کہا جانا اپنی جگہ بالکل صادق ہے کہ ساقی کے شاہد احمد دہلوی نے عصمت آپا کے افسانوی محاورے کو زندگی کی تابانی اور رخشندگی بخشی تھی۔ اور پھر گھر میں عظیم بیگ چغتائی جیسے ان کے بڑے بھائی جیسا ناول نگار، جو متوسط طبقوں میں آرائش محفل کی طرح ہاتھوں ہاتھ لیا جا رہا تھا۔

عصمت آپا کا باغی ذہن ان کے گھر سے عطا ہوا تھا۔ سماج میں رائج بوسیدہ قدروں نے عورت کو پیر کی جوتی سے زیادہ

لائق توجہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ مرد کی غلامی اس کا مقدر قرار دی گئی تھی اسے سات پردوں میں قید رکھا جاتا تھا۔ اور اس کی حیثیت ایک غلام سے زیادہ نہیں سمجھی جاتی تھی۔ عہد وسطیٰ کی اس خام سکار گندگی سے ذہنیت کو آشکارا کرنے کیلئے عصمت آپا نے قلم سے تلوار کا کام لیا۔ اور مردوں کی بالا دستی کے پرخچے اڑا کر رکھ دئے۔ عصمت آپا نے ایسے باغی کردارِ نسوانی خلق کئے جو تابعداری اور غلامی کی زنجیروں کو توڑ دینا چاہتے تھے۔ مرد اور عورت کے بیچ صدیوں سے جاری و ساری اس آویزش، اس تصادم اور ٹکراؤ کی فضا میں عصمت آپا کی عورت مغلوب نہیں ہونا چاہتی اس لئے عصمت آپا کے کردار ٹائپ (TYPE) کردار نہیں۔ وہ شخصیت کے کسی ایک سانچے میں قید نہیں۔ ان کرداروں کو اپنی پیوندکاری سے بھی گریز ہے۔ یہ فطری کردار ہیں۔ جو زمانے کی آندھیوں کے باوجود کسی ایک مخصوص فریم میں ڈھلنا نہیں چاہتے وہ کائنات کی آزاد فضا کے باسی ہیں۔ وہ زنجیروں کے قیدی نہیں۔ وہ اپنی شخصیت کی حد بندیوں سے نکل کر آزاد فضاؤں میں اپنی ایک نئی دنیا تعمیر کرتے ہیں۔ انھیں جس جنت کی تلاش ہے وہ ان کی شخصیت کے اندرون میں اگی اور پروان چڑھی ہے۔ ساختیاتی اعتبار سے عصمت آپا کے کرداروں کا ڈھانچہ عمومی ہو سکتا ہے مگر ان کے باطن کی تعمیر و تخلیق باغیانہ روش پر ہوئی ہے۔ یہ آئیڈیل کردار نہیں جو روایتی اردو فکشن کا مزاج رہے ہیں۔ ان کی تخریب ہی میں ان کے تعمیر کا راز مضمر ہے۔ بقول وزیر آغا عصمت کے کرداروں کی بنیادی جہت کو لیجئے۔ جو ایک طرح کی بغاوت، توڑ پھوڑ یا کم از کم ایک منضبط سماجی یا نفسیاتی پیٹرن (PATTERN) سے انحراف کی صورت ہے۔

عصمت آپا اپنی اصل زندگی میں بھی اظہار و ابلاغ کی حد تک ایک باغی خاتون تھیں۔ وہ مرد کے تابع نہیں رہنا چاہتیں۔ وہ مرد کو اپنے سے اعلیٰ و ارفع تو خیر کبھی مانتی ہی نہیں تھیں۔ موقع ملتے ہی وہ اس کی تذلیل پر بھی اتر آتی تھیں۔

جولائی ۱۹۸۴ء کی بات ہے۔ راجندر سنگھ بیدی صاحب فراش تھے۔ میں نے عصمت آپا سے عرض کیا، چلئے بیدی صاحب کی طبیعت پوچھ آئیں۔ کچھ باتیں بھی کریں گے۔ آپ سے ان کی قربت رہی ہے۔" فوراً تیار ہو گئیں۔ بیدی صاحب اپنی شدید علالت کے باوجود بیحد محبت اور گرمجوشی سے ملے۔

عصمت آپا نے بات شروع کی۔ بیدی کی کہانیوں پر بات آئی تو عصمت آپا نے ایک سوال اٹھایا۔ وہ جاننا چاہتی تھیں کہ بیدی کے افسانے میں عورت کا کردار زیادہ قوی اور طاقتور کیوں ہے؟

بیدی صاحب نے سوچتے ہوئے کہا۔

"عورت کا استحصال ہوا ہے، اسے کچلا اور دبایا گیا ہے، وہ ظلم سہتی ہے اور خاموش رہتی ہے، مرد کی خوشی کیلئے اسے اپنا جسم دیتی ہے اس کے بچوں کو پروان چڑھاتی ہے۔ جھڑکیاں کھا کر بھی اس کی دلجوئی کرتی ہے۔ ...."

عصمت آپا نے بیدی کی بات کو بیچ سے لپک لیا۔

"مرد کا کردار تو ضمنی حیثیت رکھتا ہے، کوکھ ہری کرنے سے مرد بڑا کہاں ہوتا ہے۔ تخلیق کا کام تو عورت کرتی ہے، پیٹ میں بچہ کسی کا ہو اس سے کیا فرق پڑتا ہے، بڑی بات تو بچے کو نو مہینے تک پیٹ میں رکھنا ہے۔"

"عورت کو بڑا میں مانتا ہوں پر اسکی تکمیل مرد کے بغیر ممکن نہیں۔"

"ارے چھوڑو بیدی یہ کیا بکنے بیٹھ گئے، عورت ہر اعتبار سے اپنے آپ میں مکمل ہے اور مرد کی حیثیت ضمنی اور محض ضمنی ہے۔"

یہ مکالمہ ضبط تحریر میں لانے کا مقصد محض یہ ہے کہ عصمت آپا کی شخصیت اپنی تمام تر انفرادیتوں کے باوجود کہیں کہیں سے مجروح اور نا آسودہ شخصیت تھی۔ شاید اسی پس منظر میں تشنہ کام محروم و محزون شخصیت کے ادھورے پن کی تکمیل کے متوسط طبقہ کی عورت کی کچلی ہوئی شکست خوردہ شخصیت کو توانائی عطا کرنے کی خاطر ایسے ٹیڑھے ترچھے کردار تراشے جن کی بنیادی پہچان ان کی جنون خیزی اور ابنارملٹی ABNOR MALITY مل جاتی ہے۔ غالباً اسی بنا پر یہ کردار اپنی منفرد انا کی تسکین کیلئے کسی بھی ڈرامائی سچویشن کو جنم دینے کیلئے تیار نظر آتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ فنکار کی شخصیت کی پیچیدگی اسے فنی تجزیوں کے پل صراط سے گذارتی ہے اور وہ مکمل حقیقت کو پانے کی جستجو میں نت نئے تجربے کرتا رہتا ہے۔ کہ اس طور اس کی آدھی ادھوری شخصیت کی تکمیل بھلے نہ ہو پائے تسکین ضرور ہوتی رہتی ہے۔

عصمت آپا اپنے ڈرامہ فسادی سے ادبی دنیا میں متعارف ہوئیں ان کا یہ ڈرامہ ۱۹۳۹ء میں "ساقی" دلی میں شائع ہوا تھا۔ ۱۹۳۹ء میں جس فساد کی بنیاد انھوں نے ڈالی تھیں اس کی چنگاریاں مرتے دم تک پر تصنع سماج کی زبوں حال قدروں کو خس و خاشاک کی طرح جلاتی رہیں۔ ان کا ناولٹ ضدی بھی ان کے مزاج کی نمائندگی کرتا ہے۔ "ٹیڑھی لکیر" ان کا ایک اور ناول ہے جس سے عصمت آپا کی ٹیڑھی شخصیت مترشح ہوتی ہے۔ عظیم بیگ چغتائی پہ لکھا گیا ان کا خاکہ "دوزخی" اپنی بے باک شعلگی اور سفاک بیانی کے لیۓ اردو ادب میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔
اسی طور ان کی سٹر بار کہانیاں "لحاف"، "اچھوتی کا جوڑا"، ننھی کی نانی، گیندا، چڑی کی دکی، امربیل" اردو قاری کو خواب میں بھی چونکاتی رہیں گی۔

کچھ بھی کہیئے اردو ادب اور بالخصوص اردو افسانے کی آخری روشن قندیل بھی بجھ گئی۔ عصمت آپا اپنے آپ میں انجمن بھی تھیں اور انجمن ساز بھی۔ بیحد محبت کرنے والی خاتون جو نئے پرانے سبھی طرح کے ادیبوں شاعروں کی دل نواز دوست اور رفیق تھیں شاید لطیف کی زندگی تک عصمت آپا کی ادبی محفلوں میں کرشن بیدی، مجروح، سردار، کیفی، شیام کرشن نگم، ساحر، غلام رسول زنزو اور رام ارنگ آبادکر شامل ہوتے رہے۔
ابھی گذشتہ برس تک وہ خوب چونچال تھیں، ادبی اجتماعات میں باقاعدگی کے ساتھ شریک ہوتی تھیں۔ کشاں کشاں ریڈیو اسٹیشن بھی چلی جاتی تھیں گذشتہ سال انھیں مدھیہ پردیش سرکار نے اقبال سمان سے نوازا تو بھوپال تشریف لائے تھیں۔ میں ان دنوں وہیں تھا۔ آل انڈیا ریڈیو کی جانب سے انھیں انٹرویو کیلئے مدعو کیا گیا۔ سلطانہ جعفری اور سفینہ فرحت کی معیت میں تشریف لائیں۔ ایک طویل گفتگو ریکارڈ کی گئی۔ عصمت آپا اپنے اسٹائل میں ہنسی بولتی رہیں اور مرد ذات کو گالیاں دیتی رہیں۔ غالباً ریڈیو پہ یہ ان کی آخری بات چیت تھی۔
بمبئی پوسٹنگ ہونے کی میں نے انھیں ٹیلی فون پر اطلاع دی کھنک دار آواز میں بولی "میں تو گھر پہ ہی رہتی ہوں۔ کبھی بھی گھر آجاؤ"۔ میں نے عرض کیا "مجھے پہچانا بھی یا نہیں" کہنے لگیں لو میں اور تمہیں نہیں پہچانوں گی! اپنے رفعت سروش ہو نا" میں بھی ہنستا رہا۔ میں نے تردید نہیں کی اور فون رکھ دیا۔ کسے پتہ تھا کہ یہ ان سے آخری گفتگو ہے۔ اللہ کے کام اللہ ہی جانے۔ مرتے وقت عصمت آپا کی عمر تقریباً اسی برس تھی۔ ان کی آخری وصیت کے مطابق انھیں نذر آتش کیا گیا کہ یہ بھی اپنے آپ میں جداگانہ روش تھی۔

ضروری گذارش :-

مضمون نگار حضرات سے خصوصی گذارش ہے کہ مسودہ صاف اور خوش خط تحریر میں روانہ فرمائیں اور کاغذ کے صرف ایک ہی طرف۔ زیروکس یا کاربن کاپی ہرگز نہ بھجوائیں۔ گذارش اس لیے ضروری ہے کہ نظر ثانی اور تصحیح میں دشواری نہ ہو اور غلطیوں کا امکان نہ رہے۔ مسودہ سپرد ڈاک کرنے سے پہلے نظر ثانی کرلیں اور مضمون کے آخر میں اپنا نام اور پتہ پن کوڈ نمبر کے ساتھ لکھنا نہ بھولیں۔ (ادارہ)

• ایم جمال علوی
شیانہ ۹۹/۲۹۹ پرانا نخاس
لکھنؤ ۳

آپا اور فحش نگاری

. صحیح معنوں میں عصمت آپا سے میرا تعارف ۴۲ سال قبل
ن گورکھپوری نے جنھیں ہم جبراً شیام کشن نگم صاحب کے یہاں
ا آئے تھے، بڑے ہی والہانہ انداز میں کرایا تھا۔" اس
تفصیلی ملاقات میں میرے اوپر ان کا کچھ بہت اچھا تاثر مرتب
سکا کیوں کہ فراق سے بحث میں ان کی بے جا ضد اور اپنی بات
حال اونچا رکھنے اور منوانے کا جذبہ، ان میں اتنا شدید تھا کہ
، سے فریقین کسی طرح بھی قائل و معقول ہونے نظر آتے نہیں
ہے تھے۔ تاویلات اور اقوال کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا جو بحر ذخار
رح رواں تھا۔ اس بحث میں یہ ناچیز بہرحال فراق کا ہمنوا
۔ دو گھنٹے کی گرما گرمی کے بعد فراق کو ہی قدرے مصالحتی
اختیار کرنا پڑا اور بحث ادھوری رہ گئی۔ موضوع تھا اردو
موجودہ رسم تحریر جسے دیوناگری میں تبدیل کردینے کی عصمت
پرزور پیش پیش تھے۔ اس موضوع پر ان کی تحریر کافی بعد
منظر عام پر آئی اور اس پر شدید عوامی ردعمل بھی ہمارے
سامنے آیا۔

بہرحال، آپا ایک نہایت باوقار، سمجھدار اور حوصلہ مند خاتون تھیں
علی گڑھ کے تعلیمی ماحول کی گریجویٹ مرزا عظیم بیگ چغتائی
بہن اور شاہد لطیف کی بیگم تھیں۔ ان کا پہلا افسانہ "فسادی"
۱۹۳۸ء میں "ساقی" میں شائع ہوا تھا۔ جو کچھ لکھتی تھیں، وہی کہتی
اور منوانا بھی چاہتی تھیں۔ بولنے میں الفاظ کا سلیکشن بے حد سلیقے اور
ناپ تول کر کرتیں اور پھر اپنی رائے کو حرف آخر قرار دینے کے لئے
ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتیں اور سامنے والے کا بولنا مشکل کر دیتیں۔

ان کا شمار ان حسینوں میں کیا جا سکتا تھا، جو چہرے کے ساتھ
ساتھ دل کے بھی خوبصورت ہوتے ہیں۔ کھلتا ہوا گیہواں رنگ، موتی
سے چمکدار دانت، پتلے پتلے پان کی لالی سے ملوث ہونٹ، بھرے
بھرے گال، چھوٹی لیکن آگے سے کسی قدر پھیلی ہوئی ناک، دوہرا
جسم، قدرے طویل، اعضا متناسب، سر پر ہمیشہ الجھے بالوں کے
ساتھ، زندگی کے مسائل سلجھاتی ہوئی، تیز اور کھنکتی ہوئی آواز
دوسرے کی دلی کیفیات کا تحقیقی انداز میں معائنہ کرتی ہوئی
آنکھیں جن پر سونے کے فریم کی عینک، خوبصورتی اور ان کے
وقار میں اضافے کا باعث بن کر، ان کے چہرے کا ایک حصہ معلوم
ہوتی تھی۔ ساری اور بلاؤز پر مشتمل بے حد سادہ لباس، ان کی
نفاست کا مظہر، زیور اور آرائش سے کوسوں دور، چہرے
پر مسکراتی ہوئی متانت سجائے، صرف گھر میں ایک سگھڑ گرہستن
اور سینے پرونے میں مشغول، گھر سے باہر قطعی مختلف، زود نویسی
کا یہ عالم کہ لکھیں تو لکھتی چلی جائیں اور نہ لکھیں تو مہینوں قلم کو

ہاتھ نہ لگائیں، معاوضہ کی جانب سے قطعی لاپرواہ ہاں روپیہ پیسہ سے بے نیاز — یہ تھیں عصمت چغتائی جو دوستوں میں آپا کے نام سے مشہور تھیں۔

افسانے میں جنسیت کے دخول اور اسی موضوع پر بڑی بے باکی سے قلم اٹھا کر وہ شہرت کے بام عروج سے دوچار ہوئیں لیکن حقیقتاً زندگی کا شاید ہی کوئی گوشہ ہو جس پر انہوں نے قلم نہ اٹھایا ہو۔ اپنے اوپر لگائے گئے فحش نگاری کے الزامات کے جواب بھی بڑی متانت سے اور کبھی بے حد جل کر دیا کرتیں۔ اس ضمن میں ان کی ایک نفسیاتی توجیہہ ملاحظہ فرمائیں۔

"یا اللہ یہ فحش نگاری کیا ہوتی ہے۔ ہماری ایک خالہ تھیں جو کمسن لڑکیوں کو ہر وقت ڈھنگ سے دوپٹہ اوڑھنے کی تلقین کیا کرتی تھیں۔ ذرا سا دوپٹہ ڈھلکا اور ان کی آنکھوں میں خون اترا، کچھ میں نہیں آتا تھا۔ کہ وہ اس خاص حصۂ جسم سے کیوں جلتی تھیں۔ معلوم ہوا کہ محترمہ چونکہ نہایت مرجھائی ہوئی کھنائی کی شکل کی تھیں۔ لڑکیوں کے جسم کو دیکھ کر کڑھا کر ہو جاتی تھیں۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ جنس پر لکھتے ہوئے اپنے خیالات کی روانی میں، قلم برداشتہ کردار اور کہانی کے بیا بازی رت سے کچھ اس طرح ادھیڑنا شروع کر دیتیں کہ جیسے حقیقتاً وہ ان کرداروں سے ذاتی طور پر واقف ہوں اور تفصیل میں جا کر چغل خوری کی مرتکب نہ ہو کر بھی سب کچھ کہے جا رہی ہوں "تہہ بٹیاں" کی یہ تحریر میری بات کا، بہترین ثبوت ہے۔

"میاں کا ایک دوسرے اعلیٰ افسر کی بیوی سے مشہور زمعروف قسم کا عشق چل رہا ہے اور بیوی اس کے ایک ہم عمر سے مانوس ہے جس کی بیوی اپنی سہیلی کے میاں سے اٹکی ہوئی ہے۔ یہ سہیلی ایک سارجنٹ کے دام الفت میں گرفتار ہے جس کی بیوی ایک بڑ قہل سے سیٹھ کے پاس رہتی ہے جس کی پرانی چیچک رو بیوی منیجر سے الجھی ہوئی ہے۔"

اپنے بے باک خیالات کو جنسی نائی کہتے اور ان کے ڈیفینس میں لڑتے رہنے کی وجہ سے وہ ہمیشہ ہدف ملامت بنتی رہیں۔ ایک مرتبہ ایک نقاد نے ان کے جنسی تجربات کو خام بتایا تو جواب میں انہیں لکھ بھیجا۔

"قبلہ آپ کے مشورے کے بغیر ان تجربات میں پختگی کیسے آسکتی ہے۔"

اپنے ایک افسانوی مجموعے "ایک بات" کے دیباچہ میں، انہوں نے ایک شاعر کا حوالہ دیا ہے جنہوں نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ جو ادیب فحش نگاری کرتے ہیں تو کیا ان کے ماں بہن نہیں ہیں؟ عصمت ان کے جواب میں یوں رقم طراز ہیں۔

"ان حضرت سے دست بستہ عرض ہے کہ قبلہ اگر ماں بہن نہ ہوتیں تو مشاعرہ کہاں ہوتا؟"

عصمت نے اپنے افسانوں میں جون، ای، ملعون ڈرموز کی طرح واقعات وحالات کا زیادہ تر صیغۂ واحد متکلم حاضر کے ذریعہ، بیان کیا ہے۔ جس سے خود لوثیت جیسا تاثر پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ تمام ادبا، شعراء اور نقاد مولانا صلاح الدین احمد، شوکت آل احمد سرور اور مجنوں گورکھپوری جو کھلے عام عصمت کے افسانوی موضوعات کی مدافعت میں سرگرم عمل تھے نے بھی عصمت کی شخصیت کو ان کی تحریروں سے جوڑنے میں بالکل بھی دیر نہیں کی۔ ممکن ہے یہ صیغۂ واحد حاضر والے بیان کردہ نقطۂ نظر کا ہی نتیجہ رہا ہو۔ اس کی دوسری وجہ خود عصمت کا اپنے کرداروں کے حقیقی ہونے پر اصرار اور بحث میں مدمقابل کی ہر بات کا جواب بلکہ کاٹ بھی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں مجنوں گورکھپوری کی یہ مدافعانہ تحریر جو عصمت کی ذات اور اس مصنفہ عصمت میں تفریق نہ کرنے کے باعث وجود میں آئیں۔ مدافعتی تحریر میں وہ لکھ رہے ہیں۔

"یہ پردے کے پیچھے اور سماٹ یا گیند اور خدمت گار کی بے دار نفسیاتی واقفیت کو ہمارے غلط معاشرتی مفروضات اور ہمارے ریاکارانہ اخلاقی معیار اس لئے گوارا نہیں کر سکتے کہ وہ ابھی اپنا نقطۂ نظر قائم رکھ کر ہماری تسلی کو رد کے رکھنا چاہتے ہیں۔"

لیکن جیسے ہی مجنوں صاحب کے علم یہ بات لائی گئی کہ عصمت

چغتائی نے ایک اسکول میں بحیثیت معلمہ، ملازمت اختیار کر لی ہے۔ ان کا شدید ردِ عمل ملاحظہ فرمائیں۔

"میں نے جب یہ سنا کہ عصمت ایک اسکول میں پڑھانے لگی ہیں، تو میرا دل دھڑکنے لگا۔ نہ صرف عصمت کے لئے بلکہ ان لڑکیوں کے لئے بھی جن کو وہ پڑھا رہی ہوں گی۔ جس شخص کے اندر اتنی نفسیاتی گرہیں ہوں، جو جذباتی جبر و تشدد اور قلبی اور ذہنی حائلات و موانع میں اس طرح مبتلا ہو، اس کے معلمی کا پیشہ سراسر حد تک خطرناک ہوگا۔" (مجنوں گورکھپوری)

یہ درست ہے کہ عصمت نے عورتوں کی جنسی گھٹن اور بدمزاجیوں پر سختی سے قلم اٹھایا ہے۔ منہ پھٹ میں وہ بے حد ہیں، تحریریں نشتر کے تیر بھی چلاتی ہیں۔ اس پر سونے پر سہاگہ ان کی بے ساختگی اور بے باکی تھے۔ اپنے ان افسانوی کرداروں کی توضیع خود انہوں نے کچھ یوں کی ہے۔

"عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ مرد ہی بڑی گندی باتیں کرتے ہیں، نہیں عورتیں بھی کرتی ہیں۔ عورتوں کے پاس زیادہ وقت ہوتا ہے دوپہر کو محلے بھر کی عورتیں جمع ہو کر بیٹھ جاتی تھیں اور ہم لڑکیوں سے کہا جاتا۔ چلو بھاگو تم لوگ، میں چھپ کے، پلنگ کے نیچے، گھس کر، کہیں سے ان کی باتیں سن لیا کرتی تھی۔ جنسیں کا تجزیہ، گھٹے ہوئے ماحول اور پردے میں رہنے والی بیویوں کے لئے بہت اہم ہے۔ میری افسانہ نگاری اسی گھٹے ہوئے ماحول کی عکاسی ہے۔ توڑ کر آتی ہے۔"

عصمت کے "مٹی مالش" جیسے افسانے ان کے فن اور جمالیاتی ذوق پر یقیناً داغ ہیں لیکن ان کی قدآوری "نیند، بچھو پھوپھی، بیشہ، بھول بھلیاں، ہندستان چھوڑ دو، چوتھی کا جوڑا، لحاف، ضدی، پردے کے پیچھے، کیڈل کورٹ اور اُمر بیل" جیسے افسانوں میں مضمر ہے ان کے دوسرے درجہ کے افسانے "عشق پر زور نہیں، دو ہاتھ، گلدان، ننھی، پاؤں، نفرت، بیمار، خدمت گار، سونے کے گھونٹ، تھوڑی سی پاگل، گھونگھٹ، تنہا تنہا، چارپائی، گیندا، بے کار اور فسادی" وغیرہ بھی اپنے اندر بے حد جاذبیت لئے ہوئے ہیں۔ ان کے چند ناول بھی فن اور صداقت کا بہترین نمونہ ہیں جن میں ضدی، ٹیڑھی لکیر، معصومہ اور سودائی حقیقتاً قابلِ ذکر ہیں اور یہ سب ہی موضوعی اعتبار سے جنسی قطعی نہیں ہیں لیکن "عصمت کا نام آتے ہی مرد افسانہ نگاروں کو دورے پڑنے لگتے ہیں۔ شرمندہ ہو رہے ہیں۔ آپ ہی آپ خفیف ہوتے جا رہے ہیں۔" (کرشن چندر) آخر اس کی وجہ کیا تھی۔ بات صرف اتنی تھی کہ ہم نے ان پر "لحاف" کے فوراً بعد ایک لیبل لگا دیا جس میں نقادوں کی تنقید کے ساتھ ہی خود ان کا بھی بڑا ہاتھ رہا ہے۔ ان کے یہاں جنسی لذتیت کا پہلو شعوری نہیں ہے۔ ان کے زیادہ تر افسانوں سے ہمیں جنسی وابستگی کا نہیں، گھٹن اور نفرت کا احساس یا صرف حقیقت و صداقت کی رونمائی کا تصور ملتا ہے۔ ان کی جن تحریروں پر جنسی تلذذ غالب ہے۔ ان کے ایسے افسانے یا تو معیاری نہیں ہیں یا پھر ان کا افادی پہلو کمزور ہے۔

ہمارے یہاں اردو میں اس بدعت کو بے حد دخل ہے کہ کسی بھی مصنف کو ایک مخصوص شناخت یا ایک خصوصی لیبل لگا کر پہچانا جائے جبکہ عصمت پر تو یہ لیبل والی بات بالکل صادق نہیں آتی۔ اس ضمن میں غلط فہمی اور جنسی مصنفہ کی حیثیت سے اپنی پہچان کرانے میں خود عصمت کا بڑا ہاتھ ہے۔ بھیونڈی ترقی پسند کانفرنس میں ان کی چیخ و پکار، جا بجا ان کے بلند بانگ بیانات، انجمن ترقی اردو بمبئی میں ان کی بیشتر تقاریر اور پریس کو پیش کی گئی بیشتر تشریحات میں چونکہ انہوں نے اپنے کو ایک ترقی پسند جنسی قلم کار کی حیثیت سے ہر مقام پر بڑے طمطراق سے درست ثابت کرنے کی سعی کی ہے اور خود پر جنسی افسانہ نگاری کا لیبل لگاتے ہوئے جنسی رجحانات، سرمایہ دارانہ طبقاتی نظام کے گھناؤنے پن اور بے رحم تضادات کو اپنی تحریروں میں کمال خوبی سے واضح بھی کیا ہے۔ اس لئے ان کی کہانیاں دراصل اس ظالم نظام کی بے رحم تضادات کو اپنی تحریروں میں کمال خوبی سے واضح بھی کیا ہے۔ اس لئے ان کی کہانیاں دراصل اس ظالم نظام کی بے رحم عکاس تو ہیں لیکن انہیں صرف اور صرف جنسی عینک لگا کر نہیں دیکھا جا سکتا۔ مختلف موضوعات پر ان کا کوئی بھی نمائندہ افسانہ لیجئے خواہ وہ بھول بھلیاں ہو یا ڈائن، تل، جوانی، ساس، نفرت، جال اور ریشہ ہو یا بچھو پھوپھی، کنواری، چوتھی کا جوڑا اور چڑیں، ان پر کسی بھی طرح کوئی مخصوص لیبل نہیں لگایا جا سکتا ظاہر ہے کہ صرف لحاف جیسے چند افسانوں کی وجہ سے حاصل کردہ شہرت، ان کی شناخت قرار نہیں دی جا سکتی۔

ڈاکٹر محمد منشاء الرحمٰن خاں منشاء
11- اسٹار کی ٹاؤن
ناگپور (1)

عصمت چغتائی کی افسانہ نگاری

ذوقِ شعر و ادب انسانی زندگی کو حسین و جمیل بنانے میں ایک اہم رول ادا کرتا ہے۔ شاعری کے بعد افسانہ ہی ایک ایسی صنفِ ادب ہے جو دل کو شادمانی اور فرحت بخشی کا وافر مواد فراہم کرتی ہے۔ زندگی اپنی جگہ خود افسانہ ہے۔ بقول منشاءؔ

ہماری زندگانی بھی نرالی زندگانی ہے
حقیقت کی حقیقت ہے کہانی کی کہانی ہے

اس زندگی کے حالات و واقعات نیز گرد و پیش والے موضوعات پر طبع آزمائی کرنے والے اہلِ قلم جب افسانہ نگاری کے ذریعے فطرتِ انسانی اور وارداتِ قلبِ انسانی کی سچی تصویریں پیش کرتے ہیں تو اس کے فن کی عظمت اور مقبولیت میں بے حد اضافہ ہو جاتا ہے۔

اردو میں مختصر افسانہ کے ارتقائی سفر کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو چند ایسی معتبر اور نامور ہستیاں ہمارے سامنے ابھر آتی ہیں جنھوں نے اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کی بدولت فنِ افسانہ نگاری کو غیر معمولی آب و تاب عطا کی ہے۔ اور اپنے خونِ جگر سے افسانہ کو نکھارا اور سنوارا ہے۔

زلفِ ادب کو سنوارنے والے خدمت گزارانِ ادب میں مردوں کے ساتھ ساتھ چند نامور خواتین کے نام بھی شامل ہیں۔ ان خواتین میں عصمت چغتائی کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔

کہانی کہنے - کہانی سنانے نیز باتیں بنا کر کہانی بنانے کا دلپذیر فن خواتین کو بدرجہ احسن ودیعت کیا گیا ہے۔

روزمرہ زندگی کے واقعات و حادثات کے تانے بانے سے مختصر کہانی کا خول تیار کرنے کا ہنر مرحومہ عصمت چغتائی کو خوب آتا تھا۔ وہ افسانوی ادب کے افق پر پوری تابانی اور تمازت کے ساتھ جلوہ افروز تا دمِ آخر رہیں۔ انہوں نے درجنوں افسانے اور سیکڑوں نے کہانیاں لکھیں مگر داستانی اسلوب کبھی اختیار نہ کیا۔ اور نہ ہی کسی کی نقالی کی نہ کسی کے نقشِ قدم پر چل کر شہرت و مقبولیت حاصل کرنے کی کوشش کی بلکہ ابتدا سے اپنا ڈگر آپ اختیار کر لی۔ جو کچھ لکھا اپنا لکھا۔ اپنے طور پر لکھا اپنی دنیا میں رہ کر لکھا۔ ان کی کہانیوں میں خود تخلیقی کا منفرد رنگ و آہنگ ملتا ہے۔ اور زبان کی قدروں اور قواعد کی پابندیوں کے ساتھ اسلوبِ نگارش کا منفرد انوکھا اور البیلا انداز پایا جاتا ہے۔ ان افسانوں کے پلاٹ موضوعات اور مضمون کے ساتھ فنکارانہ طرزِ تحریر کی خصوصیات قاری کو نامانوس یا اجنبی نہیں لگتی۔

سماج کے مختلف طبقوں اور مختلف مذاق رکھنے والے انسانوں کے جذبات اور نفسیات کی ترجمانی انہوں نے بہت دلکش انداز میں کی ہے۔ انھیں افسانہ نگاری کے فنی لوازمات کا بخوبی احساس تھا۔ انسانی نفسیات اور خاص طور پر عورتوں کی نفسیات

سے بھرپور آگاہی کے باعث انہوں نے جو کچھ لکھا حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر کو کام میں لاتے ہوئے لکھا۔ ذلت کچلی ستم رسیدہ خواتین کے جذبات کی ترجمانی کی اور سماج کے ٹھیکیداروں کی بد اطواریوں کو نہایت جرأت مندانہ بلکہ ہمت مردانہ کے ساتھ بے نقاب کیا ہے۔

انہوں نے تقسیم ہند سے پہلے انتہائی قدامت پرست سماج میں پرورش پائی پھر بھی جدت پسندی کی روش اختیار کی اور اپنی بے باکانہ تحریروں سے ہندوستان بھر میں تہلکہ مچادیا۔ ایک طرف تو نئے ترقی پسند قارئین اور نئی نسل کے جنسیات پرستوں کی جانب سے انہیں بھرپور داد و تحسین ملی اور دوسری طرف قدامت پسند حلقوں کی طرف سے شور مذمت سے انہیں دو چار ہونا پڑا۔

اپنے افسانوں سے انہوں نے عورت کو اس کے فطری روپ میں پیش کیا۔ کہانی گیندا "تل" کی رانی۔ ٹیڑھی لکیر کی شمن، بھول بھلیاں، کی رفو باجی اور الربی نیز لحاف کی بیگم جان نے ان کی کہانیوں کے ایسے زندہ جاوید کردار ہیں جو اپنے سراپے میں تمام انسانی خواہشات جبلی و جنسی تقاضوں سے بھرپور ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ کردار نگاری میں انہیں خاص کمال حاصل تھا۔ وہ سادہ اور معمولی قسم کی معمولی بولیوں کے بے ساختہ استعمال پر قدرت رکھتی تھیں فنی اعتبار سے بھی ان کے افسانوں میں آغاز۔ ارتقاء۔ مرکزی تاثر اور اختتام میں ایک خاص ربط پایا جاتا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے اور نفس مضمون کے پیش نظر بلاشک و شبہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے پردہ نشین مسلم گھرانوں کی خواتین کے حالات اور عام انسانی زندگی کے مسائل کو بطور موضوع سخن منتخب کیا اور فن افسانہ نگاری کے تقاضوں سے اچھی طرح عہدہ برآ ہوئیں ان کے یہاں زبان اور بیان کی خوبیاں جاذب قلب و نظر ہوتی ہیں اور یہی خوبیاں افسانے کی تاثیر میں اضافہ کرتی ہیں۔ ان کی حقیقت بیانی میں بھونڈے پن کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔

ستم رسیدہ عورتوں کی نفسیاتی الجھنوں اور جنسی جذبات کی ترجمانی مرداتہ وار کرنے والی اس محترمہ خاتون کو ان کے بعض افسانوں نے شہرت بھی بخشی اور بعض لاجواب کہانیوں کی طرحدار زبان۔ دلکش انداز بیان اور لوچ دار نرم و سبک لہجے نے انہیں مقبولیت کے بام عروج پر پہنچا دیا۔ ان کا مردانہ وار قلم حقیقت میں اپنی مثال آپ تھا۔

اپنے شوہر نامدار جناب شاہد لطیف کے ساتھ وہ فلمی ادب کی طرف بھی متوجہ ہوئیں۔ فلموں کیلئے کامیاب کہانیاں۔ مکالمے اور ڈائیلاگ بھی لکھے۔ رواں دواں زبان اور قلم کے شوخ و شنگ اشاروں کے باعث عصمت کی تحریروں میں نمایاں انفرادیت والا بانکپن پایا جاتا ہے۔ ان کی کہانیوں کے پلاٹ اور واقعات کا مناسب ارتقائی عمل۔ وحدت تاثر کا ضامن ہوتا ہے۔

حق بات تو یہ ہے کہ افسانہ نگاری کو ایک مخصوص سمت اور بصیرت عطا کرنے والوں میں مرحومہ کا مقام بہت بلند و بالا ہے۔ انہوں نے دور حاضر کے قارئین کے رجحان کا خیال رکھتے ہوئے اپنی تحریروں میں زبان کے مزیدار چٹخاروں، طنز کے نشتروں اور ظرافت کی پھلجھڑیوں سے بھی خوب ادب کا نہایت گراں قدر سرمایہ بن گئی ہیں۔

آزاد خیالی ان کا طرۂ امتیاز رہا ہے اور لہجہ ستھرا اور اختصار آفریں ہے۔ عام طور پر ان کے یہاں ایسی نادر تشبیہات و استعارات ملتے ہیں جو نظاہر نہ ہونے کے باوجود قابل توجہ ضرور ہوتے ہیں۔

زبان کے برجستہ استعمال اور عوامی بولیوں کے دل پذیر فقروں نے ان کے اسلوب تحریر کو دلکشی عطا کردی ہے۔ شستہ زبان اور گھریلو محاوروں کی وجہ سے ان کی تحریروں میں غیر معمولی بے تکلفی اور دلکشی پیدا ہوگئی ہے۔

ان کے افسانے علامتی نہیں بلکہ بالکل سیدھے سادھے ہوتے ہیں ان میں سادگی اور پرکاری کے ساتھ تجربہ اور مشاہدہ کی شدت اور احساس و شعور کی بالیدگی صاف جھلکتی نظر آتی ہے۔

پلاٹ۔ ٹکنک اور زبان و بیان میں سادگی آمیز حقیقت

پسندانہ رنگ ہونے کے باعث ان کی کہانیوں میں کہانی پن کہیں بھی مجروح ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔ ان میں متوسط سماج اور عام آدمی کی زندگی کی دھڑکنیں صاف سنائی دیتی ہیں۔ کہیں کہیں کہانی میں ادب لطیف اور انشائیہ کا سا لطف آنے لگتا ہے۔ ان کے افسانوں میں نسوانی زندگی میں پیش آنے والے چھوٹے چھوٹے دکھ سکھ اور عام زندگی کی بنیادی صداقتیں اور جنس کے تعلق سے کھری کھری سچائیاں کچھ ایسے انداز میں در آتی ہیں۔ کہ ان کے بے ساختہ پن کی داد دیتے ہی بنتی ہے۔

دراصل عصمت چغتائی کی کہانیاں خودرو پودے کے مانند ہوتی ہیں۔ پلاٹ من گھڑت۔ فرضی اور قیاسی نہیں ہوتے بلکہ ان کے کردار خود اپنی جانب سے کہانی کو آگے بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔

گزشتہ چالیس پینتالیس سال کے دوران میں اردو کے افسانوی ادب کو جن فنکاروں کی تخلیقات نے غیر معمولی آب و تاب بخشی ہے ان میں کرشن چندر۔ منٹو۔ راجندر سنگھ بیدی اور عصمت چغتائی ایوان افسانہ کے پائیدار ستون تصور کئے جاتے ہیں۔

عصمت چغتائی نے کثیر تعداد میں کہانیاں لکھ کر اردو افسانے کے دامن کو بلاشبہ مالا مال کر رہا ہے۔ خوبی کی بات تو یہ ہے کہ بدنامی اور شہرت دونوں کی بلندیوں کو چھونے والی اس نامور خاتون نے بے باکی تحریر تو ضرور دکھائی ہے۔ مگر اپنی تخلیقات سے اردو کے دامن عصمت کو کبھی داغدار نہ ہونے دیا۔

افسوس صد افسوس کہ وہ اب ہم میں نہیں رہیں مگر ان کی دلکش و تابناک تخلیقات اردو ادب کی مانگ میں افشاں بن کر چمکتی رہیں گی۔

* رباب جعفری
۲۵ سیتا محل، پرمت ب پیٹٹ روڈ
بمبئی ۴۰۰۰۳۶ -

انسان کا ماتم

ان فضاؤں میں کہیں گریہ کناں ہے کوئی!
سسکیاں بچوں کی ماؤں کی فغاں ہے ان میں
درد کا کرب ہے بسمل کی تڑپ ہے اس ان میں
ماتمی گیت ہیں اور درد بھری آہیں ہیں
سن کے ان گیتوں کو
چاند غمگین، ستارے ہیں اداس
نور خورشید نے بھی کالی ردا اوڑھی ہے
تیرگی پھیل گئی ہے ہر سو
حوروں نے کھول دیئے ہیں گیسو
بے گناہوں کا لہو چھلکا ہے
بزم افلاک میں انسانوں کا ماتم ہے بپا

اشعار :-

۱) ساری دنیا کی خوشی میری ہے
نوحۂ انسان کا غم میرا ہے

۲) نونہالان چمن مرجھائے
سر نگوں باد صبا آئی ہے

۳) کربلا کے ظلم پر سوچو تو ہل جاتا ہے دل
ایسی بربریت کہ دنیا میں نہیں اس کی مثال

۴) چراغ دیر و حرم جھلملائے جاتے ہیں
ستون علم ادب تھرتھرائے جاتے ہیں

عصمت چغتائی

بچھو پھوپی

ار میں نے اُنھیں دیکھا تو وہ رحمان بھائی کے پہلے منزلے کی کھڑکی میں
اور کوسنے دے رہی تھیں۔ یہ کھڑکی ہمارے صحن میں کھلتی تھی اور
ا جاتا تھا کیونکہ پردے والی بی بیوں کا سامنا ہونے کا ڈر تھا۔
کے جمعدار تھے کوئی شادی، بیاہ، ختنہ، بسم اللہ کی رسم ہوتی،
ہوے ان رنڈیوں کو بُلا دیتے اور غریب کے گھر میں بھی دیدہ جان۔
کہروا ناچ جاتیں۔

لے کی لڑکیاں بالیاں اُن کی نظر میں اپنی سگی ماں بہنیں تھیں۔ ان کے
ور جیدا کئے دن تک جھانک کے سلسلہ میں سر پھٹول کیا کرتے تھے۔
محلّے کی نظروں میں کوئی اچھی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ اُنھوں نے اپنی
یں اپنی سالی سے جوڑ توڑ کر لیا تھا۔ اُس یتیم سالی کا سوائے اُس بہن
نا نہ تھا۔ بہن کے ہاں پڑی تھی۔ اُس کے بچّے پالتی تھی۔ بس دودھ
تی سارا گوٹوت دیکھا کرتی تھی۔ اور پھر کسی نک چڑھی نے اُسے
یک دن چھاتی دیکھ لیا۔ بھانڈا پھوٹ گیا اور پتہ چلا کہ بچّوں میں آدھے
ت پہ ہیں۔ گھر میں رحمان کی دُلہن چاہے بہن کی دُرگت بناتی ہوں،
نہ کیا۔ یہی کہا کرتی تھیں جو کنواری کو کہے گا، اُس کے دیدے گھٹنوں
ن بر کی تلاش میں ہمیشہ سر کھایا کرتی تھیں، پر اس کیڑے بھرے کباب کو
کہ میں یہ بڑی کوڑی سی پھیلی تھی۔ پھر بھی ایک ذرا چھوٹا تھا کو لھا

ے ایک عجیب طرح کا بائیکاٹ ہو چکا تھا۔ لوگ رحمان بھائی سے کام پڑتا

تو وہ دھونس جما کر کہہ دیتے۔ نکلے میں سب کی اجارت دے رکھی تھی۔ بہی کیا کم عنایت
تھی۔ رحمان بھائی اُسی کو اپنی عزّت افزائی سمجھتے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ وہ ہمیشہ رحمان بھائی کی کھڑکی میں بیٹھ کر طول طویل گالیاں
دیا کرتی تھیں۔ کیونکہ باقی محلّے کے لوگ انا سے دبتے تھے۔ مجسٹریٹ سے کون بیر مول لے
اُس دن پہلی دفعہ مجھے معلوم ہوا کہ ہماری اکلوتی سگی پھوپھی بادشاہی خانم ہیں
اور یہ لمبی لمبی گالیاں ہمارے خاندان کو دی جارہی تھیں۔

اماں کا چہرہ فق تھا اور وہ اندر کمرے میں سہمی بیٹھی تھیں، جیسے بچھو پھوپھی کی
آواز اُن پر بجلی بن کر ٹوٹ پڑے گی۔ چھٹے چھ ماہے اسی طرح بادشاہی خانم رحمان بھائی
کی کھڑکی میں بیٹھ کر ہنکارتیں، ابا میاں اُن سے ذرا سی آڑ لے کر مزے سے آرام کرسی پہ
دراز اخبار پڑھتے رہتے اور موقع محل پر کسی لڑکے بالے کے ذریعے کوئی ایسی بات جواب
میں کہہ دیتے کہ پھر سے بادشاہی پھر شتابیاں چھوڑنے لگتیں۔ ہم لوگ سب کھیل کود،
پڑھنا لکھنا چھوڑ کر صحن میں گچھا بنا کر کھڑے ہو جاتے اور مُڑ مُڑ اپنی پیاری پھوپھی
کے کوسنے سُنا کرتے۔ جس کھڑکی میں وہ بیٹھتی تھیں وہ اُن کے طول طویل جسم سے لبالب
بھری ہوئی تھی۔ ابا میاں سے اتنی ہم شکل تھیں جیسے وہی مونچھیں اُتار کر دوپٹہ اوڑھ کر
بیٹھ گئے ہوں۔ اور باوجود کوسنے اور گالیاں سُننے کے ہم لوگ بڑے اطمینان سے اُنھیں
تکا کرتے تھے۔

ساڑھے پانچ فٹ کا قد، چلا اُٹھل چوڑی کلائی، شیر کا سا کلّا، سفید بگلا بال،
بڑا سا دہانہ، بڑے بڑے دانت، بھاری سی ٹھوڑی! اور آواز تو ماشاء اللہ ابا میاں
سے ایک سُر نیچی ہی ہوگی۔

پھوپی بادشاہی ہمیشہ سفید کپڑے پہنا کرتی تھیں۔ جس دن پھوپھا مسعود علی نے
بی کے سنگ کیلیں کرنی شروع کیں۔ پھوپی نے تئے سے ساری چوڑیاں چھناچھن توڑ
ں۔ رنگا دوپٹہ اتار دیا اور اُس دن سے وہ اُنھیں 'مرحوم' یا 'مرنے والا' کہا کرتی تھیں۔
بی کو چھوڑنے کے بعد انھوں نے وہ ہاتھ پیر اپنے جسم کو رنگنے دئے۔
یہ سانحہ خاصی جوانی میں ہوا تھا اور جب سے وہ "رنڈاپا" جھیل رہی تھیں۔
یہ پھوپھا ہماری اماں کے چچا بھی تھے۔ ویسے تو نہ جانے کیا گھپلا تھا۔ میرے ابا میری
کے چچا لگتے تھے۔ اور شادی سے پہلے جب وہ چھوٹی سی تھیں تو میرے ابا کو دیکھ کر
کا پیشاب نکل جاتا تھا اور جب اُنھیں یہ معلوم ہوا کہ ان کی منگنی اسی بھیانک
سے ہونے والی ہے تو اُنھوں نے اپنی دادی یعنی ابا کی پھوپھی کی پٹاری سے افیون
رکھائی تھی۔ افیون کچھ زیادہ نہیں تھی اور کچھ دن وہ لوٹ پوٹ کر اچھی ہو گئیں،
دنوں ابا علی گڑھ کالج میں پڑھتے تھے۔ اُن کی بیماری کی خبر سن کر امتحان چھوڑ کر
گئے۔ بڑی مشکل سے ہمارے ماما جو ابا کے پھوپھی زاد بھائی بھی تھے، زبردست دوست
، اُنھوں نے سمجھا بجھا کر واپس امتحان دینے بھیجا تھا جتنی دیر وہ رہے ہوکے پیاسے
رہے۔ ادھ کھلی آنکھوں سے میری اماں نے اُن کا جوڑا ایکلا سایہ پردے کے پیچھے
قراری سے تڑپتے دیکھا۔
"امراؤ بھائی، اگر اُنہیں کچھ ہو گیا ...... تو ... ... " دلو کی آواز لرز رہی تھی۔
ا میاں خوب ہنسے۔
"نہیں برادر خاطر جمع رکھو۔ کچھ نہ ہوگا۔"
اس وقت میری ننھی سی معصوم ماں ایک دم عورت بن گئی تھی۔ اُس کے دل سے
ے دم وہ دلدادہ انسان کا خوف نکل گیا تھا۔ جبھی تو میری پھوپی بادشاہی کہتی تھیں میری
ں جادوگرنی ہے اور اُس کا تو میرے بھائی سے شادی سے پہلے علق ہو کر پیٹ گرا تھا۔
ری اماں اپنے جوان بچوں کے سامنے جب یہ گالیاں سنتیں تو ایسی بسور بسور کر روتیں کہ
یں اُن کی مار فراموش ہو جاتی اور پیار آنے لگتا۔ مگر یہ گالیاں سن کر ابا کی گمبھیر آنکھوں
ں پریاں ناچنے لگتیں۔ وہ بڑے پیار سے ننھے بھائی کے ذریعے کہلواتے: "کیوں پھوپی'
ج کیا کھایا ہے؟"
"تیری میّا کا کلیجہ۔" اس کے چٹکے جواب سے پھوپی جل کر مُردا ہو جاتیں، ابا پھر
راب دلواتے۔
"ارے پھوپی' جب ہی منہ میں بواسیر ہو گئی ہے۔ جلاب لو جلاب!"
وہ میرے نوجوان بھائی کی چھپاتی لاش پر کوّدوں' چیلوں کو دعوت دینے لگتیں۔
ان کی دلہن کو جو نہ جانے بیچاری اُس وقت کہاں بیٹھی اپنے جیالے دولہا کے عشق میں لرز
رہی ہو گی، رنڈاپے کی دعائیں دیتیں۔ اور میری اماں کانوں میں انگلیاں دے کر بدبداتیں۔

'جل تو جلال تو، آئی بلا کو ٹال تو۔'

پھر ابا اُکساتے اور ننھے بھائی پوچھتے۔
"پھوپی بادشاہی' مہترانی پھوپی کا مزاج تو اچھا ہے اور ہمیں ڈر لگتا کہ کہیں
پھوپی کھڑکی میں سے پھاند نہ پڑیں۔
"ارے جا سپولئے' میرے منہ نہ لگ، نہیں تو جوتی سے منہ مسل دوں گی۔ یہ بڈھا
اندر بیٹھا کیا لونڈوں کو سکھا رہا ہے۔ مغل بچہ ہے تو سامنے آکر بات کرے۔"
"رحمان بھائی' اے رحمان بھائی' اس بوڑھی کُتیا کو سنکھیا کیوں نہیں کھلاتے۔"
ابا کے سکھانے پر ننھے بھائی دوڑتے ہوئے بولتے حالانکہ اُنھیں ڈرنے کی کوئی ضرورت تو
نہ تھی کیونکہ سب جانتے تھے کہ آواز اُن کی ہے مگر الفاظ ابا میاں کے ہیں۔ لہٰذا گناہ ننھے
بھائی کی جان پر نہیں۔ مگر پھر بھی بالکل ابا کی شکل کی پھوپی کی شان میں کچھ کہتے ہوئے
اُنھیں پسینے آجاتے تھے۔
کتنا زمین و آسمان کا فرق تھا۔ ہمارے ددھیال اور ننھیال والوں میں۔ ننھیال
حکیموں کی گلی میں تھی اور ددھیال گاڑی بانوں کے کٹہرے میں۔ ننھیال والے سلیم چشتی کے خاندان
سے جنھیں مغل بادشاہ نے مرشد کا مرتبہ دے کر نجات کا راستہ پہچانا۔ ہندوستان میں
اُسے بسے عرصہ گذر چکا تھا۔ رنگتیں سنولا چکی تھیں۔ نقوش نرم پڑ چکے تھے۔ مزاج ٹھنڈے
ہو گئے تھے۔
ددھیال باہر سے سب سے آخری کھیپ میں آنے والوں میں سے تھے۔ ذہنی
طور پر ابھی تک گھوڑوں پر سوار منزلیں مار رہے تھے۔ خون میں لاوا دہک رہا تھا۔ کھڑے کھڑے
تلوار جیسے نقوش، لال انگاروں جیسے منہ، گُریلوں جیسی قد و قامت' شیروں جیسی گرجدار
آوازیں' شہتیر جیسے ہاتھ پاؤں۔
اور ننھیال والے' نازک ہاتھ پیروں والے' شاعرانہ طبیعت کے دھیمی آواز میں
بولنے چالنے کے عادی۔ زیادہ تر حکیم' عالم اور مولوی تھے۔ جبھی محلے کا نام حکیموں کی گلی پڑ گیا تھا
کچھ کاروبار میں بھی حصہ لینے لگے تھے۔ شال باف' زردوز اور عطار وغیرہ بن چکے تھے۔ حالانکہ
میری ددھیال والے ایسے لوگوں کو کنجڑے قصائی ہی کہا کرتے تھے۔ کیونکہ وہ خود زیادہ تر
فوج میں تھے۔ ویسے مار دھاڑ کا شوق ابھی تک نہیں ہوا تھا کشتی' پہلوانی' تیراکی میں
نام پیدا کرنا، بٹیر لڑانا، تیتر اور پٹے کے ہاتھ دکھانا اور چوسر پچیسی کو جو میری
ننھیال کے مرغوب ترین کھیل تھے' ہیجڑوں کے کھیل سمجھنا۔
کہتے ہیں جب آتش فشاں پہاڑ پھٹتا ہے تو لاوا وادی کی گود میں اتر آتا ہے۔
شاید یہی وجہ تھی کہ میرے ددھیال والے ننھیال والوں کی طرف خود بخود کھنچ کر آگئے' یہ
میل کب اور کس نے شروع کیا۔ سب شجرے میں لکھا ہے مگر مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔ میرے
دادا ہندوستان میں پیدا نہیں ہوئے تھے۔ دادیاں بھی اسی خاندان سے تعلق رکھتی
تھیں۔ مگر ایک چھوٹی سی بہن بن بیاہی تھی۔ نہ جانے کیوں وہ شیخوں میں بیاہ دی گئی شاید
میری اماں کے دادا نے میرے دادا پر کوئی جادو کر دیا تھا کہ انھوں نے اپنی بہن بقول پھوپھی
بادشاہی کنجڑوں قصائیوں میں دے دی۔ اپنے 'مرحوم' شوہر کو گالیاں دیتے وقت وہ ہمیشہ
اپنے باپ کو قبر میں چین نہ ملنے کی بددعائیں دیا کرتیں۔ جنھوں نے خاندان کی مٹی
پلید کر دی۔
میری پھوپی کے تین بھائی تھے۔ میرے تایا۔ میرے ابا میاں اور میرے چچا' بڑے

ں سے بڑے تھے اور چچا سب سے چھوٹے تھے۔ تینوں بھائیوں کی ایک بہن پھوپھی
ی اور تند مزاج تھیں۔ وہ ہمیشہ تینوں پر رعب جماتیں اور لاڈ کرواتیں۔ بالکل
ں کی طرح رہیں۔ شہسواری، تیر اندازی اور تلوار چلانے کی بھی خاص مشق تھی۔
تو پیس پھال کر ڈھیر معلوم ہوتی تھیں مگر پہلوانوں کی طرح سینہ تان کر چلتی تھیں۔
ا سی جارحو، تون حتیلہ
ا) مذاق میں اماں کو چھیڑا کرتے۔
"بیگم، بادشاہی سے کشتی لڑو گی؟"
"اوئی نوج میری، عالم فاضل باپ کی بیٹی" میری اماں کانوں پر ہاتھ دھر کر کہتیں۔
نٹے بھائی سے فوراً پھوپی کو چیلنج بھجواتے۔
"پھوپی، ہماری اماں سے کشتی لڑو گی؟"
"ہاں ہاں۔ بلا اپنی اماں کو آجائے خم ٹھوک کر۔ ارے اُلّو د سناؤں تو مزا کریم بیگ
ادنیں۔ باپ کا نطفہ ہے تو بلا۔ بلا مُلّا زادی کو .... اور میری اماں اپنا گھونگھ
ے پائنچوں کا پاجامہ سمیٹ کر کونے میں دبک جاتیں۔

پھوپھو بادشاہی، دلوامیاں گوارہ تھے تا؟ بڑے ناناجان انھیں آمنا سرپڑھایا
ی تھے۔ ہمارے پرنانا کے دادا جان نے کبھی دادامیاں کو کچھ پڑھادیا ہوگا۔ ابا میاں
ہنے کو بات توڑ موڑ کر کہلواتے۔
"ارے وہ اسے تبّے کا ڈھیلا کیا میرے باوا کو پڑھاتا۔ مجاور کہیں کا، ہمارے ٹکڑوں
ا تھا۔" یہ سلیم چشتی اور اکبر بادشاہ کے رشتے سے حساب لگایا جاتا۔ ہم لوگ بیل پتائی
بادشاہ کے خاندان سے تھے، جنھوں نے میری ننھیال کے سلیم چشتی کو پیرو مرشد کہا تھا،
دپی کہتیں "خاک پیرو مرشد کی دُم، مجاور تھے مجاور۔"
تین بھائی تھے، مگر تینوں سے لڑائی ہو چکی تھی۔ اور وہ غصہ ہوتیں تو تینوں کی
ں بکھیر دیتیں۔ بڑے بھائی بڑے اللہ والے تھے، انھیں حقارت سے فقیر اور بھیک منگا کہتیں۔
ے ابا گورنمنٹ سروس میں تھے۔ انھیں غدار اور انگریزوں کے غلام کہتیں، کیونکہ مغل شاہی
زوں نے ختم کرائی، "ورد آج مرحوم" چنے وال کے کھانے والے جولاہے یعنی میرے پھوپھا
ئے وہ لال قلعے میں ربِ النساء کی طرح عرقِ گلاب میں غسل فرماکر کسی ملک کے شہنشاہ
ہی بیٹھی ہوتیں۔ تیسرے یعنی بڑے چچا دس نمبر کے بدمعاشوں میں سے تھے اور سپاہی ڈنڈا
یہ بھائی کے گھر ان کی حاضری لینے آیا کرتا تھا۔ انہوں نے کئی قتل کئے تھے، ڈاکے ڈالے
شراب اور رنڈی بازی میں اپنی مثال آپ تھے۔ وہ انھیں ذکر کیا کرتی تھیں جو ان کے
ا دیکھتے ہوئے قطعی ٹھیٹھ سا لفظ تھا۔
مگر جب وہ اپنے مرحوم شوہر سے خفا ہوتیں تو کہا کرتیں: "منہ جلے۔ گرد کی ماشی
ہوں۔ تین بھائیوں کی اکلوتی بہن ہوں۔ ان کو خبر ہو گئی تو دُنیا کا نہ رہے گا۔ اور
یں۔ اگر چھوٹا مٹی لے تو پل بھر میں انتڑیاں نکال کے ہاتھ میں تھما دے۔ ڈاکو ہے ڈاکو۔
— اس سے بچ گیا تو مجھلا مجسٹریٹ تجھے جیل میں سڑوا دے گا۔ ساری عمر چکیاں پسوائے گا
سے بچ گیا تو بڑا جو اللہ والا ہے۔ تیری عاقبت خاک میں ملا دے گا۔ دیکھ سنبھل جا۔

ہوں، تیری اماں کی طرح قیمقان قتالی نہیں۔" مگر میرے پھوپھا ابھی طرح جانتے تھے کہ تینوں بھائی
اُن ہی پر رحم کھاتے ہیں اور وہ بیٹھے مسکراتے رہتے ہیں۔ وہی میٹھی میٹھی زہریلی مسکراہٹ
جس کے ذریعے سے میرے ننھیال والے ددھیال والوں کو برسوں سے جلا رہے ہیں۔
ہر عید بقرعید کو میرے ابا میاں بیٹوں کو لے کر عیدگاہ سے سیدھے بہن سے انا کے ہاں
کوسنے اور گالیاں سننے جایا کرتے، وہ فوراً پردہ کر لیتیں اور کوٹھری میں سے بھری
جادو گرنی ماں اور ڈاکو ماموں کو کوسنے لگتیں۔ نوکر کو بلا کر سوئیاں بھجواتیں۔ مگر کہتیں
"پڑوسن نے بھیجی ہیں۔"
"اللہ میں زہر تو نہیں ملا ہو گا؟" ابا چھیڑنے کو کہتے اور پھر ساری ننھیال کے
چیتھڑے بکھیرے جاتے۔ سوئیاں کھا کر ابا عیدی دیتے جو وہ فوراً زمین پر پھینک دیتیں،
کہ اپنے سالوں کو دو۔ وہی تمہاری روٹیوں پر پلے ہیں۔" اور ابا چپ چاپ چلے آتے اور وہ
جانتے تھے کہ پھوپی بادشاہی وہ روپے گھٹنوں آنکھوں سے لگا کر روتی رہیں گی بھتیجوں کو وہ
آڑ میں بلا کر عیدی دیتیں۔
"حرام زادو، اگر ابا اماں کو بتلایا تو بوٹیاں کاٹ کر کتوں کو کھلا دوں گی۔" اماں ابا
کو معلوم تھا کہ لڑکوں کو کتنی عیدی ملی۔ اگر کسی عید پر کسی وجہ سے ابا میاں نہ جا پاتے تو پیام
پر پیام آتے: "حضرت خانم ہیں، مر گئیں چلو اچھا ہوا!" بُرے بُرے پیغام شام تک آتے ہی
رہتے اور پھر وہ خود ڈھاں بھائی کے کوٹھے پر سے گالیاں برسانے آجاتیں۔
ایک دن عید کی سوئیاں کھاتے کھاتے کچھ گرمی سے جی مالش کرنے لگا۔ ابا میاں
کو اُلٹی ہو گئی۔
"او بادشاہی خانم، کہا سُنا معاف کرنا، ہم تو چلے:" ابا میاں نے کراہ کر آواز بنائی۔
اور پھوپی ستم پیشتم پردہ پھینک چھاتی کوٹتی نکل آئیں۔ ابا کو شرارت سے ہنستا دیکھ
کر سستی لوٹ گئیں۔
"تم آگئیں بادشاہی تو ملک الموت بھی گھبرا کر بھاگ گئے۔ ورنہ ہم تو آج ختم ہی
ہو جاتے۔" ابا نے کہا۔ پھر پیچھے بھرپی نے کتنے وزنی کوسنے دیے۔ انھیں غصے سے باہر
دیکھ کر بولیں۔
"اللہ سے چاہا بجلی گرے گی۔ نال میں گر کر دم توڑو گے۔ کوئی میت کو کاندھا دینے
والا نہ ہوگا۔" اور ابا چڑانے کو انھیں اور روپے بھجوا دیتے۔
سنو ہماری جان ان ڈومنیاں گوئیاں ہیں تو انھیں بیل تو ملنی ہی چاہیے۔
اور پھر بھی وہ کھلاہٹ میں کہہ جاتیں۔
"بیل دے اپنی اماں بہنیا کو:" اور پھر فوراً اپنا منہ پیٹنے لگتیں۔ جلدی سے کہتیں۔
"اے بادشاہی بندی، تیرے منہ کو کالک لگے۔ اپنی منت آپ پیٹ رہی ہے:" پھوپی کو اصل
میں بھائی سے ہی بیر تھا۔ بس اُن کے نام پر آگ لگ جاتی۔ ویسے کہیں ابا کے بچے ان کی نظر
آجائیں تو گلے لگا کر پیار کرتیں۔ پیار سے چٹو پٹو کہتیں۔ "بچے تو اچھے ہیں۔" وہ اصل بھول
جاتیں کہ یہ بچے اُسی بدذات بھائی کے ہیں جسے وہ ازل سے ابد تک کوستی رہیں گی۔ اماں
اُن کی بھتیجی بھی تو تھیں۔ بس کس قدر گھپلا تھا میری ددھیال ننھیال میں۔ ایک دفعے

ے میں اپنی اماں کی بہن بھی لگتی تھی ۔ اس طرح میرے ابا میرے دولہا بھائی بھی ہوتے تھے
میری ددھیال کو ننھیال والوں نے کیا کیا غم نہ دیئے۔ غضب تو جب ہوا جب میری پھوپی
کی بیٹی مسرت خانم ظفر ماموں کو دل دے بیٹھیں ۔
ہوا یہ کہ میری اماں کی دادی یعنی ابا کی پھوپی جب لب دم ہوئیں تو دونوں طرف
کے لوگ تیمارداری کو پہنچے ۔ میرے ماموں بھی اپنی دادی کو دیکھنے گئے ۔ اور مسرت خانم
بھی اپنی اماں کے ساتھ اُن کی پھوپی کو دیکھنے آئیں ۔
بادشاہی پھوپی کو کچھ ڈر/ خوف تو تھا نہیں وہ جانتی تھیں کہ میرے ننھیال والوں
کی طرف سے انھوں نے اپنی اولاد کے دل میں اطمینان بخش حد تک نفرت بھر دی ہے اور
پندرہ برس کی مسرت خانم کا ابھی سن ہی کیا تھا اماں کے کولھے سے لگ کر سوتی تھیں ۔
دودھ پیتی ہی تو انھیں لگتی تھیں ۔
پھر جب میرے ماموں نے اپنی کرنجی شربت بھری آنکھوں سے مسرت جہاں کے
لچک دار سراپے کو دیکھا تو وہیں کی وہیں جم کر رہ گئیں
دن بھر بڑے بوڑھے تیمارداری کر کے تھک ہار کر سو جاتے تو یہ فرماں بردار بچے
سرہانے بیٹھے مریضہ پر کم، ایک دوسرے پر زیادہ نگاہ رکھتے ۔ جب مسرت جہاں برف میں
تر کپڑا بڑی بی کے ماتھے پر بدلنے کو ہاتھ بڑھاتیں تو ظفر ماموں کا ہاتھ وہاں پہلے سے موجود ہوتا۔
دوسرے دن بڑی بی نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں ۔ بدتی کا پتی گاؤ تکیے کے سہارے
اُٹھ بیٹھیں۔ اُٹھتے ہی سارے خاندان کے ذمہ دار لوگوں کو طلب کیا ۔ جب سب جمع
ہوگئے تو حکم ہوا "قاضی کو بلواؤ۔"
لوگ پریشان تھے کہ بڑھیا قاضی کو کیوں بلا رہی ہے ۔ کیا آخری وقت سہاگن
ہو جائے گی، کس کو دم مارنے کی ہمت تھی ۔

"دونوں کا نکاح پڑھاؤ۔" لوگ چکرائے کن دونوں کا ۔ مگر مسرت جہاں
پٹ سے بے ہوش ہو کر گریں اُدھر ظفر ماموں بوکھلا کر باہر چلے ۔ چور پکڑے گئے ۔ نکاح
ہوگیا ' بادشاہی پھوپی سناٹے میں رہ گئیں ۔
حالانکہ کوئی خطرناک بات نہ ہوئی تھی ۔ دونوں نے صرف ہاتھ پکڑے تھے مگر
بڑی بی کے لئے بس یہی حد تھی ۔
اور پھر جو بادشاہی پھوپی کو دورہ پڑا ہے تو بس گھوڑے اور تلوار کے بغیر
انھوں نے کشتے کے پشتے لگادیئے ۔ کھڑے کھڑے بیٹی داماد کو نکال دیا ۔ مجبوراً ابا میاں
دولھا دلھن کو اپنے گھر لے آئے ۔ اماں تو چاند سی بھابی کو دیکھ کر نہال ہوگئیں ۔ بڑی
دھوم دھام سے ولیمہ کیا ۔
بادشاہی پھوپی نے اس دن سے بھائی کا منہ نہیں دیکھا ۔ بھائی سے پردہ کرلیا ۔
میاں سے پہلے ہی نا چاقی تھی ۔ دنیا سے منہ پھیر لیا اور ایک زہر تھا کہ اُن کے دل و دماغ
پر چڑھتا ہی گیا ۔ زندگی سانپ کے پھن کی طرح ڈسنے لگی ۔
"بڑھیا نے پوتے کے لیے میری بچی کو پھنسانے کے لئے مکر گانٹھا تھا۔"
وہ برابر یہی کہے جاتیں کیوں کہ واقعی وہ اس کے بعد بیس سال تک اور جئیں ۔

کون جانے ٹھیک ہی کہتی ہوں پھوپھی ۔
مرتے دم تک بہن بھائی میں میل نہ ہوا ۔ جب ابا میاں پر فالج کا چوتھا
اور بالکل ہی وقت آگیا تو انھوں نے پھر بھی بادشاہی کو کہلا بھیجا ۔
"بادشاہی خانم ہمارا آخری وقت ہے ۔ دل کا ارمان پورا کرنا چاہو تو آجا
نہ جانے اس پیغام میں کیا تیر چھپے تھے ۔ بھیا نے پھیکے اور بہنیا کے د
ہوگئے ۔ بلبلاتی ، چیختی کوستی ، سفید پہاڑ کی طرح بھونچال لاتی ہوئی بادشاہی
ڈیوڑھی پر اتریں جہاں اب تک انھوں نے قدم نہیں رکھا تھا ۔
"لو بادشاہی ، تمھاری دعا پوری ہو رہی ہے ۔" ابا میاں تکلیف میں بھو
تھے ۔ اُن کی آنکھیں اب بھی جوان تھیں ۔
پھوپی بادشاہی باوجود بالوں کے وہی مٹھی سی کچھ لگ رہی تھیں جو بچپن
سے جل جل کر مات منوالیا کرتی تھیں ۔ ان کی شیر جیسی تراشی آنکھیں ایک سہمے آ
آہوں کی طرح سہمی ہوئی تھیں ۔ بڑے بڑے آنسو اُن کی سنگ مرمر کی چٹان
گالوں پر بہہ رہے تھے ۔
"ہمیں کوسو پھوپی بی ۔" ابا نے پیار سے کہا ۔ میری اماں نے سے
بادشاہی خانم سے کوسنے کی بھیک مانگی ۔
"یا اللہ .... یا اللہ ...." انھوں نے گرجنا
کانپ کر رہ گئیں ۔" یا .... یا اللہ . . . میری عمر میرے بھیا کو
.... یا مولا .... اپنے رسولؐ کا صدقہ ...." وہ اس
جھنجھلا کر رو پڑیں جیسے سبق یاد نہ ہو ۔
سب کے منہ فق ہوگئے ۔ اماں کے پیروں کا دم نکل گیا ۔ یا خدا آج کیا
منہ سے بھائی کے لئے ایک کوسنا نہ نکلا ۔
صرف ابا میاں مسکرا رہے تھے ۔ جیسے اُن کے کوسنے سُن کر مسکرا
تھے ۔
سچ ہے ، بہن کے کوسنے بھائی کو نہیں لگتے وہ ماں کے دو
ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں ۔
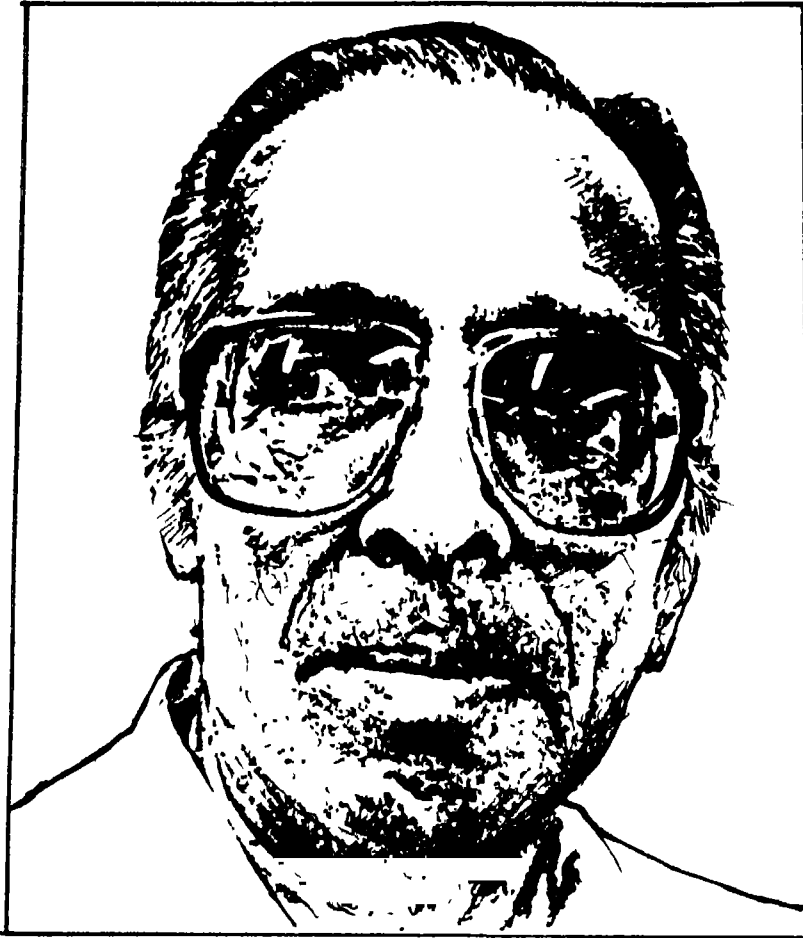
فیروزہ فیاض خان

شرد جوشی

ہندی کے معروف مزاح نگار شری شرد جوشی کے پچھلے دنوں
کے اچانک انتقال سے ہندی ادب نہ صرف ایک منفرد طنز و مزاح
نگار سے محروم ہو گیا۔ بلکہ ہندی زبان نے ایک ماہر اور آزاد خیال
مصنف اور شاعر بھی کھو دیا ہے۔ ان کی موت پر کسی نے کہا تھا کہ
"ہنستے ہنستے جیسے ہندی زبان رونے لگی ہو"
شرد جوشی نے تو اپنا دور پورا کر لیا تھا۔ مشاعروں میں اپنی کویتاؤں
سے اور نثری نشستوں میں اپنے چبھتے ہوئے جملوں سے
وہ ہمیشہ محفل لوٹ لیا کرتے تھے۔
"اپنے منہ میاں مٹھو" مضمون میں انھوں نے اپنی تخلیقات
کے متعلق لکھا ہے

"دراصل میری لگ بھگ پندرہ بیس تخلیقات ہیں۔ ادھر
ادھر شائع ہونے کے بعد کسی نے مجھے بتایا کہ یہ سب طنز و مزاح
ہیں۔ میں اپنی طرف سے افسانہ اور مضمون لکھ رہا ہوں مگر اسلوب
کے بارے میں لاپرواہ واقع ہوا ہوں اور آپ کہتے ہیں کہ میں طنز
لکھتا ہوں۔ خیر بات جب پھیلنے لگی ہے تو میں نے بھی منظور کر لیا۔ میں
طنز نگار ہی سہی لیکن اگر آپ کچھ بھی نہ سمجھیں تب بھی اپنا کام چلے
گا۔"

پچھلے چند برسوں سے وہ "نو بھارت ٹائمس" کیلئے لگاتار
طنزیہ کالم لکھتے رہے ہیں۔ اور پچھلی چار دہائی کی لگاتار تخلیقی

صفدرے انھوں نے اپنی شخصیت سے علیحدہ شناخت قائم کی ۔ ان کا اسلوب بقول میر ہے

میں جو بولا کہا کہ یہ آواز
اسی خانہ خراب کی سی ہے

چھلے ہے وہ تو ورد کشن پر سیریل ہو (یہ جو ہے زندگی) یا ہندی فلم " دل ہے کہ مانتا نہیں " انھوں نے بھونڈے مزاح پر حقیقی اور سادہ مزاحی کو ترجیح دی ۔ وہ کسی افکار کے پابند ہرگز نہیں رہے ۔ بلکہ انھوں نے ہمیشہ وہی لکھا جو ان کے جذبات کا تقاضا تھا ۔

وہ آج ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن انھوں نے طنز و مزاح کی صورت میں جو کچھ ہندی زبان کو دیا ہے وہ ورثہ کی صورت میں ہمیشہ موجود رہے گا ۔

انگریزی

ہندوستان آزاد ہونے کے بعد جن کچھ بڑھیا عورتوں نے واپس انگلینڈ لوٹنا منظور نہیں کیا ۔ انگریزی ان میں سے ایک ہے ۔ موقع نازک جان کر یہ یکایک پیرجا ہو گئی اور دیسی بھاشاؤں کے چودھرائے والے بھون میں پسر کر بیٹھ گئی ۔ کچھ لوگ اس بڑھیا کو ماں کا درجہ دینے لگے ۔ اور جب تک ایسے ہونہار بیٹوں کی بات چلتی ہے بڑھیا کو کون نکال سکتا ہے ۔ ہندوستانی ماں سے پیدا ہوئے بچوں کیلئے یہ بڑھیا دائی کا کام کرچکی ہے اور اتنے اچھے ڈھنگ سے کہ بچے ماں سے نفرت کرنے لگے ہیں ۔ آج بھی یہ سرچھپن کی طرف مہیا سیڑھی ہے

اچھی زبان وہ ہے جسے صاحب لوگ بولتے ہوں انگریزی کو اس طرح تسلیم کیا جاتا ہے جس طرح کسی بادشاہ کے بڑھاپے میں اس کے منہ لگے مصاحب انگریز رکھیل کے بچے کو گدی دلانے کی مہم چلا رہے تھے ۔ اور چھاؤنی کے ریذیڈنٹ بہادر انھیں support کر رہے تھے ۔

انگلینڈ نام کے ایک جزیرے میں بولی جانے والی زبان کو لوگ " عالمی زبان " کہتے ہیں ۔ اور انگریزی دنیا کو اپنی دنیا مانتے ہیں ۔

ہندوستان میں زیادہ تر لوگ جو اپنے گھر سے کھنڈوہ تک جانے کا کرایہ نہیں جٹا پاتے ان کے لیے اس عالمی زبان کا سا تھ ضروری سمجھا جاتا ہے ۔ کیا پتہ جنیا دھوبی کے ننگے بچے کو کب ولایت جانا پڑے تب اسے اگر انگریزی نہیں آئے تو ہمارے ملک کیلئے بڑے شرم کی بات ہوگی انگریزی جاننے سے شان بڑھتی ہے ۔ دھوبی اپنی دکان کو " لانڈری " اور نائی اپنی دکان کو " سیلون " کہتا ہے تین چار زبانوں کی کتابیں اپنی پیٹھ پر لاد کر بچے پڑھنے جاتے ہیں ۔ اپنے ثقافتی ورثہ کیلئے سنسکرت ، ملک کی یکجہتی ، مراٹھی یا بنگلہ ، اپنی بات کہنے یا سمجھنے کیلئے ہندی اور پاپی پیٹ کی خاطر انگریزی جاننا ضروری سمجھا گیا ہے ۔

شرد جوشی

• شرد جوشی

اپنے منہ میاں مٹھو" عرف "

اپنی اعلیٰ تخلیقات کے بارے میں

آبادی بڑھ گئی ہے۔ مگر کبوتر خانہ
چھوڑنے کے لیے کوئی راضی نہیں! ہر آدمی اسی کے آنگن
میں کھیلتا ہے۔ اور اسی میں گھسنے کی کوشش کرتا ہے۔
ان کی کوشش یہی ہے اللہ کرے لافانی شمشان میں جائیگا
جہاں اسے پھونکتا ہے طنز کے اشاروں کو سمجھنے بدلے
گھر پھونکتا تو دور کنارہ مرنے والا دیر سے لیے لیکن گھر چھوڑنے
کو تیار نہیں۔ خوف غالب ہے۔ یہ جگہ چھوڑ دینگے تو کیا
ہوگا۔؟ ایسی تیسی تمہاری! ہم تو چلے۔

میں نے اکثر اعلیٰ قسم کے طنز لکھے ہیں اب کو جمع
کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب یا کتابوں کا سلسلہ بن سکتا ہے
جو اس حد تک ہوگا کہ اکتا کر آپ مجھ سے نفرت کرنے
لگیں گے۔ مگر ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ لہٰذا عزت اسی
میں ہے کہ ان کا ایک مجموعہ ہو اور اعلان کر دیا جائے
کہ یہی میری اعلیٰ تخلیق ہے مگر نہیں یہ میری وہ تخلیقات
ہیں جو لکھنے کے عرصہ بعد بھی پڑھی جا سکتی ہیں۔

اعلیٰ کی صفت تو دور مجھے اپنی لکھی ہوئی طنزیہ تحریر
پر لفظ صنعت چسپاں کرنا بھی اچھا نہیں لگتا یہ ایک خوش فہمی
بھی ہو سکتی ہے کہ میری تخلیقات طنزیہ ہیں دراصل میری
لگ بھگ پندرہ بیس تخلیقات ہیں ادھر ادھر شائع ہونے
کے بعد کسی نے مجھے بتایا کہ یہ سب طنز و مزاح ہیں میں اپنی
طرف سے افسانہ اور مضمون لکھ رہا ہوں مگر اسلوب کے
بارے میں لاپرواہ واقع ہوا ہوں اور آپ ہیں کہ کہہ رہے
ہیں کہ میں طنز لکھتا ہوں۔ خیر جب بات پھیلنے ہی لگی ہے تو
میں نے بھی منظور کر لیا۔ میں طنز نگار ہی سہی لیکن اگر آپ
مجھے کچھ بھی نہ سمجھیں تب بھی اپنا کام چلیگا۔

دراصل ہماری نگارش ہمارے ہی پیدا کیے ہوئے
جملوں اور اسلوبوں کے پھندوں میں پھنس کر رہ جاتی ہے
فضا ایسی بنتی ہے کہ جل کٹنے پر رکھنے کا نہ موقع ملتا ہے نہ
اس کی ضرورت ہی محسوس ہوتی پھر ایک دن ایسا بھی آتا
ہے جب یہ گوشہ کچرے میں پھینک دی جاتی ہے یا سیلاب

لگاتار اپنا جائزہ کرتے رہنا مصنف کی مجبوری ہے۔ تخلیق کار
بے نام ہے نہ ہماری کوئی ماضی ہے اور نہ تجرباتی روشنی۔
ہر تخلیقی موضوع کو امید و بیم کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے۔
پھر چاہے جیسا لکھا جائے۔ لکھنا پڑتا ہی ہے اور ہر
نگارش کو اعلیٰ نگارش بنانے کی کوشش صرف اسلئے
کی جاتی ہے کہ تخلیق کار کا مقصد پیدا ہو اگر پچھلے تجربات
کا فائدہ ملتا تو ادب میں ہر ایک ادیب اعلیٰ سے اعلیٰ تر اور
اعلیٰ ترین تخلیق کرتا۔ مگر ایسا نہیں ہوتا ہر تخلیق کی
تاثیر جدا ہوتی ہے۔ وہ کتنی معیاری ہو سکتی ہے اور
کتنے دنوں تک برقرار رہ سکتی ہے یہ اس کی تشکیل قوت
اور آرائش پر منحصر ہے میں تو تازہ واقعات اور مسائل
پر لکھتا ہوں مگر کئی بار صورت حال رنگ بدل دیتی ہے
اور میرا لکھا پرانا ہو جاتا ہے۔ میرے لئے نگارش ایک
قسم کی بھاگ دوڑ ہے ایسی صورت میں یہ سمجھنا ایک
بھول سی ہوگی کہ کوئی تخلیق اعلیٰ ترین یا لافانی ہوگی۔
کیوں ہوگی؟ ایسے نہیں ہونا چاہیئے۔

اگر کوئی تخلیق طویل عرصہ تک زندہ رہتی ہے
تو اس کے اعلیٰ ترین ہونے کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی
ہے کہ ہمارے ملک میں وقت کی رفتار بہت دھیمی ہے
اسکے جواب میں آپ شیکسپیئر کے ڈراموں کا ذکر کرینگے
مگر بات وہیں کی وہیں رہیگی کیونکہ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ۔
اعلیٰ تخلیق کیلئے۔ تگ و دو ۔ موافق ناموافق انصاف
اور ناانصافی اور صحیح و غلط کو لگاتار پرکھ کر سمجھنا اور لکھتے
وقت اپنے مخصوص ذاتی تخیلات کو تلخ حقائق سے روشناس
کراتے ہوئے بلندیوں تک پہونچانے کا عمل اعلیٰ تخلیق کی
ضمانت ہے۔ ادب کے ذریعہ حاصل لفظی تربیت کا وزن
ڈھونے سے ادبیت اپنے دائرہ تک محدود ہوتی ہے اسے
ادب بننے سے روکتی ہے۔ طنز نگاری کیطرف پچھلے سالوں
سے حیرانی کے ساتھ دیکھا جا رہا ہے۔ طنز نگاروں نے اپنی
تخلیقات کو ہندی ادب کے معنوں میں ادب بننے سے
حفاظت کی ہے۔ تاکہ وہ زیادہ موثر اور کارگر ثابت ہوسکے۔
طنز نگاروں کو یہ کہتے ہوئے ذرا بھی شرم نہیں آتی کہ
وے سامعین کے بڑے طبقہ کے ذریعہ پڑھے جاتے ہیں
اور تعریف کئے جاتے ہیں پتہ نہیں کیوں ہندی میں
مقبولیت کو جرم تصور کیا جاتا ہے۔ یارو! یہ اپنا
ملک ہے۔ یہاں اپنے لوگ ہیں ان کے درمیان سے اٹھ کر
کہاں جاؤگے؟ ان سے بچکر کہاں پوشیدہ رہوگے؟
اگر ہم تم الو ہیں تو ہو سکتا ہے کہ ہم میں بھی الو ہی دکھائی
پڑیں گے۔ دکھ کی بات ہے کہ ہندی ادب نے اپنی شروعات
کے فوراً بعد زبردست نقلی چوغہ اوڑھ لیا۔ اسے توڑنے کی
کوشش کرنے والوں کو ہمیشہ حقارت کی نظر سے دیکھا
جاتا رہا ہے۔ طنز نگار بھی حقارت سے دیکھے گئے ہیں مگر
یہ ان کی خوش قسمتی تھی۔

اس بندہ کے کبھی سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ طنز میں
تعجب کی کیا بات اور اس میں عجوبہ کیا ہے جس ملک کے
لوگ ہزاروں سال سے ظلم و ستم ناانصافی بھوک
غریبی۔ بیماری۔ مایوسی کو برداشت کرتے ہوئے اپنے
اقدار۔ اعتماد و اعتقاد سے جڑے رہے ہیں ایسے
زندہ رہنے کے لئے کوئی سینس آف ہیومر یا کوئی مستی
ضروری رہی ہوگی اس طرح جینے کا معیار کچھ بھی رہا ہو لیکن

اتنے برسوں تک زندگی کی جد و جہد بغیر کسی سستی کے ممکن نہیں تھا۔ اب اگر انہیں اقدار اعتماد اور اعتقاد سے جڑا ہوا ادب عام زندگی سے اگر جڑتا ہے تو وہ سینس آف ہیومر ادب میں شامل کیا جائے گا۔ اس کے برعکس ناانصافی ظلم و ستم اور مایوسی کے خلاف اظہار خیال طنز کے زمرے میں آئیگا۔ ہندی جب عام آدمیوں کی زبانی رنگ اور مستی میں رہے گی طنز زیادہ لکھا جائے گا۔

جب تجربہ کاری اور نئی شاعری کے تحت شعر گوئی اپنی دقیانوسی مزاج الفاظ اور مناظر کے روایتی دائرے کو توڑنے کی کوشش کرتی ہے۔ تب تجربہ نگاروں کی عقل کو ہوش آتا ہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔؟ لیکن جب سے زندگی اور سماج سے گہری معنویت کے ساتھ جڑے۔ ہوئے مضامین اور نثر نگار ... دیکھتے ہیں تو انہیں یہ لگتا ہے کہ یہ سطحی ہے طنز ہے اور سستی مقبولیت ہے کیوں کہ ان کے محترم باپ نے مرتے وقت کہا تھا کہ بیٹا۔ دنیا برقرار رکھنا ہے تو طنز و مزاح سے دامن بچائے رکھنا۔ ایک آدمی جو شاعری کے کسی موڑ میں ہو اور تو، تو، تو، تا۔تا۔تا کرکے تھرکنے لگے اور اس کی یہ حرکت دیکھ کر تجزیہ نگار کو سنجیدہ احساس ہوگا کہ تھایا داد (منظر نگاری) میں چھید ہو رہا ہے۔ وہی شخص اس کے فوراً بعد پرانی مصنوعی خول میں گھسنے لگے تو ظاہر ہے کہ اسپر خوف غالب ہے ڈر اس بات کا ہے کہ نگارش کا مزاج نرم ہوگیا تو ہمارے وقار ہمارے اعلیٰ شخصیت کا کیا ہوگا ؟

طنز یہ نگار کبیر نے ایسے ہی لوگوں کے لیے کہا تھا کہ جو اپنا گھر پھونک سکتا ہو وہی ہمارے ساتھ چل سکتا ہے یہ گھر بھی سالہا سال سے بنا ہوا ہے معروف تجربہ نگاروں نے اس کا نقشہ تیار کیا۔ تھایا داد والوں نے نئے انیجرے کمروں کی توسیع کی بعد میں کسی خبط الحواس آئے گھر موس کی شان جوں کا توں رہی آبادی میں اضافہ ہوا گھر پرانا کبوترخانہ چھوڑنے پر کوئی رضامند نہیں ہر جنم لینے والا اسی کے آنگن میں کھیلتا ہے اور اسی میں گھسنے کی کوشش میں رہتا ہے۔ ان کی لاش یہیں سے اٹھے گی اور ابدی شمشان میں پھونک دی جائے گی۔ طنز کے اشارے اور شبیہی کو سنکر بھی گھر پھونکنا تو در کنار گھر چھوڑنے کو بھی تیار نہیں ! خوف زدہ ہیں کہ گھر چھوڑ دینگے تو کیا ہوگا ؟ ایسی تیسی منظر کی !

ہم تو چلے" !

ترسیل زر کا پتہ:

اسسٹنٹ ڈائریکٹر (ایڈمنسٹریشن)
ڈائریکٹوریٹ جنرل آف انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز
گورنمنٹ آف مہاراشٹر، بیرک نمبر ۱۹
مقابل سروچی بلڈنگ، نزد منترالیہ، بمبئی ۴۰۰۰۲۱
Tel 2021510

مراسلت کا پتہ:

ایڈیٹر قومی راج
ڈائریکٹوریٹ جنرل آف انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز
گورنمنٹ آف مہاراشٹر
۱۷واں منزل، ایراینڈ منسٹرس بلڈنگ،
مقابل منترالیہ، بمبئی ۴۰۰۰۳۲
Tel. Nos. { 2023957
2023006

وہ چاند چہرہ ستارہ آنکھیں

وہ مہربان فلمی ماں

دُرگا کھوٹے جنھوں نے سنہ ۱۹۳۱ء میں "فریبی جال" نامی ایک خموش فلم میں کام کیا تھا جس کا معاوضہ انھیں ۵۰ روپے ملا تھا۔ ایک معزز گھرانے کی لڑکی کے لیے اس فلم کے ریلیز ہونے کے بعد چرنی روڈ جہاں وہ رہتی تھیں باہر نکلنا دوبھر ہوگیا تھا۔ ان کی سسرال اور میکہ دونوں باعزت گھرانے مانے جاتے تھے۔ ابھی وہ سوچ رہی تھیں کہ انھوں نے فلموں میں کام کرنے کا فیصلہ کرکے کتنی بڑی غلطی کی ہے کہ شری وی شانتارام نے انھیں اپنی بولتی فلم "اجودھیا کے راجہ" میں ہیروئن کا موقع فراہم کر دیا اور اس طرح فلم انڈسٹری میں ایک کامیاب انٹری بطور ہیروئن انھیں ملی۔ اس کے بعد "مایا مچھندر" بنی اور وہ بھی کامیاب رہی۔

"پتت پاون" (جس میں جے راج ہیرو تھے) کے بعد "راج رانی میرا" جسے نیو تھیٹرز نے بنایا تھا۔ درگا کھوٹے پردہ سیمیں پر جگمگانے لگیں اور اُس زمانے کے مشہور ہیرو کے۔ سی۔ ڈے پہاڑی سانیال ۔ کے ایل۔ سہگل ۔ نواب اور مُبارک کے مقابل کئی فلموں میں بطور ہیروئن کام کیا۔

سنہ ۱۹۳۶ء سے سنہ ۱۹۴۸ء تک نہایت باصلاحیت ڈائریکٹروں مثلاً آر۔ سی چودھری ("کل کی بات") اور کے۔ دھیبر نند کمار کے ساتھ کام کیا۔ اور مشہور فلمیں ہندی فلم صنعت کو عطا کیں جنمیں "ادھوری کہانی"، "پرتھوی ولبھ" (جسے سہراب مودی نے ڈائریکٹ کیا تھا) کے۔ آصف کی "پھول" اور کشور ساہو کی "ویرکنیا" قابلِ ذکر ہیں۔

تقسیم کے بعد یعنی سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد انھوں نے ساس، ماں اور دیگر کیریکٹر رول لینے شروع کر دیئے اور مغلِ اعظم کی جودھابائی کا کردار تو اپنی مثال آپ ہے۔ ویسے تو ان کا کام فیہا سرحدی کی "ہم لوگ" سہراب مودی کی "مرزا غالب" رمیش سہگل کی شکست میں بہت پسند کیا گیا اور ہندوستانی اسکرین کی "ماں" کے صورت میں انھیں مکمل طور پر منظور کرلیا گیا۔ ان کی بہت بعد کی فلمیں "فرض" اور "بدائی" میں بھی درگا کھوٹے کی ایکٹنگ کو بہت سراہا گیا۔ آج درگا کھوٹے ہمارے درمیان نہیں ہیں ہم اس چہرے کو کبھی بھلا نہیں سکتے جنھوں نے ہر کردار کو پردہ پر بخوبی نبھایا۔ درگا کھوٹے کو ان کی اداکاری پر دادا صاحب پھالکے جیسے ایوارڈ سے بھی نوازا جاچکا ہے اُن کی موت سے فلم انڈسٹری نے ایک بہت اچھی اداکارہ کو کھو دیا۔

(ایڈیٹر)

اکٹر کے. بھکنہ وتسل راؤ
، /۱۱۶۶/۲ - 2. 2 پوسٹ آفس لین
ونلکنٹر حیدرآباد ۲۸ (اے پی)

نہرو، اندرا گاندھی و سائنس

آزادی کے بعد ہندوستان میں جو کچھ بھی ترقی سائنس کے
ن میں ہوئی ہے، اس کا سہرا نہرو جی اور اندرا گاندھی پر ہے
ی مزاج کی افزائش کے لیے پنڈت نہرو نے کڑی محنت کی تھی
، دور کرنے کے لیے اقتصادی حالت کو سدھارنے کے لیے وہ
ت ترقی دیکھنا چاہتے تھے. منصوبہ بنانا ضروری تھا. ترقی یافتہ
. میں ترقیاتی کاموں کا نہرو جی نے جائزہ لیا وہ بے حد متاثر ہوئے
ح وبہبود کا انحصار مادی ترقی پر ہی مبنی ہے وہ ایسا خیال کرتے
. توہمات، اوہام کے خلاف انھوں نے جدوجہد جاری رکھی.
ریخی کارناموں میں سیاسی رجحان کا ذکر رہا تو وہ جدیدیت میں
لنے کی کوشش کرتے تھے. سائنسی کارناموں کی وجہ سے انسانی
ون کی پہچان ہوتی ہے.

پنڈت نہرو ایک عظیم انسان تھے. ایک قائد تھے. قاصد تھے
رستے امن کے، استحکام کے، ایک مدبر تھے. اُن کے منصوبوں
خیالوں میں، عمل پیرائی میں سائنسی نقطۂ نظر تھا. سائنسی مزاج
ائش کے لیے کئی کارنامے کر دکھائے تھے پنڈت نہرو نے.
کیمبرج یونیورسٹی سے حیاتیاتی اسباق سے واقفیت حاصل

کرنے کے بعد گو قانون کا مطالعہ کیا لیکن قدرت سے لگاؤ ان کی فطرت
میں داخل ہوگیا. اعلیٰ تعلیم کے احاطہ میں تحقیق کے لئے کئی تحقیقی
ادارے آزادی کے بعد انہوں نے کھولائے تھے. یہ باغِ ہند کے
نئے پودے تھے جو آج ہم کو پھل دے رہے ہیں. انکا خیال تھا کہ
سائنس کے احاطہ میں جو بھی تحقیقات کی جاتی ہیں ان کا کچھ نہ کچھ
اثر عوام کی زندگی پر ہوتا ہے. سائنس کا بجا استعمال انسان کی
فلاح کے لیے کارآمد ثابت ہوتا ہے. ان کو سائنسدانوں کی ایجادات
پر ناز تھا. فخر تھا. بیرون ممالک کا جب کبھی دورہ کرتے تھے تو ممتاز
سائنسدانوں سے ملتے تھے. تبادلۂ خیال کرتے تھے. آئن سٹائن
سے ان کی ملاقات رہی. ہندوستان میں سائنس کانگریس کے افتتاحی
جلسہ میں مندوبین کو مخاطب کرتے ہی رہتے تھے. تحقیقاتی نتائج
سے تکنیکی معلومات سے ہی سماج میں ایک نئی لہر پیدا ہوتی ہے
ایسا ان کا خیال تھا. بھوک غریبی مٹانے کے لیے، صحت عامہ کی
برقراری، تعلیم بالغاں کی اشاعت، اندھے ایقان سے انحراف ضروری تھا
فنونِ لطیفہ سے زیادہ وہ دیش سے بھوک کو مٹانے کے لیے
سائنس کی ترقیاتی پہلوؤں سے عوام کو روشناس کرنا چاہتے تھے

یہ ان کی جد و جہد تھی، مہم تھی۔ ایک کوشش تھی۔ ایک سادھنا تھی۔ اعشاریائی (ڈسیمل) سکوں کا اجراء ان کی سائنسی تخلیق تھی۔ جسے عام زبان میں ڈسیمل کا نیج (DECIMAL COINAGE) کہا جاتا ہے۔ وگیان شاستر میں نئی کھوج سے زیادہ صنعتی اعتبار سے سائنسی امور کے استعمال کو وہ ترجیح دیتے تھے۔ پنج سالہ بنانے میں پیش پیش رہے۔ قومی منصوبہ بندی کمیشن کے صدر رہے۔ دیش بھر میں آب پاشی کے بڑے پراجکٹس شروع کئے گئے۔ بھاکرا ننگل، دامودر والی، ناگارجنا ساگر دورِ حاضرہ کے مناد رہیں جن سے لاکھوں انسان فیض یاب ہو رہے ہیں۔ خوراک کے احاطہ میں خود کفیل بنانے کی کوشش قومی سطح پر انہوں نے کی۔ کئی بجلی گھر کی تعمیر عمل میں آئی۔ زراعت کے کاموں میں سہولتیں پہنچائی گئیں۔ کھاد کے کارخانے قائم کئے گئے۔ ایٹمی توانائی کو پیدا کرنے کے لیے اور امن کے اغراض کے لیے استعمال کرنے کے لیے ری ایکٹر نصب کئے گئے۔ تاراپور مرکز اس کی تمثیل ہے۔ ہومی جے بھابھا سے پنڈت نہرو تبادلۂ خیال کرتے تھے۔ ڈاکٹر سی وی رامن سے بھی نہرو جی ملاقات کرتے تھے۔ رامن ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس کا بھی انہوں نے تفصیلی دورہ کیا۔
سائنسدانوں سے جب کبھی ملاقات کرتے تھے وہ کہتے تھے کہ وہ ایک عام آدمی ہیں۔ سچ کی کھوج میں ہی لگے رہتا ہے۔ فلاح و بہبود کے لیے ہی سائنس کو استعمال میں لانے کے لیے مشورہ دیتا ہے۔ سائنس کے ماہرین کو، کارکنان کو، تحقیق میں مصروف شدہ افراد کو، ترقیاتی کاموں کے چرچہ سے نئی زندگی کی ابتدا ہوتی ہے۔ قدرت سے بے حد لگاؤ تھا ان کو۔ اس کی صراحت ان کے وصیت نامہ سے ہوتی ہے۔ اس میں اظہار کیا تھا کہ ان کا چتا بھسم گنگا جل میں ڈال دیا جائے جس کی تاریخ و تہذیب صدیوں پرانی ہے۔ خاک کا ایک حصہ ہمالہ کی پہاڑیوں پر پھینک دیا جائے جو انسان کے تخیل کو بالائی کی طرف مرکوز کرتی ہیں۔ امن کا پیغام دیتی ہیں۔ تھوڑی بہت مقدار لہلہاتے کھیتوں میں بھی ڈال دی جائے کیوں کہ مجھے کسان، کامگار، کاشتکار بھی عزیز ہیں۔

ہم فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان میں آزادی کے بعد سائنس کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ وہ تھا خوشحالی کی طرف ترقیاتی کاموں میں ہاتھ بٹانے کا۔ پنڈت نہرو اس کے موجد تھے قومی سائنسی پالیسی کے ہدایت کار تھے۔
پنڈت نہرو جی نے تن من دھن کو دیش کے لیے وقف کر دیا۔ مشعلِ راہ بنے رہے۔ ان کی بیٹی شریمتی اندرا گاندھی نے سولہ سال کے عرصہ میں ملک کی خدمت میں کئی کارنامے پیش کئے تھے۔ سائنس کی افزائش میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی تھیں۔ ہندوستان کا مقام مین پاور (MANPOWER) آج سارے عالم میں تیسرے درجہ پر ہے ایشیاڈ کھیلوں سے، نام (N A M)، چوگھام (CHOGM) سے ہندوستان کی عظمت، شان و شوکت میں اضافہ ہوا ہے۔ یہ کیفیت شریمتی اندرا گاندھی کی کوششوں کا ہی نتیجہ ہے۔

ایٹم، خلا، مواصلاتی سیارہ کے احاطوں میں ہمارا ملک پیش رفت ہے۔ تجارتی فروغ و استعمال کے لیے متعدد نظام اور آلات تیار کئے گئے ہیں۔ ایس۔ وی۔ ایل ۳ ۔ روہنی کے داغے جانے پر سائنس دانوں کی کارکردگی کو بھی داد و تحسین پیش کی۔ امنِ عالم جہاں گیر دوستی کی طرف وقف شدہ ہمارے سائنس دانوں کو محترمہ اندرا گاندھی نے تصدیق کیا۔ مبارکباد دیا تھا۔ نتیجہ خیز سائنسی کلچر اور اشتراکِ عملی پر زور دیا۔ انہوں نے پورا تعاون اور امداد پیش کرنے کا بھی وعدہ کیا۔
آنجہانی شریمتی اندرا گاندھی وزیر اعظمِ ہند نے پندرہویں تولیدی و خلقی جنسیاتی بین الاقوامی کانگریس کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ بہتر انسان بنانے میں وہ عالمِ انسانیت کی اور اپنے ملک کی خدمت کریں۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ تشدد اور عدمِ اعتماد کو دبایا جائے۔ سائنس کا مقصد شانتی اور صلح جوئی کے لیے استعمال ہونی چاہیئے انھوں نے کہا تھا کہ سورج کی روشنی، دھوپ، توانائی، آکسیجن اور

ن کو جسمانی حفاظت کی ضروریات کے لیے استعمال کرنے کا
کو مساوی حق ہے۔
الیکٹرونکس کی ترقی کے سلسلے میں شریمتی گاندھی وزیر اعظم
تھا کہ پہاڑی علاقوں میں کشمیر ہماچل وغیرہ کے علاقوں میں
پیدہ الیکٹرانکس صنعت کو فروغ دیا جائے گا۔ انٹارکٹکا
وفد کو تجربات و تحقیق میں جُٹ جانے کی خواہش انہوں نے
۔ سائنس کانگریس کے ۷۱ ویں اجلاس سے خطاب کرتے
کہا تھا کہ سائنسدانوں کو اپنے اقدامات و عمل سے امنِ عالم کی
ت کرنا ہے۔ انسانی ذہنوں کو نیوکلیائی خطرہ سے بچانے کے
دہ کرنا ہوگا۔ ملکی و قومی منصوبہ بندی میں بھی دلچسپی لینے کی
ے دی۔ اُن کے مایوسیوں اور دقتوں کو دُور کرنے کا وعدہ کیا۔

محترمہ اندرا گاندھی نے دفاعی سائنسدانوں سے کہا تھا کہ وہ
کو دفاعی ٹکنالوجی میں اُن بلندیوں تک پہنچائیں جہاں وہ
دباؤ اور دباغت سے قطعی آزاد ہو سکے۔ ماضی کی جارحیت
تلے کر آئندہ کی حفاظت پر مستعد رہنے کے لیے کہا تھا۔

سویوز ٹی ۱۱ کو ۳ اپریل ۱۹۸۴ء کے شام کو داغ دیا گیا۔
ن وزیر اعظم اندرا گاندھی نے خلائی سفر کے خلا باز ونگ
کمانڈر راکیش شرما کو مبارکبادی کا پیغام دیا۔ آپنے کہا تھا کہ خلا
تحقیقات سے کسی قوم کو خوف و خطرہ لاحق نہیں ہونا چاہیئے۔

گاندھی کا قتل سے جمہوریت کا قتل ہوا۔ انسانیت کا قتل
بے رحمانہ قتل ہوا اُن پر بزدلانہ حملہ ہوا۔ گولیوں کا وہ
ہیں۔ ایک سانحہ عظیم ہوا۔ ہندوستان بھر میں تاریکی ہوگئی
طاری ہوگئی۔ لوگ حیران رہ گئے۔ زار و قطار رو دیئے۔ اس
کو پُر کرنا مشکل ہے۔ اُن کا ایک ایک قطرۂ خون قوم کے لیے
ہو گیا ہے۔
کہ بیٹی باپ سے بازی لے گئی۔ قوم کی سیوا کرنے میں۔ وہ ایک
رہنما تھیں۔ ایک کارکنِ امن تھیں۔ انسانیت کی علمبردار تھیں سائنسی
موضوعات پر امدادی ذہن رکھتی تھیں۔
ہندوستان کی ترقی میں نہرو و اندرا، باپ بیٹی نے جو نقش بنایا،
راستہ بنایا، رنگ بھرا وہ ہمارا سرمایہ ہے۔ اثاثہ ہے۔ قومی اتحاد
کی جڑیں انھوں نے مضبوط کیں۔ ہمیں اس سمت مصروف رہ جانا
ہے۔ سائنسی رجحان، سائنسی مزاج کی مزید افزائش کرنا ہے۔ ان کے
سلسلے میں یہی ہماری خراجِ عقیدت ہو سکتی ہے۔

شمبر نگار دی، سیتا مارکٹ
جی بی روڈ، گیا ۸۲۳۰۰

غزل

پہلے اپنے اندر دیکھ
بعد میں مسجد مندر دیکھ

بڑھتے ہیں کیوں خنجر دیکھ — تو بھی اپنا تیور دیکھ
کتنا دھندلا دھندلا ہے — اپنے دل کا منظر دیکھ
ظلم و ستم کا رونا کیا — اب تو سب ہیں خوگر دیکھ
طوفان تیز بہت ہے آج — کشتی کا بھی لنگر دیکھ
دیکھ زمانہ جاگ اٹھا — اٹھ بھی جا اب اٹھ کر دیکھ
نیا زمانہ نیا رنگ ہے — رہزن بھی ہے رہبر دیکھ
بک جاتی ہے آج انا — گر گئی قیمت آ کر دیکھ
سب کی زباں ہے تلخ شمبر
اس کا اثر تو خود پر دیکھ

* ڈاکٹر نایاب لکھنوی
روم نمبر ۴۹ - ۲۴۸، سالوین لین
نیا پورہ ـ مالیگاؤں (ضلع ناشک) مہاراشٹر ۴۲۳۲۰۳

گوہرِ بے بہا

مشرق و مغرب میں ہے شہرت جواہر لال کی
ہے دلوں میں آج بھی عظمت جواہر لال کی

نام اس کا ہے امر بھارت کی آزادی کے ساتھ
کام آئی سعیٔ و حریت جواہر لال کی

داخلِ زنداں رہا برسوں وطن کے واسطے
زینتِ تاریخ ہے ہمت جواہر لال کی

رہنما اقوامِ عالم کے تھے اس کے معترف
تھی مسلّم دانش و حکمت جواہر لال کی

وہ سیاست کے خزانے میں تھا دُرِ بے بہا،
کوئی دے سکتا نہ تھا قیمت جواہر لال کی،

اس کے ذہن و فکر کی باپو نے کی تھی تربیت،
جگمگاتی کیوں نہ پھر فطرت جواہر لال کی،

اس کے سینے میں نہاں سارے جہاں کا درد تھا
بے کراں تھی اس لئے وسعت جواہر لال کی

ہیچ تھا اس کی نظر میں دبدبہ انگریز کا،
شخصیت تھی جیسے اِک پربت جواہر لال کی

پیار دنیا بھر کے بچوں سے کیا بے امتیاز
کس قدر معصوم تھی سیرت جواہر لال کی

گلشنِ عالم میں تھا دلکش وہ مانندِ گلاب
بھا گئی ہر ایک کو رنگت جواہر لال کی

نعرۂ آزادیٔ کامل کیا اُس نے بلند!
پا گئے نایاب ہم دولت جواہر لال کی

. نثار اختر انصاری
ا ایڈیٹر "ہمہ گیر"، ناگپور ۱۸

جواہر لال نہرو کو بچوں سے بے پناہ محبت تھی یوں
ا وہ بچوں کے ساتھ گھل مل جاتے تھے۔ نہرو جی کو بچوں
اتھ ہنسنے بولنے میں لطف آتا تھا۔ وہ ہر ہندوستانی
ے چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ دیکھنا چاہتے تھے۔
نہرو جی ملک کے دور دراز علاقوں میں رہنے والے بچوں
رط کا جواب بڑے دلچسپ انداز میں دیا کرتے تھے۔
بچے نے انہیں خط میں لکھا۔ "پیارے چاچا۔ آپ ہمارے
، وزیر اعظم ہیں۔ آپ کی تمام خواہش پوری ہو گئی ہے
ں۔" ؟

نہرو جی نے جواب میں لکھا۔ "میری بہت سی تمنائیں
ا ہیں۔ جب میں اکیلا رہتا ہوں تو میرے دل میں یہ خیال
ا ہے کہ کسی گاؤں کے کھیت میں جا کر رات بھر کبڈی
کھیلوں۔ اب تم بتاؤ کیا یہ میری خواہش پوری
ہے" ؟

یک بار ایک بچے نے انہیں خط میں لکھا۔ "چاچا جی
بھی آپ کی طرح وزیر اعظم بن سکتا ہوں۔۔؟

نہرو جی نے جواب میں لکھا۔ "آدمی اپنی لگن اور محنت
سے کیا نہیں بن سکتا تم چاہو تو آج سے وزیر اعظم بن جاؤ۔ تم
پوچھو گے کیسے ؟
تو بس آج سے اپنے نام کے آگے وزیر اعظم لکھنا شروع کر دو۔"
ایک بار ایک بچے نے ان سے دریافت کیا۔ "چاچا جی
کیا بچپن میں آپ کو کبھی ڈانٹ پڑی تھی ؟"

نہرو جی نے اس خط کا تفصیلی جواب دیتے ہوئے لکھا "
ایک بار نہیں بلکہ بارہا مجھے اپنی غلطیوں کے لئے مار بھی کھانی
پڑی اس میں برا ماننے کی کوئی بات نہیں، ہمارے بڑے اگر
ہمیں ڈانٹتے یا مارتے ہیں تو صرف ہماری بھلائی کیلئے۔"

جواہر لال نہرو کی بچوں سے بے پناہ محبت کا اندازہ مندرجہ
ذیل واقعے سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔
نہرو جی اپنے سکریٹری کے ہمراہ نئی دہلی کے راج مارگ
سے کار میں گزر رہے تھے۔ اچانک نہرو جی نے اپنے سکریٹری کو
مخاطب کرتے ہوئے کہا، دیکھو سامنے گارڈن میں پیڑ تلے پس
کھیلتے ہوئے بچوں کے گروپ کتنے خوبصورت معلوم پڑ رہے ہیں۔"

لیکن فوراً ہی ان کا تیور بدل گیا اور انہوں نے حیرت سے کہا۔ "لیکن اس موسم میں تو یہاں بچوں کی بھیڑ بھاڑ رہتی تھی۔ آج یہ خاموشی کیسی"؟

انہوں نے اپنے سکریٹری سے کہا تم آج ہی اس بات کا پتہ لگاؤ۔ شام کے وقت نہرو جی اپنے دفتر میں فائلیں دیکھ رہے تھے یکایک ان کے سکریٹری نے دہلی میونسپل کارپوریشن کے میئر کو نہرو جی کے سامنے لاکھڑا کر دیا۔

میئر نے نہرو جی کو نمسکار کرنے کے بعد کہا۔ صاحب آپ کے سکریٹری نے مجھ سے فون پر اس گارڈن کے تعلق سے پوچھا تا تھا کی میں نے ضروری سمجھا کہ آپ کو صورتحال سے آگاہ کر دوں۔

"بات یہ ہے کہ ہر سال اس موسم میں شہر بھر کے بچے گارڈن میں جامن توڑنے کے علاوہ گندگی بھی کرتے تھے۔ لہذا میں نے صاف صفائی بنے رہنے کی خاطر اس سال ساری جامن کا ٹھیکہ ایک ٹھیکے دار کو دے دیا۔ صاف صفائی بھی قائم ہے اور میونسپل کارپوریشن کو ۵ ہزار روپئے کی آمدنی بھی ہو گئی۔"

یہ بات سن کر نہرو جی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ انہوں نے میئر کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "تم ۵ ہزار روپے کی خاطر بچوں کو زندگی کی چھوٹی موٹی خوشیوں سے محروم رکھنا چاہتے ہو۔ یہ بچے ہمارے ملک کا مستقبل بنیں گے۔ آپ فوراً ٹھیکے دار کو اس کی رقم واپس کر دیں اور اس کے چوکیداروں کو ہٹا دیں۔ کل میں اس راستے سے گزروں گا تو مجھے وہاں بچوں کی بھیڑ بھاڑ نظر آنی چاہئے نہ کہ چوکیداروں کا پہرہ۔

دوسرے دن جب شام کو نہرو جی اس راہ سے گزرے تو انہوں نے دیکھا کہ بچے باغ میں اچھل کود رہے ہیں، کوئی پیڑوں پر پتھر مار رہا ہے تو کوئی گلی ڈنڈا کھیل رہا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر نہرو جی کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر آئی۔ نہرو جی ہر موقع پر ہر محفل میں بچوں کا خاص خیال رکھتے تھے۔ بچوں کو دیکھ کر وہ بے حد خوش ہوتے تھے۔ بچوں کے ساتھ ہنسی مذاق ان کی عادت میں شامل تھی۔

ایک بار ایک بچے نے نہرو جی کو اپنی ڈائری پیش کرتے ہوئے کہا۔ چاچا جی آپ اس پر سائن کر دیں۔ انہوں نے فوراً انگریزی میں سائن کر دی۔ بچے نے کہا تاریخ بھی لکھ دیں۔

نہرو جی اردو میں تاریخ لکھ دی۔ بچے نے کہا واہ چاچا جی!

زبیر اعظمی
پردیسی پورہ، ایور ضلع ناشک

چاچا نہرو

بڑی مشکل سے رہزن کو بھگایا چاچا نہرو نے
ہمیں قید غلامی سے چھڑایا چاچا نہرو نے
کہیں کس منہ سے بھارت کے گلے پر جب چلی آری
قیامت کا سماں تھا خون کی تھی گرم بازاری
بڑھا کر حوصلہ ہمکو بچایا چاچا نہرو نے

لٹیروں نے حوالے کر دیا اجڑا ہوا بھارت
وطن کی شان اور تہذیب کو بھی کر دیا غارت
دلہن کی طرح اس کو پھر سجایا چاچا نہرو نے
کوئی بھی سن کے روئیگا ہمارا ایسا دکھڑا تھا
عروس ہند کا اترا ہوا بے نور مکھڑا تھا
وطن کی مانگ پر ٹیکا لگایا چاچا نہرو نے
جہاں میں شانتی لانا ہی ان کا دین وایماں تھا
دکھی لوگوں کا رنج وغم اٹھا لینے کا ارماں تھا
محبت ہی کا کاشانہ بنایا چاچا نہرو نے
گلستان وطن کو خیر سے ایسا ملا مالی
کہ جس کی محنتوں سے ہر ترقی ہم نے کر ڈالی
وطن کے غم میں ہی جیون تبایا چاچا نہرو نے
نئے بھارت کی تعمیر و ترقی ان کے دم سے ہے
ہر اک خطہ یہاں شاداب ان کے ہی قدم سے ہے
وشال اس دیش بھارت کو بنایا چاچا نہرو نے

سائن انگریزی میں، تاریخ اردو میں یہ بھی خوب رہی۔
نہرو جی نے مسکرا کر کہا۔ تم نے سائن کہا تو انگریزی میں کر دی۔ تاریخ کہا تو اردو میں ڈال دی۔ بتاؤ اس میں میرا کیا قصور ہے؟...

• ڈاکٹر یونس اگاسکر
ڈپارٹمنٹ آف اردو
یونیورسٹی آف بامبے
سانتا کروز ایسٹ، ودیا نگری۔ ممبئی ۴۰۰۰۹۸

ریڈیو فیچر

روشنی کا تہوار - دیوالی

نریٹر: دنیا کے ہر خطے میں سال کے کچھ دن ایسے ہوتے ہیں جنہیں دوسرے دنوں سے الگ، اہم اور برتر سمجھا جاتا ہے۔ ان کے ساتھ خوشی اور احترام کے جذبات وابستہ ہوتے ہیں اور انہیں "منایا" جاتا ہے۔ ان دنوں کے ساتھ اکثر کوئی نہ کوئی مذہبی یا تہذیبی روایت یا کوئی تاریخی یا فرضی حکایت جڑی ہوتی ہے۔ ایسے دنوں کو تہوار کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ کوئی رسم یا عبادت ادا کرکے ان تہواروں کو منایا جاتا ہے اور اچھے کپڑے پہن کر، عمدہ پکوان بنا کر اور گھروں کو سجا کر تہواروں کا سواگت کیا جاتا ہے۔

تہوار کسی بھی ملک یا قوم کی مذہبی روایات، تہذیبی اقدار اور سماجی زندگی کا آئینہ ہوتے ہیں۔ ان سے لوگوں کا قومی کردار عیاں ہوتا ہے۔ بہادری، حق پرستی، ایثار، مروت، انسان دوستی، بھائی چارگی، ایکتا اور حب الوطنی جیسی مثبت خصوصیات ساتھ ساتھ خود نمائی، عیش پرستی، فضول خرچی، ہنگامہ پروری، ایذا رسانی، شراب نوشی اور جوئے بازی جیسی منفی خصوصیات بھی تہواروں کے موقعوں پر ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ ہمیں کوشش یہی کرنی چاہئے کہ تہواروں کے منانے میں شائستگی اور اخلاق کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیں اور ایک اچھے شہری کے فرائض سے منہ نہ موڑیں۔

ہندستان عہد قدیم سے دیہاتوں، کھیتوں اور کھلیانوں کی سر زمین رہا ہے۔ یہاں مذاہب اور یہاں کلچر کی وابستگی یہاں کی زمین اور اس کی پیداوار، یہاں کے مظاہر فطرت اور یہاں کے موسموں سے بہت اٹوٹ اور گہری ہے۔ اس لئے یہاں کے کئی تہواروں میں اس وابستگی کے متعدد مظاہر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ بعض تہواروں کا پس منظر خالص مذہبی ہے لیکن ان کے منانے میں رسمی عبادتوں کے علاوہ سماجی رشتوں اور بندھنوں پر بھی زور دیا جاتا ہے۔ ان

ان کی حیثیت دہری ہو جاتی ہے یعنی مذہبی بھی اور سماجی بھی لیکن اکثر تہوار مذہبی، فطرتی اور سماجی ان تینوں خصوصیات سے حامل ہوتے ہیں۔ روشنیوں کا تہوار دیوالی بھی ایک ایسا ہی تہوار ہے۔ (باہر پٹاخوں اور آتش بازیوں کا شور۔ درمیان میں موسیقی بھی سنائی دیتی ہے۔)

آکاش : دادا جی آپ میرے لئے پھل جھڑیاں لائے ؟

دادا جی : ہاں بیٹے، یہ لو اور باہر جا کر جلاؤ مگر یاد رکھو جلی ہوئی پھل جھڑی ادھر ادھر نہیں پھینکنا کسی ایسی جگہ ڈال دینا جہاں کسی کا پیر نہ پڑے۔

آکاش : وہ کیوں دادا جی ؟

دادا جی : بیٹے اس لئے کہ جلی ہوئی پھل جھڑی دیر تک گرم رہتی ہے اور اس سے کسی کا پیر جل سکتا ہے۔

آکاش : دادا جی آپ میرے لئے ایٹم بم اور دوسرے بڑے بڑے پٹاخے کیوں نہیں لائے۔

دادا جی : بیٹے تم ابھی چھوٹے ہو ان پٹاخوں کو چھوڑنے میں غلطی کر بیٹھو گے تو کسی حادثے کا شکار ہو جاؤ گے۔ یہ لو میں تمہارے لئے انار لایا ہوں۔ ان کے جلانے میں کوئی خطرہ نہیں۔ ان سے خوبصورت روشنی پھیلتی ہے۔

آکاش : دادا جی، دیوالی تو روشنیوں کا تہوار ہے نا۔ پھر اس میں دھماکہ پیدا کرنے والی چیزیں کیوں جلاتے ہیں۔ ؟

دادا جی : خوشیاں منانے کا یہ طریقہ لوگوں کو زیادہ پسند ہے لیکن اچھے شہری شور اور دھماکا پیدا کرنے سے بچتے ہیں کیوں کہ اس سے بیماروں کو تکلیف ہوتی ہے، اسکول جانے والے بچوں کی پڑھائی میں ہرج ہوتا ہے، لوگوں کی نیندیں خراب ہوتی ہے۔

آکاش : اور چھوٹے بچے ڈر بھی جاتے ہیں۔

دادا جی : ہاں بٹیا۔ پٹاخوں کے شور کا انسانوں کے علاوہ جانوروں پر بھی برا اثر پڑتا ہے۔ شہر کے کتے ان ہی دنوں پاگل ہوتے دیکھے گئے ہیں۔

آکاش : دادا جی میں پھل جھڑیاں اور انار ہی لوں گا۔

دادا جی : شاباش بیٹے شاباش۔!

آکاش : دادا جی۔ مجھے دیوالی کے تہوار کے بارے میں کچھ بتائیے نا!

دادا جی : بٹیا، دیوالی بنیادی طور پر فصلوں کی کٹائی کے بعد آنے والی خوش حالی کی خوشی منانے کا تہوار تھا یعنی اس کی حیثیت موسمی اور معاشی تھی۔ اسی کے ساتھ ہندؤں کے کیلنڈر کا نیا سال بھی شروع ہوتا ہے اس لئے نئے سال کی آمد کی مسرت اس سے وابستہ ہو گئی۔ پھر اگلے سال بھی خوشحالی اور معاشی ترقی حاصل ہو اس لئے دیوتاؤں اور خصوصاً دولت و خوشحالی اور معاشی ترقی حاصل ہو اس لئے دیوتاؤں اور خصوصاً دولت و خوشی حالی کی دیوی لکشمی کی پوجا کو اس تہوار کا لازمی جزو بنا دیا گیا۔ فصلوں کی کٹائی کے بعد خوش حالی آئی اور اگلے سال بھی برکتوں کا نزول ہو اس لئے پوجا پاٹھ کی گئی اور جب اس سے فرصت ملی تو بھائی کو بہن کی یاد آئی، چنانچہ وہ بہن کے لئے تحفے تحائف لے کر اس سے ملنے گیا۔ بہن نے اس کی آرتی اتاری، ٹیکا لگایا اور لمبی عمر کی دعا مانگی۔ بھائی نے اسے تحفے دے کر اپنی خوشی میں شریک کر لیا مگر سب سے بڑی خوشی تو بہن بھائی کے ملنے کی ہوتی ہے۔

آکاش : لیکن دیوالی کے موقع پر اتنی روشنی کیوں کی جاتی ہے؟ اتنے پٹاخے اور اتنی آتش بازیاں کیوں چھوڑی جاتی ہیں۔ ؟

دادا جی : دیوالی کے تہوار کو اس دن سے خصوصی مذہبی حیثیت حاصل ہو گئی جب شری رام چندر جی چودہ برس کا بن باس پورا کر کے اور راون کا خاتمہ کرنے کے بعد سیتا جی اور بھائی لکشمن کے ساتھ صحیح اور سلامت اجودھیا لوٹے تھے۔ اتفاق سے وہ دیوالی کا دن تھا۔ رعایا نے ان کی واپسی کی خوشی پورے جوش و خروش کے ساتھ منائی گھر گھر دیپ جلے اور ان تینوں کی پوجا کی گئی۔ تب سے دیوالی کا تہوار بدی پر نیکی کی فتح کی یاد کے طور پر بھی منایا جانے لگا۔ اور اس میں پٹاخے اور آتش بازیاں بھی چھوڑی جانے لگیں

آکاش : لیکن دیوالی تو کئی روز تک منائی جاتی ہے ؟ ایسا کیوں ؟

دادا جی : دراصل دیوالی پانچ دن کا تہوار ہے۔ ان پانچ دنوں کی الگ الگ اہمیت ہے۔ دیوالی کا پہلا دن کارتک ماس کے اماوس کا تیرہواں دن ہوتا ہے۔ اسے "دھن تیرس" بھی کہتے ہیں۔ اس رات دھن کی دیوی لکشمی کی پوجا کی جاتی ہے۔ دیوالی کا دوسرا دن "نرک چتردشی" کہلاتا ہے کیوں اس شری کرشن کی بیوی ستیہ بھاما نے نرکاسر

نامی راکشس کو مارا تھا۔ جس کی قید میں ۱۶ ہزار کنواریاں تھیں۔

دیوالی کا تیسرا دن مہورت کا دن کہلاتا ہے۔ بیوپاریوں کے لئے بہت مبارک دن سمجھا جاتا ہے۔ یہ خاص دیوالی کا دن ہے۔ اس دن سے نئے سال کا آغاز مانا جاتا ہے۔ اس دن بھی لکشمی کی پوجا کی جاتی ہے۔ دیوالی کے چوتھے پھیرتے درخت، فصل بونے اور کاٹنے کے آلات کی پوجا کی جاتی ہے اور دیوالی کے پانچویں دن بھیا دوج ہوتی ہے جو بھائی بہن کے رشتے کو مضبوطی دیتی ہے۔ اچھا اب تم باہر جا کر کھیلو۔ (فیڈ آؤٹ)۔

منظر دو

آشا : دیوالی مبارک ہو سلمیٰ بھابی!

سلمیٰ : کون آشا؟ — بھئی دیوالی مبارک ہو۔ کیا لائی ہو مٹھائی؟

آشا : جی ہاں بیسن کے لڈو، چکلیاں، کرنجیاں اور چیوڑا۔

سلمیٰ : اوہو۔ یہ تو خاص مہاراشٹری پکوان ہیں۔

سلیم : بھئی ہمیں تو چکلیاں اور چیوڑا پسند ہے۔

آشا : اور مجھے آپ لوگوں کا شیر خرما اور سوئیاں جو عید کے دن بھیجتی ہیں۔

سلیم : بھئی آشا — اس دیوالی کو تمہارے بھائی ہندوستان لوٹ رہے ہیں کہ نہیں؟

آشا : نہیں سلیم بھائی اروند کو اس مرتبہ کویت سے گھر آنے کی اجازت نہیں ملی۔ خلیج کی جنگ کے بعد وہاں تعمیر کا کام بہت بڑھ گیا ہے اس لئے چھٹی نہیں مل سکی۔ لیکن اس نے میرے لئے ایک ساڑی اور ایک گھڑی بھجوائی ہے۔

سلیم : تو پھر اس مرتبہ بھاؤ بیج کی تم آرتی کس کی اتارو گی؟

آشا : آخر آپ کس دن کام آئیں گے؟

سلمیٰ : لیکن یاد رہے۔ اس کے بدلے میں بہن کو اچھا سا تحفہ بھی دینا ہوتا ہے۔

سلیم : بھئی تحفہ تو یہ وصول کر چکی ہے، ہم سر پر ہاتھ دھر کے آشیرواد دیں گے۔

(سب ہنسنے لگتے ہیں)

اسلم : (سلیم اور سلمیٰ کا بیٹا) یہ بھاؤ بیج کیا ہوتا ہے؟

سلیم : بیٹے بھاؤ کا مطلب ہے بھائی اور بیج کا مطلب ہے دوج یا دوسرا۔ ہندو کیلنڈر کے مطابق چڑھتے چاند کی دوسری دوج یا بیج کہتے ہیں۔ ماہ کی دوسری تاریخ کو جو نئے سال کا دوسرا دن ہوتا ہے، بھائی اپنی بہن سے ملنے جاتا ہے۔ بہن بھائی کی آرتی اتارتی ہے اور وہ اسے تحفہ یا آشیرواد دیتا ہے۔ ہندی میں اس رسم یا تہوار کو بھیا دوج کہتے ہیں۔ اور مراٹھی میں بھاؤ بیج!

اسلم : کیا اور دنوں میں بھائی ایسا نہیں کر سکتا؟

سلیم : بھئی کر کیوں نہیں سکتا۔ بہن بھائی کا پیار کیلنڈر کا پابند تھوڑا ہوتا ہے۔ لیکن ہندوؤں میں اس دن کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسی دن یم راج اپنی بہن یمنا سے ملنے گئے تھے۔ انہوں نے اپنی بہن کو بہت سے زیور اور کپڑے دیئے اور اس کے گھر کھانا کھایا تھا۔ اس لئے اس دن کو مقدس مان کر یہ رسم ادا کی جاتی ہے۔

اسلم : ڈیڈی میری تو کوئی بہن ہی نہیں ہے۔ میں کسے آشیرواد دوں؟

سلمیٰ : بیٹے تم پڑوس کی مادھاو دشی کی بیٹی سشما کو آشیرواد دینا اور ساتھ میں یہ چاندی کی پائلیں بھی لے جانا جو میں نے اس کے لئے لائی ہیں۔

اسلم : جی اچھا ممی!

— منظر تین —

(مادھاو دشی کے گھر میں پوجا ہو رہی ہے۔ زور زور سے منتر پڑھنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔)

اسلم : رادھا ماؤسی ! رادھا ماؤسی ! (منتر پڑھنے کی آواز پس منظر میں چلی جاتی ہے) رادھا : آؤ اسلم بیٹے ۔ کیسے ہو ؟ ۔
اسلم : میں آپکو دیوالی کی مبارکباد اور سشما کو اُس کا شیروانی دینے آیا ہوں ۔ رادھا : بیٹا تمہیں بھی دیوالی کی بہت بہت مبارکباد اور نئے سال کیلئے نیک تمنائیں ۔ یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے ۔؟
اسلم : ممی نے سشما کے لئے چاندی کی پائلیں بھیجی ہیں ۔
رادھا : وہ یہ تو بہت خوبصورت ہیں ۔
اسلم : ماؤسی یہ انکل زور زور سے کیا پڑھ رہے ہیں ؟ ۔

(منتر پڑھنے کی آواز تیز ہو جاتی ہے)

رادھا : بیٹا یہ پھٹ جی ہیں ۔ پوجا پاٹ کرنیوالے برہمن آج ہمارے پاس لکشمی پوجا ہے ۔ اس لئے اشلوک پڑھ رہے ہیں ۔
اسلم : اور ان کے سامنے اتنی ساری مٹھائیاں اور پھل اور اناج کیوں رکھا ہے ؟ رادھا : بیٹا لکشمی کی پوجا کرتے وقت یہ ساری چیزیں سامنے رکھ کر دیوی سے پرارتھنا کی جاتی ہے کہ سال بھر ان چیزوں سے بھنڈار بھرا رہے ۔ کسی چیز کی کمی نہ ہو ۔
اسلم : پھر تو یہاں کھلونے بھی رکھنے چاہئیں تاکہ مجھے اور سشما کو ان کی کمی نہ ہو ! ۔
رادھا : ضرور رکھدیں گے ۔ اب تم اندر جاکر سشما سے ملو ۔ میں تب تک تمہارے لئے دیوالی کا ناشتہ لاتی ہوں ۔

صفحہ نمبر ۶۱ سے آگے

تعاون دینا چاہیئے ۔
انھوں نے لائنس کلب سے معذور افراد کی بازآبادکاری کے لئے عطیات دینے کی اپیل کی ۔ اس ریلی میں شرکت کرنے والے معذور افراد کو شریمتی ڈمپل کپاڈیہ کے ہاتھوں تحفے دیئے گئے ۔
شری الہاس اگاسکر صدر نیشنل فورم برائے معذورین فورم کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی ۔ شری منوبھائی کوٹھاری نے شکریہ ادا کیا ۔

خورشید افسر بسوانی
بسواں ضلع سیتاپور (یوپی)

قطعات

بھیگی بھیگی پلکیں اچھی لگتی ہیں
بارش میں یہ شاخیں اچھی لگتی ہیں
فٹ پاتھوں کا جیون فن کا غازہ ہے
غربت کی سب باتیں اچھی لگتی ہیں

•

دل کہ دریا ہے اور یہ دریا
سارے دریاؤں سے عجوبا ہے
ہر تمنا یہیں سے ابھری ہے
ہر سفینہ یہیں پہ ڈوبا ہے

•

تیرگی کو جماہی آتی ہے
رات کا جسم جلنے لگتا ہے
آپ جب مسکرانے لگتے ہیں
چاند کروٹ بدلنے لگتا ہے

•

آپ جس وقت سنورتے ہوں گے
حسن جب اور دمکتا ہوگا
آپ ہر چند چھپائیں لیکن ..
آپ کا دل بھی دھڑکتا ہوگا

•

عمر صدیوں کبھی کم ہے کسی کے لئے
اور کسی کے لئے ایک لمحہ بہت
ایک جگنو نے کل مسکرا کر کہا
زندگی کے لئے ایک لمحہ بہت

•

سمیت چکرورتی

جمہوری نظام - بھارت کی طاقت

حال ہی میں بھارت جو آبادی کے لحاظ سے دنیا کا دوسرا سب سے بڑا ملک ہے، اپنی آزادی کے ۴۴ برسوں میں سب سے بڑے بحران کا شکار ہوا لیکن دنیا کی توجہ اس جانب مبذول نہیں ہوئی کیوں کہ اس کی نظریں خلیج اور مرکزی یورپ میں رونما ہونے والے واقعات پر لگی ہوئی تھیں۔ بھارت کے دسویں عام انتخابات سے تقریباً ایک ماہ قبل "واشنگٹن پوسٹ" نے لکھا تھا "بھارت میں امنڈتا ہوا سیاسی اور اقتصادی بحران ذات پات سے پیدا ہونے والی بدامنی، فرقہ وارانہ فسادات، افراط زر کی بڑھتی ہوئی شرح، اقتصادی صورت حال میں تنزلی جیسے مسائل کا ایک ساتھ حملہ ہے۔ ماضی میں بھارتی نظام ایسے بحرانوں سے کامیابی سے نمٹ چکا ہے لیکن اب بحران خود ہی اس نظام کا حصہ بن گیا ہے۔

لیکن بھارت کے ووٹروں نے ان کو غلط ثابت کر دیا ہے کیونکہ حالیہ انتخابات میں ملک کے جمہوری نظام میں ان کے پختہ اعتماد و یقین کی عکاسی واضح طور پر ہوئی ہے۔ بھارت نے بارہا دنیا کو دکھا دیا ہے کہ بحران جتنا شدید ہوتا ہے انھوں نے اسکا اتنا ہی ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے۔

گذشتہ چالیس برس کے دوران ملک میں جو عام انتخابات ہوئے ہیں ان میں یہ دسواں عام چناؤ غالباً سب سے زیادہ آزمائش والا تھا۔ انتخابات کے دوران سابق وزیر اعظم شری راجیو گاندھی کو ایک بم دھماکے میں ہلاک کر دیا گیا۔ اس واقعہ سے ملک کو زبردست دھکہ لگا اور انتخابی عمل کو روکنا پڑا جو کہ تین ہفتے بعد پورا ہوا۔ حالیہ برسوں میں تشدد کے بڑھتے ہوئے واقعات نے اس کثیر الجہت بحران 'جس نے پورے ملک کو اپنی رو میں لے لیا ہے' کی جانب توجہ مبذول کرائی۔

سیاسی بحران کے ساتھ ساتھ ملک اقتصادی بحران سے بھی دوچار ہے۔ بھارت کے غیر ملکی زرِ مبادلہ کے لیے مجوزہ رقم میں زبردست کمی اور ادائیگی کے توازن میں زبردست خسارہ کے باعث زبردست تشویش لاحق ہوگئی ہے۔ جب نئی حکومت نے اقتدار سنبھالا اور تو ملک کے پاس محض ۸۱۱۰۵۲ ہزار کروڑ روپے کا غیر ملکی زرِ مبادلہ تھا جس سے صرف چار ہفتے کی درآمدات کی ضرورت مشکل ہی سے پوری ہوتی تھی۔

صدر جمہوریۂ ہند شری آر وینکٹ رمن نے ۱۱ر جولائی ۱۹۹۱ء کو دسویں لوک سبھا کے پہلے اجلاس کی ابتدا پر دونوں ایوان کے اراکین سے خطاب کرتے ہوئے کہا: "حکومت اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ ملک ایک غیر متوقع اقتصادی بحران کا شکار ہے ملک اپنے ذرائع سے زیادہ خرچ کرتا رہا ہے اور آسان طریقے اپناتا رہا ہے۔ ہم حالات سے مجبور ہوگئے ہیں۔ اب ہمیں کچھ کرنا چاہیئے۔ اپنی اقتصادی آزادی کے لیے حفاظت کے لیے کوئی بھی قربانی بڑی نہیں ہے اور ملک کو کچھ سخت اور ناگوار اقتصادی فیصلے لینے

کے لیے تیار رہنا چاہیئے۔

ساتویں پنجسالہ منصوبے (۸۶-۱۹۸۵ تا ۹۰-۱۹۸۹) کی مدت کے دوران ادائیگیوں کے توازن میں خسارہ مجموعی اندرون ملک پیداوار (جی ڈی پی) کا ۲۳ فیصد ہے جبکہ چھٹے پنجسالہ منصوبے کے دوران یہ ۱۲ فیصد تھا لیکن ۹۰-۱۹۸۹ کے دوران غیر ملکی زرمبادلہ کے لحاظ سے پیسہ نکالنے کے خصوصی حقوق (SDRs) اور ۸۹-۱۹۸۸ اور ۹۰-۱۹۸۹ میں برآمدات میں بالترتیب ۱۵ فیصد اور ۲۳ فیصد اضافہ کے باوجود یہ خسارہ بڑھ کر جی ڈی پی کا ۲۷ فیصد ہوگیا، یہ سب کچھ درآمدات کے لیے کی جانے والی ادائیگیوں میں تیزی سے اضافہ کے باعث ہوا۔

اس کا واحد حل یہ ہے کہ ممکنہ حد تک درآمدات میں کمی لائی جائے۔ ایسی اشیاء کی درآمدات میں کمی لانے کے لیے مشورے موصول ہوئے ہیں جو کہ نتیجۃً عیش و عشرت والی اشیاء تیار کرنے کے لیے ہوتی ہیں۔ پیداوار کے ایسے طریقہ کار کو ترک کرنے کے لیے ہوتی ہیں۔ پیداوار کے ایسے طریقہ کار کو ترک کرنے کے لیے بھی زور دار اپیل کی گئی ہے۔ جن میں بڑی بڑی مشینوں اور زیادہ بڑے سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور انکے چلانے کے لیے زیادہ توانائی کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ پیداوار کا ایسا طریقہ استعمال کرنے پر زور دیا گیا ہے جن سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو روزگار حاصل ہو۔ اسی کے ساتھ ساتھ بڑے بیوپاریوں اور کارخانوں پر زور دینا ہوگا کہ وہ نہ صرف اپنے درآمدات میں کمی کریں اور غیر ملکی زرمبادلہ کی ضروریات کو برآمدات کے ذریعہ پورا کریں۔ یہ تمام طویل مدتی اقدامات ہیں جن کا مقصد خود کفالت کو فروغ دینا ہے۔ تاہم یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ ملک کی برآمدات سے ہونے والی آمدنی کا ۳۰ فیصد حصہ ملک کے قرضوں کی ادائیگی میں چلا جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ملک میں سرمائے کی آمد تقریباً رک گئی ہے۔ یہ ملک کے غیر ملکی زرمبادلہ کے لیے محفوظ فنڈ میں تازہ ترین کمی کی وجہ ہے۔

اسی سلسلے میں حکومت بین الاقوامی مالیاتی فنڈ سے ایک بڑا قرضہ حاصل کرنے کے لیے اپنی ہر ممکن کوشش کر رہی ہے۔ وزیر خزانہ ڈاکٹر من موہن سنگھ جو عالمی شہرت یافتہ ماہر معاشیات ہیں، نے بین الاقوامی مالیاتی فنڈ سے قرضہ حاصل کرنے کی کوششوں کو صحیح بتاتے ہوئے یہ واضح کر دیا کہ قرضے سے متعلق شرائط کو تب ہی پورا کیا جائے گا جب وہ بھارت کے قومی مفادات سے مطابقت رکھتی ہوں۔

مختلف اصلاحی اقدامات کے ساتھ ہی قومی مفادات کی وضاحت کردی گئی تھی جس میں نئی صنعتی پالیسی بھی شامل ہے جس کا مقصد ملکی اور غیر ملکی غیر سرکاری اداروں کے دائرکار کو توسیع کرنا ہے اور سرکاری زمرے کے اداروں میں سرمایہ کاری کے رجحان کو ختم کرنا ہے۔ سرمایہ کو نکالنا ہے جن کی ماضی میں معیشت کو بلندیوں تک لیجانے کے لیے سرکاری طور پر مدد کی جاتی تھی۔ اس نئی صنعتی پالیسی کے اعلان سے صنعتی پالیسی سے متعلق پہلی قرارداد کافی حد تک کمزور پڑ جائے گی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ایم آر ٹی پی ایکٹ، جس کے ذریعے کمپنیوں کے لیے اثاثوں کی حد مقرر کی جاتی ہے اور غیر ملکی زرمبادلہ کے کنٹرول کے قانون جس کے ذریعہ بھارت میں غیر ملکی سرمائے پر کنٹرول رکھا جاتا ہے، میں زبردست ترامیم کی گئی ہیں۔ اقتصادی اقدامات میں تیز تر تبدیلی لانے والا عنصر یقیناً درست ہے۔ نئی حکومت کے سامنے سب سے اہم کام یہ ہے کہ وہ تبدیلی کے ساتھ ساتھ تسلسل کو قائم رکھے۔

بعد میں حکومت نے روپے کے تبادلے کی شرح میں رد و بدل کرنے کا فیصلہ کیا جسے عام زبان میں روپے کی قیمت میں کمی کرنا کہا جاتا ہے۔ تاہم سماج کے متعدد طبقات میں یہ اندیشے پائے جاتے ہیں کہ اس اقدامات سے افراطِ زر میں مزید اضافہ ہوگا۔ لیکن حکومت نے افراطِ زر پر قابو پانے کے لیے متعدد احتیاطی اقدامات کئے ہیں۔ ریزرو بینک آف انڈیا کے

برآمدات کی مقابلہ جاتی صلاحیت کو تسلیم کو مستحکم کرنے ملک سے سرمایہ باہر لیجانے کے لیے دی جانے والی ترغیبات کو کم کرنے کے، غیر ضروری درآمدات پر ہونے والے اخراجات کو کم کرنے اور سرمایہ کی صورت حال کو مستحکم بنانے کے لیے روپے کی شرح تبادلہ میں رد و بدل کی ہے۔

مئی تجارتی پالیسی اور صنعتی پالیسی کے تحت کیے گئے اقدامات سے ہماری برآمدات کی مقابلہ جاتی صلاحیت کو بڑھانے میں مزید مدد ملے گی۔ تاہم یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ کیا ہوتا ہے لیکن حکومت کی از سرِ نو یقین دہانی کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیئے یہ بات قابلِ ذکر ہے کیونکہ یہ اقتصادی پالیسی میں زبردست اصلاحات کے ساتھ ملک کے نظر انداز کمزور طبقے کی مدد کرنے کی حکومت کے عزم کی عکاسی کرتی ہے۔ لہٰذا اس کی اہمیت کو زیادہ تصور کیا جا سکتا ہے۔

جدید بھارت کے معماروں نے محروم طبقے کے لیے اس تشویش کا وقتاً فوقتاً اظہار کیا تھا ملک کو آزادی حاصل ہونیکے موقع پر قانون ساز اسمبلی میں اپنی تاریخی تقریر میں کہا تھا:

"بھارت کی خدمت سے مراد ان کروڑوں افراد کی خدمت کرنا ہے جو پریشان حال ہیں۔ اسکا مطلب غریبی جہالت اور مواقع میں عدم مساوات کو ختم کرنا ہے۔ ہمارے دور کے سب سے عظیم شخص کی یہ خواہش رہی ہے کہ ہر شخص کی آنکھ سے آنسو کو پونچھ دیا جائے، یہ کام ہمارے بس سے باہر ہو سکتا ہے لیکن ہمارا کام اس وقت تک ختم نہیں ہوگا جب تک لوگوں کی آنکھوں میں آنسو ہیں اور وہ پریشان حال ہیں"۔

یہ ہی وہ اغراض و مقاصد ہیں جمہوری اقدار میں ملبوس اس ملک کو کچھ خاص لوگوں یا فوجی تاناشاہی سے واضح طور پر ممیز کرتے ہیں۔ واشنگٹن پوسٹ میں شائع ہوئے مضمون میں جس کا ذکر شروع میں کیا گیا ہے، مضمون نگار کو بھارت میں انتخابی عمل کے بارے میں یہ اظہار رائے کرنا پڑتا، حالانکہ بعض بھارتی ریاستوں میں سیاست بری طرح سے مجرمانہ ذہنیت کی حامل ہوگئی ہے۔ لیکن دہلی اور ریاستوں میں حکومتیں انتخابات کے ذریعہ تبدیل ہوتی ہیں نہ کہ فوجی بغاوتوں کے ذریعے۔ مضمون نگار نے کہا کہ دو چیزیں یعنی موسم اور پارلیمانی جمہوری نظام بھارت کے لیے بالکل ٹھیک چل رہے ہیں؛

جمہوریت کی مضبوط جڑوں کا یہ ہی وہ پہلو ہے جسے بھارت کو درپیش کسی بحران کے بارے میں تبادلۂ خیالات کرتے ہو وقت نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیئے۔ سیاسی نظام کے جمہوری اخلاقی اصول اس نظام میں انقلابی تبدیلی کی بہترین ضمانت ہیں جو موجودہ صورتحال کے لیے موزوں ہوں۔ اس میں وہ طاقت پنہاں ہے جو بھارت کو ورثے میں ملی ہے وہی راستے میں آنے والی دشواریوں کو دور کرے گی۔

کے کے کھلر

اردو میں سفرنامے

سفرنامہ نہ صرف ایک دلچسپ داستان ہے بلکہ ایک اہم تاریخی ماخذ بھی ہو سکتا ہے۔ جیسے میگستھنز کا "انڈیکا" اور ہیونگ سانگ کا "سی یو کی"۔ میگستھنز یونانی بادشاہ سیلوکس کا سفیر تھا۔ جو سوریہ کے دربار پاٹلی پتر میں کئی سال رہا۔ اس سفر نے ۲۲ سو سال پہلے کے ہندوستان کے جو تفصیلی حالات قلمبند کئے ہیں جو کئی اسفار پر مبنی ہیں آنے والے کلاسیکی ادیبوں کے لئے بڑی معیاری حیثیت رکھتے تھے۔

یہ بدنصیبی ہے کہ میگستھنز کے تحریر کردہ حالات کا کوئی نسخہ باقی نہیں رہا۔ بلکہ بہت سے لاطینی اور یونانی مصنفوں نے کثرت سے ایسے استعمال کیا ہے۔ میگستھنز کے بیان کردہ حالات یقیناً ہماری خواہش کے مکمل اور درست نہیں ہوں گے۔ لیکن پھر بھی وہ اس اعتبار سے اہم ہیں کہ ایک بیرونی سیاح کی زبان سے ہندوستان کے متعلق یہ پہلا مربوط و معتبر بیان ہے۔ جب ہم میگستھنز کی تحریر کا مقابلہ کوٹلیا کے ارتھ شاستر سے کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ موریوں نے ملکی نظم و نسق کا منظم آزاد نظام اپنا رکھا تھا۔ جو ریاست کی پوری معاشی زندگی پر حاوی تھا اور ان کے پاس جاسوسی کا بھی بہت اچھا نظام تھا اس طرح چینی سیاحوں کے سفرنامے جن میں "فاہیان"، ہیونگ سانگ اور اولنگ شامل ہیں۔ اہم تاریخی ماخذ بن چکے ہیں۔ ہیون سانگ جو ساتویں صدی میں راجہ ہرش کے زمانے میں گوتم بدھ کے مقدس مقامات کی زیارت کے لئے ہندوستان آیا تھا اپنے سفرنامے "سی یو کی" میں لکھتا ہے۔ کہ ہندستان ایک خوشحال ملک جہاں دودھ کی ندیاں بہتی ہیں۔ یہاں کے لوگ سادہ اور پاک زندگی بسر کرتے ہیں اپنے گھروں کو تالا نہیں لگاتے۔ اور اپنے کھانے پینے کا سامان خود پیدا کرتے ہیں۔

سفرنامے کی ایک ادبی ثقافتی اور سماجی حیثیت بھی ہو سکتی ہے۔ جیسے "البیرونی" کا ہندوستان یعنی تحقیق ماللہند۔ یا پھر بابر کی ڈائری۔ تزک بابری، ان سب سفرناموں کے اردو میں ترجمے ہو چکے ہیں۔ اور نہایت دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ "ابن بطوطہ کا روزنامچہ" اور شہر دلی کی تفصیل۔ شاید کسی اور سیاح نے اتنی خوبصورتی سے نہ پیش کی ہوگی۔ جس طرح ابن بطوطہ نے محمد تغلق کا کردار جو ابن بطوطہ کے صفحات سے ابھرتا ہے۔ وہ شاید ہی کسی تاریخ سے ابھرتا ہو۔ اس طرح دلی کالج کا پڑھا ہوا وہ طالب علم جس کا نام موہن لال تھا۔ جس کے سفرنامے میں مہاراجہ رنجیت سنگھ اور شاہ عباس کے کرداروں کی وہ تصویر ہے۔ جو کسی اور جگہ نہیں ملتی۔

سفرنامہ ایک افسانہ بھی ہے اور ناول بھی جیسے سمرسٹ مہم کا افسانہ "بارش" یا وی ایس نیپال کے ناول

WOUNDED ENGLISH TEN AREA OF D

"زخمی تہذیب" اور ای ایم

اتیر کا علاقہ اور فراد چودھری کا

پت م سفرنامے اپنے PASSAGE TO

ادب ہیں۔ اور ادبی تاریخ میں اپنا مقام

ـ

میں سفرنگاری کی عمر دو سو سال سے

ہیں ہے۔ لیکن خطوط کے ذریعہ سیاحوں

جن میں اپنے احباب و اکرام کو اپنی خیریت

سماجی، معاشرتی، جغرافیائی حالات لکھے

ہیں۔ ویسے تو انیسویں صدی میں ایسے خطوط

میں کا انبار لگا ہوا ہے۔ لیکن ایک ایسا سفرنامہ

سے سفرنگاری کو اہمیت دی جانے لگی

ات فرنگ جو ۱۸۴۷ء میں دلی سے چھپا

نام یوسف خان کمبل پوش جنہوں نے ۱۹۴۷ء

سفر کیا۔ منشی نول کشور نے ۱۸۵۸ء میں اس

دوسرا ایڈیشن چھاپا۔ کمبل پوش حیدرآباد

الے تھے۔

وہ دیش بدیش گھومتے رہے لیکن بالآخر انہیں

د واپس لے آیا۔ کمبل پوش کے ہندوستانی

موجود ہیں۔ خاص کر کلکتہ، ڈھاکہ اور

نامے۔ جو نئی نئی معلومات سے بھرپور

کا انداز نہایت دلچسپ ایکبار شروع کر د

یکل ہے۔

۱۸ء میں سید کریم علی نے "باغ و بہار"

ردو سے شروع ہوا۔ ۱۸۵۹ء میں منشی امین

سفرنامہ امین چند "لکھا جو کوہ نور

سے شائع ہوا۔ ۱۸۶۷ء میں مرزا کاظم

اپنا سفرنامہ لکھا جو مرادآباد سے چھپا

میں مولوی سمیع اللہ نے سفرنامہ لندن لکھا

ء میں امروہہ سے چھپا۔

سرسید احمد خان کا سفرنامہ پنجاب ۱۸۸۴ء میں اقبال علی نے مرتب اور شائع کیا۔ سرسید کا مسافران لندن" بھی اعتبار کا درجہ رکھتا ہے۔ محمد عمر علی خان رئیس کا "آئینہ فرنگ" اور سفر لنکا بھی کافی دلچسپ ہے۔ بابو اما شنکر کا سفر یورپ، آئینہ سکندری، اور شبلی نعمانی کا سفرنامہ "روم مصر و شام" بھی دلچسپی سے خالی نہیں

اردو ادب میں حاجیوں کے سفرنامے بھی لاتعداد ہیں۔ لیکن محمد لطیف مجلی شہری کا سفرنامہ "حج" دوسرے حاجیوں کے سفرناموں سے مختلف ہے۔ خواجہ حسن نظامی کا سفرنامہ "روزنامہ باتصویر سفر مصر و شام و حجاز" نہایت دلکش اور دلچسپ ہے۔ سید احتشام حسین کا سفرنامہ "ساحل اور سمندر"، عابد حسین کا "ذوق و شوق"، قاضی محمد عبدالغفار کا "نقش فرنگ" اہم ہیں۔ خواجہ احمد عباس کا سفرنامہ "مسافر کی ڈائری" بھی قابل ذکر ہے۔

وہ ادیب جن کے سفرنامے پاکستان سے متعلق ہیں ان کی فہرست بہت لمبی ہے۔ رام ناتھ، جگن ناتھ آزاد، بلراج کومل، سنتوش کمار، رفعت سروش کی "یادوں کے ماند ستارے" جو ۲۲ دن کا سفر دلی سے کراچی تک ۱۹۸۲ء میں طبع ہوا۔ لیکن چھپا ۱۹۹۵ء میں۔ ادھر پاکستان میں بھی سفرناموں کی کمی نہیں۔ ان ادیبوں کے سفرناموں جو ہندوستان آتے ہیں۔ انتظار حسین، قسان فتح پوری، تسہیل اروی، عطاء الحق قاسمی، یعنی دونوں طرف سے آگے برابر کی ہوئی۔ آل احمد سرور بھی اس دوڑ میں پیچھے نہیں۔ "میں نے امریکا کو کیسا پایا"۔ مجتبیٰ حسین "جاپان چلو"، جگن ناتھ آزاد "برما میں اردو"، "برطانیہ میں اردو"، "فرانس میں اردو"، "کینیڈا میں اردو" کے عنوان سے سفرناموں کی شکل میں کئی مضامین اخبارات اور رسائل میں چھپ چکے ہیں۔

پاکستان میں ابن انشا، حمزہ فاروقی اور جمیل الزین عالی کے سفرناموں کی کافی اہمیت ہے۔ ہندوستان میں ثریا حسین کا "پیرس و پارس" اور ڈاکٹر سید محمد عقیل کا "لندن او لندن" قابل توجہ سفرنامے ہیں۔

ان تمام سفرناموں میں سنتوش کمار کا "لاہور نامہ" بالکل مختلف سفرنامہ ہے۔ یہ سفرنامہ ۱۹۸۳ء میں چھپا اور آج تک پڑھا جا رہا ہے۔ کیوں کہ اس میں عوامی زندگی ہے۔ لاہور کا ماحول ہے۔ سنتوش کمار کشمیری ہیں۔ لیکن پنجابی اور اردو کے لہجے کو خوب سمجھتے ہیں۔ ویسے تو یہ سفرنامہ روزنامہ "پرتاپ" کے سنڈے اڈیشنوں میں چھپ چکا ہے۔ لیکن اس سفرنامے سے لطف اندوز ہونے کے لئے اسے ایک وقت پڑھنا ضروری ہے۔ اس سفرنامے کے کردار زندہ ہیں جو سوچتے ہیں اور بولتے ہیں۔

لاہور کے ٹوپیوں والے بازار کا سین ملاحظہ ہو:۔

وہ رونق جو پہلے ہوا کرتی تھی وہی اب بھی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے کوئی بھگوان داس مال بیچتا تھا اب عبدالرشید بیچ رہا ہے۔ پہلے بے پردہ ہندوانیوں کی بھیڑ ہوتی تھی اب بے پردہ مسلمانیوں کے ٹھٹھ تھے۔ دکاندار آج بھی "بہن جی" کہہ کر عورتوں سے مخاطب ہوتے ہیں اور دکاندار کل بھی "بہن جی" کہہ کر پکارتے تھے۔

لاہور بھگوان رام کے بیٹے "لو" کے نام سے آباد ہوا۔ پاکستان کے محکمہ آثار قدیمہ کا گائیڈ آج بھی ہر سیاح کو لو سے شروع کرتا ہے۔ گوتم بدھ کو وہ اپنے زمانے کا سب سے خوبصورت شہزادہ بتاتا ہے۔ لیکن جب سنتوش کمار دیکھتا ہے کہ وچھووالی کے مندر کو چھوتی ہوئی چھوٹی سی نہر جو لاہور کے کچھ دروازہ کے باہر سبزہ زاروں کو سیراب کرتی تھی بند کر دی گئی ہے تو اسے دکھ ہوتا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

"وہ نہ جانے کیوں بند کر دی گئی ہے۔ بچے سارا دن نہایا کرتے تھے۔ لوہاری دروازے کے باہر والی مسجد کے نمازی اس کے پانی سے وضو کرتے تھے۔ اور جب کبھی میونسپل نل بند ہو جاتے تھے تو بھائی منوہر لال کے مندر کی مورتیوں کو اس پانی سے اشنان کرایا جاتا تھا۔"

سنتوش کمار کی استاد دامن سے ملاقات بھی اعلیٰ فن کا نمونہ ہے۔ استاد نے بڑھی عمر میں گیتا پڑھنے کیلئے سنسکرت سیکھی۔ حالانکہ دل محمد کی منظوم "گیتا" موجود تھی۔

اور پھر ہندو خاتون جگت مائی کا قصہ۔ جس نے اگست ۱۹۴۷ء کے فسادات کے بعد اپنے جوان بیٹے کے انتظار میں لاہور چھوڑنے سے انکار کر دیا تھا۔ جب ۴۷ء کی دیوالی آئی تو صرف اس کے گھر میں دیئے جلے اور خود مٹھائی بنائی اور محلے والوں میں بانٹی۔ پھر یہ ہوا کہ کسی کے گھر کوئی بیمار پڑا تو اس کے ہاں تیمارداری کے لئے پہنچ گئی۔ نہ جانے اس کے قدموں میں کیسی سچائی تھی کہ جس کے گھر میں قدم پڑے دلی مرادیں پوری ہونے لگیں۔ اور پھر جب اس کی شہرت اور خلوص سارے لاہور میں پھیل گیا تو وہ جگت مائی کہلانے لگی۔ پندرہ سال بعد یعنی ۱۹۶۲ء میں وہ مر گئی۔

باقی سنتوش کمار کی زبانی سنیئے:۔

"محلے والوں نے اکٹھا ہو کر فیصلہ کیا کہ میت کو نہایت احترام کے ساتھ قبرستان لے جا کر دفن کر دیا جائے۔ ڈولا لانے کیلئے ایک محلے دار مسجد پہونچا۔ تو فرشتہ صورت مولوی صاحب پوچھ بیٹھے کہ موت کس کے ہاں ہوئی ہے بتانے پر کہ وہ ہندو بڑھیا چل بسی ہے اسے لے جانا ہے مولوی

صاحب خود کوچہ میں آگئے اور سب کو اکٹھا کر کے بولے دیکھو اب وہ مر چکی ہے اسے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ اس کی لاش کیسے ٹھکانے لگتی ہے۔ لیکن ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ وہ آخری دم تک ہندو رہی تھی۔ اور ہمارے ایمان کا تقاضا ہے کہ اس کی آخری رسوم بھی ہندو رسم و رواج کے مطابق ادا کی جائیں "

مولوی صاحب کی بات لوگوں کی سمجھ میں آگئی ہندو رسم و رواج اور قاعدے کے مطابق جگ مائی کی ارتھی اٹھائی گئی۔ کندھا دینے والے لاہور کے بوڑھے مسلمان "رام نام ست ہے" پکارنے لگے۔ پکارتے پکارتے وہ میت کو دریائے راوی کے کنارے لے گئے۔ محلے والوں نے اپنی یادوں کے مطابق جگ مائی کی چتا روشن کی اور پھر چوتھے روز یعنی تین روز کے بعد اس کی سرد راکھ دریا برد کر دی گئی۔

میں سعادت حسن منٹو کے افسانوں کو سفرنامہ کہتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ لیکن زحمت مہر درخشاں جو بعد میں اس کے افسانہ "ٹھنڈا گوشت" کا دیباچہ بنا اس کو سفرنامہ مانتا ہوں اس میں نہ صرف متحدہ پنجاب زندہ ہے بلکہ پاکستانی لاہور بھی۔

میری فہرست میں آخری سفرنامہ ہے "کارِ جہاں دراز ہے" جو اقبال کے نسخہ سے کافی آگے نکل چکا ہے۔ اور جس کی مصنفہ ہیں قرۃ العین حیدر۔ شعور کی رو کو برقرار رکھنے والی گیان پیٹھ۔ ایوارڈ انعام یافتہ۔ یہ کتاب جو بظاہر ناول ہے۔ لیکن سفرنامے کی ہر شرط پر پوری اترتی ہے۔ اس سفرنامے کی اپنی قیام گاہیں ہیں۔ اس سفرنامے کے اپنے صنم خانے ہیں۔ اس میں آگ کا دریا بھی ہے اور پت جھڑ کی آواز بھی اس میں صبح کے ستارے بھی ہیں اور آخری شب کے ہم سفر بھی۔ اس میں انیسویں صدی بھی ہے اور اکیسویں صدی بھی جس کا حدود اربعہ ساری دنیا ہے لیکن اس کا دارالخلافہ انسانی دل ہے۔ یہ سفر ایسے راستوں سے گزرتا ہے۔ جو ایکدم مل کے پھر بچھڑ جاتے ہیں۔ اور بچھڑ کے پھر ملتے ہیں۔ پہاڑی راستوں کی طرح یہ زندگی کے انداز کو سمجھتے ہیں۔ وہ انسانی راستہ جو آپس میں دور رہنے کے باوجود اس طرح وابستہ ہیں جس طرح پھول سے خوشبو۔ سفرنامہ ادب میں بہت پرانی صنف ہے۔ تاریخ میں اس کا مقام ہے۔ اور زندگی اس کے بغیر ادھوری ہے۔

حفص پن ووین

اس دور کا انسان

حیف کیا ہو گیا اس دور کے انسانوں کو
شرم آتی ہے جنہیں دیکھ کے حیوانوں کو

امن کی بات کریں جنگ کے سامان کریں
کیا سودا ہوا ان سر پھرے دیوانوں کو

ہے ابھی وقت کہ دنیا کو تباہی سے بچا
کر دے برباد تو ان جنگ کے سامانوں کو

دور شاہی جو گیا دور جمہوری آیا
بنگلے بنوائے گئے توڑ کے ایوانوں کو

تعجب ہوتا ہے اس دور ترقی میں بھی
بڑھتی جاتی ہے پریشانی پریشانوں کو

ہر طرف فرقہ پرستی کی ہے آندھی پر تیز
روکنا ہے ہمیں اٹھتے ہوئے طوفانوں کو

ماضی کے آئینہ سے

جاں نثار اختر

ایک دوست کے نام

(شاعرِ اعظم پوشکن کی نظم "Kzaadaeby" کا ترجمہ)

کبھی کھوئے تھے ہم محبت کے ترانوں میں
کشش محسوس ہوتی تھی وفا کی داستانوں میں
امیدوں کی حسیں شہنائیاں دل کو رجھاتی تھیں
خموشی سے اُبھرتی شہرتیں ہم کو بُلاتی تھیں
مگر یہ دِل رُبا دھوکے ہمیں اپنا نہیں پائے
یہ بہلاوے بہت دن تک ہمیں بہلا نہیں پائے
کوئی دل میں جوانی کا فریبِ آرزو ٹوٹا
حقیقت اس طرح اُبھری طلسمِ رنگ و بو ٹوٹا

کہ جیسے انکھڑیوں سے خواب کوئی دُور ہو جائے
کہ جیسے صبح کا کہرا کہیں کافور ہو جائے
دھندلکے چھٹ گئے آنکھوں سے جھوٹی آرزوؤں کے
ہمارے دل میں اب اک زندگی کی شمع روشن ہے
ہوا کیا وقت کے منحوس فولادی شکنجے میں،
اگر اپنی تڑپتی رُوح کا خاموش مسکن ہے
ہماری رُوح پھر بھی گوش بر آواز رہتی ہے
کہ ہونٹوں پر وطن کے اک دبی فریاد و شیون ہے

اُمیدیں مضمحل ہیں، پھر بھی آزادی کے لمحے کا !!
اُسی بے تاب شدت سے ہمیں ہے انتظار اب تک
اگر رگ رگ میں اپنی زندگی کی آگ باقی ہے
اگر کچھ آبرومندی کا دل میں راگ باقی ہے
تو آؤ دوست، اس اپنی زمیں کو ہم چمن کر دیں
اُبلتے ولولوں کی زندگی، نذرِ وطن کر دیں
یقیں رکھنا مرے ہمدم یقیں اس عہدِ مبہم پر
کسی صورت ہو لیکن چارۂ دردِ بشر ہو گا
وہ تارا جو ہر اک دل کو خوشی سے گھیر لیتا ہے
وہ تارا زندگانی کے اُفق پر جلوہ گر ہو گا
ہمارا مُلک جو مدت سے گہری نیند سوتا ہے
یکایک جاگ جائے گا جو اعلانِ سحر ہو گا
نظامِ کہنہ کے ٹوٹے ہوئے ایک ایک ٹکڑے پر
ہمارا اور تمہارا نام ہی زیبِ نظر ہو گا

(آئینہ بمبئی، فروری ۱۹۶۵ء)

[illegible] ملاح

احمد ہمیش

نسلی اذیت کے منظر میں کوّے اور گِدھ، دُور سے اُڑتے
آئے
اور مُردہ افق کو نوالا سمجھ کر اُسے نوچ کھانے کو دَوڑے!
ہوا نے بھلاوا دیا ۔
ٹوٹ کے جانے والی شعاعیں نہ تھیں ۔ گوشت سے
لوتھڑے تھے کرچ کے فیتے
مگر اب تو مٹی کے پُر تاریک، اندھے تراشے ہی گرتے ہیں.
حیرت. کرن بھر کی مہمان ہے.
اور ہر بار دنیا کے دُہرائے اَوراق میں، وقت، مفہوم رٹتا ہے
گراں باریٔ نیست سے کوئی جانے کو ہے.
سطحِ مافیہا سے روشنی اور پانی اور خشکی اور صفر صد الک ہر روز،
کشکول صورت خلاء، اگلے پچھلے جہاں اور صدیوں کو آنکھوں
کے مبہوت جانے میں اک لمحہ مرکوز کرتا ہے.
دَرد کے سَیل جانکاہ میں، ہڈیاں، ٹوٹنے والے چپّو اور
چکراتی ناؤ،

اور مَلاّح کے بازوؤں سے بچھڑ کر بکھرنے کو ہیں ۔
پسلیوں کی دَرازوں میں گھائل پرندوں کے ڈَینے اُلجھ
سے گئے ہیں.
پھینک دو اِن دواؤں کو ۔ منحوس بوتل کے سُوراخ میں
کاگ دَبنے لگا ہے!
خاک انگیز مَردُم شماری کے صفحہ پلٹنے سے پہلے ہی،
توڑ دو کاگ کو ۔ ہم سبھی کاگ ہیں اور ہر روز بوتل کے
سُوراخ سے ہو کر، بوتل کے کُوئیں میں گرتے ہیں ۔ گرتے
ہیں. اُٹھتے نہیں!
سامنے ایک مُردہ افق جھک رہا ہے.
کوّے اور گِدھ دُور سے اُڑتے آتے ہیں!

(آئینہ، بمبئی. فروری ۱۹۶۵ء)

تحریر: انور خان

"قند و زقند"

اردو میں غالب کے خطوط، اودھ پنچ، پطرس، شوکت تھانوی، شفیق الرحمٰن، رشید احمد صدیقی — کنہیا لال کپور، فکر تونسوی سے مشتاق احمد یوسفی تک طنز و مزاح کی ایک شاندار روایت رہی ہے۔ قارئین نے انہیں بڑی محبت دی ہے اور ان کے مضامین کو ڈھونڈ کر پڑھا ہے۔ ان کی کتابوں کے کئی کئی ایڈیشن نکلے ہیں اور آج بھی لوگ انہیں پڑھتے ہیں۔ لیکن ادھر دہائیوں سے کسی مزاح نگار کو ایسی مقبولیت نصیب نہیں ہوئی۔ مجتبیٰ حسین کی کتابیں البتہ پسند کی جاتی ہیں۔

ادھر شگفتہ، مزاحیہ انداز کے ہلکی پھلکی کالم نگاری نے بڑا رواج پایا ہے۔ چنانچہ مشفق خواجہ، عطاء الحق قاسمی اور انتظار حسین کے کالم بڑے مقبول ہوئے ہیں۔ اور چونکہ کالم بھی مضامین کی طرح کسی بھی موضوع پر لکھے جاتے ہیں اور پھر وہ عصر حاضر میں ہونے والے سیاسی، ادبی واقعات اور صورت حال سے جڑے ہوتے ہیں، قارئین کی فوری دلچسپی کا باعث ہوتے ہیں۔ اس لئے مزاح نگار کے لئے انہیں اپنی طرف متوجہ کرنا خاصا مشکل ہو گیا ہے تا وقتیکہ کہ واقعی اس کے پاس کچھ کہنے کے لئے نہ ہو۔

اس صورت حال میں ہمارے دوست جناب فیاض احمد فیضی کے مضامین کا پہلا مجموعہ "قند و زقند" شائع ہوا ہے۔ کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ فیضی کو زبان پر خاصا قابو ہے۔ چن چن کر زبان و بیان کی غلطیاں نکالنے کی بات اور ہے لیکن آج جب بیشتر نوجوان اچھی نثر لکھنے پر قادر نہیں۔ فیضی بڑی خوبصورت اور پیاری نثر لکھتے ہیں۔ اپنی بات شگفتہ لب و لہجے میں کہنے پر وہ قادر ہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ کم از کم یہ دو باتیں ضرور ثابت کرتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مزاح پر کسی کی پہلی کتاب سے اگر ہماری یہ دو توقعات پوری اترتی ہیں تو ہم سمجھ سکتے ہیں کہ یہ شخص آئندہ بحیثیت مزاح نگار اپنی پہچان بنا سکتا ہے۔

فیضی ایسے وقت میں اپنی کشتی کھینے کی کوشش کر رہے ہیں جب ہوا ان کے مخالف ہے۔ آج کا قاری کنہیا لال کپور کے تیر و نشتر کا طلبگار ہے۔ زہرخند تاریک طربیہ اور دل ہلا دینے والا تمسخر چاہتا ہے، الیکشن، لیڈر، ہڑتال جیسے معصوم عنوانات کے تحت مضامین اب اسکول اور کالج کے لڑکوں کیلئے چھوڑ دینا چاہیئے۔ سیاست آج کا بنیادی استعارہ ہے۔ اور یہ ہماری بدقسمتی رہی ہے کہ ہمارے بیشتر مزاح نگار یا تو سرکاری ملازمتوں میں رہے ہیں یا درسگاہوں کے اسیر۔ اور دونوں ہی مقامات مزاح نگار کے لئے مردہ گھر سے کم نہیں۔ دونوں ہی ضابطوں سے بندھے ہوئے ہیں اور لکھنے میں بے حد محتاط۔ یہ احتیاط ان کے مزاج کا حصہ بن جاتی ہے اور بات یہاں تک پہنچتی ہے کہ ایسے جملے جن سے لیڈر کی پیشانی پر شکن پڑے یا مولوی کو نقص امن کا موقع ملے ذہن نیا ابھرنے سے پہلے ہی دم توڑ دیتے ہیں۔ چنانچہ ایک ایسا مزاح وجود میں آتا ہے، جس میں ہلکی پھلکی باتیں، ہلکے پھلکے انداز میں کہی جاتی ہیں۔ سامعین وقتی طور پر لطف اندوز ہو بھی لیں تو ہال کے باہر قدم رکھتے ہیں۔ ایسے فراموش کر دیتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی اثر اس وقت ہوتا ہے جب یہ رسالوں میں شائع ہوتے ہیں کہ قاری جب رسالہ ہاتھ

رکھتا ہے تو ان مضامین کو بھول چکا ہوتا ہے۔

ایسے مزاح نگار جب ان موضوعات پر لکھتے بھی ہیں تو سو اسکول کے جوابی مضمونوں کی طرح۔ الیکشن، برسات کا ایک دن، لیڈر کی ہڑتال۔ مزدور وغیرہ۔

فیاض احمد فیضی اس میدان میں تازہ وارد ہیں گزشتہ دس پندرہ سال میں شائع ہوئے اپنے تقریباً سارے ہی مضامین انہوں نے اس کتاب میں یک جا کر دیئے ہیں۔ بہتر ہوتا کہ وہ ان میں سے چند اچھے مضامین کا انتخاب کرتے۔ چند بالکل ابتدائی مضامین جیسے ہم کے کلرک بن گئے۔ رسوا، دشمنی ہزار نعمت ہے، برسات کی یاد میں وغیرہ نکال دیتے کہ اسطرح کے مضامین کو کتابی شکل میں دیکھ کر مصنف کو بھلے ہی طمانیت محسوس ہو۔ قاری ممکن ہے کتاب رکھ دینے کے بعد دوبارہ نہ اٹھائے۔ بعض اوقات یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ مضامین کو ایڈٹ کیا جاتا تو بہتر ہوتا کہ مصنف نے اپنی دانست میں موضوع کے متعلق جتنی باتیں وہ سوچ رکھتا تھا ایک ہی مضمون میں لکھ ڈالی ہیں جس سے بوجھل پن پیدا ہو گیا ہے۔ بمبئی کی لوکل ٹرین میں دفتر کے اوقات میں سفر کرنا ایک نادر تجربہ ہے۔ جو لوگ تفریح کی غرض سے بمبئی آتے ہیں۔ انہیں اس کا لطف ضرور لینا چاہیئے۔ اگر اسے برداشت نہ کر سکیں ورنہ فیضی کا سفر نامہ لوکل ٹرین، پڑھ لینا چاہیئے۔ یہ مضمون سفر ناموں میں ایک نیا اور منفرد مضمون ہے۔

آج مزاح پر جس معیار کی کتابیں شائع ہو رہی ہیں ان سے مجھے یہ کتاب بہتر نہیں تو کمتر بھی نہیں لگی اور ان کتابوں سے تو یقیناً یہ کتاب بہتر ہے جن میں اخبار کے اتواری کالموں کو یکجا کر کے مزاحیہ مضامین کا نام دیا جاتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ بے ضرر قسم کا، مزاح نہ لکھیں بلکہ ایسی باتیں کہیں کہ جن سے منافق لوگوں کو تکلیف ہو۔ ان کی تحریروں میں قاری کو اپنا مکروہ، منافق چہرہ نظر آئے کہ لوگ اب اس قدر کرپٹ ہو چکے ہیں کہ اپنی حرکتوں پر انہیں شرم بھی نہیں آتی۔ آج ادب میں، سیاست میں بلکہ زندگی کے ہر میدان میں جو صورت حال ہے اس کے لئے ہم سب ذمہ دار ہیں۔ ہر شخص ذمہ دار ہے۔ اور آج کے ادیب کی تحریروں میں اس کا عکس بے حد ضروری ہے۔

میں جناب فیضی کو اسی خوبصورت کتاب پر مبارکباد دیتا ہوں اور خوب سے خوب تر کی توقعات کے ساتھ ■

کتاب :- چراغِ چشمِ تر (شعری مجموعہ)
شاعر :- ظفر گورکھپوری
ناشر :- خالد ظفر۔ رچنا پبلی کیشنز
۲۰۲/اے فلور یڈا، شاستری نگر
اندھیری (مغرب) بمبئی ۵۸ ... ۴۰۰
ملنے کا پتہ :- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، علی گڑھ، بمبئی
قیمت :- چالیس روپے
مبصر :- م۔ ناگ

زیر تبصرہ کتاب "چراغ چشم تر" ظفر گورکھپوری کا چھٹا شعری مجموعہ ہے جو ان کے جواں سال مرحوم بیٹے جاوید ظفر (۶۴ - ۱۹۸۸) کی یادوں سے منسوب ہے ظفر نے کچھ اسطرح اپنی تنہائی شدت غم موت اور زیست کے ناقابل فہم سلسلے اور پھر اپنے بیٹے کی موت کے حادثے کو موجودہ عہد کے تناظر اور جدید شاعری کے لب و لہجہ میں پیش کیا ہے کہ غم ذات غم کائنات بن گیا ہے۔ اس مجموعے کی غزلیات اس قیامت کے دن کی سوغات ہیں جب ان کے بیٹے جاوید ظفر نے آخری سانس لی۔

ظفر گورکھپوری کی مسلسل غزلیں بے اختیار دل میں تیر ونشتر کے مانند خلش پیدا کرتی ہیں۔ ان میں شدت جذبات بھی ہیں اور صنعت کلام بھی درد و کرب بعض مقامات پر فلسفیانہ حد تک پہنچ گیا ہے۔ تاہم شاعرانہ سوز و گداز برقرار ہے غزلوں میں کہیں بھرتی کے اشعار نہیں ہیں اور نہ کہیں کوشش اور کاوش کا دخل نظر آتا ہے بلکہ ایسا لگتا ہے جیسے جذبے کی شدت نے لفظوں کا قالب اختیار کر لیا ہو۔

اس سے پیشتر اردو شاعری میں کئی اچھے شخصی مرثیے لکھے گئے لیکن اس دکھ کی آگ کو ظفر نے اپنی روح میں کچھ اسطرح رچایا ہے۔ کہ اس کے بے ساختہ اظہار نے ایک پورے شعری مجموعے کا روپ لے لیا۔
نظام صدیقی رقم طراز ہیں ــ

"ظفر گورکھپوری نے ذاتی غم کو آفاقی بنا دیا ہے

ان کی غزلیہ شاعری میں بیک وقت ایک ایسی جمالیاتی اور اقداری قوت ہے جو قاری کی پوری ذات کو شدید طور پر متاثر کرتی ہے۔ اس کو نچلی سطح سے بلند کر کے اعلیٰ وارفع سطح پر لے جاتی ہے اور اسکی روح کی گہرائیوں میں اتر کر اسکو روحانی سکون بخشتی ہے''

ظفر کی نظمیں کسی KELIDOSCOPE کی مانند لگی ہیں کہ جس میں چوڑیوں کے رنگین ٹکڑے گھما گھما کر ہم طرح طرح کے پھول۔ کئی طرح کے ڈیزائن بناتے ہیں بالکل اسی طرح الگ الگ زاویوں اور پہلوؤں سے درد پھوٹتا ہے، پھوٹتا ہے اور تڑپاتا ہے۔ نظم "لفظوں کی بھیگی آنکھیں" میں ایک باپ کے دکھے ہوئے مجروح دل کی دلدوز پکار ہے۔ یہ نظم بیٹے کی لاش کو جنازے میں رکھتے وقت کا روحانی منظرنامہ ہے ایک دوسری نظم "قرض مٹی کا" میں لاش قبر میں رکھی جا چکی ہے اور باپ کی مٹھی میں وہ مٹی لرز رہی ہے جو قبر میں ڈالی جائے گی۔ چوبیس سال تک بیٹا ان کے دکھ سکھ میں شریک رہا۔ غمگساری کا وہ قرض ایک مٹھی بھر مٹی سے کیسے بے باک ہوگا؟۔
ایک اور نظم "دلاسہ" میں ظفر کی انفرادیت بے اختیار آفاقیت سے ہم کنار ہو جاتی ہے اور تزکیۂ نفس کرتی ہے جو المیہ شاعری کا بنیادی وصف ہے۔ اس کے علاوہ گاؤں کی دہلیز پر، کھلونے کا زخم، پرسہ، صبر جمیل بڑی موثر اور رچنے والی نظمیں ہیں۔

پل صراط کے ہم سفر ایک قابل ذکر نظم ہے۔ زندگی کے پل صراط پر سوگوار باپ اپنے بیٹے کو دفن کرنے کے بعد دل فگار رماں کے ساتھ گزر رہا ہے۔ پہلے اس کے کاندھوں پر مستقبل کے خوابوں کی گٹھریاں لدی تھیں اب کاندھے پر انھیں خوابوں کی لاشیں ہیں۔

نظموں کے برجستہ اظہار میں جذباتی قوت، شدت تاثر اور جمالیاتی لالہ کاری پیدا ہو گئی ہے یہ نظمیں واقعاتی نہیں ہیں بلکہ تخلیقی عمل سے گزرنے کے بعد یہ نظمیں فن کا بہترین نمونہ بن گئی ہیں۔
بلاشبہ ظفر نے تمام فکری ادوار کی حدیں پھلانگ کر اپنی آواز کو پالیا ہے ۳۵ غزلوں، ۴۲ نظموں، ایک حمد، ایک گیت کے علاوہ اس مجموعہ میں ظفر گورکھپوری کا لکھا ہوا ایک مضمون بھی ہے جس میں انھوں نے اپنے بیٹے جاوید ظفر کے شب وروز، اس کی عادتوں، سلوک اور سروکار سے متعلق تفصیلات دی ہیں اس کے علاوہ سردار جعفری کی ایک تحریر بھی کتاب کے شروع میں دی گئی ہے کتاب کے آخر میں سیاست دانوں اور دانشوروں کے تعزیت ناموں کو بھی شامل کیا گیا ہے، جو ظفر کو ارسال کئے گئے۔

یہ خوبصورت مجموعہ بلاشبہ اردو شاعری میں اضافے کی حیثیت رکھتا ہے سرورق ساجد رشید نے بنایا ہے کتابت اور طباعت اعلیٰ درجے کی ہے۔

* بسنت کمار بسنت (ایڈوکیٹ)
۲۵۱/۲۹ - ٹیڑھی بازار، رکاب گنج - لکھنؤ (یو۔پی)

یہ دھرتی سونا اگلے گی!

(۱)

یہ دھرتی سونا اگلے گی   یہ دھرتی اک دن مہکے گی
اس دھرتی کا سنگار کرو
اس دھرتی سے تم پیار کرو

پھیلی ہے ہمالہ سے لے کر یہ دھرتی کنیا کماری تک
بنگال کی کھاڑی سے لے کر کشمیر کی ٹھنڈی وادی تک
ندیاں، نہریں، چشمے، جھرنے، یہ گنگا جل وہ جمنا جل
یہ جھومتی گاتی مست پون چھائے ہوئے ساون کے بادل
برکھا کی پھواریں یہ رم جھم بادل کی گرج بجلی کی چمک
یہ بیلے جوہی، چمیلی کی اور رات کی رانی کی یہ مہک
کوئل، مینا، بلبل، طوطے، سب پیار کے نغمے گاتے ہیں
مل جل کے رہو سب کہتے ہیں سب من کا میل مٹاتے ہیں
انسان نے دھرم بنایا ہے، سب مل کے جئیں سب مل کے رہیں،
ہندو مسلم سکھ ایک ہیں سب اک ساتھ رہیں اک ساتھ چلیں
یہ دھرتی سونا اگلے گی۔!   یہ دھرتی اک دن مہکے گی
اس دھرتی کا سنگار کرو
اس دھرتی سے تم پیار کرو

(۲)

یہ ہرش، اشوک کی نانک کی، یہ چشتی اکبر کی دھرتی
یہ شور، کبیر کی تلسی کی یہ گوتم میرا کی نگری
یہ بندرابن کے سندر بن یہ متھرا کاشی پنچ وٹی
یہ بٹھوا۔ل، ہر کی پوڑی یہ رام لکشمن کی بستی!
یہ گنگا، جمنا کا سنگم، کاویری، کرشنا، گوداوری
یہ سرجو اور ایودھیا کی شبھ پاون رام جنم بھومی
اس دیش کے بسنے والوں کے سب ایک ہی رشتے ناطے ہیں
سب پیار کی مدرا پیتے ہیں ہر سمت امرت برساتے ہیں
سب ایک ہی مدرا پیتے ہیں سب ایک ہی رشتے ناطے ہیں
انسان نے دھرم بنایا ہے۔ سب مل کے رہیں سب مل کے جئیں
ہندو مسلم سکھ ایک ہیں سب ایک ساتھ رہیں اک ساتھ چلیں
یہ دھرتی ہے سونا اگلے گی   یہ دھرتی اک دن مہکے گی!
اس دھرتی کا سنگار کرو!
اس دھرتی سے تم پیار کرو

(۳)

ہر رنگ کے پھول سے پودے سے سبزے سے کلی سے پیار کرو
نفرت کی کہیں بھی بو نہ رہے گلشن میں سبھی سے پیار کرو
ہے دھرم ایک مانوتا کا اس دھرم کو تم سویکار کرو!
اُدھار کرو، اُپکار کرو، ہر انسان کو بیدار کرو
کردار بنا تم اپنا، تم بھارت کے ہر انسان کا
وہ بات کرو، وہ کام کرو جس سے دیش کا نام اونچا
بھارت ہے وہی جو پہلے تھا اور ہے وہی سمجھے کی لنکا
ہے کرشن، سدآماں، گوپیوں کا گوکل میں جلناتھ کا پرچم
اس جنا تٹ پر آج بھی تو کرشن آ کر گوپیاں چراتے ہیں،
رادھا سنگ ناچتے گاتے ہیں اور مدھر بنسی بجاتے ہیں!
انسان نے دھرم بنایا ہے، سب مل کے جئیں سب مل کے رہیں
ہندو، مسلم، سکھ ایک ہیں سب اک ساتھ رہیں سب اک ساتھ چلیں
یہ دھرتی سونا اگلے گی   یہ دھرتی اک دن مہکے گی
اس دھرتی کا سنگار کرو
اس دھرتی سے تم پیار کرو

غزلیں

★ شاکر جرولی

سحر کو تیرہ شبی کا غلام لکھ دینا !!
چڑھے جو دن تو کتابوں میں شام لکھ دینا

نہ در یہاں ہے کوئی اور نہ بام لکھ دینا
مرے مکاں پہ یہ اعلانِ عام لکھ دینا

جب اسکے شہر چلوں میں تو راہوں سے کہو
شکستہ پا ہوں مگر تیز گام لکھ دینا

یہ گونگے بہرے غزل خواں نہ ہوں تو شرطاری
انہیں پہ تم کوئی تازہ کلام لکھ دینا

نہ ملنے پائے غریبوں کو ان کا یہ حق بھی
امیر جتنے ہیں ان کو عوام لکھ دینا

یہاں تو فن ہی نہیں آدمی بھی بکتا ہے
مری کتاب پر میرے بھی دام لکھ دینا

ورق ہے دل کا بہت دن سے بکھرے جاتا ہے
کہیں پہ میرے مسیحا کا نام لکھ دینا!

کسی شجر پہ اترنا بھی جرم ہے شاکر
حسینا پہ پرندوں کو اتنا پیام لکھ دینا

★ مسعود جاوید ہاشمی

پھیکے تھے حرف، صاف کہیں کچھ لکھا نہ تھا
سب کا تھا ذکر، خط میں انہی کا پتا نہ تھا

اب انکا نام لیتے ہی اٹھتی ہیں انگلیاں
پہلے تو کوئی ہم کو یہاں پوچھتا نہ تھا

دو حرف اس نے جا کے کہلوائے بھی نہیں
شاید اسے خیال ہمارا ذرا نہ تھا

کیوں یہ طواف ہو رہے سہاروں کے ارد گرد
اوروں کی طرح تو کبھی بے آسرا نہ تھا

سنجیدگی وقار متانت نہیں تھی کیوں
کیا اپنے قافلے کا کوئی رہنما نہ تھا

گھیراؤ کر لیا تھا حوادث نے جب مرا،
بس وہ تھا میرے ساتھ کوئی دوسرا نہ تھا

وہ اپنی خواہشات کے آگے نہ ٹک سکا
جو شخص بے ضمیر تھا با حوصلہ نہ تھا

دار و رسن سے گزرے ترے قرب کے لئے
اس کے سوا تو اور کوئی راستہ نہ تھا

یوں تو سبھی لکھے گئے احوال واقعی
جاوید حالِ دل کا کہیں تذکرہ نہ تھا

سنجے مصرا شوقی

تیری ہی طرح خرد سے خفا ہو کے چلا [illegible]
پہچان لے مجھ کو کہ ہوں تیری ہی ادا [illegible]

دونوں کی طبیعت ہے جدا گانہ طبیعت [illegible]
نفرت کا خدا تو ہے، محبت کا خدا [illegible]

آنکھوں سے برسنے ہی کو تھی پیار کی رم[illegible]
زلفوں نے کہا جھوم کے ساون کی گھٹا [illegible]

دو ہاتھوں سے بجتی ہے سدا دہر میں ت[illegible]
جو بھول گیا مجھ کو، اسے بھول گیا [illegible]

کترا کے گزر جاتی ہے ظلمت میرے گھر [illegible]
دہلیز پہ رکھ آیا ہوں اک ایسا دیا [illegible]

مدت سے اسی راز کی گردش میں ہے د[illegible]
دنیا ہی کھلی مجھ پہ، نہ دنیا پہ کھلا [illegible]

کیا کھیل تماشوں میں حیات اپنی گزار[illegible]
دو روز میں ہو جاؤں گا دنیا سے جدا [illegible]

منزل کا کہیں نام و نشاں تک نہیں مل[illegible]
اڑنے کو پرندوں کی طرح خوب اڑا [illegible]

اے گیسوئے دلدار نہ ہو اتنا پریش[illegible]
اک روز بدل دوں گا زمانے کی ہوا [illegible]

اے شوق حدود غم دنیا سے نکل[illegible]
ہر روز جلا دیتا ہوں خود اپنی چتا [illegible]

غزلیں

راشد ندیم
باڑہ وزئی اوّل شاہجہانپور
(یوپی) ۲۴۲۰۰۱

یہ دیکھ کر مرا پیکر اداس رہتا ہے
وہ آج بھی مرے اندر اداس رہتا ہے

تمہارے شہر کی ویرانیاں بتاتی ہیں
ہر ایک شخص یہاں پر اداس رہتا ہے

کنارے جا کے پلٹتی نہیں ہیں جب لہریں
تو دیر تک یہ سمندر اداس رہتا ہے

میں راستوں کی طرح جب خموش ہوتا ہوں
ہر ایک میل کا پتھر اداس رہتا ہے

نہ جانے کون سے رستے پہ میں بھی کھو جاؤں
یہ سوچ کر مرا رہبر اداس رہتا ہے

مرے وجود کی وہ تشنگی نہ جان سکا
اسی لئے تو وہ اکثر اداس رہتا ہے

بہت ہی دیر میں مجھکو خبر ہوئی راشد
مرے لئے بھی مرا گھر اداس رہتا ہے

ضوجمہ صفی
کنج عزیز ۲۴-۳-۸ مشوگڑہ
محبوب نگر ۲-۹-۵۰ (اے پی)

صرف سنتے ہیں ماجرا پتھر
کچھ تو کہئے بھلا برا پتھر

وار پہلا اگر گیا خالی
پھینکئے کوئی دوسرا پتھر

گھر کی دیوار بن گیا جب سے
کتنے آفات میں گھرا پتھر

میں جھکا موم بن کے قدموں پر
جب بھی وہ بن گیا ذرا پتھر

پوجا جانے لگا خدا کی طرح
بن گیا بت جو کٹ کر گرا پتھر

زینتِ تخت و تاج بنتا ہے
سرخ نیلا ہو یا ہرا پتھر

شب کا سناٹا جاگ اٹھا صفی
کسی شیشے پہ پھر گرا پتھر

علی احمد کلیم
چشمہ رحمت اورنیٹیل کالج
غازی پور (یوپی) ۲۳۰۰۱

ہم اس کے سوا اور بھی کیا یاد کریں گے
بس اپنی وفا ان کی جفا یاد کریں گے

اے گردش دوراں تجھے کیا یاد کریں گے
اس دور میں جینے کی سزا یاد کریں گے

دل توڑنے والوں کی ادا یاد کریں گے
قاتل کو بھی ہم دے کے دعا یاد کریں گے

شانوں پہ بکھر جائینگے جب انکے یہ گیسو!
اس وقت سبھی کالی گھٹا یاد کریں گے

یوں جھوم کے میخانوں پہ برسی ہیں گھٹائیں
یہ رند بلا نوش بھی کیا یاد کریں گے!

سرخی مرے کچھ خونِ تمنا کی ملے گی!
جب مرمریں ہاتھوں کی حنا یاد کریں گے

کچھ ہم بھی کلیم اہل زمانہ کی بدولت
بخشی ہوئی تلخی کا مزا یاد کریں گے

بدؔر نظری
معرفت ظفر اسٹور
پوسٹ گورارو ملز ۸۲۴۱۱۸
ضلع گیا (بہار)

فراقِ محبوب

میری جاں کہاں ہو میری جاں کہاں ہو۔

نظر ڈھونڈتی ہے کدھر ہو کہاں ہو ۔ کہ گم گشتہ جلووں میں ہر سو عیاں ہو
یہ کیسی وفا ہے یہ کیسی محبت ۔ ادھر میں پریشاں اُدھر تم نہاں ہو

میری جاں کہاں ہو۔ میری جاں کہاں ہو

تمہیں بزم ہستی کی روح رواں تھے ۔ شفا تھے مریضانِ قلبِ تپاں تھے
فضا کیف زا ہے مگر تم کہاں ہو ۔ کہاں کھو گئے تم ابھی تو یہاں تھے

میری جاں کہاں ہو میری جاں کہاں ہو

امیدوں کا مرکز دعاؤں کا حاصل ۔ بہلتا تھا تم سے ہمیشہ مرا دل۔۔!
فضا اب دھواں سی یہ کیوں لگ رہی ہے ۔ یہ کیا ہو گیا۔ کون ہے زہر قاتل

میری جاں کہاں ہو میری جاں کہاں ہو۔

کبھی رنجشیں بھی جو ہوتی تھیں باہم ۔ تو لمحات ٹھہرے سے لگتے تھے اکدم
پھر ایسے میں آتا جو الفت کا موسم ۔ بڑا کیف دیتا تھا ملنے کا عالم

میری جاں کہاں ہو میری جاں کہاں ہو

یہ اشکوں کے طوفاں یہ بے لفظ کلمے ۔ اُٹھاؤں میں کیسے جدائی کے صدمے
عجب خاموشی ہے عجب لب کشائی ۔ کہ ہلتے ہیں ہونٹ اور چپ سے ہیں نغمے

میری جاں کہاں ہو میری جاں کہاں ہو

بنا کر مجھے خوگرِ رنج پیہم ۔ کہاں جا لئے او جفا کے مجسم
نہ ہو بدرؔ سے اپنے بے وجہ برہم ۔ نہ لو اپنی گردن پہ خون دو عالم

میری جاں کہاں ہو میری جاں کہاں ہو

• قاضی انصاؔر
قاضی پورہ کھنڈوہ (ایم۔پی)
۴۵۰۰۰۱

غزل

طبیعت میں ملنساری نہیں ہے
کسی بھی شخص سے یاری نہیں ہے

گل و بلبل، صراحی، جام و ساقی
ہماری فکر پر طاری نہیں ہے

یقیناً سر کٹاتے سچ کی خاطر
ابھی یہ سلسلہ جاری نہیں ہے

مرے اشعار فن پارے غزل کے
یہ سرمایہ تو سرکاری نہیں ہے

دلوں کا ٹوٹنا کیا خاک سمجھے
کوئی بازی اگر ہاری نہیں ہے

یہ مانا کہ کھلیں آنکھیں غنیمت
مگر پھر بھی یہ بیداری نہیں ہے

مسائل نے کہیں انصاؔر کیسے
یہاں اپنی عملداری نہیں ہے

ریاستی خبریں

وزیر دفاع کا اظہار غم

وزیر دفاع شری شرد پوار جو کہ مہاراشٹر کے دورے تھے انہوں نے اتر پردیش اور ہریانہ کے سابق گورنر اور بست بمبئی کے سابق وزیر شری بی۔ ڈی تپاسے کی ت پر گہرے دکھ و رنج کا اظہار فرمایا ہے۔

اپنے تعزیتی پیغام میں شری شرد پوار نے فرمایا کہ مجھے ری جی۔ ڈی تپاسے کی رحلت کی خبر سن کر بے حد دکھ ہوا معر نسل کے گاندھی جی کے پیروکار تھے۔ شری تپاسے اعلیٰ ولوں والے ایک شخص تھے جنہوں نے ایک پرسکون زندگی ،اری انہوں نے مستقبل کی نسلوں کو جینے کی ایک نئی راہ سے شناس کرایا۔ میں اس موقعہ پر غمزدہ خاندان کو اپنی دلی ریت پیش کرتا ہوں۔

آر۔ این۔ گوئنیکا کی رحلت پر وزیر اعلیٰ کا اظہار غم

وزیر اعلیٰ شری سدھاکر راؤ نائیک نے شری رام ناتھ نیکا کی رحلت پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار فرمایا ہے۔ یر اعلیٰ شری سدھاکر راؤ نائیک جو کہ وزیر اعظم کی طرف سے لی میں طلب وزیر اعلیٰ کانفرنس میں شرکت کر رہے تھے۔

انہوں نے اپنے تعزیتی پیغام میں فرمایا کہ شری رام ناتھ گوئنیکا آزادی صحافت اور جمہوریت کے علمبردار تھے انہوں نے بھارتی جمہوریت کو تقویت پہونچانے کے لئے تمام عمر بے خوفی سے لڑا۔ وزیر اعلیٰ شری نائیک نے اپنے سینیئر کابینی رفقاء شری وجے سنگھ موہتے پاٹل، وزیر پبلک ورکس کو مدراس میں شری گوئنیکا کی آخری رسومات میں شرکت کرنے کیلئے روانہ کیا۔

شکر امداد باہمی کے زیادہ تر انعامات مہاراشٹر کو حاصل ہوئے

نیشنل فیڈریشن آف کوآپریٹیو شوگر فیکٹریز لمیٹیڈ کی جانب سے دیئے گئے کل ۱۲ انعامات سے زیادہ یعنی ۸ انعامات بشمول چھ اعلیٰ ترین مہاراشٹر شوگر کوآپریٹیو فیکٹریز نے حاصل کئے۔ یہ انعامات یہاں نئی دہلی میں ۲۷ ستمبر کو منعقدہ ایک تقریب میں مرکزی وزیر زراعت شری بلرام جاکھڑ، اور وزیر مملکت برائے سول سپلائز شری تردان گوگوئی نے تقسیم کئے۔

فنی مہارت کیلئے درمیانی زون سال ۹۱-۱۹۹۰ کے درجے میں پہلا انعام منجا راشٹیکی سہکاری ساکھر کارخانہ لمیٹڈ جیجولی راؤ (واڑی) ضلع لاتور مہاراشٹر نے حاصل کیا کارخانے کو فنی مہارت کے نشانے کو حاصل کرنے کے لئے دیا گیا یہ کارخانہ ۱۹۸۷ء میں قائم کیا گیا تھا۔ جس کا افتتاح آنجہانی وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے کیا تھا۔ یہ انعام کارخانہ کے ایک پرموٹر شری ولاس راؤ دیشمکھ وزیر صنعت نے مسٹر ڈی۔ ڈی دیشمکھ، ممبر گورننگ باڈی کے ساتھ موصول کیا۔

اعلیٰ زون میں اعلیٰ فنی مہارات کا مظاہرہ کرنے کا پہلا انعام شری چھترپتی ساہو سہکاری ساکھر کارخانہ لمیٹیڈ واقع کاگل ضلع کولہاپور مہاراشٹر کو ملا اور دوسرا انعام سجوانی ڈنکلی، سہکاری ساکھر کارخانہ لیٹیڈ واقع شاہ جہاں نند نگر مہاراشٹر نے حاصل کیا۔ سنگری دگھناتھ سہکاری ساکھر کارخانہ لیٹیڈ واقع شیرول ضلع پونے نے تیسرا انعام حاصل کیا۔

گنے کے سدھار میں بہترین کارکردگی کرنے کے تین اعلیٰ

انعامات مہاراشٹر میں واقع کارخانوں کو دیئے گئے۔ اعلیٰ زون کا پہلا انعام شری بھگوتی سہکاری ساکھر کارخانہ لمیٹیڈ کو دیا گیا اور دوسرا انعام شری نیپھاڈ سہکاری ساکھر کارخانہ لمیٹیڈ کو دیا گیا۔ درمیانی زون کا پہلا اور تیسرا انعام مہاراشٹر میں واقع شکر کارخانوں کو دیئے گئے جن کے نام اس طرح ہیں۔ شری ستیموڈا تاپی، سہکاری ساکھر کارخانہ لمیٹیڈ اور کنڈ سہکاری ساکھر کارخانہ لمیٹیڈ کو بالترتیب حاصل ہوا۔

تپاسے ایک سچے گاندھی وادی وزیر اعلیٰ کی تعزیت

مہاراشٹر کے وزیر اعلیٰ شری سدھاکر راؤ نائیک نے اتر پردیش اور ہریانہ کے سابق گورنر اور ریاست بمبئی کے سابق وزیر شری، جی۔ ڈی۔ تپاسے کی رحلت پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار فرمایا ہے۔

وزیر اعلیٰ نے فرمایا کہ شری تپاسے کی رحلت سے ہم ایک مشہور مجاہد آزادی لائق منتظم گاندھی جی کے سچے پیروکار اور سماجی خدمتگار سے محروم ہو گئے!

مہاراشٹر نے "پھول والوں کی سیر" میں بہترین پنکھے کا انعام حاصل کیا

راجدھانی میں انجمن سیر گل فروشان کی جانب سے منعقدہ "پھول والوں کی سیر" میں مہاراشٹر کے ٹروپ کو متواتر تیسرے سال بھی سال ۱۹۹۱ء کیلئے دو انعامات اور شمول ایک شری پانڈورنگ کمبھارے کی جانب سے ڈیزائن کئے گئے بہترین پنکھے اور شری سکندر بادشاہ اینڈ پارٹی کی جانب سے فوک آرٹسٹوں کی جانب سے ان کے سدھی دھامل ڈانس میں بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کرنے پر منتخب کیا گیا۔ شری رویندر سروے ڈائرکٹر آف مہاراشٹر کلچرل افیرس ممبئی نے - منعقدہ ایک تقریب میں یہ انعامات صدر ہند شری آر وینکٹ رامن کے ہاتھوں حاصل کئے۔

قومی یکجہتی کی اس تقریب میں مہاراشٹر ۱۹۸۹ یعنی گزشتہ تین سالوں سے شرکت کر رہا ہے۔ ابتدا مہاراشٹر فوک آرٹسٹوں کی ٹیم نے ۱۹۸۹ء، دوسری ٹرنڈ اور دو انعامات پنکھا اور نارچ میں حاصل کئے۔

بمبئی کی کمپنی کو سال کی پہلی "بچت کمپنی" ہونے کا فخر حاصل

جرمن ریمیڈیز فارماسیوٹیکل کمپنی اندھیری بمبئی نے مو مال سال کیلئے پہلی "بچت کمپنی" ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔ اس کمپنی کے افسران اور ملازمین کی تعداد ۶۵۶ ہے انہوں نے ۶۷۵ اور ٹوٹل آف پے رول سیونگ گروپ اور چھوٹی بچت کی دیگر اسکیمات میں ۵۸۷۵۴ روپئے ماہانہ سرمایہ کاری کر کے شروع کی۔

شری آر۔ ڈی۔ جادھو، جوائنٹ ڈائرکٹر آف سمال سیونگ نے منعقدہ ایک خصوصی تقریب میں تمام متعلقہ افراد کی چھوٹی بچت کو ایک بڑی کامیابی سے ہمکنار کرتے پر تعاون دینے کے لئے ان کی ستائش کی۔ انہوں نے اعلان کیا کہ حکومت کی طرف سے ۳۲۰۰ روپئے کی ایک خصوصی سالانہ ترغیب کمپنی کو اس صورت میں دی جائے گی کہ وہ چھوٹی بچت میں مذکورہ سرمایہ کاری کو جاری رکھیں۔

کمپنی کے پرسنل ڈائرکٹر اور چیئرمین ریمیڈیز ایمپلائز کو آپریٹیو کریڈٹ سوسائٹی شری، بی، ایس، ہیگڈے نے اس تقریب کی صدارت کی۔

شری رماکانت کوبلی، ڈپٹی ڈائرکٹر آف سمال سیونگ نے تقریب میں فرمایا کہ پانچ سالہ ریکرنگ ڈپازٹ اسکیم سے بمبئی میں ماہانہ متواتر ۲۱ کروڑ روپئے سمال سیونگ میں جمع کئے جا رہے ہیں۔ اس تقریب میں متعلقہ افراد کو ۸۵۰۰۰ روپئے کی ایک کل رقم کے ۱۳۸ ریکورڈ اکاؤنٹس ڈاکٹر ایم، پی۔ راؤ جنرل مینیجر کمپنی، شری جادھو جوائنٹ ڈائرکٹر آف سمال سیونگ اور شری ہیگڈے پرسنل ڈائرکٹر آف کمپنی کے ہاتھوں تقسیم کئے گئے تقریب میں ماہانہ جمع کئے گئے ۵۸۷۵۴ روپے کے ۶۷۵ اکاؤ

ئی بجٹ میں بطور سرمایہ کاری پیش کئے گئے۔
کمپنی کے عہدیداران سرو شری اہاس دیشپانڈے، دیے
ئے، راجا رام پنچال، اور منیجر اور اسسٹنٹ ڈائرکٹر آف
ل سروس، ایس، آر ساونت، پرسنل پبلک ریلیشنز انسپکٹر
ری، کے۔ ایم، ساورکر اور کمپنی کے ملازمین اس موقعہ پر موجود
ھے۔
شری آنند کار پروڈیکر سکریٹری آف کریڈیٹ کیپٹل پریٹیو
ریسائٹی نے مہمانوں کا خیرمقدم کیا اور شری دیپے شیکھی
نعدر سوسائٹی نے شکریہ ادا کیا۔

اعلیٰ سدھاکر راؤ نائیک اردو اکادمی کے نئے صدر

اردو اکادمی کے بجٹ میں نولاکھ کا اضافہ

امسال فروری ۱۹۹۱ء میں مہاراشٹر اسٹیٹ اردو
ں کی تشکیل نو کے وقت پروفیسر جاوید خان وزیر اوقاف
سنگ وچیرمین اردو اکادمی کی درخواست پر اس وقت
وزیر اعلیٰ جناب شرد پوار نے اردو اکادمی کی صدارت
مہ داری قبول فرمائی تھی۔ دو ماہ قبل شری شرد پوار
زیر دفاع مرکز میں چلے جانے کے بعد اردو اکادمی کے صدر
گہ خالی ہو گئی تھی۔ پچھلے دنوں پروفیسر جاوید خان کی
ست پر مہاراشٹر کے نئے وزیر اعلیٰ شری سدھاکر
نائیک نے اردو اکادمی کی صدارت بخوشی قبول فرمائی اور
تحریری اجازت نامہ اردو اکادمی کو ارسال کیا ہے۔
اس کے ساتھ اردو داں طبقے میں یہ خبر بھی مسرت
ساتھ پڑھی جائے گی کہ مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کے
ر شری سدھاکر راؤ نائیک نے اردو اکادمی کا بجٹ
۹۲-۱۹۹۱ء کیلئے صرف ۱۶ لاکھ روپے منظور ہوا
تھا اپنے خصوصی اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے ۲۵
روپے کر دیا ہے اور اب امید ہے اردو اکادمی کی
ردگی میں بہتری پیدا ہوگی۔ نیز اس کی اسکیموں کے دائرہ
توسیع کرتے ہوئے انھیں جلد از جلد عمل کا جامہ پہنایا
جائے گا۔
اردو اکادمی کے بجٹ میں ۹ لاکھ روپے کا گرانقدر
اضافہ پروفیسر جاوید خاں کی ذاتی دلچسپی اور کوششوں کا
نتیجہ ہے۔

معذوروں کیلئے اسکوٹر ریلی

معذور افراد کو درپیش مسائل سے آگاہ کرنے کے لئے
معذور افراد کی ایک اسکوٹر ریلی کا حال ہی میں اہتمام کیا گیا۔
اس ریلی میں تقریباً ۰ ۷ معذور افراد نے اپنے خاندان کے ہمراہ
شرکت کی اس ریلی کا علی یاور جنگ انسٹی ٹیوٹ باندرہ ریکلیمیشن
سے جھنڈی دکھا کر افتتاح کیا گیا۔
اس ریلی کا اہتمام نیشنل فورم برائے معذور اور لائنس کلب
جوہو کی جانب سے کیا گیا۔ اس ریلی میں لائنس کلب اور ان کے خاندان
والوں نے بھی حصہ لیا، ریلی کا کھار سانتا کروز اور دیے پارلے
سے ہوتے ہوئے دویاندھی ہائی اسکول جوہو میں اختتام ہوا۔
مشہور فلم اسٹار شریمتی ڈمپل کپاڈیہ نے دویاندھی ہائی اسکول
پر ریلی کا خیرمقدم کیا۔ شریمتی ڈمپل کپاڈیہ کے ہاتھوں لائنس کلب
نے دو معذور افراد کو تین پہئے والی سائیکل دی۔
شریمتی کپاڈیہ نے نیشنل فورم برائے معذور اور چیرمین
آف لائنس کلب شری پیرش دیوان کی اس بامقصد ریلی کا،
اہتمام کرنے پر ستائش کی انہوں نے فرمایا کہ معذور افراد کو
سماج میں ایک باعزت مقام دلانے کیلئے انہیں ضروری مواقع
فراہم کئے جانے چاہئیں۔
اس اپیل کے جواب میں شری پیرش دیوان چیرمین آف
لائنس کلب جوہو نے فرمایا کہ لائنس کلب اور اس کے ممبر ان معذور
افراد کو خاص طور سے انہیں خود روزگار فراہم کرنے کے لئے
اپنا ضروری تعاون دیں گے۔
شری جینی والا گورنر آف لائنس کلب نے نیشنل فورم برائے
معذور اور لائنس کلب آف جوہو کی ریلی منعقد کرنے پر سراہنا کی
انہوں نے کہا کہ ہمارے سماج میں بے شمار معذور افراد کو مشکلات
کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے لہذا سماج کو ان کی نشوونما میں اپنا بھرپور

(باقی صفحہ ۴۲ پر)

وزیر اعلیٰ شری سدھاکر راؤ نائیک اور وزیر ہاؤسنگ و اوقاف پروفیسر جاوید خان ، بمبئی کے عید میلا د النبیؐ کے جلوس میں ۔

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکیڈمی نے پاکستان سے آئے ہوئے دو شعراء شری قتیل شفائی اور شری شہزاد احمد کے اعزاز میں ایک نشست کا اہتمام اکریسیر بھائی ہال ، وی ٹی ، میں کیا تھا تصویر میں اردو اکیڈمی کے صدر اور وزیر ہاؤسنگ و اوقاف پروفیسر جاوید خان ، اردو اکیڈمی کے نائب صدر شری علی سردار جعفری شری قتیل شفائی اور شری شہزاد احمد نظر آرہے ہیں ۔

مدھیہ پردیش کی دستی کلا نمائش کا شری رام راؤ آدک نے بمبئی کے جہانگیر آرٹ گیلری میں ۳۰ ستمبر ۱۹۹۱ء کو افتتاح کیا ۔ اس موقعہ پر لی گئی تصویر ۔

مہاتما گاندھی جینتی کے موقعہ پر ۲/اکتوبر
سنہ ۱۹۹۱ء کو لائنز کلب انٹرنیشنل "نوول
گرہ" ، "رکشک دل" وغیرہ کی جانب سے "نشہ
بندی مہم" کا آغاز وزیر ہاؤسنگ و اوقاف
پروفیسر جاوید خان نے شمع جلا کر کیا۔

محکمۂ کھیل کود و بہبود نوجوانان کی
جانب سے کھیل کود مقابلے میں جیتنے والے
نوجوانوں کو یکم اکتوبر سنہ ۱۹۹۱ء کو باندرہ
کام اور ثقافتی امور کے وزیر شری ریہ
سنہ مہیتے پاٹل کے ہاتھوں حوصلہ
افزائی کی گئی۔

ناشک کی کھو کھو ٹیم جو کل ہند مقابلے
میں جیتی تھی اس کے ایک کھلاڑی شری
اجے کاکڑ کو وزیر موصوف اعزازی سند
دے رہے ہیں۔

لائنز کلب آف وادر اور کاما اسپتال
کے اشتراک سے ورلی، بمبئی کے منعت لال
ہال میں وزیر صحت شریمتی پشپا تائی
ہیرے کے ہاتھوں حال ہی میں اسکول
کے غریب طلبہ کو یونیفارم تقسیم کئے گئے۔
یہ اسی موقع پر کی گئی تقریر ہے۔

* قیصر عثمانی

۸، محبوبی بلڈنگ (اے) پشپا پارک ملاڈ (ایسٹ)، بمبئی ۴۰۰۰۹۷

اس مرتبہ (شمارہ ۱۰ جنوری ۱۹۹۱ء) اس لحاظ سے بھی قابل تعریف ہے کہ اس میں شعر و ادب سے متعلق کئی خوبصورت نگارشات بھی شامل ہے۔ یوسف ناظم نے معلومات افزا مضمون کے ذریعہ کرشن چندر کے طنز و مزاح کے نیم پوشیدہ گوشے پر اچھی خاصی روشنی ڈالی ہے اور مشتاق مومن نے ندا فاضلی کی شاعری کے اچھوتے رنگ سے واقف ہونے کا موقع فراہم کیا ہے۔

سلام بن رزاق کا مراٹھی سے ترجمہ "مدرسہ" اور سعادت حسن منٹو کے ادب پارے بھی پڑھنے کی چیزیں ہیں۔ منظومات کا حصہ بھی متاثر کرتا ہے۔ اس کامیاب شمارے کے لئے دلی مبارکباد قبول کیجئے۔

عرفان یوسف قاضی
مقام و پوسٹ داپولی تعلقہ داپولی
ضلع رتناگری (مہاراشٹر) ۴۱۵۷۱۲

مئی ۱۹۹۱ء کا قومی راج اپنی تمام تر خوبیوں سے آراستہ ہے۔ اور دن بہ دن ترقی پر گامزن ہے اس رسالے میں ہندوستان کے عظیم رہنما ڈاکٹر باباصاحب امبیڈکر اور مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں معلوماتی مضامین شامل ہیں۔ جن کو پڑھ کر قلبی مسرت ہوئی ہے

جون ۹۱ء کا رسالہ سب شماروں میں اہم مقام رکھتا ہے۔ جس میں ہندوستان کے سابق وزیر اعظم اور کانگریس آئی کے صدر آنجہانی شری راجیو گاندھی کی اچانک موت کی دردناک اطلاع ہے اور ان کی چند یادگار دلکش تصاویر شامل ہیں۔ بہت پسند آیا۔ ساتھ ہی ساتھ علامہ اقبال کا مضمون "ہندوستان کی پرانی تاریخ کا احترام" تو بہت ہی پسند آیا۔ علامہ اقبال کے بہت سے مضامین نے قومی یکجہتی کو فروغ دیا۔ ایسے مضامین کے مطالعے سے دل و دماغ پر بہت اچھا اثر ہوتا ہے۔

ایسے کامیاب شماروں کے لئے مبارک باد۔

* رفیق جعفر

۱۲/۶۱ مالونی کالونی ۶ باندرہ پلاٹ ملاڈ (ویسٹ)
بمبئی ۹۵ ۴۰۰۰۹۵

مئی ۱۹۹۱ء کا قومی راج ملا۔ خوشی ہوئی کہ حسب روایت "امبیڈکر نمبر" خوبصورت اور معیاری ہے۔ یہ نمبر ڈاکٹر باباصاحب امبیڈکر کی شخصیت کا آئینہ ہے۔

م۔ ناگ کا مضمون معلوماتی ہے۔ یوسف ناظم صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں امبیڈکر جی پر جو مضمون لکھا ہے۔ وہ اپنی نوعیت کا ایک الگ مضمون ہے۔ ڈاکٹر امبیڈکر پر مختار صاحب کی نظم خوب ہے۔ مولانا آزاد پر علی سردار جعفری صاحب کا مضمون ایک شان لئے ہوتے ہے۔ جمال علوی نے بھی مولانا آزاد پر سیر حاصل مضمون تحریر کیا ہے۔

شمس نکاردی نے رباعی کے فن پر مضمون لکھا ہے۔ ایسے مضامین کم ہی پڑھنے کو ملتے ہیں۔ مقدر حمید کا افسانہ "ن و یا" مختصر مگر پر اثر ہے۔ آپ قابل مبارکباد ہیں کہ آپ نے نمبر کے تقاضوں کو پورا کرنے کے بھی ادب کے معیار اور مواد کو برقرار رکھا ہے۔ کتابت اور طباعت معیاری ہے۔

* عنبر الحسن جعفری (عنبر جعفری)

جواہر پرنٹنگ پریس۔ گجری بازار، کامٹی، ضلع ناگپور (مہاراشٹر)

"قومی راج" ۱۰ جون ۱۹۹۱ء ملا۔ خوش ہوا۔ آنجہانی شری راجیو گاندھی سے متعلق تمام شمولات پسند آئے۔

جلد ۱۸ ۱۰/دسمبر سنہ ۱۹۹۲ء شمارہ ۱۲

قومی راج

ہندی اور مراٹھی میں ہر ماہ کی یکم اور پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے
انگریزی، گجراتی، سندھی اور اردو زبان میں
ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

زر سالانہ ۲۵ روپے
قیمت فی شمارہ ۲ روپے

چیف ایڈیٹر
شری ارون پاٹھک

منیجنگ ایڈیٹر
آر۔ جی۔ مانیدیو

ایڈیٹر: فیروزہ فیاض خان

ترسیل زر کا پتہ

اسسٹنٹ ڈائریکٹر (ایڈمنسٹریشن)
ڈائرکٹوریٹ جنرل آف انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز
گورنمنٹ آف مہاراشٹر، بیرک نمبر ۱۹
مقابل سروجنی بلڈنگ، نزد منترالیہ، بمبئی ۴۰۰۰۲۱
Tel. 2021530

مراسلت کا پتہ

ایڈیٹر قومی راج
ڈائرکٹوریٹ جنرل آف انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز
گورنمنٹ آف مہاراشٹر
۱۷ واں منزلہ نیو ایڈمنسٹریٹو بلڈنگ
مقابل منترالیہ، بمبئی ۴۰۰۰۳۲
Tel. Nos. 2020651 / 2023957

اس شمارے میں

صفحہ نمبر

امجد عباسی

عزم واستقلال اور قوتِ فیصلہ کا مینار
شری سدھاکر راؤ نائیک

مہاراشٹر کے سابق وزیر اعلیٰ شری شرد پوار کو جب وزیر داخلہ کی حیثیت سے مرکزی کابینہ میں شامل کیا گیا تو ایسے عظیم سیاستداں کا جانشین کون ہوگا؟ یہ سوال رہ رہ کر اٹھ رہا تھا۔ اور جب شرد پوار جی نے شری سدھاکر راؤ نائیک کا انتخاب کیا۔ تو مجموعی طور پر لوگوں کی زبان سے ٹھیک ہے کے الفاظ ادا ہوئے مگر شری سدھاکر راؤ نائیک نے مہاراشٹر کے وزیر اعلیٰ بننے کے بعد صرف ۱۰۰ سو دنوں کی قلیل ہی مدت میں اپنی قوت فیصلہ اور آہنی عزم و یقین کو بروئے کار لاتے ہوئے جو فیصلے مرتب کیے ان کی روشنی میں ان کے انتخاب پر عوام میں ایک گونہ اطمینان واعتماد پایا جاتا ہے۔

۲ اکتوبر ۱۹۹۱ء کو شری سدھاکر راؤ نائیک کی وزارت اعلیٰ کے ۱۰۰ دن مکمل ہو چکے ہیں۔ اس قلیل عرصے میں وزارت اعلیٰ جیسے کارگذاریاں اور ذمہ داریوں کی قدر پیمائی قطعی ممکن نہیں تاہم نظم و نسق اور اپنی پارٹی کے استحکام کے تعلق سے انھوں نے جو اقدامی اور انقلابی اقدامات اٹھائے ان سے آپکے آہنی عزم مستقل مزاجی اور خودشناسی کا پتہ چلتا ہے

جون کے تیسرے ہفتے میں پارلیمنٹ کے انتخابات ہونے کے بعد شری شرد پوار مرکزی کابینہ میں چلے گئے اور ۲۵ جون ۱۹۹۱ء کو شری سدھاکر راؤ نائیک کا مہاراشٹر کے دسویں وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے انتخاب کیا۔ شرد پوار جیسے ایک کامیاب وزیر اعلیٰ کے بعد آنے والا وزیر اعلیٰ اگر بہترین منتظم، ماہر سیاستداں اور قوت ارادی کا مالک نہ ہو تو وہ ریاست بھر میں خوشگوار اثرات مرتب نہیں کر سکتا۔ مگر شری سدھاکر راؤ نائیک نے سو دنوں کے قلیل عرصے میں اپنی دانشمندی، سیاسی سوجھ بوجھ اور خوش اخلاق سے اپنی مقبولیت اور استحکام کے پرچم لہرا دئے

اپنی پہلی پریس کانفرنس کے موقعہ پر ایک اخبار نویس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے

انھوں نے کہا

"گذشتہ کئی برسوں میں ہم نے بہت ساری اسکیمیں مرتب کیں۔ لیکن ان پر خاطر خواہ عمل آوری نہیں ہوئی اس لئے اب نئی اسکیم بنانے کے مقابلے میں جو اچھی اسکیمیں ہیں ان کا جائزہ لے کر ان کی خامیاں دور کر کے ان کو کامیاب بنانے کیلئے میں کوشاں رہوں گا۔"

اسی کانفرنس میں انھوں نے ایک اور بات کا ذکر کیا

"میں صرف لباس اور پائپ کے استعمال میں اپنے چچا کی تقلید نہیں کرتا بلکہ ان کے خیالات اور عمل کی بھی تقلید کرتا ہوں اور اس کا ثبوت مجھے ہر گام دینا ہے۔"

ان دو باتوں میں جو تیقن، جذبۂ عمل اور بلند حوصلگی ہے وہ ان کی زندگی کے روشن پہلو ہیں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ شری لہار حکومت اور اس کے فوراً بعد شری نائیک حکومت کو ودھان سبھا میں اکثریت حاصل نہ ہونے کی جو شکایت تھی وہ جلد ہی دور ہوئی۔ اکثریت حاصل نہ ہونے کی بنا پر بننے والی حکومت، تاروں پر کی جانے والی کسرت کے مترادف ہوتی ہے۔

شری نائیک کو اس کا ادراک حاصل تھا۔ اسی لئے انھوں نے ایک مہینے کے اندر اپنی حکومت کو اکثریت سے فیض یاب کیا۔ انھوں نے جنتا دل کے نو ایم ایل اے حضرات کے سات آٹھ مہینوں سے جاری آنکھ مچولی والے کھیل کو ختم کر کے انھیں اپنی پارٹی میں شامل کرا لیا اور اپنی پارٹی کو ودھان سبھا میں اکثریت دلائی۔ یہ اقدام ان کی سیاسی بصیرت اور مردم شناسی کا ایک بیّن ثبوت ہے۔

ان کے وزیر اعلیٰ بننے کے بعد نائب وزیر اعلیٰ کا جو تنازعہ پیدا ہوا اسے بھی انھوں نے بغیر کسی پس و پیش کے حل کر دیا۔ نہ وہ جھوٹے وعدوں کے فریب میں آئے اور نہ ہی مخالفتوں کے عفریت سے حواس باختہ رہے۔ انھوں نے نائب وزیر اعلیٰ کو منظوری نہیں دی اور وہ صمیم قلب سے اپنے اس فیصلے پر قائم رہے۔ آخر کار یہ مسئلہ ہی باقی نہ رہا۔

نائب وزارت اعلیٰ کا مسئلہ ہو یا وکیلوں کی ہڑتال کا معاملہ ہو، پارٹی کے کئی سینیر لیڈروں نے اسے اپنا وقار کا مسئلہ بنا کر پارٹی میں بغاوت کے بیج بو دئے تھے اور اگر اس وقت شری سدھا کر راؤ نائیک حکمت عملی سے کام نہ لیتے تو باغی گروپ حکومت کو ناکوں چنے چبوانے پر مجبور کرتا۔ اور سارا شیرازہ تاش کے پتوں کی طرح بکھر جاتا۔ شری سدھا کر راؤ نائیک نے وکیلوں کی ہڑتال کو اس خوش اسلوبی کے ساتھ ختم کروایا کہ یہ دانش مند طبقہ "انہے مت ٹد" کے گن گانے لگا۔ اور حالات کا جواں مردی سے مقابلہ کرنے والی فطرت کی وجہ سے شری نائیک بڑی ثابت قدمی سے آگے بڑھتے رہے نتیجتاً مخالفین خود تتر بتر ہو گئے۔

ایک جہاں دیدہ سیاستداں کی حیثیت سے انھوں نے قانون اور عدلیہ کی وزارت ایک رات میں بدل ڈالی۔ اور ثابت کر دیا کہ وہ خود اپنے فیصلے کے خالق ہیں۔ اور ان پر عمل پیرا ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

ان کی قوتِ فیصلہ غضب کی ہے۔ وہ اپنے فیصلوں پر بڑی ثابت قدمی سے قائم رہتے ہیں اس سلسلے میں وہ کسی کی مداخلت برداشت نہیں کرتے اور نہ کسی کے زیر اثر رہ کر فیصلہ کرتے ہیں۔ مہا منڈل کے صدور کو دئے گئے وزرا اور ریاستی وزرا کے درجات کو رد کرنے کے بارے میں ان کے انقلابی فیصلے نے بہت ساری سیاسی شخصیتوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ اس فیصلے سے جہاں

دو چار متعلقین ناراض ہوئے وہاں بے شمار ورکرس اور لوگ مسرت سے جھوم اٹھے۔ بہت سارے اخبارات نے بھی اس فیصلے کا خیر مقدم کیا۔

پالک منتریوں کی نئی ترتیب و فہرست کے تعلق سے ان کے فیصلے نے بھی خاص و عام کو ششدر کر دیا۔

اتنے سارے اسکولوں اور کالجوں کو منظوری تو دی مگر ایک بھی ڈی ایڈ اور بی ایڈ کالج کو منظوری نہ دینے کے فیصلے کو بڑے استقلال سے قائم رکھا۔

عام طور پر نائیک وزارت پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ اس پر شوگر لابی کے گہرے اثرات ہیں۔ اور ودربھ پر ناانصافی کی گئی ہے۔ شری سدھاکر نائیک نے بڑے غور و خوض، صبر و تحمل اور انصاف پسندی کا ثبوت دیا اور ودربھ کے نمائندوں کو مہاڈا ڈیولپمنٹ مہامنڈل وغیرہ میں مناسب اہمیت دے کر ودربھ کو انصاف دلایا نیز کابینہ کے تعلق سے جو جو شکایتیں اٹھ رہی تھیں۔ ان کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لیا اور خوشگوار ماحول میں ان کا تدارک کیا۔

ان تمام معاملات میں شری نائیک کی کامیابی قابلِ تحسین رہی۔ مگر سب سے بڑی کامیابی انتظامیہ پر ان کی گرفت اور سرمائی اجلاس کا بخیر و خوبی انعقاد ہے۔ جب شری نائیک نے وزارت کی باگ ڈور سنبھالی تو اس وقت سرمائی اجلاس کے آغاز میں ایک دو ہفتے تھے اسمبلی میں اکثریت حاصل نہ ہونے کی وجہ سے نائیک حکومت کو کافی تشویشناک حالات کا سامنا تھا۔ اخبارات میں نائیک وزارت کے ٹوٹنے کے متعلق کافی چرچے تھے مگر یہ شری نائیک کی اولوالعزمی اور مستقل مزاجی تھی جس نے نہ صرف اسمبلی کے سرمائی اجلاس کو حسن و خوبی، اختتام تک پہنچایا بلکہ اپنی حکومت کے استحکام کی بنیادیں بھی مضبوط کر دیں۔ اس وقت تمام اخبارات نے اس بات کا اعتراف کیا کہ نائیک صاحب کی دور اندیشی اور موقع شناسی نے وزارت کو مستحکم کر دیا۔

شری نائیک روزِ اوّل ہی سے چیلنج کا مقابلہ کرتے آئے ہیں۔ ۲۸، ۲۹ اور ۳۰ جولائی ۱۹۹۱ء کو ودربھ کی وردھا ندی میں بڑا سیلاب آیا اور موواڈ کے قریب کا بند ٹوٹ گیا۔ ناگپور اور امراوتی ضلعوں کے تقریباً ۳۰، ۳۵ گاؤں سیلاب میں گھر گئے۔ بڑا جانی اور مالی نقصان ہوا۔ سیکڑوں لوگ بے گھر اور بے سہارا ہو گئے۔ اس ناگہانی مصیبت کا مقابلہ کر کے، مصیبت زدگان کو فوری طور پر امداد دینا ضروری تھا ان کی آباد کاری کا پیچیدہ مسئلہ بھی درپیش تھا۔ مگر نائیک نے اس چیلنج کو بھی قبول کیا اور انھوں نے اپنے سارے انتظامیہ اور مشینری محصولی کو تیز تر کر دیا۔ ناگپور میں بذاتِ خود دو روز قیام کر کے سارے منصوبوں کو تشکیل دے کر انھیں عملی جامہ پہنایا۔

ان تمام امور کی ذمہ داری ریاستی وزیر شری بابا صاحب کیدار اور شری رنجیت دیشمکھ کو سونپی اور خود پشت پناہ کے فرائض انجام دیتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ موواڈ کی نو آبادکاری کے بارے میں ریاست بھر میں غیر اطمینان بخش ماحول قائم نہیں ہوا۔ یہ شری نائیک کی انتظامی صلاحیت کا اعتراف ہی تو تھا۔

گذشتہ کئی برسوں سے شری سدھاکر راؤ نائیک مہاراشٹر کابینہ میں رہے ہیں۔ انھوں نے تعلیم، تجارت، بجلی محصول، دودھ کی اسکیم، پبلک ورکس، سماجی بہبودی وغیرہ اہم وزارتیں سنبھالی ہیں۔ اور انھوں نے ہمیشہ یہی کوشش کی ہے کہ ان وزارتوں کے تعلق سے مرتب کی جانے والی اسکیموں سے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ کیسے فائدہ پہنچیں۔

انھوں نے اپنے ذمہ دی گئیں وزارتیں اور
ان کے کاروبار کا بڑی باریکی سے جائزہ لیا۔ ترتیب شدہ
اسکیموں کی جانچ پڑتال کی اور عوامی بہبود کے ذرائع ہموار
کئے۔ وزیراعلیٰ بننے کے بعد اسی طریق کو اپنایا اور ہر وزارت
کی قدر پیمائی کا کام اپنے ذمے لیا۔ کابینہ کی نشستوں
میں تجارت، تعلیم، دودھ اسکیم، زراعت، غذا،
شہری رسد، جنرل ایڈمنسٹریشن، شہری ترقی، گرام وکاس
اور امداد باہمی جیسی اہم وزارتوں کی بڑی باریک بینی اور
تنقیدی نظریے کے تحت قدر پیمائی کرائی اور اگلے ۱۰،
۱۵ سالوں کیلئے مذکورہ وزارتوں کی کارگزاریوں کا
تخمینہ بنایا گیا۔

ان ہی نشستوں میں مستقبل میں آنے والے
مسائل کون سے ہوں گے اور ان کا کیا حل ہوگا۔ اس
پر بھرپور غور و خوض کیا گیا۔ اور راستہ معین کیا گیا۔

کارواں کیلئے جو سمت معین کی جاتی ہے اس سے
سفر آسان ہو جاتا ہے۔ اس کلیے کے نشیب و فراز سے
شری نائیک بخوبی واقف ہیں۔ اور اسی لئے ان کی کابینہ
کے مستقبل میں قابل ذکر کامیابی سے ہمکنار ہونے کے
کافی امکانات ہیں۔

وہ فوری فیصلے لینے میں بھی مہارت رکھتے
ہیں۔ جب وہ وزیر تعلیم تھے تو لڑکیوں کے لئے ہوسٹل
قائم کرنے کا انھوں نے منصوبہ بنایا تھا۔ بعد میں اس
منصوبے پر کوئی عمل نہیں ہوا۔ وزیراعلیٰ کی باگ ڈور
سنبھالتے ہی لڑکیوں کی تعلیم کے لئے ہوسٹل کا قیام
کا منصوبہ زیر عمل لایا۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی اور اشیائے
ضروری کے ناکافی رسائی کے پیش نظر راشننگ کی دکانوں
کے ذریعہ تیل، دالیں، صابن وغیرہ اشیاء سستے
داموں فراہمی کا انتظام کرایا۔ اناج اور دوسری ضروری
اشیاء کی چلتی پھرتی دکانوں کو رائج کرایا۔ اور پہاڑی
علاقوں میں مناسب داموں والی دکانیں رائج کرائیں۔

ضروری اجناس کی تقسیم کے طریقۂ کار میں بہتری پیدا
کرنے کے ساتھ ان اشیاء میں ان کی پیداوار میں
اضافے سے متعلق بھی اقدامات کئے جا رہے ہیں۔

انھوں نے تین لاکھ ہیکٹر زمین پر تلہنوں کی
کاشت کا منصوبہ زیر عمل لایا۔ اور اس کے لئے ۳۰ فی
صدی پانی محفوظ کرایا۔ غرض انھوں نے کاشتکاروں
کی بھلائی کے تعلق سے کئی کام کئے۔

زراعت ریاست کا اہم پیشہ ہونے کی وجہ سے
انھوں نے اپنے چچا کی طرح زراعت کی ترقی پر زیادہ
توجہ دینے کی پالیسی اپنائی ہے۔ اور اس ضمن میں
انھوں نے کولہاپور، ناگپور، امراؤتی اور مراٹھواڑا
میں فصلوں اور پھلوں کی پیداوار کے مراکز قائم کئے
کوکن میں دودھ اسکیم کو فروغ دینے کیلئے کئی سہولتیں
بہم پہنچائیں۔

تجارت کے تعلق سے بھی انھوں نے ان سو
دنوں کے قلیل عرصے میں بڑے اہم فیصلے کئے ہیں۔ انھوں
نے ۱۵۰ دھندے اور روزگار کو No Objection
سرٹیفکٹ سے مستثنیٰ قرار دیا۔ اور غیر ترقی یافتہ علاقوں
میں روزگار اور صنعتیں شروع کرنے والے تاجروں کو
بہت ساری صنعتی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ اور سہولتیں
بہم پہنچانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اور ہوائی جہازوں
کے لئے Running Strips
تیار کرنا۔ ۶۵ گرڈ سنٹر پرائیویٹ اداروں
کو دینا۔ اور مقامی ضرورتوں کو جان کر وہاں
Small Industrial Estates
چھوٹے صنعتی علاقے تیار کرنا وغیرہ امور

ے بارے میں حال ہی میں نائیک وزارت نے اہم
یصلے کئے ہیں۔ اور ایک ترقی پذیر صنعتی ریاست
ی حیثیت سے مہاراشٹر کے بارے میں جو تصورات
یں انھیں راسخ کرنے کی کوششیں کیں۔

اس کے علاوہ صنعتی علاقوں میں بجلی پیدا کرنا،
ی کی ترسیل اور فراہمی وغیرہ باتوں کی اہمیت کے
ں نظر بجلی مزید طاقتور پروڈکشن پر توجہ دینے
اعلان کیا ہے۔

کئی سالوں سے ریاست بھر کے کارپوریشن ضلع
یشد اور میونسپلٹیوں کے انتخابات التوا میں
ڑے ہوئے تھے۔ شری سدھاکر راؤ نائیک
نے وزیر اعلیٰ بنتے ہی مذکورہ انتخابات کا پروگرام
عین کیا۔ اس کے مطابق آئندہ نومبر میں نگر
لیکا اور مارچ سے قبل مہانگر پالیکاؤں کے
کشن ہوں گے۔ ضلع پریشدوں کے انتخابات
معاملہ عدالت میں زیر غور ہے۔ اس کا فیصلہ
ہوتے ہی ان کے بھی انتخابات جلد لئے جانے
شری نائیک نے اعلان کیا ہے۔

صرف ۱۴ دنوں کے قلیل عرصے میں
اس طرح یکے بعد دیگرے
یصلے کرنے والے اور منصوبے بنانے میں نائیک کی حکمت
ملی، تدبر اور سیاسی شعور کو بڑا دخل حاصل ہے وہ
ربھ اور مراٹھواڑہ میں سائنسی ترقی بورڈ کے قیام کے لئے
ی جاکر وزیر اعظم شری نرسمہا راؤ، وزیر داخلہ شری شنکر
ؤ چوہان اور وزیر دفاع شری شرد پوار سے بحث و مباحثہ
کے اسے منظور کرانا بھی بڑی بات ہے

انھوں نے ودربھ اور مراٹھواڑہ کے کئی مسائل
ری طور پر حل کئے۔ اور اسمبلی کے دیوالی اجلاس سے
آٹھ روز قبل تمام وزراء کے وفد نے ناگپور میں آ کر
ان دو علاقوں کے مسائل پر غور و خوض کیا جائے۔ اس
قسم کے انتظامات بھی کر رکھے ہیں۔ ودربھ کے ۲۰ نکاتی
پروگرام اور مراٹھواڑہ کے ۳۵ نکاتی پروگرام کا جائزہ لینے
کا بھی انھوں نے فیصلہ کیا ہے۔ اس قسم کے منتھن سے یقینی
طور پر ترقی کے راستے ہموار ہوں گے۔

ایک عام آدمی کو تسلی اور دلاسا نصیب ہو سوجھ
بوجھ رکھنے والوں کو اعتماد ملے اور افسران ورکرس اور
ساتھیوں کو فخر کا احساس ہو اس قسم کا دور وزارت
شری نائیک صاحب کا ہے۔ وہ جہاں بلند بانگ نعرے
لگاتے ہیں وہاں انھیں عملی پیکر میں بھی ڈھالتے ہیں وہ
نئی نئی اسکیمیں تیار کرتے ہیں اتفاق رائے حاصل کرنے
کیلئے لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اور پھر پور حمایت
حاصل ہونے پر انھیں زیر عمل لاتے ہیں۔ در اصل
ان کے آہنی عزائم اور ان کا جذبۂ عمل ہی ان کی
کامیابی کی بشارت دیتے ہیں۔ ہماری نیک خواہشات
ان کے ساتھ ہیں ۔

ضروری گذارش

اس شمارے کے بارے میں بطور خاص اپنی رائے ہمیں
آج ہی لکھئے اور اپنے دوستوں کو "قومی راج"
سے متعارف کرائیے۔ انھیں سالانہ خریداری
کے لیے توجہ دلائیے۔
ہمیں آپ کے بھرپور تعاون کا انتظار رہے گا۔ (ادارہ)

پروفیسر اکبر رحمانی
۳/۷ بھوانی پیٹھ جلگاؤں

غریبوں کی مسیحا
شریمتی آنجہانی اندرا گاندھی

کل من علیہا فان ـــ یہاں کی ہر چیز فنا ہونے
لی ہے۔ موت سے کسی کو چھٹکارا نہیں ـــ کوئی بڑے سے
ا انسان چاہے کیسی ہی تدبیریں کر لے ـــ لیکن وہ موت سے
چ نہیں سکتا ـــ اس دنیا میں انسان کا وجود ہزاروں اور
ھوں سال سے ہے ـــ لیکن اب تک نہ کوئی ایسی مثال صفحۂ
ں آئی نہ دیکھنے میں کہ کسی انسان کو بالآخر موت نہ آئی ہو ـــ
ین ان لاکھوں مرنے والوں میں بعض ہستیاں ایسی بھی ہوتی
ہے جو اپنے بلند کردار، اولوالعزمی، جرأت و بے باکی ،
ربر و دانشمندی، محنت و استقلال، خلوص و محبت اور بلند
ب العین اور آدرشوں کیلئے ایثار و قربانی کے ایسے لازوال
نقوش چھوڑ جاتے ہیں جو آئندہ بھی انسانی زندگی کیلئے مینارۂ
نور ثابت ہوتی ہیں۔ ایسی ہستیاں اگرچہ ہم سے جدا ہو جاتی
ہیں ـــ لیکن وہ کبھی فنا نہیں ہوتیں۔ ہمیشہ زندہ رہتی ہیں۔

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت ہے کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

ایسی ہی ایک ہستی ہے یہ وہ ہستی اندرا گاندھی کی تھی۔ جن لوگوں
نے اندرا گاندھی کو قریب سے دیکھا ہے جنھیں ان کے
ساتھ کام کرنے کا موقعہ ملا ہے اور جنھوں نے ریڈیو ٹیلی
ویژن، جلسوں اور اخباروں میں انھیں سنا ہے۔ دیکھا
اور پڑھا ہے وہ سب اس بات کی گواہی دیں گے کہ اس

جیسی نڈر، بے باک، دلولہ انگیز، متحرک و فعال، اعلیٰ پایہ کی سیاستداں، مدبر و مفکر، بے پناہ قوت ارادی اور آہنی عزم کی مالک عورتوں میں تو کیا مردوں میں بھی بہت کم دیکھی گئی ہے۔

اندرا گاندھی غریبوں، کمزوروں، پچھڑے ہوؤں اور بے کسوں کی ہمدرد اور مسیحا تھیں۔ وہ اہنسا، انسانیت، رواداری اور سیکولرزم کی جیتی جاگتی مثال تھیں۔ دراصل اندرا گاندھی ایک شخصیت کا نام نہیں ایک عہد کا نام ہے جس نے آنے والی نسلوں کو بھی متاثر کیا ہے۔ آنے والی نسلیں بھی ان کی عظمت، خلوص اور قربانی وشہادت کی قسمیں کھاتی ہیں۔

اندرا گاندھی صحیح معنوں میں عوام کی رہنما تھیں۔ ہندوستان میں کسی کو اتنی مقبولیت حاصل نہیں ہوئی جتنی اندرا جی کو۔ وہ اپنے باپ آنجہانی نہرو سے بھی زیادہ مقبول تھیں۔ ان کی دل آویز شخصیت، دل نشیں خطابت، محبت آمیز سلوک اور انسانیت دوستی نے ہر ایک کا دل موہ لیا تھا۔ کچھ ذاتیں تو انھیں پرستش کی حد تک چاہتی تھیں۔ اصل میں انھوں نے محبت و ہمدردی سے زمانے کو فتح کر لیا تھا۔ پوری دنیا کے عوام اور حکمراں انھیں عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ مقبولیت اور عزت کی یہ معراج بڑی مشکل سے کسی رہنما کو حاصل ہوتی ہے اس لئے مرنے کے بعد بھی ایسی ہستی لوگوں کے دلوں میں اپنی محبت کے چراغ روشن کئے رہتی ہیں اور وہ دنیا میں امر ہو جاتی ہیں۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

اگر ہم اندرا گاندھی کی زندگی کا سرسری جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تمام زندگی حرکت اور جہد مسلسل کی آئینہ دار رہی ہے۔ نازو نعمت میں پرورش پانے کے باوجود سکون ان کی زندگی میں محال نظر آتا ہے۔ بچپن ہی سے ان میں خدمت خلق کا جذبہ، حریت پسندی، انسان دوستی انھیں اپنے دادا پنڈت موتی لال نہرو، والد جواہر لال نہرو اور والدہ

پنڈت جواہر لال نہرو اور شریمتی اندرا گاندھی

کملا نہرو سے ورثے میں ملی تھیں۔ اور تمام زندگی ان قدروں کو وہ اپنے سینے سے لگائے رکھیں۔ ان کا نقطۂ نگاہ آفاقی اور ہمہ گیر تھا۔ ان کا دل چھوٹی موٹی وفاداریوں، تنگ نظریوں اور تعصب سے پاک وصاف تھا۔

۱۹ر نومبر ۱۹۱۷ء کو وہ آنند بھون الہ آباد میں پیدا ہوئیں۔ الہ آباد، پونہ، شانتی نکیتن اور کیمبرج میں انھوں نے تعلیم حاصل کی۔ دوران تعلیم انھوں نے ہریجنوں کی سیوا اور ملک کی خدمت کا کام انجام دیا۔ ملک کو آزاد کرانے کی تڑپ ان کے دل میں لڑکپن میں پیدا ہو گئی تھی۔ ۱۹۲۸ء میں وہ گاندھی جی کی قائم کردہ بال چرخا سنگھ میں شامل ہوئیں اور ۱۹۳۰ء میں وانر سینا کے نام سے انھوں نے بچوں

کی ایک قومی جماعت قائم کی۔ ۱۹۳۶ء میں وہ کانگریس کی ایک سرگرم سیاسی کارکن بنیں۔ اور اس کے بعد ان کی سیاسی سرگرمیاں بڑھتی چلی گئیں۔

۱۹۳۶ء میں ماں کے سایہ سے محروم ہونا پڑا۔ یہ ایک ناقابل برداشت دکھ تھا۔ لیکن اندرا جی نے اس وقت بھی صبر کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ ایسے وقت فیروز گاندھی کی غم گساری بڑے کام آئی۔ انھوں نے اندرا جی کی ڈھارس بندھائی اور نیا حوصلہ بخشا۔ ان دونوں میں دوستانہ تعلقات قائم ہوئے جو آگے چل کر شادی کے بندھن میں بندھ کر اور مضبوط و مستحکم ہو گئے۔ ایک پارسی جوان سے یہ شادی بھی روایت سے بغاوت ہی تھی۔ لیکن اندرا جی نے قدیم رواجوں کی کبھی پروا نہ کی۔

اندرا جی کو قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑیں۔ ۱۹۴۲ء کی ہندوستان چھوڑو تحریک میں انہیں بھی نظر بند کر دیا گیا۔ جیل سے رہائی کے بعد راجیو گاندھی اور سنجیو گاندھی کو انھوں نے جنم دیا۔ چند ہی ماہ انھوں نے سکھ اور چین کی سانس لی تھی کہ پھر وہ آزادی کی لڑائی میں زور و شور کے ساتھ شامل ہو گئیں۔ پولیس کی لاٹھیاں کھائیں مگر ان کے حوصلے پست نہ ہوئے۔

ملک آزاد ہونے کے بعد جب پنڈت جواہر لال نہرو جب وزیر اعظم منتخب ہوئے تو وہ ان کی نگراں اور معتمد بن گئیں۔ پنڈت نہرو کے ساتھ انھوں نے سیاست کے داؤں پیچ سیکھے۔ ساری دنیا کی سیر کی اور دنیا کے بڑے بڑے رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں۔

۲۷ مئی ۱۹۶۴ء کو پنڈت نہرو کا انتقال ہوا اس کے بعد لال بہادر شاستری وزیر اعظم مقرر ہوئے تو انھوں نے اندرا جی کو انھوں نے بہ حیثیت وزیر اطلاعات و نشریات کے شامل کیا۔ اگرچہ یہ ان کا پہلا موقع تھا مگر انھوں نے جس حسن و خوبی سے اپنے فرائض انجام دئے اس نے انھیں اعلیٰ عہدے کے لائق اور اہل ثابت کر دیا تھا۔ وہ ایک تجربہ کار اور پختہ سیاستداں کے طور پر نمایاں ہوئیں

۱۹۶۶ء میں جب لال بہادر شاستری کا اچانک انتقال ہوا تو وزارت عظمیٰ کا تاج اندرا گاندھی کے سر پر رکھا گیا۔ اس کے بعد وہ ۱۹۷۷ء تک وزیر اعظم بنی رہیں

۱۹۷۵ء میں ایمرجنسی کا نفاذ ان کے کیریر کی سب سے سنگین غلطی تھی۔ اس کا اقرار خود مسز اندرا گاندھی نے بھی دل زبان سے کیا تھا۔ اس غلطی کا انھیں ۱۹۷۷ء عام انتخابات میں شکست کی صورت میں خمیازہ بھگتنا پڑا۔ لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری حالات کا نہایت پامردی سے مقابلہ کیا۔ مخالفت کے طوفان سے بھی ہراساں نہیں ہوئیں۔ عوام سے اپنے تعلق کو اور زیادہ مضبوط و استوار کیا۔ اور اپنی سیاست اور حکمت عملی، فراست اور تدبر کا ثبوت دیا۔ کہ ۱۹۸۰ء میں عوامی

دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک تو وہ جو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں اور اندھیارے کا رونا روتے ہیں۔ دوسرے وہ ہیں جو اٹھ کر چاہے کتنا چھوٹا سا کیوں نہ ہو دیا جلاتے ہیں۔ میں چاہتی ہوں ہر شخص جہاں کہیں بھی ہو کام کرتا ہو۔ ایسا دیا روشن کرے جس سے اندھیارا دور ہو اور ہندوستان کی حالت بہتر ہو۔ جس میں ہم سب ہنسی خوشی جیون بتائیں۔

— آنجہانی شریمتی اندرا گاندھی

مقبولیت کے عروج پر پہنچا اقتدار حاصل کیا۔ ۳۰ اکتوبر ۱۹۸۴ء کو بعض شر پسند طاقتوں نے سازش کرکے انھیں گولیوں کا نشانہ بنادیا۔ اور انھیں شہید کردیا۔

اندرا گاندھی نے ملک کے اتحاد و سالمیت کی خاطر اپنی جان قربان کی اپنی موت سے صرف ایک دن پہلے انھوں نے کہا تھا کہ:

"اگر میں قوم کی خدمت کرتے ہوئے مر بھی جاؤں تو میرے لئے یہ بڑے فخر کی بات ہوگی۔ مجھے یقین ہے میرے خون کا ہر قطرہ اس قوم کے فروغ میں کام آئے گا اور اسے مستحکم و متحرک بنانے میں کارآمد ثابت ہوگا۔"

اندرا گاندھی نے اپنی موت سے جو مثال قائم کی تاریخ میں بہت کم ایسی مثالیں ملتی ہیں۔ جو اندرا گاندھی کے دلیرانہ قربانی کا مقابلہ کرسکے۔

مدت کے بعد ہوتے ہیں پیدا کہیں وہ لوگ
مٹتے نہیں ہیں دہر سے جن کے نشاں کبھی

محمد زبیر اعظمی
پردیسی پورہ ایولہ ضلع ناسک

شانتی

جہاں والو ہمارے پاس آکر شانتی لے لو
اگر دل میں اندھیرا ہے تو ہم سے روشنی لے لو

وہ تم ہو جو ہمیشہ جنگ کی باتیں سناتے ہو
بموں کا ذکر کرکے بیگناہوں کو ڈراتے ہو
یہ سب کچھ چھوڑ کے ہم سے اصول زندگی لے لو
ہمارے دم سے دنیا میں پیام امن پہونچا ہے
ہمیں وہ ہیں کہ دشمن کی خطا کو ہم نے بخشا ہے
جو لینا ہے تو بھارت سے ادائے دلبری لے لو
گل و شبنم کے درشن سے مزاج اپنا بنایا ہے
غریبوں کو خوشی دی اور روتوں کو ہنسایا ہے
تو تم بھی پھول سے مسکان، شبنم سے نمی لے لو
محبت سے شرافت سے غریبوں کی دعائیں لو
جو ممکن ہو سکے لاچار بچوں کی بلائیں لو
کسی زخمی کو مرہم دو کسی کی بے کسی لے لو

سکون اور شانتی کے دم سے ہے دنیا کی آبادی
بغیر اس کے نظر آئیگی بربادی ہی بربادی !
جو جینا چاہتے ہو تو یہ دولت آج ہی لے لو

شکست رنگ کی جھنکار

جگر مرادآبادی

بیسوی صدی نے اپنے استقبال کیلئے جن عظیم الشان
خصیات کو چشم براہ پایا ان میں ایک اہم نام جگر مرادآبادی
بھی ہے۔

۱۸۹۰ء میں لال باغ، مفتی ٹولہ میں صاحب دیوان
اعر محمد علی نظر کے گھر جگر نے آنکھ کھولی، یہ خاندان عرب
، بہتا پور اور ریتا پور سے ہجرت کرکے ہندستان پہنچا
پھر مرادآباد میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔

ڈاکٹر محمد اسلام جنھوں نے جگر صاحب پر تحقیق کا حق
ادا کیا ہے ۳۶ واسطوں سے جگر کا نسبی سلسلہ حضرت ابوبکر
صدیقؓ سے بتاتے ہیں، خود جگر صاحب بھی اس کا تذکرہ کیا
کرتے تھے اور اس نسبت پر فخر کیا کرتے تھے۔

جگر صاحب نے ابتدائی تعلیم زمانے کے چلن کے مطابق
حاصل کی ان دنوں مسلم گھرانوں کا معمول تھا، عربی اور فارسی
اپنے والد کے پیر بھائی اور اپنے عہد کے زبردست عالم

مولوی محمد صدیق سے حاصل کی۔ اس کے بعد وہ لکھنؤ کے ایک پبلک اسکول میں داخل ہوئے جہاں ان کے مشہور اور مستند سوانح نگار محمود علی خاں جامعی کے بقول انہوں نے انٹرنس پاس کیا، یہ وہ زمانہ تھا کہ انٹرنس کی صلاحیت کے لوگ اعلیٰ اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتے تھے، اردو پڑھنا اور پڑھانا اور اس زبان میں تصنیف و تالیف کے ساتھ شعر گوئی باعث عزت و افتخار تھی۔ خوش ذوقی اور خوش گفتاری کے لئے اردو سے بہتر کوئی زبان دوسری نہیں تھی، زبان تو آج بھی دوسری نہیں ہے لیکن مصلحتوں کی ستم ظریفی نے اس زبان کے ساتھ جو سلوک کیا ہے۔ اس کا نمایاں ثبوت ہے کہ ہم ابھی تقریباً چالیس برس پہلے کے مقبول ترین شاعر کو محو کرنے لگے ہیں۔
وجہ کچھ تو اردو زبان و ادب کے سمٹتے دائرے اور کچھ ان معتقدین جگر کا رفتہ رفتہ اٹھتے جانا ہے جو اٹھتے بیٹھتے جگر کے ذکر سے سرشار رہتے تھے، میں نے جگر صاحب کے ایک عاشق صادق اور شاگرد بھی شاید عارف عباسی کو ہمیشہ جگر صاحب کی خصوصیات ان کی شائستگی، سلیقہ مندی اور حد درجہ اخلاص کے ہمہ وقت تذکرے کرتا دیکھے ہیں، عارف عباسی جیسے لوگ اب کہاں ہیں وہ لوگ ہیں جن کو جگر صاحب سے براہ راست فیض پہونچا اور جن کی شہرت و مقبولیت میں جگر صاحب کی خورد نوازی کا زبردست ہاتھ رہا ہے، اب ایسے لقبیہ نقبیہ لوگ اپنے اپنے شہرت کے حصاروں میں جگر صاحب کے ذکر کو اپنے لئے معزت رسان تصور کرتے ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ ان لوگوں کی تعداد بالکل نہیں ہے، لوگ ابھی باقی ہیں اور شہرت کے بام عروج پر ہیں، لیکن کتنے افسوس اور شرم کی بات ہے کہ جگر صاحب کی یاد میں کوئی جلسہ، کوئی مشاعرہ یا کوئی اخباری بیان ہی دینا اب ان لوگوں کو اپنی ہتک محسوس ہوتا ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مستند ترین ادیب و طنز نگار رشید احمد صدیقی جگر صاحب کی شائستگی اور شاعری دونوں کے زبردست مداح تھے۔ جو لوگ رشید احمد صدیقی کی شخصیت سے تھوڑی بہت بھی واقفیت رکھتے ہیں۔ وہ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ رشید صاحب کی ذات اپنے عہد کی شائستہ ترین شخصیت تھی، اب اس درجہ کے عالم اور ادیب زمانہ کی آنکھیں دیکھنے کو ترستی ہیں، جگر صاحب کے تعلق سے رشید احمد صدیقی صاحب کے جذبات:

"مجھے وہ زمانہ خوب یاد ہے جب جگر صاحب پر شراب کا بد ترین تسلط تھا، اکثر و بیشتر وہ آپے میں نہ ہوتے عزیز اور عقیدت مند ان کو قدم قدم پر سنبھالے ہوتے، اس حال میں بھی ان کی زبان سے کبھی ایسا فقرہ نہ نکلتا یا کوئی ایسا فعل سرزد نہ ہوتا جس سے خود ان کو یا ان کے دوستوں کو شرمندگی اٹھانا پڑتی، شراب اور شاعری سے زیادہ کوئی چیز ہوگی؟ جگر صاحب کو ان دونوں نے بے نقاب کیا، بد ہنگی کہیں نظر نہیں آئی رکھ رکھاؤ ہر جگہ موجود۔"

ہمارے عہد کے ایک اور قد آور شاعر علی سردار جعفری کے الفاظ میں:

"میں نے جگر صاحب کے بہت سے رنگ دیکھے ہیں، ایک رنگ وہ تھا کہ وہ خود ان کے الفاظ میں رگ و پے میں صہبا ہی صہبا رقص کرتی تھی اور کبھی وہ رنگ کہ "زندگی ہی زندگی" خون کی طرح دوڑ رہی تھی، لیکن مذہبی تقدس کا رنگ، اور کبھی ایک قسم کی صوفیانہ تشکیک کا رنگ، لیکن ہر رنگ میں نمایاں ایک ہی رنگ رہتا تھا۔ اور وہ ان کا اصلی رنگ تھا خلوص اور والہانہ پن، ان دو لفظوں میں ان کی ساری شخصیت اور شاعری سمٹ آئی ہے۔"

جگر صاحب کی بے نوشی اور ہمہ تن سرشاری نے بہت گل کھلائے ہیں۔ وہ کبھی کبھی بے نوشی کی وہ منزلیں بھی طے کر جاتے تھے جن تک بڑے بڑے بے نوش ایک عمر کے ریاض کے بعد بھی پہونچنے کی ہمت نہ کر پائے۔
جگت موہن لال رواں اناؤ دی کے صاحبزادے چودھری پربھان شنکر سروش نے اپنے گھر کے واقعات جگر صاحب کے تعلق سے ایسے مزے لے لے کر مجھے سناتے ہیں کہ ان واقعات پر ایک کتاب ترتیب دی جاسکتی ہے۔ افسوس گزشتہ نوں

سرورش صاحب بھی علمی ادبی محفلوں کو ویران کر گئے۔ میرے حافظے
میں جگر صاحب کے متعلق ایسے کئی واقعات محفوظ ہیں جن سے جگر
صاحب کی مے نوشی کی انتہاؤں میں بھی ناشائستگی سرزد
نہیں ہوئی اور یہ تمام واقعات سرورش صاحب کے حوالے سے رشید
احمد صدیقی اور علی سردار جعفری کے الفاظ کی تائید کرتے
ہیں۔

جگر صاحب کی مقبولیت اور شہرت کے سامنے ان کے
عہد میں بڑے بڑوں کا چراغ نہ جلا، یہ کچھ تو ان سحر انگیز تخلیت
کا کمال تھا اور کچھ یہ غزل کا وہ جادو تھا جس کے حصار میں
عام و خاص سبھی کی شرکت تھی۔

"میں نے اپنی زندگی میں دو ہی ایسے شاعر دیکھے جنھیں
سن کر بڑے بڑے ثقہ اور تقدس مآب داڑھی بردار مولویوں
کو وجد آگیا۔ ایک حفیظ جالندھری اور دوسرے جگر
مرادآبادی،" (مالک رام)

جگر صاحب کی مقبولیت و شہرت میں ان کی غزل کے
آہنگ و اسلوب کو بڑا دخل ہے۔ "معاملاتِ عشق کی سلگتی
دلی کیفیات کو جس سہل و سادہ انداز میں جگر صاحب بیان
کر سکتے تھے۔ ایسا لہجہ ابھی تک کسی شاعر کو نصیب نہیں
ہوا ہے۔

سب کچھ لٹا کے راہِ محبت میں اہلِ دل
خوش ہیں کہ جیسے دولتِ کونین پا گئے

●

سمجھے تھے دور تجھ سے نکل جائیں گے کہیں
دیکھا تو ہر مقام تری رہگذر میں ہے

●

دنیا کے ستم یاد، نہ اپنی ہی وفا یاد
اب کچھ بھی نہیں مجھ کو محبت کے سوا یاد

●

چھیڑا تھا جسے پہلے پہل تیری نظر نے
اب تک ہے وہ اک نغمۂ بے ساز و صدا یاد

●

یارب ہجومِ درد کو دے اور وسعتیں
دامن تو کیا ابھی مری آنکھیں بھی نم نہیں

●

میں ہوں اس مقام پر اب کہ فراق و وصل کیسے
مرا عشق بھی کہانی، ترا حسن بھی فسانہ

●

ترے عشق کی کرامت یہ اگر نہیں تو کیا ہے!
کبھی بے ادب نہ گزرا مرے پاس سے زمانہ

تیرے دل کے ٹوٹنے پر ہے کسی کو ناز کیا کیا
تجھے اے جگر مبارک یہ شکستِ فاتحانہ

●

شیر مزاجِ حسن کی بیتابی
تیز بہت ہے دل کی دھڑکن

تو نے سلجھا کر گیسوئے جاناں،
اور بڑھا دی دل کی الجھن

○

راہ جنوں آسان ہوئی ہے
زلف و مژہ کے سائے سائے

○

کوئی نہ دیکھ سکا جن کو دو دلوں کے سوا
معاملات کچھ ایسے بھی درمیاں گزرے

○

یہ کیا مقامِ عشق ہے ظالم کہ ان دنوں
اکثر ترے بغیر بھی آرام آگیا!

○

حسن کی ایک ایک ادا پر جان و دل صدقے مگر
لطف کچھ دامن بچا کر ہی گزر جاتے ہیں ہم

ٖ

دل کی کیا بات کہ پہونچے صفِ مژگاں کے قریب
جلوے خود لوٹ رہے ہیں رُخِ تاباں کے قریب

ٖ

بھول جاتا ہوں میں ستم اس کے
وہ کچھ اس سادگی سے ملتا ہے

ٖ

آج کیا بات ہے کہ پھولوں کا
رنگ تیری ہنسی سے ملتا ہے

—

مل کے بھی جو کبھی نہیں ملتا
ٹوٹ کر دل اسی سے ملتا ہے

—

اپنے حدود سے نہ بڑھے کوئی عشق میں!
جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے

ٖ

اک لفظ محبت کا ادنیٰ سا فسانہ ہے
سمٹے تو دلِ عاشق پھیلے تو زمانہ ہے

ٖ

یہ عشق نہیں آساں اتنا ہی سمجھ لیجئے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

ٖ

ملتی ہے عمر رندِ عشق کے میخانے میں
اے اجل تو بھی سما جا مرے پیمانے میں

ٖ

یہ اور اسی قبیل کے سینکڑوں اشعار جو ایک زمانے میں زبان زدِ خاص و عام تھے اور ان اشعار کے ذریعہ جگر نے لوگوں کے دلوں پر اپنی غزل کے جو نقش بنا دیئے تھے اس کا احساس انہیں خود بھی تھا۔

وہ ادائے دلبری ہو کہ نوائے عاشقانہ
جو دلوں کو فتح کرلے وہی فاتح زمانہ

شاہد احمد دہلوی نے ساقی میں جگر صاحب کے سحر اور ان کی غزل کے تاثر سے متعلق بڑے پتے کی بات کہی ہے۔

"جگر صاحب شعلۂ طور کی اشاعت سے پہلے بھی شاعر تھے، اور ان کا ایک مجموعۂ کلام شائع ہو کر گمنام ہو چکا تھا۔ اس زمانے کے کلام میں بھی ایک بھکھا پن تھا، مگر سنا ہے کہ کسی معرکۂ عشق میں ناکام ہونے کے بعد ان کے ساتھ ان کے کلام کی بھی دنیا بدل گئی۔ جگر کی غزل میں جو نیا مزاج پایا جاتا ہے وہ اسی محرومی کا نتیجہ ہے، عشق کی آگ بھڑک کر شعلۂ طور بن گئی۔"

عشق کی آنچ ان کے الفاظ میں ڈھل کر دو آتشہ بن گئی تھی، اس پر مستزاد جگر صاحب کا والہانہ ترنم، اسی نسبت سے جگر صاحب نے اپنے مجموعے جب اشاعت کیلئے ناشرین کے سپرد کئے تو ان کے نام "آتش گل"، "شعلۂ طور"، یا آفتاب جگر، داغ جگر جیسے نام ہی انتخاب کئے۔

آتش گل کے دیباچہ میں پروفیسر آل احمد سرور نے لکھا کہ،

"جگر ایک رومانی شاعر ہیں، رومان کسی نہ کسی حقیقت کو ہی خوابوں میں پیش کرتا ہے، جگر صاحب کے یہاں بھی خواب اور حقیقت کی دھوپ چھاؤں نظر آتی ہے، جگر نے ساری عمر حسن اور عشق کے نغمے گائے ہیں۔"

اب ایک جگر صاحب کی علم دوستی اور وسیع النظری کی قمر مراد آبادی کے حوالے سے پڑھئے اور اپنے دور کے

شاعروں کو اس معیار پر پرکھنے کہ مقبولیت کے اسباب کچھ بھی ہوں اور ان میں توازن برقرار رکھنا اور مقصدِ علم وادب کو ملحوظ رکھنا کتنا دشوار اور ایثار طلب مرحلہ ہے۔

"جگر صاحب شروع میں کیا بلکہ اپنے مین پوری کے قیام تک مشاعروں میں بلا نذرانہ شریک ہوا کرتے تھے۔ اور شائقین انہیں جگہ جگہ کھینچ لے جاتے تھے۔ گویا جگر صاحب کی حیثیت ایک فٹ بال کی سی تھی، جو میدان میں اِدھر اُدھر سے اِدھر پھینکا جاتا رہتا تھا، مشاعروں میں نذرانہ قبول کرنے کو وہ شعر بیچنے کے مترادف سمجھتے تھے۔

اس کے بعد دیکھتے دیکھتے ہماری تہذیبی اقدار نے پلٹا لیا اور مشاعروں پر ٹکٹ لگنا شروع ہو گیا، مشاعرے خواص کے بجائے عوام کے مذاق کے لئے ہونے لگے اور بڑھتے بڑھتے اسے کارکنان نے تجارت کا ایک ذریعہ بنا لیا۔

جگر صاحب ایک طرف تو اس کھینچا تانی سے عاجز آ گئے تھے، دوسری طرف مشاعروں کے اس تجارتی پہلو یعنی ٹکٹ سے وصولیابی کرنے کے اصول کے پیش نظر انھوں نے اپنی رائے میں ترمیم کی اور اخبارات میں یہ اعلان شائع کرایا کہ آئندہ جو صاحب کسی مشاعرے میں مجھے مدعو کریں، وہ جامعہ ملیہ دہلی کو پچاس روپے بطور عطیہ چندہ منی آرڈر کر کے، رسید دعوت نامے کے ساتھ مجھے بھیجا کریں" یا خود ساتھ لایا کریں۔

(آئینہ سکندری)

٭ تسنیم فاروقی
تلسی داس مارگ لکھنؤ (بہار)

غزل

جب ترے شہر سے جانے کا خیال آتا ہے
پھول جیسی تری صورت کا خیال آتا ہے

رہتا ہے نوکِ قلم میں ترا منظر نامہ
ہم تجھے پاس بلائیں یہ کمال آتا ہے

دکھ میں تپئے تو مسرت کی توقع رکھئے
آگ کی دھار سے سونے کا اُجال آتا ہے

سر چھپا لیتے ہیں سائے میں اندھیرے اکثر
جب بھی اُگتے ہوئے سورج پہ جلال آتا ہے

آئینے طنز کے ہم نے بھی تراشے ہیں بہت
بس کہ اب شیشۂ گفتار پہ بال آتا ہے

اس طرف مجھ کو نہ سے جا تو مجھے جام نہ دو
میکدہ دیکھ کے پیاسوں کا خیال آتا ہے

عقلمند اس کی تباہی سے سبق لیتے ہیں
جب کسی قوم پہ دنیا کا زوال آتا ہے

کیوں کھنکتی ہوئی مٹی سے بنایا ابن کو
سازِ سن کر ترے مستوں کو جو حال آتا ہے

یہ کھنڈر چھوڑ کے تسنیم کہاں جائیں ہم
اس کے سائے میں بزرگوں کا خیال آتا ہے۔

نیوکلیائی سائنس مرکز کا ایکسیلریٹر

یونی ورسٹی کے سائنسدانوں کیلیے ایک نعمت

جدید آئیون ایکسیلریٹروں کی ایجاد سے نیوکلیائی ڈھانچے کو سمجھنے کی جستجو میں ایک نئی جہت کا اضافہ ہوا ہے اور بالکل ہی نئے حالات میں ایٹمی نظاموں کا مطالعہ کرنا ممکن ہو سکا ہے۔ ۲۵ بھارتی یونی ورسٹیوں کے نیوکلیائی محققین کی سرگرمیوں میں اس ایکسیلریٹر کے آجانے سے حال ہی میں کافی اضافہ ہوا ہے اس ایکسیلریٹر کا مقابلہ دنیا کے بہترین ایکسیلریٹر سے کیا جا سکتا ہے۔

یہ ایکسیلریٹر جسے ۱۵ یو ڈی پیلیٹرن کہا جاتا ہے ہلکے سے ہلکے ایٹم یا پروٹان سے لے کر بھاری سے بھاری ذروں مثلاً یورینیم تک تقریباً ہر ایک ذرے کی حرکت میں ۱۶۰ لاکھ الیکٹرون وولٹ تک کی صلاحیت پیدا کر سکتا ہے یہ ایکسیلریٹر بھارت میں اپنی نوعیت کا پہلا ایکسیلریٹر ہے اور اس کا مقابلہ غیر ممالک کے اعلیٰ اداروں میں دستیاب جدید سہولتوں سے کیا جا سکتا ہے۔

۴۰ میٹر اونچے مینار میں رکھا گیا یہ ۱۵۰ لاکھ وولٹ ٹینڈم ایکسیلریٹر نیوکلیائی سائنس مرکز کا ایک حصہ ہے جو نئی دلی میں جواہر لال نہرو یونی ورسٹی کے کیمپس میں قائم کیا گیا ہے۔ یہ بین یونی ورسٹی تحقیقی مرکز جسے یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن نے قائم کیا ہے، مختلف بنیادی سائنسز، مادی مطالعات، حیاتیاتی سائنسز اور متعدد بین فنی شعبوں میں ایکسیلریٹر پر مبنی تحقیق کے لیے ایک خود مختار ادارہ ہے۔ یہ مرکز یونی ورسٹی نظام کے تحت دستیاب اعلیٰ پیمانے کی تحقیقی سہولیات میں وسیع خلا کو پر کرتا ہے۔ اب تک یہ ایکسیلریٹر ایٹمی توانائی کے محکمے کے تحقیقی مرکزوں میں ہی دستیاب تھے۔

چوتھے دہے کی ابتدا میں پہلے اس کے ڈھانچے کے لیے نیوکلس کی کھوج کی غرض سے تیار کیا گیا تھا۔ یہ ایکسیلریٹر نیوکلیائی طبیعات کو سمجھنے کے لیے اس قدر مفید پایا گیا تھا کہ بعد کے برسوں میں گوناگوں استعمال کے لئے مختلف اقسام کے ایکسیلریٹر ایجاد کیے گئے۔

ذرات یا آئیون جن کی حرکت میں بہت زیادہ صلاحیت پیدا کر دی جاتی ہے۔ مختلف مادوں کے نیوکلیائی میں گہرائی سے کھوج کرنے کے لیے آلات بنتے ہیں اور اس خاص شکل میں ان کے وجود کے پیچھے چھپے راز کو افشا کرتے ہیں۔

آج ایکسیلریٹر صرف نیوکلیائی طبیعات تک ہی محدود نہیں ہے، یہ محققین کے لیے بنیادی، اور عملی اور دیگر بین شعبہ جاتی میدانوں میں بھی اتنے ہی کارآمد ہیں۔ ان کا استعمال ایٹمی اور سالماتی طبیعات، ستاروں سے متعلق طبیعات، مادیاتی سائنسز، ٹھوس مادیاتی طبیعات، حیاتیاتی سائنسز، عدالتی سائنسز، علم آثار قدیمہ، جغرافیائی سائنس، علم معدنیات، نیوکلیائی علم کیمیا اور طبی سائنسز کے شعبوں میں وسیع پیمانے پر کیا جاتا ہے۔

یہ ایک ایکسیلریٹر گوناگوں جدید ٹیکنالوجی پر مشتمل ہے۔ نیوکلیائی سائنس مرکز میں موجود پیلیٹرون ٹینڈم قسم کا ایک الیکٹروسٹیٹک ایکسیلریٹر ہے جو بھاری لوہے کا بنا ہوا ہے اور جس میں بہت سے کام کرنے کی صلاحیت ہے نیز جس سے ہلکے اور بھاری دونوں طرح کے آئیون میں تیزی آ سکتی ہے۔ اسے امریکہ کے ایک ادارے الیکٹروسٹیٹک انٹرنیشنل اِن کارپوریشن نے فراہم کیا ہے۔

ایکسیلریٹر کی نصب اور تجرباتی سہولیات کے قیام سمیت پورا پروجیکٹ صرف چار برس کے قلیل عرصے میں ۲۱ کروڑ روپے کی لاگت سے مکمل ہوا۔ ایکسیلریٹر کی سہولت کو مسلسل جدید ترین بنانے کے لیے ایک منصوبے کو قطعی شکل دی جا چکی ہے ان منصوبوں سے کمپیوٹر کنٹرول جیسی جدید ٹیکنالوجی کے مواقع فراہم ہوتے ہیں۔ ان منصوبوں سے مستقبل میں قائم کی جانے والی تجرباتی سہولیات کے زیادہ سے زیادہ استعمال میں مدد ملے گی۔ بین الاقوامی طور سے یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ ایکسیلریٹر تجربہ گاہیں کثیر شعبہ جاتی میل کا بہترین ماحول فراہم کرتی ہیں جس سے نئی ٹیکنالوجی کو فروغ حاصل ہوا ہے اور سازوسامان، کمپیوٹر کنٹرول اور خودکار نظام کے شعبے میں قطعی طور پر متوقع ترقیات سامنے آئی ہیں۔

علینہ دت
۹ - آکاش دیپ
پہلی سڑک، سانتا کروز (ویسٹ)
بمبئی ۴۰۰۰۵۴

ہمارے تہوار

ہندؤں کے تہوار

رام نومی

ہندو دھرم کے تہواروں میں دو تہوار ایسے ہیں جنھیں بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ ان میں ایک ہے رام نومی، دوسرا گوکل اشٹمی۔ رام نومی بھگوان شری رام کا یوم پیدائش ہے۔ کہا جاتا ہے شری رام چیت ماہ کی نو تاریخ کو پیدا ہوئے۔ آپ وشنو کے اوتار سمجھے جاتے ہیں۔ آپ کی ولادت کا مقصد دنیا میں پھیلی ہوئی برائیوں کو ختم کرنا تھا۔ یہ تہوار راجہ رام چندر کی نیکی، شجاعت، دیانتداری، فرمانبرداری اور حق پرستی اور راستی کی بقا کی یاد میں منایا جاتا ہے۔ آج کے دن ہندو بھائی شری رام کی پوجا کرتے ہیں اور ان کا چرتر سنتے سناتے ہیں۔

گرو پورنیما

یہ تہوار اشاڑھ کی ۱۴ تاریخ کو آتا ہے۔ یوں تو ہر مذہب کے ماننے والے استاد کو عزت، عقیدت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن ہندو دھرم میں استاد کو بھگوان کا درجہ دیا گیا ہے۔ اس عقیدت کی پیروی کرنے والے شری وید ویاس جنھوں نے مہابھارت لکھا ہے، کو دنیا بڑا گرو مانتے ہیں۔ گرو پورنیما ویاس کی یاد کا دن ہے آج کے دن شاگرد اپنے اساتذہ سے ملتے ہیں اور، آشیرواد حاصل کرتے ہیں۔ یہ تہوار استاد شاگرد کے رشتے کو مستحکم کرتا ہے۔

ناگ پنچمی

اس تہوار کے ساتھ بہت سی کہانیاں جڑی ہوئی ہیں۔ ایک کہانی ایسی ہے کہ ایک دفعہ شری کرشن بھگوان یمنا (جمنا) کے کنارے کھیلتے ہوئے پانی میں ڈوب گئے۔ تھوڑی دیر بعد ایک پانچ منہ والا سانپ انہیں باہر نکال لایا جب عوام نے یہ منظر دیکھا تو ناگ کے احسان مند ہو گئے اور اس کی پوجا کی — آج کے دن عقیدتمند ناگ کو دودھ پلاتے ہیں۔ اس کی پوجا کرتے ہیں۔ اگر یہ تہوار منگل کے دن آئے تو اسے نیک تصور کیا جاتا ہے۔

رکشا بندھن

شراون ماہ کی پورنیما کے ہیں۔ یہ دن رکشا بندھن کے نام سے مشہور ہے۔ اسی تہوار میں سمندر دیوتا کی پوجا کی جاتی ہے۔ سمندر یا ندی میں ناریل بہایا جاتا ہے۔ ایک عام عقیدے کے مطابق ایسا کرنے سے سمندر دیوتا کا قہر نازل نہیں ہوتا۔ راکھی صرف ہندؤں کا تہوار نہیں بلکہ ہندستانی بھائیوں کا تہوار ہے۔ یہ بھائی بہن کی محبت، جذبات کے والہانہ اظہار اور ایثار کا ثبوت ہے۔

گوکل اشٹمی

۸ شراون کو شری کرشن پیدا ہوئے تھے ان کی پیدائش کو جنم اشٹمی یا گوکل اشٹمی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اشٹمی کی رات لوگ مندروں میں گزارتے ہیں عام عقیدہ ہے کہ ایسا کرنے سے انسانوں کی تکالیف دور ہو جاتی ہیں اور گناہوں سے نجات ملتی ہے۔ ہندو دھرم میں اس شب کو مقدس مانا گیا ہے۔

گنیش چترتھی

بھادرپد کی ۴ تاریخ کو آتا ہے۔ یہ شری گنیش جی کے یوم پیدائش کا دن ہے۔ یوں تو اس تہوار کو ہندوستان بھر میں مقبولیت حاصل ہے مگر صوبہ مہاراشٹر میں اس کی ایک نرالی شان ہے۔

دسہرہ و وجے دشمی

دسہرہ اور وجے دشمی ایک ہی تہوار کے دو مختلف نام ہیں۔ اس کے تعلق سے پرانوں میں جداگانہ روایات ملتی ہیں جن میں سے دو ذیل میں بیان کی جا رہی ہیں۔

(۱) آج کے دن درگا ماتا کی پیدائش ہوئی تھی۔ جب اندر لوک میں مہیشاسر کا ظلم بڑھ گیا۔ بھگوان وشنو نے اس کے خاتمے کیلئے ایک دیوی کو [illegible] اتارا۔ اسی دیوی کی اس ظالم کے ساتھ ایک زبردست جنگ ہوئی۔ یہ جنگ مسلسل نو دنوں تک چلتی رہی۔ دسویں دن وہ مارا گیا۔

(۲) ایک روایت یہ ہے کہ شری رام نے آج ہی کے دن راون پر فتح پائی تھی اور دس سر والے راون کی لنکا کو آگ لگا کر اسے بھی موت کے گھاٹ اتارا تھا۔

دسہرا شگون کی دس تاریخ کو آتا ہے۔ آج کے دن لکشمی اور اسلحہ جات کی پوجا کی جاتی ہے اس تعلق سے بھی ایک کہانی وابستہ ہے کہ پانڈو جب بن باس ہو گئے تو انہوں نے اپنے اسلحہ جات ایک درخت کے اندر چھپا دیئے تھے۔ بن باس سے لوٹنے پر انہوں نے ان اسلحوں کو نکالا، صاف کیا اور ان کی پوجا کی۔ اتفاق سے یہ واقعہ بھی اسی تاریخ کو وقوع پذیر ہوا۔

دیوالی

دیوالی ہندوستان کا بڑا تہوار ہے اسے دیش کے کونے کونے میں منایا جاتا ہے۔ ہندو حضرات بلکہ تمام ہندوستانی بالخصوص بیوپاری طبقے کے لوگ بڑے جوش و خروش سے مناتے ہیں۔ دیوالی کے دن کاروباری ہی کھاتوں کا اختتام ہوتا ہے جسے مہورت کے نام موسوم کیا گیا ہے۔

دیوالی کے ساتھ کئی تاریخی واقعات وابستہ ہیں۔ آج کے دن شری لنکا پر فتح حاصل کر کے اور بن باس کی معیاد پوری کرنے کے بعد شری رام راجدھانی ایودھیا لوٹے تھے۔ ان کی واپسی پر رعایا نے اپنے گھروں کے آگے دیپ جلا کر استقبال اور خوشی کا اظہار کیا تھا۔ یہ جھلملاتے ہوئے دیپ دور سے دیپوں کی لڑی کا منظر پیش کر رہے تھے۔ لہذا اس کا نام دیپاولی پڑا اور لفظ دیپاولی نے رفتہ رفتہ دیوالی کی شکل اختیار کر لی جس کا مطلب دیوی کی لڑی ہے۔

یہ تہوار پانچ دنوں کا ہوتا ہے اس کے ہر دن کی ایک تاریخ ہے۔

مکر سنکرانت:

گرنتھ پران کے مطابق ۱۴ اروپس کو سنکرانت دیوی نے سنکا سور اور کنکر اسور نامی دو راکشسوں کا خاتمہ کیا تھا۔ ہندوستان کسانوں کا ملک رہا ہے اس کی آبادی کا ایک بڑا حصہ آج بھی دیہاتوں میں بسا ہوا ہے۔ جنکا ذریعہ معاش کھیتی باڑی ہے۔ کاشتکار کی زندگی میں سورج بڑا اہم رول ادا کرتا ہے اس لئے وہ سورج کی خوشنودی کیلئے سورج دیوتا کی پوجا کرتے ہیں سوریہ دیوتا کو جلالی تصور کیا جاتا ہے۔ اسی لئے مکر سنکرانت کا تہوار سوریہ دیوتا سے بھی وابستہ ہے۔ اتر پردیش کے علاقوں میں اس تہوار کو "کھچڑی" بھی کہتے ہیں اس روز یہاں کے لوگ کھچڑی بنا کر کھاتے ہیں۔

بسنت پنچمی

ماگھ کی پانچویں کو بسنت پنچمی کہتے ہیں۔ اس تہوار کا

پرانی وشاستر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ کسانوں کا تہوار ہے۔ یہ تہوار بالخصوص فن کاروں کا تہوار ہے۔ سنگیت اور کا فنکاروں کا۔ یہی وجہ ہے کہ راگوں میں ایک راگ بسنت بھی ہے۔

مہا شیوراتری

میگھ کی ۱۴ کی رات کو یہ تہوار منایا جاتا ہے اس تہوار کی پران کے مطابق یہ کچھ ایسی رات ہے کہ قبل زمانہ تاریخ یہاں پر جنگل پھیلا ہوا تھا۔ دور دور تک آدم زاد نہ تھے اس زمانے میں انسان کی زندگی کا انحصار صرف شکار پر تھا۔ شیوراتری کی ایک رات پیش آنے والے واقعہ سے جڑی ایک کہانی پر منحصر ہے۔ اس رات ہندو شیو جی کی پوجا کرتے ہیں اور اپواس (روزہ) بھی رکھتے ہیں۔ آج کے دن پرندوں اور جانوروں کو پانی پلانا ثواب سمجھا جاتا ہے۔

ہولی

پھاگن ماہ کی پورنیما کو ہولی کے دن سے منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ بدی کے خاتمے کا دن ہوتا ہے۔ ہولی کی آگ سے تمام برائیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ دل سے کدورت پاک ہو جاتی ہے اس دن ہندو حضرات خوشی میں مگن ہو کر رنگ کھیلتے ہیں۔ طرح طرح کے رنگ و گلال ایک دوسرے پر اڑاتے ہیں۔ اس تہوار کے ساتھ کئی کہانیاں منسلک ہیں۔

ہولی بھارت کا سب سے پرانا تہوار ہے۔ قدیم زمانے میں اس کے منانے کی وجہ فصل کا پک جانا ہوا کرتا تھا۔ فصل کے تیار ہونے پر کاشتکار اپنے رب کا شکر ادا کرتا تھا۔ چوں کہ کھیت کی بوائی سے کٹائی تک سورج ایک اہم رول ادا کرتا ہے اور سورج جو اگنی یعنی آگ اور گرمی کی بھی نشانی ہے۔ اس کی خوشنودی کیلئے کسان آج کے دن آگ جلا کر اپنا نیا اناج اسکو بھینٹ کرتا تھا۔ یہ رواج پرانے زمانے سے اس ملک میں چلا آ رہا ہے۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس کے ساتھ کئی کہانیاں بھی جڑتی گئیں ان میں ایک کہانی ہرناکشیپ، ہولی کا (ہولیکا) اور بھگت پرہلاد کی بھی ہے۔

مسلمانوں کے تہوار

عید الفطر

عید الفطر مسلمانوں کا سب سے بڑا تہوار ہے۔ اس کو میٹھی عید یا رمضان عید بھی کہا جاتا ہے۔ یہ اسلامی کیلنڈر کے حساب سے یکم شوال کو منایا جاتا ہے۔ اس کو "عید الفطر" کہنے کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان عید کی واجب نماز سے پہلے فطرہ یعنی صدقہ دیتے ہیں۔ فطرہ کے دوسرے معنی روزہ کشائی کے ہوتے ہیں۔

رمضان کا پورا مہینہ روزہ رکھنے کے بعد اس دن یہ ختم کرتا ہے اس لئے اس کو عید الفطر (روزہ کھولنے کا تہوار) کہا جاتا ہے۔ ماہ صیام یا رمضان برکتوں کا مہینہ ہے اسی ماہ "قرآن مجید" مسلمانوں کی مقدس کتاب نازل ہوئی تھی لہذا قرآن شریف کی کثرت سے تلاوت کی جاتی ہے۔ یہ مہینہ صحیح معنوں میں عبادت و اطاعت کا ہے پانچ وقت کی فرض نماز کے علاوہ تراویح بھی ادا کی جاتی ہے۔ طاق راتوں میں جاگ کر عبادت کی جاتی ہے۔ زکوٰۃ (جو ایک طرح سے مسلمانوں میں صاحب حیثیت پر فرض ہے) نادار اور غربا میں تقسیم کی جاتی ہے۔ زکوٰۃ نادار بھائی کا پہلا حق ہے۔ فطرہ ہر مسلمان پر واجب قرار دیا گیا ہے۔ اسے ادا کیا جاتا ہے عید کے دن خاص طور پر شیر خورمہ اور سوئیاں پکانے اور مل جل کر کھانے کا رواج ہے۔

عید الاضحیٰ یا بقرعید

حضرت ابراہیم خدا کے پیارے نبی تھے۔ ان کے اولاد نہ تھی۔ آپ نے رب العزت سے دعا کی اور بارگاہ خداوندی میں دعا مقبول ہوئی اور بڑھاپے میں حضرت اسماعیل پیدا ہوئے۔ ایک روز حضرت ابراہیم نے خواب دیکھا کہ اللہ تعالیٰ آپ سے آپ کی عزیز ترین چیز کا قربانی چاہتا ہے۔ یہ خواب مسلسل تین دن تک آتا رہا آپ بہت پریشان ہوئے اپنے

...فرما بردار بیٹے سے صلاح لی ۔ اسماعیل میری عزیز ترین
...ے تم ہی ہو ، یہ سنتے ہی اسماعیل اپنی قربانی راہِ خدا میں
...نے کے لیے خوشی خوشی تیار ہو گئے ۔ مگر خدا کو تو
...ف ان کا امتحان لینا تھا ۔ اس لیے ایک معجزہ پیش آیا
...ر حضرت اسماعیل کی جگہ دنبہ ذبح کیا ۔

اسی واقعہ کی یاد میں یہ تہوار منایا جاتا ہے ۔ ہر سال مسلمان
...ا حیثیت کے مطابق مینڈھا دنبہ ، بھینس ، بیل یا اونٹ کی
...ربانی کرتے ہیں ۔ ان ہی لمحات میں عالم اسلام کا سب سے بڑا
...تماع حج مکہ معظمہ میں ادا کیا جاتا ہے ۔

مسلمانوں کے دیگر تہواروں کے بارے میں

محرم کی نوعیت اگرچہ تہوار میں شامل کرنے کی سی
...نہیں ہے ۔ کیوں کہ تہوار خوشی کے دن کو کہا جاتا ہے اور محرم کا
...لق غم ہے مگر محرم بہت سے ممالک میں منایا جاتا ہے ۔ یہ حضرت
...ام حسینؓ کی شہادت کا دن ہے ۔ اس لیے اس کا ذکر
...ی ہو جاتا ہے ۔

عید میلاد کو بھی عید کے زمرے میں رکھوں گا کیوں کہ اس
تعلق خاتم الانبیاء آخر الزماں آنحضرت محمدؐ کے یوم پیدائش
...ے ہے آج کی شب رسول اکرمؐ کی سیرت طیبہ پر تقاریر
...ی ہیں ۔

شب برات بھی ایک مقدس ترین رات ہے اور برصغیر
...ں یکساں طور پر بہت ہی تقدس احترام اور اہتمام کے ساتھ
...نائی جاتی ہے ۔ دراصل مسلمانوں کے سارے تہوار خدائے بزرگ
...برتر کی اطاعت و عبادت سے منسوب ہیں ان کا فصلوں
...ے اور موسموں سے کوئی رشتہ نہیں ہے ۔

سکھوں کے تہوار ۔

گرونانک جینتی

...ہ گرونانک کا یوم ولادت ہے ۔ گرونانک ۱۸ اپریل
۱۴۶۹ء میں کھتری گھرانے میں پیدا ہوئے انہیں بچپن سے ہی
اونچ نیچ اور دیگر فرسودہ رسم و رواج سے نفرت تھی ۔ وہ
بے شمار بھگوانوں ، دیویوں اور دیوتاؤں کی عبادت کو
برا سمجھتے تھے ۔ گرونانک کے والدین ہندو عقائد کے ماننے
والے تھے ۔ مگر گروجی کو اس مذہب سے کوئی لگاؤ نہ تھا انہوں
نے انسان کے بنائے چار طبقوں کی سخت مخالفت کی ۔ ان
کی نظر میں تمام انسان برابر تھے ۔ چھوت چھات کو برا سمجھتے
تھے ۔ گرونانک جی نے ایک خدا کی عبادت کی اور اسی کی تعلیم
لوگوں کو دی ۔ انہوں نے سکھ مذہب کی بنیاد رکھی ۔ سکھوں
کی مقدس کتاب کا نام گرو گرنتھ صاحب ہے ۔ اس میں
گرونانک دیو جی کے اقوال قلم بند ہیں ۔ آج کے دن اسے
پڑھا جاتا ہے ۔ گرونانک کی یاد تازہ کی جاتی ہے اور عوام
کی پیاس بجھائی جاتی ہے ۔

گرو گوبند جینتی

گرو گوبند جی سکھوں کے دسویں اور آخری پیشوا تھے
ان کا جنم ۱۶۶۶ء میں پٹنہ میں ہوا ۔ آپ سکھ مذہب میں
خالصہ فرقے کے بانی ہیں ۔ یہ دن ان کے یوم پیدائش کے طور
پر منایا جاتا ہے ۔

آپ ایک جید عالم تھے ، فارسی ، پنجابی اور برج بھاشا
پر انہیں عبور حاصل تھا ۔ انہوں نے بھٹکے ہوئے سکھوں کو مذہب
کی طرف راغب کیا ۔ شناخت کے لیے ناموں کے آگے سنگھ لگانے
پر زور دیا ۔ بال بڑھانے ، چڈی اور کڑا پہننے کرپان رکھنے
کی تلقین کی ۔

عیسائیوں کے تہوار

کرسمس

یہ ایک مقدس دن ہے ۔ آج کے دن حضرت
عیسیٰ کی ولادت ہوئی تھی ۔ آپ کی ولادت بھی دیگر پیغمبروں
کی طرح دنیا میں پھیلی ہوئی برائیوں کے خاتمے کیلئے ہوئی
تھی ۔ آپ ۲۵ دسمبر کے دن نزارتھ نامی گاؤں میں پیدا ہوئے
جو اسرائیل میں واقع ہے ۔ ماں کا نام مریم تھا ۔ مریم بالکل

کنواری تھیں جب عیسیٰؑ ان کے رحم میں پرورش پا رہے تھے۔
اس تعلق سے عقائدِ عیسیٰ کا کہنا ہے کہ ایک دن بی بی مریم خدا کی عبادت کر رہی تھیں کہ کیا دیکھا کہ ایک فرشتہ ان کے پاس آیا اور کہا اے مریم اب تو ماں بننے والی ہے۔ بی بی مریم رونے لگیں اور کہا "مگر میں تو کنواری ہوں" فرشتے نے جواب دیا یہ خدا کا حکم ہے کہ اب تیرے پیٹ میں ایک پاک روح پرورش پائے گی یہ خدا کا پیغمبر ہوگا۔
اس واقعہ کے بعد بی بی مریم کے رحم میں بچہ حرکت کرنے لگا۔ اس درمیان لوگوں نے ان پہ بہتان لگانا شروع کیا وہ برداشت کرتی رہیں۔ اس طرح حضرت عیسیٰ کا جنم ہوا یہی وجہ ہے کہ عیسائی آپ کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں۔ اور مسلمان آپ کو نبیا پیغمبر تسلیم کرتے ہیں۔ بڑے ہو کر حضرت عیسیٰ نے وحدانیت کی تبلیغ کی۔ اور عیسائی مذہب کی بنیاد رکھی۔

گڈ فرائی ڈے

گڈ فرائی ڈے عیسائیوں کے لئے غم کا دن ہے۔ آج ہی کے دن آپ کو صلیب پر چڑھایا گیا تھا۔ آج کے دن عیسائی خاموش جلوس نکالتے ہیں بائبل کی تلاوت کرتے ہیں۔ گرجا گھروں میں دوپہر دیر گئے تک دعائیں ہوتی رہتی ہیں۔ اس تہوار کو مقدس جمعہ بھی کہہ سکتے ہیں۔

ایسٹر

قدیم زمانہ یونان میں یہ تہوار ایسترا کے نام سے منسوب تھا۔ یہ تہوار ۲۲ مارچ سے ۲۵ اپریل تک چودھویں کی چاندرات کے بعد آنے والے پہلے اتوار کو منایا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے جس دن عیسیٰ کو صلیب پر چڑھا دیا گیا تھا۔ اس سے ٹھیک دو دن بعد یعنی اتوار کے روز حضرت عیسیٰ مسیح قبرستان سے زندہ ہو کر اپنے ماننے والوں کے سامنے آئے اور ان سے مخاطب ہوئے قیاس کیا جاتا ہے کہ مسیح کے دوبارہ زندہ ہونے کی خوشی میں یہ تہوار منایا جاتا ہے۔

پارسیوں کے تہوار

نوروز

پارسیوں کے سال کا پہلا دن ہے۔ پارسی نہا دھو کر اگیاری جاتے ہیں۔ آتش کی پوجا کی جاتی ہے اس دن پارسی ایک دوسرے کو نئے سال کی مبارکباد دیتے ہیں ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر "ہم زور" لفظ کا استعمال کرتے ہیں۔ ہم زور کے لفظی معنیٰ اتحاد کے ہیں۔

خورداد سال

زرتشت کا جنم ایران میں دارج ندی کے کنارے آباد ایک گاؤں میں ہوا تھا۔ ان کا پیدائشی نام تھا۔ الہام کے بعد ان کا نام زرتشت رکھ دیا گیا۔ یہ پارسی مذہب کے بانی ہیں۔ یہ دن ان کی یاد سے منسوب کیا جاتا ہے۔

یہودیوں کے تہوار

روش ہشانہ

یہ یہودیوں کا نیا سال ہے۔ آج کے دن سے کیلنڈر کا آغاز ہوا ہے۔ اس تہوار کو منانے کی کئی وجوہات ہیں۔ ان میں دو ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔
(۱) بنی اسرائیل (یہودیوں) کے عقیدے کے مطابق آج کے دن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کا حساب کرتا ہے۔
(۲) کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم کی قربانی آج کے دن قبول ہوئی تھی۔ یہ انتہائی خوشی کا تہوار ہے۔ کثرت سے عبادت گاہ جاتے ہیں اور توریت پڑھتے ہیں۔

یوم کپور

خوشی کا دن ہے عقائد کے مطابق رب العزت انصاف کرتا ہے گناہوں کی معافی دیتا ہے اس لئے اسے

یوم تلافی بھی کہا جاتا ہے۔ یہودی اس روز پہلے گرم پھر ٹھنڈے پانی سے نہاتے ہیں۔ کہیں کہیں صرف ٹھنڈے پانی سے نہانے کا رواج ہے۔ غسل کرنے کے بعد یہ لوگ سفید کپڑے پہنتے ہیں۔ عبادت گاہ جاتے ہیں۔ توریت کی قرأت کی جاتی ہے۔ آج کے دن روزہ رکھا جاتا ہے۔

سکوتھ

ہبرو (عبرانی) میں سکوتھ بے چھت گھر کو کہتے ہیں اس کو خیمہ کے معنیٰ میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

بلبیکل زمانے میں (قبل مسیح) میں یہودی مصریوں کے ظلم وستم سے بچنے کیلئے خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ کبھی پکا مکان یا مستقل رہائش کا انتظام نہیں کیا۔ مصریوں کی غلامی سے نجات پانے کے بعد انہیں سکون میسر آیا اور بستی بستیوں میں آباد ہونے لگے۔ غلامی کی سختیاں اور آزادی کی کھلی سانس میں تمیز باقی رہے اس لئے اللہ نے یہودیوں کو ہدایت دی کہ وہ سال میں ایک بار "سکا"، (گھاس پھوس کا جھونپڑا) بنا کر رہیں تاکہ وہ آزادی کی اہمیت کو سمجھ سکیں

اس روز بنی اسرائیل عبادت گاہوں میں جاتے ہیں، خدا کا شکر ادا کرتے ہیں یوم سکوتھ پر یروشلم میں جلوس نکالے جاتے ہیں۔

ہانوکا

یہ تہوار آٹھ دنوں تک چلتا ہے۔ ان دنوں یہودی اپنے گھروں میں موم بتیاں جلاتے ہیں۔ اپنی کامیابی و کامرانی کا جشن مناتے ہیں۔ یہ تہوار ایک تاریخی فتح سے وابستہ ہے جو بنی اسرائیل کو ۱۶۵ ق۔م میں حاصل ہوئی تھی۔ یہ فتح میکابس کو آنوکس نامی ظالم بادشاہ پر حاصل ہوئی تھی۔ ان دنوں یہودی میکابس کی فتح کی کہانی سنتے ہیں خدا کا شکر ادا کرتے ہیں اس کا شکر بجالاتے ہیں۔

پورم

یہ تہوار بھی تاریخی فتح سے وابستہ ہے۔ پورم کا اہتمام دشمن پر فتح حاصل ہونے کی خوشی میں کیا جاتا ہے۔ پورم کے معنیٰ قرعہ اندازی کے ہیں۔ ہمان نے یہودیوں کے قتل کا دن چھٹی ڈال کر طے کیا تھا مگر یہ دن اس کی موت کا دن ثابت ہوا۔

تشہ بے آب

یہودیوں کی عبادت کا دن ہے۔ اس دن روزہ رکھا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہودیوں کو اس روز سخت ترین حادثات سے گزرنا پڑا تھا۔ یہ دن قومی روزہ کا دن بھی ہوتا ہے۔

شابواوتھ

شابواوتھ اسرائیلی کیلنڈر کے مطابق سیوان ماہ کی چھٹی ساتویں تاریخ کو آتا ہے۔ دو دنوں کے اس تہوار کو بڑی دھوم سے منایا جاتا ہے۔ اس تہوار کو منانے میں تاریخی اور زراعی وجوہات شامل ہیں۔

پے شاہ

یہ بنی اسرائیل کا قدیم ترین تہوار ہے پے شاہ کا مطلب چھلانگ مارنے کے ہیں۔ انگریزی میں اسے پاس اوور کہا جاتا ہے۔ اس تہوار کا اہتمام آٹھ دنوں تک ہوتا ہے۔ اس سے بھی تاریخی واقعہ جڑا ہوا ہے پے شاہ غلامی سے نجات پانے کی خوشی میں منایا جاتا ہے۔ اس تہوار کو اسرائیل میں قومی تہوار کا مرتبہ حاصل ہے۔

قومی تہوار

۱۵ راگست یوم آزادی

۱۵ راگست ۱۹۴۷ کو ہندوستان آزاد ہوا۔ اسے انگریز کے تسلط سے نجات دلانے میں بے شمار جانیں گئیں۔ یہ دن انہیں شہیدوں کی یاد اور آزادی کی خوشی کے سلسلے میں منایا

جاتا ہے۔ اس تہوار میں تمام مذہب و ملت کے لوگ شامل ہوتے ہیں۔ تمام دفاتر، اسکول اور زیادہ تر کاروبار بند رہتے ہیں۔

یوم جمہوریہ

۲۶ جنوری کو یوم جمہوریہ کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے آج ہی کے دن ۱۹۵۰ء میں بھارت کا دستور عملی طور پر نافذ کیا گیا تھا۔ اس آئین کے تحت تمام ہندستانیوں کو مذہبی آزادی، برابری کا حق اور انصاف ملتا ہے حکومت بنانے اور قانون سازی میں بھی ایک عام انسان کو دخل دینے کا حق حاصل ہوا ہے، آئین ہند کے تحت انسانی رشتوں کو تقویت ملی ہے بھائی چارگی کا ناطہ مضبوط ہوا ہے لہذا یوم جمہوریہ کو عوام نئے جوش و خروش اور جذبۂ حب الوطنی کے ساتھ مناتے ہیں۔

جین دھرم کے تہوار

مہاویر جینتی

جیت ماہ کی ۱۲ تاریخ ۵۲۷ء ق۔م کو وردھمان مہاویر کا جنم ہوا، آپ چوبیسویں تیرتھنکر کہلائے گئے۔ اور وہ آخری تیرتھنکر تھے۔ یعنی جین عقائد کے مطابق یوں سمجھئے کہ آخری مذہبی رہنما تھے۔

آج کے دن اس مذہب کے ماننے والے آپ کا یوم ولادت مناتے تھے۔ ان کی پوجا کی جاتی ہے اور مذہبی جلسوں کا انعقاد ہوتا ہے اور بھگتا تہوار ہیں۔ اس دھرم میں بھی دو فرقے ہیں۔

بدھ دھرم کے تہوار

بدھ جینتی

گوتم بدھ نے بدھ دھرم کی بنیاد رکھی اس کی تعلیمات سناتن دھرم کے اصولوں سے مختلف تھی اس لئے یہ مذہب کم وقت میں مقبول ہوا۔ ۵۶۳ء ق۔م کو آپ کا جنم ہوا۔ یہ دن ان کی یاد میں جشن ولادت کے طور منایا جاتا ہے۔

صوبائی تہوار

نوروز

کشمیریوں کے نئے سال کا پہلا دن ہوتا ہے۔ اسے پورے صوبے میں بہت ہی جوش و خروش سے منایا جاتا ہے۔

لوہاری

پنجاب اور ہریانہ کا مقبول ترین تہوار ہے۔ اسے ہولی کی طرح آگ جلاکر اور اس آگ میں مختلف اقسام کے اجناس بھینٹ چڑھاکر منایا جاتا ہے۔

جوالا مکھی میلہ

ہماچل پردیش کی کانگڑا کی ترائیوں میں بڑے اہتمام اور پرجوش طریقے سے منایا جاتا ہے۔ آتش فشاں کی دیوی کو خوش کرنے کیلئے اس تہوار کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

چھٹ

یہ تہوار سوریہ دیوتا سے وابستہ ہے اور بہار کے صوبے میں اہتمام کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ بہار میں اس کی مقبولیت درگا پوجا کی طرح ہے لوگ چھ روزہ اپواس رکھتے ہیں اور سوریہ دیوی کی پوجا کرتے ہیں۔ یہ تہوار آدی واسیوں میں آتنا ہی مقبول ہے۔

بی ہو

آسام اور منی پور میں یہ تہوار سال میں تین بار منایا جاتا ہے۔ یہ کاشتکاروں کا تہوار ہے اس کا تعلق فصلوں سے ہے اس تہوار میں بھینس لڑانا مقبول ترین کھیل ہے۔ اس تہوار کے تین نام یوں ہیں۔

(۱) بھوگ بی ہو : اپریل ماہ کے وسط میں آتا ہے۔
(۲) منگھو بی ہو : جنوری کے وسط میں منایا جاتا ہے۔
(۳) کٹی بی ہو : کٹی بی ہو اکتوبر کے وسط میں آتا ہے۔

کاریوال

گرا میں کیھولک کرسچن اس تہوار کو رنگارنگ طریقے سے مناتے ہیں۔ یہ تین دنوں تک چلتا ہے اس تہوار میں موسیقی اور ناچ گانے کو انفرادیت حاصل ہے۔

پونگل

یہ تہوار جنوبی ہند۔ خصوصاً تامل ناڈ کا سب سے بڑا تہوار ہے تین دن تک مسلسل منائے جانے والے اس تہوار میں پہلے دن کو بھوگی پونگل، دوسرے دن کو سوریہ پونگل اور تیسرے دن متو پونگل کہتے ہیں۔

اونم

یہ کیرالا کا سب سے بڑا تہوار ہے۔ اسے راجہ مہابلی کی یاد میں منایا جاتا ہے۔ گنپتی چترتھی اور نوراتری کی طرح دس دن تک چلتا ہے۔ اس میں دو لوک ناچ اور سنگیت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

گڈی پاڑوا

یہ تہوار مہاراشٹر کا سب سے بڑا تہوار ہے۔ سال کا پہلا دن ہے۔ آج کے دن نیم، زیرہ، نمک، کالی مرچ اور ہینگ بنی چٹنی پکائی جاتی ہے۔

• مشتاق الحوی،
بھارت ٹاکیز بھوپال

غزل

گلشن دل پہ خزاں کا تھا سرایا آنچل
فصل گل آئی تو پھولوں نے اڑایا آنچل

تم کتابوں میں، رسالوں میں پڑھو تو دیکھو
میں نے تحریر کیا نام حیا کا آنچل

تیرے آتے ہی ہوئے زخم نمایاں دل کے
تو، خدا کے لئے ہنس ہنس کے نہ سرکا آنچل

چہرۂ ماہ پہ پردہ نہ کبھی ڈال سکی!
زلف نے یوں سیاہ رات پہ ڈالا آنچل

آسماں کیا ہے وہ اک سایہ ہے دنیا کے لئے
میری امید کا سایہ ہے کسی کا آنچل!

میری مشتاق نگاہوں کو ذرا دیکھو تو
میں نے پلکوں پہ اٹھایا ہے نظر کا آنچل

بیساکھی

آج کے دن گرو گوبند جی نے خالصہ فرقے کی بنیاد رکھی تھی۔ لہٰذا پنجاب میں اس دن کو تقدس کا درجہ حاصل ہے۔ ہندستان کے شمالی حصے میں نئے سال کی ابتداء بھی ہوتی ہے۔ اس لئے اسے بڑے جوش و خروش سے منایا جاتا ہے۔

ماضی کے آئینے سے

فیاض رفعت

انتہائے غم

ڈاکٹر داس کا شمار دنیا کے گنے چنے ذہنی امراض کے ماہرین میں ہوتا تھا۔ وہ مریض کی حرکت و عمل اور اس کے شعوری اور غیر شعوری کوششوں کو جدید نفسیات کی روشنی میں پرکھنے کے بعد ہی علاج تجویز کرتے تھے۔

اس وقت بھی وہ کلینک کے داخلی دروازہ سے لگ کر کھڑے ہوئے اس شخص کا نفسیاتی جائزہ لینے میں مصروف تھے جو ابھی کچھ دیر قبل ہی آیا تھا۔ وہ ایک ستائیس اٹھائیس سالہ یورپین نوجوان تھا۔ اس کا چہرہ خاصہ جاذب نظر تھا۔ مگر اس میں تازگی نہیں تھی۔ وہ اس کے کوٹ کے رنگ کی طرح پیلا تھا اس نے ورسٹڈ کی مٹیالے رنگ کی پتلون پہن رکھی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ پتلون کی جیب میں تھا ——— وہ بڑی سنجیدگی سے سوچ کی گہرائیوں میں ڈوبا ہوا تھا اور اپنے گرد و پیش کے ماحول سے بالکل بے نیاز نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر سب سے زیادہ متاثر کن اس کی آنکھیں ہی تھیں ایسا لگتا تھا جیسے ان میں جادو جگانے کی قوت ساحری کی آنکھوں سے بھی زیادہ ہے۔

ڈاکٹر نے ایک بار اخبار کی اوٹ سے اس کی جانب دیکھا اور مسکرا دیا۔ وہ اس کے خیال کے سلسلے کو منقطع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ حالانکہ اسے جلدی تھی۔ وہ آج اپنی بیوی شیلا کے ساتھ جرمنی کا مشہور سرکس دیکھنے جانا چاہتا تھا۔ جو پچھلے ایک ہفتہ سے اس کے شہر میں دھوم مچائے ہوئے تھا۔ اور جس کا بہترین آئٹم کسی مسخرے کے کمالات کا مظاہرہ تھا۔ یہ مسخرہ ہنساتے ہنساتے لوگوں کے پیٹ میں بل ڈال دیتا تھا ——— اس کی بیوی شیلا کو ہنسنے ہنسانے کے پروگراموں سے بڑی دلچسپی تھی شاید اس لئے اور بھی کہ وہ بذات خود ایک اچھی مزاح نگار تھی۔ اور اس کے مضامین "پنچ" جیسے معیاری پرچے میں شائع ہو چکے تھے۔

ڈاکٹر نے اس یورپین نوجوان پر ایک بار گہری نظر ڈالی اور بڑی احتیاط سے کرسی پر پہلو بدلا ——— نوجوان بدستور خیال کی بھول بھلیوں میں کھویا ہوا تھا۔

وہ لندن کے کسی ویران پارک میں روتا بلکتا پایا گیا تھا۔ اس کی پرورش یتیم خانوں میں ہوئی تھی۔ شعور کی پختگی کے ساتھ ساتھ اسے شدت سے احساس ہوتا گیا تھا کہ وہ اس دنیا میں بالکل تنہا ہے۔ اور اس تنہائی کے شدید احساس نے اس کی روح میں تشنگی کا زہر گھول دیا تھا۔ یتیم خانہ کا سرپرست انتہائی بے رحم اور بد مزاج آدمی تھا۔ وہ اس سے بہت زیادہ کام لیتا تھا اپنے بے ڈھب بڑے بڑے لوہے جوتوں پر اس سے پالش کراتا تھا۔ ڈرائنگ روم کی صفائی بھی اس کے ذمہ تھی۔ باورچی خانہ کا کچھ کام بھی اسے کرنا پڑتا تھا۔ اور اگر کبھی کبھار اس سے کوئی پلیٹ ٹوٹ پھوٹ جاتی تھی تو اسے اپنے سرپرست کی غلیظ گالیاں سننی پڑتی تھیں۔ گھونسے تھپڑ اسے کھانے پڑتے تھے۔ اور وہ بڑے بڑے لوہے جوتے بھی، جنہیں وہ اپنی میلی اور بوسیدہ قمیض سے چمکایا کرتا تھا۔ اور جنہوں نے اس کے نرم جسم پر نشان ڈال دیئے تھے۔ وہ اپنے سرپرست کے مظالم اور جبر و تشدد سے تنگ آ کر اکثر خودکشی کے متعلق سوچنے لگتا تھا۔ رہ رہ کر اس کے دل میں یہ جذبہ پیدا ہوتا تھا کہ اسے موت آ جائے۔ ایسی زندگی سے فائدہ بھی کیا۔ جس میں ذلت ہی ذلت ہے۔ کاش وہ پیدائش کے وقت ہی مر گیا ہوتا۔ کاش اسے پارک میں کوئی درندہ کھا لیتا۔ اس کا سرپرست جب غصہ میں دانت پیستا ہوا اسے حرامزادہ کہتا تو وہ اپنی مجبوری پر بلک بلک کر رو دیتا تھا۔ اور اسے بے اختیار اپنی ماں یاد آ جاتی تھی۔ ایک تخیلی پیکر اس کی آنکھوں کے سامنے اُبھرتا تھا۔ اور وہ ماں، ماں کہہ کر چیخ اٹھتا تھا۔ اس طرح وہ بچپن سے

جوانی کے دور تک ماں کی مقدس محبت اور اس کے لازوال پیار کے لئے تڑپتا رہا تھا۔ مگر اسے ماں کی ممتا نصیب نہ ہو سکی تھی۔ وہ اس سے محروم ہی رہا تھا۔

ہوش سنبھالنے کے بعد ہی وہ ایک روز رات کو یتیم خانہ سے بھاگ گیا تھا اور پھر وہ شہر در شہر بھٹکتا رہا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح عورتوں کو گھورتا تھا۔ مگر اس کے ذہن نے ماں کا جو تخیلی پیکر تراشا تھا۔ وہ کسی سے بھی میل نہ کھاتا تھا۔ شاید اس لئے کہ وہ کنواری بیکر مریم کی طرح مقدس۔ حوروں سے زیادہ حسین اور نازک پھولوں سے بھی زیادہ خوش رنگ اور لطیف تھا۔

اچانک اس کی زندگی میں ایک لڑکی آ ئی۔ موتیس ۔۔ وہ بڑی پیاری لڑکی تھی۔ بہت خوش مزاج اور پرمزاح لڑکی تھی۔ پتہ نہیں اُسے جیتس کی کونسی ادا بھائی تھی کہ وہ اس پر مرمٹی تھی۔ جیتس بھی خلاف توقع اس سے پیار کرنے لگا تھا۔ اور بڑی حد تک پرسکون اور مطمئن نظر آنے لگا تھا۔ اور پھر ایک دن۔

وہ اور موتیس جھیل کے کنارے مچھلیوں کا شکار کھیلنے گئے ہوئے تھے۔ اس دن موتیس نے فیروزی رنگ کے بروکیڈ کا اسکرٹ اور سفید ساٹن کا چمکیلا بلاؤز پہن رکھا تھا۔ وہ بہت حسین نظر آ رہی تھی۔ موسم بھی خوبصورت تھا۔ وہ دونوں بہت دیر تک مچھلیاں پکڑتے رہے تھے۔ ڈوبتی ابھرتی لہروں کو دیکھتے رہے تھے۔ لہروں کے شفاف آئینہ میں ان کے عکس تھرتھرا رہے تھے۔ اور موتیس اس کے قریب کھسک آ ئی تھی۔ جیتس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔

" کہہ دو جیتس جلدی کہہ دو۔۔" اس نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا ۔۔۔

" تم ۔۔۔۔ تم کتنی اچھی ہو" جیتس نے اٹک اٹک کر کہا " تم مریم کی طرح مقدس حوروں سے زیادہ نازک پھولوں سے زیادہ لطیف ۔۔ اور ۔۔۔ ساحرہ ہو پھر وہ چیخ اٹھا تھا۔ موریا مجھے وہ چہرہ مل گیا ۔۔۔ جس کی مجھے برسوں سے تلاش تھی ۔۔۔ وہ تم ہو ۔۔۔ تم ۔۔۔ ہاں۔ ہاں تم ۔ میری ماں ہو ۔۔۔ تم میری ماں ہو ۔۔۔ موریا ۔۔۔ میری ماں! مجھے سینے سے لگا لو وہ ہانپتے ہوئے کہا تھا ۔۔۔ میری تشنگی دور کر دو ۔۔۔ مجھے سینے سے لگا لو"

موتیس بپھری ہوئی شیرنی کی طرح اس کے پہلو سے اٹھ گئی تھی۔ اس نے انتہائی نفرت سے اُسے گھورا تھا۔ اور اس کے منہ پر تھوک دیا تھا۔ "پاگل۔ جنونی۔ سڑی" اور وہ اسے اکیلا چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ وہ اسے آوازیں دیتا رہ گیا تھا۔ مگر اس کی آواز کون سنتا تھا۔ اس کی آواز گونج بن کر رہ گئی تھی۔ اور وہ روتا رہا تھا۔ اس کا سارا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو گیا تھا۔ پھر وہ کبھی نہیں ہنس سکا تھا۔ اسے کبھی ہنسی نہیں آئی تھی۔ اور اس نے اس روز اس شہر کو چھوڑ دیا تھا۔

اس نے اپنی نظریں اٹھائیں۔ ڈاکٹر بدستور اخبار کے مطالعہ میں مصروف تھا۔ وہ خاموشی سے بغیر کچھ کہے سنے مقابل کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر نے اخبار رکھ دیا۔ ایک لمحہ تک وہ خاموش رہا۔ اور پھر سگریٹ کا ڈبہ اس کے آگے کھسکا دیا۔

" شکریہ میں سگریٹ نہیں پیتا"

" اوہ کوئی بات نہیں نہ سگار؟" ڈاکٹر نے خوش اخلاقی سے کہا۔

" جی نہیں"

" چائے۔ کافی یا ٹھنڈا پانی؟"

" جی کچھ نہیں"

" ہوں" ڈاکٹر نے کچھ سوچا اور اسے مخاطب کیا۔

" آپ کچھ سوچ رہے تھے" ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے بے تکلفی سے کہا

" جی ہاں"

" کیا؟"

" میرے ذہن میں ایک گرہ لگ گئی ہے۔ اور پچھلے دس سالوں سے وہ گرہ نہیں کھل سکی" وہ رکا۔ اور تذبذب کے عالم میں بولا ۔۔۔ " مجھے ہنسی نہیں آتی ۔۔۔ میں ایک مسکراہٹ کے لئے ترس گیا ہوں، ایسی مسکراہٹ جس میں دل کی سچی خوشی شامل ہو ۔۔۔ کیا تم مجھے ہنسی دے سکتے ہو؟۔ کیا تمہارے پاس اس کا کوئی علاج ہے؟" اس نے تیزی سے کئی جملے کہے اور خاموش ہو گیا

"آپ بہت زیادہ پریشان ہیں۔ زندگی نے شاید آپ کو بہت غم دیئے ہیں؟"

"ہاں ڈاکٹر! تم ٹھیک کہتے ہو..... مگر..... مگر مجھے ہنسی کیوں نہیں آتی۔ میرے ہونٹوں پر پھولوں کی طرح شاداب ہنسی کیوں نہیں کھیلتی؟"

"بعض اوقات انسانی زندگی ایسے حادثات سے دوچار ہوتی ہے کہ انسان مایوسی کے عمیق ترین اندھیروں میں ڈوب جاتا ہے — کیا آپ کی زندگی میں بھی کوئی حادثہ.....؟" ڈاکٹر نے دریافت کیا۔

"ہاں ڈاکٹر ہاں..." اور پھر جیمس نے اپنی زندگی کے اوراق ڈاکٹر کے سامنے پلٹ دیئے۔

جیمس کی زندگی کی المناک داستان سن کر ڈاکٹر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ لیکن وہ مریض کو اس بات کا احساس دلا کر اسے مزید احساسِ کمتری میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا تھا — شاید اسی لئے وہ بڑی خوبصورتی سے اپنے آنسو پی گیا تھا۔ مسئلہ بہت مشکل اور پیچیدہ تھا۔ پھر بھی تسلی و تشفی دینا ڈاکٹر کا پہلا فرض ہوتا ہے۔ خصوصاً ذہنی امراض کے ماہرین کو اس کی بہت ضرورت پڑتی ہے۔ وہ کسی بھی طرح مریض کو اس کی ذہنی نزاکت کا احساس نہیں ہونے دیتے۔

"مسٹر جیمس کوئی خاص بات نہیں زندگی میں حادثات پیش آتے رہتے ہیں۔ آپ یقیناً ہنس سکیں گے"

"ڈاکٹر میں دنیا کے بہترین ماہرین سے مشورہ لے چکا ہوں۔ دنیا کے متعدد مقامات کے چکر لگا چکا ہوں۔ مگر....."

"آپ بلاوجہ مایوس ہو رہے ہیں۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ..."

اور ابھی ڈاکٹر اپنا جملہ پورا نہیں کر پایا تھا کہ شیلا کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی — "ڈارلنگ کتنی دیر کر دی تم نے — کیا سرکس نہیں چل رہے؟"

"ہیلو شیلا۔ تم نے خوب یاد دلایا۔ میں بالکل تیار ہوں۔ بی کمال تم ان سے ملو۔ آپ ہیں میرے نئے دوست مسٹر جیمس — اور یہ ہیں شیلا میری بیوی" جیمس نے نظریں اٹھا کر شیلا کی طرف دیکھا۔ اور اپنی جگہ سے ایک انچ کھسکے بغیر اپنا ہاتھ شیلا کی طرف بڑھا دیا۔

"مسٹر جیمس شیلا بہت ہنسوڑ ہے۔ ہر وقت ہنستی رہتی ہے۔ یہ مزاح نگار بھی ہیں۔ ان کے مزاحیہ مضامین اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ تم ان کے لطیفوں پر بے اختیار ہنس دو گے" ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ اجنبیت کے احساس کو بالکل ختم کر دینا چاہتا تھا۔

"آیئے بی کمال ہم لوگ جانسن کا مشہور سرکس دیکھنے چل رہے ہیں۔ آپ نے بھی نام سنا ہوگا؟"

"جی ہاں۔ مسٹر جیمس یہ بہت اچھا رہے گا۔ ہم لوگ اکٹھے سرکس دیکھ سکیں گے۔ خوب لطف رہے گا۔ اس مشہور سرکس میں کوئی مسخرہ ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا مسخرہ۔ سنجیدہ کامیڈی میں جس کا جواب نہیں۔ سنا ہے کہ دنیا بھر کے اعزازات و انعامات حاصل کر چکا ہے۔ میں تو صرف اسی کی خاطر سرکس دیکھنے جا رہا ہوں۔

جیمس کے چہرہ پر الجھن کے آثار تھے۔ شاید وہ ان لوگوں کے ساتھ جانا نہیں چاہتا تھا —

"آپ بلاوجہ تکلفات برت رہے ہیں۔ آیئے بھی"

"مگر ڈاکٹر....."

"ہاں کہیئے۔ میں آپ کی ہر بات ماننے کو تیار ہوں۔ مگر آپ کو سرکس ضرور چلنا ہوگا"

"مگر ڈاکٹر۔ م۔ میں..."

"آپ بلاوجہ رسمیات میں الجھ رہے ہیں۔ کیا آپ کو ہماری دوستی پر اعتماد نہیں؟"

"نہیں ڈاکٹر یہ بات نہیں بلکہ..." جیمس نے اپنا سر تھام لیا۔

"آپ جو بھی کہنا چاہتے ہوں کہہ ڈالیئے" ڈاکٹر نے خوش گوار لہجہ میں کہا۔

"قسمت کی یہ کتنی بڑی ستم ظریفی ہے۔ قدرت کا یہ کتنا بڑا ظلم ہے..." جیمس پھر رک گیا۔ اس نے ڈاکٹر کے چہرہ پر نظریں جما دیں۔

"ڈاکٹر وہ مسخرہ میں ہی ہوں۔ میں ہی ہوں وہ مسخرہ — میں ساری دنیا کو ہنسا سکتا ہوں۔ مگر خود نہیں ہنس سکتا"

اس بار کوشش کے باوجود ڈاکٹر اپنے آنسو نہیں روک پایا۔ شیلا حیرت سے اس کا منہ تک رہی تھی۔

[جام نو۔ دہ سالہ نمبر ۱۹۶۱ء]

مقیت اعظمی
اینگلو اردو ہائی اسکول
دھولیہ - ۴۲۴۰۰۱

غزلیں

بیتے ہوئے لمحوں کا تجھے غم تو نہیں ہے
بے وجہ تری آنکھ یہ پُرنم تو نہیں ہے

اے کاکلِ گیتی ذرا اتنا تو بتا دے
باقی ترے پہلو میں کوئی غم تو نہیں ہے

موتی سا چمکتا ہے چمن میں جو ہر اک سو
یہ اشکِ بہاراں ہے یہ شبنم تو نہیں ہے

آتے ہیں نظر غنچہ و گل چاک گریباں
برگشتہ ہواؤں کا یہ موسم تو نہیں ہے

مسموم سی لگتی ہے فضا شہر کی ہر سو!
درپردہ کوئی سازشِ پیہم تو نہیں ہے

کس بات کی رہتی ہے تمہیں فکر مقیت ایسا
احباب کی فطرت کہیں برہم تو نہیں ہے

●

میری الفت کا نہ دے مجھکو صلا رہنے دے
بارِ احسان سے مرا سر نہ جھکا، رہنے دے

چاندنی راتوں میں ہو جاتے ہیں سب زخم ہرے
تپتے سورج کو مرے سر پہ، ذرا رہنے دے

وقت کی دھول ہے، شاید ہی ہو کم مرے
دستِ نازک میں ترے نقشِ حنا، رہنے دے

راہ گیروں کو جو ٹھوکر سے بچائے شب میں
اک دیا ایسا سرِ راہ جلا رہنے دے

پھول قسمت سے چٹانوں پہ کھلا ہے ظالم
چند لمحوں کے لئے بھی تو کھلا رہنے دے

دیکھنا بادِ صبا آئے گی لے کر خوشبو
گھر کا دروازہ مقیت آج کھلا رہنے دے

بھگوان داس اعجاز
ٹی ۴۵/۱۵ لجپت نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۰۸

دوہے

آیا اپنے گاؤں میں، پہونچا ہوا فقیر
میں دکھلاؤں گی اسے ہاتھ کی اک لکیر

وہ اگر آئے یہاں کرے نہ پل بھر دیر
جوگی اس کے نام کا منتر ایسا پھیر

ان کے آنے کی خبر لگتی ہے کچھ ٹھیک
بجتی ہیں شہنائیاں، اس دل کے نزدیک

آتے ہی کہنے لگے اور نہ کرے دیر
جاتے جاتے لے چلے اپنے سنگ سویر

اونر موہی پیار کو آنک سکے تو آنک
آنکھوں کے رستے مرے دل کے بھیتر جھانک

دنیا گرگٹ کی طرح بدلے رنگ انیک
لیکن انتم سانس تک ہم دونوں ہیں ایک

سنگم پانی آگ کا ہم نے دیکھا آج
کرن کرن ہے زندگی لہر لہر ناراج

غزل

جب زمانے سے یہ دل اکتا گیا
لوٹ کر کوچے میں تیرے آ گیا

غیر کی باہوں میں تجھ کو دیکھ کر
ساری دنیا میں اندھیرا چھا گیا

دیکھ کر مجھ کو نگاہیں پھیر لیں
زندگی کیا ہے کوئی سمجھا گیا

ایک بھوکا بھوک کا مارا ہوا
زہر کو روٹی سمجھ کر کھا گیا

کیا بتاؤں اس میں کیا اعجاز تھا
صنفِ نازک پہ بھی قابو پا گیا

شمس الاسلام نسیم
۲۲۷، بخشی بازار، الٰہ آباد ۔ ۲۱۱۰۰۳ (یوپی)

غزلیں

دیکھئے اک نظر حالتِ خاص و عام
آج برہم ہے ہر زندگی کا نظام

کوئی بیٹھا ہے چلمن کے پاس اس طرح
پردۂ ابر میں جیسے ماہِ تمام

ایسا لگتا ہے پھر انقلاب آئے گا
آج ہر دل میں ہے شعلۂ انتقام

بھولنے والے تجھ کو پتہ ہی نہیں
آج بھی میرے ہونٹوں پہ ہے تیرا نام

عزمِ ترکِ محبت نہ کام آسکا
دل ہمیشہ ہی کرتا رہا اپنا کام

بدحواسی کا الزام مجھ کو نہ دو!
ہر نظر سے تمہاری چھلکتا ہے جام

دل میں رہنے دے ورنہ یہ مٹ جائیگا
انگلیوں سے نہ لکھ ریت پر میرا نام

فکرِ شب کیجئے آپ اب اے نسیم
ڈھلنے والا ہے دن ہونیوالی ہے شام

کوئی مخمور آنکھوں کو ملتا رہا
مے برستی رہی دور چلتا رہا

میں ہواؤں کے تیور بدلتا رہا
آندھیوں میں چراغ اپنا جلتا رہا

پھول کھلنے سے پہلے ہی مرجھا گئے
موسمِ گل بھی شعلے اُگلتا رہا

آگ بستی کی میں نے بجھادی مگر
ایک میرا ہی گھر تھا کہ جلتا رہا

مجھ سے اس کو بہت بدگمانی رہی
میرے ہمراہ لیکن وہ چلتا رہا

ہم گزرتے رہے موجِ طوفان سے
اور طوفان ہاتھوں کو ملتا رہا

لاکھ اشکوں نے طوفاں اٹھائے مگر
اک شرر تھا کہ دل میں مچلتا رہا

یاد کا تیری موسم نہ بدلا کبھی
بجھ گئی شمعِ دل تھا کہ جلتا رہا

راہِ غم میں نسیمِ حزیں کا قدم
ڈگمگاتے ہوئے بھی سنبھلتا رہا

غزلیں

• شبنم جبیں، کریم گنج (بہار) ۸۲۴۳۰۱

فیصلہ ستمگر کا مجھکو کرانا آتا ہے
راکھ اس کو کرتی ہوں جو مجھے جلاتا ہے

خوف تم کو ہوتا ہے دست و گریباں کا
ہم کو اپنا دامن تو خود بچانا آتا ہے

بھول کر غم دل کو مسکراتی رہتی ہوں
ہر گھڑی خیالوں میں وہ مجھے ہنساتا ہے

کیا یہ دردِ الفت ہے یا جوانیوں کے دن
بن پئے گلابی بھی اب سرور آتا ہے

بے خطر گذرتی ہے الجھنوں کے جنگل سے
کون ہے جو شبنم کا حوصلہ بڑھاتا ہے

• ضیا زخمی کھامگاؤں

غم کی شدت میں ہے دل کو شادمانی کی تلاش
جیسے صحرا میں کسی پیاسے کو پانی کی تلاش

دربدر پھرتی ہے لیکر زندگی کی جستجو
قاتلوں کے شہر میں ہے مہربانی کی تلاش

آسماں کو بڑھ کے چھونا دسترس سے دور ہے
حق لاحاصل کو پیہم کامرانی کی تلاش

دو گھڑی خوابوں میں تیرے ڈوب کر سو جائینگے
پھر کریں گے رات بھر تیری جوانی کی تلاش

بھول جاؤ اے ضیا زخمی وفاؤں کا صلہ
دور نا قدری میں کیوں ہے قدردانی کی تلاش

• ہرتیما نسیم، شیواجی پارک، جالندھر سٹی (پنجاب)

عزم پختہ نہیں ہے اگر معتبر
ٹھوکریں کھائے گا پھر بشر دربدر

ہیں بری ہی سبھی بندہ پرور مگر
اپنے دامن میں بھی دیکھئے جھانک کر

جن کو سنکر لرز جائے دل آپ کا
میں نے صدمے اٹھائے ہیں وہ جان پر

اپنی روداد چھیڑی تو کہنے لگے
قصۂ غم ذرا دیکھئے مختصر

ان کا جانا قیامت سے کم تو نہیں
کتنی حسرت سے تکتے ہیں دیوار و در

میں نے کیفیت دل چھپائی تو تھی
کر گئی مجھکو رسوا مری چشم تر

تازگی بخش دے روح کو بھی مری
اے نسیم سحر اے نسیم سحر

وقار احمد نظر اٹاوی
نگر پالیکا۔ اٹاوہ۔ یوپی ۲۰۶۰۰۱

دھوپ نکلی برف پگھلی خواب پانی ہو گئے
پھول سے چہرے کتابوں کی کہانی ہو گئے

وقت کے جادوگروں نے وہ دکھایا ہے کمال
آج پتھر کے صنم ظلِ سبحانی ہو گئے

جس نے چاہا روند ڈالا شوق پورا کر لیا
دستو ہلوگ مفلس کی جوانی ہو گئے

چاند سورج ٹھوکروں میں دیکھئے عالم پناہ
خاک کے ذرّے ابھر کر آسمانی ہو گئے

ہم بتا کر کیا کریں اس دور میں حسب و نسب
راہ کے پتھر بھی اب تو خاندانی ہو گئے

حضرت امجد کی برجستہ رباعی

حضرت امجد کے قلم سے

دارالسلطنت حیدرآباد

MEMORANDA

(ما عندکم ینفد و ما عند اللہ باق)

جو چیز جہاں کی ہے، وہاں رکھ چھوڑو

کچھ کل کیلئے بھی مہرباں، رکھ چھوڑو

ممکن ہے تمہارے ہاتھ سے کھو جائے

اپنا سب کچھ کسی کے ہاں، رکھ چھوڑو

امجد [illegible]

بات ۱۹۴۵ء یا ۱۹۴۶ء کی ہے۔ محترم قاضی عبدالغفار نواب سر مین جنگ (معتمد پیشی نظام حیدرآباد) کے پاس ہفتہ میں دو بار ان سے احوال گذشتہ" حاصل کرنے جایا کرتے تھے اور ان سے جو گفتگو ہوتی تھی اس کے نوٹس لیا کرتے تھے۔ نوٹس دیکھ کر مجھے بھی تجسس ہوا اور میں نے قاضی صاحب سے خواہش کی کہ میں بھی ان کے ساتھ چلنا چاہتا ہوں۔ قاضی صاحب اس بات پر راضی ہو گئے لیکن ساتھ ہی تاکید کر دی کہ میں بالکل خاموش رہوں گا۔ چار بجے سے پانچ بجے تک سوال و جواب ہوتے اس کے بعد چاء کا وقفہ دیا جاتا۔ وقفہ کے بعد اور احباب جمع ہو جاتے اور اس محفل میں قرآن حکیم سے لیکر حکمت تک گفتگو چلتی۔ ایک بار قرآن حکیم کی ایک آیت پر بات ہو رہی تھی اور اس محفل میں حضرت امجد حیدرآبادی بھی موجود تھے۔ انہوں نے آیت سماعت فرمانے کے بعد سامنے رکھی ہوئی ایک ڈائری اٹھائی اور آیت تحریر فرما کر رباعی لکھ دی یہی اس رباعی کی شان نزول ہے۔

رباعی تحریر فرمانے کے بعد حضرت امجد نے پرزہ میرے حوالے کر دیا جو پنسل سے تحریر کردہ اب تک میرے پاس محفوظ ہے۔ اب میں اس نایاب تحفہ کو قارئین کے حوالے کرتا ہوں۔

سری نواس لاہوٹی

○

ضروری گذارش

مضمون نگار حضرات سے خصوصی گذارش ہے کہ مسودہ صاف اور خوش خط تحریر میں روانہ فرمائیں اور کاغذ کے صرف ایک ہی طرف۔ زیروکس یا کاربن کاپی ہرگز نہ بھجوائیں۔ گذارش اس لیے ضروری ہے کہ نظر ثانی اور تصحیح میں دشواری نہ ہو اور غلطیوں کا امکان نہ رہے۔ مسودہ سپرد ڈاک کرنے سے پہلے نظر ثانی کر لیں اور مضمون کے آخر میں اپنا نام اور پتہ پن کوڈ نمبر کے ساتھ لکھنا نہ بھولیں۔ (ادارہ)

تبصرے کیلئے کتاب کی دو جلدیں رجسٹری سے روانہ فرمائیں۔ (ادارہ)

نام کتاب : سوچ لیجئے (ڈراموں کا مجموعہ)
مصنف : نورالعین علی
قیمت : ۳۰ روپے
ملنے کا پتہ : ۲۴ رالہلال، باندرہ ریکلیمیشن، بمبئی ۵۰
مبصر : منظر سلیم
۷/۱۵/۱۱ گنتی دیوی چال ونوبا بھاوے نگر،
کرلا۔ بمبئی ۷۰

اردو میں عام طور پر یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ فن ڈرامہ اور ڈرامہ نگاری کی روایت آغا حشر کاشمیری اور امتیاز علی تاج پر ختم ہوگئی۔ مگر ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ اس روایت کو آگے بڑھانے کی کوششیں بھی کی جاتی رہی ہیں۔ اور نئی نسل کو ڈرامہ کی جدید ٹیکنک سے متعارف کروانے کا کام بھی بڑی لگن اور یکسوئی کے ساتھ کیا جاتا رہا ہے۔ اور کچھ نام ایسے نکل آتے ہیں جو اس مشن کو فرض اولین سمجھ کر انجام دے رہے ہیں۔

انہی ناموں میں ایک نام نورالعین صاحبہ کا بھی ہے۔ پھر بھی یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اس صنف (فن ڈرامہ) سے آج تک بے توجہی برتی گئی ہے اور آج بھی برتی جا رہی ہے جس کے نتیجے میں فن ڈرامہ بہت دھیمی رفتار سے ادب میں اپنی جگہ بنا سکا ہے۔

زیر نظر کتاب نورالعین علی کے ڈراموں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ اس سے قبل محترمہ نے "بھوک کی تلاش" اور دوسرے ڈرامے" اس عنوان سے اپنا پہلا ڈراموں کا مجموعہ ۱۹۶۵ء میں پیش کیا تھا۔ جس کی خاطر خواہ پذیرائی بھی ہوئی ہے۔ ٹھیک ۲۵ سال کے طویل عرصہ بعد محترمہ نے دوسرا مجموعہ قارئین کی نذر کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈراموں کی اشاعت کی رفتار ہمارے یہاں کتنی دھیمی اور سست ہے۔

اس مجموعے میں کل چھ یک بابی ڈرامے ہیں۔ اور ایک چھوٹا سا انتساب جو امی، ابا کے نام ہے۔ اور ساتھ ہی مصنفہ کا ایک جذبہ پیدائی کے عنوان سے سوچ لیجئے کے متعلق ایک بیان ہے جس کے ذریعے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ نورالعین علی صاحبہ فن ڈرامہ نگاری سے حد درجہ گہری دلچسپی رکھتی ہیں اور اس فن پر سنجیدگی اور ذہانت سے سوچتی بھی ہیں۔ غور و فکر بھی کرتی ہیں اور سوچ لیجئے کہ عنوان کے تحت قارئین کو سوچنے کی دعوت بھی دیتی ہیں۔ مصنفہ فرماتی ہیں،

"میں تقریباً ۲۵ سالوں سے ڈرامے لکھ رہی ہوں۔ ان میں اسٹیج ڈرامے بھی ہیں۔ ریڈیو ڈرامے بھی اور نکڑ ناٹک بھی۔"

نورالعین علی صاحبہ نے ایک طویل سفر فن ڈرامہ کے ساتھ طے کیا ہے۔ ۲۵ سالوں میں کم از کم ۵ ڈراموں کے مجموعے منظر عام پر آجانا چاہیئے تھا مگر ایسا نہ ہوسکا کیونکہ طباعت اور اس کے بعد کتابوں کی نکاسی خود ایک مسئلہ

ہے اور ان مسائل کا سامنا کرتے کرتے بے چارہ ادیب تھک سا جاتا ہے۔

محترمہ نے علاقائی زبان مراٹھی ڈراموں کے ترجمے بھی کئے ہیں۔ اور ان کے طبع زاد ڈراموں کی تعداد پچاس سے کہیں زیادہ ہے۔

"سوچ لیجئے" اس عنوان سے جو ڈرامہ شامل ہے وہ تین ایکٹ ڈرامہ ہے۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تک پر کیا جا سکتا ہے جو قارئین اور ناظرین کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر ڈرامے "منزل ہے کہاں تیری" "جیون ساتھی" "ہاتھی کے دانت" کس کے لیے، "مانگے کا اُجالا وغیرہ" ڈرامے اپنی نوعیت اور پیش کش کے اعتبار سے منفرد اور کامیاب ڈرامے ہیں۔ ان ڈراموں میں جو کردار منتخب کیے گئے ہیں وہ کوئی طلسماتی دنیا کے نہیں ہیں۔ اجنبی اور غیر مانوس نہیں ہیں بلکہ سبھی کردار جیتی جاگتی دنیا کے کردار ہیں۔ ہمارے آس پاس اور اطراف کے کردار ہیں۔ جنھیں بڑی خوش اسلوبی سے ترتیب سے نوازا گیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے واقعات، گھریلو نوک جھونک، چھیڑ چھاڑ اور زندگی میں درپیش حادثات اور مسائل کا باریک بینی سے مطالعہ پیش کیا گیا ہے اور ہماری نظریں مسائل پر ٹھہری نہیں ہیں ان کی طرف بھی توجہ مبذول کروائی گئی ہے۔ اور محترمہ اس میں کامیاب بھی ہوئی ہیں۔ اور یہی تو ان کی فنکارانہ چابک دستی ہے کہ مصنفہ نے ہمیں اپنے ماحول سے اور اپنے اندر بکھرے ہوئے ٹیڑھے میڑھے راستوں سے مڈبھیڑ کرائی ہے۔ چاہے وہ سوچ لیجئے کا پروفیسر شوکت ہو یا نگار، "منزل ہے کہاں تیری" کا نمل ہو، اسے کمار یا چپراسی یا سریتا ہو۔ "جیون ساتھی" کا آنند ہو، وبجے، مادھوری یا ارچنا ہو۔ "ہاتھی کے دانت" کا سریش ہو، اجیت ہو یا اوشا یا رما۔ "کس کے لیئے" کی نُوا ہو، عزیز، روہنی یا بی بی جی۔ "مانگے کا اُجالا" کا ظفر، تربت یا پھر منی۔ سبھی کے کردار جیتے جاگتے اور باہوش کردار ہیں۔ ہماری اپنی دُنیا، اپنے ماحول، اپنے آس پاس کے کردار جو زندگی کی ساری اونچ نیچ اور نشیب و فراز سے سمجھتے ہیں۔ اور صعوبتوں کو برداشت کر رہے ہیں اور کہیں نہ کہیں مفاہمت کا راستہ اپنائے ہوئے ہیں۔

اس مجموعے کے تمام ڈرامے اپنے پلاٹ، پیش کش، کردار نگاری اور واقعات کی صحیح ترتیب اور روانی و تسلسل کے باعث نہایت سنجیدہ اور مقصدیت لیے ہوئے ہیں۔ کردار کی ترتیب غیر شعوری طور پر کامیابی کیساتھ کی گئی ہے۔

چھ یک بابی ڈرامے ایک سو اڑتالیس (۱۴۸) صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں جو اسٹیج بھی کئے جا سکتے ہیں جس کے لیے مصنفہ کی تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ اس مجموعے کی قیمت تیس روپے ہے۔ جو شاید واجبی ہے۔ سرورق سادہ مگر پرکشش ہے۔

- نام رسالہ: اسباق (خاص نمبر)
- مدیر: نذیر فتح پوری
- پتہ: تیتا پارک، ایروڈرہ، پونہ نمبر ۶

تبصرہ نگار: رفیق جعفر

مراٹھی زبان کی اہم سرزمین پونے سے اردو زبان کا یہ رسالہ کالیداس گپتا رضا کی سرپرستی میں جس بہ سولت سے کسی ہے گلہے منظرِ عام پر آتا رہتا ہے۔ جس میں ملک کے مختلف مقامات سے شعراء و ادباء حضرات کی تخلیقات شامل

گپتار رضا صاحب کا کوئی ذکر تحقیقاتی مضمون بھی ہوتا ہے۔ حسب روایت موجودہ شمارے میں بھی وہی سب کچھ ہے۔ فرق رسالے کی ضخامت اور زیادہ سے زیادہ تخلیقات کی اشاعت ہے۔ اس بار گپتار رضا صاحب کے دو اہم مضامین ہیں۔ ایک غالب پر اور دوسرا مضمون ہے "منظوم" جو طویل ہونے کے باوجود اہم ہے۔

یہ ماہنامہ "اسباق" کا ایک خاص شمارہ ہے جو چار ماہ کی کمی پورا کرتا ہے یعنی ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۹۰ء اس میں مایہ ناز ادیبہ قرۃ العین حیدر پر نظام صدیقی کا لکھا ہوا ایک مقالہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں نظام صاحب کے عمیق مطالعہ اور بے باک نظریہ کی غمازی ہوتی ہے۔ کہانیاں اور غزلیں ان ہی ادبا و شعراء کی ہیں جو زیادہ سے زیادہ چھپتے رہتے ہیں۔ کوئی نیا نام یا اہم موضوعات پر لکھنے والا نام اس میں نظر نہیں آتا۔ شعری انتخاب درمیانہ ہے۔ کہانیاں غنیمت ہیں۔ مراٹھی کہانی "شراب زدہ" اچھی ہے۔ ترجمہ بھی عمدہ ہے۔ خصوصی پیشکش میں پرکاش تیواری کی غزلیں خوب ہیں اور ڈاکٹر امام اعظم کی آزاد غزلیں سندھی جائیں گی۔ گپتار رضا صاحب کی سرپرستی میں شائع ہونے والا یہ رسالہ اگر ہر ماہ پابندی سے شائع ہو تو اپنا ایک مقام بنا سکتا ہے۔ ●●●

- نام کتاب : روشن ستارے
- مصنف : عبدالعزیز عرفان
- قیمت : آٹھ روپئے
- ناشر : صابرہ صدیقی صبا
- پتہ : بیت العزیز، جیکری پورہ، اکوٹ ۴۴۴۱۰۱ اکولہ

تبصرہ نگار : رفیق جعفر

●● عبدالعزیز عرفان، درس و تدریس کے پیشے سے تعلق رکھتے ہیں اور ممبئی کے موقر اخبار "اردو ٹائمز" کے لئے چھوٹے چھوٹے ... مگر کارآمد مضامین لکھتے ہیں۔ اخلاق اور تربیت ان کا موضوع ہے اس سے پہلے ان کی ایک کتاب شائع ہو چکی ہے "آنچل کے ستارے" اس میں انہوں نے عورتوں کی تعلیم و تربیت اور اخلاق رہن سہن بہتری پر بات کی ہے۔ ان کی دوسری کتاب "روشن ستارے" ہے یہ کتاب بچوں کے لئے لکھی گئی ہے۔ اس میں شامل مضامین میں بچوں کی تربیت کی ترغیب دی گئی ہے۔ یہ ایک فال نیک ہے کہ عرفان صاحب کا رجحان قوم کی تربیت کی طرف ہے۔ ورنہ جس میں ذرا سی بھی لکھنے کی صلاحیت ہوتی ہے وہ شاعر یا افسانہ نگار بن جاتا ہے۔ اور غلط حوصلہ افزائی یا اس کی اپنی خوش فہمی اسے برسوں تک بھٹکاتی رہتی ہے۔

"روشن ستارے" کے مضامین بہت ہی مختصر ہیں جو ۲۵ صفحوں پر پھیلے ہوئے ہیں۔ موضوعات کا انتخاب اچھا ہے۔ زبان بچوں کو سمجھانے والی اور صاف ہے۔ ہر مضمون میں اصلاح کا پہلو ابھر کر سامنے آتا ہے۔ مضامین کا اختصار اخبار کے لئے تو ٹھیک ہے کتاب کے لئے ٹھیک نہیں شاید اسی وجہ سے کہیں کہیں تشنگی محسوس ہوتی ہے۔ اس کے باوجود کتاب اپنی نوعیت سے اہم ہے۔ سرپرست یہ کتاب خرید کر بچوں کو پڑھنے کے لئے دے سکتے ہیں۔ اگر مصنف ان مضامین پر مزید محنت کرے تو یہ کتاب اردو کے کورس میں بھی شامل کی جا سکتی ہے۔

م۔ ناگ
معرفت حمید خاں
بھیانا ٹیلر کمپاؤنڈ، بوریولی (ویسٹ)، بمبئی ۴۰۰۰۹۲

انگریزی کو عربی کی طرح پڑھنے والا لڑکا

سُونیل کدم کی عمر صرف آٹھ برس ہے۔ وہ ششم جماعت
کا طالب علم ہے۔ اور مسقط میں اپنے والدین کے ساتھ
رہتا ہے۔ وہ انگریزی زبان کو عربی یا اردو کی طرح دائیں
طرف سے اس طرح پڑھتا یا بولتا ہے جیسے ہم اور آپ
اپنی مادری زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ممبئی
کو انگریزی MUMBAI لکھا جائے گا مگر سُونیل کی زبان
میں یہ لفظ "ایابموم" پڑھا جائے گا۔ اور CHIEF MINISTER
کا "فیچ ریٹس اِنم" ہو جائے گا۔ اس
سے جب پوچھا گیا کہ اس نے یہ فن کہاں سیکھا تو اس نے جواب
دیا۔ "میں نے خود ہی تھوڑی سی کوشش سے یہ زبان سیکھ لی"
گویا اس نئے اسلوب کا سرپرست وہ خود ہی استاد بھی ہے
اور شاگرد بھی۔

سُونیل کی ماں سمتا کدم نے بھی یہی بتایا کہ یہ زبان
اس نے خود سیکھی ہے۔ ان کے مطابق وہ گھر میں اس طرح
بک بک کرتا رہتا تھا۔ شروع میں ہم نے کوئی دھیان
نہ دیا۔ بعد میں جب ہمیں پتہ چلا کہ وہ الٹی زبان بول رہا
یا پڑھ رہا ہے۔ مگر ہم نے اسے منع کرنا مناسب نہیں سمجھا۔
کیونکہ یہ زبان سننے میں بڑی اچھی لگتی تھی۔

اس کے اسکول میں بھی اس کی اس خوبی کو خوب سراہا
اسکول کے سالانہ پروگرام میں اس کے اس ہنر کو خصوصی
طور پر پیش کیا گیا۔ اور اس نے کافی انعامات حاصل
کئے۔ اس شوق سے سونیل کو تعلیمی میدان میں بہت فائدہ
بھی ہوا ہے۔ اس کی انگریزی کی اسٹڈی کافی اچھی ہوگئی
ہے۔ اسے اس مشغلے کے سبب کتابیں پڑھنے کا چسکا لگ
گیا ہے۔ اس کی انگریزی کی اسپیلنگ تو اس قدر پختہ ہوگئی
ہے کہ اس کے ٹیچروں پر بھی اس کی اچھی خاصی دھاک بیٹھ گئی
ہے۔

۱۳؍ اگست کو ممبئی دوردرشن نے اپنے سیکنڈ چینل
کے سیٹرڈے جنرل کے پروگرام میں اس کا انٹرویو لیا تھا۔ جس
میں اس نے بڑی چابکدستی سے نہ صرف سبھی سوالوں کے جوابات
دیئے بلکہ دوردرشن پر الٹی انگریزی میں بڑے مزے سے
بات چیت بھی کی۔ اور کتابوں کے پیراگراف پڑھ کر سنائے۔
مثلاً وہ CENTRAL RAILWAY
کو "لارتنیک یاولیئر" TELEVISION کو
"نوایژی ولیت" RADIO کو "اوئیدار" FAST
TRAIN "تساف نیارات" اور CHURCH
GATE کو "ایٹگ ہچروچ" پڑھتا ہے۔

کبھی کبھی یہ الٹی زبان خود اپنے آپ میں ایک الگ معنی
دینے لگتی ہے۔ جو کافی دلچسپ ہوتی ہے۔
وہ MAMA کو "اَمام" بتاتا ہے۔ مگر جب
MAMI کو الٹا گیا تو وہ "امام" بن گیا۔ اور محفل میں ہنسی کی
پھلجھڑیاں سی چھوٹ گئیں۔

اسی طرح مسقط میں اس کی ٹیچر نے "GOD IS GREAT" کو الٹا کرنے کیلئے کہا تو سونیل نے جواب دیا۔ "اگر میں اس جملے کو الٹا کردوں گا تو آپ ناراض ہوجائیں گی۔" ٹیچر نے پوچھا کیوں؟ تب اس نے بتایا کہ اس میں "GOD" کو الٹنے ہی وہ DOG ہوجائے گا۔ پوری کلاس کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

سونیل پچھلے دنوں چھٹیوں میں مسقط سے اپنے نانا کے گھر بمبئی آیا تھا۔ اس بیچ بمبئی دوردرشن کے علاوہ کئی مراٹھی اخباروں نے اس کا انٹرویو لیا۔

پھر اگر، سانتا کروز کے ایک گنیش اتسو میں اس کا ایک پروگرام بھی ہوا۔ اور لوگوں نے آزمائش کے طور پر اس سے الگ الگ سوالات پوچھے اور اس نے سبھی سوالوں کے مزے مزے میں جواب دیئے۔

ایسی ہی ایک ملاقات میں بمبئی کے ایک مشہور ڈاکٹر کوٹھاری نے سونیل کے اس آرٹ میں مزید تحقیق کی گنجائش پر زور دیا۔ ایک اندازہ ہے کہ مسقط میں انگریزی کے ساتھ عربی بھی پڑھائی جاتی ہے۔ چونکہ عربی زبان دائیں طرف لکھی جاتی ہے لہذا عربی پڑھتے پڑھتے ہی سونیل نے یوں ہی کھیل کھیل میں انگریزی زبان کو بھی دائیں طرف سے پڑھنا شروع کیا ہوگا۔ اس طرح اس نے کھیل کھیل میں اس اسلوب میں مہارت حاصل کرلی۔ مگر اس کی عمر کو دیکھتے ہوئے اس کا یہ کھیل "سچ مچ ایک کارنامہ معلوم ہوتا ہے۔"

طالب ممتاز
حاتم پورہ، کھنڈوہ

اُڑتی ہے خاک سونے کی چڑیا کے دیس میں

گنگا کی وادیوں میں، ہمالہ کے دیس میں
ہنسا بھڑک رہی ہے۔ اہنسا کے دیس میں

دھرتی کے کنڈ کنڈ سے نکلنے لگی ہے آگ
نہریں تمام پیاسی ہیں دریا کے دیس میں

کرنے لگے ہیں خون سے اشنان یاتری
سنگم لہو لہان ہے گنگا کے دیس میں

تاریخ کو بھی زیب نہ دے گا یہ قتل و خون
اسنیہہ، پیار، ستیہ، اہنسا کے دیس میں

داتا کے ہاتھ پھیلے ہیں خیرات کیلئے
اڑتی ہے خاک سونے کی چڑیا کے دیس میں

بنسی بجائے کون مدھر لے میں پیار کی
رادھا بہت دکھی ہے کنہیا کے دیس میں

پتھر میں جان ڈالنے والا کوئی نہیں
فن کا پتہ نہیں ہے اجنتا کے دیس میں

یہ شعلہ تو جوش محبت کو کھا گیا!
یوسف فسردہ دل ہے زلیخا کے دیس میں

ساقی کو اپنی پیاس بجھانے سے کام ہے
ہم تشنہ لب ہیں ساغر و مینا کے دیس میں

رستہ بھٹک رہی ہو تو شاید کہیں ملے
آشا کو ڈھونڈتے ہیں نراشا کے دیش میں

اے پیار چل کہ میں تجھے ہمراہ لے چلوں
ماضی کی سرزمین سے فردا کے دیس میں

رکھنا ہے سر بلند مجھے پرچم حیات
دل، آرزو، امنگ تمنا کے دیس میں

طالب غزل کو چھوڑ دو اب مرثیہ لکھو
انسان مر رہا ہے مسیحا کے دیس میں

ریاستی خبریں

وزیر اعلیٰ کی اپیل

شریمتی باکل بین پٹیل کنوینر رجنی پٹیل سمارک سمیتی کو ایک لاکھ روپے کا چیک پیش کرتے ہوئے مہاراشٹر کے وزیر اعلیٰ شری سدھاکر راؤ نائیک نے آنجہانی رجنی پٹیل کے بمبئی میں مجسمہ قائم کئے جانے کی بابت تمام دوستوں اور مداحوں سے شری رجنی پٹیل کے شہر میں ورلی بمقابل لوٹس ہاؤس میں نصب کئے جانے والے مجسمے کے لئے فراخدلی کے ساتھ عطیات دینے کی اپیل کی۔

اس مقصد کے لئے زمین بمبئی میونسپل کارپوریشن کو دے دی گئی ہے عطیات شریمتی باکل پٹیل کنوینر رجنی پٹیل سمارک سمیتی کے ۴ رکف کیسل کف پریڈ بمبئی ۵۰۰۰ کو روانہ کئے جا سکتے ہیں۔

شریمتی سدھا جوشی

حکومت مہاراشٹر نے شریمتی سدھا جوشی سابق ممبر راجیہ سبھا کو شریمتی پاروتی ملگونڈ کی جگہ مہاراشٹر سوشیل ویلفیئر ایڈوائزری بورڈ، بمبئی کا چیئرمین مقرر کیا ہے۔

شریمتی جوشی کی تقرری کی میعاد ۶ نومبر ۱۹۹۱ء سے تین سال تک کے لئے ہے۔

اویناس نائیک کی بحیثیت "ایم ایل سی" نامزدگی

گورنر مہاراشٹر نے شری اویناس وسنت راؤ نائیک کو مہاراشٹر لیجسلیٹیو کونسل میں شری منوہر پھاٹکے کی رحلت کی وجہ سے خالی ہوئی نشست پر نامزد کیا ہے۔

اس ضمن میں اطلاع نامہ ریاستی حکومت گزٹ کے حصہ ۷-۱۷ مورخہ ۷ نومبر ۱۹۹۱ء میں شائع کر دیا گیا ہے۔

"ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر" پر فلم حکومتِ مہاراشٹر کا عطیہ

شری ارون پاٹنکر، ڈائرکٹر جنرل انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز حکومت مہاراشٹر نے دس لاکھ روپے کا ایک چیک منترالیہ میں شری رنری، گپتا مینجنگ ڈائرکٹر آف نیشنل فلم ڈیولپمنٹ کارپوریشن کو بھارت رتن ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر پر بنائی جانے والی فلم کی ریاستی حکومت کی جانب سے پہلی قسط کے طور پر پیش کیا۔ یہ فلم، ہندی اور انگریزی میں بنائی جائے گی۔

فل لینتھ فیچر کلر فلم ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر کی زندگی پر حکومت ہند اور حکومت مہاراشٹر کی جانب سے مشترکہ طور پر پروڈیوس کی جائے گی اس فلم پر لاگت کا تخمینہ ۶ کروڑ روپے ہے۔

اس فلم کی پروڈکشن نیشنل فلم ڈیولپمنٹ کارپوریشن لمیٹڈ کے سپرد کی گئی ہے اس فلم کی ڈائرکشن ڈاکٹر جبار پٹیل کریں گے۔

حکومت ہند ۵ کروڑ روپے سے اخراجات برداشت کرے گی جب کہ حکومت مہاراشٹر اس پروڈکشن کے لئے ایک کروڑ روپے ادا کرے گی۔

ڈاکٹر وجیہ پاٹل

ماویم کی نئے چیرمین

حکومت مہاراشٹر نے ڈاکٹر وجیہ پاٹل کو شریمتی کملا تائی وچارے کی جگہ ۴ نومبر ۱۹۹۱ء سے مہیلا آرتھک وکاس مہامنڈل لمیٹڈ کا چیرمین مقرر کیا ہے۔ شریمتی وچارے ۵ اکتوبر ۱۹۸۸ء سے ۲ نومبر ۱۹۹۱ء تک مہیلا آرتھک وکاس مہامنڈل کی چیئرمین کے عہدے پر فائز تھیں۔

ڈاکٹر وجیہ پاٹل گیئنا کولوجیسٹ کی پریکٹیس کر رہی ہیں ان کا بمبئی کے پریل میں خود کا ایک نرسنگ ہوم ہے اور آپ بمبئی اسپتال میں بحیثیت ایک کنسلٹینٹ گیئنا لوجسٹ کے بھی کام کر رہی ہیں۔

موصوف مہیلا آرتھک وکاس مہامنڈل لمیٹڈ کی ۱۲ ویں چیئرمین ہیں۔

مہاراشٹر نے اتر پردیش کے زلزلے کے شکار لوگوں کیلئے ۱۵ لاکھ روپئے کا عطیہ دیا

مہاراشٹر کے وزیر اعلیٰ شری سدھاکر راؤ نائیک نے اُتر پردیش کے زلزلے کے شکار افراد کی راحت کے لئے ۱۵ لاکھ روپے کے ایک عطیہ کا اعلان کیا۔

وزیر اعلیٰ نے فرمایا کہ یہ عطیہ مہاراشٹر کے عوام نے یوپی میں بسنے والے اپنے ملکی بھائیوں کی مشکلات کو محسوس کر کے دیا ہے۔

کل ہند حزب مخالف لیڈران
کے منعقدہ اجلاس کا گورنر ڈاکٹر
سی۔ سبرامینم۔ نے ۱۴ اکتوبر
۱۹۹۱ء کو ودھان بھون میں دیپ
جلا کر افتتاح کیا۔ اس موقع پر
لی گئی تصویر میں شری مدھوکر راؤ چودھری
اسپیکر لیجسلیٹو اسمبلی شری شیواجی راؤ دیشمکھ
وزیر برائے پارلیمانی امور، وزیر اعلیٰ شری
سدھاکر راؤ نائیک، ودھان سبھا میں
حزب مخالف کے لیڈر شری منوہر جوشی
بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

اورنگ آباد میں منعقدہ ریاستی کابینہ
کی میٹنگ میں وزیر اعلیٰ شری سدھاکر راؤ
نائیک مراٹھواڑہ سے ترقیات کے بارے
میں خلاصہ کرتے ہوئے دیکھے جا
سکتے ہیں۔

حکومت مہاراشٹر کی جانب سے
"ترقیاتی تحریرات" پر سال برائے
۸۹-۱۹۸۸ء کیلئے انعامات کی
تقسیم منترالیہ میں منعقدہ تقریب میں
وزیر مالیات شری رام راؤ آدیک
کے ہاتھوں اختتام پذیر ہوئی زیر نظر
تصویر میں موصوف شری ارونہ راؤ جوشی کو
انعام پیش کرتے ہوئے دیکھے جا سکتے ہیں
وزیر مملکت برائے انفارمیشن اینڈ پبلک
ریلیشنز شری ارون گجرالی اور سکریٹری
انفارمیشن شری دینکر چاری بھی
دیکھے جا سکتے ہیں۔

سہیل ظفر قریشی

محمد قیصر حسین، قریش نگر ۲۱ ملکاپور ضلع بلڈانہ (مہاراشٹر)

مئی ۱۹۹۱ء کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر خصوصی نمبر پسند آیا۔ یوسف ناظم کا مضمون اچھا لگا۔ مقدر حمید کا افسانہ ...ماری ہے۔ ڈاکٹر منشاء الرحمن منشاء کی نظم بابا صاحب امبیڈکر کی ...ری زندگی کی ترجمان ہے۔ شجاع کی غزل بھی خوب ہے۔ ...سب کو مبارکباد۔

ڈاکٹر یونس اگاسکر
ڈپارٹمنٹ آف اردو، یونیورسٹی آف بامبے
رانا ڈے بھون، ودیانگری، بمبئی ۴۰۰۰۹۸

"قومی راج" صوری و معنوی دونوں اعتبار سے خوب سے خوب تر ہوتا جا رہا ہے۔ اپریل، مئی اور ...ن ۱۹۹۱ء کا شمارہ اس کی ترقی پذیری کا روشن ...ت ہیں۔

...جون ۱۹۹۱ء کا خصوصی شمارہ جو ہمارے سابق وزیر ...ظم آنجہانی شری راجیو گاندھی کو خراج عقیدت کے ...پیش کیا گیا ہے خاص طور سے پسند آیا۔ ریاض ...احمد خاں کا مضمون اور انجم رومانی، جمیل کامل کی ...ل لائق تحسین ہیں۔

آپ نے آنجہانی کامریڈ ڈانگے کو بھی یاد رکھا ...پ کی بیدار مغزی کی دلیل ہے۔

کتابت اب معیاری اور متوازن ہوگئی ہے اس معیار برقرار رکھئے جہاں تک ہو سکے اسکیچوں کے بجائے ...ویروں یا پریس میں موجود ڈیزائنوں سے کام چلایئے

...نظر کے طور پر علمی، ادبی معلومات کا استعمال کیجئے (صفحہ ۳۱ کا اسکیچ نہ ہوتا اچھا تھا) افسانوں کی اشاعت کا سلسلہ جاری رکھئے۔ ساجد رشید کا افسانہ "دوپہر" خوبصورت ہے۔

★ ڈاکٹر خورشید نعمانی

خالق ملینس، ۱۸۰۰، پینے، پائپ روڈ کرلا، بمبئی نمبر ۴۰۰۰۷۰

ماہ جون ۱۹۹۱ء کا قومی راج کا شمارہ موصول ہوا جسے خوش سلیقگی سے ترتیب دیا گیا ہے اس سے آپ کے ذوق جمال کی عکاسی ہوتی ہے۔ اسے اصلاً "راجیو گاندھی نمبر" کہا جاسکتا ہے۔ ریاض احمد خاں کا مضمون "اکیسویں صدی کا معمار"، لاجپت رائے کا مضمون "کامریڈ ڈانگے"۔ ان شخصیتوں سے متعلق اچھے معلوماتی مضامین ہیں۔ نظموں کے حصہ میں انجم رومانی کی خوبصورت نظم "اور اب" نے متاثر کیا۔

اس شمارے میں مطرب نظامی کا مضمون "تنقید و تحقیق سے تبصرے اور تنقیص تک" اور احمد ہمیش کا مختصر مضمون "علامہ اقبال اور ہندستان کی پرانی تاریخ کا احترام"۔ (یہ مضمون ہر چند کہ مختصر ہے) دونوں قابل داد مضامین ہیں۔

★ عبدالرفیع

ہمدرد نگر (بی)، پوسٹ بکس نمبر ۳۴، انوپ شہر روڈ۔ علی گڑھ (یو۔پی) ۲۰۲۰۰۲

"قومی راج" ہر ماہ مل رہا ہے۔ اس کا میں نہایت شکر گزار ہوں۔ جون ۱۹۹۱ء کا شمارہ زیر نظر ہے۔ اس میں شامل تمام نگارشات قابل قدر ہیں۔ آنجہانی شری راجیو گاندھی پر لکھے ہوئے مضامین بطور خاص ... ان مضامین کے ذریعہ آنجہانی شری راجیو گاندھی سے متعلق اہم معلومات فراہم ہوئیں۔

(مطبوعہ: گورنمنٹ فوٹو زنکو پریس۔ پونے ۱)

۲ ر اکتوبر ۱۹۹۱ء گاندھی جینتی کے روز ، راج بھون میں گورنر مہاراشٹر شری سی. سبرامنیم خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے۔

"کرشی بھوشن" ایوارڈ پانے والے کسانوں کے ہمراہ گورنر مہاراشٹر شری سی. سبرامنیم ، وزیر اعلیٰ شری سدھاکر راؤ نائیک ، وزیر زراعت شری رو ہیداس پاٹل اور وزیر مملکت برائے زراعت شری انیرت پوار ، محکمہ زراعت کے دیگر افسران کے ہمراہ دیکھے جاسکتے ہیں۔

شائع کردہ شری مادھو پانگکر، ڈائرکٹر جنرل آف انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز، گورنمنٹ آف مہاراشٹر، سچیوالیہ بمبئی ۳۲ ..... مطبوعہ گورنمنٹ سنٹرل پریس، بمبئی ۴